مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

سورۂ الاحزاب' سورۂ السبا' سورۂ الفاطر

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ 25بی گلبرگ 2 لاہور

مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

سورۂ الاحزاب ٗ سورۂ السبا ٗ سورۂ الفاطر

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ 25 بی گلبرگ 2 لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	....	مطالب القرآن فی دروس الفرقان۔سورۃ الاحزاب۔سورۃ سبا سورۃ فاطر
دروس	....	از: جناب غلام احمد پرویز رحمۃ اللہ علیہ
ناشر	....	بزمِ طلوع اسلام، لاہور
زیر اہتمام	....	ادارہ طلوع اسلام 25بی2 گلبرگ، لاہور
	....	فون نمبر 5714546-5753666
ایڈیشن اول	....	نومبر 2009ء

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ کی طرف سے شائع کردہ لٹریچر کی جملہ آمدنی قرآنی فکر کو عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

مطبع	....	باقر پرنٹنگ پریس، لاہور

سرٹیفیکیٹ تصحیح

انتساب

رسالت مآب خاتم النبیین ﷺ کے نام

جو کافۃ للناس اور رحمۃ للعالمین بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظام عدل وحریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔صداقت جہاں کہیں بھی تھی اُسی کتاب مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمد ﷺ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ نبوی ﷺ میں اتاری گئی۔شامِ جاں نواز نے جہاں کہیں بھی عطر بیزی وعنبر فشانی کی وہ لالہ ویاسمین کی ان ہی پتیوں کی رہینِ منت تھی جن کا گلدستہ اس نبی آخر الزمان ﷺ کے مقدس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی وسماوی کی تیز آندھیوں نے صحنِ کائنات میں اِدھر اُدھر بکھیر دیا تھا۔ اور مقامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی درخشندہ وتابندہ ذراتِ نادرہ کا پیکرِ حُسن وزیبائی جن کی حقیقی آب وتاب کوان کے ستائش گروں کی غلو آمیز عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جو ہر الگ الگ پڑے تھے' یہاں یہ پیکرِ جلال وجمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے' یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب وتاب سے موزوں ہوگئے تھے جو ضمیرِ کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے' یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں' یہ پھول تھا۔ وہ ذرے تھے' یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے' یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے' یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے' یہ ملت تھی۔ وہ نقطے تھے' یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتداء تھی' یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینیؐ انتہا ست

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لیے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادئ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقام بلند تک پہنچنے کے لیے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس واعظم ﷺ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق ' دل بند و راہ مصطفےؐ رو

[معراجِ انسانیت ص ۷۴ از۔ علامہ پرویز رحمۃ اللہ علیہ]

اسوۂ حسنہ

ہمارا ایمان ہے کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے کسی ارشاد یا حضور ﷺ کے کسی عمل کی صداقت سے اِنکار کرتا ہے، ہمارے نزدیک وہ مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا، اِس لیے کہ حضور ﷺ کے ارشادات و اعمالِ حیات سے تو وہ ماڈل ترتیب پاتا ہے جسے خدا نے ''اسوۂ حسنہ'' قرار دیا ہے۔ اِس اسوۂ حسنہ سے انکار، نہ صرف انکارِ رسالت ہے، بلکہ ارشادِ خداوندی سے انکار ہے۔ اس انکار کے بعد، کوئی شخص مسلمان کیسے رہ سکتا ہے؟ اِسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس اسوۂ حسنہ کو خود قرآن میں محفوظ کر دیا ہے۔

[طلوع اسلام۔ اگست ۱۹۸۱ء]

قیصر و کسریٰ کے استبداد اور احبار و رھبان کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت کو آزادی سے ہم کنار کرنے والے قائدِ انسانیت ﷺ تجھ پہ لاکھوں سلام

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا ست
رحمۃ للعالمینی انتہا ست

[محمد اشرف ظفر]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مشمولات سورۃ الاحزاب

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

پہلا باب: **الاحزاب** (پس منظر، سازشیں اور وسوسے)

جنگ احزاب کا پس منظر 35

مسجدِ ضرار کے متعلق قرآنِ حکیم کا حکم 36

سورۃ الاحزاب کی آیات کی تعداد کے متعلق وسوسہ پیدا کرنے کی سازش 36

زنا کی سزا کے متعلق قرآنِ حکیم کے برعکس شریعت کا ایک الگ موقف اور اس کی روئداد 38

خدا کی طرف سے عطا کردہ دین قرآنِ حکیم میں دے دیا گیا جو محفوظ ہے 39

دوسرا باب: **الاحزاب** (آیات 1 تا 6)

احزاب کی شکل میں مدینہ پر کفار کی لشکر کشی اور اس کے اسباب 40

سرمایہ پرستی انسانی صداقت اور حق گوئی کی جرأت کو مفلوج کر دیتی ہے 41

وحی کی روشنی میں نبی اکرم ﷺ کی ذاتی زندگی کے خدوخال 42

بعض مقامات پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی اکرمؐ سے مخاطب ہونے کا مقصد اجتماعی طور پر بھی مخاطب ہونا ہوتا ہے 42

میدانِ جنگ میں مخالفین سے محتاط رہنے کی تلقین 43

حق کی بنا پر اصول پرستی پر قائم رہنا ضد نہیں کہلاتا 44

کفار کی طرف سے مفاہمت کے مطالبہ پر نبی اکرمؐ کا ارشاد 45

قرآنِ حکیم کے علاوہ مثلہ معہ کے عقیدہ کی نوعیت اور قرآنِ حکیم کا چیلنج 45

آج سنیوں اور شیعہ حضرات کے ۱۰ مستند ترین مجموعے 14 لاکھ روایات پر مشتمل ہیں 46

حدیث، قرآن حکیم کی آیات کو منسوخ کر سکتی ہے 46

روایات کے بعد فقہ کے احکام کی نوعیت 46

قرآنِ حکیم نے اپنے لیے تمت کا لفظ استعمال کیا ہے جس کا انسان کو اتباع کرنا ہے 47

قوانینِ خداوندی پر یقینِ کامل کا نام توکّل ہے 49

جنگِ احزاب بڑی ہی تباہ کن اور زلزلہ انگیز جنگ تھی: اس میں پہلی حکمت عملی 49

قرآنِ حکیم کے نزدیک گھریلو زندگی کی اہمیت اور اس کے متعلق ہدایات 49

قرآنِ حکیم کے نزدیک صداقت کا معیار 50

غصے میں بیوی کو ماں کہہ دینے سے وہ ماں نہیں بن جاتی 50

جس جرم میں انسان کے دل کی رضامندی شامل نہ ہو اس کا مواخذہ بھی نہیں ہوتا 51

قرآنِ حکیم نے قتل بالخطا اور قتلِ عمد میں فرق کیا ہے 51
لغویت کو روکنے کے متعلق قرآنِ حکیم کی تعلیم اور حلالے کا فتویٰ 52
یہ کس خدا کا حکم ہے؟ میں اُسے خدا کو نہیں مانتی 53
میں عورتوں کا ہی وکیل نہیں بلکہ ہر مظلوم کا وکیل ہوں: پرویزؒ 53
طلاق کا صحیح طریق 54
1962 کے Family Laws (عائلی قوانین) کی مخالفت 54
یتیم پوتے کو دادے کی وراثت سے بے دخلی کا
فتویٰ اور ہماری شریعت 54
لغویات کہنے پر یہ کفارہ کی ادائیگی میں حکمت 56
کسی دوسرے کو اپنا بیٹا بنا لینے کا ماجرا 58
عربوں کے ہاں کی معاشرتی زندگی کے خدوخال 58
مومنین پر نبی اکرمؐ کا حق کس قدر ہے! 59
نبی اکرم ﷺ کی بیویاں مومنین کی مائیں ہیں 60
جائیداد کی تقسیم کے متعلق وراثت کے حقوق کے لیے
قانون اور وصیت کی اہمیت اور ہمارے فتاویٰ 60

تیسرا باب: **الاحزاب** (آیات 7 تا 21)

کفر اور اسلام کے فرق کو واضح کرنے کے لیے
جنگِ بدر کو قرآنِ حکیم نے یوم الفرقان کہا ہے 63
مومنین کی اِن جنگی فتوحات پر مورخین
انگشت بدنداں بھی تھے اور پریشان بھی 63
اہلِ قریش کی پریشانی کی وجہ 64
دورِ اولیٰ میں ملوکیت، نظامِ سرمایہ داری اور مذہبی
پیشوائیت کا دور دورہ تھا جن پر اسلام نے فتح حاصل کی 64
عربی زبان میں ''فتح'' کے معنی اور یہودیوں کی منافقت 65
خدا تعالیٰ نے انبیائے کرامؑ سے بھی عہد لیا تھا 66
جنگِ احزاب کے سلسلہ میں قرآن حکیم کا ادبی انداز 67
مہینہ بھر پندرہ بیس ہزار کا محاصرہ، خورد و نوش کی قلت،
باہر سے پتھراؤ، تیروں کی بوچھاڑ اور اندر سے یہودیوں کی سازش 68
جنگ کے دوران آندھی کے جھکڑ اور بارش نے
میدانِ جنگ کا پاسا پلٹ دیا 68
جنگِ احزاب میں ملائکہ کے نزول کا تصور اور اس کی حقیقت 68
1965ء کی پاک بھارت جنگ میں پاک فوج
کے جرأت مندانہ کارنامے اور ہماری غلط نگہی کے افسانے 69
خدا تعالیٰ کی طرف سے مدد کا انداز 70
خدا اور اس کے فرشتوں کی طرف سے مجاہدین پر
تحسین و آفرین کی گُل پاشی 70
قرآنِ حکیم نے اپنے ہاں مجاہدین کے عمل کا تو ذکر کیا
ہے، سبز عماموں کا کہیں ذکر نہیں کیا 71
ہمارے ہاں کلمہ پڑھنے کی صورت اور شفاعت کا غلط تصور 72
ہمارے ہاں کی غلط روایات کے برعکس جنت کے
حصول کے لیے قرآنِ حکیم کا ارشاد 72
تزاحمات اور تصادمات کے گھنے جنگل کو عبور کیے بغیر
جنت کا حصول ممکن نہیں ہوتا 73
جنت جیسی عظیم نعمت کا حصول کاسۂ گدائی کے ذریعے ممکن نہیں ہوتا 74
قرآنِ حکیم کے مطابق جنت تو مومنین کا مسکن ہے،
ہم جیسے گداگروں کا نہیں 74
انسان کے لیے پہلا مرحلہ میثاق کا ہے پھر صلاحیتوں
کی نشوونما کا اور پھر عمل کے بعد حصولِ نتائج کا 76

نبی اکرمؐ کی طرف سے جوہرِ کامل کے چناؤ کا مرحلہ 76
قرآنی اقدار انسانی جوہروں کو جلا بخش دیتی ہیں‘
انہیں بڑا بنا دیتی ہیں 77
انسان کی اپنی نفسیات ہی اس کا اپنا معیار متعین کرتی ہیں 77
قرآنِ حکیم کے نزدیک سب سے خطرناک شے
وسوسہ اندازی ہوتی ہے 78
جنگ کے دوران بعض لوگوں کا کردار جن سے
محتاط رہنے کے لیے وحی نازل ہوئی 78
جنگ بدر میں نبی اکرم ﷺ کی زبان مبارک سے رقت انگیز دعا 79
شفاعت کے معنی سفارش کرنا نہیں بلکہ کسی کے ساتھ
کھڑے ہونے کے ہیں 79
کوئی شخص بھی موت سے بچنے کی یقین دہانی نہیں کرا سکتا 80
منافقت کی زندگی کا ایک ایک لمحہ بڑا پریشان کن ہوتا ہے 81
اسلام کی شان وشوکت کو دیکھ کر ایمان لانے والوں
کے متعلق قرآنِ حکیم کا ارشاد 81
میدانِ جنگ سے بھاگنے والوں کو نمازوں کا ثواب نہیں ملا کرتا ہے 82
اعتراض کسی کی نماز پر نہیں‘ افسوس تو صلوٰۃ کی روح کے فقدان کا ہے 83
روشنی کے مینار کی طرح ایک شخصیتؐ میدان جنگ
میں پہاڑ کی طرح اپنے مقام پر کھڑی تھی 83
نبی اکرمؐ کی ساری زندگی نوع انسانی کے لیے اسوۂ حسنہ ہے 84
انسانی رہنمائی کے لیے نظری تعلیم ہی کافی نہیں ہوتی
نقوشِ قدم بھی انسان کو متاثر کرتے ہیں 84
اڑھائی سو سال کے بعد اسوۂ حسنہ پر لکھی گئی کتب کی علمی نوعیت 84
اسوۂ حسنہ کے سلسلہ میں کعب بن اشرف کا قصہ:
آپ ﷺ کی طرف سے جھوٹ بولنے کی اجازت (معاذ اللہ) 85
نبی اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ کے مسائل کو قرآن حکیم
نے اپنے ہاں محفوظ کر رکھا ہے 85
قرآنِ حکیم کی روشنی میں اسوۂ حسنہ پر پرویزؒ کی طرف
سے لکھی گئی سیرت کی کتاب: معراج انسانیت 86

چوتھا باب: **الاحزاب** (آیات 22 تا 34)

استخلاف فی الارض کے بغیر خدا کی طرف سے عطا
کردہ نظام حیات یا دین کا نفاذ ہو ہی نہیں سکتا 88
میدانِ جنگ تو انسان کے ایمان کا ٹیسٹ ہوتا ہے 88
اہلِ ایمان کے لیے تصادمات کی گرفت ان کے
ایمان کو اور زیادہ مستحکم کر دیتی ہے 89
خدا تعالیٰ کی طرف سے ایمان کا صلہ ایمان کے
ٹیسٹ ہونے پر ہی ملتا ہے 90
اپنی کوتاہیوں پر نادم ہونے والوں کا معاملہ 91
جنگِ احزاب میں انتقام لینے والے خود اپنی انتقامی
آگ میں ہی جھلس کر رہ گئے 92
خدا تعالیٰ کی قوت‘ اس کے اقتدار یا اس کے غلبہ سے مراد
‘اس کے وہ قوانین ہیں جن کے تابع یہ کائنات سرگرمِ عمل ہے 92
خدا تعالیٰ کی یہ صفات تو حدودِ بشریت میں ایک مومن
کے اندر منعکس ہوتی ہیں 93
مدینے کی حفاظت کے سلسلہ میں یہودیوں کا جنگ کے
دوران معاہدے سے انحراف اور اس کا انجام 93
جنگِ خیبر کے بعد حضرت عمرؓ کے دور میں یہودیوں کو
جزیرۃ العرب سے ہی باہر نکال دیا گیا 94

مسلمانوں کوسب سے زیادہ نقصان یہودیوں سے
ہی پہنچا ہے، جنگ احزاب کا اختتام اور دین کی فتح 94
پاکستان کے مطالبہ پر مخالفین کا اعتراض اور اس کا جواب 95
تحریکِ پاکستان کے سلسلہ میں قائد اعظمؒ کے ساتھ 95
علامہ پرویزؒ کی رفاقت: 1937ء میں قائد کے ساتھ پہلی ملاقات 95
فتح مکہ کے بعد مسلمانوں کے لیے فتوحات کے دروازے کھل گئے 96
قرآنِ کریم جیسی عظیم المرتبت، واضح، روشن اور لاریب
کتاب کے متعلق بے ربط ہونے کا تصور غلط ہے 97
گھریلو زندگی کی اہمیت 98
کائنات کا نظم ونسق کیوں بخوبی چل رہا ہے؟
مرزا غالب کا مزاحیہ اندازِ بیان 98
انسان کی جنّتی زندگی گھر سے شروع ہوتی ہے 99
تاریخی طور پر حضور نبی اکرمؐ کے ہاں گیارہ بیویوں
کا ذکر ہے۔ یہ کیوں؟ 99
عربی زبان میں وہ عورت جس کا شوہر ہی نہ مل رہا ہو
اور وہ شادی کے قابل ہو وہ یتیم کہلائے گی 100
25 سال کی عمر میں حضورؐ کی پہلی شادی
چالیس سالہ حضرت خدیجہ الکبریٰؓ سے ہوئی 100
عملی طور پر نبی اکرمؐ کی زندگی بڑی عسرت کی زندگی تھی 101
سربراہِ مملکت کی معاشی زندگی 101
حضرت ابوبکرؓ کی خلافت حضرت عمر فاروقؓ کی زندگی 102
نبی اکرمؐ کا سربراہ مملکت کی حیثیت سے
حضرت فاطمہؓ کی خواہش پوری کرنے سے انکار 103
بات تو نصب العین کی تھی نہ کہ معاشی حالات کی 103
دنیا بھر کی کامیابیوں کا راز گھریلو زندگی کے سکون میں تھا 104
نبوت کے گھرانے کی زندگی کے خدوخال
پورے معاشرے کو متاثر کرتے ہیں 104
حضور نبی اکرمؐ کی زندگی بھر کے خدوخال اور
سیرت وکردار نوعِ انسانی کے لیے اسوۂ حسنہ ہیں 105
اصل میں حقیقی جوہر تو کسی چیز کو بطیّب خاطر قبول کرنا ہوتا ہے 105
سونے چاندی کے معیار کی بجائے عزت وتکریم کا
معیار، رزق کریم کا معیار 106
غیر مردوں سے بات کرنے کا معیار یا طریق
سنجیدہ ہونا چاہیے جیسے باوقار ماں بیٹے سے بات کرتی ہے 106
نمودِ حسن کا جذبہ انسان کے دل میں جذبات کا ہیجان پیدا کرتا ہے 107
زندگی کی آماجگاہ میں مرد اور عورت دونوں کا یکساں مقام ہے 108
قدرت نے عورت کو مرد کے لیے کوئی کھلونا نہیں بنایا'
یہ مردوں کا کوئی بہلاوا نہیں ہے 109
قرآنِ حکیم کی نظر میں عورت کا مقام 109
زکوٰۃ کا مروجہ مفہوم تو سنت رسول پر پورا ہی نہیں اترتا 110
ازواج النبیؐ کے بعد نسآء النبی کو ''رجس''، یعنی
شکوک وشبہات سے دُور رہنے کا حکم 110
تطہیر کا مفہوم قلب ونگاہ کی پاکیزگی ہوتا ہے 111

پانچواں باب: **الاحزاب** (آیات 35 تا 42)

باہر کی زندگی گھر کی زندگی کا عکس ہوتی ہے 112
نمائش اور زیبائش میں ایک بنیادی فرق ہے 113
عورت کا مردوں کی نظروں میں جاذب بننے کا تصور
جہالت پر مبنی ہے 113

قرآنِ حکیم میں مذکر اور مونث صیغوں کے استعمال
کا طریق اور عربی زبان کی خصوصیت 114
قرآنِ حکیم کی روشنی میں مسلمان اور مومن میں فرق کی نوعیت 115
مومن مرد اور مومن عورتوں کی بنیادی خصوصیات
اور عورت کے مقام کا تعین 115
کیا عورت امورِ مملکت میں حصہ لے سکتی ہے؟ 116
اسلامی مملکت میں اطاعت کسی فرد کی نہیں ہوتی
بلکہ صرف خدا کے قانون کی ہوتی ہے 118
اسلامی نظام میں ہر فرد کی حیثیت برابر ہوگی 119
اسلامی مملکت میں ذمیوں کے ساتھ روابط کی وضاحت 119
مومنین کے لیے ضوابط 119
مرتد کی سزا موت نہیں 120
مومن اور مسلم میں فرق 121
اسلامی مملکت میں کوئی شخص اپنی اطاعت کرا ہی نہیں سکتا 122
اطاعت کے سلسلہ میں حضرت زیدؓ بن حارث کی مثال 123
غلام سے بیٹے کا درجہ اور پھر داماد اور داماد کے بعد طلاق 123
طلاق کے سلسلہ میں نبی اکرم ﷺ کے مشورے
سے انکار کے باوجود ان کا حسنِ سلوک 124
حضرت زیدؓ کے واقعہ کی اہمیت کیوں؟ 125
حضرت زیدؓ کے دل میں پیدا ہونے والا خوف 126
بیٹے کی بیوی سے شادی کا قصہ: منہ بولا بیٹا نہیں ہوتا 126
تاریخ میں بریرہ نامی ایک لونڈی کا واقعہ 128
قرآنی معاشرے میں آزادیٔ رائے کے احترام کی اہمیت 128
کسی کا بیٹا ہونے کی حیثیت سے نبی اکرم کے
متعلق قرآن حکیم کی وضاحت 130
خاتم النبیین کے سلسلہ میں زبیر اور زبر کا قصہ نیز احمدی
اور غیر احمدی کے سلسلہ میں بہاولپور کا مقدمہ 130
کیا ختمِ نبوت کے بعد قرآنی نظام کا خاتمہ ہو جائے گا؟ 132
چھٹا باب: **الاحزاب** (آیات 41 تا 44: درود شریف کا مفہوم)
مذہب اور دین میں ایک بنیادی فرق ہے 134
نماز، حج، زکوٰۃ کے سلسلہ میں پرویزؒ کا مسلک 134
فرقہ اہل قرآن سے میری مخالفت کی وجہ 135
میری مخالفت کرنے والوں سے میری گزارش: پرویزؒ 135
درود کے تصور، اس کے احترام اور مقام کی وضاحت
کے علاوہ، اس کا قرآنی مفہوم 137
درود کا مفہوم 138
درود کا لفظ قرآن کریم میں نہیں آیا اور نہ ہی یہ عربی کا لفظ ہے 139
قرآنی مفہوم کو بدلنے کے سلسلہ میں قرآن حکیم
کی اصطلاحات کے خلاف ایک گہری سازش 140
قرآنِ حکیم کو بغیر سوچے سمجھے پڑھنے کی گہری سازش 140
قرآنِ حکیم نوعِ انسانی کے لیے اپنے اندر ایک
عظیم انقلابی پروگرام لیے ہوئے ہے 141
''کرو'' کی بجائے ''پڑھو'' کے ترجمہ نے ملتِ اسلامیہ
کی سوچ کا رخ ہی بدل دیا 142
خدا تعالیٰ اور اس کے فرشتوں کی طرف سے
مجاہدین کے لیے تحسینی جذبات کے اظہار کی تلقین 142
خدا تعالیٰ کسی کی آزمائش نہیں کرتا بلکہ انسان نے
اپنے آپ کو آزمانا ہوتا ہے 144

صلوٰت بھیجنے کا قرآنی مفہوم 144
وحی خداوندی انسانیت کوظلمات سے نور کی طرف لے جاتی ہے 145
تاریکیوں سے نور کی منزل سے متعارف کرنے کا مفہوم 146
مومنوں کے لیے نعمائے خداوندی کے حصول کو خدا تعالیٰ
نے اپنے ہاں مشروط کر رکھا ہے 146
خدا کی مدد سے مراد خدا کے عطا کردہ نظام کو عملاً متشکل کرنا ہے 146
میدانِ جنگ میں ثابت قدم رہنے والوں کی مدد کرنا
خدا کی ذمہ داری قرار پاتی ہے 147
صحابہ کبارؓ کا مرتبہ 148
نبی علیہ السلام کے پروگرام کی تکمیل کی خاطر خدا
اور صحابہ کبارؓ کی رفاقت 148
رسول ﷺ کی عظمت کو قائم رکھنے کا طریق 149
فتوحات کے ثمرات کو دوام بخشنے کی خاطر پہلے
سے زیادہ تگ و تار سے کام لینا ہوتا ہے 150
نبی کا فریضہ صرف وعظ کرنا ہی نہیں تھا بلکہ ایک نظام کی تشکیل بھی تھا 151
اللہ تعالیٰ کی بذات خود ذات اور ملائکہ مومنین کے میزبان ہوں گے 152

ساتواں باب: **الاحزاب** (آیات 45 تا 50)

ختمِ نبوت کے بعد آپؐ کے متبعین کا فریضہ اور
پھر اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کا رتبہ 154
قرآن حکیم کے ہاں قوموں کی موت وحیات کی
کیفیت کو بیان کرنے کا انداز اور ہر ایک کا فریضہ 156
انسانی نظامِ حیات کے گرد پیدا کردہ تاریکیوں
کے جال سے نکلنے کا طریق اور مومنین کی ذمہ داری 157
تاریک راہوں کا طویل سفر آخر کار انسانی
نفسیات کو زنگ آلود کر دیتا ہے 157
زندگی کی ان تاریک راہوں کو دوام بخشنے والوں کی تکنیکی کوشش کا ذکر 158
تاریکیوں کے اس دور میں مومنین کا فریضۂ حیات 159
روشنی کے چراغ خود ہی بجھا دینے والے کو روشنی
کی افادیت سے کوئی روشناس نہیں کر سکتا 159
سوچنے کی یا عقل وشعور کی صلاحیتوں کے سلب
ہو جانے سے انسان اندھا ہو جاتا ہے 160
مقامِ نبوت، مقام رسالت، سنّتِ رسول 160
ملتِ ابراہیمی کا فریضہ یہ تھا کہ وہ فکرِ قرآنی کی روشنی
سے اس کرّہ ارض کو منور کر دے 161
آسمانی انقلاب ہر قسم کی تاریکیوں کے لیے سامان موت ہے 162
خلفائے راشدینؓ کے دور کے بعد ہی روشنی کا
یہ مینار نظروں سے اوجھل ہونا شروع ہو گیا تھا 163
اس بین الاقوامی امت کا فریضہ اقوام عالم کے
اعمال کی نگرانی کرنا ہے 164
علم وبصیرت سے بھٹکے ہوئے راہی کو صحیح راستے
کی طرف راغب کرنے والی امت 164
اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم کو سراجاً منیراً کہا ہے 165
جو قوم بھی قرآنِ حکیم کو پسِ پشت رکھے گی،
اس کا مستقبل ہمیشہ تاریک رہے گا 166
چودہ سو سال پہلے کے انکشافات 166
قرآنِ حکیم اپنے مفہوم کو از خود بیان کرنے کے لیے کافی ہے 167
اہلِ تصوف کے بالمقابل مقامِ نبوت کا فریضہ 168
قدم قدم پر منافقین اور کفار کی محتاج قوم کی حالتِ زار 169

حق کی خاطر دنیا بھر کی دشمنی 169

معاشرتی طور پر ازدواجی زندگی کی اہمیت 170

میاں بیوی کے مابین نکاح کے معاہدہ کی نوعیت

اور ہمارے ہاں کے فقہی قوانین کی شکل وصورت 171

مصالحتی کوشش کے لیے ایک بورڈ کی تشکیل

اور رائج الوقت قانون کی نوعیت 171

عائلی قوانین کے سلسلہ میں رائج وقت قانون کی مخالفت 172

قرآنِ حکیم کے نزدیک ازدواجی زندگی کا ضابطۂ حیات 173

عائلی زندگی کے سلسلہ میں نبی اکرمؐ کے متعلق ایک خاص شرط کا اضافہ 174

ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت جن حالات میں دی گئی 175

عورتوں کا ''یتیم عورتوں'' سے سلوک 176

آٹھواں باب: **الاحزاب** (آیات 50 تا 71)

تجدید یادداشت 178

نکاح نامے کے فارم پر ''خفتم'' کے الفاظ محذوف کر دیئے جاتے ہیں

چار چار شادیوں کی گنجائش نکالنے کی خاطر عائلی 180

قوانین کو ختم کروانے کی کوشش 180

ہجرت کے دوران مکہ مدینہ میں پیدا ہونے والے خاندانی حالات

شادی کے سلسلہ میں نبی اکرمؐ کے متعلق خصوصی 181

احکام اور آپ کی عملی زندگی 182

حضرت زیدؓ نبوت کے گھرانے کا فرد بن گیا 183

آپ ﷺ کو مزید کسی شادی سے ممانعت کا حکم 184

ظہورِ اسلام کے وقت عربوں کی معاشرتی زندگی

اور حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے وقت خود انؓ کی اپنی کیفیت 185

وحی کی طرف سے دنیا بھر کے انسانوں کے لیے

معاشرتی آداب اور ان کی اہمیت 185

اس قسم کی معاشرتی عادات سے خدا کے نبیؐ کی ذہنی کیفیت 187

معاشرتی آداب کے سلسلہ میں خدا سچی بات کہنے

سے بالکل نہیں شرماتا 188

وحی کی طرف سے ملنے والی معاشرتی ہدایات کی

اہمیت کے پیش نظر قرآنِ حکیم کا ارشاد 189

قرآنِ حکیم نے زینت کی چیزوں کو حرام قرار دینے

کی بجائے ان کا مقام متعین کیا ہے 190

قرآنِ حکیم کے نزدیک پردے کی وضاحت

اور عورت کی معاشرتی حیثیت 190

حضورِ اکرم ﷺ کی اہل خانہ خواتین کے لیے خاص ہدایات 190

جنسیاتی طور پر اُبھرنے والے جذبہ محرکہ کا

دارومدار انسان کے اپنے تصورات پر منحصر ہے 191

درود کا لفظ عربی کا نہیں بلکہ فارسی زبان کا ہے

جو مجوسیوں کے ہاں رائج تھا 191

درود کا مفہوم: اللہ تعالیٰ کی طرف سے

عطا کردہ پروگرام کی تکمیل کے لیے ہر آن کوشاں رہنا 192

اللہ اور رسول کے اکٹھے الفاظ کے معنی ''نظام خداوندی'' ہوتا ہے 193

قانونِ خداوندی کی نظر میں تہمت تراشی سنگین ترین جرم ہے 193

قرآنِ حکیم کے نزدیک سب سے خطرناک عنصر وسوسہ اندازی ہے 194

نبی اکرمؐ کے گھرانے کے علاوہ مومن

عورتوں کے لیے چوغہ Overall پہن لینے کا حکم کیوں؟ 194

احتیاطی تدابیر کے باوجود اگر فتنہ پرور باز نہ آئیں تو پھر ان کی سزا 195

شریف عورتوں کی حفاظت کا ذمہ خدا تعالیٰ نے اپنے اوپر لے رکھا ہے 195

الساعۃ کا لفظ صرف قیامت کے لیے ہی مخصوص نہیں ہے 196

تشبیہات کی شکل میں جہنم میں لیڈروں اور عوام
کا باہمی مکالمہ بازی کا منظر 197
قرآنِ حکیم نے اپنے ہاں بنی اسرائیل کا تذکرہ
بڑی تفصیل سے کیا ہے 198
حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق بخاری شریف کی ایک روایت 199
قول و فعل کے سلسلہ میں مومنین کے لیے
قرآن حکیم کی راہ نمائی اور اس کا ثمر 199
مذاہبِ عالم میں حسنِ عمل کا ماحصل صرف نجات کا ہی تصور ہے 200

نواں باب: الاحزاب (آیات 72 تا اختتام)

''کائنات کی ہر شے خدا کی طرف سے پیش کردہ
امانت اٹھانے سے انکاری تھی'' غلط ہے 202
کائنات کی کوئی قوت بھی خدا کے کسی حکم کو تسلیم کرنے
سے انکار نہیں کر سکتی: 202
انسان نے اس امانت کو اٹھالیا اور پھر ظالم بھی بنا اور جاہل بھی کہلایا 204
دل میں پیدا ہونے والی ایک کسک' اس کسک کا
علاج ''تتفکرون'' میں ہے 204
دروسِ قرآنی کی اہمیت کے پیش نظر انہیں محفوظ
کرنا نہایت ضروری ہے 205
لفظ امانت کا لغوی اور قرآنی مفہوم 205
اللہ پر ایمان کا حقیقی مفہوم 206
عربوں کے ہاں عروۃ الوثقیٰ کا اور یومن باللہ کا مفہوم 207
عربی زبان کی وسعت اور ابو الفضل فیضی کی
قرآنی تفسیر بغیر کسی نقطہ کے 209
امانت کے بالمقابل خیانت کا مفہوم 209
اگر کوئی قانون ہی عدل پر مبنی نہ ہو تو کوئی
فیصلہ بھی پھر عدل پر مبنی نہیں کہلا سکتا 210
لفظ امانت کا تفصیلی اور متعین قرآنی مفہوم اور اس کے راستے
میں حائل ہونے والی خطرناک گھاٹیوں کی نشاندہی 211
انسانوں کے علاوہ خارجی کائنات یعنی ارض و سماوات کے سپرد فرائض 212
کائنات کی کوئی شے اپنے فرائض کی بجا آوری میں ذرا خیانت نہیں کرتی 213
کائنات کی کوئی شے فرائض کی ادائیگی میں نہ
تھکتی ہے اور نہ ہی سرکشی اختیار کرتی ہے 214
مظاہرِ فطرت اگر اپنے فرائض میں تساہل برتتے
یا انکار کرتے تو یہ کائنات وجود میں ہی نہ آتی 215
کائنات کی ان قوتوں کے حسنِ عمل کے برعکس حضرت انسان
کی حالت اور ہمارے ہاں کی تفاسیر اور قرآنی تراجم کی نوعیت 215
مجھے نہ الہام ہوتا ہے' نہ کوئی وحی آتی ہے: پرویزؒ 216
حملِ امانت' امانت میں خیانت کرنے کو کہتے ہیں 216
ہر ظالم اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے: اس کی صلاحیتیں ہی سلب ہو جاتی ہیں 217
وحی کی راہنمائی انسانی صلاحیتوں کو جلا بخشتی ہے 217
عہد کی اہمیت کو نظر انداز کرنا اپنی ذات سے خیانت کرنا ہے 218
بدعہدی سے انسان Self Confidence (خود اعتمادی)
کی نعمت سے محروم ہو جاتا ہے 218
انسان کی اپنی ذات کے متعلق نیٹشے کا ایک قول 219
اپنی ذات سے خیانت کرنے والا قرآنِ حکیم
کی نظر میں منافق ہے' مشرک ہے 220
سفرِ زندگی میں کسی لغزش یا تساہل کے احساس
کی شکل میں خدا کا قانون انسان کے ساتھ ہوتا ہے 220

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مشمولات سورۂ السبا

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

باب: سورۃ سبا (آیات 1 تا 5)

حضرت انسان کے علاوہ کائنات کی کوئی شے بھی خدا کی طرف سے مقرر کردہ قانون سے سرتابی اختیار نہیں کرتی 225

اس پوری کائنات کا ذرہ ذرہ حمدیت کا مظہر ہے 227

میرا ایک ذاتی واقعہ جس سے مجھے دوبارہ زندگی ملی: پرویزؒ 227

انسانی زندگی میں مہلت کا وقفہ بھی ایک نعمت ہے 228

ظلم کے مقابلے میں، کسی تعمیری پروگرام کی تکمیل کی خاطر، استقامت ہمیشہ ثمر بار ثابت ہوتی ہے 229

خدا تعالیٰ کی طرف سے ملنے والا پروگرام الحمد فی الاخرۃ Trial & Error (سعی وخطا) کی خامیوں سے ہمیشہ مبرا ہوتا ہے 230

عدمِ استقامت کا عمل خیر کو شر میں بدلنے کا موجب بن جاتا ہے 231

سمندر کے کڑوے پانی کو خیر ثابت کرنے کے لیے زمین سے تیرہ لاکھ گنا بڑے سورج کی تخلیق 231

سورج عملِ خیر کی تکمیل کی خاطر استقامت کے عمل کو پوری دل جمعی سے اپنائے ہوئے ہے 232

انسان کی اخلاقی، تمدنی، معاشرتی اور معاشی موت مفادِ عاجلہ کی بنا پر واقع ہوتی ہے 233

خدا کا قانون انسان کی طعن آمیزی کے باعث جذباتی نہیں ہوتا، خدا تعالیٰ کی ذات بڑی حکیم ہے 234

خدا کی ذات کائنات کے ذرے ذرے کی مالک ہوتے ہوئے غفور بھی ہے اور عدل واحسان کی حامل بھی 235

انسانی اعمال کے سلسلہ میں آج کی سائیکالوجی (نفسیات) کی تحقیق 235

ظہورِ نتائج کے وقت نفسِ شعوری اور نفسِ غیر شعوری میں تکرار کا نتیجہ 236

انسان کا اعمال نامہ اس کی گردن میں Unconscious Mind (نفسِ غیر شعوریہ) کی شکل میں لپٹا ہوا ہوتا ہے 237

قرآنِ حکیم کے پیش کردہ نظامِ حیات کا ماحصل اور اس کی نوعیت 237

رزق کریم کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ لینے والا کسی قسم کی سبکی تک محسوس نہ کرے 238

خیرات سے دل کی موت ہوتی ہے اس لیے خدا نے رزق کو شخصیتوں سے بالاتر رکھا ہے: آپ ﷺ کا فرمان 239

دنیائے انسانیت میں سب سے مقدم شے احترامِ آدمیت ہے 240

قرآنِ حکیم کے مروجہ تراجم نے قرآنی حقائق کو مکمل طور پر نظروں سے اوجھل کر دیا ہے 241
قرآنِ حکیم کے لفظ نذیر اور مدثر کا قرآنی مفہوم 242
لفظِ قم کی عظمت اور پھر حضور ﷺ کی عملی زندگی کے نقوشِ قدم 242
بزبان اقبالؒ خدا تعالیٰ کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کی اور اہلِ تصوف کی رفاقت کے بنیادی فرق کی وضاحت 243
علامہ اقبالؒ کے چھٹے لیکچر کا ایک پُر معنی اقتباس 244
نبی کی ذات کو لفظِ قم کی روشنی میں، انسانی دنیا کے اندر ایک انقلاب برپا کرنا ہوتا ہے 245
رَبَّکَ فَکَبِّرۡ کی عملی تفسیر اور عالم گیر سطح پر کبریائی کا مفہوم: نظامِ ربوبیت کا قیام ہے 245
ثِیَابَکَ فَطَھِّرۡ اور مزمل کا قرآنی مفہوم 246
لفظ رجز کا قرآنی مفہوم 246
نظامِ ربوبیت کے لیے ایسی جماعت تشکیل دینا جس کے دل میں دوسروں سے تعریف کروانے کا جذبہ بھی پیدا نہ ہو 247
غار کے اندر حضرت جبریل کی حضور ﷺ کی خدمت میں پیش آوری کا قصہ 248
قرآنِ حکیم کے معنی تو ''ایک منشور کا اعلان کرنے'' کے ہوتے ہیں یعنی نظامِ ربوبیت کا اعلان پوری نوع انسانی کے لیے 250
لفظِ رکعت کا قرآنی مفہوم: خدا کے قانون کے سامنے جھک جانا 249
قَدۡ قَامَتِ الصَّلٰوۃُ کا قرآنی مفہوم 250

دوسرا باب: **سورۃ سبا** (آیات 6 تا 13)

وحی کی طرف سے ملنے والے علم کے نتائج ایک نظام کے تحت ظہور پذیر ہوتے ہیں جو ایک حقیقت ہے 251
لفظ کلمہ کے معنی نظریہ حیات کے ہیں 252
قرآنی نظام میں اقتدار اور حکمرانی کی بنیادی پہچان: عزیز کے ساتھ حمید کی صفت لازم ہے 253
مکافاتِ عمل کے تابع لادینی نظام کا حشر اور جوئے رواں زندگی کے تصور کا ماحصل 253
مسلمان ہونے کے باوجود دنیا بھر میں مسلمانوں کی اس قدر زبوں حالی کی وجہ جواز 254
قرآنِ حکیم کی پوری تعلیم کا نقطہ ماسکہ مکافاتِ عمل کا تصور اور آخرت پہ ایمان ہے 255
خزاں کے بعد حیاتِ جدید (بہار) موت کے بعد کی زندگی کا زندہ ثبوت ہے 256
ہر آن کروڑوں کی تعداد میں دنیائے افلاک کے دامن سے ٹوٹنے والے شہابِ ثاقب اور تختِ محفوظ 256
بنی اسرائیل کی داستانِ غم میں سے شوکتِ داؤدی اور سطوتِ سلیمانی کا ظہور 257
روایات میں حضرت داؤدؑ کی دست کاری کا بیان: لوہے کو ہاتھ میں لیتے ہی وہ موم ہو جاتا تھا 258
انبیائے کرامؑ کو کتاب کے ساتھ مملکت وحکمت بھی یعنی بصیرت بھی عطا ہوتی تھی 259

قوت کے ساتھ بصیرت نہ ہوتو باقی سارے کا
سارا فریب رہ جاتا ہے 260
عربی زبان میں جبال بڑے بڑے سرداروں کو بھی کہا جاتا ہے 260
گھوڑوں کو پالنے والا قبیلہ جسے طیر کہا جاتا تھا 261
نبیؑ کی مملکت وقوت اور چنگیزی کی حکمرانی میں فرق
صرف حکمت کا ہی ہوتا ہے 262
انسانوں کی قائم کردہ سیاسی مملکت کے برعکس
قرآنی مملکت اور قرآنی آئین کا امتیاز 262
خارجی کائنات میں تو خدا کی حکمرانی لیکن
انسانوں کی دنیا میں انسان پر انسان کی حکومت 263
یہودیت کی کتابوں میں حضرت داؤدؑ کے متعلق
حیا سوز قصے جو کتبِ احادیث میں راہ پا چکے ہیں 263
مودودی مرحوم کے نزدیک اس واقعہ کی تصویر کشی
تفہیم القرآن میں کچھ یوں ہے 264
خدا کی حکومت میں خدا کے نبی کا یہ کیریکٹر (معاذ اللہ)!!! 265
مودودیؒ کی نظروں میں مقامِ نبوت 266
ذاتِ خداوندی انبیائے کرام سے خود بھی ایک دو لغزشیں
کرواتی ہے (العجب اور معاذ اللہ) 267
نبی سے غلطی خود خدا کرواتا ہے اور پھر معافی بھی
نبی سے منگواتا ہے (معاذ اللہ) 267
نوجوان نسل سب سے زیادہ متنفر ان تفسیروں سے ہوئی ہے 268
قرآنِ حکیم کی روشنی میں حضرت داؤدؑ کے اس
بیان کردہ واقعہ کی اصل حقیقت 268
یہودیوں نے نظام سرمایہ داری کے میدان میں
ہمیشہ فتح حاصل کی ہے 270
آخر کار حضرت داؤدؑ اس مقدمہ کو سر کرنے میں کامیاب ہو گئے 271
کاروباری شراکت میں بڑا فریق چھوٹے فریق پر
ہمیشہ غالب آنے کی فکر میں رہتا ہے 271
حضرت سلیمانؑ کے پرشکوہ عہد کے متعلق ہمارے ہاں کے تفسیری قصے 272
اندھی تقلید دراصل عقیدت مندی کا وہ بندھن ہوتا ہے
جسے توڑنا آسان نہیں 272
اہلِ عرب کے ہاں جن وانس کی نوعیت
اور حضرت سلیمانؑ کا ان کے ساتھ واسطہ 273
تصویر کشی کو حرام کہنے کے باوجود تصویر کھنچوانے
کے عمل پر اعتراض کا جواب 274
حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں جو مجسمہ سازی
حلال تھی، وہ حضور کے زمانے سے حرام قرار دے دی گئی 274

تیسرا باب: **سورة سبا** (آیات 14 تا 21)

یہودیوں کی تورات کی تفسیر، تالمود کے بیان کردہ اکثر
افسانے، ہمارے ہاں کی تفسیروں میں راہ پا گئے 277
ہمارے ہاں کے ان افسانوں نے حضرت سلیمان کو (معاذ اللہ)
جادوگر بنا رکھا ہے 278
ایک ضابطۂ حیات کے ناطے سے قرآنِ حکیم نوعِ انسانی
کے لیے ایک بے مثل کتاب ہے 278

اسم اعظم کے قصوں نے قندیل آسمانی کو (معاذ اللہ)	
منتر کی کتاب بنا رکھا ہے	279
حضرت سلیمانؑ کے متعلق اسمِ اعظم والی انگوٹھی کے تاثر پر مبنی کہانیاں	279
تورات کی رو سے اس بیان کے بعد ہمارے ہاں	
آپؑ کی بیوی کے متعلق مزید اضافہ بھی ہے	280
ہمارے ہاں کی تفسیروں میں حضرت سلیمانؑ کی موت کی کہانی کا بیان	281
حضرت سلیمانؑ کے بعد آپ کی اس سلطنت کے زوال کی روئداد	282
سلطنتِ سلیمانی کے جانشین حضرت سلیمانؑ کے	
بیٹے کے متعلق قرآنِ حکیم کا بیان	282
آفاق کے پردوں میں چھپا ہوا ایک ایک راز آخر کار	
بتدریج حقیقت بن کر سامنے آجائے گا	283
کائناتی رموز کو مسخر کیے بغیر کوئی قوم محتاجی کی لعنت سے	
چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتی	283
تباہ شدہ قوموں کی بستیوں کے کھنڈرات کو نگاہِ بصیرت	
سے پڑھنے کی ضرورت ہے	284
تصوف کی دنیا میں سیروا فی الارض کا عملی طریق	284
قرآنِ کریم کی حامل قوم کے حوالے سے کائنات کو مسخر	
کرنے کے برعکس آسمانوں کے متعلق ہماری علمی سطح	285
آج فلسطین کے علاقوں کے کھنڈرات کی کھدائی منہ بولتی	
داستانیں ہیں	286
قرآنِ حکیم کے سلسلہ میں عربی زبان کی اہمیت اور اس کا انداز	286
الفاظ کا مجازی مفہوم، زبان کی ذہنیت متصور ہوتا ہے	287
قرآنِ حکیم کو سمجھنے کا طریق	287
عربی زبان کے مرادفات کا کوئی زبان مقابلہ نہیں کر سکتی،	
فیضی کی لکھی ہوئی قرآنی تفسیر بغیر کسی نقطہ کے موجود ہے	288
حضرت سلیمانؑ کے جانشین بیٹے کے تخت و تاج کی،	
حکمرانی کی، حالت زار	288
روایات کے مطابق حضرت سلیمانؑ کا یہ بیٹا ایسا نالائق کیوں نکلا؟	289
ملکہ سبا کا قصہ	290
قرآنِ حکیم کے الفاظ میں ایک کامیاب حکومت کا نشان	
یہ ہے کہ ''مملکت سرسبز و شادادت'' ہو اور خدا کی حفاظت میں ہو'	290
خبیث کے معنی جو درخت پھل نہ دے اور لفظ مغفرت	
کے معنی بخشنے والا نہیں بلکہ حفاظت کرنے کے ہوتے ہیں	291
مملکتوں کی حقیقی حفاظت وہاں کے باسیوں کے قلبی سکون اور	
راحت سے مشروط ہوتی ہے جس کا اصل محور قرآنی اقدار ہیں	292
دوسروں کی زمین ہتھیانے کی بھوک اور دور دراز چلے	
جانے کی ہوس کا دوسرا نام استعماریت ہے	292
استعماریت کا نتیجہ: اصل زر بھی ختم ہوا اور صرف داستانیں	
باقی رہ گئیں	293
خارجی کائنات کے قوانین کو نظر انداز کرنے کا دوسرا نام کفر بھی ہے	293
دیکھنا یہ ہے کہ آج ہمارا نام کس زمرے میں آتا ہے	294
ایسی دولت جو اقدارِ خداوندی کے تابع نہ رکھی جائے،	
اس کا نتیجہ ایسا تباہ کن ہوتا ہے کہ جیسے کوئی بے چراغ دیہہ ہو	294
تباہ حال قوم کی معاشرتی زندگی	295

حضرت سلیمانؑ کے عہد میں قوم کی معاشرتی حالت:
رزق کی فراوانی بھی اور خدا کی حفاظت بھی 295
ابلیس وآدم کی کشمکش کے تمثیلی قصہ کی نوعیت 296
دنیائے تصوف کی ساری تگ وتاز جذبات کو
مارنے میں مصروفِ کار ہے 296
آدم کا اعتراف اور ابلیس کی سرکشی کا نتیجہ 297
قدرت کی طرف سے انسان کو اختیار وارادہ کی نعمت
نے اُسے پتھر بننے سے بچالیا 298

چوتھا باب: **سورۃ سبا** (آیات 22 تا 30)

قرآنِ حکیم کی تعلیم کا مرکزی نکتہ توحید کے
برعکس شرک کو واضح کرنا بھی ہے 299
لفظ شرک کا مفہوم اور توحید کی اہمیت 300
انسانیت کی دنیا میں سب سے بڑا شرک ''انسان کا انسان
پر حکمرانی کرنا ہے'' 301
انسانوں میں سب سے بلند ہستی' نبی اکرمؐ کے مقام کا تعین 301
خدا کا شریک' خدا کی عبادت' خدا کی محکومت اور خدا کے
اقتدار کا قرآنی مفہوم اور مروّجہ تراجم 302
خدا اپنی حکم رانی کو کس طرح قائم کرتا ہے؟ 303
مذہبی پیشوائیت کی طرف سے خود ساختہ مذہب
کی ملاوٹ سب سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے 303
خدا تعالیٰ نے نوعِ انسانی کے لیے آئین کی تشکیل کے
حقوق کسی انسان کو عطا نہیں کیے 304
مذہبی پیشوائیت کے مقابلے میں سیکولر حکومت کا کردار 304
مذہبی پیشوائیت کی طرف سے بنائے ہوئے
قانون کو نہ ماننے والا شخص ان کے نزدیک مرتد قرار پاتا ہے 305
توحید صرف خدا کے قوانین کو تسلیم کرنے کا نام ہے 305
خارجی کائنات کی طرح انسانی دنیا میں بھی کسی
انسان کو قانون بنانے کا حق حاصل نہیں 306
آسمانوں پر خدا کی حکومت اور زمین پر انسانوں کے
بنائے ہوئے قانون کی پیروی: اسی کا نام شرکِ عظیم ہے 307
جناب بوعلی سینا' الرازی اور مسعودی کے بعد صدیوں سے تحقیق
کے میدان میں ہماری گاڑی ایک ہی جگہ کھڑی ہے 307
دنیا بھر میں عملی طور پر امتِ مسلمہ کے ہاں قرآن کی
قدر ومنزلت کی نوعیت 308
قرآنِ حکیم سے دوری کی بنیادی وجہ: گاڑی کا ٹائر بدل گئی 309
قرآنِ حکیم کے ایک ایک لفظ کی حرمت کو پیشِ نظر رکھنا ہوتا ہے 309
یہ پوری کائنات ایک اکائی ہے لہٰذا ارض وسما میں
صرف اسی کا قانون رائج ہوگا' اسی کی حکمرانی ہوگی 310
عدل کا قرآنی مفہوم صرف خدا کے قانون کے
مطابق فیصلے کرنا ہے 311
انسانوں کا ذاتِ خداوندی سے رابطہ صرف اس کی
عطا کردہ کتاب کے ذریعے ہی ہے 311
عملی زندگی کے لیے اسلامی مملکت کے نزدیک اصل سوال قرآنی
حدود کے اندر رہتے ہوئے طور طریقوں کا وضع کرنا ہوتا ہے 312

نفاذِ قانون کے سلسلہ میں شفاعت کے تصور کا غلط مفہوم 312
اگر انسانی آنکھ کو قرآنِ حکیم کی روشنی سے محروم کر دیا جائے
تو پھر اُسے کچھ دکھائی نہیں دیتا 313
لفظ شفاعت کا قرآنی مفہوم 314
قرآنِ حکیم کے ہاں قانونِ مکافات کے عمل کو سمجھانے کا طریق 314
شفاعت کا قرآنی مفہوم، خدا کی عدالت میں سچی شہادت
دینے کا نام ہے، سفارش کرنا نہیں ہے 314
شرک کی ایک دوسری قسم "کسی دوسرے انسان کا محتاج ہونا بھی ہے" 316
جنّتی معاشرے کی بنیادی خصوصیت: وہاں کوئی انساں نہ
تو کسی دوسرے کا حاکم ہوگا اور نہ ہی محتاج 316
انسانوں کے خود ساختہ نظام اور قرآنی نظام کے نتائج کو
پرکھنے کا طریق 317
آخر عالم گیر سطح پر وہ کون ہے جو ذرائع رزق کا ذریعہ بن رہا ہو؟ 317
قرآنِ حکیم کی تعلیم کا مقصد اور نصب العین عالمگیر برادری کے
لیے ایک ضابطہ حیات عطا کرنا ہے 318
پوری نوعِ انسانی کی خاطر رسولِ اکرم کو ختمِ نبوت کے
اعلیٰ ترین مقام پر فائز کر دیا گیا 318

پانچواں باب: **سورۃ سبا** (آیات 31 تا 33)

جہنم میں لیڈرانِ قوم، حکمران، محکوم اور مذہبی پیشوائیت کے
مقلدین کے باہمی مکالمات کی اہمیت ذہن سے محو کر دی گئی 321
جنت اور جہنم کا آغاز اور واعظ 322
قرآنِ حکیم کے نزدیک دنیائے انسانیت کا بلند ترین مقام
احترامِ آدمیت ہے اور اس سے محرومی سب سے بڑا جہنم 323
کسی انسان کا کسی انسان کے آگے محکوم ہو جانا،
یہی ملوکیت ہے اور یہی جہنم ہے 324
دنیا کی یہ جہنمی زندگی ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کے
باہمی گٹھ جوڑ کا نتیجہ ہے 325
لفظِ جہنم کی نوعیت و ماہیت 325
جہنم کی آگ دلوں کو لپیٹ لیتی ہے 326
انسانیت کی دنیا میں ایک انسان کی دوسرے انسان
پر حکمرانی سب سے بڑا جہنم ہے 327
قوم کے مقابلے میں قوم کی تذلیل کے تقابلی اسباب 327
جس قوم کی زندگی میں روانی نہ رہے، وہ جہنم کی نذر ہو جاتی ہے 328
مذہبی پیشوائیت کی تکنیک 328
علامہ اقبالؒ کی نظر میں موجودہ جہنم کی کیفیت اور واعظ کا بیان 329
نگاہ بصیرت رکھنے والا تو یہاں جہنم کو اپنی آنکھوں
سے بخوبی دیکھ رہا ہے 330
شرفِ انسانیت سے محروم قوم آخر کار احساس
کی نعمت سے بھی محروم ہو جاتی ہے 331
شرفِ انسانیت کو جلا دینے والا عذاب جس میں
نہ زندگی ہے اور نہ موت 332
اہلِ جہنم کے دو گروہوں کے مابین باہمی مکالمے کا منظر 332
مفاد پرست قوتوں کی طرف سے اختیار کردہ سازشوں کی نوعیت:
مزاجِ خانقاہی کا نشہ آور صبحگاہی کا ورد 333

جہنمی معاشرے کے باسیوں کو اپنا مستقبل ہمیشہ تاریک
دکھائی دیتا ہے اور ماضی روشن 334
مذہبی پیشوائیت لوگوں کو تقلید پرستی کے جال میں الجھا سکتی ہے 335
ایسا انسان جس کا ایمان محکم ہو وہ کسی کے سامنے جھکتا ہی نہیں 336
پیچھے چلنے والے ہوں یا غلط راستے پر چلانے والے
وہاں ہر دو کو دوگنا عذاب ہوگا 337
غلط معاشرے میں اہلِ ایمان کی ذمہ داری اور زیادہ ہوتی ہے 337
غلط روش کے پیروکار بڑے بزدل ہوا کرتے ہیں 338
محکوم میت پر قبر کی پکار اور اپنی سوختہ بختی کا اظہار 340
قوتِ ایمانی ہی وہ قوت ہے جو تمام بیڑیوں کو اور
تمام ہتھکڑیوں کو توڑ دیتی ہے 340
جہنم کی آگ کے شعلے انسانی اعمال کی آگ کی شکل میں
نمودار ہوتے ہیں 341
شرفِ انسانیت سے محرومی جہنم ہے 341

چھٹا باب: سورۃ سبا (آیات 34 تا 38)

گزشتہ سے پیوستہ یعنی جہنمی معاشرے کی پہچان جس میں
تکریمِ آدمیت مفقود ہو جائے 343
قفس کے آرام کا خوگر معاشرہ آزادی کی نعمت سے آشنا ہوتا ہی نہیں 344
مترفین نے قرآن حکیم کی ہمیشہ مخالفت کی ہے 345
آخر قرآن حکیم کے ہوتے ہوئے ہمیں یہ صحیح طور پر اسلام
سمجھ میں کیوں نہیں آتا؟ 345
لفظ ملوکیت کا بنیادی مفہوم 346
''مترفین'' کا ترجمہ دوسروں کی کمائی پر عیش کرنے والوں
کے بجائے آسودہ حال کیوں کیا جاتا ہے؟ 347
ایک گہری سازش تاکہ غریبوں کی توجہ مترفین کی
طرف جانے ہی نہ پائے 346
ہامان، فرعون اور قارون سے مل کر ہی ایک مثلث بنتی ہے 347
نبی اکرم ﷺ کی زندگی کے متعلق قرآنِ حکیم کا ارشاد 347
قرآنِ حکیم کے معاشی نظام میں محنت کشوں کا کوئی الگ طبقہ نہیں ہوتا 348
قرآنِ حکیم کے معاشی نظام کے برعکس ربوٰ کا ایک دوسرا نظام 349
حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ربوٰ کے نظام کے خلاف ہی جہاد کیا تھا 350
مذہبی پیشوائیت کی تعلیم تو انسانی عقل و شعور کو مفلوج کر دیتی ہے 350
ربوٰ کے نظام کے برعکس قرآنی نظامِ ربوبیت کا ماحصل 351
قرآن اپنے معاشی نظام میں محنت کا معاوضہ متعین کرنے
کی بجائے اس کا ماحصل پیش کرتا ہے 351
ہر رسول یا ہر نبی کی مخالفت کی اصل وجہ نظام سرمایہ داری
کا استحکام ہی تھا 352
قرآنِ حکیم کے نزدیک خوف اور بھوک خدا کا عذاب ہے 353
تقدس کے روپ میں مترفین کا دوسرا گروہ 354
مترفین کا طبقہ نوعِ انسانی کی عقل و فکر کے چراغ کو بجھانے والا'
انسانیت کا سب سے بڑا دشمن ہوتا ہے 355
کسی Production (پیداوار) میں حصہ لیے
بغیر دوسروں کی محنت کو سلب کرنے والے 355

قوم کی تباہی کا سبب کام نہ کرنے والے طبقہ کی کثرت'
اور کام کرنے والوں کے احترام میں فرق کا ہونا ہے 356
قرآنِ حکیم کی پکار'اس کی وارننگ اور انجام 357
مکافاتِ عمل کے سلسلہ میں انکارِ آخرت کا تصور 359
ملوکیت اور خلافت میں فرق' آخرت میں بخشش کے
لیے بندوبست کے قصے اور اُن کی نوعیت 359
جہنمی معاشرے میں جنت کی ہوا کہاں؟ 361
پہلے غلام بنانے کا جرم کرنا پھر چھڑا کر ثواب حاصل کرنے کا نتیجہ 361
آج دنیا بھر میں مسلمانوں کو دین کے نام پر دی جانے
والی معاشرتی تمدنی معاشی اور سیاسی تعلیم کے اثرات 362
جنت کے حصول کا قرآنی فارمولہ' چند غلط فہمیاں اور غلط تراجم 363
مغرب کی فلاحی مملکت اور قرآنی معاشرے میں ایک بنیادی فرق ہے 364
دنیا کا کوئی شخص خدا کے قانون کو شکست نہیں دے سکتا 365

ساتواں باب: **سورۃ سبا** (آیات 39 تا 49)

مروّجہ تفاسیر کی روشنی میں قرآنِ حکیم کے تراجم اور
اُن پر اٹھنے والے اعتراضات 368
قرآنی آیت (34:39) کا مفہوم قرآن حکیم کی روشنی میں 369
قرآنِ حکیم کا معاشی نظام' نظامِ سرمایہ داری کے بالکل برعکس ہے 370
سرمایہ داروں' جاگیرداروں' اور کارخانوں کے مالکوں کا بنایا ہوا
قانون مزدوروں کے حق میں کیوں کر انصاف پر مبنی ہو سکتا ہے؟ 370
لفظ ''انفاق'' کا ترجمہ خرچ کرنا نہیں بلکہ منفعت عامہ
کے لیے کھلا رکھنا ہے 371
قرآنِ حکیم کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے قرآنی
اصطلاحات کا مفہوم سمجھنا ضروری ہے 372
لفظ انفق کا قرآنی مفہوم: خزاں دیدہ درخت پر بہارِ نو کا آجانا 373
نوعِ انسانی کو انفاق کا یہ پروگرام ایک نظام کی شکل میں اپنانا ہے 374
مسلمانوں کے معاشرے میں جہالت کا انداز 374
دیوی دیوتاؤں سے بڑھ کر مذہب میں اسلاف پرستی کا جادو 376
الحق کسی ذہنی اور فکری چیز کا نام نہیں بلکہ حقیقی طور
پر محسوس نتائج کا نام ہے 377
اسلاف پرستی کے متعلق ہمارے علما حضرات کا عقیدہ 378
قرآنِ حکیم ہر دور کے انسانوں کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے 379
اسلاف پرستی انسانوں کی دنیا پر حیوانوں کی طرح
جمود طاری کر دیتی ہے 379
زندہ قوموں کا اسلاف پرست قوموں سے سلوک اور ہماری حالت 379
دنیا کی ہر مذہب پرست قوم علم و شعور کے میدان
میں آپ کو پیچھے دکھائی دے گی 380
ملتِ اسلامیہ کو فکر و عمل اور دانش و بینش سے محروم رکھنے کی گہری سازش 380
مذہب کے شعبوں کی دو بڑی خصوصیات: توہم پرستی اور اسلاف پرستی 381
نبی اکرم ﷺ کی تئیس سالہ تبلیغ کا ماحصل صرف ایک بات:
بس سوچا کرو 381
جہنم میں جانے والوں کی نشانی 383
دلوں پر تالے پڑ جانے کی نوعیت اور اصلیت چمگادڑ کی سی ہو جاتی ہے 384

دنیائے مذہب میں سب سے عقل مند انسان وہ سمجھا جاتا
ہے جو عقل سے کام نہ لے بلکہ عقیدے کو مانے 384
قرآنِ حکیم کے نزدیک اہلِ ایمان کی ایک خاص
خصوصیت' فتوحات اور سازش 385
میں نے آدھی عمر تصوف اور شریعت کے میکدوں میں
گزاری ہے' تعلیم یہ تھی کہ سوچنا نہیں: پرویزؒ 386
طبلے کی تھاپ اور ماہرین علم نفسیات 387
تصوف کے بعد اہل شریعت کی تعلیم' نبی اکرم ﷺ کی
طرف منسوب کردہ ایک حدیث 387
اسی روایت کے سلسلہ میں صحیفہ اہل حدیث اور الاعتصام ہفتہ
وار کا جواب: عقل لڑانا حرام ہے 388
اہلِ شریعت اور اہلِ طریقت کی سوچ کا انجام 389
مملکتِ پاکستان کے اندر سب سے زیادہ پروپیگنڈہ
اس پرویزؒ کے خلاف کیوں؟ 389
دعوتِ حق دینے والے کے لیے دو اہم اصول 390
حق کی آواز بلند کرنے والا اپنا اجر خدا سے طلب کرتا ہے'
انسانوں سے نہیں 390
حق و باطل کی جنگ ہر آن جاری و ساری ہے اور
آخر کار فتح حق کی ہی ہوتی ہے 391
رات کی تاریکی سورج کے نکلنے تک ہی ہوتی ہے'
ضرورت تو صرف چراغ روشن کرنے کی ہے 392
خاموشی آواز کے نہ ہونے کا نام ہے 393

آٹھواں باب: **سورۃ سبا** (آیات 50 تا اختتام)
قرآنِ حکیم نظامِ زندگی کی ایک مکمل شکلِ دین پیش کرتا ہے'
یہ چند ایک رسمی عقائد کا مجموعہ نہیں ہے 394
قرآنی نظامِ حیات میں اور دیگر مذاہبِ عالم میں ایک بنیادی فرق 395
آخرت کے تصور کو سمجھانے کے لیے قرآنِ حکیم نے
تمثیلی انداز اختیار کیا ہے 396
مذہب میں فرقوں کی بنیاد سراسر مذہبی پیشوائیت کی روٹی
کے معاملے پر ہی استوار ہوتی ہے 397
دین کا بانی صرف خدا کی ذات ہوتی ہے' کوئی رسول بھی نہیں ہوتا 397
بانیانِ مذاہب کے علاوہ بیشتر مذاہب میں خدا کا تصور 398
قرآنِ حکیم کی تعلیم کے برعکس مذہب کی دنیا میں
رسول فوق البشر متصور ہوتا ہے 398
وحی کی ماہیت اور پھر رسول کا فریضہ 399
خدا کا تصور آپؐ کی بعثت سے پہلے بھی موجود تھا 399
دورِ جہالت میں اہلِ عرب کے نزدیک رسول کی
ذات کے متعلق پایا جانے والا تصور 400
علامہؒ پرویز کی زندگی کے کچھ حقائق ان کی اپنی زبانی 400
مذہبی تصورات کے باعث حُلیہ میں تبدیلی کا نمایاں عنصر 401
مقربِ بارگاہِ خداوندی کے متعلق پایہ جانے والا تصورِ حیات 402
نبی اکرمؐ کی زندگی نوعِ انسان کے لیے ماڈل کی حیثیت رکھتی ہے 402
ہمارے ہاں اتباعِ سنت کا مفہوم اور اس کا عملی مظاہرہ 403
انبیائے کرام سے معجزات کا مطالبہ اور نبی اکرم ﷺ سے بھی 403

معجزوں کی مختلف نوعیتیں	404
آپؐ کی زندگی کا ایک اتفاقی حادثہ	405
آپؐ کے کردار کی عظمت اور سورج گہن کا واقعہ	406
اپنی اپنی مرادیں پوری کرانے کی غرض سے بڑے بڑے آستانوں پر انسان کی حاضری	406
نفع اور نقصان کے سلسلہ میں قرآن حکیم کے الفاظ میں نبی اکرم ﷺ کا اعلانِ عام	407
گناہگاروں کے لیے شفاعت کے عقیدے کی حقیقت	407
زندگی کے معاملات میں رسولوں کا کیریکٹر	408
نبی اکرم ﷺ کی بلند ترین شخصیت قرآن حکیم کی روشنی میں	409
غزوہ تبوک کے موقعہ پر منافقین کا کردار اور نبی اکرم ﷺ کی طرف وحی کا نزول	409
نبی اکرمؐ کی زندگی کی ایک دوسری مثال	410
بخاری اور مسلم کی احادیث نماز کے دوران آپؐ کے بھول جانے کی بات	411
دین اور مذہب کی امتیازی خصوصیت	411
آپؐ اپنی تعظیم کے لیے اٹھ کھڑے ہونے والوں کو روک دیا کرتے تھے	411
آپ ﷺ کا حضرت فاطمہؓ کے لیے اٹھ کھڑے ہونا محبت کا اظہار تھا	412
محمدؐ بن عبداللہ کی آنکھ کے آنسو اور محمد رسول اللہ ﷺ کے عدل کا حکم	412
قرآنِ حکیم کے بیان کردہ اسوۂ حسنہ کے برعکس ہمارے ہاں کے مذہبی لٹریچر کی نوعیت	413
نبی اکرمؐ کی عظمتِ کردار کی ایک مثال	414
مودودیؒ کی تضاد بیانی پر ایک نظر اور اس سے ہونے والا نقصان	414
قرآنِ حکیم کی تعلیم کے مطابق رسولؐ سے لغزش تو ہوسکتی ہے، معصیت نہیں ہوتی	415
فرعون کی توبہ قبول نہ ہونے کی وجہ	416
چور اور ڈاکو کے کیریکٹر میں ایک واضح فرق ہوتا ہے	416
فرعون کی نفرت اس کی موت کا سبب بن گئی	417
تعصب اور نفرت حقیقت کو تسلیم کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے	417
شک اور ریب میں ایک بنیادی فرق ہے	418

فہرست مشمولات سورۃ الفاطر

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

پہلا باب: سورة فاطر (آیات 1 تا 5)

حمد اور حامدون کا قرآنی مفہوم 421
لفظ Creation کے مقابلے میں امر اور تخلیق کا تصور 422
فطر اور بدع کا مفہوم اور اس کا استعمال 423
انسانی عقل خاص حد سے آگے جا ہی نہیں سکتی 424
کائنات کو عدم سے وجود میں لانے کے بعد بغیر کسی
وقفہ کے نت نئے اضافے 424
قرآنِ حکیم کے احکام کے برعکس ہمارے ہاں جمعہ کے
روز چھٹی کا تصور 425
کائنات کے متعلق ہندوؤں کا تصورِ حیات 425
کائناتی کنٹرول کے سلسلہ میں خدا تعالیٰ کے قائم کردہ
نظم وضبط کی شکل وصورت 426
وہ Abstract (غیر محسوس) چیزیں جو محسوسات
کا پیکر اختیار کرنے سے ناآشنا ہیں 427
غیر محسوس چیز کو محسوس شکل میں دیکھنے کی تڑپ 427
محسوسات کی دنیا میں حضرت انسان کا مقام تو کہیں زیادہ بلند ہے 428
قرآنِ حکیم کے ارشاد کے برعکس انسانی ذہن فرشتوں کو
بھی محسوس شکل میں دیکھنے کا عادی ہے 428
سائنس کی اس قدر ترقی کے باوجود انسان Cause &
Effect (علت ومعلول) سے آگے نہیں پہنچا 429
جو قوت پانی کو بھاپ اور برف بنا دیتی ہے قرآن حکیم
نے اسے ملائکہ کہا ہے 430
عربی زبان میں ملائکہ کا یہ لفظ کس طرح تشکیل پایا 430
اہل یورپ کے مفکرین کے نزدیک ایک اہم سوال 431
کائنات کے ذرّے ذرّے کے علاوہ انسانی پیکر کو حکم دینے
والے اس فنکشن (عمل) کو قرآن نے ملائکہ کہا ہے 432
ہمارے ہاں فرشتوں کے لیے محسوس تصور کی بنیاد 432
لفظ اَجۡنِحَةٍ کا قرآنی مفہوم 432
خدائے حکیم نے ہر شے کے لیے پیمانے مقرر کر رکھے ہیں 433
عالمِ امر سے عالمِ خلق کی طرف مختلف منازل کے لیے
اَن گنت قوتوں کا نزول 433
ملائکہ کو دیکھا نہیں جا سکتا اور یہ کائنات ہر آن
ارتقائی منازل کی طرف گامزن ہے 434

فطرت کے قوانین کا علم تو حاصل کیا جاسکتا ہے
لیکن انہیں تبدیل نہیں جاسکتا 434
قرآنِ حکیم نے اپنے ہاں آدم کے قصے کو تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے 435
آدم نے ان مہیب قوتوں کو تسخیر کرلیا اور یہ ملائکہ سجدہ ریز ہو گئے 435
مومن سے پہلے مقامِ آدم کا حصول لازم ہے 436
کائناتی قوتوں کا صحیح استعمال ہی مقام مومن ہے
ورنہ یہی کچھ شیطنت 436
حضور ﷺ کی طرف منسوب کردہ روایات کا اثر 437
مذہب اور دین میں ایک بنیادی فرق ہے 438
کائنات کی تخلیق کا اصل مقصد:
انسانی جسم کی ربوبیت اور انسانی ذات کی نشوونما ہے 438
رحمت، رحم، رحمِ مادر، عزیز و حکیم کی ان اصطلاحات
کا قرآنی مفہوم اور خصوصیات 439
قرآنی نظامِ ربوبیت اور انسانوں کے ہاتھوں رزق
کی تقسیم کا باہمی فرق 439
انسانوں کے پاس ان کے خودساختہ معاشی نظام
کی کوئی دلیل نہیں ہوتی 441
مترفین طبقہ کی ذہنیت حق بات کو ماننے کے لیے
تیار ہی نہیں ہوتی 441
نبی اکرم ﷺ کی حسّاس خیالی کی کیفیت 442
انسان کے کیریکٹر کا معیار اس کے Past (ماضی)
کے ترازو میں تولا جاتا ہے 442
انسان کے ہر عمل کا تعلق خدا کے قانون کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے 443
خدا کے ہر قانون کا نتیجہ محسوس شکل میں سامنے آکر ہی رہتا ہے؟ 443
کلمہ کی دوٹوک عملی تشریح نظریۂ زندگی کے سچ ہونے
کا عملی ثبوت ہوتی ہے 444

دوسرا باب: **سورۃ فاطر** (آیات 6 تا 9)

شیطان کا قرآنی تصور 445
شیطان کی ماہیت اور اس کے عمل کی نوعیت 446
بچے کی تعلیم تو اخلاقیات سے شروع کرنی چاہیے 446
ہمارے ہاں شیطان اور ملائکہ کا مروّجہ تصور اور ہزار برس سے
ذہنی انتشار کی نوعیت 448
خدا کے حضور آدم کی لغزش اور معصیت اور پھر شیطان
کی نافرمانی اور اپنی روش سے انکار 448
ہم اپنی غلط روش کی ذمہ داری بھی شیطان پر ڈال دیتے ہیں 449
اڑھائی ہزار سال سے خیر و شر کی گتھی کا حل قرآن حکیم کی روشنی میں 449
خدا تعالیٰ نے کائناتی قوتوں کے بالمقابل صرف
انسان کو اختیار و ارادہ کی نعمت سے نوازا ہے 450
شر تو انسان کی غلط روش کو اختیار کرنے کا نام ہے 450
غصہ کی حالت میں انسان کا دو ڈگری ٹمپریچر (F) بڑھ جاتا ہے 451
انسان کے اپنے سرکش جذبات ہی شیطان ہیں 451
Aggression (جارحیّت) کے ختم ہونے پر
انسان کی نفسیاتی کیفیت مایوسی کی شکل اختیار کرلیتی ہے 451
اشتعال کے ختم ہونے کے بعد انسان کے ٹمپریچر میں کمی اور جسمانی حالت
میں کمزوری کی وجہ سے نفسیاتی کیفیت ندامت میں بدل جاتی ہے 452
انسان کا اپنا نفس ہی انسان میں وسوسہ پیدا کرتا ہے 453

انسان کا ہر عمل انسانی نفس کا ہی رہن منت ہوتا ہے 454
ہمارے ہاں زندگی کو ختم کرنے کے لیے سورۃ یٰسٓ
کا استعمال کیا جاتا ہے 454
لفظ اعبدوا کا قرآنی مفہوم 455
انسان کا اپنے سرکش جذبات سے مغلوب ہونے کا نتیجہ 456
شیطان کی ماہیت کے متعلق علامہ اقبالؒ کی گوہر افشانی 456
جب قوموں کی قومیں اپنے سرکش جذبات کو اپنا
خدا بنالیں تو پھر دوزخ کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی 457
قرآنِ حکیم کے ارشاد کے مطابق شیطان کے منشور کی
مختلف شقیں: پہلی چیز پروپیگنڈا اور فوجوں سے چڑھائی 457
شیطان کی زیرِ نگرانی دوسرا حربہ: قوموں کی Economy
(اقتصادیات) پر کنٹرول اور اس کا نتیجہ 458
شیطانی منشور کی تیسری شق: آنے والی نسل کو تعلیم کے
ذریعے اپنا محکوم بنالوں گا 458
شیطان کی ان تمام چالوں سے محفوظ رہنے کا طریق اور علاج 458
موجودہ دور کی سوشیالوجی کے ماحصل پر عیسائیت کے اثرات 459
قرآنی اقدار کی حامل شخصیت پر انسان کے سرکش
جذبات (شیطان) اثر انداز نہیں ہوسکتے 460
نفس کشی کا عقیدہ بھی عیسائیت کا دیا ہوا ''تحفہ'' ہے 460
ابلیس کے سلسلہ میں نبی اکرم ﷺ کی ایک حدیث
چمکتی ہوئی: میں نے اپنے ابلیس کو مسلمان کرلیا ہے 461
مومن کی پہچان یہ ہے کہ وہ شیطان کی ہر سازش کو
قرآنِ حکیم کی تلوار سے ذبح کرتا ہے 461
انسان خود اپنے ہی سرکش جذبات کی بنا پر اپنا شیطان آپ ہے 462
برائی کے سرزد ہونے کی شکل میں ندامت کے احساس کی اہمیت 463
بار بار کسی انسان کی بدعملی پر نبی اکرم ﷺ کے قلبِ حساس کی کیفیت 464
حسرت لفظ کا قرآنی مفہوم 465
جھوٹ بالآخر بے نقاب ہو کر ہی رہتا ہے 466
انسانی زندگی کی ادنیٰ سی صلاحیت بھی جہانِ تازہ کی
نوید کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتی ہے 467
وحی کے سمندر سے اٹھنے والے ابرِ رحمت کا ہر ایک قطرہ،
ہر مردہ قوم کے لیے زندگی کا پیغام لیے ہوئے ہوتا ہے 467
زندگی کی نشوونما کے لیے آرزو ایک قیمتی سرمایہ حیات ہے 467

تیسرا باب: **سورۃ فاطر** (آیت 10)

قرآنِ حکیم کی ساری تعلیم کا ملخص انسان کو اس کے
مقام سے آگاہ کرنا ہے 470
خدا اور بندے کا باہمی تعلق شرفِ انسانیت کی رفاقت
کی شکل میں ہے 471
کلمات اللہ کی خصوصیت، وسعت اور جامعیت 471
انسانی ذات کی نشوونما کا انحصار صالح بیج کی
مانند اعمالِ صالحہ کا رہین منت ہے 472
لفظ صعود اور رفع کا مفہوم، ایک فرق کے ساتھ 473
الیہ یَصْعَدُ کی پیدا کردہ پیچیدگیاں 473
خدا کی طرف جانے کا قرآنی مفہوم اور ہماری سوچ 475
معراج شریف کے سلسلہ میں خدا تعالیٰ کے
پاس جانے کا غیر قرآنی تصور 475

- قرآنی قوانین کے ساتھ اگر انسان کا ہاتھ مل جائے تو پھر صدیوں کا سفر دنوں اور سالوں میں طے ہو جاتا ہے 476
- خدا اور بندے کی رفاقت کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ انسانی زندگی خدا کے قانون کے مطابق ہو 477
- خدا تعالیٰ انسان سے اس کی خامیوں کو بطورِ جرم بیان کرتا ہے 477
- انسان خدا کے حضور میں 479
- انسان کے لیے اختیار و ارادے کی نعمت کا استعمال ہر دو شکلوں میں 480
- خدا تعالیٰ کے ساتھ رفاقت کے معاملے کی نوعیت 481
- خدا تعالیٰ کی طرف سے مظلوم کی آہ و پکار کے جواب کا طریق 481
- حضرت عمرؓ کے نزدیک خلافت کے فریضہ کی عملی شکل 482
- خدا کے پروگرام کی تکمیل کی خاطر جنگ بدر میں تیروں کے استعمال کی نوعیت 483
- قرآنِ حکیم نے اسوۂ حسنہ کے سلسلہ میں کنکریوں کی بات نہیں کی بلکہ تیروں کی' کی ہے 483
- حضورؐ کی زندگی کے آخری الفاظ خدا تعالیٰ کے ساتھ رفاقت کی عملی تفسیر ہیں 484
- قرآنی نظام کے سلسلہ میں نوجوان نسل کی مایوسی کی وجہ اور اس کا علاج 485
- یہ کائنات ہر آن ارتقائی منازل طے کرتی' خوبصورت سے خوبصورت تر ہوتی' جا رہی ہے 486
- کائناتی ارتقا کے سلسلہ میں قدرت کا ایک دن ایک ایک ہزار اور پچاس پچاس ہزار سال کے برابر ہوتا ہے 487
- یعرج الیہ کے قرآنی مفہوم کے علاوہ' سیڑھی کے ڈنڈوں کے لیے دو مختلف الفاظ 488
- کائناتی قوانین کے ساتھ انسانی ہاتھ کے استعمال کی بنا پر حیرت انگیز نتائج برآمد ہونے کی شکل 488
- قانونِ خداوندی کے ساتھ نبی اکرمؐ کے ہاتھ کی رفاقت کا نتیجہ: صدیوں کا سفر دنوں میں 489
- آج بھی کلمہ طیّبہ کے نتائج پر دنیا بھر کے انسان محوِ حیرت ہیں 490
- قرآنِ حکیم کے اس پیش کردہ کلمہ طیّبہ کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ 490
- وحی کے مقابلے میں انسانی عقل کا طریق تجرباتی ہوتا ہے 490
- ملوکیت کو حرام کہنے والے' آج خود ہی ملوکیت کے محافظ بنے ہوئے ہیں 491
- عقل کے بالمقابل ہزار سال پیشتر قندیلِ آسمانی کی راہنمائی کا پیدا کردہ نتیجہ 491
- عیسائیت میں مذہبی پیشوائیت کے ساتھ ہونے والا سلوک 492
- آج غیر شعوری طور پر انسانی زندگی کا ہر اٹھنے والا قدم نظامِ خداوندی کی طرف ہی گامزن ہے 492
- آج دنیا بھر کے مسلمانوں کی حالتِ زار کا تجزیہ 494

چوتھا باب: سورة فاطر (آیات 11 تا 23)

- کائناتی حقیقتوں کے اصول و اقدار کی نوعیت اور انسانی اعمال کی نتیجہ خیزی 495
- کائنات کے اندر باہمی ربط کی طرح قرآنِ حکیم کا ایک ایک لفظ مربوط ہے 496
- انسانی زندگی کی ابتدا پانی سے ہوئی' طینِ لازب سے ہوئی 497

انسانی پیدائش کا موجودہ سلسلہ اپنے اندر اربوں سال کی مسافت لیے ہوئے ہے 498
رحمِ مادر میں جرثومے کے ارتقا کی اربوں سالوں کی منازل، مہینوں میں، دنوں میں 499
رحمِ مادر کے سلسلہ میں ایک غلط سوچ کا ازالہ 501
چودہ سو سال کے عرصہ میں انسان کا اپنی منزل کی طرف چند قدم سفر 501
کیا عمر کا تعین کہیں پہلے سے ہوا ہے؟ 502
خدا تعالیٰ نے ہر چیز کے لیے قانون بنا رکھے ہیں 503
عمر کے کم ہونے یا زیادہ ہونے کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کا بیان کردہ اصول 504
غلط تراجم کے پیدا کردہ نتائج کی متضاد کیفیت 505
قوموں کی طبیعی عمر کا دارومدار ہمیشہ طبعی اصولوں پر ہوتا ہے 505
قرآنِ حکیم نے انسان کی عمر متعین نہیں کی 507
اجل، موت اور زندگی کے درمیانی وقفے کا نام ہے: اجل کا قرآنی مفہوم 507
خدا تعالیٰ نے ہر چیز کی اجل کے لیے قانون مقرر کر رکھا ہے 508
کیا موت کا کوئی دن متعین ہے؟ 509
کائناتی نظام میں کسی قسم کی کوئی ملاوٹ محسوس نہیں ہوتی 509
قدرت کے تخلیقی قوانین میں اور انسانی سوچ کے عملی نتائج میں بنیادی فرق ہوتا ہے 510
حدودِ بشریت کے اندر خدا تعالیٰ کی صفتِ ربوبیت سے انسانوں کی نشوونما کے فریضہ کی اہمیت 511
تیری اور میری کی تفریق میں انسان کی عزتِ نفس اور عقل وفکر کی لاانتہا پستی 511
جو قوم اپنی زندگی مُردوں کے سپرد کردے تو پھر وہ خود بھی مُردہ ہوجاتی ہے 512
حضرت صاحب کی کرامت 513
لفظ فقرآء کا قرآنی مفہوم اور نظامِ ربوبیت کی خصوصیت 514
نوعِ انسانی کی جگہ ایک دوسری مخلوق بھی لائی جاسکتی ہے 516
قرآنی نظام کی بنیاد یہ ہے کہ اس میں کوئی اپنا بوجھ دوسرے پر نہیں لاد سکے گا 516
انسان کا ہر عمل صرف اس کی اپنی ذات پر ہی اثر انداز ہوگا 517
عالمِ غیب کی حقیقت اور اس کا مفہوم 517
اپنی ''میں'' کو دوسروں کے حوالے کرنے والا شخص حیوان کی سطح پر آپہنچتا ہے 518
زندگی سانس لینے کا نام نہیں بلکہ تکریمِ آدمیت کا نام ہے 518

پانچواں باب: سورۃ فاطر (آیات 24 تا 35)

نبوت کا فریضہ کاروانِ انسانیت کو خطراتِ منزل سے آگاہ کرنا ہوتا تھا 521
مواخذہ کے لیے دو شرائط کا پورا ہونا ضروری ہے 521
کسی چیز کو جھوٹا کہنے کی نسبت اس کی تکذیب کرنا زیادہ نقصان دہ ہے 522
صدیوں سے ہمارے ہاں قرآن حکیم کے استعمال کا مقصد 522
تکذیب دین کی حقیقت کا نتیجہ 523

تکذیب دین کرنے والے کون کون لوگ ہیں؟ یہ جاننے کے لیے سورۃ الماعون قابل غور ہے 523

دین کی تکذیب کرنے والوں کی پہچان 524

امریکا کی حالتِ زار پر لکھی جانے والی کتاب: The Lonely Crowd تنہا ہجوم 524

آج ہمارے معاشرے کا ہر فرد اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے 525

ہم نے صلوٰۃ کے حقیقی مفہوم کو نظروں سے اجھل کر رکھا ہے 525

مرئی طور پر حرکات وسکنات کو ہی صلوٰۃ سمجھ لیا گیا 526

قرآنِ حکیم کو صرف ناظرہ پڑھنے تک کیوں محدود کر دیا گیا؟ 526

اجڑی بستیاں اور کھنڈرات تکذیب دین کرنے والوں کا منہ بولتی شہادت ہیں 527

قرآنِ حکیم اپنے قوانین کی صداقت کے لیے خارجی کائنات کو بطور شہادت پیش کرتا ہے 527

کھیتی کی مثال کے بعد پہاڑوں کی مثال' چٹانوں کی مثال 528

کائنات کے اندر شعبۂ بیالوجی (Biology) کی مثالیں 529

قرآنِ حکیم نے کائنات کا علم حاصل کرنے والوں کو علما کہا ہے 529

اجرامِ فلکی کے نظم وضبط کا حیران کن سسٹم اور اس پر کنٹرول کی کیفیت 529

نسلِ انسانی کے سلسلہ میں ازدواجی تعلقات' رنگوں کا' زبانوں کا' اختلاف اور ارض وسما کی تخلیق 530

ہمارے ہاں تو سائنٹسٹ کو علما کی لسٹ میں شامل ہی نہیں کیا جاتا 531

ہمارے علما کے نزدیک تو آنکھ کا عطیہ دینا بھی حرام ہے 531

مودودی مرحوم کے نزدیک آنکھ ہی نہیں بلکہ جسم کا ہر حصہ بطورِ عطیہ دینا حرام ہے 531

مفتی محمد شفیع مرحوم کا فتویٰ: لاؤڈ اسپیکر کا استعمال حرام ہے 532

دارالعلوموں' مکتبوں اور مدرسوں کے تعلیم یافتہ طالب علموں کی حالت زار 533

1972ء میں نوسو دارالعلوموں کے پینتالیس ہزار طالب علموں کے لیے 80 لاکھ روپے کا بجٹ 534

لفظ تلاوت کا مفہوم پڑھنا نہیں بلکہ پیروی کرنا ہے 535

رزق کا قرآنی مفہوم بڑا پرُ معنی ہے 535

نظام سرمایہ داری میں Wages (اجرتوں) کا سسٹم بدترین سسٹم ہے 535

قرآنِ حکیم اپنے ہاں انسان کو معاوضہ کی بجائے ماحصل کے نظام سے متعارف کراتا ہے 536

عدل کے ساتھ احسان کا بھی حکم ہے 536

قرآنِ حکیم کا معاشی نظام پوری انسانیت کی ربوبیت کا ضامن ہے 536

دینِ خداوندی شخصیات سے وابستہ نہیں ہوتا 537

اقوامِ عالم کی حد تک وارثِ کتاب امت کا فریضہ اور پھر اس کی ادائیگی کا ماحصل 538

اعمال صالحہ کے عوض خدا تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ نعمتوں کا تمثیلی ذکر 538

عربوں کے ہاں شفاف پانی کی قدر ومنزلت 538

وحی کی روشنی میں قائم ہونے والے نظام اور انسانی عقل کے بل بوتے پر اختیار کردہ نظام میں فرق 538

جنتی معاشرے میں نہ خوف ہوگا نہ حزن 538

ایک قطرہ خون بہائے بغیر مملکت پاکستان کا حصول،
خدا تعالیٰ کا بہت بڑا فضل تھا 543
نہ جسمانی مشقت اور نہ نفسیاتی تکان 543

چھٹا باب: **سورۃ فاطر** (آیات 36 تا اختتام)

جہنم کی کیفیت: نہ زندگی، نہ موت 546
ہر عمل کا ایک اپنا فطری نتیجہ ہوتا ہے، خدا کسی کو سزا نہیں دیتا 546
اُخروی زندگی کا عذاب ہو یا مکاں کی خوشگواریوں کا
تذکرہ، ان کی نوعیت کا ہمیں شعور نہیں ہو سکتا 547
جہنمی معاشرے کی حالت 547
صرف سانس لینے کا نام زندگی نہیں ہوتا 548
ذاتِ خداوندی انسانی جذبات کو کس قدر بلیغ
انداز میں بیان کرتی ہے 549
زندگی واپس نہیں لوٹا کرتی 549
ظلم کرنے والوں کا کوئی دوست نہیں ہوتا 550
کسی قسم کی سزا سے پہلے حق و باطل سے آگاہی کا
فریضہ ادا کرنا ضروری ہے 550
ختم نبوت کے بعد مامور من اللہ کا تصور خلافِ قرآن ہے 551
کتاب کا وارث ہونے کی بنا پر امت کا فریضہ اور اس کی اہمیت 552
اس فریضہ کی عدمِ ادائیگی کا نتیجہ 552
قرآن کو دوسروں تک پہنچانے میں تغافل کی بنا پر
خداوندی نعما سے فیض یاب نہ ہونے کا جرم 553
قرآنِ حکیم کے دنیا بھر میں سمجھے بغیر پڑھے جانے
کے چرچے کے فریب کی نوعیت اور نتیجہ 554
نبی اکرمؐ کا صحابہؓ کو قرآنِ حکیم کو پڑھانے
اور سمجھانے کا طریق اور ہمارا عمل 555
امام غزالیؒ سے لے کر مولانا تھانویؒ تک ورد و وظائف،
عملیات، تعویذ گنڈے، دم وغیرہ کا سلسلہ 555
اس وارث کتاب کے بارے میں قیامت کے
روز خدا کے حضور نبی اکرمؐ کی شکایت 556
قرآن حکیم جیسی لازوال نعمت کے مل جانے پر
ناسپاس گزاری، ناشکری کے جرم کی سزا 556
شکر کا قرآنی مفہوم یعنی خدا کی طرف سے ملنے
والی نعمتوں کو دوسروں کے لیے کھلا رکھنا 557
کفار کے عمل سے زیادہ سنگین جرم کفور کا ہونا ہے 557
شکر کے لفظ سے انسان کے اندر اضطراب کی بجائے
فراخدلی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے 558
پاکستان جیسی عظیم مملکت کے مل جانے پر بھی
ناشکر گزاری کی شکل میں تنگ نظری کی انتہا 558
قائداعظمؒ کی وہ بلند کردار شخصیت کہ جس نے اپنی
خدمت کے عوض ایک پائی تک وصول نہیں کی 559
قائداعظمؒ کی کہانی علامہ پرویزؒ کی زبانی 559
پاکستان کے اس خطہ میں بیک وقت جس قدر خزائن
ہیں یہ دنیا بھر میں کہیں نہیں 559
شکر گزاری کو اپنائے بغیر گھر کا ماحول جہنم بنا رہتا ہے 560
قائداعظمؒ سے بدسلوکی اور اس ناقدری کا نتیجہ 560
ناشکر گزار قوم کو ہر وقت سوائے پژمردگی کے

بھیانک چہرے کے پیچھے کچھ نظر نہیں آتا 561
خدا کی ذات جذبات واحساسات کی کیفیات سے بالاتر ہے
لیکن وہ ہر قسم کے انسانی جذبات سے پوری طرح باخبر ہے 562
بات کسی کے احساسات کو محسوس کرنے کی ہوتی ہے 562
زمین پر انسان خدا کا خلیفہ نہیں بلکہ یہ سابقہ مخلوق کا جانشین ہے 563
قرآنِ حکیم کے مروجہ تراجم نے انسان کے مذموم
جذبات کو خدا کی طرف منسوب کر رکھا ہے 554
کائنات میں انسان صاحب اختیار تو ہے لیکن خدا
کے قوانین میں دخل انداز نہیں ہوسکتا 564
صراطِ مستقیم سے ہٹ کر انسان کا اپنا کردار
ہمیشہ اپنی مفاد پرستی پر مبنی ہوتا ہے 565
انسان کو اس قدر وسیع کائنات کی بناوٹ اور اس
کے نظم ونسق پر غور وفکر کرنا ہوگا 565
یہ کائنات تو اپنے اندر کشش ثقل کے کروڑویں
حصے کی کمی بیشی کو بھی برداشت نہیں کرسکتی 566
قدم قدم پر انسان کی بدنظمی اور غلط روش پر خدا کو بُردبار ہونا پڑتا ہے 566
انسان کی کوئی بھی تدبیر خدا کے قانون کا مقابلہ نہیں کرسکے گی 566
دنیا کی کوئی قوم بھی سنت اللہ کو عاجز نہیں کرسکتی 557
انسانی دنیا کے لیے اس کائنات کے اندر مہلت کا
وقفہ خدا تعالیٰ کی رحمانیت کا ظہور ہے 568
مہلت کا وقفہ ختم ہونے پر خدا کا قانون نتیجہ خیز ہوئے
بغیر نہیں رہتا 568
انسان کا نامۂ اعمال تو ہر وقت اس کے گلے میں لٹکا ہوا ہوتا ہے 569
مردہ قوم میں زندگی بخشنے والی سورۃ، سورۃ یٰسین کا
ہمارے ہاں استعمال کا طریق 569

پیش لفظ

خدائے علیم وخبیر اور رحیم وکریم کا یہ احسانِ عظیم ہے کہ بزمِ طلوعِ اسلام لاہور آج ایک بار پھر قارئینِ کرام کے حضور **''مطالب القرآن فی دروس الفرقان''** کی انیسویں جلد پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہی ہے۔زیرِ نظر جلد سورۃ احزاب' سورۃ سبا اور سورۃ فاطر اسی قرآنی تفسیر کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ جس طرح اس کرۂ ارض کی بلندیوں اور پستیوں میں ہر کھلنے والا پھول اپنی اپنی ذات میں خوبصورتی کے ساتھ مختلف قسم کی خوشبو کو اپنے دامن میں لیے ہوتا ہے۔عزیزانِ من! بعینہٖ اسی طرح قرآنِ حکیم کا ایک ایک لفظ' اس کی ایک ایک آیت اور اس کی ایک ایک سورۃ' اپنے اپنے مقام پر عقلِ انسانی کو جلا بخشنے کے لیے قدم قدم پر ہر آن ایک نیا انداز پیش کرتی ہے۔چنانچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ وحی کے سمندر سے اٹھنے والا ابرِ رحمت کا ہر ایک قطرہ مردہ قوموں کے لیے زندگی کا پیغام لیے ہوئے ہوتا ہے۔

جہاں تک جنگِ احزاب کا تعلق ہے تو یہ ایک ایسی تباہ کن جنگ تھی کہ جس میں کفار کے پندرہ' بیس ہزار کے قریب افراد نے حصہ لیا۔چنانچہ زیرِ نظر تفسیر میں محترم پرویز صاحبؒ نے جنگِ احزاب کی ہولناکیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

> ''اس معرکے کے متعلق قرآنِ حکیم نے کہا ہے کہ یہ اس قدر زلزلہ انگیز' قیامت خیز تصادم تھا۔اس زلزلے کے اندر بنیادیں تک ہل گئیں۔بعض کے دلوں کے اندر اس قسم کے خیالات بھی آ گئے کہ مومن جو سیسہ پلائی ہوئی دیواروں کی طرح کھڑے ہوئے تھے ان میں بھی یہ چیز آ گئی کہ وہ پکار اٹھے کہ **متٰی نصر الله** (2:214)۔بارِ الٰہا ہماری کوششوں کی بار آوری کا وقت کب آئے گا؟ اور تاریخ کہتی ہے کہ ان تمام پر ہجوم مصائب کے اندر ایک شخصیت ایسی تھی جو روشنی کے مینار کی طرح کھڑی تھی۔یہ تلاطم خیزیاں آئیں اور اپنا سر ٹکرا کر واپس چلی جائیں۔اور وہ عظیم شخصیت محمد رسول اللہ ﷺ تھے۔مؤرخ لکھتا ہے کہ وہ ایک ذات تھی جو ایک سیکنڈ کے لیے بھی اپنے مقام سے اِدھر اُدھر نہیں ہوئی' وہ حوصلے بڑھائے چلی جا رہی تھی۔نبی یہ ہوتا ہے' امام اس کو کہتے ہیں۔میدانِ جنگ میں بھی یہ کیفیت تھی۔عزیزانِ من! قرآن نے اس مقام پہ کہا ہے **لقد كان لكم في رسول الله اسوة حسنة** (33:21) رسول اللہ ﷺ نے جو یہ روش اختیار کی تھی وہ تمہارے لیے اسوۂ حسنہ ہے۔وہ تھا تمہارے

لیے حسین ترین نمونہ۔رسول کو ایسے مقام کے لیے حسین ترین! **اسوۃ حسنۃ**' توازن بدوش نمونہ بننا ہے۔کہا کہ **لمن کان یرجوا اللہ و الیوم الاٰخر و ذکر اللہ کثیرًا** (33:21) لیکن انہی کے لیے یہ نمونہ بن سکتا ہے جن کو مکافاتِ عمل پر یقین ہو' جنہیں مستقبل کی زندگی پر ایمان ہو' جنہیں معلوم ہو کہ خدا کے ہاں جا کر ایک ایک چیز کا جواب دینا ہے۔اور وہ اس لیے خدا کے قانون کو زیادہ سے زیادہ اپنے سامنے رکھیں۔ان کے لیے رسول اللہ ﷺ کی یہ روش اسوۂ حسنہ تھی' بہترین نمونہ تھی۔''

عزیزانِ من! ان سطور کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو انسانی رہنمائی کے لیے نظری تعلیم ہی کافی نہیں ہوتی نقوشِ قدم بھی انسان کو متاثر کرتے ہیں۔چنانچہ جنگِ احزاب کا ذکر کرتے ہوئے محترم پرویز صاحبؒ کا کہنا یہ ہے کہ

''یہ نقوشِ قدم کہاں ڈھونڈیں' کہاں تلاش کریں؟ کہا یہ جائے گا کہ بالآخر ہمارے پاس تاریخ ہی تو ہے اس میں سے یہ نکلے گا۔سیرت پہ جو کتابیں لکھی گئیں وہ سینکڑوں ہزاروں ہیں۔تیرہ صدیوں میں دیکھیں تو شاید لاکھوں کی تعداد میں پہنچ جائیں۔تو یہ اس تاریخ میں سے لکھی گئی ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ اس تاریخ میں جو کچھ بھی رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کیا گیا ہے' کیا وہ صحیح اسوۂ حسنہ ہے؟ یہ تاریخ انسانوں کی لکھی ہوئی ہے۔وہ بھی جو پہلی مستند تاریخ' رسول اللہ ﷺ کے اڑھائی سو سال بعد لکھی گئی ہے۔اس سے پہلے کوئی WRITTEN MATERIAL (تحریری مواد) نہیں ہے' صرف زبانی روایات ہیں۔پہلی تاریخ' طبری لکھتا ہے۔سیرت پر ابنِ ہشام اور اسحاق کی دو ایک پہلے بھی ہیں۔-------------------------------مخالفین اور مستشرقین اعتراض کرنے والے ہیں' وہ اسی تاریخ سے تو رسول اللہ ﷺ کے خلاف وہ سارے اعتراضات لاتے ہیں۔اگر ہم سند تاریخ کو ہی قرار دیدیں تو اس میں تو کعب بن اشرف کا آپ ﷺ کی طرف سے جھوٹ بولنے کا قصہ بھی ہے۔مخالفین کو تو چھوڑیئے' جو اپنے ہیں وہ بھی رسول اللہ ﷺ کی سیرت میں اسی طرح کی چیزیں لکھتے ہیں۔''

عزیزانِ من! مذکورہ بالا حقائق کے بعد جہاں تک سورۃ سبا کا تعلق ہے تو زیرِ نظر سورۃ سبا کے سلسلہ میں جن جن عنوانات کی نشاندہی کی گئی ہے وہ یہ ہیں:

1۔یہودیت کی کتابوں میں حضرت داؤدؑ کے متعلق حیا سوز قصے جو کتبِ احادیث میں راہ پا چکے ہیں 2۔مودودی صاحب مرحوم کے نزدیک ان واقعات کی تصویر کشی' تفہیم القرآن کے حوالے سے پیش خدمت ہے 3۔قرآنِ حکیم کی روشنی میں حضرت داؤدؑ کے

بیان کردہ قصے کی اصل حقیقت 4۔حضرت سلیمانؑ کے پر شکوہ عہد کے متعلق ہمارے ہاں کے تفسیری قصے 5۔تصویر کشی کو حرام کہنے کے باوجود تصویر کھنچوانے کے عمل پر اعتراض کا جواب 6۔یہودیوں کی تورات کی تفسیر' تالمود کے بیان کردہ اکثر افسانے' ہمارے ہاں کی تفسیروں میں راہ پا گئے 7۔ہمارے ہاں کے ان افسانوں نے حضرت سلیمان کو (معاذ اللہ) جادوگر بنا رکھا ہے 8۔اسمِ اعظم کے قصوں نے قندیلِ آسمانی کو (معاذ اللہ) منتر کی کتاب بنا رکھا ہے 9۔حضرت سلیمانؑ کے متعلق اسمِ اعظم والی انگوٹھی کی تاثیر پر مبنی کہانیاں 10۔حضرت سلیمانؑ کے جانشین حضرت سلیمانؑ کے بیٹے کے متعلق قرآنِ حکیم کا بیان 11۔تصوف کی دنیا میں سیروا فی الارض کا عملی طریق 12۔ہمارے ہاں کی تفسیروں میں حضرت سلیمانؑ کی موت کی کہانی کا بیان 13۔حضرت سلیمانؑ کے بعد آپ کی اس سلطنت کے زوال کی روئیداد 14۔ملکہ سبا کا قصہ 15۔قرآنِ کریم کے الفاظ میں ایک کامیاب حکومت کا نشان یہ ہے' مملکت سر سبز و شاداب ہو اور خدا کی حفاظت میں ہو 16۔ابلیس و آدم کی کشمکش کے تفصیلی قصہ کی نوعیت 17۔دنیائے تصوف کی ساری تگ و تاز جذبات کو مارنے میں مصروفِ کار رہے 18۔مذہبی پیشوائیت کی طرف سے خود ساختہ مذہب کی ملاوٹ سب سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے 19۔آسمانوں پر خدا کی حکومت اور زمین پر انسانوں کے بنائے ہوئے قانون کی پیروی' اسی کا نام شرکِ عظیم ہے 20۔اور آخر پر یہ کہ جناب بوعلی سینا' الرازی اور مسعودی کے بعد صدیوں سے تحقیق کے میدان میں ہماری گاڑی ایک ہی جگہ کھڑی ہے

برادرانِ عزیز! سورۃ فاطر کے متعلق جن عنوانات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے وہ درج ذیل ہیں:

1۔کائنات کو عدم سے وجود میں لانے کے بعد بغیر کسی وقفہ سے نت نئے اضافوں کا ذکر 2۔قرآنِ حکیم نے اپنے ہاں آدم کے قصے کو تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے 3۔کائنات کی تخلیق کا اصل مقصد انسانی جسم کی ربوبیت اور انسانی ذات کی نشو و نما ہے 4۔بچے کی تعلیم اخلاقیات سے شروع کرنی چاہیے 5۔ہمارے ہاں شیطان اور ملائکہ کا مروجہ تصور اور ہزار برس سے ذہنی انتشار کی نوعیت 6۔جب قوموں کی قومیں اپنے سرکش جذبات کو اپنا خدا بنالیں تو دوزخ کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی 7۔شیطان کی زیرِ نگرانی قوموں کی اقتصادیات پر کنٹرول 8۔شیطانی منشور: آنے والی نسل کو تعلیم کے ذریعے اپنا محکوم بنالینا ہے 9۔مومن کی پہچان یہ ہے کہ وہ شیطان کی ہر سازش کو قرآنِ کریم کی تلوار سے ذبح کرتا ہے 10۔کائناتی حقیقتوں کے اصول واقدار کی نوعیت اور انسانی اعمال کی نتیجہ خیزی 11۔انسانی زندگی کی ابتدا پانی سے ہوئی' طین لازب سے ہوئی۔انسانی پیدائش کا موجودہ سلسلہ اپنے اندر اربوں سال کی مسافت لیے ہوئے ہے 12۔غلط تراجم کے پیدا کردہ نتائج کی متضاد کیفیت 13۔اپنی ''میں'' کو دوسروں کے حوالے کرنے والا شخص حیوان کی سطح پر آ پہنچتا ہے 14۔اجڑی ہوئی بستیاں اور کھنڈرات تکذیبِ دین کرنے والوں کا منہ بولتی شہادت ہیں 15۔ہمارے علما کے نزدیک تو آنکھ کا عطیہ دینا بھی حرام ہے۔مودودی صاحب مرحوم کے نزدیک آنکھ ہی نہیں بلکہ جسم کا ہر حصہ بطورِ عطیہ

دینا حرام ہے 16۔لفظ تلاوت کا مفہوم پڑھنا نہیں بلکہ پیروی کرنا ہے 17۔قائداعظمؒ کی کہانی علامہ پرویزؒ کی زبانی 18۔شکرگذاری کو اپنائے بغیر گھر کا ماحول جہنم بنا رہتا ہے

ہمارا خیال ہے کہ اگر ان بیان کردہ تمام حقائق کو بہ نظرِ عمیق دیکھ لیا جائے تو قرآنِ حکیم کی تعلیم کو علیٰ وجہ البصیرت سمجھنے میں یقیناً آسانی ہوگی۔ جہاں تک نبوت کا تعلق ہے تو نبی کی شخصیت وحی کی روشنی میں انسانوں کو شخصیت سازی کے اصولوں سے آگاہ کرتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ تنہا عقلِ انسانی خواہ وہ کتنی بھی بلند ہو جائے وہ وحی کی روشنی کی پھر بھی محتاج رہے گی۔ لہٰذا یہی وہ قندیلِ آسمانی ہے کہ جس کی بنا پر قرآن کی عطا کردہ فکر' انسانی تصورات کو فلک بوس بلندیوں سے ہمکنار کر دیتی ہے۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

محمد اشرف ظفر
نمائندہ بزم طلوعِ اسلام لاہور
دسمبر 2009

پہلا باب: **الاحزاب** (پس منظر، سازشیں اور وسوسے)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جنگ احزاب کا پس منظر

یہ سورۃ الاحزاب ❶ ہے۔ یہ 33 ویں سورۃ ہے۔ حزب کے معنی گروہ ہوتا ہے۔ پہلے تو یہ مکے والے یہ قریش، اکیلے ہی آ کر مدینے پہ حملہ کر کے مسلمانوں کے ساتھ لڑائی کرتے تھے۔ پھر ایک وقت ایسا آ گیا تھا کہ انہوں نے دیکھا کہ ہم اکیلے ان پہ غالب نہیں آ سکتے تو انہوں نے بہت سے Allied (اتحادی) اپنے ساتھ اکٹھے کر لیے۔ جنہیں آج کی اصطلاح میں Allied Forces (اتحادی طاقتیں) کہتے ہیں، ان کو عربی زبان میں احزاب کہتے ہیں۔ یعنی مختلف جماعتوں اور مختلف فوجوں نے اکٹھے ہو کر مدینہ پر حملہ ❷ کیا تھا۔ اور پھر اس جنگ میں انہوں نے پہلی دفعہ، بلکہ عرب نے پہلی دفعہ، اپنے گرد خندق کھودی تھی۔ اسے جنگِ خندق بھی کہتے ہیں اور جنگِ احزاب بھی کہتے ہیں۔ یہ بڑی ہولناک جنگ تھی، قرآنِ کریم میں اس جنگ کا نقشہ آتا ہے کہ مخالفین کی پوری Forces (طاقتیں) حملہ آور ہو گئی تھیں۔ ایک تو اس سورۃ میں یہ بات آئے گی لیکن اس کے اندر اور اہم چیزیں آتی ہیں کہ خود نبی اکرم ﷺ کی جو اپنی عائلی زندگی ہے، اس کے متعلق اس میں بہت سی ہدایات آتی ہیں۔ گھر کی زندگی کے متعلق بہت سی چیزیں بھی آتی ہیں۔ تو گویا اس اعتبار سے بھی یہ اہم ہوا کہ وہ مدنی (Social) اور سیاسی (Political) زندگی کے متعلق جو قوانین تھے ان سے ادھر ہٹ کر، گھروں کی زندگی کے متعلق بھی قوانین قرآن نے دیئے ہیں۔

---

❶ یہ حصہ دسمبر 1979ء کی 14 تاریخ کے سورۃ السجدہ کے درس کے ختم ہونے کے فوراً ہی بعد دیا گیا تھا۔

❷ میدانِ بدر میں مسلمانوں کی فتح نے مخالف عناصر کے حوصلے فی الجملہ پست کر دیئے تھے لیکن جنگ احد (14 شوال 3ھ مطابق 29 مارچ 625ء) کی شکست نے راکھ کے نیچے دبی ہوئی چنگاریوں کو پھر سے ہوا دے دی اور مخالفت وعدوان کے جذبات میں ازسرِ نو سرگوشیاں شروع ہو گئیں۔ اب ان فتنہ پردازیوں کا سب سے بڑا مرکز خود مدینہ تھا جہاں یہ جنگ احزاب ذیقعدہ 5ھ کو لڑی گئی۔ 22,20 روز کی ناکام طغیانیوں کے بعد یہ طوفان جدھر سے اٹھا تھا، خاسر و ناکام اُدھر ہی واپس لوٹ گیا۔ بنی قریظہ (یہودیوں) نے کھلی ہوئی عہد شکنی کی تھی۔ اس لیے ان کی سرکوبی ضروری تھی۔ ان کے خلاف فوج کشی کی گئی۔ قریب ایک ماہ تک وہ محصور رہے اور پھر ان ہی کے مقرر کردہ ثالث کے فیصلہ کے مطابق ان کی قسمتوں کا فیصلہ کر دیا گیا۔ (ماخوذ از پرویزؒ: معراج انسانیت، ادارہ طلوع اسلام، کراچی، 1949، ص ص۔ 538 تا 549)۔

مسجدِ ضرار کے متعلق قرآنِ حکیم کا حکم

قرآنِ مجید کے خلاف جو سازشیں ہوئی ہیں، وہ کھلے بندوں قرآن کا انکار کرنے والوں کی طرف سے نہیں ہوئیں۔ یہ حقیقت میں وہ سازش ہوتی ہے جو مسلمان کا نقاب اوڑھ کر، مذہب کے راستے سے، اسلام کے خلاف سازش کرتے ہیں۔ یہ سب سے زیادہ مہیب اور خطرناک سازش ہوتی ہے کہ لوگ اس کے فریب میں آ جاتے ہیں۔ مدینے میں تو وہ سازش آگے جا کر آئے گی کہ کسی اور طرح سے اس قوم میں تفرقہ نہیں پڑا تو انہوں (منافقین) نے ایک مسجد [1] بنا دی۔ ہمارے ہاں تو یہ ہے کہ جو بھی مسجد بنائے اُس کے لیے جنت میں موتیوں کا گھر بن جاتا ہے۔ مدینے میں یہ کہہ کر مسجد بنائی کہ صاحب! اُس مسجد میں اتنی گنجائش نہیں، اس لیے ایک اور مسجد ہونی چاہیے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ اس کے متعلق پھر کیا حکم آیا تھا۔ خدا کو اس کے متعلق Warn (وارن) کرنا پڑا۔ کہا کہ یہ جو مسجد ہے، یہ حقیقت میں مسجد نہیں ہے، یہ مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے کے لیے ایک سازش ہے، یہ خدا اور رسول کے خلاف مخالفین کی پناہ گاہ ہے، یہ کفر [2] ہے۔ اس مسجد کی تعمیر کفر ہے کیونکہ اس سے مسلمانوں میں تفرقہ پیدا ہو جائے گا۔

عزیزانِ من! آج مسجدیں الگ الگ ہیں، باہر تختی لگی ہوئی ہوتی ہے کہ یہ حنفیوں کی مسجد ہے، اہلحدیث کا اندر آنا منع ہے۔ اب تفرقے کی علامت مسجد ہے۔ اور یہ پہلی مسجد جو مدینے کے اندر بنی ہے تو اس کے متعلق خدا نے رسول اللہؐ سے کہا کہ یہ مسجد نہیں بلکہ خدا اور رسول کے مخالفین کی پناہ گاہ ہے اس لیے کہ اس سے مسلمانوں میں تفرقہ پیدا ہوگا، اس میں جا کر کبھی نہ کھڑے ہونا [3]۔ اس مسجد کو نہ صرف ڈھا دیا گیا بلکہ جلا دیا گیا کہ اس سے تفرقہ پیدا ہوتا ہے۔ اسے سازش کہتے ہیں۔ آج ایک ایک محلے میں تین تین چار چار مسجدیں ہیں۔ ہر پانچویں مسجد جو بنتی ہے وہ بھی جنت کا گھر ہوتی ہے جبکہ وہ مسجد جو بنی تھی اس کو جلا دیا گیا تھا۔ یہ ہے وہ سازش۔ تو پہلی جو سازش ہوئی تھی وہ قرآنِ کریم کے خلاف تھی۔ یہ کتاب خدا کی آخری کتاب ہے، اس نبیؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آنا کہ وہ آ کر اس کے اندر سے کچھ تبدیلیاں یا اعتقادی چیزیں دور کر دے۔

سورۃ الاحزاب کی آیات کی تعداد کے متعلق وسوسہ پیدا کرنے کی سازش

قرآن کی حفاظت کا ذمہ خدا نے لیا ہے۔ کہا ہے کہ **اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ** (15:9) ہم اس کے محافظ ہیں۔ اب دیکھیے کہ کس کس

---

[1] قرآنِ کریم نے اسے مسجدِ ضرار کہا ہے (9:107)۔

[2] قرآنِ مجید کی متعلقہ آیات، جن کا مفہوم اوپر دیا گیا ہے، یہ ہیں: (9:107-110)۔

[3] (9:107-108)۔

قسم کے عقائد اس کے اندر پیدا ہو گئے۔ یہی جو سورۃ الاحزاب ہے اس کے متعلق ایک حدیث میں ہے کہ حضرت سجادؓ ایک صحابی تھے، جن سے ایک دوسرے صحابی حضرت ابی بن کعبؓ نے پوچھا کہ سورۃ الاحزاب میں کتنی آیتیں ہیں۔ سورۃ الاحزاب جو اس وقت قرآنِ کریم میں ہے، اس میں 73 آیتیں ہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ 73 آیتیں ہیں۔ وہ کہنے لگے کہ نہیں! میں نے دیکھا تھا کہ سورۃ الاحزاب میں تو سورۃ البقرہ جتنی آیتیں تھیں۔ کہنے لگے کہ رسول اللہؐ کے زمانے میں ہم نے دیکھا کہ اس میں 286 کے قریب آیتیں تھیں۔ یعنی اسی زمانے میں ایک ہی سورۃ میں سے 213 آیتیں ہی گم ہیں۔ یہ روایت ہے اور دونوں صحابیوںؓ کے متعلق بات ہو رہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس میں 286 کے قریب آیتیں تھیں۔

میں اتنا عرض کروں کہ یہ چیز کتنی خطرناک تھی۔ اس سارے قرآنِ کریم کے 30 پاروں میں پوری تعلیم دینے کے بعد، آخر میں اس نے مسلمانوں کو متنبہ کیا ہے تو وہ اس بات سے کیا ہے کہ **قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ . مَلِكِ النَّاسِ . اِلٰهِ النَّاسِ . مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ . الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ . مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ** (114:1-5) اس چیز سے بچنا کہ یہ جو وسوسہ اندازی کرتے ہیں یعنی لوگوں کے کان میں کچھ پھونکتے ہیں، اور دلوں کے اندر وسوسہ پیدا کر دیتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے ان کو خناس کہا ہے کہ یہ دبے پاؤں آکر، کان میں کچھ کہہ کے، دبے پاؤں پیچھے چلے جانے والے ہیں۔ عزیزانِ من! قرآن اس پہ ختم ہو جاتا ہے۔ تو گویا کسی قوم کے لیے سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ سازش کرنے والے وسوسہ اندازی کریں۔ وہ ایسے بات کرتے ہیں کہ "تمہیں ان کے متعلق پتہ ہے کہ وہ بڑے نمازی پرہیزگار بنے پھرتے ہیں، بڑا دیانتدار بنا پھرتا ہے لیکن پوچھو نہیں صاحب! کہ اندر کی بات کونسی ہے لیکن ہمیں اس بات سے کیا لینا، ہم نے کوئی اس کی قبر میں تھوڑی جانا ہے"۔ یہ کہا اور چل دیئے۔ قرآن کی حفاظت کا ذمہ خدا نے لیا تھا۔ اس میں کوئی ایک حرف کی تبدیلی بھی نہیں کر سکتا تھا اور نہ کر سکا ہے۔ لیکن **یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ** .(114:5) آج تک مسلسل چلا آ رہا ہے۔ آپ سوچیے کہ ایک صحابیؓ کی طرف سے جب آپ کے ہاں یہ روایت آئے کہ انہوں نے کہا تھا کہ ہم نے تو رسول اللہؐ کے زمانے میں اس سورۃ الاحزاب میں 286 آیتیں دیکھیں اور اب اس میں 73 ہی آیتیں ہیں تو اس سے دل کے اندر ایک بات آ گئی کہ صاحب! پھر ہوا کیا؟ اب بات آگے چلی۔ کیا ہوا جی؟ ہوا کیا "رب دیاں پرمیشور جانڑے توں گل اے چھڈ، بس تہتر ہیگیاں نیں ہیگیاں نیں"❶۔

---

❶ رب کی باتیں رب جانے۔ تم یہ بات ہی چھوڑ دو۔ بس 73 ہی ہیں، 73۔

زنا کی سزا کے متعلق قرآنِ حکیم کے برعکس شریعت کا ایک الگ موقف اور اس کی روئداد

اب آپ کے ہاں شریعت کے قانون نافذ ہوئے ہیں [1]۔ اس میں زنا کی سزا سنگسار کرنا ہے۔ قرآن میں تو یونہی سو درّے یعنی کوڑے لکھی ہوئی ہے اور یہ جو آپ کے ہاں قانون نافذ ہوا ہے اس میں سنگسار کرنا بھی ہے۔ اس میں فرق یہ کیا ہے کہ اگر غیر شادی شدہ زنا کے مرتکب ہوں تو ان کو تو کوڑے لگائے جائیں، اگر وہ شادی شدہ ہوں تو ان کو سنگسار یعنی زمین میں گاڑ کر پتھر مار مار کر مار دیتے ہیں۔ قرآن میں تو سنگسار ہے ہی نہیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ جو 286 آیتوں میں سے 213 آیتیں نہیں ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی آیت تھی۔ اب یہ آپ کے ہاں قانون بنا ہوا ہے اور ہزار برس سے چلا آ رہا ہے، آج اس کی تجدید ہوئی ہے کہ وہ جو شادی شدہ ہے اس لیے یہ ہے۔ کہا کہ تم اس کو کہاں سے لیتے ہو، جواب دیا کہ جی، وہ جو سورۃ الاحزاب کی 213 آیات گم ہو گئی تھیں، ان میں یہ آیت بھی تھی۔ اب اس کے بعد تجویز ہوئی کہ صاحب! یہ تو بڑی اہم آیت ہے، یہ تو قانون کی آیت ہے، اب وہ اس کے بعد اس آیت کی تفصیل کا سلسلہ چلا کہ ہوا کیا۔ باقی آیتوں کے متعلق تو پتہ نہیں لیکن اس کے متعلق آپ کے ہاں کتبِ تفاسیر میں بڑی تفصیل سے لکھا ہوا ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانے (634-644/45AD) میں اس معاملے نے بڑی اہمیت اختیار کی کہ کیا کیا جائے۔ یعنی یہ روایت میں ہے کہ حضرتِ عمرؓ (581-644/45 AD) نے کہا کہ ہم بھی اس زمانے میں رسول اللہؐ کے ساتھ یہ آیت پڑھا کرتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ اگر آپ پڑھا کرتے تھے تو آپؓ سے زیادہ مستند کون ہو سکتا ہے تو اس کو قرآن میں لکھ دیجیے۔ کہنےؓ لگے کہ ''نہیں یار! لوگ کہن گے کہ عمرؓ نے بڑی زیادتی کِتی ہیگی اے کہ قرآن اچ لکھ دتا'' [2]۔ اُنہوں نے کہا کہ پھر کیا کیا جائے کہ خدا کا یہ حکم ہے اور قرآن میں آپ لکھتے نہیں ہیں؟ اُنہوںؓ نے کہا کہ بھئی! پھر ایسا ہے کہ قرآن میں تو اس کو نہ لکھا جائے لیکن عمل اسی حکم کے اوپر کیا جائے۔ تو اس طرح سے یہ آپ کے ہاں قانون بنا۔ ان سے کہا گیا کہ کچھ کوشش تو کرو، ممکن ہے کہیں سے مل جائے۔ چنانچہ انہوں نے ڈھونڈنا شروع کیا۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے ڈھونڈتے حضرتِ عائشہؓ تک پہنچے۔ یہ حدیث کی کتاب میں ہے۔ ان سے پوچھا کہ اماں جان! آپ کو اس آیت کا کچھ پتہ ہے؟ کہنے لگیں کہ ہاں بیٹا! مجھے معلوم ہے کہ ایک یہ آیت تھی اور ایک بچے کو دودھ پلانے والی آیت تھی، یہ دونوں آیتیں کھجور کے پتے پہ لکھی ہوئی تھیں اور وہ پتے اندر چارپائی کی پائنتی پہ کہیں پڑے ہوئے تھے۔ کہنے لگے کہ جی، پھر وہ دیدیجیے۔ کہنے لگی کہ بیٹا! کہاں سے دیدوں، جس دن رسول اللہؐ کی وفات ہوئی ہے، یہاں قیامت مچی ہوئی تھی، رونا دھونا ہوا ہے، تو میری بکری جو باہر بندھی ہوئی تھی اس

---

1. یاد رہے یہ بات دسمبر 1979ء کو کہی گئی تھی۔
2. نہیں یار! لوگ کہیں گے کہ عمرؓ نے بڑی زیادتی کی کہ قرآن میں لکھ دیا۔

نے رسی تڑالی' ہم تو ادھر لگے رہے اور وہ بکری ادھر آئی اور وہ کھجور کے پتے کو کھا گئی۔ عزیزانِ من! سچ کہا تھا قرآن کریم نے کہ **يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ** (114:5)۔ جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ اندازی کرتے ہیں۔ نظر آتا ہے کہ خدائے علیم وخبیر نے جو کہا کہ **اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ** (15:9) ہم نے اسے نازل کیا ہے اور ہم اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔ ''ٹھیک ہے جی' حفاظت کی ذمہ داری لو لیکن بکری نہیں تہاڈے کولوں چھڑائی گئی''۔ عزیزانِ من! ہنسیے نہیں' رویئے۔ یہ آیت کی بات نہیں بلکہ ہزار تیرہ سو برس سے یہ چیزیں مسلسل آپ کے ہاں ان احادیث کی' تفسیر کی' کتابوں میں چلی آ رہی ہیں۔ یہ ہے جی وہ سورة الاحزاب جو آج ہمارے سامنے آئی۔

خدا کی طرف سے عطا کردہ دین قرآنِ حکیم میں دے دیا گیا جو محفوظ ہے

عزیزانِ من! خدا نے اس کتاب کے بارے میں کہا کہ **تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ** (6:115) ہم نے جو کچھ انسانی ہدایت کے لیے کہنا تھا اس میں مکمل کر دیا' اس میں کسی اضافے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو اس کے اندر نہیں ہے وہ دین نہیں ہے۔ دین جتنا ہے اس کے اندر آ چکا ہوا ہے' اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی' اس کے اندر کوئی تغیر وتبدل نہیں کر سکتا۔ **اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ** (15:9) ہم اس کے محافظ ہیں۔ اور یہ کہنے کے بعد کہا کہ اب نبوت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ خاتم النبینؐ کے معنی سامنے آ گئے۔ اور یہاں یہ صورت ہے کہ قرآن کی ایک سورة میں سے بتا رہے ہیں کہ 213 آیتیں گم ہو گئیں۔ اہم ترین آیت تھی اس کی تلاش ہوئی تو پتہ چلا کہ وہ بکری کھا گئی۔ یہ ہزار برس سے مانتے چلے آ رہے ہیں اور یہ حکم آپ کے ہاں موجود ہے کہ شادی شدہ کو رجم کیا جائے گا۔

عزیزانِ من! میں بڑی جگر شگافی کے بعد یہ باتیں کہتا ہوں' نہ پوچھیے کہ مجھ پہ کیا گزرتی ہے۔ یہ قوم قرآن کی ماننے والی ہے' غیر قوموں کے اعتراضات کا جواب تو ہم دے سکتے ہیں لیکن اس کا جواب دیجیے کہ جو یہ کہتا ہے کہ یہ حدیث نہیں ہے تو وہ منکرِ حدیث قرار پاتا ہے۔ ہزار عالم نے ہمارے خلاف کفر کا فتویٰ دیدیا ہے کہ یہ کہتا ہے کہ یہ حدیث نہیں ہے۔

عزیزانِ من! اب درس کا وقت ختم ہوا۔ آئندہ ہم سورة الاحزاب سے ہی درس شروع کریں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

❀❀............❀❀............❀❀

دوسرا باب: **الاحزاب** (آیات 1 تا 6)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج دسمبر 1979ء کی 21 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الاحزاب سے ہوتا ہے: (33:1)۔

احزاب کی شکل میں مدینہ پر کفار کی لشکر کشی اور اس کے اسباب

سورۃ الاحزاب کے متعلق ابتدائی باتیں میں نے پچھلے درس میں پیشِ خدمت کر دی تھیں۔ یہ جو احزاب ہے یہ Allied (متحدہ) کے معنی میں آتا ہے یعنی بہت سے لشکر یا فوجیں یا مخالفین اکٹھے ہو کر جب کسی کے مقابلے میں نکل آئیں تو اس کے لیے احزاب کا لفظ ہے۔ حزب گروہ کو کہتے ہیں' احزاب اس کی جمع ہے۔ تو یہ وہ جنگ [1] ہے جس میں قریب قریب تمام مخالف قوتیں لشکر کشی کر کے مدینے پہ حملہ آور ہو گئی تھیں۔

آپ کو یاد ہے کہ ہجرت کے بعد نبی اکرم ﷺ مکے سے مدینے تشریف لے آئے تو ان لوگوں کو پیچھا چھوڑ دینا چاہیے تھا لیکن انہیں معلوم تھا کہ یہ پیغام یا نظام جو پیش کیا جا رہا ہے اُس سے یہی نہیں ہے کہ کچھ مکے والوں کی مخالفت مقصود ہے بلکہ انہیں پتہ تھا کہ اگر یہ

---

[1] ذیقعدہ ۵ھ۔

نظام دنیا کے کسی خطے میں بھی قائم ہوگیا تو جتنی چیزیں' جتنے مراعات' جتنے بھی مفادات' انہیں اور بالخصوص قریش کو ان کے باطل کے نظام میں حاصل ہیں تو وہ سب چھن جائیں گے۔ان کے ہاں یوں سمجھیے کہ حکومت ان کی اپنی تھی' جو سرداران قوم تھے وہی ان کے حاکم تھے۔ کعبے کے متولی مجاور ہونے کی جہت سے مذہبی پیشوائیت کے جتنے مفاد تھے وہ تمام ان کو حاصل تھے۔نسلی تفاخر کی بنا پر جو مفاد ہونے چاہئیں تھے' وہ پہلے تو ان قبائلِ عرب میں سے اہل حجاز کو حاصل تھے اور پھر اہلِ حجاز میں سے قریش تو سرِ فہرست تھے۔اور انہیں یہ نظر آ تا تھا کہ یہ نظامِ مساوات اور عدل اور انصاف اگر کہیں بھی قائم ہو گیا تو دنیا کھنچ کر اس کی طرف چلی جائے گی۔اور یہ ہمارے مفادات جو ہم نے اس طرح سے انسانیت سے چھین رکھے ہیں وہ تمام کے تمام ختم ہو جائیں گے۔اس لیے یہ مخالفت نہ ذاتی کسی ابوجہل کی تھی' نہ نبی اکرم ﷺ کی ذات کے خلاف تھی بلکہ یہ اس نظام کے خلاف تھی جس کی دعوت حضورؐ دے رہے تھے اور جسے قائم کرنے کے لیے یہ تگ وتاز ہو رہی تھی اور اس کے لیے آپؐ ہجرت کر کے مدینے بھی تشریف لے آئے تھے۔قریش کو معلوم تھا کہ اس نظام کے قیام کے لیے وہ فضا زیادہ سازگار ہے اس لیے ان کی مخالفت اور زیادہ شدید اور تیز ہو گئی۔ یہ حضرات مکے میں تیرہ برس رہے' وہاں اُنہوں نے تکلیفیں پہنچائیں' اذیتیں دیں لیکن جنگ کی شکل اختیار نہیں کی۔ جب یہ مدینے میں آ گئے ہیں تو قریشِ مکہ نے سن 2 ھجری میں اپنی پوری قوت سے مدینے پر حملہ کر دیا۔اور یہ بے گھر' بے در' بے کس' ناتواں اور ساری جماعت اکٹھی کی تو یہ کل 300 افراد ہوئے۔دوسروں کے ہاں آ کر قیام پذیر ہوئے' وہاں ابھی پاؤں بھی ٹکنے نہیں پائے تھے کہ یہ اتنا بڑا لشکر حملہ آور ہو گیا۔ یہ پہلی لڑائی بدر کے میدان میں ہوئی اور وہاں قریشِ مکہ نے شکست کھائی۔اس کے بعد پھر انہوں نے یورش کی اور اس سے بھی زیادہ جمِ غفیر لے کر' عظیم لشکر لے کر' وہ آئے۔اسے جنگِ احد❶ کہا جاتا ہے اور یہاں بھی ان کو شکست ہوئی۔اس کے بعد سن 5 ہجری میں قریش نے دیکھا کہ اگر ہم تنہا جاتے ہیں تو شکست کھا جاتے ہیں اس لیے انہوں نے مختلف قبائل کو اکٹھا کیا۔

سرمایہ پرستی انسانی صداقت اور حق گوئی کی جرأت کو مفلوج کر دیتی ہے

مدینے کے اندر جو یہودی تھے وہ بڑے ہی منافق تھے۔ یہ جتنے سرمایہ پرست لوگ ہوتے ہیں یا قومیں ہوتی ہیں وہ کھلے ہوئے دشمن نہیں ہوتے۔دولت کی محبت تو صداقت اور حق گوئی کی جرأت کو باقی ہی نہیں رہنے دیتی۔مدینے میں یہ یہودی تھے تو یہاں وہ منافقت کرتے تھے اور اس کے بعد غداری سے قریشِ مکہ کے ساتھ ساز باز کرتے تھے کہ تم آ ؤ' حملہ کرو' تم باہر سے حملہ کرو' ہم اندر سے ان کی مخالفت کریں گے اور اس طرح ان کو ختم کر دیں گے۔اس طرح انہوں نے ساری جماعتوں کے لشکروں کو جو اکٹھا کیا تو اسے احزاب کہا جاتا ہے۔

---

❶ 14/شوال 3ھ مطابق 29/مارچ 625ء

وحی کی روشنی میں نبی اکرم ﷺ کی ذاتی زندگی کے خدوخال

پہلی جنگِ عظیم میں جسے Allied Forces کہا کرتے تھے' جسے متحدہ محاذ کہا جاتا ہے' تو اس سورۃ میں بڑا واقعہ تو جنگِ احزاب کے متعلق ہی ہے لیکن اس کے ساتھ اب قرآنِ کریم یہ جو معاشرتی یا عائلی یعنی گھر کی جو زندگی ہے' اُسے بھی سامنے لاتا ہے۔اور یہاں سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ گھر کے اندر کی جو زندگی ہے اس زندگی کا صحیح خطوط پر پُرسکون ہونا' باہر کی فتح اور کامیابی کے لیے کتنا ضروری ہے۔ یہ قرآن کی بڑی چیز ہے اور نبی اکرم ﷺ کی صداقت اور شہادت کا ثبوت ہے کہ خود حضور ﷺ کے گھر کے اندر کے جو واقعات ہیں وہ اس طرح سے وحی کے ذریعے حضورؐ پر تو آئے۔حضورؐ چاہتے تو وہ کبھی بھی ان کو باہر نہ آنے دیتے' دوسرے کسی کو تو معلوم ہی نہیں ہوسکتا تھا کہ وحی کے ذریعے کیا کچھ کہا گیا ہے لیکن اس میں ایسی چیزیں بھی آتی ہیں جن کو عام معنی میں تنبیہ بھی کہا جائے گا' سرزنش بھی کہا جائے گا' یہ چیزیں بھی اس کے اندر ہیں۔حضورؐ کی صداقت یہ ہے کہ ان کو اسی طرح برسرِ عام لاتے ہیں کہ جو وحی خدا کی طرف سے آتی ہے' اُس وقت بھی پیش کی گئی اور قرآن کے اندر آج بھی اسی طرح سے محفوظ ہے۔اور یہیں سے تو حضورؐ کی سیرت کی بلندی کی اور پاکیزگی کی شہادتیں ہمیں ملتی ہیں۔تو اس سورۃ میں جنگِ احزاب تو اس کا نقطۂ ماسکہ ہے لیکن اس کے گرد حضور ﷺ کی ذاتی عائلی زندگی کے متعلق واقعات آتے ہیں جن میں ہمارے لیے بڑا بنیادی سبق محفوظ ہے۔ یہ ہے اس سورۃ کا موضوع جواب ہمارے سامنے آتی ہے۔

بعض مقامات پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی اکرمؐ سے مخاطب ہونے کا مقصد اجتماعی طور پر بھی مخاطب ہونا ہوتا ہے

اب سورۃ الاحزاب کی ابتدا ہوتی ہے۔کہا کہ **يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ** (33:1)۔اس کا عام ترجمہ تو یہ کیا جاتا ہے کہ اے نبی! خدا سے ڈرو۔جیسا میں نے عرض کیا تھا کہ تقویٰ کے معنی ڈرنے کے نہیں ہیں۔تقویٰ کے معنی ہیں کہ ''قوانینِ خداوندی کی زیادہ سے زیادہ نگہداشت کرنا' بہت زیادہ محتاط رہنا' خطرات سے آگاہ ہونا' ان سے حفاظت کی تدابیر اختیار کرنا''۔اب یہاں خطاب تو نبی سے کیا جا رہا ہے اور یہ جو **اِتَّقِ اللّٰهَ** کہا گیا ہے تو اس میں واحد کا صیغہ بھی ہے تو گویا مخاطب خود نبی اکرم ﷺ ہیں لیکن قرآن کا انداز یہ ہے کہ وہ بعض مقامات پر مخاطب تو رسول اللہ ﷺ کو کرتا ہے مقصد اس سے پورے مسلمانوں کی جماعت کے لیے کچھ ہدایات دینا ہوتا ہے۔حضورؐ کے Through (توسط سے) وہ ہدایات امت کی طرف پہنچائی جا رہی ہوتی ہیں۔ بہت سے مقامات ہیں جو آگے آئیں گے تو میں عرض کرونگا کہ کہاں یہ کچھ کہا گیا ہے۔ایک مقام دیکھ لیجیے۔**يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ** (65:1) مخاطب نبی اکرم ﷺ ہیں۔**اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ**

(65:1)۔ یہاں جمع کا صیغہ ہے کہ جب تم لوگ طلاق دو' نکاح کا معاہدہ فسخ کرنے کا ارادہ کرو۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ مخاطب صرف نبی اکرمؐ ہیں اور اس کے بعد جمع کا صیغہ استعمال کیا کہ **طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ** یعنی جب تم لوگ یہ کرو۔ رسول اللہ ﷺ جب مخاطب تھے تو واحد کا صیغہ ہونا چاہیے تھا کہ جب تُو یہ کچھ کرے تو یہ کرو۔ لیکن اس کے بعد جمع کا صیغہ آ رہا ہے اور اس کے بعد جتنی ہدایات ہیں' وہ ساری کی ساری جمع کے صیغے میں امت کے لیے ہیں۔ مجھے یہ اس لیے کہنا پڑا کہ یہاں سے بڑے الجھاؤ پیدا کر دیئے جاتے ہیں کہ خدا نے رسول سے یہ کہا یا خدا نے نبی سے یہ کہا۔ خدا نے نبی سے کہا تو امت تک پہنچانے کے لیے کہا ہے۔ یہاں بھی یہ ہے۔ ٹھیک ہے خود رسول اللہ ﷺ کو بھی تاکید کی جا رہی ہے کہ بڑی احتیاط برتو۔ اگلے الفاظ خود یہ بتا رہے ہیں لیکن یہ صرف رسول اللہ ﷺ کی ذات کے لیے یہ احکام نہیں ہیں۔ اُس وقت بھی پوری امت کے لیے تھے اور اس کے بعد بھی ساری امت کے لیے ہیں۔ اور جو میں نے عرض کیا ہے کہ پہلا لفظ تو واحد کے صیغے میں ہے اور اسی آیت میں بات صاف ہو گئی کیونکہ آیت کے آخر میں ہے **اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا** (33:2)۔ یہ **تَعْمَلُوْنَ** تو جمع کا صیغہ ہے کہ تم لوگ جو کچھ بھی کرتے ہو' اللہ اس سے باخبر ہوتا ہے۔ یہ اگر پہلے واحد کا صیغہ ہے تو یہ تم لوگ یہاں کیوں آیا۔ میں نے عرض کیا کہ قرآن کا یہ اسلوب ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کرتا ہے اور وہ ہدایات پوری امت کے لیے ہوتی ہیں۔ تو یہ جو ہے کہ محتاط رہو تو ٹھیک ہے سب سے پہلی چیز تو یہ رسول اللہ ﷺ کے لیے تھی۔ میں ابھی عرض کرونگا کہ یہ احتیاط کی تاکید کیوں کی گئی تھی۔ کہا تھا کہ **لَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ**[1] (33:1)۔ یہ ہے وہ اصل مقصد۔

میدانِ جنگ میں مخالفین سے محتاط رہنے کی تلقین

یہاں جو دو جنگیں[2] قریش نے لڑیں اور ان میں شکست کھائی تو یہ تیسری[3] جنگ ہے جس کی تیاریاں اُدھر ہو رہی تھیں۔ تو مدینے میں یہ جو بڑھتی ہوئی قوت ہے' اس کو ئی مملکت کہہ لیجیے' اُس میں مخالفین کی طرف مفاہمت کرنے کا' Compromise کرنے کا' ایک حربہ استعمال ہوا کرتا ہے۔ سیاست میں تو یہ عام روش ہے کہ جب فریقِ مخالفت کے ساتھ تصادم میں دیکھیے کہ شکست کا امکان ہے' کامیابی نہیں ہو سکتی تو مفاہمت کے لیے آگے بڑھ جایئے۔ میکاوَلی[4] سیاست میں تو چونکہ اصول پرستی ہوتی ہی نہیں ہے اس میں تو مفاد

---

1. (مفاہمت کے خیال سے) ان لوگوں کی بات نہ مان جو اس قانون سے کھلا ہوا انکار کرتے ہیں' یا جو زبان سے تو اقرار کرتے ہیں اور دل سے اسے صحیح مانتے ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔963)۔
2. جنگِ بدر (17 رمضان 2ھ مطابق 13 مارچ 624ء) اور جنگِ اُحد (14 شوال 3ھ مطابق 29 مارچ 625ء)
3. جنگ احزاب (ذیقعدہ 5ھ)
4. میکاوَلی سیاست کے خدوخال کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ حج' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص ص۔94 تا 95 نیز ص۔98 کا فٹ نوٹ 1۔

پرستی ہوتی ہے‘ خواہ وہ ٹکراؤ سے حاصل ہو جائے‘ مفاہمت سے حاصل ہو جائے اور اُس سے بھی کہ کچھ تم جھکو کچھ ہم جھکتے ہیں‘ کچھ تم بڑھو کچھ ہم بڑھتے ہیں۔ تو یہ جو مفاہمت ہے یہ تو میکاؤلی سیاست کا عام انداز ہے۔ وہ لوگ بھی اس حربے کے اوپر اتر آئے۔ قریشِ مکہ نے بھی یہ کیا کہ اس ٹکراؤ سے کام چلتا نہیں ہے‘ آیئے ان سے مفاہمت کی گفتگو کریں‘ مصالحت کی گفتگو کریں۔ اب ظاہر ہے کہ اگر بات تو ایک حکومت کی دوسری حکومت سے ہوتی تو مفاہمت وہ کر لیتے اور Compromise بھی کر لیتے۔ یہاں تو اصول کی جنگ ہو رہی تھی۔

حق کی بنا پر اصول پرستی پر قائم رہنا ضد نہیں کہلاتا

اصول کی جنگ میں مفاہمت تو ایک طرف رہی وہاں تو آدمی ایک قدم بھی پیچھے ہٹ جائے تو اس کے بعد وہ صداقت اور سچائی پہ رہتا ہی نہیں ہے۔ جیسے میں عام طور پہ مثال دے کر سمجھایا کرتا ہوں کہ دو اور دو چار ایک اصول ہے۔ اگر اس پہ لڑائی ہو اور دوسرا کہہ رہا ہو کہ نہیں دو اور دو چھ ہوتے ہیں یا پانچ ہوتے ہیں لیکن یہ کہے کہ چار ہوتے ہیں۔ آپس میں جھگڑا ہو اور جھگڑے کے بعد وہ تیسرا درمیان میں آ جائے کہ میاں! آپس میں جھگڑنے سے فائدہ کیا ہے اور یہ تو ضد ہے۔ لہٰذا کچھ تم جھکو‘ کچھ یہ جھکیں اور مان لیجیے کہ یہ چھ سے پانچ پہ آ جائے اور تم چار سے پانچ پہ آ جاؤ لہٰذا دو اور دو پانچ کہہ دیجیے۔ نہ اس کی رہی نہ تمہاری رہی‘ میاں! یہ ٹھیک ہے ناں۔ تو یہ تو واقعی جی کو لگتی بات ہے لیکن یہ دو اور دو چھ والے کی تو اب بھی جیت ہے۔ اس نے تو دو اور دو چار کے اصول کو توڑنا تھا‘ اب چھ کہہ دو تب بھی ٹوٹا یا پانچ کہہ دو تب بھی ٹوٹا۔ یہ دو اور دو چار کو دو اور دو پانچ کہہ کر مان گیا ہے۔ اس کے ہاتھ میں کیا رہا؟ شکست تو اس کی ہوئی۔ اس لیے حق اور باطل میں مفاہمت ہو نہیں سکتی:

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
شرکت میانہ حق و باطل نہ کر قبول

عزیزانِ من! یہ ہے اسلام۔ اس کے مخالف جو مذموم لفظ استعمال کرے گا وہ ہوگا ضد کہ یہ بڑا ضدی ہے۔ جو اصول پرستی ہے اس کو تو وہ ضد کہے گا کیونکہ اس کے خلاف جاتی ہے۔ ضد اور اصول پرستی میں فرق ہی یہ ہے۔ ضد باطل پہ ہوتی ہے‘ اصول پرستی حق پہ ہوتی ہے۔ حق والا اگر ذرا سا بھی اپنے مقام سے اِدھر اُدھر ہو گیا‘ پھسل گیا‘ ذرا سی مصالحت کر لی تو پھر یہ حق پہ نہ رہا۔ باطل کے یہ معنی نہیں ہیں کہ پورے کا پورا ہی باطل پہ ہو بلکہ وہ تو دو اور دو چھ سے‘ دو اور دو پانچ ہو‘ تب بھی باطل ہی ہے لیکن جونہی اس نے دو اور دو چار سے الگ ہٹ کر کچھ اور کہا تو پھر حق اس کے پاس نہیں رہا اور یہ بھی باطل پہ آ گیا۔ وہ چاہتے ہی یہ ہیں کہ باطل پہ آ جائے۔

قرآنِ کریم نے خود یہ بیان کیا ہے کہ اب یہ لوگ کیا حربہ استعمال کریں گے۔ میں نے کہا ہے کہ یہ وہ مقام ہے جہاں یہ قریش

دو بار شکست کھا چکے ہیں' ان میں پھر مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ تو وہ اس حربے کے اوپر اتر آئے کہ ان کے ساتھ مفاہمت کرو۔ ادھر مدینے کے یہودیوں کو بھی یہ معلوم ہو گیا تھا کہ یہ بڑی قوت اختیار کرتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ بھی اس کے لیے آگے بڑھ رہے تھے کہ مفاہمت کرو۔ قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ **وَ اِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیَاتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَ نَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ** (10:15) جب تُو ان کے سامنے قوانینِ خداوندی کو پیش کرتا ہے تو یہ بنیادی طور پر تو قانونِ مکافاتِ عمل جو کہ اصل میں اسلام اور ایمان ہے' کو نہیں مانتے۔ جو اس سے انکار کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ میاں! ضد سے کیا حاصل ہے۔ اس قرآن کی جگہ کوئی اور قرآن لاؤ تو ہم ماننے کے لیے تیار ہیں۔ اور اگر سارے کا سارا نہیں لا سکتے تو اس میں کچھ تبدیلی ہی کر دو۔

کفار کی طرف سے مفاہمت کے مطالبہ پر نبی اکرمؐ کا ارشاد

عزیزانِ من! اب وہ ان شرائط کے اوپر آ رہے ہیں کہ آؤ! باہمی مفاہمت کر لو۔ جواب یہ دیا جاتا ہے کہ **قُلْ مَا یَکُوْنُ لِیْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ** (10:15) اے رسول! ان سے کہہ دو کہ اگر قرآن میری اپنی تصنیف ہوتا' میرا اپنا وضع کردہ ضابطۂ قوانین ہوتا تو یہ ممکن تھا کہ میں اس کو Reconsider (از سرِ نو غور) کر لیتا' میں اس پہ نظرِ ثانی کر لیتا اور اس میں کوئی تبدیلی کر دیتا۔ ارے بابا! یہ میرا ہے ہی نہیں' یہ تو خدا کا ضابطۂ قوانین ہے اور میرے ذریعے تم لوگوں تک پہنچایا جاتا ہے۔ مجھے اس کا اقتدار و اختیار نہیں ہے کہ میں اس میں تبدیلی کر دوں۔ نہ اس کی جگہ دوسرا قرآن لا سکتا ہوں' نہ اس میں کوئی کسی قسم کی تبدیلی کر سکتا ہوں۔ **اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ** (10:15) جو کچھ میری طرف نازل ہوتا ہے میں تو خود اس کا اتباع کرتا ہوں۔ میں تو اپنی خاطر بھی اس میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ **اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ** (10:15) تم تو ایک طرف رہے اگر میں بھی اس کی کہیں خلاف ورزی کروں تو مجھے بھی عظیم سزا ملے گی۔ تمہیں تو شاید عام سزا ملے' مجھے تو سخت ترین سزا ملے گی۔ یہ تھا جو وہ چاہتے تھے کہ مصالحت ہو جائے' مفاہمت ہو جائے' قرآن کی جگہ کوئی اور قرآن لے آؤ یا اس میں تبدیلی کر دو۔

قرآنِ حکیم کے علاوہ مثلہ معہ کے عقیدہ کی نوعیت اور قرآنِ حکیم کا چیلنج

معاف کیجیے گا جگر خراش باتیں کہنا پڑتی ہیں۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ یہاں تو شکست ہوئی ہے۔ اس کے بعد جب یہ رسول اللہ ﷺ کا اور صدرِ اسلام کا اولیں دور ختم ہو گیا جس میں قرآن میں کسی قسم کی تبدیلی پیدا کرنا ناممکن تھا' وہ دوسرے راستے سے آپ کی طرف آئے' نئے عقائد وضع کیے۔ کیا آپ کو پتہ ہے کہ ایک مسلمہ عقیدہ اس کے بعد وضع کیا گیا جو آج تک چلا آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو ایک تو قرآن ملا تھا اور مثلہ معہ' قرآن کی مثل قرآن کے ساتھ' کچھ اور بھی تھا۔ قرآن بار بار یہ چیلنج دیتا ہے کہ اگر تمہیں اس کے منجانب

اللہ ہونے میں کوئی شک وشبہ ہو تو تم اس کی ایک سورۃ کی مثل بنا کر لے آؤ' دس آیتیں ہی اس کی مثل بنا کر لے آؤ۔قرآن چیلنج دے رہا ہے کہ اگر تم لے آؤ گے تو میں شکست مان جاؤنگا۔

آج سنیوں اور شیعہ حضرات کے ۱۰ مستند ترین مجموعے 14 لاکھ روایات پر مشتمل ہیں

یہاں آپ کے اندر یہ عقیدہ پیدا کر دیا گیا ہے کہ مثلہ معہ' قرآن کے ساتھ قرآن کی مثل' اور دوسرا بھی ہے' یہ دوسرا روایات کے مجموعے ہیں جنہیں نہ رسول اللہ ﷺ نے دیا اور نہ صحابہؓ نے دیا۔ یہ دو اڑھائی سو سال بعد بغیر کسی تحریری ریکارڈ کے' بغیر کسی سند کے' نہ رسول ﷺ کی سند' نہ صحابہؓ کی سند' جمع کیے گئے۔اور وہ کوئی ایک ہی نہیں بلکہ چھ تو سُنّیوں کے ہاں صحیح ترین ہیں اور چار مستند ترین شیعہ حضرات کے ہاں ہیں۔ان سب مجموعوں کی کل روایات ملا کر 14 لاکھ روایات بنتی ہیں۔اب یہ سارے کے سارے ہیں اور ان کے مقابلے میں یہ بیچارہ چھوٹا سا قرآن ہے اور یہ اس کی مثلہ معہ یعنی قرآن کی مثل قرآن کے ساتھ' رکھ دی گئی ہے۔اب اس کے اندر کئی چیزیں ایسی ہیں جو ان روایات کے مجموعے والی چیزوں کے خلاف پڑتی ہیں۔تو دونوں میں ٹکراؤ ہوا۔قرآن نے کہا ہے کہ قرآن کے منجاب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں کوئی چیز ایک دوسرے کے مخالف نہیں اور یہاں ان مجموعوں میں بہت سی چیزیں ہیں جو اس کے خلاف جاتی ہیں۔تو اب کیا کیا جائے؟

حدیث' قرآن حکیم کی آیات کو منسوخ کر سکتی ہے

پہلے تو یہ کہا گیا کہ یہ جتنی ایسی آیات ہیں' جو حدیثوں کے خلاف جاتی ہیں وہ منسوخ ہیں۔عقیدہ یہ ہے کہ حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے ❶۔تو اب یہ مثلہ معہ ہی نہیں بلکہ اس سے اوپر ہے کہ یہ ان کو منسوخ کر سکتی ہیں۔آپ سوچ لیجیے کہ وہ جو میدانِ جنگ میں شکست کھائی تھی' وہ جو ہڈیوں میں چوٹ لگی ہوئی تھی' اس کا بدلا کیسے لیا؟ آپ کے ہاں یہ جو قوانین بنے ہوئے ہیں جن کو فقہ کے احکام کہتے ہیں' جو رائج ہو رہے ہیں' ان میں بیشتر ایسے ہیں جو قرآن کے خلاف ہیں۔

روایات کے بعد فقہ کے احکام کی نوعیت

قرآن نے کہا تھا کہ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ (6:115) جو کچھ خدا نے تم سے کہنا تھا وہ قرآن میں مکمل ہو گیا۔یہاں عقیدہ یہ ہے کہ قرآن کے اندر تو دین کا 1/9 حصہ ہے باقی 9/10 حصہ تو باہر ہے اور قرآن کے اندر احکام کی کم از کم پانچ سو آیات

---

❶ ان نکات کی تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ حج' طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص ص۔197 تا 217' نیز انہی صفحات کے فٹ نوٹ۔

منسوخ ہیں۔ پھر وہ آیات بھی ہیں جو قرآن میں نہیں ہیں لیکن ان کا حکم رائج ہے۔ یہ جو زنا کی سزا ہے' جو فقہ کا قانون حال ہی میں آپ کے ہاں رائج ہوا ہے کہ رجم یعنی پتھر مار کے مارنے کا' یہ قرآن میں نہیں ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ یہ ایک آیت قرآن میں تھی' اب قرآن میں نہیں ہے لیکن حکم اسی کا جاری ہے۔ اور یہ بھی کہ قرآن میں جو آیتیں ہیں وہ تو منسوخ ہیں اور صرف پڑھی جاتی ہیں۔ حکم اُن آیتوں کا جاری ہو رہا ہے جو قرآن میں نہیں ہیں۔ قرآن نے تمت کہا تھا کہ یہ مکمل ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ اس کا 9/10 حصہ تو قرآن کے باہر ہے۔ کفار کی طرف سے یہ مطالبہ آ رہا تھا کہ اس قرآن میں ذرا سی تبدیلی کر دو۔ تو آپؐ کی طرف سے جواب یہ آ رہا تھا کہ ارے بابا! میں اگر ذرا سی یہ بات کروں تو میں خدا کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ یعنی رسول بھی اس میں کچھ تبدیلی نہیں کر سکتے مگر یہ کر سکتے ہیں۔ قرآن کا یہ بیّن حکم ہے کہ **کُتِبَ عَلَيْكُمْ** (2:180) فرض کیا جاتا ہے تمہارے اوپر وصیت کرنا' کہ جو کچھ تم چھوڑ جاؤ اس کے متعلق والدین کے لیۓ اقربین کے لیۓ جس کے لیے جی چاہے' وصیت کر جاؤ۔ **حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ** (2:180) متقین کے اوپر ایسا کرنا فرض ہے۔ یہ ہے قرآن کی آیت۔ آپ کے ہاں فقہ کا حکم ہے کہ وصیت صرف تہائی مال میں کر سکتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ سارے مال میں وصیت کر سکتے ہو جبکہ یہ فقہ والے کہتے ہیں کہ صرف تہائی مال میں کر سکتے ہو۔ قرآن کہتا ہے کہ جس کے حق میں تم مناسب سمجھو وصیت کر دو جبکہ یہ فقہ والے کہتے ہیں کہ تم اُن کے حق میں نہیں کر سکتے۔ یعنی یہ تبدیلی نہیں تو اور کیا ہے!!! پہلے قرآن کے ساتھ قرآن کی مثل اتنا کچھ' پھر ان کی رو سے قرآن کی آیتیں منسوخ اور اب جو موجود ہیں ان کے اندر یہ تبدیلی! یہ سارا کچھ ہزار برس سے آپ کے ہاں جزوِ ایمان بنا ہوا چلا آ رہا ہے۔ جو شخص اس کے خلاف آواز اٹھاتا ہے اور کہتا ہے کہ او بابا! قرآن میں تو یہ کچھ لکھا ہوا ہے تو اس کے خلاف فتوے لگتے ہیں کہ یہ منکرِ حدیث ہے' اُسے حلقۂ اسلام سے خارج قرار دیا جاتا ہے۔ یہ تھا مطالبہ جو وہ کفار پیش کرتے تھے اور اتنا دوٹوک جواب ہوتا تھا کہ او بابا! یہ میری کتاب نہیں' میری تصنیف نہیں' میں نے یہ قوانین خود وضع نہیں کیے اس لیے میں یہ کیسے کر سکتا ہوں۔ اس کے بعد یہ سارا جتنا بھی ہے یہ اجتماعی چیز ہے اور چھ چھ اور چار چار حدیثوں کے مجموعے رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر دیئے جبکہ رسول اللہ ﷺ کا تو قول قرآن میں موجود ہے کہ ایسا میں نہیں کر سکتا لیکن یہ پھر بھی کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا کیا تھا' ان کے زمانے میں تو یہ نہیں تھا مگر ہم تمہیں جمع کر کے دیتے ہیں۔ دیکھو کہ (معاذ اللہ) قرآن کے خلاف کتنا کچھ کیا ہوا ہے۔

قرآنِ حکیم نے اپنے لیے تمت کا لفظ استعمال کیا ہے جس کا انسان کو اتباع کرنا ہے

یہ بڑا اہم مسئلہ ہے کہ کیا قرآن کے اندر تبدیلی ہے؟ یا قرآن سے باہر بھی کہیں دین ہے؟ قرآن تو تمت کہتا ہے۔ یہاں ان کی کوشش ہو رہی ہے کہ یہ ذرا سا اپنے مقام سے پھسل جائے' ذرا سا ہٹ جائے' مفاہمت کر لے۔ قرآن کہتا ہے کہ **فَاسْتَقِمْ كَمَآ**

اُمِرْتَ (11:112) اس کے اوپر جم کر کھڑے رہو جو تمہیں حکم دیا جاتا ہے۔ **وَ لَا تَرْکَنُوْٓا اِلَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا** (11:113) یہ لوگ جو مخالفین ہیں ان کی طرف ذرا سا بھی مت جھکو۔ ایسا کرو گے تو **فَتَمَسَّکُمُ النَّارُ** (11:113) جہنم میں پھینک دیئے جاؤ گے۔ **وَ مَا لَکُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ مِنْ اَوْلِیَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ** (11:113) خدا کے سوا کوئی تمہارا حامی و ناصر نہیں ہوگا۔ حق لاشریک ہے۔ مختلف مقامات پر یہ نظر آتا ہے کہ وہ بار بار یہ کوشش کرتے تھے۔ **فَلَا تُطِعِ الْمُکَذِّبِیْنَ** (68:8) یہ جو ہمارے قوانین کو جھٹلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ خدا کا نہیں تمہارا ہی ہے' ان کی کوئی بات نہ ماننا۔ **وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَیُدْهِنُوْنَ** (68:9)۔ سب سے زیادہ پھسلنے والی چیز یعنی گھی یا دودھ یا مکھن ہے۔ اگر انہیں پھینک دیا جائے تو جس طرح اس پہ آدمی پھسلتا ہے تو اس کو دھنیت کہتے ہیں' مداھنت کا لفظ وہیں سے ہے۔ قرآن یہاں سے یہ لفظ لایا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ چاہتے یہ ہیں کہ ذرا سا تو پھسلے تو یہ اور زیادہ پھسلائیں۔ جسے دنیا ضد کہتی ہے یہی تو اصلِ ایمان ہوتا ہے اگر وہ حق کے لیے ہو۔ جونہی پھسلا دور چلا گیا بلکہ گیا نہیں' پھر تو وہ دو اور دو پانچ والے میں اور دو اور دو چھ والے میں فرق ہی کچھ نہیں رہتا۔ یہ ہے کیریکٹر۔ یہ تھا وہ مقام جہاں قرآنِ کریم نے کہا کہ **یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اتَّقِ اللّٰہَ** (33:1)۔ اب پتہ چلا کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ قوانینِ خداوندی کو سختی سے' شدت سے احتیاط کرو' اس کی حفاظت کرو۔ **وَ لَا تُطِعِ الْکٰفِرِیْنَ وَ الْمُنٰفِقِیْنَ** (33:1) ۔ دو دشمن ہیں کھلے ہوئے۔ دشمن اور منافقین کی کوئی بات نہ ماننا۔ کھلے ہوئے دشمن یہ قریش تھے' ان کی بھی بات نہ ماننا۔ اور یہ نقاب پوش جو تمہارے ساتھی بنے پھرتے ہیں' ان کے بھی فریب میں نہ آ جانا۔ **اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیْمًا حَکِیْمًا** (33:1) ہم سب کچھ جانتے ہیں اور جو کچھ کہہ رہے ہیں یہ بڑا حکمت پر مبنی ہے۔ **وَّاتَّبِعْ مَا یُوْحٰٓی اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ** (33:2) رسول اللہ ﷺ سے بار بار یہ فرمایا کہ جو کچھ تیری طرف نازل کیا جاتا ہے اس کا اتباع کیے چلے جاؤ۔ رسول اللہ ﷺ سے بھی **مَا یُوْحٰٓی اِلَیْکَ** (33:2) کے اوپر اتباع کا اصرار کیا جا رہا ہے' تاکید کی جا رہی ہے۔ اسی قرآن کا اتباع رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے۔ عزیزانِ من! یہی دین ہے' اسی کا اتباع اسلام ہے' حضور ﷺ اسی کا اتباع فرماتے تھے' بحکمِ خداوندی اس کا اتباع فرماتے تھے۔ اس کے خلاف نہ کوئی بات حضور ﷺ کہتے تھے اور نہ کرتے تھے' بلکہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کی زبانِ مبارک سے کہلوایا کہ اگر میں اس کی ذرا بھی خلاف ورزی کروں تو میں بھی جہنم کے عذاب سے نہیں بچ سکتا۔ **اِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا** (33:2)۔ اب یہ **تَعْمَلُوْنَ** جمع کا صیغہ آ گیا۔ کہا کہ خدا خوب جانتا ہے' جو تم کرتے ہو اور جو یہ کرتے ہیں اُسے بھی جانتا ہے۔ اور یہ بات کہ بہت بڑی طاقتیں جمع ہو رہی ہیں' بڑے لشکر تمہارے خلاف اکٹھے کیے جا رہے ہیں' ممکن ہے کہ یہ بات کسی کے دل میں عزیمت کے خلاف ذرا سا کھٹکا پیدا کر دے۔

قوانینِ خداوندی پر یقینِ کامل کا نام توکّل ہے

قرآن کہتا ہے کہ وَّ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (33:3) قوانینِ خداوندی کی محکمیت پر یقینِ کامل رکھو۔اور یہ یقینِ کامل ہی ہے جو اصل میں کامیابی کا راز بنتا ہے۔آپ نے دیکھا کہ توکّل کہاں آیا ہے۔اور ہمارے ہاں کا توکل دیکھتے ہیں کہاں ہوتا ہے؟ حضرت صاحب بیٹھے ہیں' اللہ پر توکل کیے ہوئے ہیں۔وہ مزدور خون پسینہ ایک کر کے شام کو کما کر لاتے ہیں اور حضرت صاحب کے قدموں میں رکھتے ہیں' پاؤں بھی چومتے ہیں۔اور اگر یہ مزدور نہ ہوں تو پھر حضرت صاحب سے پوچھیے کہ جو خود ایک وقت کی روٹی بھی نہیں کما سکتے' بیٹھے ہیں توکّل بخدا کیے ہوئے' یہ دوسروں کی ساری محنت کی کمائی کے اوپر جینے والے ہیں۔فریب یہ ہے کہ توکل بخدا بیٹھے ہیں۔کسی دن ان سے پوچھ کر دیکھو کہ صاحب! یہ تو ان کا لایا ہوا ہے' خدا نے حضرت صاحب کے پاس براہِ راست کیا بھیجا ہے؟ کہتے ہیں کہ جی! وہ انہی کے وساطت سے بھیجتا ہے۔توکل ہے خدا پہ اور انتظار ان لانے والوں کا ہے!!!

اتنی بڑی مخالفتوں کے ہجوم میں یہ کہنا کہ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ(33:3) ان قوانین کی محکمیت پر یقین رکھو۔ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا (33:3) اور اللہ کے قوانین پر اعتماد کافی ہے۔یہ وکیل کا لفظ آیا ہے۔ایک تو یہ وکالت ہے جس کے متعلق کہا ہے کہ وہ کافی ہے' کچھ اور تمہارے لیے ضروری نہیں ہے۔اور ایک وکالت ہمارے دور کی بھی ہے۔اس کے لیے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔منافقین کی بھی بات آ گئی۔اس معاشرے کے اندر جو غلط رسمیں عام ہو چکی ہوئی تھیں ان کی بھی بات آ رہی ہے۔میں نے عرض کیا ہے کہ عجیب وغریب موضوعات پر مشتمل یہ سورۃ ہے۔ایک طرف جنگ ہے ابھی اس کی تفصیل کی طرف آتے ہیں۔

جنگِ احزاب بڑی ہی تباہ کن اور زلزلہ انگیز جنگ تھی: اس میں پہلی حکمت عملی

اس جنگِ احزاب کے متعلق قرآن کا اس قدر زلزلہ انگیز بیان ہے۔جتنی جنگیں ہوئی ہیں ان میں واقعی سب سے زیادہ تہلکہ انگیز اور زلزلہ انگیز جنگ' جنگِ احزاب ہے۔اسی کو جنگِ خندق بھی کہتے ہیں کیونکہ حضورﷺ نے اپنی مدافعت کے لیے مدینے کے گرد خندق کھودی تھی حالانکہ عربوں میں جنگ کی یہ Strategy (حکمت عملی) پہلے تھی ہی نہیں' یہ ایرانیوں کے ہاں ہوتی تھی۔حضورﷺ نے پہلی دفعہ اس کو اپنے ہاں استعمال کیا تھا اور یہ بڑی کامیاب ثابت ہوئی تھی۔تو یہ جنگِ احزاب یا جنگِ خندق ابھی چار آیتوں کے بعد آئے گی۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک گھریلو زندگی کی اہمیت اور اس کے متعلق ہدایات

ایک طرف تو یہ کیفیت ہے کہ اس کا بیان بھی اتنی تفصیل وشرح سے کیا جاتا ہے اور دوسری طرف وہ واقعات ہیں جو عائلی زندگی

سے متعلق ہیں' ان کو بھی بیان کیا جا رہا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ قرآن گھر کے اندر کی زندگی کو کتنی اہمیت دیتا ہے۔ عربوں کے ہاں ایک غلط رسم چلی آتی تھی کہ غصے میں آ کر بیوی کو ماں کہہ دیا۔ اب اس کے بعد وہ تو ماں ہوگئی' بیوی تو نہ رہی۔ پھر اس کے اوپر ان کے ہاں عجیب عجیب قسم کے توہمات تھے۔ یہ اس قسم کی چیزیں کہ انسان غصے میں آ کر یہ کچھ کہہ دے یا توہم پرستی کی بنا پہ یہ کچھ کہہ دے تو قرآن ان کی اصلاح کے لیے بھی آ رہا ہے۔ معاشرے میں اصلاح کر رہا ہے اور گھروں کی زندگی کو مثال کے طور پہ پیش کرتا ہے۔ **مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ** (33:4) ارے میاں! سینے کے اندر دو دل تھوڑے ہوتے ہیں کہ ایک دل نے کہہ دیا کہ ماں کہہ دو' تم نے ماں کہہ دیا اور دوسرا دل کہہ رہا ہے کہ نہیں یہ تو بیوی ہے۔ صداقت تو یہ ہے کہ زبان اور دل کی ہم آہنگی ہو:

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

ہمارے دور کا فلاسفر وائٹ ہیڈ (1974-1861) ہے۔ اس کی کتاب "Adventures of Ideas" ہے۔ اُس نے یہ بتایا ہے کہ Truth یا صداقت کس کو کہتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ صداقت یہ ہے:

"Conformity of appearance with reality" .

''جو کچھ مخفی ہے' جو باطن میں ہے' اس میں اور Appearance (جو کچھ ظاہر و مشہود ہے) میں جو ہم آہنگی ہے' اسے صداقت کہتے ہیں''۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک صداقت کا معیار

اس بات کو قرآن نے بڑے ہی خوبصورت انداز سے بیان کیا ہے۔ کہا ہے کہ دو دل نہیں ہوتے بلکہ دل ایک ہی ہوتا ہے۔ دل کی بات تم کرو گے اور زبان ہم آہنگ ہوگی تو وہ ایک ہی بات ہوگی۔ یہ جو اس طرح سے کہہ دیتے ہو' وہ دل کی بات نہیں ہوتی کیونکہ دل دو نہیں ہوتے۔ قرآن کا یہ بیان یہ وائٹ ہیڈ (1974-1861) سے زیادہ وضاحت کا بیان ہے بلکہ میں کہوں گا کہ اس اعتبار سے یہ بیان سب سے زیادہ بلیغ ہے۔ وائٹ ہیڈ تو فلاسفروں کو ہی سمجھا سکتا تھا لیکن قرآن نے تو عوام کو سمجھانا ہے اس نے تو شتر بانوں کو سمجھانا ہے' سو سمجھا دیا۔

غصے میں بیوی کو ماں کہہ دینے سے وہ ماں نہیں بن جاتی

کیسا حسین انداز ہے قرآن کے کہنے کا! کہ کسی کے پہلو میں دو دل نہیں ہوتے کہ ایک دفعہ ایک بات کہی تو اگر وہ دل کی بات ہے تو وہی بات ہے اور اگر دوسری بات کہی تو کیا وہ کوئی دوسرا دل ہے جو یہ بات کہہ رہا ہے۔ تو اسی اعتبار سے کہا کہ **وَ مَا جَعَلَ**

اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓئِ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ (33:4) اگر کسی وقت غصے میں آ کر بیوی کو ماں کہہ دیا تو وہ سچ مچ کی ماں نہیں بن جاتی۔ جذبات میں آ کر یا غصے میں آ کر تم یہ بات کہہ بیٹھے ہو۔ اب یہ جو اس قسم کی جذبات میں آئی ہوئی چیزیں ہیں، جو زبان سے کہی جاتی ہیں، ان میں اور اس میں کیا فرق ہے کہ جو کہا جائے کہ نہیں! یہ سچ مچ کہا گیا ہے۔ اور یہ چیز صرف اس قسم کی توہم پرستانہ یا جذباتی باتوں کے متعلق ہی نہیں ہے بلکہ جرم میں بھی یہ چیز آپ کے ہاں آئے گی۔ ایک جرم وہ ہوتا ہے، جو ارادتاً کیا جائے گا عملاً کیا جائے گا، ایک وہ ہوگا جو سہواً ہو جائے گا۔ اب سہواً بھی وہ چیز ہے جس میں دل کا ارادہ شامل نہیں ہوتا۔ پہلے تو میں قرآن کی دو چار آیات سامنے لاتا ہوں، جن میں اس نے کہا ہے کہ ان دونوں میں فرق ہوتا ہے۔ کہا کہ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ (2:225) یہ یونہی جو لغویت کے طور پر تم قسم کھا بیٹھتے ہو، یہ لغو ہے۔ اب کیسے قرآن نے اس میں فرق کیا کہ یہ لغو کیسے ہوگئی؟ کہا کہ وَ لٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ (2:225) دل کا ارادہ ساتھ شامل ہو تو اس سے مواخذہ ہوتا ہے۔ غصے میں آ کر یونہی خوامخواہ جذباتی طور پر ایک بات کہہ دی، غصہ فرو ہوا تو دل میں اس کے خلاف ندامت شروع کر دی کہ یہ کیا کہہ بیٹھا، یہ کیا کر بیٹھا۔ کہا کہ اس وقت دل شامل نہیں تھا۔

جس جرم میں انسان کے دل کی رضامندی شامل نہ ہو اس کا مواخذہ بھی نہیں ہوتا

قرآن نے یہی کہا ہے کہ غصے میں آ ؤ تو دل کو ساتھ نہ چھوڑنے دیا کرو۔ غصے کی شدت کو دوسری طرف لوٹا دیا کرو اور بات دل کی مانا کرو۔ اس لیے کہ وَ لٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ (2:225) دل کا ارادہ اس کے اندر شامل ہو تو مواخذہ ہوتا ہے۔ اسی سورۃ الاحزاب میں اگلی آیت کے اندر کہا ہے کہ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ (33:5) یونہی سہواً بھول چوک سے بغیر دل کے ارادے سے کوئی بات کہہ دو تو وہ جرم نہیں ہو جاتا۔ وَ لٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ (33:5) جرم قابلِ مواخذہ وہ ہوتا ہے جس میں تمہارے دل کا ارادہ شامل ہو۔ اسی سے قرآن جرم کی طرف چلا گیا اور جرم بھی وہ جو سب سے بڑا جرم ہے یعنی جرمِ قتل۔ قرآنِ کریم نے جرمِ قتل بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ جو عمداً کسی کو قتل کرتا ہے تو پھر یہاں بھی اس کی سزا موت ہے یعنی قصاص ہے اور اس کے بعد جہنم کے اندر بھی وہ رہتا ہے۔ میں کہہ رہا تھا کہ جو باتیں بلا ارادہ سہواً بالخطا سرزد ہوں، ان کے کرنے میں دل کا ارادہ شامل نہ ہو اور وہ کہ جن میں دل کا ارادہ شامل ہو تو قرآن ان دونوں میں فرق کرتا ہے۔ وہ اس کے لیے عام قسم کھانے کی مثالیں دیتا ہے جو روزمرہ لوگ کرتے رہتے ہیں۔

قرآنِ حکیم نے قتل بالخطا اور قتلِ عمد میں فرق کیا ہے

سب سے بڑا جرم قتل کا ہے۔ اس میں بھی اگر ارادہ شامل نہیں ہے تو مواخذہ نہیں ہے، خواہ قتل کے جرم کا بھی کوئی کیوں نہ مرتکب

ہو گیا ہو۔ اگر اس میں عمداً قتل نہیں ہے تو اس کی سزا قرآن کی رو سے موت نہیں ہے بلکہ دیّت ہے' خوں بہا ہے۔ اور دوسری چیز یہ کہ خوں بہا صرف قتل بالخطا میں ہے' قتلِ عمد میں نہیں ہے۔ قتلِ عمد تو اتنا بڑا جرم ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ جس نے عمداً کسی ایک فرد کو قتل کر دیا وہ یوں سمجھو کہ جیسے قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا (5:32) اس نے پوری انسانیت کو قتل کر دیا۔ قرآن کی رو سے جان کا بہت احترام ہے لیکن قرآن یہودیوں کا وہ آتشی ضابطۂ قانون نہیں ہے جو فرق ہی نہ کرے۔ قرآن تو قتل بالخطا میں اور قتلِ عمد میں فرق کرتا ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ جس میں دل کا ارادہ شامل نہیں ہے وہ جرم اس نوعیت کا نہیں ہے بلکہ اس جرم میں صرف خطا ہے یا سہو ہے۔ وہ جو واقعہ ہوا ہے یعنی جس کا ارتکاب اس نے کیا ہے وہ جرم نہیں ہے یعنی اس پہ وہ فردِ جرم نہیں لگے گی۔ میں نے کہا ہے کہ سزائیں بھی مختلف ہونی چاہئیں۔

لغویت کو روکنے کے متعلق قرآنِ حکیم کی تعلیم اور حلالے کا فتویٰ

میں پھر وہیں آ جاتا ہوں کہ اُس زمانے میں یہ بات ہوتی ہوگی کہ غصے میں بیوی کو ماں کہہ دیا ہوگا۔ قرآن نے اس کے بعد یہ کہا کہ یہ جرم نہیں ہے' یہ لغویت ہے۔ یاد رکھیے! یہ نہیں ہے کہ قرآن اس کو جرأت دلاتا ہے کہ بیشک یہ کچھ کہتے کرتے رہا کرو۔ اُس نے دوسری جگہ کہا ہے کہ یہ جرم تو نہیں ہے لیکن لغویت بجائے خویش بھی ایک گناہ کی چیز ہے۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ (23:3) مومن لغویت میں نہیں الجھتا' بڑی احتیاط برتتا ہے۔ اور اسی لیے جو لغو قسم کی قسمیں ہیں' ان پہ بھی اس نے جرمانے کی سزا رکھی ہے۔ جسے آپ ایک قسم کا کفارہ کہتے ہیں وہ اس کی لغویت کو روکنے کے لیے قرآن نے یہ تجویز کیا ہے۔ تو لغویت کے متعلق ہمارے ہاں جب یہ آیتیں آتی ہیں تو کہا جاتا ہے کہ صاحب! یہ تو اس زمانے کی بات ہے ہم تو کبھی یہ کچھ نہیں کرتے جبکہ آپ یہ کچھ روز کرتے ہیں۔ ٹھیک ہے آپ کی آنکھیں حیرت سے اٹھی ہیں آپ حق بجانب ہیں۔ بات سننے کے بعد ابھی آپ کی آنکھیں جھک جائیں گی۔ ہر روز یہ قصہ ہوتا ہے کہ میں نے غصے میں آ کر بیوی کو طلاق طلاق طلاق کہہ دیا۔ کہا کہ مولوی صاحب کے پاس جاتا ہوں۔ مولوی صاحب نے کہا کہ نکاح ختم ہوا۔ میں اس کے بعد رو رہا ہوں کہ میں کیا کر بیٹھا۔ میں تو پھر بھی بہرحال لغویت میں' جذبات میں' غصے میں آ کر یہ بک بیٹھا لیکن وہ جو معصوم بیچاری ہے اس نے تو کچھ بھی نہیں کیا کہ جو اس کے بعد میری بیوی نہیں رہی۔ فقہ کا مسئلہ تو یہی ہے کہ تین دفعہ طلاق طلاق طلاق کہا اور نکاح ٹوٹ گیا۔ کہا کہ جی! اس جڑنے کی کوئی صورت بھی ہے۔ میری بیٹیاں اور بہنیں معاف رکھیں۔ یہ ان کا مسئلہ مجھے بیان کرنا پڑتا ہے۔ میں پھر معذرت کے ساتھ کہتا ہوں کہ میرے درس میں' میری محفل میں' یہ باتیں نہیں ہونی چاہئیں لیکن کیا کیا جائے:

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر [1]

---

[1] ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر (غالبؔ)

اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ پھر نکاح اس طرح سے جڑ سکتا ہے (معاذ اللہ) کہ یہ خاتون کسی دوسرے مرد کے ساتھ نکاح کرے' ایک رات کے لیے نکاح کرے' اس کے ساتھ شب بسری ضروری ہے۔ اور وہ صبح اس کو پھر طلاق دے پھر وہ تمہارے ساتھ آ کر نکاح کرے۔ اس کو حلالہ کہتے ہیں۔ یہ ہے' وہ بات جو شریفوں کی محفل میں نہ کہی جائے' نہ سنی جائے۔ اب اس کے لیے کون تیار ہوگا کہ وہ یہ کرے۔ وہ مولوی صاحب کہتے ہیں کہ بھئی! شریعت کا یہ معاملہ ہے اور تمہارے لیے مشکل آ پڑی ہے تو اب ہم ہی اس کو حل کر دیتے ہیں۔ صبح اٹھے تو کہا کہ صاحب! اب طلاق دیجیے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ میں نے تجربۃً دیکھ لیا ہے کہ وہ طلاق والی بات نہیں ہے اس لیے میں طلاق نہیں دیتا ہوں۔ یا اللہ! یا للعجب!!

یہ کس خدا کا حکم ہے؟ میں اُیسے خدا کو نہیں مانتی

اگر وہ ایک رات ہی کی بات مانی جائے تو میں پوچھتا یہ ہوں کہ میرے پاس یہ قصے عام طور پر آتے ہیں۔ دو دو چار چار بچوں کی مائیں ہوتی ہیں' سفید بال ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ کہہ کر رو رہی ہیں کہ مجھے بتائیے میرا کیا جرم ہے جو میرے متعلق یہ فتویٰ دیا جا رہا ہے کہ میں کسی غیر مرد کے پاس ایک رات کے لیے جاؤں۔ او خدا کے لیے مجھے بتائیے کہ یہ کس خدا کا حکم ہے جو مجھ سے یہ کہا جاتا ہے۔ آپ حیران ہونگے کہ ایک بہن اس قدر پریشاں خاطر تھی اور ہونا بھی چاہیے۔ اس سے جب یہ کہا گیا کہ یہ خدا کا یا شریعت کا قانون ہے تو اس نے کہا کہ بابا جان! مجھے معاف رکھیے گا میں یہ جرم قبول کرنے کو تیار ہوں کہ میں ایسے خدا کو نہیں مانتی۔ میرا جرم کیا ہے کہ جس کی اتنی سنگین سزا مجھے دی جا رہی ہے۔ کیا نکاح اسی کو کہتے ہیں؟ مجھ پہ یہ جبر کیا جا رہا ہے۔ عزیزانِ من! آپ کے ہاں یہ فقہ کا حکم ہے۔

میں عورتوں کا ہی وکیل نہیں بلکہ ہر مظلوم کا وکیل ہوں: پرویزؒ

مجھے تو عام طور پہ یہ کہا جاتا ہے کہ یہ تو عورتوں کا وکیل ہے۔ میں تو ہر مظلوم کا وکیل ہوں جہاں تک میری استطاعت ہے لیکن ہمارے معاشرے میں عورت سب سے زیادہ مظلوم ہے اس لیے مجھے اس کی وکالت کرنی ہے۔ غلط وکالت نہیں بلکہ قرآن پیش کرنا ہے۔ قرآن میں تو کہیں نہیں ہے کہ تین دفعہ تم نے طلاق طلاق طلاق کہا اور نکاح ٹوٹ گیا۔ قرآن میں تو یہ کہیں نہیں ہے کہ پھر اس کے بعد ایک رات کے لیے یہ کرو تو پھر نکاح جڑ گیا۔ بڑی کوشش کے بعد Family Laws (عائلی قوانین) میں یہ ایک شرط لکھا دی کہ طلاق یہ نہیں ہے کہ آپ نے جذبات میں اٹھ کر طلاق طلاق طلاق کہا تو وہ نیلام والے کی طرح 3'2'1 ہوا اور اس کے بعد قصہ ختم۔ اور پھر اس کو جوڑنے کے لیے دوبارہ یہ چیز ہو کہ جس کو زبان پہ لاتے ہوئے حیا کی آنکھیں زمین میں گڑ جائیں۔ قرآن تو یہ نہیں کہہ سکتا۔ رسول اللہ ﷺ تو کبھی بھی یہ نہیں فرما سکتے۔

طلاق کا صحیح طریق

طلاق کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اگر میاں بیوی میں کہیں آپس میں اختلاف پیدا ہو جائے تو قرآن کہتا ہے کہ ثالثوں کا ایک بورڈ بناؤ۔ ایک اس کے گھرانے سے' ایک اُس کے گھرانے سے۔ عدالت اس میں ❶ Preside (صدارت) کرے گی۔ کہا ہے کہ ان میں مصالحت کرانے کی کوشش کرو۔ اور بورڈ اگر یہ دیکھے کہ معاملہ یہاں تک پہنچ چکا ہے کہ یہ بات نبھ نہیں سکتی تو پھر اس میں تین مہینے کی مہلت رکھی گئی ہے کہ تین مہینے کوشش کرو۔ نہیں ہو سکتا تو پھر وہ عدالت یہ فیصلہ کرے کہ ہم نے انتہائی کوشش کر دیکھی ہے لیکن ان میاں بیوی کے تعلقات اس طرح سے رہ نہیں سکتے تو بجائے اس کے کہ یہ اس طرح سے یوں جوڑ کر رکھا جائے اور روز سر پھٹول ہو' بہتر یہی ہے کہ اس صورت میں جو معاہدۂ نکاح ہے اس کو کالعدم قرار دیدیا جائے۔ اس کے معنی طلاق ہیں۔

1962 کے Family Laws (عائلی قوانین) کی مخالفت

عزیزانِ من! اِن ❶ Family Laws (عائلی قوانین) میں جو 1962ء میں جاری ہوئے تھے' یہ Provision (دفعہ) رکھی گئی تھی۔ ان حضرات کی طرف سے اس زمانے سے ان قوانین کی مخالفت ہو رہی ہے کہ یہ جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے یہ خلافِ شریعت ہے۔ کہتے ہیں کہ طریقہ وہی ہے کہ طلاق طلاق طلاق اور پھر اس کے بعد حلالہ۔ یہ غنیمت ہے کہ وہ Family Laws (عائلی قوانین) ابھی تک قائم ہیں۔

یتیم پوتے کو دادے کی وراثت سے بے دخلی کا فتویٰ اور ہماری شریعت

اس میں ایک قانون اور بھی تھا' وہ بھی میں واضح کر دوں تا کہ آپ کی سمجھ میں آئے کہ یہاں کیا ہو رہا ہے مثلاً ایک شخص ہے' اس کا ایک بیٹا ہے اور اس کے بعد اس کا پوتا ہے۔ اس شخص کی زندگی میں اگر یہ بیٹا مر جاتا ہے تو پوتے یتیم رہ جاتے ہیں۔ آپ کے ہاں کی فقہ کا فیصلہ یہ ہے کہ یہ جو دادا ہے' وہ جو بھی جائیداد چھوڑ جائے اس میں سے ان یتیم پوتوں کو کچھ نہیں مل سکتا۔ وہ سارے کا سارا وہ لے جائے گا

---

❶ They are presided over by Civil Judges notified as Family Courts Act 1964 (Farani, M. of Lincoln's Inn: Procedural Practice, Nadeem Law Book House, Lahore, P.11)

مغربی پاکستان میں 1964ء میں عائلی عدالتوں کا قانون منظور کیا گیا (تنزیل الرحمٰن، جسٹس ڈاکٹر: قانونی لغت (Law Dictionary) (نواں ایڈیشن)' پی ایل ڈی پبلشرز' لاہور' 2002' ص۔226)۔ اس کی مکمل تفصیل کے لیے دیکھیے:

The Muslim Family Laws Ordinance (VIII of 1961).

جو زندہ ہے۔ یتیم ہیں اس لیے کچھ نہیں مل سکتا۔ یہ قرآن کی نصِ صریح کے خلاف ہے۔ تو ان Family Laws (عائلی قوانین) میں یہ بھی تھا کہ قرآن کے مطابق انہیں حصہ مل سکتا ہے یعنی جو ان کے باپ کو ملنا تھا وہ ان کو ملے گا۔ اس کی بھی مخالفت ہو رہی ہے کہ یتیموں کو کیوں دیا جائے۔ ابھی تک تو یہ چلا آ رہا تھا۔ یہ جو شریعت بنچ[1] اب بنے ہیں تو ان شریعت بنچوں میں سے پہلا فیصلہ پشاور کی شریعت بنچ نے کسی کی رٹ کے اوپر دیا ہے کہ یہ قانون منسوخ قرار دیا جائے کیونکہ ان یتیموں کو حصہ نہیں مل سکتا۔ تو ان 1962ء کے عائلی قوانین یا Family Laws میں سے ایک کے متعلق تو فیصلہ ہو گیا ہے۔ ان باقیوں کے متعلق بھی یہ اسی طرح سے وہاں سے فیصلے کرانا چاہتے ہیں۔ اِن میں یہ طلاق والا مسئلہ بھی ہے۔ Family Laws (عائلی قوانین) میں یہ بھی ہے کہ ایک بیوی کی موجودگی میں دھڑا دھڑ دو تین چار نہیں کر سکتے تاوقتیکہ از خود اس بیوی کی رضا مندی نہ ہو جائے۔

میں عرض کر رہا ہوں کہ یہ ہیں ہمارے ہاں فقہ کے احکام اور یہ ہے جو کچھ قرآن کہہ رہا ہے۔ اب اگر کہیں کوئی ایسی بات اٹھی تھی جو قرآن کے ذرا قریب لے جائے تو مسلسل اس کی مخالفت ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اس کے بعد یہ ہے کہ ایک شریعت بنچ کے ہاں سے انہوں نے ہمت کر کے ایک قانون کو تو کالعدم قرار دلوا ہی دیا ہے:

آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

قرآن نے یہ کہا ہے کہ اس طرح سے غصے کے عالم میں جو یوں منہ سے کوئی بات کہہ دینا ہے یہ حقیقت نہیں بن جاتا۔ وہ جو اس طرح سے اٹھ کر غصے میں طلاق طلاق طلاق کہنا ہے وہ ایک لغو قسم کی قَسم ہے، جیسے ہم کہتے ہیں کہ تو میری بیوی نہیں ہے۔ یہی قرآن کہتا ہے کہ اُس زمانے میں وہ یوں کہا کرتے تھے۔ اب بھی بعض جو جہلاء ہیں وہ ایسا ہی کہتے ہیں کہ جی! میں نے غصے میں آ کر بیوی کو کہہ دیا کہ "تُوں تے میری ماں لگدی ہیگی ایں[2]" یہ بعینہ وہی چیز ہے جو قرآن نے کہا ہے کہ اس زمانۂ جاہلیت میں یہ چیز ہوتی تھی۔ جہالت تو قیامت تک جاتی ہے، عقل ہی کبھی کبھی آتی ہے۔ قرآنِ کریم نے یہ تو کہا ہے کہ یہ اس طرح سے کہنے سے یہ کچھ نہیں ہو جاتا کہ وہ تمہاری ماں ہو جاتی ہے اور اس سے تمہارا نکاح فسخ ہو جاتا ہے لیکن یہ لغویت ہے اور مومن کا شعار یہ نہیں ہے کہ وہ اس طرح سے غصے میں بھڑ بھڑا کر اس قسم کی بکواس کرتا پھرے۔

---

[1] یاد رہے یہ بات دسمبر 1979 کی 21 تاریخ کو کہی گئی تھی۔

[2] تم تو میری ماں لگتی ہو۔

لغویات کہنے پر یہ کفارہ کی ادائیگی میں حکمت

قرآن کہتا ہے کہ **لَا یُؤَاخِذُکُمُ اللّٰہُ بِاللَّغْوِ فِیْۤ اَیْمَانِکُمْ** ❶ (5:89) اس قسم کی لغو باتیں جو زبان سے تم کہہ دیتے ہو یہ جرم نہیں ہوتا۔**وَ لٰکِنْ یُّؤَاخِذُکُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَیْمَانَ** ❷ (5:89) لیکن قابلِ مواخذہ وہ بات ہوتی ہے جو تم دل کے ارادے سے کہو۔غصہ فرو ہو جائے‘ ٹھنڈا ہو جائے‘ تمہاری حالت بالکل نارمل ہو جائے تو اس وقت پوچھا جائے کہ کہو جو اس وقت کہا تھا‘ کیا اب بھی کہتے ہو؟ کیا یہ تمہارا فیصلہ ہے؟ کیا بقائمی ہوش وحواس یہ تمہارا فیصلہ ہے؟ اگر یہ نہیں ہے تو وہ جو تم لغو بات کہہ چکے ہو تو یونہی روز روز لغویت کے اندر نہ الجھتے جاؤ۔**فَکَفَّارَتُہٗۤ اِطْعَامُ عَشَرَۃِ مَسٰکِیْنَ** ❸ (5:89) اس کے بعد اس کا کفارہ ادا کردو‘ کوئی دس غریب آدمیوں ❸ کو کھانا کھلا دو‘ یا غلام چھوڑ دو ❸۔ یہ کچھ اگر نہیں ملتا ہے تو تین روزے ہی ❸ رکھ لو تا کہ کچھ تو تمہارے اوپر اس کا احساس ہو کہ میں نے لغو قسم کی بات کہی تھی۔ **اَلَّذِیْنَ یُظٰھِرُوْنَ مِنْکُمْ مِّنْ نِّسَآئِہِمْ مَّا ھُنَّ اُمَّھٰتِہِمْ اِنْ اُمَّھٰتُہُمْ اِلَّا الّٰٓـِٔیْ وَلَدْنَہُمْ** ❹ (58:2) اس آیت میں وہی الفاظ ہیں جو وہ غصے میں ماں کہہ دیتے ہیں تو وہ اصل میں مائیں نہیں بن جاتیں ان کی مائیں تو وہی ہیں جنہوں نے انہیں جنا ہے۔ یہاں (58:3) یہ ہے کہ اگر یہ کہد یا جائے تو اس کے لیے یہ ہے کہ غلام آزاد کرو۔ یا اگر یہ نہیں ہے تو پھر دو

---

❶ اگر تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ ہم نے فلاں فلاں حلال چیزوں کے نہ کھانے کی قسم کھا رکھی ہے اس لیے اب اس قسم کو کسی طرح توڑیں؟ (پرویزؒ: مفہوم القرآن‘ ص۔270)

❷ تو یاد رکھو! لغو اور مہمل قسموں پر کوئی مؤاخذہ نہیں ہوتا (2:225)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص270)۔

❸ باقی رہیں وہ (غلط) قسمیں جو تم نے قصد وارادہ سے نہایت محکم طور پر کھائی ہوں‘ تو انہیں بھی توڑا جا سکتا ہے‘ لیکن اس صورت میں کچھ کفارہ دینا ہوگا۔ یہ کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔ **مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَھْلِیْکُمْ** (5:89) یہ کھانا ویسا ہی ہونا چاہیے جیسا تم عام طور پر اپنے اہل وعیال کو کھلاتے ہو۔**اَوْ کِسْوَتُھُمْ اَوْ تَحْرِیْرُ رَقَبَۃٍ** (5:89) یا دس مسکینوں کو کپڑا دینا یا کسی غلام (گردن) کا آزاد کرانا۔**فَمَنْ لَّمْ یَجِدْ فَصِیَامُ ثَلٰثَۃِ اَیَّامٍ** (5:89) لیکن جسے یہ کچھ میسر نہ ہو (یا حالات ایسے ہوں جن میں یہ کچھ ممکن نہ ہو‘ مثلاً کوئی محتاج یا غلام موجود نہ ہو) تو وہ تین دن کے روزے رکھے **ذٰلِکَ کَفَّارَۃُ اَیْمَانِکُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ** (5:89) یہ کفارہ ہے تمہاری اُن (غلط) قسموں کا جو تم نے بالارادہ کھائی ہوں۔**وَ احْفَظُوْۤا اَیْمَانَکُمْ** (5:89) لیکن جو قسمیں قوانینِ خداوندی کے خلاف نہ ہوں‘ ان کی پاسداری نہایت ضروری ہے۔اس لیے کہ یہ قسمیں درحقیقت عہد وپیمان کی حیثیت رکھتی ہیں اور عہد کا پورا کرنا نہایت ضروری ہے (خواہ وہ عہد دوسروں کے ساتھ کیا گیا ہو‘ یا خود اپنے ساتھ)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن۔ ص‘270 تا 271)۔
محکوموں اور مظلوموں کی آزادی اسی زمرہ میں آجائے گی (پرویزؒ: مفہوم القرآن‘ ص۔ 271 کا فٹ نوٹ)۔

❹ بات یہ ہے کہ جو لوگ اپنی بیویوں کو (جہالت کی وجہ سے غصّے میں آکر) ماں کہہ دیں‘ وہ اس سے ان کی سچ مچ کی مائیں نہیں بن جاتیں۔ (اس لیے محض ایسا کہہ دینے سے انہیں ان پر حرام نہیں ہو جانا چاہیے)۔ ان کی مائیں وہی ہیں جنہوں نے انہیں جنا ہے (33:4)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن‘ ص۔1286)۔

مہینے ❶ کے روزے رکھو۔ یہ بھی اگر نہیں کر سکتے تو بہر حال پھر ساٹھ لوگوں کو کھانا کھلاؤ ❷ ۔ یہ تمہارے اوپر جرمانہ ہے' یہ اس قسم کی قسموں کا کفارہ ہے۔لغویت کی چیزوں کے متعلق یوں جرمانے کے طور پر کہا ہے جسے کفارہ کہا جاتا ہے تاکہ آئندہ کے لیے تم محتاط رہو کہ ایسا کچھ کہا جائے تو اس کے بعد پھر یہ جرمانہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ اگر احتیاط نہ برتی جائے تو پھر تو وہ روز روز یہ کچھ ہوجاتا ہے۔

عزیزانِ من! معاف رکھیے گا' وہ بات ''جولاہا'' کہہ کر کہنا پڑتی ہے۔ جولاہے نے بیوی سے کہہ دیا کہ 'توں تے میری ماں لگنی ہیگی ایں'' ❸ ۔اب وہ رونا پڑ گیا۔ یہ بھی رو رہے ہیں وہ بھی رو رہے ہیں۔ مُلّا کے پاس گئے تو اس نے کہا کہ صاحب! اس کے لیے تو بہر حال دس مسکینوں کو کھانا کھلانا پڑے گا۔ ان بیچاروں نے کچھ تندی تانی بیچ کر دس کو کھانا کھلایا۔ آ کے شام کو وہ بیٹھے۔ بیوی چولہے کے پاس بیٹھی کچھ بھوننے لگی اور یہ وہاں حقہ پینے بیٹھ گیا۔ دونوں افسوس میں ندامت کے اندر ہیں کہ کیا کر بیٹھے۔ اب وہ کہنے لگی کہ دیکھو! میں آپ سے روز روز یہ کہا کرتی ہوں کہ اتنی جلدی غصے میں نہ آیا کرو۔ اب اتنے میں تم غصے میں آئے تو ایک تو سارے گاؤں کے اندر بدنامی ہوئی' دوسرا اتنا کچھ جو تھا وہ اس کے کفارے میں دینا پڑا' ندامت الگ ہوئی۔ اگر اپنے آپ پہ ضبط کرلیا کرو تو کیوں یہ سارا کچھ ہو۔ اب وہ سن رہا ہے۔ کہتا ہے: 'فیر لگی ایں پیونوں چھیڑن ❹ یہ ہوتا ہے اگر اپنے آپ پہ ضبط نہ رکھا جائے۔ حالانکہ یہ غصے کی بات نہیں ہے' یہ جہالت کی بات ہے لیکن وہ تو صبح سے شام تک یہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔ یہاں نظر آتا ہے کہ قرآن نے یہ جو اتنی بڑی پابندی لگائی ہے کہ ساٹھ دن کے روزے رکھا رہا ہے' تو یہ آباؤاجداد تک کانوں کو پکڑ لیں گے کہ میرے بڑوں کی توبہ کہ میں آئندہ کبھی یہ لفظ زبان پہ لاؤں۔ اس کو جرم بھی قرار نہیں دیا اور اس سے آئندہ محفوظ رہنے کے لیے' محتاط رہنے کے لیے' یہ تدبیر بھی اختیار کی۔

---

❶ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا (58:4) جس کے پاس غلام نہ ہو یا غلام آزاد کرانے کی استطاعت نہ ہو (یا اُس زمانے کے غلاموں کے ختم ہونے کے بعد' جب غلام باقی ہی نہ رہیں تو) اس صورت میں وہ' تعلقاتِ زناشوئی سے پہلے' دوماہ کے متواتر روزے رکھے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1287)۔

❷ فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا (58:4) اور اگر اس کی طاقت نہ ہو' تو ساٹھ محتاجوں کو کھانا کھلائے (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 1287)۔

❸ تم تو میری ماں لگتی ہو۔

❹ پھر اس باپ کو چھیڑنے لگی ہو۔

کسی دوسرے کو اپنا بیٹا بنا لینے کا ماجرا

دوسرا وہاں کا طریقہ یہ تھا کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنا لیتے تھے۔قرآن نے اس چیز کو بھی جائز نہیں قرار دیا۔کہا کہ **وَ مَـــا جَـعَـلَ اَدۡعِیَآءَکُمۡ اَبۡنَآءَکُمۡ ذٰلِکُمۡ قَوۡلُکُمۡ بِاَفۡوَاهِکُمۡ** (33:4) یہ یونہی زبان سے ایک لفظ ہے کہ تم کہہ دیتے ہو کہ ''آ و بیٹا یا آ و بیٹی'' تو یہ سچ مچ کا نہ بیٹا بن جاتا ہے اور نہ وہ سچ مچ کی بیٹی بن جاتی ہے۔ **وَ اللّٰهُ یَقُوۡلُ الۡحَقَّ وَ هُوَ یَهۡدِی السَّبِیۡلَ** (33:4)۔اب یہ جو بات ہے کہ یہ دیکھیے کہ کس طرح سے کھلی کھلی باتیں کرتا جاتا ہے' وہ کہتا ہے کہ ہم نے تو الحق کہنا ہے۔اور کہنا اس لیے ہے کہ **وَ هُـوَ یَهۡـدِی السَّبِیۡـلَ** (33:4) تم صحیح راستے پہ چلو ورنہ ہمیں کیا ضرورت ہے کہ دخل دیتے پھریں۔لیکن ہم نے تو الحق کہنا ہے اور وہ کہنا اس لیے ہے کہ تم صحیح راستے پہ چلو۔اس میں ہمارا کوئی اپنا فائدہ نہیں ہے۔وہ جنہیں تم اس طرح سے بیٹا کہہ دیتے ہو۔ **اُدۡعُـــوۡهُـــمۡ لِاٰبَآئِهِمۡ هُوَ اَقۡسَطُ عِنۡدَ اللّٰهِ** (33:5) ٹھیک ہے ان کو کہو کہ فلاں کا بیٹا ہے۔محبت سے بیٹا کہتے ہو تو تمہارا بیٹا تو نہیں ہو جاتا۔اس سے بڑی الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں۔اگر یہ بات درمیان میں رہے تو کہا کہ اس کے باپ کا نام لے کر کہو۔

عربوں کے ہاں کی معاشرتی زندگی کے خدوخال

عربوں کے ہاں صرف اکیلا نام تو لیتے ہی نہیں تھے' وہاں ''ابن'' تو ضرور کہا کرتے تھے۔اس کا اصلی نام تو محدود کر دیتے تھے لیکن ''ابن'' ساتھ ضرور لاتے تھے۔اور ایسی سوسائٹی جو اس طرح سے کھلی ہوئی ہو یعنی صحرائی' خانہ بدوشوں کی زندگی' چلنے پھرنے والے رجسٹریشن بھی کہیں نہیں ہے' Death & Birth (موت اور پیدائش) کا ریکارڈ بھی کہیں نہیں ہے' تو ان کے ہاں یہ جو تخصیص تھی کہ واقعی یہ شرط لفظ کے اعتبار سے صحیح ہے تو اس میں یہ ٹھیک تھا کہ نام کے ساتھ ''ابن'' بھی آئے کہ فلاں کا بیٹا ہے تو ان سے کہا کہ جیسا تمہارے ہاں رواج ہے تو تم اسی طرح سے ان کو ''ابن عمر یا ابن عباس وغیرہ'' کہا کرو پھر اس کے بعد محبت سے بھائی کہو یا محبت سے بیٹا کہو اور بات ہے۔لیکن نام ان کا جو ہے وہ ان کے باپ کی طرف نسبت کر کے لیا کرو۔ **فَاِنۡ لَّـمۡ تَـعۡلَمُوۡۤا اٰبَآءَهُمۡ فَاِخۡوَانُکُمۡ فِی الدِّیۡنِ وَ مَوَالِیۡکُمۡ** (33:5) ۔وہاں اس معاشرے میں غلامی عام تھی۔تو جو غلام پکڑے ہوئے آ جاتے تھے تو ان میں بچے بھی ہوتے تھے۔جیسے ہمارے ہاں یہ خرکار لے جاتے ہیں۔تو کہا کہ اگر اس قسم کا کوئی تمہارے ہاں آ گیا ہے کہ باپ کے نام کا پتہ نہیں تو پھر اس کو کس طرف منسوب کریں؟ کہا کہ وہ دین میں تمہارے بھائی ہیں۔بھائی کہہ دینے سے کوئی وہ بات پیدا نہیں ہوتی جو باپ بن جانے سے ہوتی ہے۔بھائی بھی ہیں' **وَ مَـوَالِیۡکُمۡ** کہہ کر دوست کا درجہ دیا جا رہا ہے' برابر کا درجہ دیا جا رہا ہے۔اور آپ کے ہاں تاریخ میں آپ دیکھیں گے کہ انہوں نے انداز یہ اختیار کیا تھا کہ یہ غلام جس قبیلے کا ہوتا تھا اسے اس قبیلے کی طرف منسوب کرتے تھے اور اس کو غلام نہیں کہتے تھے

بلکہ موالی کہتے تھے۔ تاریخ میں آپ کو بڑی بڑی شخصیتیں ملیں گی، کئی مفسر بھی ہیں، کئی ادیب بھی ہیں، امام بھی ہیں۔ ان کے نام کے ساتھ موالی فلاں قبیلے کا لکھا ہے۔ تو اس طرح سے وہ Distinguish (امتیاز) کرتے تھے، ان کی شناخت کرتے تھے، امتیاز کرتے تھے۔ باپ کا نام معلوم نہیں ہے تو ان کو بھائی کہو ان کو دوست کہو تو وہ موالی کہلاتے تھے۔ **وَ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ** (33:5) اور یونہی اگر سہوونسیان سے، کسی نے کوئی بات سہواً کسی کو کہہ دی ہے تو اس سے مواخذہ نہیں ہوتا۔ **وَ لٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا** (33:5) دل کے ارادے سے جو بات کہی جائے وہ ہے قابلِ مواخذہ۔ اور یہ جو اس طرح سے، یونہی زبان سے، تم سہو وخطا سے، بات کہہ دیتے ہو تو اس کا کفارہ ادا کرو تا کہ یہ جو نقصان پہنچا ہے، اس سے تمہاری حفاظت بھی ہو جائے گی اور تمہاری ذات کی نشوونما میں جو فرق پڑ تا تھا وہ بھی پورا ہو جائے گا۔ صحیح راستہ یہ ہے۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ جنگِ احزاب کا واقعہ ہے اور اس میں یہ کیا کیا عائلی احکام چلے آ رہے ہیں۔ کہا ہے کہ **اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ اَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ** (33:6) نبی کا مقام، نبی ہونے کی حیثیت سے بہت بلند ہے۔ رسول کی پوزیشن یہ ہے کہ جتنا کوئی شخص خود اپنی ذات پر حق رکھتا ہے، رسول کا اس پر، اس سے بھی زیادہ حق ہوتا ہے۔ اس کا مقام تو یہ ہے کہ باپ بننا تو ایک طرف رہا، وہ تو تمہارے اپنے آپ سے بھی تمہارے اوپر ہے۔ اس کا اولیں مقام ہے، جس کو افضلیت حاصل ہے، جس کو ترجیح دی جائے گی۔ یہ جو **اَنْفُسِهِمْ** ہے اس کے معنی ہیں کہ وہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جو یہ فضیلت دیتا ہے وہ مومن ہوتا تھا۔

مومنین پر نبی اکرمؐ کا حق کس قدر ہے!

جسے ایمان کہتے ہیں وہ ایک معاہدہ ہوتا تھا۔ قرآن کہتا ہے کہ **اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ** (9:111) آؤ اس معاہدے کے اوپر دستخط کرو کہ میں نے اپنی جان اور مال خدا کے ہاتھ بیچ دیا۔ اور خدا کہتا ہے کہ اس کے عوض میں تمہیں یہاں بھی اور آخرت میں بھی جنت دوں گا۔ اب وہ معاہدہ کرنے والا کہتا تھا کہ جی! میں نے تو دستخط کر دیئے، میں تو اس پہ پکا ہو گیا۔ اور جو فریقِ ثانی ہے وہ تو ہے ہی نہیں، اس کے تو دستخط ہی اس پہ نہیں تو اس معاہدے کا اعتبار کیا؟ یہ ہوا دو فریقین میں لیکن دستخط ایک ہی فریق کے ہیں۔ قرآن میں نبی سے کہا گیا کہ یہ ٹھیک کہتے ہیں۔ خدا بہ شکلِ انسانی تو آ کر دستخط نہیں کرے گا لہٰذا ہمارے Behalf (طرف سے) پہ تم دستخط کرو اور یہ ذمہ داری لے لو۔ تو یہ جو معاہدہ ہے جس کی بنا پہ خدا کی طرف سے نبی دستخط کرتا ہے اس اعتبار سے یہ جو نبی کی حیثیت ہے تو آپ نے دیکھا کہ ان کے جو جان اور مال دونوں ہیں اس نبی کا مقام ان سے اوپر چلا گیا۔ مومن کی

جان اور مال اس کے ہاتھوں بک چکا ہوتا ہے۔اس لیے اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ (33:6)۔رسول کی پوزیشن یہ ہے کہ جتنا کوئی شخص خود اپنی ذات پر حق رکھتا ہے' رسول کا اس پر' اس سے بھی زیادہ حق ہوتا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی بیویاں مومنین کی مائیں ہیں

عزیزانِ من! جہاں تک گھر کی زندگی میں تعلق ہے قرآن کہتا ہے کہ وَ اَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ (33:6) ان کی بیویاں مومنین کی مائیں ہیں۔ ذرا آگے چل کر وہاں کہا گیا ہے کہ یہ جو ہم نے ماں کہا ہے تو یہ یونہی عام مجازی معنی میں نہیں کہا۔ بلکہ کہا ہے کہ نبی کی وفات کے بعد بھی ان کے ساتھ نکاح نہیں ہوسکتا۔اور یہ بڑی دور کی چیز ہے۔اور خدا جو بات کہے گا تو وہ بڑی دور کی نہیں ہوگی تو اور کیا ہوگی۔عزیزانِ من! آپ سوچ سکتے ہیں کہ نبی کی بیویاں گھر کے اندر ہیں۔قرآن نے کہا ہے کہ تم اپنی بیویوں کے لباس ہوتے ہو وہ تمہارے لیے لباس ہوتی ہیں۔اگر اس کی پابندی نہ ہوتی کہ ان کے ساتھ نکاح نہیں ہوسکتا تو یہ جو مرد تھے ان کے لیے کتنی گنجائش پیدا ہوجاتی۔اگر وہ منافقت برتنے والے تھے تو رسول اللہ ﷺ کے خلاف اسکینڈل پھیلا سکتے تھے۔کہتے کہ مجھے ان کی بیوی نے یہ بتایا ہے اور وہ باہر یہ بنے پھرتے تھے اور اندر یہ زندگی تھی۔تو وہ ان چیزوں کو Exploit (سلب ونہب) کرسکتا تھا۔قرآن نے پابندی عائد کردی اور انہیں مائیں قرار دیدیا۔یہ امت کی مائیں ہونگی۔آگے بات ہوئی کہ درجے کے اعتبار سے تو ٹھیک ہے نبی تمہیں تمہاری جانوں سے بھی اونچا ہے' اس کی بیویاں مائیں بھی بنادیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جو سچ مچ کی مائیں ہوتی ہیں یا باپ ہوتا ہے اس کے جو وراثت وغیرہ کے حقوق ہوتے ہیں وہ اس سے حاصل نہیں ہوتے۔ وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُهٰجِرِیْنَ (33:6) قرآن میں جو حقوق ہم نے رشتہ داروں کے مقرر کیے ہیں وہ واقعی جو رشتہ دار ہیں وہ ان کے لیے ہیں۔وہ سچ مچ کا جو باپ ہے اس کے لیے ہیں' سچ مچ کا جو بیٹا ہے اس کے لیے ہیں' سچ مچ کی جو ماں ہے اس کے لیے ہیں۔قانون میں اور احترام میں یہ فرق کردیا۔باقی یہ ہے کہ رشتے داروں کے علاوہ کسی کے ساتھ آپ حسنِ سلوک کرنا چاہو تو تمہارے لیے ہم نے وصیت کا حکم دیدیا ہے۔

جائیداد کی تقسیم کے متعلق وراثت کے حقوق کے لیے قانون اور وصیت کی اہمیت اور ہمارے فتاوٰی

اس بارے میں کہا ہے کہ اِلَّاۤ اَنْ تَفْعَلُوْۤا اِلٰۤی اَوْلِیٰٓئِكُمْ مَّعْرُوْفًا (33:6) رشتے داروں کے علاوہ کوئی دوست جو تمہارے ہیں' کوئی اور ہیں جس نے تمہارے ساتھ حسنِ سلوک کیا ہے اور تم اس کو کچھ دینا چاہتے ہو تو یاد رکھو! اس نظام میں جس میں ابھی ذاتی ملکیت ہوتی ہے' وہ جس کے لیے ذاتی ملکیت دیتا ہے' تو اس کا حق تسلیم کرتا ہے۔یعنی اس کو اپنے مال کے اوپر حق حاصل ہے۔

قرآن کی حدود کے اندر رہتے ہوئے اس کو وصیت کا پورا حق حاصل ہوتا ہے کہ جس کو مناسب سمجھتا ہے اس کو دے۔ یہ بات دوسری جگہ آئے گی تو میں عرض کرونگا کہ یہ جو وصیت کا حق سلب کر دیا ہے اس نے قوم کو کتنا نقصان پہنچایا ہوا ہے۔ مقدمے بازیاں ہو رہی ہیں' کسی کی جان کے لاگو ہیں' جائیداد کی خاطر قتل کر دیتے ہیں۔ اور اس کے بعد ان کے قانون کی رو سے ساری جائیداد لے جاتے ہیں اور وہ کسی کے حق میں وصیت نہیں کر سکتا۔ قرآن نے کہا ہے کہ کَانَ ذٰلِکَ فِی الْکِتٰبِ مَسْطُوْرًا (33:6) ہم نے اسے اپنی کتاب میں تحریر کر دیا ہے۔ یعنی وہ وصیت کا قانون جو میں نے ابھی عرض کیا ہے' وہ بڑا اہم ہے۔ قرآن نے اس کو تمہارے اوپر فرض قرار دیا ہے۔ کہا ہے کہ اِنْ تَرَکَ خَیْرَا الْوَصِیَّۃُ لِلْوَالِدَیْنِ وَ الْاَقْرَبِیْنَ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَی الْمُتَّقِیْنَ(2:180)۔ دو انجن لگے ہوئے ہیں' پہلے کُتِبَ عَلَیْکُمْ (2:180) ہے' پھر حَقًّا عَلَی الْمُتَّقِیْنَ (2:180) ہے۔ پورے ترکے کے اوپر حق ہے کہ جس کو جی چاہے تم دے سکتے ہو۔ جہاں وراثت کی تقسیم کا تعلق ہے تو چار جگہ دو آیتوں میں کہا ہے کہ مِنْ بَعْدِ وَصِیَّۃٍ (4:11`12) وصیت کے بعد یا قرضہ ادا کرنے کے بعد۔ وصیت اتنی اہم ہے۔

اس وصیت کے متعلق آپ کے ہاں فقہ کا قانون ہے کہ وارث کے حق میں نہیں کر سکتا اور 1/3 سے زیادہ نہیں کر سکتا۔ قرآن کہتا ہے کہ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ (6:34) ہمارے حکم میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ یہ کہتے ہیں کہ ہم کر سکتے ہیں۔ آپ حیران ہونگے کہ آپ کے ہاں حکم ان کا چل رہا ہے' قرآن کا حکم نہیں چل رہا۔ مروجہ قانون کی رو سے آپ پورے مال میں وصیت نہیں کر سکتے' ورثا میں سے کسی کے حق میں نہیں کر سکتے۔ قرآن کہتا ہے کہ کَانَ ذٰلِکَ فِی الْکِتٰبِ مَسْطُوْرًا (33:6) ہم نے تو کتاب میں لکھ دیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے آپ نے لکھ دیا ہے تو ہم نے پڑھ لیا ہے۔ اور پڑھنے سے ہم نے ثواب تو کما لیا ہے' باقی رہا اس کے اوپر عمل تو وہ تو ہمارے قانون کے مطابق ہوگا۔ عزیزانِ من! سورۃ الاحزاب کی آیت 6 تک ہی ہم آج آئے ہیں لیکن بعض اہم باتیں آ گئی ہیں۔ اس کے بعد موضوع بھی دوسرا شروع ہو رہا ہے۔

اب سورۃ الاحزاب کی آیت 7 سے آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

❀❀............❀❀............❀❀

تیسرا باب: **الاحزاب** (آیات7 تا21)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج دسمبر 1979ء کی 28 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الاحزاب کی آیت 7 سے ہو رہا ہے: (33:7)۔

کفر اور اسلام کے فرق کو واضح کرنے کے لیے جنگِ بدر کو قرآن حکیم نے یوم الفرقان کہا ہے

میں نے گزشتہ درس میں بھی یہ بتایا تھا کہ اس سورۃ کا نام الاحزاب ❶ کیوں ہے اور اس میں زیادہ تفصیل بھی جنگِ احزاب ❶ کی آئی تھی۔ ہجرت کے بعد نبی اکرم ﷺ اور آپ کے رفقائے گرامیؓ مکے سے مدینے تشریف لے آئے' مکے کو چھوڑ دیا' قریش کو چھوڑ دیا لیکن اس پر بھی قریش نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ ہجرت کے دوسرے ہی سال وہ اُمڈ آئے اور بدر کے میدان میں حق و باطل کی پہلی جنگ ❷ ہوئی۔ اسی لیے قرآن نے اسے یوم الفرقان کہا ہے جہاں کفر اور اسلام کا نتارا ہو جائے' نکھار کے دونوں سامنے آ جائیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ کونسا مقام ہے جہاں کفر کی حامی اور اسلام کی حامی جماعتوں میں ایک امتیاز محسوس طور پر سامنے آتا ہے وہ میدانِ بدر ہے۔ وہاں قریش نے شکست کھائی اور بڑی شکستِ فاش تھی۔ اس کے بعد پھر وہ اُمڈ کے آئے' وہ جنگِ احد ❸ تھی اور وہ پہلی سے بھی زیادہ صبر آزما جنگ تھی۔ اس میں بھی انہوں نے شکست کھائی۔

مومنین کی اِن جنگی فتوحات پر مورخین انگشت بدنداں بھی تھے اور پریشان بھی

میں نے عرض کیا تھا کہ قریش کو اب ان کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا کہ وہ اپنی مدافعت میں یہ کچھ کرتے تھے اور اُمڈ کر آتے تھے اور لڑائیاں کرتے تھے۔ دنیا کے مورخین اس پہ حیران ہیں کہ پھر قریش کو ہوا کیا تھا کہ وہ بار بار آتے تھے' شکست کھاتے تھے اور ان لڑائیوں میں ان کا بڑا ہی نقصان ہوتا تھا۔ وہ کس مقصد کے لیے لڑائی کرتے تھے؟ ان کی کوئی مملکت نہیں تھی' کوئی حکومت نہیں تھی جو انہوں نے حاصل کرنی ہو' دولت بھی نہیں تھی کیونکہ ان کے پاس تو اپنے بھی کھانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ کیوں یہ بار بار آتے تھے؟ ان کی سمجھ میں یہ بات شاید کم آئے لیکن بات بڑی اہم ہے۔ اسلام کے متعلق قرآن نے کہا یہ ہے کہ **لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ** (9:33) دنیا کے ہر نظام پر اس نے غالب آ کر رہنا ہے۔ قریش کو یہ معلوم تھا' وہ ہم سے کہیں زیادہ بہتر طور پر جانتے تھے کہ اگر یہ نظام وہاں کسی گوشے میں بھی عملاً لوگوں کے سامنے آ گیا تو اس کے منفعت بخش نتائج اتنی کشش اپنے اندر رکھیں گے کہ ساری دنیا اُمڈ کر ان کی

---

❶ یہ ذیقعدہ 5ھ میں لڑی گئی۔

❷ 17 رمضان 2ھ مطابق 13-مارچ 624ء

❸ 14-شوال 3ھ مطابق 29 مارچ 635ء

طرف چلی جائے گی۔ چنانچہ یہ خطرہ قریش ہی کو نہیں تھا بلکہ ایران کی مملکت کو بھی تھا جو صدیوں سے تہذیب وتمدن کا گہوارہ بنے چلی آ رہی تھی' بازنطینی ایمپائر کو بھی تھا جسے رومن ایمپائر کہتے ہوئے ہر Historian (مورّخ) جانتا ہے کہ اس سے مقصد کیا ہوتا ہے۔ وہ سلطنت اپنی جگہ متوحش تھی اور احتیاط کی نگاہ سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی:

ذرۂ ناچیز وتعمیر بیابانے نگر!

اہلِ قریش کی پریشانی کی وجہ

یہ مٹھی بھر لوگ تھے' تین سو کے قریب تو تھے جو بدر کے میدان میں گئے۔ کیا ہوا تھا ان لوگوں کو؟ کیوں یہ ان سے ڈر رہے تھے؟ کیوں یہ ان سے متوحش تھے؟ صرف اس لیے کہ وہ یہ جانتے تھے کہ وہ کونسا نظام ہے جس کے قیام کی خاطر یہ امت وجود میں آئی ہے اور مصروفِ جدوجہد ہے۔ وہ ان کے لیے خطرے کا باعث نہیں تھا کہ یہ ہمیں ہڑپ کر جائیں گے' ہماری مملکت باقی نہیں رہے گی' ہم پہ استبداد کیا جائے گا۔ صرف یہ چیز انہیں معلوم تھی کہ اگر یہ نظام کہیں بھی قائم ہو گیا' خواہ چھوٹے سے خطے کے اندر بھی کیوں نہ قائم ہو جائے تو دنیا کی نگاہیں اس کی طرف مرکوز ہو جائیں گی اور اس کے خوشگوار انسانیت کے لیے سازگار نتائج' اتنی کشش اپنے اندر رکھیں گے کہ ہماری سلطنتوں کی بنیادیں متزلزل ہو جائیں گی۔ اور یہ طریقہ تھا جس سے اس نظام نے دنیا کے دوسرے نظاموں پر غالب آنا تھا۔

دورِ اولیٰ میں ملوکیت' نظام سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کا دوردورہ تھا جن پر اسلام نے فتح حاصل کی

دنیا میں اس زمانے میں ملوکیت کا نظام تھا جسے بادشاہت کہتے ہیں یعنی شخصی حکومت تھی۔ خواہ وہ ایک فرد کی ہو یا افراد کے گروہ کی ہو' انسانوں کی حکومت ہو خواہ اس کی شکل کوئی بھی کیوں نہ ہو' یہ ملوکیت کہلائے گی۔ ایک تو یہ نظام تھا اور دوسرا سرمایہ داری کا نظام تھا کہ محنت کشوں کی محنت کو وہ چھین جھپٹ کر لے جاتے تھے اور اس پہ اپنی عیش سامانیوں کا سامان کرتے تھے۔ تیسرا نظام مذہبی پیشوائیت کا نظام تھا۔ یہ اسلام کا الدین یا نظام اگر کہیں بھی قائم ہو جائے تو وہاں نظر آئے گا کہ یہ انسانوں کے نظاموں کی جو تینوں شقیں ہیں ان میں سے کوئی باقی نہیں رہتی۔ اور دنیا کو اتنا امن' خوشحالی' اطمینان اور سکون نصیب ہو جاتا ہے کہ ہر شخص لپکے ہوئے اس نظام کی طرف آ جاتا ہے۔ خود قرآن نے کہا ہے کہ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا (110:2)۔ یہ نبی اکرم ﷺ کا آخری دور ہے کہ جب یہ نظام قائم ہوا ہے حالانکہ ابھی صرف مدینے میں اور اس کے ماحول میں ہوا تھا۔

عربی زبان میں ’’فتح‘‘ کے معنی اور یہودیوں کی منافقت

قرآن نے کہا ہے کہ **اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَالۡفَتۡحُ - وَرَاَيۡتَ النَّاسَ يَدۡخُلُوۡنَ فِىۡ دِيۡنِ اللّٰهِ اَفۡوَاجًا** (110:1-2)۔ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ فتح کے معنی عربی زبان میں Victory نہیں ہیں بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ کاروانِ انسانیت کے راستے میں جو رکاوٹیں ہیں' وہ دور ہو جائیں اور ان کے آگے بڑھنے کا راستہ صاف ہو جائے۔ اسلام کی یا مسلمانوں کی جسے ہم اپنے الفاظ میں فتح کہتے ہیں' قرآن کہتا ہے کہ اس معنی میں یہ Victory نہیں ہے جس معنی میں دنیا کی باقی سلطنتیں اس لفظ کو استعمال کرتی ہیں۔ یہ تو شرفِ انسانیت کے راستے میں جو رکاوٹیں ہوتی ہیں ان کو دور کر کے راستہ کھل جاتا ہے' ان کے لیے دروازے کھل جاتے ہیں۔ کہا کہ جب تُو دیکھے کہ تمہارے نظام کے تابع یہ کیفیت پیدا ہوئی ہے تو **وَرَاَيۡتَ النَّاسَ يَدۡخُلُوۡنَ فِىۡ دِيۡنِ اللّٰهِ اَفۡوَاجًا** (110:2) اور تُو دیکھے کہ اس نظامِ خداوندی میں کس طرح لوگ فوج در فوج چلے آ رہے ہیں۔ اب یہ کہیں فتح کرنے نہیں جا رہے' جنگ لڑنے کے لیے نہیں جا رہے بلکہ دنیا کی قومیں' دنیا کے افراد گروہ در گروہ ان کی طرف چلے آ رہے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ کیسا حسین منظر ہے' جنت آفریں منظر ہے کہ لوگ اس کی کشش سے ان کی طرف چلے آئیں۔ اس نظام کا جو سب سے بڑا اجتماع ہوتا تھا جسے حج کہا جاتا ہے' اس کے متعلق قرآنِ کریم میں ہے کہ نوعِ انسانی کے لیے' دنیا بھر کی اقوام کے لیے' اعلان کر دو کہ وہ یہاں آئیں **لِّيَشۡهَدُوۡا مَنَافِعَ لَهُمۡ** (22:28) تاکہ اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ تم ان کی منفعت کے لیے کیا کچھ کر رہے ہو۔ عزیزانِ من! جو آ کر دیکھ لے گا تو پھر وہ اپنے جہنم میں تو کبھی جانا پسند نہیں کرے گا۔ یہ وجہ تھی کہ قریش کے ان تمام قبائلوں اور یہودیوں نے پھر متحدہ محاذ بنایا۔ قریش سے کہا کہ تم سے اکیلے نہیں بن پڑتا کیونکہ یہ مسئلہ بڑا اہم ہے۔ ان تمام کے مفاد جو تھے وہ اس چیز سے وابستہ تھے۔ یہ سب اکٹھے ہوئے یعنی قریش بھی' عرب کے بدو بھی' مدینے کے یہودی بھی۔ اور یہودی تو ہمیشہ سے منافق رہا ہے' انہوں نے مدینے کے اندر مسلمانوں کے ساتھ معاہدے کر رکھے تھے کہ مذہب کا معاملہ یکطرف رکھیے' کوئی بھی دشمن اگر مدینے پر حملہ آور ہوگا تو ہم اس شہر کی حفاظت کے لیے آپ ﷺ کا ساتھ دیں گے۔ اور ہر موقعہ پہ جب ایسا کوئی خطرہ آیا تو انہوں نے مارِ آستیں بن کر اندر رہتے ہوئے ان کی پیٹھ میں چھرا گھونپا۔ یہ یہودی اس قسم کی قوم ہے۔

یہ جو جنگِ احزاب کہلاتی ہے تو میں نے عرض کیا ہے کہ احزاب کے معنی Allied Forces (متحدہ قوتیں) ہیں۔ یہ جو 18-1914 کی جنگ تھی اس میں اتحادیوں کی جو فتح کہتے تھے تو یہ اتحادی' احزاب کا ترجمہ ہے۔ ان سب نے مسلمانوں کے خلاف متحدہ محاذ بنایا جو مٹھی بھر جماعت تھی اور بیچاری ابھی ایک ہی شہر کے اندر محصور تھی۔ اور اندر جو ان کے حلیف تھے جنہوں نے معاہدہ کر رکھا تھا

وہ یہودی تھے اور وہ پہلے سے ان کے ساتھ ساز باز کر رہے تھے کہ تم حملہ کرو اور ہم اندر سے ان کے چھرا گھونپ دیں گے۔ عزیزانِ من! یہ حالات تھے۔ یہ ہے جسے جنگِ احزاب کہا گیا ہے۔ چنانچہ وہ اُمڈ کر آ گئے۔ یہ پہلی بار تھا کہ عرب کے اندر جنگ کے زمانے میں خندق کھودی گئی۔ عربوں کے ہاں اس کا دستور ہی نہیں تھا۔ ایران میں یہ جنگ کی Strategy (حکمت عملی) تھی۔ ادھر مدینے کے جو پچھلے تین حصے تھے، وہ تو محفوظ تھے۔ یہ جدھر سے مکے والے آتے تھے یہ حصہ غیر محفوظ تھا تو اس حصے میں خندق کھودی گئی۔ اسی لیے اسے غزوۂ خندق بھی کہتے ہیں۔ انہوں نے حملہ کیا۔ اب بات یہاں سے چلتی ہے۔

خدا تعالیٰ نے انبیائے کرامؑ سے بھی عہد لیا تھا

آپ نے سمجھ لیا کہ جنگِ احزاب صدرِ اول کی تاریخ میں بڑا ہی زلزلہ انگیز معرکہ ہے۔ اور آپ دیکھیں گے کہ قرآن کن الفاظ میں اس کا ذکر کرتا ہے لیکن اس کا ذکر کرنے سے پہلے ایک اصولی بات قرآن نے کہی ہے کہ **وَ اِذۡ اَخَذۡنَا مِنَ النَّبِیّٖنَ مِیۡثَاقَہُمۡ وَ مِنۡکَ وَ مِنۡ نُّوۡحٍ وَّ اِبۡرٰہِیۡمَ وَ مُوۡسٰی وَ عِیۡسَی ابۡنِ مَرۡیَمَ وَ اَخَذۡنَا مِنۡہُمۡ مِّیۡثَاقًا غَلِیۡظًا**(33:7) اے رسول! تم سے بھی ہم نے یہ عہد لیا ہے اور تم سے پہلے جو انبیاء گزرے ہیں، (مثلاً) نوح علیہ السلام، ابراہیم علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام، عیسیٰ علیہ السلام ابن مریم، ان سب سے بھی یہ عہد لیا تھا۔ میثاق کے معنی 'پختہ عہد' ہوتا ہے۔ یہ بڑا پختہ عہد لیا تھا۔ خاص طور پہ یہ انبیائے کرامؑ جن کا نام گنایا ہے اور **مِنَ النَّبِیّٖنَ** کہہ کر یہ کہہ دیا کہ ہم نے ہر نبی سے ہی یہ عہد لیا تھا۔ **وَمِنۡکَ** (33:7)، اور اے رسول! تم سے بھی ہم نے یہ عہد لیا ہے۔ یہ بہت بڑا اہم عہد ہے جو خدا اپنے انبیاء سے لے رہا ہے۔ میثاق کے تو معنی ہی پختہ عہد کے ہیں اور پھر اسے **مِّیۡثَاقًا غَلِیۡظًا** (33:7) کہا گیا ہے یعنی بہت ہی پختہ عہد۔ ایک ہی عہد کا ذکر ہے اور وہ اتنا اہم، اتنا محکم، اتنا مستحکم ہے۔ اور وہی فرائض تم پر بھی عائد کیے ہیں۔ یہ فرائض بڑے اہم ہیں اور یہ عہد بڑا استوار ہے۔ عہد یہ ہے کہ **لِّیَسۡـَٔلَ الصّٰدِقِیۡنَ عَنۡ صِدۡقِہِمۡ ۚ وَ اَعَدَّ لِلۡکٰفِرِیۡنَ عَذَابًا اَلِیۡمًا** (33:8) یہ جو تمہارے ساتھ آ کر ملتے ہیں، تمہاری امت کہلاتے ہیں، مومن کہلاتے ہیں، ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں، ان سے عہد یہ لیا جاتا ہے کہ صداقت پر ایمان لانا۔ اس دعویٰ ایمان کو دیکھنے کے لیے کہا ہے۔ ان کے دعویٰ ایمان کا ذرا امتحان لو، ذرا ٹیسٹ کرو۔

عزیزانِ من! یہ عہد لیا جا رہا ہے۔ یہ آ تو گئے ہیں اور دعویٰ ایمان کرتے ہیں، کوئی شبہ کی بات نہیں لیکن یہ یونہی مان لینے کی بات نہیں ہے، ذرا ان کا ٹیسٹ لو۔ جیسے کہتے ہیں کہ ان سے ذرا پوچھ کے دیکھو، ان کا ٹیسٹ لو، ان کا امتحان لو، اس سے مقصود یہ ہے کہ جو لوگ حق و صداقت کی خاطر جینا اور مرنا چاہیں، ان کے اس جذبۂ صادقہ کو صحیح مصرف میں لایا جائے اور اس طرح سے جو اس دین کے مخالفین ہیں، تم انہیں ان کے جرائم کی سزا دے سکو۔ یہ ہے میثاق جو تمام انبیائے کرام سے لیا جا رہا تھا۔ اس امت کے زمرے میں داخل

ہونے کے ساتھ ہی جنت نہیں ملتی تھی۔ یہ اسی طرح سے رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ کے زمرے میں نہیں آ جاتے تھے۔ نبی کے ساتھ ہیں' ان کو صدقین کہا گیا ہے۔ کہا یہ ہے کہ یہ یوں صدقین کہنے کی بات نہیں ہے۔ میثاق ہر نبی سے لیا گیا کہ تمہارا فریضہ ہے کہ تم ان کے دعویٰ صداقت کا ٹیسٹ کرو۔ اور جب یہ ٹیسٹ میں پورے اتریں گے تو پھر جو اس نظام کے مخالفین ہیں' ان کو ان کے جرائم کی قرار واقعی سزا مل سکے گی۔ عزیزانِ من! آپ نے غور فرمایا کہ ایک تو ایمان لانا ہے۔ ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ **اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَ اَمْوَالَھُمْ** (9:111) یہ خدا کے ہاتھ اپنی جانیں اور اپنا مال بیچ دیتے تھے۔ اور کہا یہ تھا کہ یہ محض لفظی اقرار نہیں ہے' کوئی نظری (Academic) چیز نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ تم خدا کے Behalf (کے نام) پہ ان سے یہ عہد نامہ لے کر دستخط کر کے' پکا عہد لیا کرو۔ یہ عہد نامہ کرنے کے بعد تو یہ لوگ اس زمرے میں داخل ہوتے تھے لیکن نبی سے یہ میثاق لیا جاتا تھا کہ ان کے داخل ہونے کے بعد بھی تمہارا فریضہ یہ ہے کہ ذرا ٹیسٹ کرتے رہو کہ ان کے دعویٰ ایمان میں کس قدر صداقت ہے۔ اور ٹیسٹ اس آیت کے ساتھ ہی آ گیا کہ اے جماعتِ مومنین! ذرا جنگِ احزاب کو یاد کرو۔ آپ نے دیکھا کہ نبی اپنی امت کے مدعیانِ حق وصداقت سے جو ٹیسٹ لیتا تھا تو وہ ٹیسٹ کا میدان کونسا تھا' امتحان کونسا تھا۔ اگلی آیت جنگِ احزاب کی ہے کہ یوں ٹیسٹ لیا جاتا تھا۔ یعنی جنگِ احزاب آنے والی نہیں ہے بلکہ گزر چکی ہے۔ یاد دلایا جا رہا ہے کہ **یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْکُرُوْا نِعْمَۃَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ** (33:9)۔ اے جماعتِ مومنین! خدا کی اس نعمت کو یاد کرو کہ جنگ میں جا کر کامران وکامیاب واپس لوٹنا خدا کی نعمت ہے۔ یہ جو **اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ** (1:6) ہم ہر نماز کی رکعت میں سورۃ الفاتحہ میں پڑھتے ہیں' آرزوئیں کرتے ہیں کہ ہمیں ان لوگوں کا راستہ دکھا جن پر تُو نے اپنا انعام کیا۔ تو ان مومنین کو یہ بتایا ہے کہ اس نعمت کو یاد کرو جب جنگِ احزاب جیسے زلزلہ انگیز معرکہ میں تمہیں کامیابی عطا ہوئی تھی۔ جب ہم اس آرزو کا اظہار کرتے ہیں' مسجد میں باوضو ہو کر ایک رکعت میں نہیں بلکہ ہر رکعت میں خدا سے یہ کہتے ہیں کہ ہمیں ان لوگوں کی راہ پر چلا۔ یہاں انعام کے متعلق کہا گیا ہے۔ تو یہ تھا انعامِ خداوندی۔ آگے کہا کہ **اِذْ جَآءَتْکُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَیْھِمْ رِیْحًا وَّ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْھَا❶** (33:9)۔

جنگِ احزاب کے سلسلہ میں قرآن حکیم کا ادبی انداز

عزیزانِ من! آگے جنگِ احزاب کی ساری تفصیل آتی ہے لیکن میں نے عرض کیا تھا کہ جو احباب ادیب ہیں' لکھنے والے

---

❶ جب مخالفین کے لشکر یک بارگی تم پر حملہ آور ہو گئے تھے' تو ہم نے اُن پر آندھی کا طوفان بھیجا یعنی ان کائناتی قوتوں کے لشکروں کو بھیجا جو تمہیں نظر نہیں آتے تھے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔966)

ہیں، وہ جانتے ہیں کہ بڑا عمدہ حسین طریق یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ آگے کہا جانے والا ہے، خاص طور پر کہانی میں یا ڈرامے میں، اس کے لیے یہ انداز بڑا مؤثر ہوتا ہے کہ شروع میں چند الفاظ میں اس کا ماحصل بتا دیا جائے اور پھر اس واقعہ کی ابتدا کی جائے۔ اب تو عام طور پہ سینما میں بھی یہ کچھ کرنے لگ گئے ہیں۔ فلم کے اندر پہلے تھوڑا سا اس کہانی کا آخری حصہ دکھاتے ہیں، ناظریوں آتا ہے کہ وہ کہانی شروع ہوئی ہے لیکن وہ کہانی ابھی شروع نہیں ہوئی ہوتی بلکہ وہ اس کا ماحصل پہلے دو تین منٹ میں دکھانے کے بعد کہانی شروع کرتے ہیں۔ قرآن کا تو ادب کے لحاظ سے بھی بڑا اونچا مقام ہے۔ اس کا یہ انداز ہوتا ہے۔ کہا ہے کہ ذرا اس واقعہ کو یاد کرو۔ وہ جنود، لشکر، احزاب اکٹھے ہو کر آئے انہوں نے حملہ کیا تو آگے خندق تھی۔

مہینہ بھر پندرہ بیس ہزار کا محاصرہ، خورد و نوش کی قلت، باہر سے پتھراؤ، تیروں کی بوچھاڑ اور اندر سے یہودیوں کی سازش

جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ عربوں کے ہاں یہ پہلا موقع تھا کہ جنگ کے زمانے میں کہیں خندق سامنے آئی ہو۔ وہ تو بہر حال وہاں رک گئے۔ قریب ایک مہینہ تک یہ محاصرہ جاری رہا تھا۔ محاصرے میں بھی یہ صورت تھی کہ وہ خندق کوئی اتنی بڑی چوڑی نہیں کھودی گئی تھی۔ اس کا عرض مختصر سا تھا۔ بعض جگہ تو وہ اتنی چھوٹی تھی کہ ان کے ہاں کے جو گھوڑ سوار تھے، وہ اس خندق کو ٹاپ بھی جاتے تھے لیکن وہاں سے وہ تیر اندازی سے اور پتھروں سے وار کرتے تھے۔ اس زمانے کے یہی ہتھیار ہوتے تھے۔ پھر یہ محصور ہو گئے، باہر سے خوراک وغیرہ آنی بند ہو گئی۔ وہ باہر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک مہینے تک یہ قصہ جاری رہا۔ ان مدینے والوں پہ یہ محصوریت تھی اس طرح سے انہیں اتنے لمبے عرصے کے لیے محصور ہو جانا تھا اور پھر دن رات کے لیے خطرہ تھا، سامنے وہ لشکر تھا، وہ کم از کم پندرہ بیس ہزار کے قریب بتایا جاتا ہے۔ مقابلے میں یہ محصور ہوئے تھے اور وہاں سے دن رات تیروں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی، پتھر پڑ رہے تھے، کھانے پینے کو نہیں ملتا تھا۔ یہاں اندر ان کے ہاں کے جو یہودی منافق تھے، جنہوں نے معاہدہ کیا ہوا تھا، وہ اندر ان کے لیے وجۂ اضطراب بن رہے تھے۔

جنگ کے دوران آندھی کے جھکڑ اور بارش نے میدانِ جنگ کا پاسا پلٹ دیا

کوئی مہینہ بھر کے بعد ایک ایسی رات آئی کہ اس میں ایک بڑی ٹھنڈی یخ بستہ آندھی چلی، آندھی بھی نہیں، جھکڑ تھا۔ اس جھکڑ میں ان کے خیمے الٹ گئے، ان کے گھوڑے رسیاں تڑا تڑا کر بھاگ گئے، کھانے پینے کا سامان تہس نہس ہو گیا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ وہ دیگیں جو چڑھی ہوئی تھیں وہ بھی الٹ گئیں۔ اتنے زور کی وہ آندھی تھی۔ اور یہ بھی اصل میں تھک چکے ہوئے تھے، اس قسم کی جنگ سے تنگ آ گئے تھے جو پہلے کبھی انہوں نے لڑی ہی نہیں تھی۔ ان کی جنگوں کا تو چند گھنٹوں کے اندر فیصلہ ہو جایا کرتا تھا۔ اور بعض اوقات تو ان کی

جنگ ایک ایک آدمی کی ہوتی تھی یعنی ایک اِدھر سے ایک اُدھر سے۔ اس میں سے جو قتل ہو گیا وہ قوم شکست کھا گئی۔ یہ جنگ جس کے اندر انہیں مہینہ بھر کے لیے باہر بیٹھنا پڑا اور یہ اندر ہیں۔ وہ تنگ آ گئے تھے۔ یہ خاص طور پہ خدا نے بتایا ہے۔ دو واقعات اللہ تعالیٰ نے بتائے ہیں: بدر کے میدان میں بارش ہوئی تھی' اس بارش نے میدان کا نقشہ بدل دیا تھا۔ اس زمانے میں گرمی کا موسم تھا۔ ادھر پانی پینے کو نہیں ملتا تھا۔ عین اس وقت پہ بارش ہوئی تھی اور اسے خدا نے اپنی رحمت قرار دیا تھا' اس سے بھی جنگ کا نقشہ بدلا تھا۔ اور ❶ جنگِ احزاب میں یہ آندھی آئی تھی۔ جس کے لیے کہا ہے کہ **جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا** (33:9) آئے تھے۔ یعنی ایسے لشکر آئے تھے جنہیں تم دیکھ نہیں سکتے تھے۔

جنگِ احزاب میں ملائکہ کے نزول کا تصور اور اس کی حقیقت

عام طور پہ کہا جاتا ہے کہ یہ جنود ا ملائکہ تھے جو مدد کے لیے آئے تھے۔ میں نے ملائکہ کے متعلق عرض کیا ہوا ہے۔ بہر حال اس کی تفصیل میں تو میں اب نہیں جاتا۔ وہ ملائکہ یہ نہیں ہیں جو انسانوں کی شکل میں کہیں آتے ہیں۔ یہ ملائکہ تو کائناتی قوتیں (Cosmic Forces) ہیں۔ یہ جیسے جھکڑ اور آندھی اور بارش کہا ہے' اس اصطلاح کے مطابق یہ خود ملائکہ کہلاتے تھے لیکن قرآن نے جو کہا ہے اور جس کے لیے میں نے خاص طور پہ زور دیا ہے' وہ قرآن میں دو جگہ (33:9 اور 9:40) میں آیا ہے کہ خدا نے مدد کے لیے اپنے لشکر بھیجے اور دونوں مقام پہ ان لشکروں کے لیے "لَمْ تَرَوْهَا" آیا ہے کہ وہ لشکر ایسے تھے کہ تم انہیں دیکھ نہیں سکتے تھے۔ اب یہ نظر آیا کہ وہ انسانوں کی شکل کے اندر کوئی لشکر نہیں آیا تھا۔ یہاں (33:9) میں یہی کہا ہے اور دوسرے مقام (9:40) میں بھی کہا ہے۔ جنگِ بدر میں بھی قرآن نے ملائکہ کہا ہے اور کہا ہے کہ تم انہیں دیکھ نہیں سکتے تھے (9:40)۔ گویا جس کو قرآن نے ملائکہ بھی کہا ہے' میں ابھی ان کی تفصیل میں نہیں جاتا۔ قرآن نے کہا ہے کہ تم انہیں دیکھ نہیں سکتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ ؓ مخاطب ہیں جن سے کہا گیا ہے کہ تم انہیں دیکھ نہیں سکتے تھے۔

1965ء کی پاک بھارت جنگ میں پاک فوج کے جرأت مندانہ کارنامے اور ہماری غلط نگہی کے افسانے

آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ہاں جو 1965ء میں جنگ ہوئی ہے' اس کے متعلق افسانے مشہور ہوئے تھے کہ وہ سفید گھوڑیوں والے اور سبز عماموں والے راوی کے پل کے اوپر کھڑے تھے۔ دشمن گولا چلاتا تھا تو وہ درمیان میں ہی گولا دبوچ کر دوسری طرف پھینک دیتے تھے۔ کسی حضرت صاحب نے کہا کہ میں نے دیکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لا رہے ہیں تو میں نے پوچھا کہ آپ ﷺ کدھر جا رہے ہیں تو انہوں ﷺ نے کہا کہ جنگ کی مدد کے لیے جا رہا ہوں۔ یعنی وہ فرشتے ایسے ہیں جو نہیں سلام علیکم کرتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں

کہ وہ ان کے سامنے گولے پھینک رہے ہیں۔ یہ تو ان فرشتوں کو دیکھتے ہیں۔ اور خدا اپنے رسول ﷺ سے اور صحابہؓ سے کہہ رہا ہے کہ ہم نے جو فرشتے بھیجے تھے' تم ان کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ چودہ سو سال میں یا وہ جو فرشتے تھے ان کا انداز بدلا ہے یا ان کی نگاہ بدلی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ کتنے افسانے مشہور ہوئے تھے۔ اور آپ نے اس کی لم نہیں پہچانی کہ وہ اس قسم کے جو افسانے تھے وہ کیوں تھے۔ یہ بڑے بڑے بزرگوں کے متعلق تھا کہ حضرت داتا صاحبؒ ابوالحسن علی ابن عثمان الھجویری الغزنوی یا ابوالحسن ہجویری (1077-990ء) بھی تشریف لا رہے تھے' حضرت خواجہ فریدؒ صاحب (1901-1841) بھی تشریف لا رہے تھے اور انہوں نے آ کر میدانِ جنگ کا نقشہ بدل دیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ قصہ کیوں تھا؟ یہ بڑی گہری تانیں ہوتی ہیں۔ ایک موقعہ ایسا آیا تھا جس میں پاکستان کے مجاہدین کو اس چیز کا کریڈٹ جاتا تھا کہ سترہ دن کے اندر اندر انہوں نے بھارت جیسے اور ہندو جیسے دشمن کے دانت کھٹے کر دیئے تھے۔ عظیم قسم کی یہ جنگ تھی جو لڑی گئی۔ یورپ کے مورخین سے پوچھیے کہ وہ کیا کہتے ہیں؟ وہ کہتے ہیں کہ کوئی باور نہیں کر سکتا تھا کہ اس جنگ میں پاکستان کامیاب ہو جائے گا۔ ہماری فوجیں' ہمارے سپاہی' ہمارے مجاہدین' نے یہ سب کچھ کیا لیکن وہ جو صرف دعائیں مانگنے والے ہوتے ہیں' جنہوں نے کبھی میدانِ جنگ دیکھا ہوا نہیں ہوتا ہے' وہ چاہتے نہیں تھے کہ یہ کریڈٹ ان کو چلا جائے۔ انہوں نے ساری فتح کا جو کریڈٹ تھا' کسی حضرت صاحب کے نام کیا' کسی پیر صاحب کے نام لکھ دیا کہ وہ آئے تھے' انہوں نے فتح کیا تھا۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے مدد کا انداز

قرآن کہتا ہے کہ یہ ملائکہ آتے ہیں اور تم ان کو دیکھ نہیں سکتے۔ یہ آتے تھے تو یہ کیا کرتے تھے؟ قرآن سے پوچھیے کہ یہ کیا کرتے تھے۔ یہ گولے اٹھا اٹھا کر دوسری جگہ نہیں پھینکتے تھے۔ کہا ہے کہ **اِذۡ تَسۡتَغِیۡثُوۡنَ رَبَّکُمۡ فَاسۡتَجَابَ لَکُمۡ اَنِّیۡ مُمِدُّکُمۡ بِاَلۡفٍ مِّنَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ مُرۡدِفِیۡنَ** (8:9) تم نے خدا سے مدد مانگی تو ہم نے ملائکہ سے تمہاری مدد کی جنہیں تم دیکھ نہیں سکتے۔ پھر کہا کہ **وَمَا جَعَلَہُ اللّٰہُ اِلَّا بُشۡرٰی وَلِتَطۡمَئِنَّ بِہٖ قُلُوۡبُکُمۡ** (8:10) اس سے تمہارے دلوں میں اطمینان حاصل ہوتا تھا اور تمہارے پاؤں میں استقامت آ جاتی تھی۔ اب کچھ بھی اس کے معنی کر لیجیے' میں یہاں تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ میں نے اس کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔

خدا اور اس کے فرشتوں کی طرف سے مجاہدین پر تحسین و آفرین کی گُل پاشی

قرآن نے کہا یہ ہے کہ وہ تمہارے دلوں کو اطمینان اور تسکین دیتے تھے۔ اس سے تمہارے پاؤں میں استقامت آ جاتی تھی۔ دوسری جگہ ہے کہ یہ جو تمہاری استقامت تھی' یہ چیز مخالفین کے لیے کپکپا دینے والی تھی۔ میدانِ جنگ میں اگر مقابل کی فوج جم کر کھڑی

ہو جائے تو واقعی دشمن وہاں سے بھاگ جاتا ہے۔قرآن نے یہ بتایا ہے۔باقی یہ جو میدانِ جنگ میں یہ کچھ ان مومنین مجاہدین نے کیا ہے پوچھیے کہ اللہ تعالیٰ کس طرح اسی سورۃ میں کہتا ہے کہ **هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْكُمْ وَ مَلٰٓئِكَتُهٗ** (33:43) اومجاہدو! اللہ اوراس کے فرشتے تم پہ درود وسلام بھیجتے ہیں۔فتح اگر ان فرشتوں نے ہی کی تھی تو وہ فرشتے ان پہ کیوں درود وسلام بھیجتے تھے؟ وہ ان کے اوپر تحسین و آفرین کے پھول نچھاور کرتے تھے۔اس لیے کہ **وَ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرًا** (33:9) خدا تمہارے عمل اور تمہارے کام کو دیکھ رہا تھا کہ تم کیا کر رہے ہو۔

قرآنِ حکیم نے اپنے ہاں مجاہدین کے عمل کا تو ذکر کیا ہے' سبز عماموں کا کہیں ذکر نہیں کیا

عزیزانِ من! قرآن ہے' یہ تو وہیں معاملہ صاف کر دیتا ہے۔اگر یہ سبز عماموں والوں نے یہ کیا تھا تو یہ **بِمَا تَعْمَلُوْنَ** (33:9) کیسے آ گیا؟ قرآن **بِمَا تَعْمَلُوْنَ** کہتا ہے کہ یہ انہی کا عمل تھا۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ

کہا ہے کہ **وَ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرًا** (33:9)۔اور اللہ تمہارے اعمال سے اچھی طرح' باخبر تھا۔یہاں وہ نعمت تو گنا دی کہ وہاں تمہیں اتنی بڑی کامیابی ہوئی تھی۔کیا یہ فتح' یہ کامیابی آخری چیز تھی؟ کہا کہ اب اس کے بعد کہانی شروع ہو رہی ہے۔کیفیت یہ تھی کہ **اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَ مِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَ اِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَ بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَ تَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا** (33:10)۔وہ تم پر ایسی سختی کا وقت تھا کہ دائیں بائیں چاروں طرف سے یہ جو دشمن کے لشکر تھے وہ ہجوم کر کے تمہارے خلاف آ گئے تھے۔اور میدانِ جنگ میں تمہاری کیفیت یہ تھی کہ خوف کے مارے تمہاری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔اور دہشت سے تمہارے سینے میں' تمہارے دل' اس طرح دھک دھک کر رہے تھے گویا وہ حلق تک آ پہنچے ہیں۔تم میں جو اس قسم کے کمزور دل تھے وہ خدا کے متعلق طرح طرح کے ظن اپنے دلوں کے اندر پیدا کر رہے تھے کہ اس نے تو فتح کا وعدہ کیا تھا' یہ کیا ہو رہا ہے۔ **هُنَالِكَ ابْتُلِیَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ زُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِیْدًا** (33:11) اس لرزا دینے والی مصیبت کے وقت مومنین کا جذبۂ صادقہ ابھر کر سامنے آ گیا اور دیکھنے والوں نے دیکھ لیا کہ وہ کس پامردی سے مصائب کا مقابلہ کرتے ہیں۔یہ تھا وہ ٹیسٹ جس کے متعلق ہم نے رسول سے کہا تھا کہ ان کا ذرا ٹیسٹ کیجیے۔اس قسم کا ٹیسٹ کیجیے کہ **وَ زُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِیْدًا** (33:11) اس سے تزلزل واقعہ ہو گیا تھا اور تمہارے پایۂ استقامت میں لغزشیں آ سکتی تھیں۔یہ تھی یہ جنگِ احزاب۔دو ایک مقام میں اور بھی دیکھ لیجیے کہ قرآنِ کریم کیا کہتا ہے۔

ہمارے ہاں کلمہ پڑھنے کی صورت اور شفاعت کا غلط تصور

عزیزانِ من! ہمارے ہاں تو یہ صورت ہے کہ بس کلمہ پڑھا اور جنت ملی مگر اب تو کلمہ پڑھنے کا وہ موقعہ ہی نہیں آتا۔ جیسا میں نے کہا ہے کہ پیدا ہونے کے بعد ہم ساری عمر کلمہ نہیں پڑھتے کیونکہ وہ ملّا آ کر کان میں بانگ (اذان) دے جاتا تھا۔ ساری عمر میں' صرف نکاح کے وقت' ملّا کلمہ پڑھایا کرتا تھا۔ اب آہستہ آہستہ جب نکاح کا وہ طریقہ Modernize (جدید) ہوا ہے تو وہ بھی بیچ میں سے نکل گیا ہے۔ اب تو ساری عمر کہیں کلمہ پڑھنے کا موقعہ بھی نہیں آتا۔ اس کے باوجود اطمینان یہ ہے کہ جنت میں ہم ہی نے جانا ہے کیونکہ تیرے محبوب کی امت جو ہوئی' رسول اللہ ﷺ نے اپنی شفاعت سے بخشوا دینا ہے۔ یہ ہے ہمارا ایمان۔ یعنی اس شفاعت یا سفارش کے ایمان کو اس حد تک پختہ کیا ہوا ہے کہ کسی کو بدترین گالی دینی ہو تو اسے کہتے ہیں کہ تجھے رسول کی شفاعت نصیب نہ ہو۔ اور جس کے متعلق کہا جائے کہ یہ تو شفاعتِ رسول کا منکر ہے تو یہ کفر ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی سفارش پر جنت میں جانے کا عقیدہ اتنا راسخ کیا ہے۔ میں نے تو کئی دفعہ آپ کے سامنے وہ روایات پیش کی ہیں کہ جب تک آخری مسلمان یعنی امتِ محمد ﷺ کے آخری فرد کو بھی جنت میں نہیں بھیج دیں گے آپؐ خود جنت میں نہیں جائیں گے۔ تو یہ اس چیز پہ کتنا بڑا فریبِ نفس ہے یا کتنا بڑا اعتماد ہے کہ جنت تو ہے ہی ہمارے لیۓ' ہم نے تو بالآخر اس میں جانا ہی ہے۔ یہاں پھر اچھے کام کرنے کی کیا ضرورت ہوئی؟ یعنی وہ اچھا کام کرنے والا یا برا کام کرنے والا' وہ دونوں ہی امتِ محمد ﷺ کے فرد ہیں اور وہاں ہر ایک کی بخشش ہو جانی ہے تو پھر اچھا کام کرنے کی ضرورت کیا ہوئی کہ وہاں تو سب نے ایک جیسا ہو جانا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس کا اثر کتنا ہوتا ہے۔

ہمارے ہاں کی غلط روایات کے برعکس جنت کے حصول کے لیے قرآنِ حکیم کا ارشاد

عزیزانِ من! سنیے کہ قرآن کیا کہتا ہے۔ کہا ہے کہ اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ (2:214) کیا تم اپنے ذہن میں یہ سمجھے بیٹھے ہو' یہ خیالِ خام لیے بیٹھے ہو کہ تم جنت میں یونہی داخل ہو جاؤ گے۔ وَ لَمَّا یَاۡتِکُمۡ مَّثَلُ الَّذِیۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِکُمۡ (2:214) اور تم پہ وہ وارداتیں نہیں گزریں گی' وہ معرکہ آرائیاں نہیں ہونگی' وہ مصائب نہیں جھیلنے پڑیں گے' وہ مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا جس قسم کا اس سے پیشتر اُن قوموں پر پڑا جو حق وصداقت کی علمبردار رہی ہیں۔ انہیں اس قسم کی صعوبات برداشت کرنا پڑی تھیں۔ وہ صعوبات یہ تھیں کہ مَسَّتۡهُمُ الۡبَاۡسَآءُ وَ الضَّرَّآءُ وَ زُلۡزِلُوۡا (2:214) میدانِ جنگ تھا' سخت ترین معرکہ آرائیاں' اس قدر سخت اور شدید تھیں کہ ان کے اندر تزلزل واقع ہو گیا۔ ایسا تزلزل کہ حَتّٰی یَقُوۡلَ الرَّسُوۡلُ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ (2:214) رسول اور اس کے ساتھی بھی پکار اٹھے کہ مَتٰی نَصۡرُ اللّٰهِ (2:214) اے اللہ! تیری مدد کب آئے گی۔ یہ نہیں ہے کہ ان کے دل میں

یہ خیال تھا کہ اللہ کی مدد آئے گی نہیں۔ یہاں مَتٰی کا لفظ ہے۔ کہا کہ ہمیں اس پر تو ایمان ہے کہ تو نے کامیابی کا وعدہ کیا تھا۔ کامیابی آئے گی تو سہی لیکن اے مولا! بتا کہ وہ کب آئے گی؟ میری جان میرے لبوں تک آ گئی ہے، تم آ ؤ تا کہ مجھے زندگی مل جائے۔

بہ لبم رسیدہ جانم تو بیا کہ زندہ مانم

میری موت کے بعد اگر یہ چیز آئی تو مجھے اس کا کیا فائدہ ہے۔

تزاحمات اور تصادمات کے گھنے جنگل کو عبور کیے بغیر جنت کا حصول ممکن نہیں ہوتا

عزیزانِ من! یہ متٰـی بڑا عجیب لفظ ہے۔ یہ نہیں ہے کہ انہیں اس کے متعلق کوئی شبہ تھا۔ سوال یہ تھا کہ ہمارے اندازے کے مطابق یہ وقت آ گیا ہے کہ تیری مدد آنی چاہیے۔ اگر اس وقت بھی وہ نہیں آ رہی تو ہمیں اتنا ہی بتا دے کہ وہ کب آئے گی۔ رسول ﷺ اور اس کے ساتھیؓ دونوں پکار اٹھے۔ خدانکردہ یہ نہیں تھا کہ انہیں خدا کی نصرت کے آنے میں کوئی شک پیدا ہو گیا تھا۔ بات صرف وقت کی تھی کہ ہمارے اندازے کے مطابق تزلزل اتنی شدت اختیار کر گیا ہے کہ تیری جو نصرت ہے وہ اب آ جانی چاہیے۔ اگر اب بھی نہیں آ رہی تو ہمیں یہ تو بتا دے کہ وہ کب آئے گی۔ کہا کہ اَلَآ اِنَّ نَصۡرَ اللّٰـہِ قَرِیۡبٌ (2:214) اوحوصلہ نہ ہارو، وہ آئی مدد۔ بات یہاں سے شروع ہوئی تھی کہ اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّۃَ (2:214) تم سمجھے بیٹھے ہو کہ ہم نے اس طرح سے امتِ محمد ﷺ میں نام لکھایا اور جنت میں پہنچ گئے۔ جب تک ان تصادمات، ان تزاحمات میں سے نہیں گزر جاؤ گے، اس وقت تک جنت میں کیسے داخل ہو گے۔ یہی ہے وہ جسے پل صراط کہا کرتے ہیں۔ اس میں سے گزرنے کے بعد تم جنت میں جا سکو گے۔ کئی مقامات ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ اس زعمِ باطل میں گرفتار نہ رہنا کہ یونہی کلمہ پڑھنے سے یا اپنے آپ کو امتِ محمد ﷺ کے رجسٹر میں نام لکھوا دینے سے جنت میں چلے جاؤ گے۔ جنت میں جانے کے لیے تو ان وادیوں میں سے گزرنا پڑے گا۔ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ یُّتۡرَکُوۡۤا اَنۡ یَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا (29:2) کیا لوگ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ انہوں نے کہہ دیا کہ ہم ایمان لائے اور ہم نے کہا کہ بس ٹھیک ہے جنت میں چلے جاؤ؟ کیا لوگ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ اٰمَنَّا کا لفظ کہہ دینا ہی کافی ہے۔ جی! کون ہوتے ہو؟ جی! 'الحمدللہ مسلمان ہونے آں'۔ تو کہا کہ کیا یہ کہہ دینے سے معاملہ ختم ہو گیا؟ الفاظ ہیں اَنۡ یُّتۡرَکُوۡۤا (29:2) تو کیا تمہیں چھوڑ دیا جائے گا؟ یعنی تم نے عدالت کے اندر یہ کہا کہ ہم تو مسلمان ہیں تو کیا تمہیں چھوڑ دیا جائے گا؟ وَ ہُمۡ لَا یُفۡتَنُوۡنَ (29:2) اور کیا تمہیں ان بھٹیوں میں سے نہیں گزارا جائے گا جہاں سے پیتل کندن بن کر نکلا کرتا ہے؟ وَ لَقَدۡ فَتَنَّا الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ (29:3) تم سے پہلے بھی جو لوگ جنت کے مستحق قرار دیئے گئے تھے انہیں ان بھٹیوں میں سے گزارا گیا تھا۔ فَلَیَعۡلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ صَدَقُوۡا وَ لَیَعۡلَمَنَّ الۡکٰذِبِیۡنَ (29:3) یہ بھٹیاں ہیں جن میں سے گزرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ سچا سونا کونسا ہے اور پیتل کونسا ہے۔ ان میں سے تو گزرنا پڑے گا۔ یہ ہے جنت میں جانے کا راستہ۔ یہ ہے وہ شرط جو جنت

میں جانے کے لیے قرآن نے کہی ہے۔ جیسا میں کہا کرتا ہوں کہ ہمارے ہاں تو بس اتنی سی چیز ہی ہے۔ وہ جو اقبالؒ (1938-1877) نے کہا تھا کہ

بہشتے بہرِ پاکانِ حرم ہست
بہشتے بہرِ اربابِ ہمم ہست
بگو ہندی مسلمان را کہ خوش باش
بہشتے فی سبیل اللہ ہم ہست

(ارمغانِ حجاز، ص 210)

'اللہ واسطے وی جنت لبھ جاندی اے'❶۔

جنت جیسی عظیم نعمت کا حصول کاسۂ گدائی کے ذریعے ممکن نہیں ہوتا

یہ قوم اس کے بعد اللہ واسطے لینے کی عادی ہوگئی۔ کاسۂ گدائی ہاتھ میں پکڑا ہوا ہے: دے جا بابا! اللہ تیرا بھلا کرے گا' دیدے مجھے' اللہ تجھے دے گا۔ یعنی تجھے نہیں اللہ براہِ راست دے گا۔ کاسۂ گدائی لیے پھر رہے ہیں۔ وہ گداگری کے اندر روٹی سے چلے ہیں' آہستہ آہستہ جنت تک پہنچ گئے ہیں 'بہشتِ فی سبیل اللہ ہم ہست' اللہ کے واسطے جنت مانگ رہے ہیں۔ 'یعنی لیندا اپنے واسطے اے' تے کہندا اللہ واسطے❷ '۔ عزیزانِ من! بڑے دکھ سے مجھے یہ چیزیں کہنا پڑتی ہیں۔ جگر شق ہو جاتا ہے۔

قرآنِ حکیم کے مطابق جنت تو مومنین کا مسکن ہے' ہم جیسے گداگروں کا نہیں

بات بڑی صاف ہے۔ ہم نے بنیادی غلطی یہ کرلی ہوئی ہے کہ جو کچھ قرآن کہہ رہا ہے' جس قسم کے وہ وعدے کر رہا ہے' جس قسم کے وہ نتائج پیش کر رہا ہے' قوم کے متعلق اتنی برکات اور نعماء دے رہا ہے تو ہم نے سمجھ لیا ہے کہ یہ ہم سے وہ باتیں کر رہا ہے۔ وہ ہم سے باتیں نہیں کر رہا۔ اُس نے تو یہ پہلی چیز کہی ہے کہ وہ مخاطب ہی مومنین کو کرتا ہے۔ اور مومنین کے متعلق یہ نہیں ہے کہ جو اپنا نام رکھا لے وہ مومن ہو جاتا ہے۔ مومن کی تو خصوصیات سارے قرآن میں ہیں بلکہ خصوصیات نہیں شرائط کہیے۔ وہ جو ان شرائط کو پورا کرتا ہے وہ مومن کی صف میں آتا ہے' یہ چھوٹے سے الیکشن کے لیے آپ کے ہاں کئی Conditions (شرائط) ہوتی ہیں۔ اس کے بعد جو

---

❶ اللہ کی بخششیں کی ہوئی جنت مل جاتی ہے۔

❷ یعنی لیتا اپنے لیے ہے اور کہتا یہ ہے کہ اللہ کے لیے دو۔

ان Conditions (شرائط) کو Fulfill (پورا) کرتا ہے Eligible (حقدار) ہوتا ہے۔ ابھی صرف Eligible (حقدار) ہوتا ہے۔ اس کے بعد یہ نہیں کہ Successful (کامیاب) ہوتا ہے۔ یہ جو قرآنِ کریم نے جس قدر یہ وعدے کیے ہیں یا جنتیں دی ہیں یا دنیا کی خوشگواریاں دی ہیں، خوشحالیاں دی ہیں، جنہیں اعلون کہا ہے، یعنی اقوامِ عالم میں سب سے اونچے اور غالب تریں کہا ہے، وہ اس نے مومنین کے متعلق کہا ہے، ہمارے لیے نہیں کہا۔ اس لیے کہ جو وہ Eligible (حقدار) ہی نہیں ہے، جو ان شرائط پر پورا ہی نہیں اترتا جن کے بعد وہ مومن کہلاسکتا ہے تو اسے کیا حق حاصل ہے کہ یہ کہے کہ یہ سب چیزیں ہمارے لیے ہیں۔ یہ فریب ہے۔ یہاں تو وہ فریب کھل جاتا ہے جب وہ الیکشن آفیسر کہہ جاتا ہے کہ صاحب! تمہاری یہ شرط پوری نہیں ہے اس لیے Paper Rejected (کاغذات مسترد) تم اس صف میں بھی نہیں رہتے۔ چونکہ ہم اپنا پیپر ہی پیش نہیں کرتے اس لیے Rejection (مسترد ہونے) والی بات ہی نہیں اور جنت اپنے لیے ہی سمجھے بیٹھے ہیں۔ یہی نہیں کہ ہم Eligible (حقدار) ہیں، بلکہ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہم Successful (کامیاب) ہیں، کامیاب ہوگئے ہوئے ہیں، ہمارے لیے جنت کی پارلیمنٹ کا دروازہ کھل گیا ہے۔ عزیزانِ من! پہلی شرط اس کے لیے یہ ہے کہ وہ ان شرائط پر پورا اترے، ان Conditions (شرائط) کو Fulfill (پورا) کرے جو قرآن نے مومن کی کہی ہیں۔ پھر یہ ان چیزوں کے لیے Eligible (حقدار) ہوگا ورنہ وہ تو اندر نہیں آنے دیتا۔ بات تو غزل کے انداز کی ہے لیکن ہے بڑی عمدہ:

غافل، ان مہ طلعتوں کے واسطے
چاہنے والا بھی اچھا چاہیے
چاہتے ہیں خُوبرویوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

او بابا! یہ جو کچھ کہا گیا ہے، یہ ہمارے متعلق کہا گیا ہے کہ

غافل، ان مہ طلعتوں کے واسطے
چاہنے والا بھی اچھا چاہیے

(مرزا اسداللہ خاں غالب)

انسان کے لیے پہلا مرحلہ میثاق کا ہے پھر صلاحیتوں کی نشوونما کا اور پھر عمل کے بعد حصولِ نتائج کا

میں کہہ رہا تھا کہ نبی سے میثاق لیا جا رہا ہے کہ ان کا ٹیسٹ کرو۔ پھر اس ٹیسٹ کے بعد جو اس ٹیسٹ میں Qualify (کامیاب) ہوں تو **وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ** (2:129) وہ ان کو قرآن کی اور حکمت وفلسفہ کی تعلیم دیتا ہے۔ **وَ یُزَكِّیْهِمْ** (2:129) اور ان کی صلاحیتوں کی نشوونما کرتا ہے۔ یہ سارا پروگرام ہے۔ کرنے والا نبی ہے اور جن کا کیا جا رہا ہے وہ ہیں جنہیں ہم صحابہ کبارؓ کہتے ہیں۔ خدا جن کی قسمیں کھاتا ہے' یہ کس طرح سے بنے تھے؟ یہ تو سارے وہی تھے جن کی اسلام سے پہلے کی تاریخ ہمارے سامنے ہے' یہ وہیں کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے یہ ٹسٹ کیسے Qualify (استعداد کے لیے شرائط کو پورا) کر لیا۔ عزیزانِ من! یہ پہلا پروگرام ہے۔ غور کیجیے گا کہ ہم جو اس چیز کے بہت زیادہ آرزومند ہیں کہ اسلام کا جو نقشہ ہے وہ پھر سے آجائے' تو کیا ہم اس پروگرام کو پورا کر کے' ابھی گزرے بھی ہیں؟ کیا ہم نے اس کے لیے Qualify (استعداد کی شرائط کو پورا) بھی کیا ہے؟ کیا ہم نے یہ شرائط پوری کی ہیں؟ یہ سوچنے کی بات ہے۔ یہ جھگڑے جھمیلے تو بعد میں ہونگے کہ کس کو کتنے ووٹ ملے اور کون وہاں اندر آیا اور کس کا پیپر مسترد ہوا۔ وہ ان کے متعلق بات ہوگی جو Eligilbe (حقدار) Candidate (امیدوار) کی لسٹ کے اندر آیا ہوا ہوگا۔ جو اس لسٹ میں ہی نہیں آیا اس کو اس کی کیا خوشی ہوگی کہ فلاں پارٹی کی Majority (اکثریت) ہوگئی۔

نبی اکرمؐ کی طرف سے جوہرِ کامل کے چناؤ کا مرحلہ

عزیزانِ من! ہم ابھی اس لسٹ میں ہی نہیں آئے جو مومن کہلانے کے Eligilbe (حقدار) ہیں۔ پھر آگے بات چلے گی۔ وہ تو جوہرِ کامل کو چن چن کر لیتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے وہ یونہی دعا نہیں مانگ لی تھی۔ اس وقت مکے میں بڑی سختی کا عالم تھا۔ ایک ایک فرد آیا کرتا تھا اور اسلام لاتا تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے یہ دعا مانگی تھی کہ یا اللہ! ابوجہل [1] اور عمر میں سے کسی ایک کو مجھے دیدے۔ وہ تو ابھی مسلمان بھی نہیں ہوئے تھے۔ یہ ان کے اندر کیا چیز تھی کہ نبی دعا مانگ رہا ہے کہ ان میں سے ایک مجھے دیدے۔ تو عمرؓ (581-644/45AD) آ گئے' ابوجہل کی قسمت میں یہ سعادت نہیں تھی۔ یہ عمرؓ وہی ابنِ خطاب' اور ابوجہل تھے' جو قبل از اسلام ایک سطح پہ تھے۔ وہ کیا چیز تھی جس نے عمر کو فاروقِ اعظمؓ بنا دیا اور ابوجہل کفر کی موت مرا؟ یہ وہ چیز تھی جو نبوت کے پروگرام پر Fit (موزوں) بیٹھتی تھی۔ عمر اس میں سے گزرا تھا' ابوجہل اس میں سے نہیں گزرا تھا۔ جب تک کوئی اس پروگرام میں سے نہیں گزرتا تو ابنِ خطاب' فاروقِ اعظمؓ نہیں بن سکتا۔ ہم ہیں کہ ہمارے ہاں اس پروگرام کا نام ہی نہیں۔ اور جن مناصب کے لیے ایم اے کی ڈگریاں چاہئیں ان کے لیے

---

[1] ابوجہل کا اصل نام ''عمر بن ہشام بن مغیرہ'' تھا۔

درخواستیں بھیجتے چلے جا رہے ہیں یوں کہیے کہ درخواستیں ہی نہیں بھیجتے بلکہ آپس میں لڑ رہے ہیں' جھگڑ رہے ہیں' دھکم پیل ہو رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا وہ ڈگری تمہارے ہاتھ میں ہے؟ جو تمہیں اس کا اہل بناتی ہے۔ یہ جو آنے والے ہوتے ہیں' حقیقت میں جوہرِ انسانیت ان کے اندر پہلے سے ہوتے ہیں۔ یونہی ہر ایک ہی اس کے اندر نہیں آ جاتا۔ چاہنے والا بھی اچھا چاہیے [1]۔'' یہ شرطِ اولین ہوتی ہے۔

قرآنی اقدار انسانی جوہروں کو جلا بخش دیتی ہیں' انہیں بڑا بنا دیتی ہیں

حضرتِ عمرؓ (581-644/45AD) سے کسی نے یہ کہا تھا کہ اسلام میں آ کر تم کتنے بڑے آدمی ہو گئے ہو۔ کہنے لگے کہ ہم اسلام سے پہلے بھی بڑے تھے لیکن معیار ذرا مختلف تھا۔ بس اِدھر آنے کے بعد اقدار بدلتی ہیں' جوہر تو اندر موجود ہوتا ہے۔ موجود ہی تھا کہ نبی اکرم دعا مانگ کر لے رہے ہیں اور پھر کس طرح یہ اس دعا کے معیار کے اوپر پورے اترے! کہا کہ **هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُونَ وَ زُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا** (33:11) یہ ہیں تصادمات' تزاحمات جن میں سے مومن گزرتے ہیں۔ یہ ہیں زلزلہ انگیز صعوبتیں جن کو وہ برداشت کرتے ہیں۔ وہ اس امتحان میں پورے اترتے ہیں تو پھر وہ فتح ہوتی ہے کہ یہاں کے بھی دروازے کھلتے ہیں اور وہاں کے بھی دروازے کھلتے ہیں۔ اگر یہ صورت نہیں ہے تو نہ یہاں کا دروازہ کھلتا ہے' نہ وہاں کا دروازہ کھلتا ہے' اس لیے کہا کہ **وَ اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا** (33:12)۔ منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں کھوٹ تھا' اعلانیہ کہنے لگ گئے کہ اللہ اور اس کے رسول نے جو وعدے ہم سے کیے تھے' وہ سب دھوکا تھا اور وہاں (2:214) میں یہ تھا کہ انہوں نے صرف یہ کہا تھا کہ مولا کریم! وہ مدد جس کا وعدہ کیا ہوا ہے' ہمیں یقین تو ہے کہ وہ آئے گی لیکن وہ کب آئے گی۔ اور یہاں (33:12) یہ منافق تھے جن کے دلوں میں روگ تھا' یہ کہہ رہے تھے۔

انسان کی اپنی نفسیات ہی اس کا اپنا معیار متعین کرتی ہیں

آپ نے دیکھا کہ قرآن کیسے یہ Psychological Point (نفسیاتی نکتہ) سامنے لاتا ہے۔ چودہ سو سال کے بعد آج پہلی دفعہ سائیکولوجی کا ایک علم آیا جس نے کہا ہے کہ یہ انسان کے اندر کی نفسیاتی کیفیت ہے جو اس کی باہر کی زندگی کو متعین کرتی ہے۔ قرآن اسے **فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ** (2:10) کہتا ہے۔ ان کو سائیکولوجیکل کیس کہتے ہیں' آج یہ سائیکولوجی والے ان کو بیمار کہتے ہیں۔ قرآن چودہ سو سال پہلے یہ مرض بتا رہا ہے کہ ان کی کیفیت یہ تھی۔ ان کے اوپر یہ جھٹکا آیا ہے تو ان کو زیادہ سے زیادہ یہ ہوا کہ وہ وقت کب آئے گا جب تیری مدد آئے گی' اس پر شبہ نہیں گزرا۔ اور دوسری طرف یہ وہ منافق تھے۔ انہوں نے کہا کہ **وَعَدَنَا اللّٰهُ**

---

[1] غافل' ان مہ طلعتوں کے واسطے۔ چاہنے والا بھی اچھا چاہیے۔ (مرزا اسداللہ خان غالب)

وَ رَسُوْلُہٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا (33:12) وہ ہمارے ساتھ جو کچھ یہ کیا جا رہا تھا' جو وعدے دیئے جا رہے تھے' وہ سب فریب ہی فریب تھا' ہمیں دھوکے میں رکھا۔ اس کے برعکس' مومنین نے یہ نہیں کہا تھا۔ اس کے فوراً ہی بعد یہ کہا کہ انہی کے اندر یہ لوگ تھے' جو مجاہدین میں وسوسہ انگیزیاں پھیلا رہے تھے۔ وَ اِذْ قَالَتْ طَّآئِفَۃٌ مِّنْھُمْ یٰٓاَھْلَ یَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَکُمْ فَارْجِعُوْا (33:13) ۔ یہاں ''یثرب'' کا لفظ قرآن میں مدینے کے لیے آیا ہے' اسلام سے پہلے اس کا یہی نام تھا۔ ''ان میں سے ایک گروہ تو یہاں تک کہنے لگ گیا کہ اے اہلِ یثرب! تم یہاں ٹھہر نہیں سکو گے' یہ اندر وسوسہ انگیزیاں پھیلا رہے ہیں۔ تم دشمن کے حملے کی تاب نہیں لا سکو گے اس لیے تم فوراً لوٹ چلو۔ تمہارے لیے یہاں مقام نہیں' ٹھہرنے کی جگہ ہی کوئی نہیں ہے''۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک سب سے خطرناک شے وسوسہ اندازی ہوتی ہے

میں نے عرض کیا ہے کہ سارا قرآن ختم کرنے کے بعد آخری سورۃ کے آخری الفاظ میں کہا کہ یہ سب ٹھیک ہے اس کے اوپر تم کاربند ہو گے تو یہ نتائج برآمد ہونگے لیکن ہم تمہیں ایک چیز سے محتاط کرنا چاہتے ہیں کہ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۔ مَلِکِ النَّاسِ ۔ اِلٰہِ النَّاسِ (114:1-2-3)۔ اے رسول! کہہ دیجیے کہ ہمیں اس خدا کے قانون سے اور زیادہ قریب ہو جانا چاہیے جس کے پیش نظر (کوئی خاص گروہ' قبیلہ' جماعت یا قوم کی نہیں بلکہ) پوری کی پوری انسانیت کی نشو و نما ہے۔ وہ رب الناس ہے یعنی اس خدا کے قانون سے قریب تر جس کے سوا' کسی کو حق حاصل نہیں کہ انسانوں سے اپنی اطاعت کرائے۔ ساری کائنات میں غلبہ و اقتدار اسی کا ہے اور اس کے قوانین کی محکومیت انسان کو اختیار کرنی چاہیے۔ وہ مالک الناس ہے اور وہی ہے جس کا قانونِ حفاظت تمام نوعِ انسانی کو پناہ دے سکتا ہے۔ اسی سے انسانیت تمام خطرات سے محفوظ رہ سکتی ہے۔ وہ الہ الناس ہے۔ اتنا کچھ کہہ کر خدا نے کہا کہ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ۔ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۔ مِنَ الْجِنَّۃِ وَالنَّاسِ (114:4-5) یہ جو وسوسہ اندازی کرنے والے ہیں یعنی چپکے ہی چپکے کان میں کچھ پھونک کر پیچھے لوٹ جانے والے ہیں' کہا کہ بس ان سے بچنا۔ یہ لوگوں کے دلوں میں وساوس پیدا کر کے ان کے عزمِ راسخ کو کمزور کر دیتے ہیں۔ یہ سب سے خطرناک حربہ ہوتا ہے' پتہ ہی نہیں چلتا کہ یہ چنگاری پھوٹی کہاں سے تھی اور آگ شام تک سارے شہر میں لگ جاتی ہے۔ اندازہ لگائیے کہ پورے قرآن کے بعد آخری چیز یہ کہی ہے کہ اس سے احتیاط برتنا۔

جنگ کے دوران بعض لوگوں کا کردار جن سے محتاط رہنے کے لیے وحی نازل ہوئی

یہ وسوسہ اندازی وہاں انہوں نے شروع کی۔ کہا کہ وَ یَسْتَاْذِنُ فَرِیْقٌ مِّنْھُمُ النَّبِیَّ یَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُیُوْتَنَا عَوْرَۃٌ (33:13) اور بعض تو ایسے آ گئے جنہوں نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ ہمیں میدانِ جنگ سے واپس جانے کی اجازت دیدیجیے۔ کہنے

لگے کہ ہمارے گھر کے اندر ایسے مرد نہیں جو ان کی حفاظت کر سکیں۔ ہمارے گھر کھلے پڑے ہیں اس لیے ہم جانا چاہتے ہیں۔قرآن کہتا ہے کہ وَ مَا هِيَ بِعَوْرَةٍ (33:13) یہ بالکل غلط کہتے ہیں' وہاں یہ صورت نہیں ہے' فی الحقیقت ان کے گھر غیر محفوظ نہیں تھے۔ اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ یا یہ جو لشکر والے مومنین تھے' جو جنگ لڑ رہے تھے' انہوں نے یہ تو نہیں کیا تھا کہ پیچھے جو گھر ہیں' وہ ان کو کھلے چھوڑ دیں' غیر محفوظ چھوڑ دیں کہ دشمن آئیں تو لوٹ کرلے جائیں۔کہا کہ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا (33:13) یہ اس بہانہ سازی سے میدانِ جنگ سے بھاگ جانا چاہتے ہیں۔عزیزانِ من! جنگ سے فرار نہ کرنے کے لیے قرآنِ کریم نے تاکید کی ہے۔بدر کے میدان میں وہ 312 یا 313' جو کہا جاتا ہے وہ تمام کے تمام وہ ہیں جنہوں نے اپنی جانیں بیچ دی ہوئی ہیں' جنہیں قرآن مومنِ حقہ کہہ رہا ہے۔وہ صف آرا ہو چکے ہوئے ہیں۔قرآن کی رو سے عین اُس وقت یہ وحی نازل ہوتی ہے۔قرآن نے کہا ہے کہ اس وقت ہم نے ان سے کہا تھا کہ ایک بات سن لو کہ آج کے دن تم میں سے کوئی شخص میدانِ جنگ سے پیٹھ دکھا کر بھاگ جائے گا تو سنو! جونہی وہ پیچھے لوٹا' وہ سیدھا جہنم میں جا گرے گا۔

جنگ بدر میں نبی اکرم ﷺ کی زبان مبارک سے رقت انگیز دعا

صحابۂ کبارؓ کی جماعت کھڑی ہے۔اس جماعت کے قابلِ اعتماد ہونے کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے صفیں سیدھی کر کے ایک طرف نکل کے دعا مانگی تھی۔وہ تاریخ میں محفوظ ہے' ہماری تاریخ میں بڑے قیمتی جوہر بھی ہیں۔نہایت عجز اور محویت کے عالم میں حضور ﷺ نے ایسے دعا مانگی تھی کہ حضور ﷺ کی چادر شانوں سے گرتی چلی جا رہی تھی۔دعا یہ تھی کہ یا اللہ! اس آسمان کے نیچے جتنے ایسے لوگ ہیں جو تیرے نام پہ جانیں دینے کے لیے آئے ہوئے ہیں' میں نے انہیں اکٹھا کر کے اس میدان میں لا کھڑا کیا ہے۔اس کے بعد کوئی اور باقی نہیں ہے۔دعا یہ تھی کہ یا اللہ! اگر آج یہ لوگ یہاں ختم ہو گئے' انہیں شکست ہو گئی تو یہ تو ختم ہو جائیں گے' ہمارا کیا بگڑے گا۔عزیزانِ من! یہ دعا ہے کہ یا اللہ! تُو نے نبوت مجھ پہ ختم کی ہے' یہ اگر ختم ہو گئے تو قیامت تک تیرا نام لینے والا دنیا میں کوئی نہیں رہے گا۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر وہ جماعت نہ رہتی تو عزیزانِ من! ہمارا تو نام بھی آج عبد اللہ کبھی نہ ہوتا' ہم تو رام داس ہی ہوتے۔یہ جماعت کھڑی ہے اور اس وقت وحی آ رہی ہے کہ یاد رکھو! تم میں سے آج اگر کوئی شخص میدانِ جنگ سے پیٹھ دکھا کر بھاگ جائے گا تو جونہی بھاگا' وہ سیدھا جہنم میں جا گرے گا۔یہ تھا فرار۔

شفاعت کے معنی سفارش کرنا نہیں بلکہ کسی کے ساتھ کھڑے ہونے کے ہیں

شفاعت کے معنی ہیں ''کسی کے ساتھ کھڑے ہو جانا'' سفارش کرنا نہیں ہیں' سفارش کرنے تو ہمارے ساتھ نہیں کھڑے

ہونگے۔ یہ ہیں وہ لوگ جو وَ لَوۡ دُخِلَتۡ عَلَیۡہِمۡ مِّنۡ اَقۡطَارِہَا ثُمَّ سُئِلُوا الۡفِتۡنَۃَ لَاٰتَوۡہَا وَ مَا تَلَبَّثُوۡا بِہَاۤ اِلَّا یَسِیۡرًا (33:14) تم سے تو اجازت مانگ رہے ہیں کہ ہمارے گھر خالی پڑے ہوئے ہیں اور کیفیت یہ ہے کہ اگر تمہارے خلاف کوئی لشکر اٹھ آئے اور ان کو موقع ملے تو ان کے ساتھ جا ملیں اور تمہارے خلاف اس سے بھی زیادہ شدت سے جنگ کریں۔ یہ ہے ان کی کیفیت۔ عزیزانِ من! ان میں کچھ یہ لوگ بھی شامل تھے۔اس جماعت کے سامنے کچھ کم صبر آزما مراحل نہیں تھے۔ وہ کھلا ہوا دشمن قریش یا یہ جو احزاب آئے تھے وہی نہیں تھے بلکہ یہ بھی دشمن تھے۔ اعراب میں بھی ایسے تھے اور مدینے کے اندر یہ یہودی تھے۔ انہوں نے تو پہلے دن سے یہ کچھ ہمارے خلاف کیا۔ان کو مدینے سے نکالنا پڑا اور خیبر بھیجنا پڑا۔ وہاں بھی یہ باز نہیں آئے۔ پھر ان لوگوں کو جزیرۃ العرب سے ہی نکالنا پڑا۔ یہ اس قسم کے خبیث انسان تھے۔ پہلے دن سے اسلام کے بدترین دشمن تھے۔ان کی منافقت شدت سے ان کے اندر داخل ہوگئی ہوئی تھی۔ کہا ہے کہ وَ لَقَدۡ کَانُوۡا عَاہَدُوا اللّٰہَ مِنۡ قَبۡلُ لَا یُوَلُّوۡنَ الۡاَدۡبَارَ (33:15) یہ وہ ہیں کہ انہوں نے تمہارے ساتھ معاہدہ کیا تھا کہ ہم میدانِ جنگ میں تمہارے ساتھ جائیں گے اور ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ وَ کَانَ عَہۡدُ اللّٰہِ مَسۡئُوۡلًا (33:15) یہ تمہارے ساتھ وعدہ نہیں تھا' انہوں نے تو ہمارے ساتھ وعدہ یہ کیا تھا ہم تو پوچھیں گے کہ اس معاہدے کا کیا ہوا؟ خدا کا پوچھنا تو آپ جانتے ہیں کہ پھر کیا ہوتا ہے۔

کوئی شخص بھی موت سے بچنے کی یقین دہانی نہیں کرا سکتا

کہا ہے کہ قُلۡ لَّنۡ یَّنۡفَعَکُمُ الۡفِرَارُ اِنۡ فَرَرۡتُمۡ مِّنَ الۡمَوۡتِ اَوِ الۡقَتۡلِ (33:16) ہم نے اپنے رسول سے کہہ دیا تھا کہ ان پر اس حقیقت کو واضح کردو کہ یہاں سے تو تم بھاگ سکتے ہو۔ مگر یہ بھاگنا تمہیں کچھ فائدہ نہیں دے گا۔ تم موت سے ڈر کر یہاں سے بھاگتے ہو تو بتاؤ تم یہ یقین دہانی کرا سکتے ہو کہ تم کو کبھی موت نہیں آئے گی یا تم کبھی کسی اور جگہ قتل نہیں کیے جاؤ گے۔ کیا یہ ہے یقین تمہارا؟ وَ اِذًا لَّا تُمَتَّعُوۡنَ اِلَّا قَلِیۡلًا (33:16) یہاں سے بھاگ جاؤ گے' جو کچھ مفاد ان سے مل کر حاصل کرنا چاہو گے وہ تو سارا چند دنوں کی بات ہے۔ ان حالات میں ان سے یہ کہا جا رہا ہے کہ وہ چند دنوں کی بات ہے۔ تم نے ہمیشہ کے لیے تو جینا نہیں ہے اس لیے کہا کہ قُلۡ مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَعۡصِمُکُمۡ مِّنَ اللّٰہِ اِنۡ اَرَادَ بِکُمۡ سُوۡٓءًا اَوۡ اَرَادَ بِکُمۡ رَحۡمَۃً ؕ وَ لَا یَجِدُوۡنَ لَہُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ وَلِیًّا وَّ لَا نَصِیۡرًا (33:17-18) انہیں بتا دو کہ وہ نظامِ خداوندی قائم ہونے والا ہے جس کی کیفیت یہ ہوگی کہ جو اس کا ساتھ دینے والا ہے اسے ہی یہ خوشحالیاں اور فارغ البالیاں نصیب ہونگی۔ جس نے اس کی مخالفت کی ہوئی ہے اس کے حصے میں ذلت اور پستی آئے گی۔ اور وہ پھر دیکھے گا کہ اس نظام کے سوا دنیا میں ان کو کوئی پناہ دینے والا نہیں ہے۔

منافقت کی زندگی کا ایک ایک لمحہ بڑا پریشان کن ہوتا ہے

جہاں اللہ کسی شے کو صرف اپنی طرف نسبت کرتا ہے کہ اللہ کے سوا تمہیں کہیں حفاظت نہیں ملے گی' اللہ یہ دے گا تو قرآنِ کریم میں دیگر مقامات پہ یہ واضح ہے کہ یہ وہ نظامِ خداوندی ہے جو سب سے پہلے نبی اکرم ﷺ کے ہاتھوں متشکل ہوا تھا' یہ چیزیں وہ کرتا ہے۔ کہا کہ **قَدۡ یَعۡلَمُ اللّٰهُ الۡمُعَوِّقِیۡنَ مِنۡکُمۡ وَ الۡقَآئِلِیۡنَ لِاِخۡوَانِهِمۡ هَلُمَّ اِلَیۡنَا ۚ وَ لَا یَاۡتُوۡنَ الۡبَاۡسَ اِلَّا قَلِیۡلًا** (33:18) ہم نے یہ بھی کہا تھا کہ ان سے کہہ دو کہ خدا تم میں سے ان لوگوں کو اچھی طرح جانتا ہے جو خود ہی بھاگنا نہیں چاہتے بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی بھاگنے کو کہتے ہیں۔ ان کو روکتے ہیں کہ ان کا ساتھ نہ دینا ورنہ مارے جاؤ گے۔ یہ ان کی کیفیت ہے۔ کہا کہ **اَشِحَّةً عَلَیۡکُمۡ فَاِذَا جَآءَ الۡخَوۡفُ رَاَیۡتَهُمۡ یَنۡظُرُوۡنَ اِلَیۡکَ تَدُوۡرُ اَعۡیُنُهُمۡ کَالَّذِیۡ یُغۡشٰی عَلَیۡهِ مِنَ الۡمَوۡتِ** (33:19) ان کی کیفیت یہ ہے کہ جب ان کو کوئی خطرے کا سامنا ہوتا ہے تو یوں تمہاری طرف دیکھتے ہیں جیسے موت سامنے آ گئی ہے اور ان پہ کپکپی چھا گئی ہے۔ **فَاِذَا ذَهَبَ الۡخَوۡفُ سَلَقُوۡکُمۡ بِاَلۡسِنَةٍ حِدَادٍ اَشِحَّةً عَلَی الۡخَیۡرِ ؕ** (33:19) جب وہ خوف نہیں رہتا تو منافقت کی یہ کیفیت ہے کہ تمہارے ہاں آ کر تمہارے ہاں کے یہ جو ساتھی تھے' ان کے خلاف شکایتیں لگاتے ہیں کہ صاحب! یہ بھاگ گیا تھا' یہ کچھ یہ کہتا تھا۔ کہتا ہے کہ ان کو شرم نہیں آتی۔ منافق تو کرتا ہی یہ ہے کہ نہیں صاحب! میں تو بالکل پکے پاؤں کھڑا ہوا تھا۔ آپ کو ان کا پتہ نہیں ہے کہ یہ جو اس وقت آپ کے ساتھی بنے پھرتے ہیں' یہ تھے جو یہ سب کچھ کرتے تھے۔ کہا کہ یہ اُس وقت یہ کچھ کہیں گے۔ **اُولٰٓئِکَ لَمۡ یُؤۡمِنُوۡا فَاَحۡبَطَ اللّٰهُ اَعۡمَالَهُمۡ ؕ وَ کَانَ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیۡرًا** (33:19) ٹھیک ہے ان میں سے یہودیوں کو تو چھوڑ دیجیے لیکن اور جو قبائل وغیرہ والے تھے' ان کے متعلق تو یہ چیز تھی کہ یہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہوئے ہیں لیکن درحقیقت ایمان لائے نہیں ہیں۔

اسلام کی شان و شوکت کو دیکھ کر ایمان لانے والوں کے متعلق قرآنِ حکیم کا ارشاد

آگے ایک سورۃ آتی ہے' وہ سورۃ الحجرات ہے' اس میں کہا گیا ہے کہ یہ جو بادہ نشین یا صحرانشین بدو تھے' جن کو اعراب کہا جاتا ہے' وہ اسلام کی شوکت اور اس مملکت کی حشمت کو دیکھ کر آ گئے تھے' ان کے زمرے میں تو داخل ہو گئے لیکن قرآن نے ان سے کہا ہے کہ ان سے کہو کہ یہ اپنے آپ کو مومن نہ کہا کریں۔ عزیزانِ من! سوچیے۔ کہا کہ ابھی مومن نہ کہا کریں۔ کہا یہ کریں کہ ہم نے اس مملکت کی شان و شوکت کو دیکھا اور ہم نے اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا۔ **وَلَمَّا یَدۡخُلِ الۡاِیۡمَانُ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ** (49:14) ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں ابھی نہیں اترا۔ مومن تو اس رجسٹر میں نام لکھ لینے سے بھی نہیں ہو جاتا۔ کہا ہے کہ **وَلَمَّا یَدۡخُلِ الۡاِیۡمَانُ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ** (49:14)۔ تمہارے دلوں کی گہرائیوں میں ابھی ایمان نہیں اترا۔ یہ تو اتنی کٹھالیوں میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ انہوں نے تو پھر

بھی بہر حال کچھ شان وشوکت دیکھ کر اس میں اپنا نام لکھایا تھا۔ ہم تو ان میں بھی شامل نہیں ہیں چہ جائیکہ اگلا درجہ ہمیں نصیب ہو جائے۔ ہم تو Entrance (داخلے) کا امتحان بھی پاس نہیں کر سکے۔ وہ دسویں کے امتحان کو پہلے Entrance (داخلہ) کہتے تھے۔ وہ اصل میں تعلیم گاہ میں داخلے کے لیے Entrance ہوتا تھا' تعلیم اس کے بعد شروع ہوتی تھی۔ انہوں نے کہا ہے کہ یہ تو ابھی Entrance میں آئے ہیں۔ ان سے کہو کہ اپنے آپ کو مومن نہ کہا کریں کیونکہ **وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ** - ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں ابھی نہیں اترا۔ ان کے متعلق کہا ہے کہ **لَمْ يُؤْمِنُوْا فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ** (33:19) یہ ایمان نہیں لائے تھے اسی لیے ان کا جتنا کچھ کیا کرایا تھا وہ بھی رائیگاں گیا۔

میدانِ جنگ سے بھاگنے والوں کو نمازوں کا ثواب نہیں ملا کرتا ہے

عزیزانِ من! اس کیے کرائے کے رائیگاں جانے کے متعلق کہا یہ جائے گا کہ **وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا**(33:19) قانونِ خداوندی کے لیے ایسا کر دینا کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ بھئی! جو کچھ کیا کرایا ہے وہ رائیگاں کیوں گیا؟ کہا کہ سیدھی سی بات ہے کہ Compulsory Subject (لازمی مضمون) میں جو لڑکا فیل ہو جاتا ہے تو Optional Subject (اختیاری مضمون) کے نمبر اسے کچھ فائدہ ہی نہیں دیتے۔ اب یہ تو یوں ہے کہ میدانِ جنگ سے بھاگا ہوا اپنی نمازوں کا ثواب مانگ رہا ہے۔ عزیزانِ من! یہ میں نے کچھ غلط کہہ دیا ہے کیونکہ نمازوں والا تو میدانِ جنگ میں جاتا ہی نہیں ہے ''ایہہ کہندے نیں جی اسی تے نہیں نٹھدے میدان اچوں' کدی وی نہیں نٹھے' اج تک نہیں نٹھے ❶''۔ قرآن کہہ یہ رہا تھا کہ **وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا** (33:19)۔ یہ جو کچھ کیا کرایا ہے وہ ایسے رائیگاں جایا کرتا ہے کہ وہ قوم جذباتی ہوا کرتی ہے' وہ جذباتی قوم کچھ کم کام نہیں کرتی' یہ مذہب پرست قوم بھی کچھ کم مشقتیں نہیں اٹھاتی' جون جولائی کے مہینے بھر کے روزے کو دیکھ لو' جو مزدور رکھتے ہیں' حج کو دیکھ لیجیے کہ کتنا کچھ کرتے ہیں' اس سردی کے زمانے میں علی الصبح وہ جو ٹھنڈے پانی سے وضو کر کے ٹھٹھرتے ہوئے مسجدوں میں جا کر نمازیں پڑھتے ہیں تو یہ کچھ کم مشقتیں نہیں ہیں۔ فرق تو اتنا ہی ہے کہ یہ جتنی چیزیں ہیں' وہ بس

رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالیؓ نہ رہی

وہ یہ کچھ بطور رسوم ادا کرتے ہیں' مقاصد حیات نظر انداز کر دیتے ہیں۔

---

❶ یہ کہتے ہیں کہ جی! ہم تو میدان سے نہیں بھاگے' کبھی نہیں بھاگے' آج تک نہیں بھاگے۔

اعتراض کسی کی نماز پر نہیں' افسوس تو صلوٰۃ کی روح کے فقدان کا ہے

یہ چیزیں نماز، روزہ، حج تو ٹھیک ہیں ایسی ہی ہونگی' ان کا قائم رکھنا بھی ضروری ہے لیکن ان کے اندر وہ روح نہیں رہی ہے۔ اس لیے یہ کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ اعمال یوں رائیگاں جاتے ہیں۔ مثلاً پندرہ بیس لاکھ ہر سال عرفات کے میدان میں جمع ہو کر اسرائیل کی چڑیا جتنی مملکت کے خلاف جو کچھ وہ دعائیں کرتے ہیں اگر ان کے اندر کہیں وہ روح بیدار ہو جائے تو پندرہ بیس لاکھ کی ضرورت ہی کیا ہے وہ تو پندرہ بیس ہی کافی ہوتے ہیں۔ کہا کہ ان کی یہ کیفیت ہے کہ **يَحۡسَبُوۡنَ الۡاَحۡزَابَ لَمۡ يَذۡهَبُوۡا ۚ وَ اِنۡ يَّاۡتِ الۡاَحۡزَابُ يَوَدُّوۡا لَوۡ اَنَّهُمۡ بَادُوۡنَ فِى الۡاَعۡرَابِ يَسۡاَلُوۡنَ عَنۡ اَنۡۢبَآئِكُمۡ و لَوۡ كَانُوۡا فِيۡكُمۡ مَّا قٰتَلُوۡۤا اِلَّا قَلِيۡلًا** (33:20) باہر صحرا نشینوں سے پوچھتے پھرتے ہیں کہ سناؤ یار! وہ مسلمانوں کی جو فوج تھی اس کا کیا ہوا' شکست کھا گئی یا فتح ہوئی ہے؟ شکست کھا گئی تو وہ کہتے تھے کہ دیکھا! ہم نے پہلے ہی کہا تھا کہ نہ جانا ورنہ مارے جاؤ گے۔ فتح ہوتی ہے تو ان سے آ کر کہتے ہیں کہ صاحب! ہم ہی تو تھے جوان لوگوں کو باہر سے ریکروٹ کر کے تمہاری مدد کرنے کے لیے بھیجتے تھے۔ قرآن نے کہا ہے کہ یہ **اَشِحَّةً عَلَى الۡخَيۡرِ** (33:19) مالِ غنیمت میں حصہ بٹانے کے لیے تو آگے آگے آئیں گے اور اگر کہا جائے گا کہ گئے کیوں نہیں تھے تو کہیں گے کہ ہم ریکروٹنگ آفیسر تھے' ان کو بھیج رہے تھے۔

روشنی کے مینار کی طرح ایک شخصیتؐ میدان جنگ میں پہاڑ کی طرح اپنے مقام پر کھڑی تھی

اس معرکے میں جہاں قرآن نے کہا ہے کہ اس قدر زلزلہ انگیز قیامت خیز یہ تصادم تھا کہ اس زلزلے کے اندر بنیادیں تک ہل گئیں' بعض کے دلوں کے اندر اس قسم کے خیالات بھی آ گئے۔ مومن جو سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح کھڑے ہوئے تھے ان میں بھی یہ چیز آئی کہ وہ پکار اٹھے کہ **مَتٰى نَصۡرُ اللّٰهِ** (2:214) ۔ بارِالٰہا! ہماری کوششوں کی بار آوری کا وقت کب آئے گا؟ اور تاریخ کہتی ہے کہ اس تمام ہجوم کے اندر ایک شخصیت ایسی تھی جو روشنی کے مینار کی طرح کھڑی تھی کہ یہ تلاطم خیزیاں آئیں اور اپنا سر ٹکرا کر واپس چلی جائیں۔ اور یہ شخصیت محمد رسول اللہ ﷺ تھے۔ مؤرخ لکھتا ہے کہ وہ ایک ذات تھی جو ایک سیکنڈ کے لیے بھی اپنے مقام سے اِدھر اُدھر نہیں ہوئی' وہ حوصلے بڑھائے چلے جارہی تھی۔ نبی یہ ہوتا ہے' امام اس کو کہتے ہیں۔ میدانِ جنگ میں بھی یہ کیفیت تھی۔ عزیزانِ من! قرآن نے اس مقام پہ کہا ہے کہ **لَقَدۡ كَانَ لَـكُمۡ فِىۡ رَسُوۡلِ اللّٰهِ اُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ** (33:21) رسول ﷺ نے جو روش اختیار کی تھی وہ تمہارے لیے اسوۂ حسنہ ہے۔ وہ تھا تمہارے لیے حسین ترین نمونہ۔ رسول کو ایسے مقام کے لیے حسین ترین! **اُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ** توازن بدوش نمونہ بننا ہے۔ کہا کہ **لِّمَنۡ كَانَ يَرۡجُوا اللّٰهَ وَ الۡيَوۡمَ الۡاٰخِرَ وَ ذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيۡرًا** (33:21) لیکن انہی کے لیے یہ نمونہ

بن سکتا ہے جن کو مکافاتِ عمل پر یقین ہو' جنہیں مستقبل کی زندگی پر ایمان ہو' جنہیں معلوم ہو کہ خدا کے ہاں جا کر ایک ایک چیز کا جواب دینا ہے۔اور وہ اس لیے خدا کے قانون کو زیادہ سے زیادہ اپنے سامنے رکھیں۔ان کے لیے رسول کی یہ روش اسوۂ حسنہ تھی' بہترین نمونہ تھی۔اسے دیکھنا چاہیے تھا۔

نبی اکرمؐ کی ساری زندگی نوع انسانی کے لیے اسوۂ حسنہ ہے

میں اس مقام پہ اتنا عرض کردوں کہ یہ آیہ مبارکہ سورۃ الاحزاب کے اس ضمن میں آئی تو اس مقام پہ ہے' جہاں رسول اللہ ﷺ نے مجاہدین کے لیے بھی اس طرح کا نمونہ پیش کیا تھا' لیکن یہ جو رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ اُسوہ بنتی ہے' نمونہ بنتی ہے' میرا یہ ایمان ہے کہ یہ صرف اسی موقعہ کی بات نہیں ہے بلکہ نبی اکرم ﷺ کی ساری زندگی ہمارے لیے' قیامت تک کے لیے' بہترین نمونہ ہے۔وہی ہے قالب جس کے اندر ہمارے ایمان جائیں تو مومن بن کر نکلتے ہیں۔حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ ہمارے لیے ہی نہیں بلکہ نوعِ انسانی کے لیے' پوری کی پوری انسانیت کے لیے' اسوۂ حسنہ ہے۔عزیزانِ من! وہی صحیح پیٹرن (قالب) ہے۔زمانے کے ریگِ رواں پہ وہی نقوشِ قدم ہیں جو ستاروں کی طرح جھلملاتے تابندہ چلے جاتے ہیں اور کاروانِ انسانیت کو ان کی صحیح منزل کے لیے نشاندہی کرتے ہیں۔اگر نبی اکرم ﷺ کے یہ نقوشِ قدم زمانے کے کارواں پہ نہ رہیں تو راستے کی تلاش میں گم شدہ' انسانوں کو نشان نہ ملے۔صرف نظری تعلیم راہنمائی نہیں کرتی بلکہ نقوشِ قدم ہوتے ہیں جو راہنمائی کرتے ہیں۔

انسانی رہنمائی کے لیے نظری تعلیم ہی کافی نہیں ہوتی نقوشِ قدم بھی انسان کو متاثر کرتے ہیں

یہ نقوشِ قدم ہم کہاں ڈھونڈیں' کہاں تلاش کریں؟ کہا یہ جائے گا کہ بالآخر ہمارے پاس تاریخ ہی تو ہے' اس میں سے یہ نکلے گا۔سیرت پہ جو کتابیں لکھی گئیں وہ سینکڑوں ہزاروں ہیں۔تیرہ صدیوں میں دیکھیں تو شاید لاکھوں کی تعداد میں پہنچ جائیں۔تو یہ اس تاریخ میں سے لکھی گئی ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ اس تاریخ میں جو کچھ بھی رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کیا گیا ہے' کیا وہ صحیح اسوۂ حسنہ ہے؟ تاریخ انسانوں کی لکھی ہوئی ہے۔وہ بھی جو پہلی مستند تاریخ ہے' رسول اللہ ﷺ کے اڑھائی سو سال بعد لکھی ہوئی ہے۔اس سے پہلے کوئی Written Material (تحریری مواد) نہیں ہے' صرف زبانی روایات ہیں۔پہلی تاریخ طبری لکھتا ہے۔ابنِ ہشام اور اسحاق کی دو ایک پہلے بھی ہیں۔

اڑھائی سو سال کے بعد اسوۂ حسنہ پر لکھی گئی کتب کی علمی نوعیت

وہ کتب اس قابل بھی نہیں ہیں کہ انہیں اٹھا کر پڑھا بھی جائے۔جتنے بھی مخالفین اور مستشرقین اعتراض کرنے والے ہیں' وہ اسی

تاریخ سے تو رسول اللہ ﷺ کے خلاف وہ سارے اعتراضات لاتے ہیں۔ اگر ہم سند تاریخ کو ہی قرار دیدیں تو اس میں تو کعب بن اشرف کا آپ ﷺ کی طرف سے جھوٹ بولنے کا قصہ بھی ہے۔ مخالفین کو تو چھوڑ یئے' جو اپنے ہیں وہ بھی رسول اللہ ﷺ کی سیرت میں اسی طرح کی چیزیں لکھتے ہیں۔

اسوۂ حسنہ کے سلسلہ میں کعب بن اشرف کا قصہ: آپ ﷺ کی طرف سے جھوٹ بولنے کی اجازت (معاذ اللہ)

وہ بھی یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا دشمن کعب بن اشرف تھا۔ رسول اللہ ﷺ (معاذ اللہ) اس سے بہت تنگ آئے تھے۔ لکھا گیا ہے کہ آپؐ نے کہا کہ کوئی اسے جا کر قتل کر دے۔ صحابہؓ میں سے دو شخص تیار ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ جی! اگر ہم سیدھے سادے اس کی طرف جاتے ہیں تو اُس کا قتل تو مشکل ہے' وہ قابو نہیں آئے گا۔ اس کے لیے اگر کوئی جھوٹ بولنا پڑے تو بول دیا جائے۔ (معاذ اللہ) رسول اللہ ﷺ نے اجازت دی کہ جھوٹ بول دیا جائے۔ یہ عام تاریخ میں نہیں ہے بلکہ بخاری کی روایت ہے۔ آپ ﷺ قیامت تک پوری نوعِ انسانی کے لیے اسوۂ حسنہ ہیں اور یہ روایات آپؐ کا یہ اسوہ پیش کر رہی ہیں کہ (معاذ اللہ) آپؐ نے جھوٹ کی اجازت دی۔ ہمارے دور میں دین کی اقامت کو پیش کرنے والوں میں جو سب سے بڑے تھے انہوں نے اپنے ہاں سیرتِ رسول اللہ ﷺ کے تحت اس کو نقل کیا ہے۔ اور کہا یہ ہے کہ راست بازی اور صداقت شعاری بیشک اسلام کے اچھے اصولوں میں سے ہیں لیکن زندگی کی بعض ضرورتوں کے لیے جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے۔ اور اس کی سند میں یہ روایت لکھی ہے۔ کیا اس تاریخ کا اسوۂ حسنہ آپ کو دیدیں تو پھر آپ کہیں گے کہ اس تاریخ کے سوا تو کوئی اور ہمارے پاس سرچشمہ ہی نہیں ہے' ماخذ ہی نہیں ہے۔ تو پھر کیا کیا جائے؟

نبی اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ کے مسائل کو قرآن حکیم نے اپنے ہاں محفوظ کر رکھا ہے

عزیزانِ من! کیا وہ جائے جو قرآن نے کہا ہے۔ سیدھی بات ہے کہ جس نے اس کو اسوہ یا نمونہ قرار دیا ہے اسی کے کہے کو مانا جائے۔ میں ایک مثال دیا کرتا ہوں' اس کو دہرا دوں۔ یہ فائن آرٹ کی کلاس میں جو پینٹنگ کرتے ہیں تو ان کے سامنے پہلے ایک Sample یا نمونہ رکھا جاتا ہے اور ان سے کہا جاتا ہے کہ اس کے مطابق تصویریں بناؤ۔ وہ سامنے رکھا جاتا ہے' وہ نہ رکھا جائے تو اپنے اپنے تصور کے مطابق اسٹوڈنٹس وہ تصویریں بنائیں گے۔ اس متعین نمونے کا وہاں ہونا نہایت ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ جب کہتا ہے کہ تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں اسوۂ حسنہ تھا تو خدا کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ یہ اسوہ کا جو نمونہ ہے' وہ خود بنا کر دیتا کہ یہ ہیں رسول اور یہ ہے قیامت تک کے لیے نمونہ اور اس نمونے کے ہم محافظ ہیں۔ عزیزانِ من! رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ ﷺ کے نمایاں خدوخال جتنے ہیں وہ سارے قرآن کے اندر موجود ہیں۔ حضور ﷺ کی سیرت اور اسوۂ حسنہ متعین کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ قرآن کی

آیت کو اوپر سرِ فہرست رکھے اور اصول قرار دے۔ اور پھر اس تاریخ میں جائے' اس میں جو واقعات اس کے مطابق ہوں انہیں سمجھے کہ یہ سچے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کیے جا سکتے ہیں' جو اس کے خلاف ہوں تو کہہ دیا جائے کہ یہ تاریخ کی وضع کردہ چیزیں ہیں ہم ان کو مسترد کرتے ہیں۔

قرآنِ حکیم کی روشنی میں اسوۂ حسنہ پر پرویزؒ کی طرف سے لکھی گئی سیرت کی کتاب: معراج انسانیت

اسی تاریخ میں سے اس طرح سے چن کے جو آپ قرآن کے تابع سیرت متعین کریں گے وہ رسول اللہ ﷺ کا اسوۂ حسنہ ہوگا۔ اور یہی قابلِ تقلید ہوگا۔ معاف رکھیے گا اگر اس میں ''میں'' آ جائے۔ میں نے سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ کی سیرت اس اصول کے تابع مرتب کی۔ میری کتاب ہے ''معراجِ انسانیت''۔ سرِ فہرست عنوان کے اوپر قرآن کی آیت ہے' اس کے نیچے یہ تمام احادیث ہیں لیکن وہی ہیں جو قرآن کی اس آیت کے مطابق ہیں۔ اس سے پوری کی پوری سیرتِ طیبہ ﷺ مرتب ہوئی ہے۔ یہ پانچ سو صفحات کی کتاب ہے۔ اتنا کچھ ہے اس قرآن کے اندر۔ اور ضروری تھا کہ جو اسوہ قرار دیتا ہے' جو نمونہ قرار دیتا ہے اس کا فریضہ ہے کہ بتائے کہ یہ ہے وہ پیکر' اس کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالو۔ اور اس نے یہ کر دیا ہے۔ سیرتِ طیبہ ﷺ کا جو بنیادی ماخذ ہے وہ قرآن ہے اور جو اس کے مطابق باہر سے ملتا ہے اسے رسول ﷺ کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے' جو اس کے خلاف جاتا ہے' وہ وضعی ہے' مسترد ہے خواہ کسی کتاب کے اندر بھی کیوں نہ ہو۔ وہ کتاب جس کی حفاظت کا ذمہ خدا نے لیا ہے' وہ تو اللہ کی ہی کتاب ہے۔ یوں نبی اکرم ﷺ کا اسوۂ حسنہ قیامت تک کے لیے ہمارے پاس محفوظ ہے۔ قرآن کے ساتھ یہ دونوں چیزیں اکٹھی ہونگی تو پھر وہ صراطِ مستقیم ہمیں ملے گی جس پر چلنے سے ہم منزلِ انسانیت تک پہنچ سکیں گے۔

عزیزانِ من! سورۃ الاحزاب کی آیت 21 تک ہم آ گئے۔ 22 ویں آیت سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

❀❀............❀❀............❀❀

چوتھا باب: **الاحزاب** (آیات22 تا 34)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج جنوری 1980ء کی 4 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الاحزاب کی آیت 22 سے ہو رہا ہے: (33:22)۔

بات جنگِ احزاب کی چلی آ رہی تھی اور اس میں بتایا گیا تھا کہ اس جنگ میں تصادم بڑا ہی صبر آزما اور ہمت شکن تھا۔

نامساعدتِ حالات کا ایسا زلزلہ تھا کہ اس کی شدت سے بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں' کمزوردل کے لوگوں کی تو بات ہی کیا اور وہ لوگ جو منافقت میں اس میں شریک ہوئے تھے' انہوں نے عین دورانِ جنگ سازش کی' غداری کی اور جیسا کہ کہا گیا تھا کہ ان میں سے وہ بھی تھے جو قسم قسم کی بہانہ سازیوں سے میدانِ جنگ سے فرار چاہتے تھے۔ان کا ذکر تو سابقہ آیات میں آ چکا ہے۔ان کے بالمقابل ان مومنین کی آج بات شروع ہو رہی ہے جو اپنی جان اور مال بیچ کر اسلام لائے تھے اور ہر وقت قانونِ خداوندی کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھے ہوئے تھے۔کہا کہ **وَ لَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ صَدَقَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ** (33:22) جب انہوں نے ان لشکروں کو دیکھا جن سے ان لوگوں کی وہ کیفیت ہوگئی تھی جو پہلے بیان کی جاچکی ہے تو انہوں نے کہا کہ ارے' یہ تو اس وعدے کے پورے ہونے کا وقت آ گیا ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے کیا تھا۔

استخلاف فی الارض کے بغیر خدا کی طرف سے عطا کردہ نظام حیات یا دین کا نفاذ ہو ہی نہیں سکتا

یہ جو ''وعد'' کا لفظ ہے اگرچہ معنوی طور پر کئی اور مقامات میں بھی آیا ہے لیکن جو وعدہ ہے' اس کے لیے کہا کہ **وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ** (24:55) خدا وعدہ کرتا ہے کہ تم میں سے جو ایمان لائیں اور پھر وہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوں تو اسی دنیا میں' اسی کرۂ ارض پر' اسی زمین پر' وہ انہیں حکومت اور مملکت عطا کرے گا۔ یہ بڑی اہم آیت ہے۔ جسے اسلام کا نظام کہتے ہیں اس کا پورا نقشہ اس کے اندر آ گیا ہے۔پہلی چیز تو اس میں یہی ہے کہ اسلام ایک مذہب نہیں ہے' بندے اور خدا کے درمیان کچھ پرائیویٹ تعلق نہیں ہے یعنی پوجا پاٹ یا عبادت یا پرستش کے رسوم وغیرہ نہیں ہیں ۔ یہاں تو ایمان اور عملِ صالح کا ٹیسٹ یہ ہے کہ اس کے نتیجے میں اپنی آزاد مملکت ملے ۔اور وہ مملکت یہ نہیں ہے کہ جیسے دوسری اقوام کو حکومتیں ملتی ہیں یا سلطنتیں ملتی ہیں بلکہ وہ اس لیے ملے کہ **وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ** (24:55) اس ذریعے سے دین کا تمکن ہوگا۔اگر یہ استخلاف فی الارض نہیں ہے تو دین کا تمکن ہی نہیں ہوسکتا' دین قائم ہی نہیں ہوسکتا۔گویا یہ تھا وہ وعدہ۔ یہ باتیں تو پہلے متعدد بار آ چکی ہوئی ہیں۔اور میرا درس تو مسلسل انہی نکات ہی کی تشریح کا پروگرام ہے۔قرآن کی مختلف آیات میں یہی چیز چلی آ رہی ہے۔ یہ دین ہے تو گویا وعدہ یہ ہے۔انہوں نے کہا کہ **قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ صَدَقَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ** (33:22) یہ تو اسی وعدے کے پورے ہونے کا وقت آ گیا جو خدا اور اس کے رسول نے ہم سے کیا تھا اور ان کا وعدہ سچا تھا۔

میدانِ جنگ تو انسان کے ایمان کا ٹیسٹ ہوتا ہے

ان لشکروں کے ہجوم کا نتیجہ یہ تھا کہ **وَ مَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّ تَسْلِيْمًا** (33:22) ان کا ایمان اور زیادہ مستحکم ہوگیا اور

انہوں نے اور زیادہ شدت سے اطاعت اختیار کر لی۔ اسی سورۃ کی آیت 8-7 میں آپ دیکھیے۔ کہا یہ گیا تھا کہ ہم نے انبیاء سے ایک عہد لیا اور اے رسول ﷺ! تم سے بھی عہد لیا اور وہ عہد یہ تھا کہ جو لوگ ایمان لا کر اس کا دعویٰ کریں کہ ہم اپنے اس ایمان میں سچے ہیں تو تم نے ان کے اس دعوے کا امتحان لینا ہے' اس دعوے کو ٹیسٹ کرنا ہے۔ انبیائے کرامؑ سے یہ میثاق لیا گیا تھا۔ اور اس کے بعد ان جنگوں کی وارداتیں سامنے لائی گئیں کہ یہ وہ میدان تھے جہاں ایمان کے مدعیان کے دعوے کی صداقت کی آزمائش ہونی تھی۔ گویا یہ وہ جنگ ہے جس میں وہ کہہ رہے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے اپنے وعدے کو پورا کیا اور ہم نے اپنے ایمان کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچا دیا۔ جتنی زیادہ آزمائش کی گھڑی آئی' مقابلہ جتنا زیادہ سخت آ گیا' اس کے مقابلے میں اتنا ہی ان کا ایمان مستحکم ہوا۔ یہ تو آپس میں ایمان اور اس کے ٹکراؤ کی جو قوتیں آتی ہیں' یہ تو یوں مثال کے طور پر سمجھیے کہ جیسے ٹینس کا کھیل ہوتا ہے۔ جتنے زور سے ادھر سے وہ اس کو شوٹ لگاتا ہے اتنے زور سے اس کو ریٹرن ملتی ہے۔ یہ تو تصادمات میں آ کر پختہ ہوتا ہے' ٹیسٹ ہی یہاں ہوتا ہے۔ خدا کہتا ہے کہ ہم نے ہر نبی سے اس کا عہد لیا تھا کہ تم نے ان کے اس دعوے کی صداقت کا ٹیسٹ کرنا ہے۔ اور ٹیسٹ میں وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ اس سے ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انہوں نے اور زیادہ دل کی گہرائیوں سے اس کی اطاعت کو قبول کیا۔

اہلِ ایمان کے لیے تصادمات کی گرفت ان کے ایمان کو اور زیادہ مستحکم کر دیتی ہے

یہ ایمان زیادہ ہو جانے کا مستحکم ہو جانے کی بات ہے تو سورۃ آل عمران میں بھی ایک جگہ یہ چیز ہے۔ کہا ہے کہ **اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ** (3:173) یہ اربابِ ایمان وہ لوگ ہیں کہ جب لوگوں نے ان سے کہا کہ کیا تمہیں معلوم ہے کہ دشمنوں نے تمہارے خلاف کس قدر جمِ غفیر اور کس قدر لشکرِ جرار تیار کر رکھے ہیں تو تمہیں ان سے ڈرنا چاہئے۔ تو یہ سن کر **فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا** (3:173) ان کا ایمان اور زیادہ ہو گیا۔ ایمان کا زیادہ یا کم ہونا کچھ پیمائش کی بات نہیں بلکہ ایمان کا اور مستحکم ہو جانا اور محکم ہو جانا ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ تمہیں ان سے ڈرنا چاہیے تو کہا کہ: **قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ** (3:173) ٹھیک ہے انہوں نے ہمارے خلاف اتنے لشکر جمع کر لیے ہیں تو ہمارے لیے خدا کی نصرت کافی ہے۔ اور وہی ہے جس پہ پورا پورا اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ قوانینِ خداوندی کبھی ہمیں دھوکا نہیں دے سکتے۔ دشمنوں کی تعداد کا مقابلہ ہمارے ایمان کی محکمیت ہے اور یہ چیز ہے کہ اس کے قوانین کے مطابق مقابلہ کرنے سے ان کی تعداد کی کثرت ہم پر غالب نہیں آ سکتی۔ یہ ہمارا یقینِ محکم ہے اس لیے ہمیں ان سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اور پھر دہرا دوں آپ کو یاد ہے کہ ایرانی گورنر ہُرمزان سے حضرت عمرؓ (581-644/45AD) نے جو کہا تھا۔ جب اُنہوںؓ نے کہا تھا کہ پہلے تو کبھی ایرانی ہمارے مقابلے میں جنگ کے لیے بھی نہیں آتے تھے اور آج تمہاری کیفیت یہ ہے کہ

قدم قدم کے اوپر انہی عربوں کے ہاتھوں شکست کھا رہے ہو۔ یہ فرق کیسے پیدا ہو گیا؟ ہم بھی وہی عرب ہیں، تم بھی وہی ایرانی ہو۔ آپ اندازہ لگائیے کہ وہ لوگ کتنے دیدہ ور تھے، بات کو کیسے سمجھ گئے تھے۔ اُس ہُرمزان نے یہ کہا تھا کہ عمرؓ! بات یہ ہے کہ پہلے جب میدانِ جنگ میں آتے تھے تو ایک طرف ہم تنہا ایرانی ہوتے تھے، ایک طرف تم تنہا عرب ہوتے تھے۔ اب جو ہم میدان میں آتے ہیں تو ہم تو اسی طرح سے تنہا ایرانی ہوتے ہیں اور ہمارے مقابلے میں تم عرب ہوتے ہو اور تمہارے ساتھ تمہارا خدا ہوتا ہے۔ ان دو قوتوں کا مقابلہ دنیا کی کوئی طاقت نہیں کر سکتی۔ ایرانی گورنر ہُرمزان آ کر یہ کہہ رہا ہے کہ ہماری شکست تو اس لیے ہے اور ہم ہی کیا، دنیا کی کوئی قوت بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی کہ یہ جو دو اکٹھے ہوئے ہیں۔

من وساقی بہم سازیم

تو یہ ''من وساقی بہم سازیم'' والی بات بہت بڑی چیز ہے۔ اس لیے ان کا ایمان اس سے اور بڑھ جاتا ہے۔ اور ایمان کے زیادہ محکم ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ **تَسْلِيمًا** (33:22) اور زیادہ شدت سے وہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ محکم ایمان کی نشانی ہے۔ کہا کہ **مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ** (33:23) انہوں نے اپنے خدا سے جو عہد کیا تھا اسے کر کے دکھا دیا۔ خدا نے بھی اپنا وعدہ پورا کر کے دکھایا اس لیے کہ اِنہوں نے اپنے عہد کو پورا کر کے دکھایا تھا۔ دونوں طرف سے یہ صداقت ہوتی ہے۔ یہ اپنے دعویٰ ایمان کی صداقت کا ثبوت جانیں دے کر بہم پہنچاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کی صداقت کا ثبوت انہیں استخلاف فی الارض عطا کر کے بہم پہنچاتا ہے۔ دونوں چیزیں لازم وملزوم ہیں۔ **فَمِنْهُم مَّنْ قَضٰى نَحْبَهُ وَ مِنْهُم مَّنْ يَّنْتَظِرُ** (33:23) ان میں سے بعض تو وہ ہیں جنہوں نے خدا کے ہاتھ بیع وشراء کا معاہدہ کیا جیسے وہ ہے کہ **اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ** (9:111) مومن خدا سے ایک معاہدہ کرتے ہیں جس کی رو سے وہ اپنی جان اور مال اس کے ہاتھوں بیچ دیتے ہیں اور وہ اس کے بدلے میں انہیں الجنة دیدیتا ہے۔ یہ جو انہوں نے معاہدہ کر رکھا تھا، کہا کہ ان میں سے بعض تو وہ ہیں جو جانیں دے کر اس سے سرخرو ہو گئے ہیں اور دوسرے وہ ہیں جو ابھی انتظار میں ہیں کہ کب ہمیں اس کا حکم ملے اور ہم بھی اپنی جان ہتھیلی پہ رکھتے ہوئے میدان میں چلے جائیں یا خود میدانِ جنگ کے اندر ہی کچھ لوگ ایسے ہیں جو اس انتظار میں ہیں کہ ان کی جان دینے کی باری کب آتی ہے۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے ایمان کا صلہ ایمان کے ٹیسٹ ہونے پر ہی ملتا ہے

عزیزانِ من! یہ ہوتا ہے ایمان اور یہ ہوتے ہیں مومن۔ قرآن جو کچھ کہتا ہے، وہ اس جماعت کے متعلق کہتا ہے جسے جماعتِ

مومنین کہا جاتا ہے۔ ہم لوگ تو اس سننے کے لیے بیٹھے رہتے ہیں' حالانکہ یہ وہ تمام مخلص بندے ہیں جنہوں نے **وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلًا** (33:23) اپنے عہد و پیمان میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی بھی نہیں کی۔ یہ سارا کچھ اس لیے ہوا۔ انہوں نے یہ کیا کہ **لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ** (33:24)۔ یہ وہی صدق اور صداقت کا لفظ بار بار چلا آتا ہے۔ یہاں سے بات شروع ہوئی تھی کہ انبیائے کرام کا یہ فریضہ ہے' انہوں نے خدا سے یہ عہد کر رکھا ہے کہ وہ اپنی جماعت کے افراد کے دعویٰ ایمان کی صداقت کو ٹیسٹ کریں گے۔ اور پھر یہ اس کے ثبوت میں اپنی جانیں اور مال قربان اور نچھاور کر کے دکھائیں گے۔ کہا کہ "اللہ کی طرف سے اس کا جو معاوضہ یا صلہ ملتا ہے تو وہ ان صادقین کے صدق کے بدلے میں ملتا ہے۔ جب ایمان کا ٹیسٹ ہو جاتا ہے اور یہ اپنے دعوے کی صداقت کا عملی ثبوت بہم پہنچاتے ہیں تو پھر وہاں سے اس کا صلہ ملتا ہے۔ محض زبان سے کہہ دینے سے کہ ہم ایمان لائے' کچھ نہیں ملتا بلکہ قرآنِ کریم نے تو سورۃ الحجرات میں اعراب سے جو شروع شروع میں مسلمان ہو گئے تھے یہ کہا ہے کہ ان سے کہو کہ یہ نہ کہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں' ہم مومن ہو گئے ہیں بلکہ ان سے کہو کہ سرِ دست اتنا ہی کہیں کہ ہم اسلامی مملکت کے سامنے جھک گئے ہیں۔ یہ اس لیے ہے کہ **لَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ** (49:14). ایمان ابھی ان کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا۔ وہ تو اس وقت تک مومن کہنے کی اجازت بھی نہیں دیتا جب تک یہ کیفیت نہ پیدا ہو جائے اور یہ سارا قرآن مومنین کے لیے ہے' اس جماعت کے لیے ہے جن کے دل کی گہرائیوں میں ایمان اتر چکا ہے۔ اور وہ اس کی صداقت کا ثبوت اس طرح سے بہم پہنچائیں۔ یہ ایک جماعت تیار ہوتی ہے' یہ ایک امت تیار ہوتی ہے۔ اس کے لیے یہ سارا پروگرام دیا گیا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے صدق کا صلہ ان کو دے۔

اپنی کوتاہیوں پر نادم ہونے والوں کا معاملہ

اب یہ لوگ ہیں جن کے لیے کہا ہے کہ **وَ يُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ** (33:24) جنہوں نے درمیان میں سازش کی ہے' غداری کی ہے' تو ان کے معاملے کے متعلق خدا کی طرف سے فیصلہ ہوگا' قانون اور احکام نازل ہوں گے' دیکھا جائے گا کہ **اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ** (33:24) جو ان میں سے اپنے اس کیے پر نادم ہیں اور آئندہ کے لیے سچے رہنے کا وعدہ کرتے ہیں' انہیں معاف کر دیا جائے گا اور جن کے متعلق معلوم ہوگا کہ نہیں! وہ اپنی منافقت میں پختہ تھے اور اب بھی وہ پختہ ہیں' آئندہ بھی ان کے اوپر اعتماد نہیں کیا جا سکتا تو ان کو پھر سزا بھی ملے گی۔ کہا کہ **اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا** (33:24) یہ جن کو معاف کیا جائے گا' یہ ان کے متعلق ہے کہ ان کو Protection (حفاظت) دی جائے گی کہ ان کے خلاف کسی قسم کی چارہ جوئی نہ کی جائے حتیٰ کہ جو مراعات دوسروں کو حاصل ہیں وہ مراعات بھی ان کو دی جائیں گی۔ یعنی اگر یہ جو غلطی سے' سہواً' یا کسی طرح سے' کمزوری سے' یہ کر چکے ہیں اور اپنے کیے پر نادم ہیں' آئندہ

کے لیے محتاط رہنے کی یقین دہانی کراتے ہیں تو پھر وہ اسی جماعت کے اندر شامل سمجھے جائیں۔

جنگِ احزاب میں انتقام لینے والے خود اپنی انتقامی آگ میں ہی جھلس کر رہ گئے

کہا کہ وَ رَدَّ اللّٰہُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِغَیْظِھِمْ لَمْ یَنَالُوْا خَیْرًا (33:25) اور یہ لوگ یعنی قریش اور ان کے ساتھی لشکر جنہوں نے یورش کر کے حملہ کیا تھا، ان کے دلوں کے اندر، یہ ٹھیک ہے، کہ غصے کی آگ بھڑک رہی تھی۔ کہا یہ گیا ہے کہ اس آگ کی انگیٹھی سمیت اللہ تعالیٰ نے ان کو واپس لوٹا دیا۔ ان کی وہ آگ ان کے سینے میں ہی رہی جس نے ان کے دلوں کو جلا دیا۔ اصل تو یہ ہے کہ نَارُ اللّٰہِ الْمُوْقَدَۃُ ۙ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَۃِ (104:6-7) اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ تو دلوں کو لپیٹ لیا کرتی ہے۔ یہ دلوں کو لپیٹنے والی آگ تمہارے خلاف شعلہ فشانی کرنے کے لیے لے کر آئے تھے لیکن ہوا یہ کہ وہ یہاں سے پسپا ہوئے، شکست خوردہ بھاگے اور یہ انتقام کی آگ بھی اپنے سینوں میں اسی طرح سے لے کر واپس ہوئے۔ اور اس حملہ میں ان کے لیے کوئی بات بھی نفع بخش ثابت نہ ہوئی۔ اور یہ جنگ میں نظر آ گیا کہ وَ کَفَی اللّٰہُ الْمُؤْمِنِیْنَ الْقِتَالَ (33:25)۔ جماعتِ مومنین کے لیے خدا پر ایمان کس قدر کافی ہوتا ہے، قانونِ خداوندی کس قدر سازگار رہتا ہے۔ یہ ثابت ہو گیا کہ وَ کَانَ اللّٰہُ قَوِیًّا عَزِیْزًا (33:25) اللہ کے قوانین کی اطاعت سے کتنی بڑی طاقت حاصل ہوتی ہے، کتنا بڑا غلبہ حاصل ہوتا ہے۔

خدا تعالیٰ کی قوت، اس کے اقتدار یا اس کے غلبہ سے مراد اس کے وہ قوانین ہیں جن کے تابع یہ کائنات سرگرمِ عمل ہے

عزیزانِ من! یہ جو چیزیں قرآن میں ہیں، میں انہیں بار بار Explain (بیان) کر چکا ہوں کہ جہاں اللہ کی یہ صفات دی جاتی ہیں کہ وہ صاحبِ قوت ہے، صاحبِ اقتدار ہے، صاحبِ غلبہ ہے تو اگر ان چیزوں کا تعلق ہم سے نہ ہو تو ٹھیک ہے وہ صاحبِ غلبہ اور صاحبِ اقتدار ہوا کرے ہمیں اس سے کیا فائدہ۔ اس کی کائنات ہے جو اس نے پیدا کی ہے اس میں اس کا اقتدار ہے، اس کی طاقت ہے، اس کی قوت ہے، اس کا غلبہ ہے تو ہوا کرے:

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

اس کا یہ غلبہ، اس کی یہ قوت، اس کے یہ اختیارات، اس کی یہ طاقتیں، اس کے قوانین کے ذریعے سے یہاں کارفرما ہوتی ہیں۔

خدا تعالیٰ کی یہ صفات تو حدودِ بشریت میں ایک مومن کے اندر منعکس ہوتی ہیں

قرآن کہتا ہے کہ جو بھی ان قوانین کی اطاعت کرتا ہے' یہ صفات اس کے اندر بحدِ بشریت پیدا ہو جاتی ہیں۔ اسے ہی **صِبۡغَةَ اللّٰهِ** (2:138) کہتے ہیں یعنی خدا کے رنگ میں رنگے جانا۔ مومن میں جب یہ صفات جو خدا نے اپنی صفات کہی ہیں' بشریت کی حدود کے اندر پیدا ہوتی ہیں تو وہ صاحبِ قوت ہو جاتا ہے۔ انہی صفاتِ خداوندی کے پیدا ہونے سے جماعتِ مومنین قوی ہوتی ہے' عزیز ہوتی ہے' صاحبِ غلبہ ہوتی ہے' صاحبِ اقتدار ہوتی ہے۔ اگر وہ یہ کچھ نہیں ہوتی تو پھر خدا کی یہ صفت اس کے اندر پیدا نہیں ہوتی' ایمان اس کے اندر نہیں ہوتا۔ خدا نے کہیں نہیں کہا کہ ہم مغلوب ہیں' ہم مفتوح ہیں' ہم کمزور ہیں' ہم ضعیف ہیں' ہم بھیک مانگ کر کھاتے ہیں۔ یہ تو خدا کی صفات نہیں ہو سکتیں۔ سیدھی سی بات ہے کہ یہ تو قدم قدم کے اوپر ٹیسٹ ہو سکتا ہے۔ بہرحال غنیمت ہے کہ ہم نے کبھی ایمان کا دعویٰ کیا ہی نہیں۔ جہاں راشن کارڈ بنوانے میں مذہب کا خانہ آتا ہے تو وہاں اسلام لکھ دیتے ہیں۔ اللہ اللہ خیر سلا' ورنہ یہاں تو قدم قدم پہ یہ ٹیسٹ ہوتا ہے۔ آپ خدا کی صفات دیکھیے اور اس کے مقابل میں ہم جو بہرحال مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں تو اگر یہ ساری صفات اس کے برعکس ہیں تو پھر تو ہم اس کے علی الرغم زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وہ قوی ہے ہم ضعیف ہیں' وہ رزاق ہے ہم رزق کے لیے محتاج ہیں' وہ قادر ہے ہم مقدور ہیں۔ تو کیا کہتے ہیں آپ؟ عزیزانِ من! اس کے لیے نہ کسی فلسفیانہ دلائل کی ضرورت ہے' نہ فقیہانہ احکام کی ضرورت ہے۔ یہ تو قدم قدم کے اوپر ٹیسٹ کرنے کی بات ہے کہ اس جماعت میں کس حد تک خدا کی صفات منعکس ہو رہی ہیں۔

مدینے کی حفاظت کے سلسلہ میں یہودیوں کا جنگ کے دوران معاہدے سے انحراف اور اس کا انجام

کہا کہ **وَ اَنۡزَلَ الَّذِيۡنَ ظَاهَرُوۡهُمۡ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ مِنۡ صَيَاصِيۡهِمۡ وَ قَذَفَ فِىۡ قُلُوۡبِهِمُ الرُّعۡبَ فَرِيۡقًا تَقۡتُلُوۡنَ وَ تَاۡسِرُوۡنَ فَرِيۡقًا** (33:26) اور یہ جو یہودی تھے' وہ مدینے میں رہتے تھے' مدینے کے باشندے ہونے کی جہت سے انہوں نے ان مسلمانوں سے' رسول اللہ ﷺ سے' یہ معاہدہ کیا تھا کہ اگر کوئی دشمن مدینے پر حملہ آور ہو گا تو ہم یہاں کے باشندے (Citizens) ہونے کی جہت سے معاہدہ کرتے ہیں کہ ہم مدینے کو بچانے کے لیے مل کر مدافعت کریں گے۔ اور جب (معاذ اللہ) مدینے کو تہس نہس کرنے کے لیے اس جنگ میں حملہ آور آئے ہیں تو عین جنگ کے درمیان یہ اپنے معاہدے سے پھر گئے تھے۔ اور ان کی وجہ سے مسلمان بڑی سخت مصیبت میں گھر گئے تھے۔ انہوں نے باہر خندق کھود رکھی تھی' باہر سے وہ حملہ آور ہو رہے تھے' اندر سے ان یہودیوں نے غداری کی تھی۔ ان کا تو یہ بھی ارادہ تھا کہ جب یہ میدانِ جنگ میں باہر نکلیں تو پیچھے مسلمانوں کے گھر غیر محفوظ رہ جائیں گے ان کے گھروں کے اوپر حملہ کرو۔ یہ یہودی یہ ہے۔

جنگِ خیبر کے بعد حضرت عمرؓ کے دور میں یہودیوں کو جزیرۃ العرب سے ہی باہر نکال دیا گیا

کہا کہ پھر اس کے بعد ان کے متعلق فیصلہ کیا گیا۔ پہلی چیز یہ کی گئی کہ انہیں مدینے سے نکال دیا اور باہر ذرا دور ایک بستی خیبر ❶ میں بسا دیا گیا تھا۔ ان میں سے جو میدانِ جنگ میں سرکشی پر اترے تھے ان کے ساتھ پھر جنگ بھی ہوئی تھی۔ ان میں سے ان لوگوں کو قیدی بھی بنایا گیا تھا لیکن بہرحال انہیں وہاں خیبر میں منتقل کیا تھا۔ اس کے بعد پھر وہاں سے بھی انہوں نے اسی طرح سے مخالفت اور سرکشی اختیار کی تو پھر جنگِ خیبر ❷ ہوئی تھی۔ اور آخر میں حضرت عمرؓ کے زمانے (634-644/45AD) میں انہیں پھر پورے جزیرۃ العرب سے ہی باہر نکال دیا گیا تھا اس لیے کہ یہ قوم سازشوں سے باز ہی نہیں آتی تھی۔

مسلمانوں کو سب سے زیادہ نقصان یہودیوں سے ہی پہنچا ہے' جنگ احزاب کا اختتام اور دین کی فتح

منافقت اور سازشیں یہودیوں کی فطرت میں بالکل اس طرح سے داخل ہو گئی ہیں جس طرح ہندو کی فطرت کے اندر یہ چیز ہے۔ یہ چیز ان کے اندر سے جا ہی نہیں سکتی۔ یہ آخر تک یہ کرتے رہے۔ اور اس تیرہ سو سال کے اندر یہی کچھ یہودی کرتا چلا آ رہا ہے۔ آج بھی آپ کو جو سب سے زیادہ زک پہنچی ہوئی ہے وہ یہودیوں سے پہنچی ہے۔ یہ ہے جو قرآن نے کہا کہ جب تک یہ لوگ اپنی اس روش پہ ہیں' ان پہ کبھی اعتبار نہ کرنا۔ اب اس جنگ کی داستان کا خاتمہ اس نتیجے کے اوپر ہوا کہ وَ اَوۡرَثَکُمۡ اَرۡضَهُمۡ وَ دِیَارَهُمۡ وَ اَمۡوَالَهُمۡ وَ اَرۡضًا لَّمۡ تَطَـُٔوۡهَا وَ کَانَ اللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرًا (33:27) اے جماعتِ مومنین! پھر خدا نے تمہیں ان مخالفین کی زمین کا' ان کے شہروں کا' ان کی اموال کا' مالک بنا دیا۔ اسی طرح' خدا تمہیں ایسے ممالک کا بھی مالک بنا دے گا جن پر ابھی تک تمہارے پاؤں بھی نہیں پڑے۔ یہ ہے جہاں اسلام دین کی حیثیت سے زندہ ہوتا ہے۔ یعنی یہ لا ینفک چیز ہے' اسلام کے زندہ دین ہونے کے لیے سرزمین کی ضرورت ہے جس میں آپ تمکنِ دین کی خاطر اپنی آزادانہ مملکت قائم کر سکیں۔ اس طرح قانونِ خداوندی کی رُو سے' ہر بات اس کے مقرر کردہ اندازوں اور پیمانوں کے مطابق ظہور پذیر ہوتی ہے اور یوں خدا کے وعدے پورے ہوتے چلے جاتے ہیں۔

---

❶ یہ مقام مدینہ منورہ سے قریب دو سو میل کے فاصلہ پر ہے (پرویزؒ: معراج انسانیت، کراچی، 1949، ص 565)

❷ 7ھ۔ یہ پہلی لڑائی ہے جس میں اہل کتاب سے نبرد آزمائی ہوئی۔ مرحب یہیں کا نامور پہلوان تھا۔ اسے حضرت علیؓ کے ایک ہی حملے نے آغشتۂ خاک و خون کر دیا۔ (پرویزؒ: معراجِ انسانیت، ادارہ طلوعِ اسلام' کراچی' 1949' ص۔ 565)۔

پاکستان کے مطالبہ پر مخالفین کا اعتراض اوراس کا جواب

عزیزانِ من! جیسا کہ میں نے بار بار یہ عرض کیا ہے کہ یہ مطالبۂ پاکستان ہمارے لیے اس دین کا تقاضا تھا کہ سرزمین ملے جہاں دین کے تمکن کی خاطر اپنی آزادانہ مملکت قائم ہو۔ یہ نہ ہندو کی تنگ نظری تھی جس سے تنگ آ کر ہم نے یہ کیا' نہ انگریز کی سازش تھی' نہ کوئی معاشی مسئلہ تھا' نہ جناحؒ (1876-1948ء) کا سیاسی حربہ تھا۔ اقبالؒ (1877-1938ء) نے یہ کہا کہ ہمارے دین کا تقاضا ہے' اسلام ایک زندہ حقیقت نہیں بن سکتا جب تک کہ مسلمانوں کی آزاد مملکت اس مقصد کے لیے نہ ہو کہ اس میں دین کا تمکن ہو گا کیونکہ کہا یہ گیا تھا کہ تم مسلمانوں کی آزاد حکومت مانگتے ہو تو مسلمانوں کی پہلے سے بیسیوں آزاد مملکتیں ہیں' پھر اِن میں ایک اور کا اضافہ کر کے تم کیا کرو گے؟ یہ اعتراض ہوتا تھا۔ اس اعتراض کا جواب یہ تھا کہ یہ وہ آزاد خطہ ہو جس میں ہم اپنی مملکت قائم کریں تا کہ دین کا تمکن ہو۔ اس کے لیے یہ ہمارا مطالبہ دینی بن گیا تھا۔ (محمد علی جناح) قائداعظمؒ نے بار بار اس کو دہرایا تھا کہ خطۂ زمین مقصود بالذات نہیں تھا' نہ حضورﷺ کے زمانے میں یہ مختلف ممالک کی فتوحات مقصود بالذات تھیں۔ وہاں بھی تمکنِ دین کے لیے یہ کچھ تھا۔ جیسا کہ میں نے سورۃ النور[1] کے وعدے میں کہا ہے کہ یہ اس لیے تھا تا کہ دین کا تمکن ہو سکے۔ اور بعینہٖ اسی کے مطابق یہ تصور (ڈاکٹر محمد) اقبالؒ نے دیا تھا اور اسی کے مطابق قائداعظمؒ (محمد علی جناح) نے اس کو عملی پیکر بنایا تھا۔

تحریکِ پاکستان کے سلسلہ میں قائداعظمؒ کے ساتھ علامہ پرویزؒ کی رفاقت: 1937ء میں قائد کے ساتھ پہلی ملاقات

مجھے بار بار دہرانا اچھا نہیں لگتا۔ یہ بندۂ ناچیز آپ کے سامنے ہے۔ مجھے دس سال قائداعظمؒ (محمد علی جناح) کا قُرب حاصل رہا۔ وہاں قرآن پہ ہی باتیں ہوتی تھیں۔ میرا اور ان کا اتنا بڑا فرق تھا: یہ ذرۂ ناچیز اور وہ سلطنت پیما۔ ہم میں قدرِ مشترک قرآن تھا۔ ان کے دل میں قرآن کا ذوق تھا' میں قرآن کا طالبعلم تھا۔ وہاں یہ ساری چیزیں ان کے ساتھ Discuss (زیرِ بحث) ہوتی تھیں۔ آج طرح طرح کی اور بھانت بھانت کی بولیاں بولی جاتی ہیں' ان کے خلاف طرح طرح کی باتیں ہو رہی ہیں۔ یہ سازش ہے۔ قائداعظمؒ سرزمینِ پاکستان کو اسی طرح سے دین کا تقاضا سمجھتے تھے جس طرح اقبالؒ نے اس چیز کو پیش کیا۔ اقبالؒ نے یہ سمجھانے کے بعد کہ اسلام یہ ہے' ان کی نیشنلسٹ مسلمان کی حیثیت کو ادھر Convert (تبدیل) کیا تھا۔ میرے ذاتی علم میں ہے کہ اُن سے میری پہلی ملاقات جب 1937ء میں شملہ میں ہوئی ہے تو اسی بات پہ Discussion (گفتگو) ہوئی۔ علامہ اقبالؒ کے ایما پہ انہوں نے مجھے بلایا تھا۔

---

[1] اس تفصیل کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورۃ النور' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2007' ص ص 214 تا 229۔

اور انہوں نے کہا ہی یہ تھا کہ ہندو انگریز کا جو محاذ ہے وہ تو ہم سنبھال لیں گے لیکن یہ جو قال اللہ اور قال الرسول کی بنیادوں کے اوپر اس مطالبے کی مخالفت کر رہے ہیں یہ محاذ تم سنبھالو۔ اور اس کے بعد پھر ان چیزوں پر دس سال تک ان کے ساتھ Discussion (گفتگو) ہوتی رہی۔ وہ تو ان کو فرصت ہی نہیں ملی' پاکستان آتے ہی ہجومِ مشکلات و مصائب نے گھیر لیا' صحت بگڑ گئی' چند دن کے لیے وہ زندہ رہے اور ختم ہو گئے۔ اگر ان کی صحت رہتی اور ان کی عمر ہوتی تو آپ دیکھتے کہ اس مملکتِ سرزمین کے اوپر دین کا تمکن ہوتا۔

فتح مکہ کے بعد مسلمانوں کے لیے فتوحات کے دروازے کھل گئے

کہا ہے کہ **وَ اَوۡرَثَكُمۡ اَرۡضَهُمۡ وَ دِيَارَهُمۡ وَ اَمۡوَالَهُمۡ وَ اَرۡضًا لَّمۡ تَطَئُوۡهَا** (33:27) تمہیں ان کی زمینوں کا' اموال کا' شہروں کا' مالک بنایا اور ان زمینوں کا بھی جن پر ابھی تمہارے پاؤں بھی نہیں پڑے۔ اندازہ لگایئے کہ نزولِ قرآن کے زمانے میں تو ابھی یہ سرزمینِ عرب سے آگے بڑھے ہی نہیں تھے' ابھی اس کے بارڈر تک بھی نہیں پہنچے تھے۔ ایران کی سرزمینیں [1]' بازنطینی حکومت کی سرزمینیں [2]' مصر کی سرزمینیں [3]' ملتان تک کا ہندوستان کا علاقہ [4] اور اب تو جو تحقیقات ہو رہی ہیں وہ ان کو چین [5] تک پہنچا رہے ہیں۔ یہ وہ سرزمینیں ہیں جن پر ان کے قدم بعد میں پڑے۔ ان زمینوں کے لیے یہ کہا ہے کہ **اَرۡضًا لَّمۡ تَطَئُوۡهَا** (33:27) یہ وہ زمینیں ہیں جن پر ابھی تمہارے پاؤں بھی نہیں پڑے۔ اللہ تعالیٰ کی آنکھوں کے سامنے تو قیامت تک کا نقشہ ہوتا ہے۔ یہ چیزیں جو کہی گئی ہیں یہ اس لیے کہی گئی ہیں کہ جب ایمان اور اعمالِ صالحہ کا لازمی نتیجہ وراثتِ ارض ہے تو تم میں جب تک یہ خصوصیت رہے گی تو جہاں جہاں تم پہنچو گے وراثتِ ارض تمہارے حصے میں آتی چلی جائے گی۔ یعنی یہ ایک منطقی نتیجہ تھا' یہ پیشین گوئی نہیں تھی کہ ان سرزمینوں کے

---

1. جنگِ کاظمہ (12ھ مطابق 633ء) سے لے کر تستر کی فتح (19ھ مطابق 640) تک ایران کی سرزمین مسلمانوں کے زیرِ سلطنت آ گئی تھی (پرویزؒ: شاہکارِ رسالت' 1987' ص ص۔ تا 185)۔
2. حمص کی فتح (15ھ مطابق 635) سے لے کر جندی سالور کی فتح (17ھ مطابق 637) تک بازنطینی حکومت کی سرزمینیں مسلمانوں کی حکومت میں شامل ہو گئیں (پرویزؒ: شاہکارِ رسالت' 1987' ص ص۔ 194 تا 209)۔
3. بلبیس کے معرکہ (18ھ مطابق 40-639ء) سے لے کر فتح اسکندریہ (20ھ مطابق 641ء) تک مصر فتح کر لیا گیا تھا (پرویزؒ: شاہکارِ رسالت' 1987، ص ص۔ 210 تا 213)۔
4. محمد بن قاسم نے 20 جون 712ء کو راجہ داہر کو قتل کر کے سندھ کو فتح کیا اور سندھ کے علاقہ سے آگے ملتان تک کا سارا علاقہ فتح کر لیا۔
(Rauf, Abdur, Dr: History of Islam, Feroze Sons (Pvt.) Ltd, Lahore, 1994, pp. 175-176).
5. سعد بن ابی وقاص کی سرکردگی میں 29ھ مطابق 651ء میں چین آنے والے وفد سے لے کر 138ھ تک چین کی سرزمین مسلمانوں کے زیرِ سرکردگی تھی۔
(Rauf, Abdur, Dr.: History of Islam, Feroze Sons (Pvt.) Ltd, Lahore, 1994, PP.218-219).

اوپر بھی تمہارا قبضہ ہو جائے گا جن تک ابھی تمہارے پاؤں نہیں پہنچے۔ یہی خصوصیات تمہارے اندر باقی رہیں گی تو جہاں تم جاؤ گے وہاں یہ کیفیت ہو جائے گی۔ عزیزانِ من! اس کے یہ معنی لیجیے۔

اس کے فوراً بعد کہا کہ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرًا (33:27)۔ یہاں قدیر کے لفظ نے بات صاف کر دی کہ ہم نے تو اس کے لیے پیمانے مقرر کر رکھے ہیں' قوانین بنا رکھے ہیں۔ اور پھر یہ جو قدیر کا صیغہ ہے تو میں نے عرض کیا ہے کہ قرآنِ کریم کی رو سے جو الفاظ اس وزن پہ آتے ہیں اس کے معنی ہوتے ہیں کہ ''ہمیشہ ایسا ہوتا رہے گا''۔ یعنی یہ کوئی ہنگامی بات نہیں ہے جو اس وقت ہوا ہے۔ ہم نے ہر شے کے لیے ایسے پیمانے مقرر کر دیئے ہیں جو ہمیشہ ویسے رہیں گے۔ جب ہمارے قوانین ہمیشہ ویسے رہیں گے تو ان کے نتائج بھی ہمیشہ ویسے رہیں گے۔ آپ نے غور فرمایا کہ یہ جتنی باتیں کی جا رہی ہیں' نہ تو یہ تاریخی واقعات ہیں جو اس زمانے کے صدرِ اول کی تاریخ بیان کی ہے' نہ کوئی ہنگامی بات ہے کہ اس وقت کسی طرح سے ایسا ہو گیا۔ وہ تو ایک اصول بیان کرتا ہے وہ تو اپنے ان قوانین کو اور ان کے اٹل نتائج کو بیان کرتا ہے جو خدا نے قرآن میں دیئے ہیں۔ اور کہا یہ ہے کہ جو قوم بھی ان قوانین کا اس طرح سے اتباع کرتی چلی جائے گی' اس کے فطری لازمی نتائج ان کے سامنے آتے چلے جائیں گے۔ آج بھی ہمیشہ کے لیے ہر زمین میں' ہر زمانے میں' جو قوم بھی ایسا کرے گی اس کا یہی نتیجہ ہوگا۔ اور اس کے لیے تو واضح الفاظ میں اس نے کہا ہے کہ اگر تم یہ کچھ نہیں کرو گے اور قوانین واصول کو چھوڑ دو گے تو یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ (47:38) تمہاری جگہ دوسری قوم لے لے گی۔ ثُمَّ لَا یَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ (47:38) وہ تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ اس لیے کہ اگر وہ تمہارے جیسی ہوگی تو پھر تو کوئی بات ہی نہ بنی' پھر بدلنے کی ضرورت ہی کیا پیش آئی۔ کہا کہ وہ تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ وہ ہوگی جو ان قوانین کا اتباع کرے گی تو ان کا لازمی نتیجہ ان کے سامنے آئے گا۔ عزیزانِ من! یہاں تک جنگِ احزاب کی داستان کا آخری مقطع کا بند آ گیا اور نتیجہ بتا دیا۔

قرآنِ کریم جیسی عظیم المرتبت' واضح' روشن اور لاریب کتاب کے متعلق بے ربط ہونے کا تصور غلط ہے

اب ہم آگے چلتے ہیں۔ اور اس سے جو اگلی آیت ہے' جن کی نگاہیں سطح بیں ہیں' ذرا نیچے نہیں جاتیں تو ان کو یہ باتیں بڑی بے جوڑ سی نظر آتی ہیں' ان جوڑ سی نظر آتی ہیں۔ اور یہی ہیں جو کہتے ہیں کہ قرآن میں کوئی ترتیب نہیں ہے' مضامین کا التزام نہیں ہے۔ کہیں کوئی بات آ گئی اس کے بعد کچھ آ گیا۔ آدم کا قصہ ہے' درمیان میں قومِ عاد آ جاتی ہے' پھر عائلی قوانین آ جاتے ہیں' پھر وہ زمین کا قصہ آ جاتا ہے۔ یعنی وہ کہتے ہیں کہ یونہی جیسے بچے کے Alphabets (حروفِ ابجد) ہوتے ہیں جو ایک تھیلے میں بند کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ کبھی نکالتا ہے تو B آ جاتی ہے' اگلا نکالتا ہے تو اس میں Z آ جاتا ہے۔ قرآن کا یہ کچھ تصور ہے جو دیا جاتا ہے۔ قرآن نے

کہا ہے کہ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا (73:4) ہم نے تو اسے شروع سے آخر تک موتیوں کی لڑی کی طرح مربوط بنایا ہوا ہے مگر

محرم نہیں ہے تُو ہی نوا ہائے راز کا

یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

تو کہیں جنگِ احزاب کے واقعات ہیں' کہیں وراثتِ ارض کے اصول بیان ہو رہے ہیں اور اگلی آیت یہ ہے کہ **یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِکَ اِنْ کُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا وَ زِیْنَتَھَا فَتَعَالَیْنَ اُمَتِّعْکُنَّ وَ اُسَرِّحْکُنَّ سَرَاحًا جَمِیْلًا** (33:28) اے نبی! اپنی بیویوں سے کہہ دو۔ تو سطحی اعتبار سے بات یہ آئی کہ جنگِ احزاب کا ذکر ہو رہا ہے' وراثتِ ارض کے اصول بیان ہو رہے ہیں اور آگے نبی کے گھر کی بات ہو رہی ہے۔ کیا اسمیں کوئی ربط نہیں؟ یہ تصور غلط ہے۔ قرآن تو واضح' روشن اور مربوط عظیم المرتبت کتاب ہے۔

گھریلو زندگی کی اہمیت

عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے انسان کی عائلی زندگی' گھر کی زندگی' کو بڑی اہمیت دی ہے۔ بنیاد اس نے اس پہ رکھی ہے کہ اگر گھر کی زندگی میں تمہیں سکون اور شادمانی حاصل ہے تو پھر باہر کی زندگی بھی تم اطمینانِ قلب سے گزار سکتے ہو۔ اور اگر گھر جہنم بنا ہوا ہے تو باہر تم کوئی کام بھی اطمینان سے نہیں کر سکتے۔ یہ ہے دونوں میں باہمی تعلق' جس کی وجہ سے آپ دیکھیں گے کہ مختلف قسم کے مضامین چلے آ رہے ہیں' جہاں وہ مضمون ختم ہوتا ہے یا اگر ختم نہیں ہوتا تو اس کے درمیان میں ہی عائلی زندگی کے متعلق' میاں بیوی کی زندگی کے متعلق' بچوں کی زندگی کے متعلق' گھر کی زندگی کے متعلق' آیات آ جاتی ہیں۔ ان دونوں میں بڑا بنیادی اور گہرا تعلق ہے۔ اگر آپ کے گھر کی زندگی میں نہ صرف سکون ہے بلکہ وہاں سلیقہ نظم و نسق ہے یعنی ہر چیز ٹھکانے سے ہوتی چلی آ رہی ہے تو آپ کو اس سے کتنا بڑا اطمینان حاصل ہے' سکون حاصل ہے۔ اس کے بعد باہر کی زندگی میں بھی آپ اسی طرح سے چلے جائیں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے متعلق کچھ زیادہ تفصیل سے کہنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہ تو ہمارے ذاتی تجربے ہیں۔

کائنات کا نظم و نسق کیوں بخوبی چل رہا ہے؟ مرزا غالب کا مزاحیہ اندازِ بیان

بات یاد آ گئی۔ وہ بات تو (مرزا اسد اللہ خاں) غالب (1869-1797ء) نے یونہی مذاق میں کہی تھی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ بات سمجھانے کے لیے اس سے بہتر انداز نہیں۔ ان دونوں میاں بیوی میں کچھ تھوڑی بہت کھٹ پٹ رہا کرتی تھی۔ جو بیوی تھی' وہ بڑی نمازن پرہیزگارن تھی۔ وہ بیٹھی ہوئی ان سے کہہ رہی تھی کہ دیکھیے! اللہ تعالیٰ کا نظم و نسق کس حسن و خوبی سے قائم ہے' ہر چیز کیسے قاعدے قانون کے مطابق ہوتی چلی جا رہی ہے' اس کا عجیب و غریب نقشہ کیسے حسن و خوبی سے چلا جا رہا ہے۔ غالب نے کہا کہ ٹھیک ہے بی بی! جو

تم کہہ رہی ہو کہ چلا جا رہا ہے لیکن کیا تمہیں پتہ ہے کہ یہ کیوں اس طرح حسن وخوبی سے چلا جا رہا ہے؟ کہنے لگی: نہیں! بتاؤ کہ کیا بات ہے؟ کہنے لگے کہ اللہ میاں نے شادی نہیں کی تھی۔ شادی کر کے وہ یہ نظم ونسق چلاتا تو پھر ہم قابلِ داد سمجھتے۔ وہ بڑا سمجھدار تھا' بات بڑی پتے کی کہتا تھا۔ اس کے بعد جو بیوی کی طرف سے ہوا ہوگا' وہ اس نے نہیں لکھا۔ اس لیے قرآن میاں بیوی کی زندگی پہ اتنا زور دیتا ہے۔ یعنی اس نے سکینت کہا ہے اور اس کے بعد مودۃ (30:21) کہا ہے' وہ محبت سے بہت اگلا درجہ ہوتا ہے:

من تُو شدم تو من شدی

انسان کی جنّتی زندگی گھر سے شروع ہوتی ہے

میاں بیوی کی زندگی میں گھر کا نقشہ ایسا ہو کہ اس میں سکینت وسکون کی انتہا ہو اور باہمی محبت کے تعلقات ہوں۔ ورحمۃ (30:20) اور وہ ایک دوسرے کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کا موجب بنیں۔ و مغفرۃ (3:157) ان کو اس طرح سے ہر قسم کی تخریبات سے Protection (حفاظت) ہو جائے گی۔ گھر ایک جنت کا نقشہ بن جائے گا۔ اور یہ جو گھر جنت کا نقشہ بنا ہوا ہوگا تو یہ ہے جو باہر کی زندگی کے اندر ہر کام نہایت سکون اور اطمینان سے نظم ونسق کے تابع کر سکیں گے۔ عزیزانِ من! یہ وجہ ہے کہ قرآنِ کریم جب باہر کی زندگی کے موضوعات کا ذکر کرتے ہوئے Climax (عروج) پہ پہنچتا ہے تو فوراً گھر کی زندگی کی طرف آ جاتا ہے کہ انہوں نے یہ سب کچھ اس لیے حاصل کیا تھا کہ ان کے گھر کی زندگی جنت کا نقشہ لیے ہوئے تھی۔

تاریخی طور پر حضور نبی اکرمؐ کے ہاں گیارہ بیویوں کا ذکر ہے۔ یہ کیوں؟

اب آیئے اس آیہ کی طرف۔ یہ بڑی عجیب چیز ہے' بڑی کلائمکس (عروج) پہ پہنچی ہوئی بات ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ کے متعلق یہ ہے کہ آپ ﷺ کی ایک سے زیادہ بیویاں تھیں۔ معلوم نہیں کہ یقینی طور پر ایک وقت میں کتنی تھیں۔ تاریخ کے اندر جو نام لیا جاتا ہے وہ دس گیارہ گنائی جاتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ ایک سے زیادہ کیوں تھیں؟ یہ سوال موضوعِ تحقیق بنا رہتا ہے اور مستشرقین عام طور پہ حضور ﷺ کی اس زندگی کے اوپر بڑا اعتراض کرتے ہیں۔ اگرچہ انہی میں کے ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے خود حضور ﷺ کی اس موضوع پر مدافعت کی ہے کہ یہ جنسی تسکین کا تقاضا نہیں تھا لیکن ہمیں تو خود دیکھنا چاہیے کہ یہ بات کیا ہوئی تھی۔ مجھے اس میں ذرا تفصیل سے جانا چاہیے۔ اگرچہ بات پہلے بھی کئی دفعہ آ چکی ہے لیکن اس آیت کے ضمن میں تو ضروری ہے کہ وہ سامنے آئے۔ قرآنِ کریم کی رو سے زندگی کا اصول یہ ہے کہ ایک مرد کی ایک وقت میں ایک بیوی ہو۔ قرآن نے فواحدۃً (4:4) کہا ہے جسے Monogamy کہتے ہیں۔ اس ابتدائی زندگی کے اندر Situation (صورتِ حال) ایسی آ پڑی کہ اس سے کچھ مشکلات کا سامنا آ گیا۔ مدینے کی زندگی تھی اور

مختصر سی یہ جماعت تھی۔جنگوں کا قصہ شروع ہو گیا' سن 2 ھجری میں ہی بدر کے میدان میں جنگ ہوگئی۔اور پھر علی التواتر یہ سلسلہ جاری رہا۔ظاہر ہے کہ ہر جنگ کے اندر بچے اور بوڑھے تو کچھ محفوظ رہتے ہیں لیکن جو جوان ہیں وہی جنگ میں کچھ کام آتے ہیں۔مردوں کی کمی ہوئی۔ مکے کی عورتوں نے اپنے خاوندوں کو' جو غیر مسلم تھے' کفار تھے اور اسلام نہیں لائے تھے' چھوڑ کر مدینے آنا شروع کر دیا۔ان کے متعلق بھی یہ قانون قرآن نے دیا کہ انہیں واپس نہ بھیجے۔قرآن کے عدل اور انصاف کی مثال ہے کہ انہیں تم واپس نہ بھیجو لیکن ان کے خاوندوں نے شادی کے سلسلہ میں جو کچھ خرچ کیا ہے وہ خرچ ان کو واپس بھیج دو۔ان قریش کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ جو قریش ہر سال حملہ کر رہے ہیں' جنہوں نے ان کو گھروں سے نکال دیا ہے' یہ سارے ان کے ہاں کے تنگ کیے ہوئے ہیں کہ جو یہاں آ کر بسے ہوئے ہیں' ہر سال ان کے ساتھ جنگ ہو رہی ہے' اتنے بڑے دشمن ہیں' ان کی بیویاں ایمان کی بنا پر وہاں سے جان بچا کر بھاگ کر یہاں آئی ہیں' کہا جاتا ہے کہ ان کو تو واپس نہ بھیجیے ورنہ ان پہ اور زیادہ ظلم ہوگا لیکن انہوں نے ان پہ جو خرچ کیا ہے' وہ انہیں واپس کر دیجیے۔گویا پہلے اپنے ہاں یہ کیفیت ہو کہ جو مرد شادی کے قابل ہوں' وہ اتنے کم ہوں۔

عربی زبان میں وہ عورت جس کا شوہر ہی نہ مل رہا ہو اور وہ شادی کے قابل ہو' وہ یتیم کہلائے گی

اب صورتِ حال یہ تھی کہ اپنے ہاں کی عورتیں تھیں اور وہاں کی یہ اتنی عورتیں یہاں مدینے میں آ گئی تھیں۔قانون یہ ہے کہ مسلمان عورت غیر مسلم سے شادی نہیں کر سکتی۔عورتوں کی اتنی زیادتی ہوگئی اور اصول ایک عورت سے شادی کا ہے' اب یہ ایک Exception کی گئی' استثنا کیا گیا۔کہا یہ گیا کہ یہ جو اتنی عورتیں ہیں' جو بغیر شادی کے ہیں' تو اس مسئلے کا اگر اطمینان بخش حل نہ مل سکے تو پھر ہم اس قانون میں کچھ وقت کے لیے Exception (استثنا) کرتے ہیں کہ **ان خفتم الاتعدلوا فواحدۃً** (4:4) یہ جو تنہا رہنے والی عورتیں ہیں' ان کے معاملے میں قرآن نے Exception (استثنا) دی ہے۔ان میں بڑے بڑے اونچے گھرانے کی خواتین تھیں۔یتیم کا لفظ ہمارے ہاں تو اس بچے کے لیے بولا جاتا ہے جس کے ماں باپ مر جائیں۔عربی زبان میں ''وہ عورت جس کو شوہر نہ مل رہا ہو اور وہ شادی کے قابل ہو' اس کو بھی یتیم کہتے ہیں''۔اس مسئلے کے حل کے لیے یہ بات ہوئی۔بڑے بڑے معزز گھرانوں کی خواتین تھیں جن کی کیفیت یہ تھی کہ وہ یا بیوہ ہو گئیں یا ان کے خاوندوں نے طلاق دیدی یا اُدھر سے یوں آ گئیں۔انہیں Protection (تحفظ) دینے کے لیے ان کی درخواست یہ تھی۔ابھی ان کے ذہنوں میں تو یہ تھا کہ گھرانہ ایسا ہی ہونا چاہیے۔انہیں Protection (تحفظ) دینے کے لیے نبی اکرم ﷺ نے ان کو اپنے گھر کے اندر بیوی کی حیثیت سے پناہ دیدی۔

25سال کی عمر میں حضورؐ کی پہلی شادی چالیس سالہ حضرت خدیجہ الکبریٰؓ سے ہوئی

اس استثنا کی یہ تھی وہ بات، ورنہ حضورﷺ کی پہلی شادی حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ سے ہوئی۔ تاریخ کے اعتبار سے آپ سوچیے تو سہی کہ چالیس سال ان کی عمر تھی اور وہ دو دفعہ بیوہ ہو چکی ہوئی تھیں اور آپؐ قریش کے گھرانے کے پچیس سالہ نوجوان تھے۔ انؓ کی آپؐ سے شادی ہوتی ہے۔ ان کی پوری زندگی میں 53 سال کی عمر تک آپؐ نے دوسری شادی نہیں کی حالانکہ عربوں کے اندر تو یہ رواج تھا۔ ان کی وفات کے بعد ہجرت شروع ہوئی اور یہ ہنگامی حالات شروع ہوئے۔ یہ جتنی بھی حضورﷺ کی ازواجِ مطہرات ہیں، ان میں صرف حضرت عائشۃ الکبریٰؓ ہیں جو غیر شادی شدہ تھیں، ورنہ باقی جتنی بھی ہیں ان میں سے ہر ایک دو دو تین تین بار بار کی بیوہ ہوئی ہیں، مطلقہ ہیں، وہاں سے آئی ہوئی ہیں، خاوندوں نے چھوڑا ہوا ہے۔ چالیس چالیس پچاس پچاس سال کی تو عمر تھی۔ یہ اس طرح آئی ہوئی تھیں۔ یہ ہیں وہ واقعات جن کو دیکھنے کے بعد ولیم میور جیسا متعصب جس نے حضورﷺ کی سیرت لکھی ہوئی ہے اور زہر اگلا ہے، اس مقام پہ پہنچ کر وہ بھی یہ کہتا ہے کہ کم از کم اتنا تو مجھے بھی تسلیم ہے کہ یہ جنسی تقاضا نہیں تھا جس بنا پر حضورﷺ یہ بیویاں لائے تھے۔ وہ بھی یہ کہنے پہ مجبور ہوا۔ بعض وقت لکھنے پہ Defend (دفاع) کرنا ہوتا ہے ولیم میور (William Muir) نے جو Defend (دفاع) کیا ہے وہ بات تو ایک طرف رہی، ولیم میور جیسا آدمی بھی یہ کہنے پہ تیار ہے کیونکہ اس نے تاریخ میں یہ سب چیزیں دیکھ لی تھیں۔ حالات پہلے سے بہتر ہو گئے۔ وہ جو ایمر جنسی تھی وہ ختم ہو گئی۔ ہنگامی حالات ختم ہو گئے۔ یہ اس گھر کے اندر آئی ہوئی تھیں۔

عملی طور پر نبی اکرمؐ کی زندگی بڑی عسرت کی زندگی تھی

عزیزانِ من! اب سوال یہ ہے کہ اس سے پہلے گھر کا نقشہ کیا تھا؟ وہ جو کہا جاتا ہے وہ صحیح لگتا ہے کہ کئی کئی دن تو وہاں چولہا بھی نہیں جلتا تھا، خالی دودھ اور کھجوروں پہ ہی گزارہ ہو جاتا تھا۔ اس زمانے میں ابھی شروع میں بہرحال ایک سلطنت کے سربراہ نہ سہی، نبی اکرمﷺ ایک اتنی بڑی جماعت کے امیر اور امام ہی نہیں، بلکہ رسول تھے۔ اگر چاہتے تو اس زمانے میں بھی بڑی خوشحالی کی زندگی بسر کر سکتے تھے لیکن انہوں نے ایسا نہیں چاہا۔ آپؐ کی وہ زندگی بڑی عسرت کی تھی۔

سربراہِ مملکت کی معاشی زندگی

جب ہنگامی حالات ختم ہوئے، مملکت قائم ہوگئی، آپ علیہ السلام سربراہِ مملکت ہو گئے۔ سیدھی سی بات ہے کہ ان بیویوں کے دلوں میں یہ خیال تو پھر پیدا ہوا کہ اللہ کا شکر ہے اب تو حالات بہتر ہو گئے ہیں، اب تو گھر میں کچھ آسودگیاں اور خوشحالیاں آنی چاہئیں، کچھ تو گھر کا نقشہ مزید بدلنا چاہیے لیکن وہاں کیا کیفیت تھی؟ سنیے! وہ مملکت کے سربراہ ہوتے یا مکے میں ایک مسلمان ہوتے، یہاں تو اس دین کا

تقاضا یہ تھا کہ سربراہِ مملکت سب سے کم درجے کی جو زندگی ہوگی وہ بسر کرے گا۔ آپ کو معلوم ہے کہ جب حضرت صدیقِ اکبرؓ (632ء میں) خلیفہ منتخب ہوئے ہیں تو سربراہِ مملکت کے وظیفے کا سوال آیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں تو یہ سوال نہیں اٹھا تھا کہ سربراہِ مملکت کا وظیفہ کیا مقرر کیا جائے کیونکہ حضور ﷺ نے خود اپنے اوپر یہ چیز طاری کر لی تھی کہ جب تک ہر فردِ مملکتِ اسلامیہ رات کو کھا کر نہ سوئے گا رسول کھانا نہیں کھا سکتا۔

حضرت ابوبکرؓ کی خلافت حضرت عمر فاروقؓ کی زندگی

لیکن جو خلفا تھے اور جب مملکت اتنی زیادہ وسیع ہو گئی تھی تو اس زمانے میں یہ مسئلہ پیش ہوا کہ سربراہِ مملکتِ اسلامیہ کا وظیفہ یا تنخواہ کیا ہوگی۔ مختلف قسم کی تجویزیں پیش ہوئیں۔ آپؓ (حضرت ابوبکر صدیقؓ) نے کہا کہ یہ میرا معاملہ ہے اس کو میں ہی طے کرونگا' میں ہی بتاؤنگا۔ آپؓ نے پوچھا کہا کہ مدینے میں ایک مزدور کی روزانہ اجرت کتنی ہے؟ بتایا گیا کہ اتنی ہے۔ کہا کہ سربراہِ مملکت کی' صدیقؓ کا' میرا' وظیفہ یہ ہوگا جو اس مزدور کی اجرت ہے۔ کہا کہ کیا اس سے گزارہ ہوگا؟ کہنے لگے کہ بتاؤ' اس کا گزارہ کیسے ہوتا ہے؟ کہا کہ اگر ایسی صورت ہو کہ گزارہ نہ ہو تو کیا کرو گے؟ کہنے لگے کہ میں اس مزدور کی اجرت بڑھا دونگا تاکہ اس کے صدقے میں میرا وظیفہ بڑھ جائے۔

یہ درویشوں کی یا فقیروں کی جماعت نہیں تھی' یہ خانقاہ کے اندر نہیں رہ رہے تھے بلکہ عظیم مملکت کے سربراہ تھے۔ ان کی یہ کیفیت تھی۔

حضرت عمرؓ کے زمانے (634-644/45AD) میں تو اس مملکت کی حدود' حدود فراموش ہو چکی ہوئی تھیں' اتنی عظیم الشان مملکت تھی۔ قیصر و کسریٰ کی مملکتیں بھی ان کے زیرِ نگیں تھیں۔ اس زمانے میں بھی یہ کیفیت تھی کہ جب وہ باہر کا Ambassador (پیغام بر) ملنے کے لیے آیا[1] تو اس نے دیکھا کہ آپؓ جو کی روٹی کھا رہے ہیں۔ اُس نے کہا کہ اب تو اتنا گیہوں باہر سے بھیجا جا رہا ہے تو آپؓ گیہوں کی روٹی کیوں نہیں کھاتے؟ آپؓ نے اس سے کہا تھا کہ کیا تم مجھے یہ یقین دلا سکتے ہو کہ آج مملکت کے ہر فرد کو گیہوں کی روٹی مل رہی ہے؟ اُس نے کہا کہ نہیں! یہ تو یقین نہیں دلا سکتا۔ آپؓ نے کہا کہ مجھے اس کا تو یقین ہے کہ آج ہر فرد کو جو کی روٹی مل رہی ہے' جس دن مجھے یہ یقین ہو جائے گا کہ ہر فرد کو گیہوں کی روٹی ملتی ہے' میں اس دن گیہوں کی روٹی کھا سکتا ہوں۔ یہ تھے معیار۔ میں نے کہا یہ ہے کہ بہرحال بیویاں تھیں' عورتیں تھیں' دل میں اتنا خیال تو ابھرا کہ گھر میں کچھ خوشحالی آ جائے۔ اُنہوں نے خواہش کی ہوگی' بات کی ہوگی کیونکہ میاں بیوی کی بات ہے مگر آپ علیہ السلام نے اسے ہی دہرایا کہ جب تک ہر فردِ مملکتِ اسلامیہ رات کو کھا کر نہ سوئے گا' خدا کا رسول کھانا نہیں کھا سکتا۔

---

[1] یہ حضرت ساریہ رضی اللہ عنہ کا پیغام بر تھا اور ایک روایت میں ہے کہ یہ واقعہ عتبہ بن فرقد کے ساتھ پیش آیا تھا جو کوفہ کے عامل تھے (پرویزؒ: شاہکارِ رسالت' ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)' لاہور' 1987ء

نبی اکرمؐ کا سربراہ مملکت کی حیثیت سے حضرت فاطمہؓ کی خواہش پوری کرنے سے انکار

آپ نے دیکھا کہ عین اس آیت کے (33:28) کے ساتھ کس طرح سے پیچھے سے مضمون ملتا چلا آ رہا ہے۔انہیں وہ مملکت اتنی بڑی حاصل ہو رہی ہے کہ ان کی زمینیں' ان کے اموال' ان کی سلطنتیں' وہ تمام تمہارے زیرِ نگیں آ گئیں۔اور ادھر گھر کے اندر یہ سوال پیدا ہوا کہ اب تو آپؐ اتنی بڑی مملکت کے سربراہ ہو گئے ہیں' اب تو گھر میں چولہا جلنا چاہیے' کچھ تو آسودگی ہونی چاہیے۔کہا کہ سن رکھو! سوال اس کا نہیں ہے کہ پہلے کچھ تھا یا نہیں اور اب اتنا کچھ مل گیا ہے۔سوال زندگی کے نصب العین اور نہج کا ہے۔اتنی بڑی مملکت تو مجھے ملی ہے' اس کے ساتھ ہی اتنی کثرت سے غریبوں کی ذمہ داریاں بھی تو میرے سر کے اوپر عائد ہو جاتی ہیں۔عزیزانِ من! سنیے! جب بیٹیؓ (حضرت فاطمہؓ) نے کہا تھا کہ ابا جان! اب تو مملکت مل گئی ہے' چکی پیستے پیستے ہاتھوں میں چھالے پڑ جاتے ہیں تو کوئی ملازمہ دے دیجیے۔کہا تھا کہ بیٹی! جب میں دیکھونگا کہ مملکت کی کوئی عورت بھی چکی خود نہیں پیستی' اس دن' اے فاطمہؓ! تمہیں میں ملازمہ دونگا۔ آپ ﷺ نے کہا کہ یہاں بات یہ نہیں ہے کہ مملکت اتنی بڑی مل گئی ہے اور میں سربراہ بن گیا اور اب تو خوشحالی نصیب ہو گئی ہے بات نصب العین کی ہے۔میری زندگی تو یہی رہنی ہے۔جب تک اس پورے کے پورے معاشرہ کا جو معیار ہے وہ اونچا نہ ہو جائے گا تو ان سب سے نیچے گزارے کا میرا معیار ہوگا۔

بات تو نصب العین کی تھی نہ کہ معاشی حالات کی

یہ ہے میری زندگی' یہ ہے میرا نصب العین حیات' یہی یہاں رہے گا۔وہ جو لوگوں کو Protection (تحفظ) دینے کی ضرورت تھی جس کی وجہ سے تم یہاں آئی تھیں' اب اس کی ضرورت نہیں' وہ ہنگامہ ختم ہو گیا ہے۔اب یہ سن لو' دونوں چیزیں تمہارے سامنے ہیں: یا نبی کے گھرانے کے اندر رہتے ہوئے یہ زندگی یا اگر وہ زندگی بسر کرنی ہے تو بڑی آسانی سے میں تمہیں رخصت کیے دیتا ہوں۔کچھ ساتھ بھی دیدیتا ہوں اور نہایت حسن کارانہ انداز سے رخصت کرتا ہوں۔اگر وہ دنیاوی زیب وزینت کی' آسودگی کی' خوشحالی کی' زندگی بسر کرنی ہے تو آج ہی طے کر لیں کہ یہاں وہ نہیں میسر ہو سکے گی۔تم فیصلہ کر لو: نبی ﷺ کے گھر کی زندگی اس عسرت کے ساتھ یا یہاں سے باہر جا کر آسودگی کی زندگی۔جو بھی تم چاہو فیصلہ کر لو۔اور کہا ہے کہ پوری کی پوری ازواجِ مطہراتؓ کی طرف سے یہ جواب ملا تھا کہ آپؐ نے یہ کیا فرمادیا کہ نبی کے گھر کو چھوڑ کر باہر کی زندگی میں چلی جائیں' وہاں تو اگر جنت کی زندگی بھی ملے تو قبول نہیں ہے۔

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر
اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ مرے اس دعا کے بعد

ایک بھی ان میں سے نہیں تھی جس نے کہا ہو کہ میں باہر جاتی ہوں۔

دنیا بھر کی کامیابیوں کا راز گھریلو زندگی کے سکون میں تھا

عزیزانِ من! یہ تھا خاوند کا بیویوں کے ساتھ سلوک۔ خدا کے حکم سے اجازت دی جا رہی ہے' کہا یہ جا رہا ہے کہ کوئی ناراضگی کی بات نہیں ہے۔ میں تمہیں رخصت کرتا ہوں' کچھ ساز و سامان بھی ساتھ دیتا ہوں تاکہ جب تک تمہارا اور کہیں انتظام نہ ہو جائے' میں تمہیں بڑی خوبصورتی سے روانہ کرتا ہوں' میں اجازت دیتا ہوں کہ ان دونوں میں سے اپنے لیے تم خود منتخب کرلو کہ کونسا طریقِ زندگی تم چاہتی ہو۔ یہ تھی گھر کی زندگی۔ آپ نے سمجھ لیا کہ پھر باہر یہ سب کچھ کیسے کیا جاتا تھا کیونکہ گھر کی زندگی یہ تھی۔ کہا کہ **وَ اِنۡ كُنۡتُنَّ تُرِدۡنَ اللّٰهَ وَ رَسُوۡلَهٗ وَ الدَّارَ الۡاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلۡمُحۡسِنٰتِ مِنۡكُنَّ اَجۡرًا عَظِيۡمًا** (33:29) اور اگر خدا اور اس کا رسول چاہتی ہو' اور دارالآخرت چاہتی ہو' تمہاری مستقبل پہ نگاہ ہے' تو اللہ کی طرف سے بہت کچھ ملے گا لیکن اسی لائن میں بہت کچھ ملے گا۔ فیصلہ تمہارے لیے ہے جو فیصلہ کرنا چاہو۔ میں نے عرض کیا ہے کہ تاریخ اس کی گواہ ہے کہ کسی ایک بیوی نے بھی وہاں سے نہیں جانا چاہا بلکہ ندامت ہوئی کہ ہمیں افسوس ہے کہ ہم نے یہ مطالبہ پیش کر کے آپ ﷺ کے دل کو کچھ اذیت پہنچائی ہے۔ کہا کہ اتنی بات ہی نہیں ہے بلکہ اور بھی سن لو! یہاں یہی سوال نہیں ہے کہ وہ اتنی بڑی آسودگی حاصل نہیں ہوگی جو باہر کی ہوگی' ہوسکتا ہے کہ اس معاشرے میں تمہیں اور لوگوں کے گھروں میں اس سے بہتر معیارِ زیست نظر آئے لیکن میں نے کہا ہے کہ میرا معیارِ زیست وہ ہے جو غریب سے غریب تر فرد کا ہے۔ آگے بڑھو اور اپنی ذمہ داریوں پہ نگاہ رکھو۔

نبوت کے گھرانے کی زندگی کے خدوخال پورے معاشرے کو متاثر کرتے ہیں

عزیزانِ من! دو آیات آگے ہیں' وہ میں پہلے عرض کردوں۔ کہا کہ **يٰنِسَآءَ النَّبِىِّ لَسۡتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ** (33:32) یاد رکھو! تم دوسری عورتوں جیسی نہیں ہو۔ اُن کی زندگی' اُن کی سیرت و کردار' اُن کی نہج' اُن کی رفتار' گفتار' کردار کا اثر ان کی اپنی ذات تک ہوتا ہے لیکن تمہاری تو ہر نقل و حرکت کا اثر باہر تک جانا ہے۔ اس لیے اس کو بھی ذہن میں رکھو کہ تمہیں کس قدر محتاط رہنا پڑے گا' تمہیں خدا کے قوانین کی اطاعت شدت سے کرنا پڑے گی' تمہیں اپنے اخلاق و کردار و سیرت پہ گہری نگاہ رکھنی پڑے گی۔ اُن کی ایک ذرا سی حرکت اس کے خلاف جائے گی تو کوئی بات نہیں' وہ قابلِ معافی ہوگی لیکن تمہاری ذرا سی جو حرکت ہے' اُس کے نتائج بڑے دوررس ہونگے۔ اس لیے **يٰنِسَآءَ النَّبِىِّ مَنۡ يَّاۡتِ مِنۡكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفۡ لَهَا الۡعَذَابُ ضِعۡفَيۡنِ** (33:30) تم میں سے اگر کسی کے ہاں سے کوئی ناپسندیدہ حرکت بھی ہوئی تو یاد رکھیے! عام عورتوں کو جو اس کی سزا ملے گی تمہیں اس سے دگنی سزا ملے گی۔ فیصلہ کرلو۔ بات صاف

صاف کیے دیتا ہوں کہ تمہاری یہ ذمہ داریاں ہونگی۔ اُدھر صحابہ کرام میں سے دیکھیے کہ حضرت عمرؓ (581-644/45AD) جب باہر کی زندگی میں کوئی قانون نافذ کرنا چاہتے تھے تو پہلے اپنے گھر میں آ کر کہتے تھے کہ یہ قانون کل سے نافذ ہونا ہے' تم آج ہی سے اس کے مطابق اپنے گھر میں تبدیلی کرلو۔ آپؐ نے کہا کہ تم عام عورتوں جیسی عورتیں نہیں ہو۔

حضور نبی اکرمؐ کی زندگی بھر کے خدوخال اور سیرت وکردار نوعِ انسانی کے لیے اسوۂ حسنہ ہیں

قرآن نے تو رسول اللہ ﷺ کے متعلق کہا ہے کہ ان کی زندگی تمہارے لیے اسوہ ہے۔ اب اسی سورۃ میں بات شروع ہوئی تھی اور اسی میں' میں یہ عرض کردوں کہ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (33:21) حضور ﷺ کی زندگی سیرتِ طیبہ ﷺ قیامت تک کے لیے ماڈل ہے۔ یاد رکھیے! حضور ﷺ کی سیرت وکردار اور اخلاق کی بلندی اور پاکیزگی' یہ ہے وہ ماڈل۔ عام معاشرت کے اندر جیسے حضور ﷺ رہتے سہتے تھے' جس طرح سے لباس پہنتے تھے' گھر بناتے تھے' اٹھتے بیٹھتے تھے' سواری ایک قسم کی تھی' وہ یہ چیز نہیں ہے کہ وہی قیامت تک کے لیے آپ کے ہاں ماڈل ہے بلکہ حضور ﷺ کی سیرت وکردار ماڈل ہے۔ اور اصل چیز تو ہے ہی سیرت وکردار۔ اس ماڈل ہونے کے اندر رسول اللہ ﷺ کے گھر کے اندر کی زندگی بھی مومنات کے لیے ماڈل تھی۔ کہا کہ یاد رکھو! تم میں سے اگر کسی سے اس قسم کی کوئی نازیبا حرکت سرزد ہوگئی تو تمہیں Warn (تنبیہ) کیے دیتا ہوں کہ تمہیں دوگنی سزا ملے گی۔ وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا (33:30) ہمارے لیے ایسا کرنا کچھ مشکل نہیں ہوگا۔ قانونِ خداوندی میں پہلے سے اس ضابطے کے اندر یہ شق رکھ دی جائے گی۔

اصل میں حقیقی جوہر تو کسی چیز کو بطیّب خاطر قبول کرنا ہوتا ہے

کہا کہ وَ مَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَاۤ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ ۙ وَ اَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا (33:31) اور جو تم میں سے قانونِ خداوندی کی پوری پوری اطاعت کرے گی' اس گھر کو ماڈل بنانے کے لیے اپنی صلاحیتوں کو اس کے مطابق صرف کرے گی' تو خدا کی طرف سے تمہیں اس کا صلہ بھی دگنا ملے گا کہ تم نے اپنی ذات کے اوپر کتنی پابندیاں عائد کر کے' اس قسم کا نقشہ گھر کے اندر رکھا۔ اپنی کتنی معصوم تمناؤں کو قربان کردیا۔ لیکن یاد رکھو! تمہیں عزت اور توقیر کے ساتھ سامان زیست عطا ہوگا۔ باقی رہی یہ چیز کہ صاحب! ذرا اچھا کپڑا ملنا چاہیے' کچھ تھوڑا سا پیٹ بھر کر کھانے کو ملنا چاہیے' یہ کوئی ایسی خواہش یا آرزو نہیں تھی' یہ کوئی ایسا مطالبہ نہیں تھا جو قابلِ گرفت ہوتا لیکن یہ نہیں ہے کہ ان پہ جبر کیا گیا ہے کہ ان کو زبردستی ایسا کرنا ہوگا بلکہ ان کو اجازت دی جا رہی ہے۔ انہوںؓ نے بطیّب خاطر اس زندگی کو جو قبول کیا ہے تو یہ بہت بڑی چیز تھی۔ کہا کہ تم اس طرح سے اگر یہ قبول کرتی ہو تو اللہ کے ہاں اس کے

میزان میں اس کا جو وزن ہے وہ اور زیادہ بھاری ہو جائے گا کہ اتنی بڑی جتنی بھی کشش اور جاذبیتیں (Attractions) آ رہی ہیں ان کا مقابلہ کرتے ہوئے بطیّب خاطر تم اس زندگی کو قبول کر رہی ہو۔ اللہ کے ہاں سے تمہیں اجرِ عظیم ملے گا گو کہ تمہارا معیار کچھ اس قسم کا ہے کہ تمہیں کچھ زیادہ قیمتی کپڑے ملیں، کچھ بہتر کھانے کو ملے۔

سونے چاندی کے معیار کی بجائے عزت و تکریم کا معیار، رزق کریم کا معیار

کہنے لگے کہ معیار ذرا سا بدل دو، معیار یہ رکھو کہ **رِزۡقًا کَرِیۡمًا** (33:31) ایسی روٹی ملے جس میں عزت باقی رہے۔ جو کی روٹی کیوں نہ ملے لیکن عزت باقی رہے۔ آپ نے دیکھا کہ ایک لفظ میں کیسے معیار بدل دیا۔ اپنے دل میں وہ معیار نہ رکھو۔ خدا سے مانگو تو یہ مانگو کہ باری تعالیٰ! سامانِ زیست دے تو ایسا دے جس میں عزت برقرار رہے:

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

قرآن نے مومنین کے لیے رزق کریم کہا ہے۔ کہا کہ **یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسۡتُنَّ کَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ** (33:32) یاد رکھو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو جن کے اعمال کا اثر ان کی اپنی ذات تک محدود رہتا ہے، دوسرے ان سے متاثر نہیں ہوتے، تمہاری زندگی کا اثر تو سارے معاشرے پر پڑے گا۔ یہ تو وہی ہے جو میں نے پہلے کہا تھا۔ آگے کہا کہ **اِنِ اتَّقَیۡتُنَّ فَلَا تَخۡضَعۡنَ بِالۡقَوۡلِ فَیَطۡمَعَ الَّذِیۡ فِیۡ قَلۡبِہٖ مَرَضٌ وَّ قُلۡنَ قَوۡلًا مَّعۡرُوۡفًا** (33:32) تمہیں بتاتا چلا جاؤں کہ یہ زندگی کس قسم کی ہوگی، تمہیں کیا کیا پابندیاں اپنے اوپر بطیّب خاطر عائد کرنا ہونگی۔ سنو! اگر تمہیں کسی غیر محرم سے بات کرنی ہو تو اپنی آواز میں ایسی نرمی اور لوچ نہ پیدا ہونے دو کہ اس سے، ایسے شخص کے دل میں جو برے خیالات لیے ہو غلط آرزوئیں پیدا ہو جائیں۔ اس سے قاعدے کے مطابق عمدہ انداز سے بات کرو۔

غیر مردوں سے بات کرنے کا معیار یا طریق سنجیدہ ہونا چاہیے جیسے باوقار ماں بیٹے سے بات کرتی ہے

عزیزانِ من! اس آیت (33:32) میں کہا ہے کہ گھروں کے اندر اور لوگ آئیں گے اور انہیں غیر مردوں سے باتیں کرنا ہونگی۔ مومن عورتیں اس بات کا لحاظ رکھیں گی لیکن تمہیں خاص طور پہ بتایا جاتا ہے کہ جب کسی سے بات کرنا تو جو عام اندازِ نسوانیت ہوتا ہے کہ آواز کے اندر ذرا نرمی ہو اور لوچ ہو تو تمہیں یہ انداز بھی اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ جو اجنبی، جس سے تم بات کر رہی ہو، اس کے دل میں کچھ مرض ہو اور وہ اس سے کچھ اور اثر لے لے۔ اسی لیے ان کو مائیں کہا ہے۔ جیسے باوقار ماں بیٹے سے بات کرتی ہے تو اس انداز سے بات کرنا۔

عزیزانِ من! دیکھیے کہ کن کن چیزوں کے اوپر پابندیاں عائد کی جا رہی ہیں کیونکہ اس گھرانے نے ماڈل بننا تھا۔ کہا کہ بات کے اندر بھی یہ احتیاط برتنا کہ اس میں عام عورتوں جیسی لوچ اور لچک نہیں ہونی چاہیے' نرمی نہیں ہونی چاہیے۔ بس یوں بات کرو جیسے ماں بیٹے سے بات کرتی ہے۔ کہا کہ **وَ قَرْنَ فِیْ بُیُوْتِكُنَّ وَ لَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُوْلٰی** (33:33) اور تم نہایت سنجیدگی اور وقار سے اپنے گھروں میں رہو۔ تم سے کوئی چھچھورے پن کی بات سرزد نہ ہو اور جب تم باہر جاؤ تو اپنی زینت کی نمود و نمائش نہ کرو جیسا کہ قرآن سے پہلے عہد جاہلیت میں عورتیں کیا کرتی تھیں۔ میں یہاں پردے کے متعلق گفتگو نہیں کرنا چاہتا کیونکہ یہ موضوع بہت جگہ پہلے آ چکا ہے اور پھر بھی آئے گا۔ یہاں ایک چیز ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ **وَ قَرْنَ فِیْ بُیُوْتِكُنَّ** (33:33) یہ رسول اللہ ﷺ کی ازواج سے کہا گیا تھا کہ اپنے گھروں کے اندر بند رہا کرو۔

عزیزانِ من! ایک لفظ **قَرْنَ** کا ترجمہ یوں کیا اور کہا کہ جب رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات سے کہا گیا تھا کہ تم گھر کے اندر رہا کرو تو تم کیسے گھر سے باہر رہ سکتی ہو۔ یہ سند دی جاتی ہے اور یہ دلیل دی جاتی ہے۔ اور ساتھ ہی ہمیں یہاں تک بھی بتایا جاتا ہے کہ یہ (عورتیں) جنگوں میں بھی شریک ہوا کرتی تھیں اور جنگِ جمل میں تو ہمیں بتایا جاتا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ Lead (امامت) کر رہی تھیں۔ اور ایک طرف یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان کو حکم یہ تھا کہ گھروں کے اندر بند رہا کرو۔

نمودِ حسن کا جذبہ انسان کے دل میں جذبات کا ہیجان پیدا کرتا ہے

عزیزانِ من! گھروں کے اندر بند رکھنے کا کوئی حکم نہیں ہے۔ عورت تو آبادی کا نصف حصہ ہے۔ یہ چیز' میں نے کہا ہے کہ میں پردے کے ضمن میں عرض کرونگا۔ یہ پردہ نہیں ہے قرآن کی رو سے جو کچھ بھی ہے۔ کہا ہے کہ **وَ قَرْنَ فِیْ بُیُوْتِكُنَّ** (33:33) یہ جو ''قرن'' ہے یہ تو ''وقر'' ہے۔ پہلے یہ کہا ہے کہ گھر میں اس انداز سے رہو کہ اجنبی سے بات بھی کرنی پڑے تو بالکل ایک سنجیدہ خاتون کی طرح کرو جیسے ماں بیٹے سے بات کرتی ہے' اس طرح سے بات کیا کرو۔ کہا کہ اپنے گھر میں چھچھورا پن نہ آنے دیا کرو' وقار کے ساتھ رہا کرو۔ یہ ''قرن'' کا لفظ ہی ''وقار'' ہے۔ ''باوقار انداز سے خاتونِ خانہ کی حیثیت سے رہو''۔ کہاں وقار کے ساتھ رہنا اور کہاں گھر کے اندر ایک تہ خانے کی طرح رہنا' یہ رہائش کے دو متضاد طریق کار ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ باوقار طریق سے رہو۔ اگلی بات یہ کہی ہے کہ **وَ لَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُوْلٰی** (33:33)۔ اسلام سے پہلے کا جو معاشرہ تھا' اُس کے اندر وہ عورتیں نہایت بھڑکیلی زندگی بسر کیا کرتی تھیں' ان کے اندر چھچھورا پن ہوتا تھا' نمود و نمائش ہوا کرتی تھی۔ یہاں لفظ **تَبَرُّجَ** ہے۔ بیٹیاں اور بہنیں بیٹھی ہیں لیکن اس لفظ کے متعلق کہنے کی بات ہے۔ اس کا مادہ (Root) تو ''ب ر ج'' ہے جس سے ''برج'' نکلا ہے' معنی ہیں ''نمود یا نمائش یا ابھار''۔ کہا

کہ تم میں نمودِ حسن کا یہ جذبہ نہیں پیدا ہونا چاہیے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ عورت اس قسم کا نمودِ حسن اور نمائش کا جذبہ ابھار کر اپنے آپ کو سامنے لائے۔

یہیں سے وہ لفظ ہے جس سے ہمارے ہاں دودھ بلویا جاتا ہے۔ وہ ہے جسے دودھ بلونے والی ''بلونی'' کہتے ہیں ''ساڈے اونھوں مدھانی کہندے نیں'' ❶۔ وہ اس زور سے دودھ کے اندر اضطراب پیدا کرتی تھی کہ دودھ میں لہریں پیدا ہوتی تھیں، جبھی تو مکھن اوپر آتا تھا۔ یہیں سے انہوں نے یہ جو لفظ ''وقـرن'' تھا، وہ لیا۔ وہ اس ''بلونے'' کو یا ''مدھانی'' کو ''وقرن'' کہتے تھے۔ اِس ایک ہی لفظ سے وہ کہتے تھے کہ عورت کا نمودِ حسن کا جذبہ، مرد کے دل کے جذبات میں وہ کچھ کرتا ہے ''جو مدھانی دودھ نال کردی اے'' ❷۔ کیا بات ہے اس قوم کی! اس سے بہتر اور کوئی تشبیہ نہیں ہوسکتی۔ یہ جذبات کے اندر تلاطم انگیزیاں پیدا کر دیتی ہے۔ وہ چیزیں جو دودھ کے اندر بالکل چھپی ہوئی ہوتی ہیں بلکہ اس کے اندر محلول ہوتی ہیں، حل ہوئی ہوتی ہیں، جسے آپ مکھن کہتے ہیں، اس سے اس قسم کی اضطراب انگیزیاں ہوتی ہیں کہ وہ اُبھر کر سامنے آ جاتا ہے۔ یہ تھی قوم، یہ تھی اس کی زبان۔ یہ ہے وہ لفظ جو قرآن لایا ہے کہ دو لفظوں میں ہم یہ کہہ دینا چاہتے ہیں کہ تم اپنے گھروں کے اندر وقار سے رہو۔ وہ نمود و نمائشِ حسن کا جذبہ کبھی تمہارے دلوں کے اندر نہیں آنا چاہیے کہ جس سے مردوں کی کیفیت یہ ہو جایا کرتی ہے۔ عزیزانِ من! اس میں بات یہ نہیں ہے کہ جیسا کہا جاتا ہے کہ مردوں کی حفاظتِ عصمت کے لیے عورتوں سے کہا کہ تم یہ کچھ بن کر باہر نہ نکلا کرو تاکہ ان کی عصمت محفوظ رہا کرے ''تے اے فٹے منہ والی گل اے'' ❸۔ یعنی یہ آپ اپنی عصمت کی حفاظت نہیں کر سکتے تمہیں کہا جاتا ہے کہ ان کی حالت پہ رحم کیا کرو اور اس طرح سے نمودِ حسن سے باز آ جایا کرو تاکہ ان کی عصمت کی حفاظت رہے۔ ان مردوں کے اوپر کیا کریڈٹ ہے کہ وجہِ کشش ہی کوئی چیز ان کے سامنے نہ آئے اور یہ پھر کہیں کہ صاحب! دیکھیے ہم کسی چیز کی طرف نکل کر گئے ہی نہیں۔ یہ بات بڑی گہری ہے جو قرآن نے کہا ہے کہ تم میں نمودِ حسن کا جذبہ نہیں ہونا چاہیے۔

زندگی کی آماجگاہ میں مرد اور عورت دونوں کا یکساں مقام ہے

عزیزانِ من! اسی کے آگے وہ آیت (33:35) آتی ہے جس میں اس نے کہا ہے کہ مرد اور عورت اس زندگی کی آماجگاہ میں دوش بدوش چلنے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ جو کچھ مرد کر سکتے ہیں وہی کچھ عورت کر سکتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ عورت کے دل میں یہ

---

❶ ہمارے ہاں اسے ''مدھانی'' کہتے ہیں۔

❷ جو ''مدھانی'' (بلونی) دودھ کے ساتھ کرتی ہے۔

❸ یہ تف لعنت تجھ پر' والی بات ہے۔

جذبہ پتہ نہیں کب سے آیا ہوا ہے؟ یہ آیا ہوا اس زمانے سے ہے جب سے اماں حوا اور بابا آدم کا قصہ تورات میں آیا۔ اماں حوا کو پیدا ہی اس لیے کیا گیا تھا کہ بابا آدم کو تنہا پیدا کیا تھا اس لیے وہ اُداس ہو گیا تھا۔ اس کی اُداسی مٹانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی پسلی میں سے ایک عورت کو نکالا اور کہا گیا کہ لو! اس کھلونے سے کھیلو۔ یعنی عورت کی پیدائش مقصود بالذات نہیں' اس کے اپنے لیے نہیں بلکہ مرد کی اداسی اور تنہائی کو دور کرنے کا ایک ذریعہ بنی ہے۔

قدرت نے عورت کو مرد کے لیے کوئی کھلونا نہیں بنایا' یہ مردوں کا کوئی بہلاوا نہیں ہے

اب جو عورت کے دل میں یہ بات پیدا کی کہ تم تو مرد کو بہلانے کا ایک ذریعہ بنی ہو تو اس نے اپنے اندر یہ بات پیدا کر لی کہ میں زیادہ سے زیادہ کیسے اس کو بہلا سکتی ہوں۔ یہ ہے جذبہ نمودِ حسن کا کہ میں زیادہ سے زیادہ کیسے Attractive (پُرکشش) بن سکتی ہوں۔ میں نے کہا تھا کہ مغرب کی جولڑکیاں بن سنور کر' میک اپ کرنے کے بعد' آئینے کے سامنے' ماں سے پوچھتی ہیں کہ!

Mamai am I presentable?

یعنی امّاں! کیا میں ایسی ہو گئی ہوں کہ مردوں کو اپنی طرف کھینچوں۔ قرآن نے اس کے اس جذبے کی تردید کی کہ تُو مردوں کو بہلانے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے بلکہ تیرا اپنا تشخص ہے' اپنی Identity (شناخت) ہے' اپنی Personality (شخصیت) ہے۔ وہ تمام صفات اپنے اندر پیدا کرو جو مرد پیدا کرتے ہیں اور اس طرح سے تم دنیا کے اندر پہچانی جاؤ' نہ کہ اس طرح سے کہ مردوں کو بہلانے کے لیے ایک کھلونا ہو۔ جتنا زیادہ Attractive (جاذبِ نگاہ) کھلونا ہوگا' بچہ اسی تیزی سے اس کی طرف بھاگ کر جائے گا۔ کہا کہ تمہارا مقام یہ نہیں ہے۔

قرآنِ حکیم کی نظر میں عورت کا مقام

عورت سے کہا گیا ہے کہ تمہارا مقام یہ نہیں ہے بلکہ تمہارا برابر کا مقام ہے۔ اسی طرح سے اپنی عزت کراؤ جس طرح سے مرد اپنے کردار کی بنا پر اپنی عزت کراتا ہے۔ قرآن نے نمودِ حسن کے جذبے کی جڑ کاٹ دی۔ عورت کو مساواتِ انسانیہ کا مقام دیدیا۔ اس لیے یہ کہا کہ گھروں میں رہتے ہوئے چھچھوراپن نہیں آنا چاہیے' وقار کے ساتھ رہو۔ یہ جو نمودِ حسن کا جذبہ ہے جس سے عورت اپنے آپ کو مقصود بالذات نہیں سمجھتی بلکہ کسی دوسرے کے جذبات کی تسکین کا ذریعہ سمجھتی ہے' یہ جذبہ قطعاً اپنے دل کے اندر نہ آنے دو۔ آگے کہا کہ **وَاَقِمْنَ الصَّلٰوۃَ وَ اٰتِیْنَ الزَّکٰوۃَ وَ اَطِعْنَ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ** (33:33)۔ تم نظامِ صلوٰۃ قائم کرو۔ افرادِ امت کی' جو تمہارے بیٹوں کی مانند ہیں' صلاحیتوں کی نشوونما کا ذریعہ بنتی چلی جاؤ۔

زکوٰۃ کا مروجہ مفہوم تو سنت رسول پر پورا ہی نہیں اترتا

کہا ہے کہ اٰتِیْنَ الزَّکٰوۃَ (33:33)۔دوسرے مقام پہ میں عرض کرونگا کہ اگر زکوٰۃ سے یہ مفہوم لیا جائے جو یہ لیتے ہیں تو اس گھر کے اندر تو پیسے ہی اتنے نہیں تھے' انہوں نے زکوٰۃ کہاں سے دینی تھی۔ یہ خود بتاتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ساری عمر زکوٰۃ نہیں دی۔انہوں نے نہیں دی تھی تو ان بیویوں کے پاس کہاں سے کچھ آیا تھا جو بیچاری اچھا کپڑا مانگ رہی تھیں تو اس کا بھی جواب مل گیا۔ اٰتِیْنَ الزَّکٰوۃَ کے اگر یہ معنی ہیں جو یہ لیتے ہیں کہ اتنا روپیہ سال بھر جمع ہو جائے تو اتنا اس میں سے نکالو۔ وہاں تو صورت یہ تھی کہ اس گھر کے اندر شام کو پکانے کے لیے آٹا نہیں ہوتا تھا' تو کیا وہاں سال بھر دولت جمع ہوتی ہوگی جس کی زکوٰۃ دینے کا حکم آیا ہے؟ آپ نے دیکھا کہ زکوٰۃ کا مفہوم کیسے منہ بول رہا ہے۔ میں یہ بات کسی اور جگہ وضاحت سے عرض کرونگا۔ کہا کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا (33:33)۔خدا چاہتا یہ ہے' تمہیں اس لیے ہدایات دی جارہی ہیں کہ نبی کا گھرانہ' افرادِ معاشرہ کے لیے نمونہ بنے۔ اس لیے اس گھر کے افراد میں کسی قسم کی قلب ونظر کی آلودگی' اضطراب انگیز شکوک وشبہات یا دوسری کوئی ایسی چیز نہیں رہنی چاہیے جو ان کی نشوونما کے راستے میں حائل ہو۔ یہ گھر پاکیزہ اور بلند زندگی کا نمونہ ہونا چاہیے۔ اس لیے کہا کہ اپنے آپ کے اوپر یہ پابندیاں عائد کرو۔ پہلے تو قرآنِ کریم نے ازواج النبی سے یہ کہا تھا کہ تم رہنا چاہتی ہو تو اس طرح سے رہا جائے گا ورنہ جانا چاہتی ہو تو چلی جاؤ (33:28)

ازواج النبیؐ کے بعد نسآء النبی کو ''رجس'' یعنی شکوک وشبہات سے دُور رہنے کا حکم

عزیزانِ من! اس کے بعد نِسَآءَ النَّبِیِّ (33:32) آیا ہے یعنی گھر کے اندر جتنی عورتیں ہیں' سب سے یہ کہا جارہا ہے۔ یہ ہدایات اس گھر کے اندر رہنے والی خواتین' نِسَآءَ النَّبِیِّ (33:32)' اَھْلَ الْبَیْتِ (33:33) کے لیے ہیں۔ یہ فرق بڑا ملحوظ رکھنے والا ہے۔ وہ ازواج النبی کے متعلق بات تھی کہ میرے عقد میں رہنا چاہتی ہو یا جانا چاہتی ہو۔ یہ ساری ہدایات جو دی جارہی ہیں یہاں نسآء النبی کہا گیا ہے۔ یعنی نبی کے گھر کے اندر جتنی عورتیں ہیں' بیٹیاں ہیں' حضور ﷺ کی پھوپھیاں ہیں' ملازمہ ہیں' بیویاں ہیں' سب اس میں آجاتی ہیں۔ ''اے اس گھر میں رہنے والی خواتین! خدا چاہتا یہ ہے کہ تم سے ''رجس'' کو دور کردیا جائے۔ یہ ''رجس'' کیا چیز ہے؟ اس کے ترجمے ہمارے ہاں یہ کیے جاتے ہیں کہ ''ناپاکی کو دور کرے اور تمہیں پاک اور صاف کرے''۔ مجھے تو یہ لفظ بولتے ہوئے بھی تلخی آتی ہے۔ ''رجس'' تو ہر قسم کے شکوک وشبہات کو کہتے ہیں' ہر قسم کی ایسی چیزیں جو اضطراب پیدا کریں' ہر اس رکاوٹ کو جو انسانیت کی صلاحیتوں کی نشوونما کے راستے میں حائل ہو جائے۔ ذرا عربوں سے پوچھ کر تو دیکھو کہ وہ اس کے معنی کیا لیتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ ہم یہ

پابندیاں اس لیے تم پہ عائد کر رہے ہیں یا کہہ رہے ہیں کہ اپنے آپ پہ عائد کرو تا کہ تمہارے قلوب تمام شکوک وشبہات سے بالا تر ہو جائیں' کوئی اضطراب انگیز بات اس کے اندر نہ آئے' کوئی ایسی رکاوٹ یہاں پیدا نہ ہو جو تمہاری انسانی صلاحیتوں کی نشو ونما کے راستے میں رکاوٹ بن جائے۔ہم یہ چیزیں پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

تطہیر کا مفہوم قلب ونگاہ کی پاکیزگی ہوتا ہے

کہا کہ **وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا** (33:33) ہم تمہارے قلب ونگاہ کی پاکیزگی چاہتے ہیں۔تطہیر کے معنٰی ''دور لے جانا بھی ہے'' تاکہ وہ جو لوگوں کے اعتراضات اور الزامات ہوتے ہیں تمہاری زندگی اس سے بلند وبالا ہو جائے۔میں نے کہا ہے کہ یہ جو تطہیر ہے یعنی قلب ونگاہ کی پاکیزگی' اس کے لیے ریفرنسز تو بہت ہیں لیکن ایک ریفرنس کم ازکم آپ لے لیجیے۔کہا کہ **أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ أَنْ يُطَهِّرَ قُلُوبَهُمْ** (5:41) ۔دیکھا قرآن کیسے بات کو واضح کر دیتا ہے۔تطہیر قلب ہے۔ان پابندیوں سے مقصد یہ ہے کہ تمہارے قلب ونگاہ میں پاکیزگی پیدا ہو جائے' تمہارے دلوں میں کسی قسم کا کوئی شک وشبہ نہ رہے' کوئی اضطراب انگیز بات نہ ہو' کوئی ایسے موانعات نہ ہوں جو تمہاری ذات کی' اخلاق کی' نشو ونما کے راستے میں حائل ہوتے ہوں۔یہ احکام ہم نے اس لیے تمہیں دیئے ہیں کہ تم اس قسم کی زندگی بسر کرو۔اور پھر آگے اور بات ہوئی۔کہا کہ **وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيفًا خَبِيرًا** (33:34) باتیں ہم نے کچھ کھل کے نہیں کیں' اشارتاً کچھ لطیف انداز سے' یہ ساری باتیں تم سے کہہ دی ہیں۔یاد رکھو! زیادہ تشریح چاہتی ہو تو تمہارے گھروں کے اندر قرآن اور قرآن کی حکمت کی روز تلاوت ہوتی ہے۔زیادہ تشریح وہاں موجود ہے' وہاں سے لے لو' ہم تو خبردار ہیں' ہمیں سب بات معلوم ہے لیکن بات ذرا ہم لطافت سے کر رہے ہیں۔تشریح تمہیں وہاں مل جائے گی۔نسآء النبی سے یہ کچھ کہا ہے۔اور جو میں نے عرض کیا کہ نمودِ حسن کا جذبہ عورت کے دل سے نکالنے سے مقصد یہ تھا کہ اسے مرد کے شانہ بشانہ چلایا جائے۔یہ چیز اگلی آیت میں آئی ہے۔

عزیزانِ من! وقت ہو گیا ہے۔ہم سورۃ الاحزاب کی آیت 34 تک آ گئے۔35ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

❀❀............❀❀............❀❀

پانچواں باب: **الاحزاب** (آیات 35 تا 42)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج جنوری 1980ء کی 11 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الاحزاب کی آیت 35 سے ہو رہا ہے: (33:35)۔

باہر کی زندگی گھر کی زندگی کا عکس ہوتی ہے

جیسا کہ آپ کو یاد ہو گا سابقہ آیات میں موضوع یہ تھا کہ جب تک گھر کی زندگی کے اندر سکون' طمانیت' سکینت' مودّت اور رحمت نہیں ہو گی' انسان باہر کی زندگی میں اطمینانِ قلب سے کوئی کام نہیں کر سکے گا۔ اور یہ بات تھی جو میں نے عرض کیا تھا کہ جنگِ احزاب

کا واقعہ تھا' بڑی زلزلہ انگیز جنگ تھی اور اس جنگ کی داستان کے آخر میں جانے کے بعد اگلی ہی جو آیت تھی وہ خود نبی اکرم ﷺ کو نمونہ قرار دے کر گھر کی زندگی کے متعلق میاں بیوی کے تعلقات کے متعلق بات شروع ہوئی تھی۔ اور میں نے عرض کیا تھا کہ سطحی طور پر دیکھنے والوں کو تو ان میں کوئی ربط نظر نہیں آتا لیکن اس میں تو بڑا گہرا ربط ہے۔ قرآنِ کریم گھر کے اندر کی زندگی کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ وہ بتاتا ہے کہ وہاں کا سکون اور مودّت کی جو زندگی ہے وہ انسان کے باہر کی زندگی کے اوپر بڑی اثر انداز ہوتی ہے۔ اُسی سلسلے میں یہ ذکر آ گیا تھا۔

نمائش اور زیبائش میں ایک بنیادی فرق ہے

قرآنِ کریم نے عورت سے یہ کہا تھا کہ تم میں ''تبرج'' کا جذبہ نہیں ہونا چاہیے اور میں نے عرض کیا تھا کہ اس کے معنی نمود اور نمائش کے ہیں۔ میں اپنی بیٹیوں اور بہنوں کے لیے اتنا واضح کر دوں کہ نمائش میں اور زیبائش میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم نے تو بڑی تحدّی سے کہا ہے کہ وہ کون ہے جو زینت اور زیبائش کی چیزوں کو حرام قرار دے سکتا ہے لیکن جس چیز سے اس نے روکا ہے وہ یہ چیزیں نہیں ہیں۔ اسے غور سے سمجھ لیجیے۔

عورت کا مردوں کی نظروں میں جاذب بننے کا تصور جہالت پر مبنی ہے

اس نے عورت کو بتایا یہ ہے کہ تیرا مقام کیا ہے۔ یہ جو تیرے ذہن میں بات بٹھا دی گئی ہے' یہ مردوں کی طرف سے بہت بڑی سازش ہے کہ تیرا وجود مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ تُو مرد کے جذبات کی تسکین کا ذریعہ بنائی گئی ہے۔ قرآنِ کریم نے اس باطل کے جذبے اور نظریئے کی تردید کی اور عورت سے کہا ہے کہ یہ بالکل غلط ہے اور بہت بڑا فریب ہے جو تجھے دیا گیا ہے کہ تیرا وجود مقصود بالذات نہیں ہے۔ قرآن نے کہا کہ تمہارے اندر یہ جو جذبہ نمود اور نمائش کا ہے اس کی تہہ میں' تیرے تحت الشعور میں' غیر شعوری طور پر' (Unconscisusly)' یہی جذبہ کارفرما ہوتا ہے کہ میں کچھ ایسا بن کر نکلوں کہ مردوں کی نگاہ میں' میں جاذب ہو جاؤں۔ اس نے کہا ہے کہ یہ وہی جذبہ ہوا کہ تُو اپنے وجود کو مقصود بالذات نہیں سمجھتی بلکہ تجھے مردوں کی نگاہ میں جاذب بننا ہے۔ یہ جذبہ بالکل جاہلیت کا ہے۔ اسلام اس جذبے کو ختم کرنے کے لیے آیا ہے۔ وہ بڑی عجیب چیز کہتا ہے۔ ایک طرف تو اُس نے کہا کہ زیبائش اور زینت کو کوئی حرام قرار نہیں دے سکتا۔ دوسری طرف یہ چیز کہی کہ یہ جو ''تبرج'' کا جذبہ تیرے اندر ہے' یہ بڑی غلط چیز ہے۔ اس کے بعد جیسا میں نے عرض کیا تھا اگلی ہی آیت کے اندر قرآنِ کریم نے مردوں اور عورتوں کو زندگی کے ہر گوشے میں ہمدوش چلایا ہے۔ کیا خوب ربط ہے ان آیات کے اندر! عام طور پر یہ قرآنِ کریم میں بھی ہے اور قانون دان حضرات تو جانتے ہیں' یہ قانون کی بھی بنیاد ہوتی ہے کہ جہاں مقصود تو

مرد اور عورت دونوں ہوں لیکن وہ جو قانون دیا جاتا ہے یا جو آگے عبارت ہوتی ہے' اس میں سارے صیغے بھی' ضمیریں بھی' وہ تمام مذکر استعمال ہوتی ہیں۔ میں بھی جب کہونگا کہ میرے ہاں درس سننے کے لیے بہت سے قارئین آتے ہیں' وہ اطمینان سے بیٹھتے ہیں' توجہ سے سنتے ہیں' تو آپ نے دیکھا کہ میں یہ صیغے مذکر کے استعمال کر رہا ہوں حالانکہ یہیں ساتھ ہی تو ہماری بیٹیاں اور بہنیں بھی بیٹھی ہیں۔ وہ الگ الگ نہیں کہا جاتا کہ میرے درس کے اندر مرد آتے ہیں' آرام سے بیٹھتے ہیں' عورتیں آتی ہیں' آرام سے بیٹھتی ہیں۔

قرآنِ حکیم میں مذکر اور مونث صیغوں کے استعمال کا طریق اور عربی زبان کی خصوصیت

یہ ایک اصول ہے اور قانون میں تو یہ پہلے لکھا ہوا ہوتا ہے کہ جہاں جہاں اس قسم کے صیغے آئیں گے یا ضمیریں آئیں گی' وہ ہونگی تو مذکر کی لیکن It includes feminine gender [1]۔ قرآن میں بھی جہاں مومنین کا ذکر آتا ہے تو اس کے معنی مرد اور عوت دونوں ہوتے ہیں لیکن عربی قاعدے کی رو سے تو مذکر اور مونث کے اندر شروع سے آخر تک فرق چلا آتا ہے۔ ہر صیغہ الگ الگ ہوتا ہے' ہر ضمیر الگ الگ ہوتی ہے۔ قرآن ہمیشہ جب مومنین کہتا ہے تو مذکر کے صیغے استعمال کرتا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ مومنین صرف مردوں کو قرار دیتا ہے۔ لیکن ایک چیز اور اہم آ گئی۔ اب یہاں اس نے یہ بتانا تھا کہ مرد اور عورت دونوں زندگی کے ہر گوشے میں شانہ بہ شانہ' دوش بدوش چلنے کے لیے ہم نے بنائے ہیں۔ کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس میں جو کچھ مرد کر سکتا ہے وہ عورت نہیں کر سکتی۔ کوئی خصوصیات سوائے ان کے کہ بائیولوجیکل (حیاتیاتی لحاظ سے) دونوں کے وظائفِ زندگی میں فرق ہے۔ اتنا امتیاز تو ہے لیکن اس کے بعد جب یہ دونوں انسان کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں تو قرآن نے بتانا یہ تھا کہ یہ دونوں ہمدوش چلتے ہیں۔ اس کے اسلوبِ بیان کا اعجاز دیکھیے کہ عام قاعدہ صرف مذکر کا صیغہ استعمال کرتا ہے اور مؤنث اس کے اندر Include (شامل) ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ اس نے یہاں نمایاں طور پہ بتانا یہ تھا کہ دونوں یکساں چلتے ہیں' یہاں (مومن) مرد اور مومنات' مسلم اور مسلمات دونوں کے نام لے کر اس طرح سے بیان کیا ہے کہ اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ وَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ (33:35)۔ حالانکہ اگر وہ صرف اِنَّ المسلمین ہی کہتا تو اس کے اندر عورتیں Include (شامل) تھیں' مومنین کہتا تو اس کے اندر عورتیں شامل تھیں۔ لیکن چونکہ یہاں اس نے نمایاں طور پر ایک اصول بیان کرنا تھا کہ تمام خصوصیات جو ایک کے اندر ہیں وہ دوسرے کے اندر ہیں' جو کام ایک کر سکتا ہے وہ دوسری جنس بھی کر سکتی ہے اس لیے یہاں خاص طور پہ مرد عورت برابر برابر آخر تک گئے۔ پہلے تو اس آیت کو غور سے سنیے۔ کہا ہے کہ اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ وَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰبِرٰتِ

---

[1] اس میں مونث شامل ہیں۔

وَالۡخٰشِعِیۡنَ وَالۡخٰشِعٰتِ وَالۡمُتَصَدِّقِیۡنَ وَالۡمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِیۡنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالۡحٰفِظِیۡنَ فُرُوۡجَهُمۡ وَالۡحٰفِظٰتِ وَالذّٰکِرِیۡنَ اللّٰهَ کَثِیۡرًا وَّ الذّٰکِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمۡ مَّغۡفِرَةً وَّ اَجۡرًا عَظِیۡمًا (33:35)۔غور کیجیے کونسی خصوصیت ہے جو باقی رہ گئی ہے۔ پہلے تو مسلم مرد اور مسلم عورتیں کہا ہے۔

قرآنِ حکیم کی روشنی میں مسلمان اور مومن میں فرق کی نوعیت

اب یہاں (33:35) مسلم اور مومن میں قرآن نے فرق کیا ہے۔اور میں پہلے بتاتا چلا آ رہا ہوں کہ مسلم تو ہم بھی ہیں جنہیں سارے مسلمان کہتے ہیں لیکن قرآنِ کریم نے دوسری جگہ کہا ہے کہ یہ جو نئے نئے اعراب اسلام میں داخل ہوئے ہیں یعنی اس امت کے اندر شامل ہوئے ہیں' اس برادری کے فرد بنے ہیں' اس سوسائٹی کے رکن بنے ہیں اور اپنے آپ کو مومن کہتے ہیں' ان سے کہو کہ ابھی مومن نہ کہو' ابھی صرف مسلم کہو کیونکہ تم نے اس مملکت کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا ہے۔ابھی تو اپنے آپ کو صرف مسلمان ہی کہو کیونکہ وَلَمَّا یَدۡخُلِ الۡاِیۡمَانُ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ (49:14) ایمان ابھی تمہارے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا۔اور اس کے بعد کہا ہے کہ اس جماعت کے اندر رہ کر ان کے ساتھ اس پروگرام پہ جب تم عمل کرلو تو کچھ عرصے کے بعد یہ کیفیت پیدا ہو جائے گی کہ یہ ایمان جو تم اس وقت صرف Surrender (مملکت کے سامنے سرِ تسلیم خم) کرنے کی جہت سے لائے ہو' تمہارے دل کی گہرائیوں میں اترے گا تو پھر اس وقت تم مومن کہلاؤ گے۔یہاں اِنَّ الۡمُسۡلِمِیۡنَ وَ الۡمُسۡلِمٰتِ وَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَ الۡمُؤۡمِنٰتِ(33:35) آیا ہے۔میں نے اس لیے عرض کیا ہے کہ قرآن دونوں میں فرق کرتا چلا جاتا ہے۔

مومن مرد اور مومن عورتوں کی بنیادی خصوصیات اور عورت کے مقام کا تعین

یہ قرآن ہے' کہا ہے کہ وَ الۡقٰنِتِیۡنَ وَالۡقٰنِتٰتِ(33:35) . میں نے ''قنوت'' کا بتایا تھا کہ یہ وہ ہے جو اپنی صلاحیتوں کو ہمیشہ Preserve رکھے' محفوظ رکھے' صرف وہاں استعمال کرے جہاں قانونِ خداوندی کا تقاضا ہو۔آگے ہے کہ وَالصّٰدِقِیۡنَ وَالصّٰدِقٰتِ (33:35) صادق ہے۔میں نے کہا تھا کہ یہی نہیں کہ سچ بولنے والا بلکہ اپنے دعوے کو سچا کر دکھانے والا ہے۔یہ مرد اور عورتیں دونوں صیغے آپ کے سامنے ہیں۔اپنے دعویٰ ایمان کو سچا کر دکھانے والے یہ مرد اور عورتیں ہیں۔ وَالصّٰبِرِیۡنَ وَالصّٰبِرٰتِ (33:35) یہ مشکلات کے سامنے استقامت سے جم کر کھڑے ہو جانے والے مرد اور عورتیں ہیں۔ وَالۡخٰشِعِیۡنَ وَالۡخٰشِعٰتِ (33:35) جب زندگی کی خوشگواریاں اور نعمتیں حاصل ہوں تو یہ شاخِ ثمر بار کی طرح اور جھک جانے والے مرد اور عورتیں ہیں۔ وَالۡمُتَصَدِّقِیۡنَ وَالۡمُتَصَدِّقٰتِ(33:35) جب بھی کہیں زندگی کے مادی وسائل میں اور اقدار کے یا اصولِ خداوندی میں Tie

(ٹکراؤ) پڑے تو یہ سب کچھ نچھاور کردینے والے مرد اور عورتیں ہیں۔ وَالصَّآئِمِیۡنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ (33:35) جہاں رک جانے کے متعلق کہا جائے وہیں یہ رک جانے والے مرد اور عورتیں ہیں۔ وَالۡحٰفِظِیۡنَ فُرُوۡجَهُمۡ وَ الۡحٰفِظٰتِ (33:35) اپنی عصمت کی حفاظت کرنے والے مرد اور عورتیں ہیں۔ وَ الذّٰکِرِیۡنَ اللّٰهَ کَثِیۡرًا وَّ الذّٰکِرٰتِ (33:35) اور قانونِ خداوندی کو بکثرت اپنے سامنے رکھنے والے مرد اور عورتیں ہیں۔ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمۡ مَّغۡفِرَةً وَّ اَجۡرًا عَظِیۡمًا (33:35) دونوں کے لیے خدا کی طرف سے مغفرت اور اجرِ عظیم ہے۔ آپ نے دیکھا کہ دنیا کے کسی قانون میں، کسی قوم کی تہذیب میں بھی، کسی مذہب کی کتاب میں بھی، اس انداز سے یہ بات کہیں نہیں ملے گی کہ وہ زندگی کے ہر شعبے کے اندر مرد اور عورت کو دوش بدوش چلانے کے لیے ان الفاظ میں تاکید کر رہا ہے۔ اصل میں عورت کا مقام متعین کر کے اسے سمجھانے کی بات تھی کہ تُو خود مقصود بالذات ہے۔ یہ جتنی چیزیں مردوں کے متعلق کہی گئی ہیں وہ ساری عورتوں کے متعلق کہی گئی ہیں۔ اور کونسا شعبہ ہے جس میں کہیں گے کہ یہ نہیں آسکتیں۔ اور اس کے ساتھ میں ایک اور آیت ملانا چاہتا ہوں۔

کیا عورت امورِ مملکت میں حصہ لے سکتی ہے؟

ہمارے ہاں یہ بحث چلی تھی اور چلتی رہتی ہے کہ کیا عورتیں امورِ مملکت میں حصہ لے سکتی ہیں یا نہیں لے سکتیں؟ پھر قصے چلتے ہیں۔ جو اِن کو باہر نہیں نکلنے دیتے، کیا وہ ان کو امورِ مملکت میں حصہ لینے کی اجازت دیدینگے نہیں؟ قطعاً نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ الیکشن میں ووٹس کی ضرورت پڑے تو پھر جا کر ضرور منتیں کریں ''بھاویں برقعہ پاکے ای آجائیں تے ووٹ مینوں دیدیں' باقی کماں وچ تیرا کوئی حصہ نہیں ہووے گا'' ❶۔ میں نے کہا تھا کہ بڑی بحث چلی تھی۔ خاص طور پہ جب مرحومہ محترمہ فاطمہ جناحؒ (1893-1967) کی صدارت ❷ کے متعلق بات تھی تو اس وقت خاص طور پہ یہ بحث چلی تھی کہ عورت امورِ مملکت میں حصہ لے سکتی ہے یا نہیں؟ اور جیسا کہ بالکل ظاہر ہے کہ اسی طرف سے یہ فتوے تھے کہ یہ حصہ نہیں لے سکتی۔ قرآنِ کریم نے جس کا نام امورِ مملکت رکھا ہے یا مملکتِ اسلامی کا یا حکومتِ اسلام کا جو فریضہ قرار دیا ہے، اس کے لیے اس نے دو اصطلاحیں نہیں بلکہ ایک ہی اصطلاح استعمال کی ہے کہ یَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ یَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ (22:41)، یَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ یَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ (9:71) معروف کا حکم دینے والے، منکر سے روکنے والے۔ یہ بڑی جامع چیز ہے۔ جس جس بات کو بھی خدا کی کتاب جائز، صحیح قرار دیتی ہے اس کو نافذ کرنے والے، جن چیزوں کو وہ ناجائز قرار دیتی ہے ان سے روکنے والے۔ یہ بڑی جامع چیز ہے۔ یہ ہے مملکتِ اسلامیہ یا اسلامی حکومت کا فریضہ۔

---

❶ بے شک برقعہ پہن کر ہی آجائیں مگر ووٹ مجھے دیں باقی امور میں تمہارا کوئی حصہ نہیں ہے۔

❷ انہوں نے 1965ء میں صدر محمد ایوب خان (1907-1974ء) کے مقابلے میں 5 سیاسی جماعتوں کی مشترکہ امیدوار کی حیثیت سے صدارتی انتخاب لڑا تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ اس فریضے کے اندر کیا عورتیں بھی شامل ہیں؟ کہا ہے کہ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ (9:71)۔ یہاں بھی آپ دیکھیے کہ الگ کر کے دکھا دیا حالانکہ ''مومنون'' ہی کہتا تو اس میں عورتیں بھی آ جاتیں لیکن چونکہ وہ تو خدائے خبیر ہے' اسے پتہ تھا کہ یہ بحثیں چل پڑنی ہیں کہ عورتیں بھی حصہ لے سکتی ہیں یا نہیں۔ کہا کہ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ (9:71) 'مومن مرد اور مومن عورتیں' وہ ایک دوسرے کے ساتھی ہیں اور يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (9:71)۔ یہ دونوں معروف کا حکم دیتے ہیں اور ''منکر'' سے روکتے ہیں۔ وہی حکومتِ اسلامی کا جو فریضہ ہے اس میں ان دونوں کو شامل کیا ہے۔ اس کے بعد اس بحث کی گنجائش ہی کہاں ہے لیکن ان کے ہاں گنجائش کے لیے تو بڑے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ قرآن کو ٹھپ کر دیجیے تو پھر ہر بحث کے لیے میدان کھلا ہے۔ وہ میدان یہ ہے کہ مفسرین یہ کہتے ہیں' محدثین یہ کہتے ہیں اور فقہائے کرام یہ کہتے ہیں' آئمہ کرام کا یہ فرمان ہے۔ یہ سلسلہ چلا جا رہا ہے۔

عزیزانِ من! اب اس میں پھر ''میں'' آ جائے گی تو میں معافی چاہتا ہوں۔ یہ ساری بحثیں آپ کے ہاں روایات اور فقہی قوانین کی رو سے ہوتی رہیں۔ کسی شخص نے قرآن کی یہ آیت Quote (نقل) نہیں کی تھی۔ صرف مجلّہ ''طلوعِ اسلام'' میں یہ آیا تھا کہ بابا! اس کا فیصلہ تو ایک آیت کر رہی ہے۔ اس لیے کہ جہاں قرآنِ کریم نے اسلامی مملکت کا فریضہ قرار دیا ہے وہاں کہا ہے کہ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (22:41) جب خدا اس قوم کو' اس امت کو' تمکن فی الارض یعنی حکومت عطا کرے گا تو یہ اقامتِ صلٰوۃ کریں گے' ایتائے زکٰوۃ کریں گے' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کریں گے۔ واضح ہو گیا کہ یہ ہے اسلامی حکومت کا فریضہ۔ اب یہ دیکھیے جو اگلے دو الفاظ میں اقامتِ صلٰوۃ اور ایتائے زکٰوۃ بھی ساتھ کہا تھا۔ کہا ہے کہ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ (9:71) ان مومن مردوں اور مومن عورتوں میں یہ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ بھی یہاں بڑا جامع ہے کہ کوئی کہیں دوسرے کے ماتحت نہیں ہے بلکہ وہ ایک دوسرے کے ساتھی ہیں' دوست ہیں' مددگار ہیں' سازگار رہیں۔ یہاں يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ (9:71)۔ یہ چاروں الفاظ ہیں' چاروں ٹکڑے ہیں۔ یہی قرآن نے سورۃ الحج میں (22:41) میں امتِ مسلمہ کی' تمکن فی الارض کی غایت بتائی ہے وہاں یہی چاروں چیزیں استعمال ہوئی ہیں۔ اور یہاں وہی چاروں چیزیں استعمال کر کے مومن مرد اور مومن عورت دونوں کا یہ فریضہ قرار دیا ہے۔ اب اس بحث کی کہاں گنجائش ہے کہ عورت حصہ لے سکتی ہے یا نہیں۔

بہرحال ہمارے سامنے سورۃ الاحزاب کی آیت 35 تھی۔ میں نے عرض کیا ہے کہ وہاں دونوں کو قرآن نے شانہ بہ شانہ دکھایا ہے۔ اور میں نے یہ بھی گزارش کیا تھا کہ وہاں ایک بات اس کے اندر نہیں آئی تھی کہ کیا وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ یعنی

حکومتِ اسلامیہ کے اندر بھی عورت دخل دے سکتی ہے یا نہیں۔ تو اس آیت میں اُس نے ان کا یہ حکومت کا فریضہ گنا کر یہاں مومنین اور مومنٰت دونوں کا ذکر کر دیا ہے۔ عورت سے کہنے کا یہ وہ مقصد تھا کہ تیرے ذہن میں یہ چیز جو فریب انگیزی کے طور پہ غیر شعوری طور پہ ڈال دی گئی ہے کہ تیرا وجود مقصود بالذات نہیں بلکہ مرد کے کسی مقصد کے بروئے کار لانے کا تو ذریعہ بنی ہوئی ہے اسے دل سے نکال۔ وہاں جاہلیہ کہا ہے کہ یہ زمانہ قبل اسلام کی باتیں ہیں جس سے تجھے فریب دیا گیا ہے۔ جب تُو اس پہ ایمان لے آئے گی تو وہ سارے جتنے پہلے کے نظریات، خواہ وہ تحت الشعور میں بھی کیوں نہ ہوں، ان کو تو نکالنا پڑے گا۔ اور نکالنے کے بعد کہا کہ تیرا مقام یہ ہے۔ اب آئی یہ امت۔ نظام قائم ہو گیا، اس نظام میں یہ دونوں آ گئے۔

اسلامی مملکت میں اطاعت کسی فرد کی نہیں ہوتی بلکہ صرف خدا کے قانون کی ہوتی ہے

اب اس نظام کے قیام کے لیے اطاعت ضروری ہے۔ اطاعت کسی فرد یا گروہ کی نہیں بلکہ اطاعت تو صرف احکام و اقدارِ خداوندی کی ہے۔ یہ نظام ان اقدار کی اطاعت کرانے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ پہلے یہ خود اطاعت کرتے ہیں یعنی جو بھی اربابِ حل وعقد ہوتے ہیں یعنی نظام کے اندر کوئی تو ایسی اتھارٹی اوپر ہوگی جو اِن چیزوں کو نافذ کرے گی، دیکھے گی، ضمنی قوانین بنائے گی، ضوابط بنائے گی، انتظام کرے گی۔ تو یہ جو لوگ ہیں ان کی حکومت نہیں ہوتی۔ یہ بڑا بنیادی ضروری مسئلہ ہے جس کو سمجھ لینا چاہیے۔ یہ حاکم نہیں ہوتے۔ اِنَّ اللّٰهَ يَاۡمُرُكُمۡ (2:67) تو حاکم تو صرف خدا ہوتا ہے۔ یہ جو افراد ہوتے ہیں، یہ خدا کے احکام کو نافذ کرنے کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ جیسے یہ جتنے بھی ہمارے ہاں افسرانِ ماتحت ہوتے ہیں وہ حکومت نہیں کہلاتے بلکہ حکومت کے کارندے کہلاتے ہیں۔ حکومت تو سنٹرل گورنمنٹ یا پراونشل گورنمنٹ ہوتی ہے۔ یہ گورنمنٹ کے احکام کو نافذ کرنے کے ذرائع ہوتے ہیں۔ اسلامی حکومت میں اور سیکولر میں فرق یہ ہوتا ہے کہ سیکولر میں تو کسی مقام پہ پہنچ کر ایک ہیئت حاکمہ ہوتی ہے جو قانون بناتی بھی ہے اور وہ قوانین کو وضع بھی کرتی ہے، حقِ حکومت ان کے پاس ہوتا ہے۔ اسلامی مملکت میں اس قسم کی کوئی ہیئت ہو ہی نہیں سکتی جو قوانین بنائے اور اپنے بنائے ہوئے قوانین کو نافذ کرے۔ یہ حق ہی کسی کو نہیں ہوتا۔ اسی لیے قرآن نے کہا ہے کہ تمہارے ہاں خواہ اوپر تک کیوں نہ چلے جائیں ہیئت حاکمہ کوئی نہیں ہوتی۔ وَّ لَا يُشۡرِكُ فِىۡ حُكۡمِهٖۤ اَحَدًا (18:26) وہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک بھی نہیں کرتا۔ یہ جتنے بھی ہوتے ہیں ان کے متعلق فریضہ یہ بتایا کہ جس بات کو خدا نے معروف کہا ہے اس کو نافذ کرو، جس سے اس نے روکا ہے اس سے منع کرو۔ بس یہ ان کا فریضہ ہے۔ گویا اس اسلامی مملکت کے اندر اوپر تک کا بھی طبقہ وہی کچھ ہوتا ہے جیسا عام حکومتوں میں یہ نیچے کے افسر ہوتے ہیں۔ یہ اس حکومت کے احکام کو نافذ کرنے کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ اور اسلامی حکومت میں جو سب سے بالاتریں طبقہ ہوتا ہے وہ بھی خدا کی حکومت کے احکام کو نافذ کرنے کا ذریعہ ہوتا

ہے۔ یہ دونوں چیزیں پہلے کہہ کر کہ یہ مرد اور عورت دونوں شریک ہوتے ہیں' پوری کی پوری امت' پوری کی پوری ملت' یکساں حیثیت رکھے ہوئے ہوتی ہے۔

اسلامی نظام میں ہر فرد کی حیثیت برابر ہوگی

آگے قرآنِ کریم نے نظام بتایا کہ **وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ** (33:36)۔اے رسول! انہیں یہ بھی بتا دو کہ جب کسی معاملہ میں خدا اور اس کا رسول یعنی نظامِ خداوندی کوئی فیصلہ دیدے' تو مومن مردوں اور عورتوں کو اس میں کوئی اختیار باقی نہیں رہتا۔انہیں بطیّبِ خاطر اس فیصلہ کا پابند رہنا ہوگا اب آپ اس نظام کی یہ بات سن لیجیے کہ جس نے بھی اس نظام کو تسلیم کر لیا' بطیّبِ خاطر کیا۔ اب میں یہاں بتا دوں کہ اس اختیار کرنے میں کوئی جبر نہیں' کوئی اکراہ نہیں' جس کا جی چاہے' اس نظام کو تسلیم کرے' جس کا جی چاہے وہ اس سے باہر رہے لیکن یہ ضرور ہے کہ جس نے اسے تسلیم کیا تو اس میں ہر فرد کی حیثیت مساوی ہوگی۔

اسلامی مملکت میں ذمیوں کے ساتھ روابط کی وضاحت

اسلامی مملکت کے اندر یہ لوگ جنہیں ہم ذمی کہتے ہیں' وہ ہیں جو قرآن کی حاکمیت کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ حکومت کے تابع یا رعایا یا باشندوں کی حیثیت سے رہنا چاہتے ہیں۔ان کا الگ گروہ ہوتا ہے۔ان کو بھی اجازت ہوتی ہے کہ جی چاہے تو وہ اس میں رہیں' نہ جی چاہے تو نہ رہیں' قرآن تو یہ کہتا ہے کہ اگر دشمن کا کوئی فرد بھی کسی طرح سے تمہارے ہاں آ جائے تو اسے قرآن سناؤ اور اس کے بعد اگر وہ کہے کہ صاحب! میں تو اسے نہیں مانتا تو اسے اپنی حفاظت میں جہاں وہ کہے وہاں پہنچا دو۔ جو یہاں پہلے ذمی بن کر رہیں گے' تو ان کی حفاظت کی ذمہ دار یہ حکومت ہے۔ذمی کے معنی ہیں وہ جن کی حفاظت کا ذمہ حکومت نے لیا ہے' یہ ذمی کوئی گالی نہیں ہے' یہ وہ ہیں جن کی حفاظت کا ذمہ اس حکومت نے لیا ہے۔اب یہ ضرور ہے کہ یہ ملٹری یا فوج میں نہیں جائیں گے اور ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت کا ذمہ اس حکومت نے لیا ہے۔ یہ ہے وہ نظام۔اسلامی حکومت ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت کا ذمہ لیتی ہے کیونکہ ان کو مذہب کی اجازت دیتی ہے۔اسی طرح سے جو مسلمان کہلائیں وہ ہیں جنہوں نے بطیّب خاطر اس نظام کو تسلیم کر لیا ہے' میں نے عرض کیا ہے کہ وہ پھر مومن ہو جاتے ہیں۔

مومنین کے لیے ضوابط

اب مومنین کے متعلق میں عرض کرتا ہوں۔کہا ہے کہ یہ نظام قائم ہوا ہے' تم نے بطیّب خاطر اس کے اندر مسلم یا مومن کی

حیثیت سے رہنے کے لیے اپنا ارادہ ظاہر کر دیا اور اسے تسلیم کر لیا۔ یہاں تک تمہیں اجازت تھی' تمہارا جی چاہتا تو اس میں آتے' تمہارا جی نہ چاہتا تو نہ آتے۔ تم آ گئے ہو' تم نے اپنے ارادے کو Exercise (روبعمل) کر لیا ہے۔ اب یہ بات نہیں ہے کہ اس نظام کے جو احکام نافذ ہوں اس میں تمہارا جی چاہے تو مان لو' جی نہ چاہے تو نہ مانو۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ اور بات بڑی صاف ہے۔ یعنی اس میں کوئی زور یا جبر نہیں ہے کہ یہ ماننا پڑے گا۔ اگر نہیں ماننا ہے تو اس دائرے سے' اس حلقے سے' باہر چلے جاؤ۔ اور دنیا کی کوئی مملکت بھی اس کی اجازت نہیں دے سکتی کہ آپ اس کے آئین و دستور کو صحیح مان کر اس کے باشندے یا نیشنل کی حیثیت سے رہیں اور پھر یہ کہیں کہ صاحب! آپ کے جتنے احکام گورنمنٹ کے آئیں گے ان میں سے جس کو جی چاہے گا ہم مانیں گے اور جس کو جی نہیں چاہے گا ہم نہیں مانیں گے۔ اس طرح کوئی نظام چل ہی نہیں سکتا۔ کہا کہ پھر تمہیں یہ اختیار نہیں رہے گا۔ اور پھر یاد رکھو کہ **وَ مَنۡ یَّعۡصِ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ فَقَدۡ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِیۡنًا** (33:36) جو اس سے سرکشی برتے گا' انحراف برتے گا' اس کی خلاف ورزی کرے گا تو وہ سیدھا راستہ چھوڑ کر دوسرے بہت ہی غلط راستے پر جا پڑے گا۔ یہ دوسرے راستے کی ہی بات تو کہی تھی کہ تم اس سے نکل جاؤ۔

مرتد کی سزا موت نہیں

یہ جو چیز ہمارے ہاں کہی گئی ہے کہ ایک دفعہ مسلمان ہونے کے بعد پھر اگر کوئی چاہے کہ وہ اسلام کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرے تو اس کی سزا موت ہے' یہ قطعاً قرآن کے خلاف ہے۔ یہی تو جبر ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ جو مسلمان کے گھر میں پیدا ہوا ہے وہ تو پیدائشی مسلمان ہے۔ اس نے تو اسلام بھی اپنی مرضی سے نہیں اختیار کیا لیکن پیدا ہونے کے بعد ان کا یہ فتویٰ ہے کہ اگر یہ کہے کہ نہیں صاحب! اس اسلام پہ میرا جی نہیں ٹھکتا' میں یہ مذہب چھوڑتا ہوں' کوئی دوسرا اختیار کرتا ہوں تو یہ کہتے ہیں کہ تمہیں اس کی اجازت نہیں ہے' اس کی سزا موت ہے۔ دعوے ان کے یہ ہیں کہ **لَاۤ اِکۡرَاہَ فِی الدِّیۡنِ** (2:256) دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔ تو پھر یہ زبردستی نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ کوئی غیر مسلم اگر اسلام اختیار کر کے آ جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ اس کی تو اجازت ہے۔ اور ادھر آنے کے بعد اگر وہ آپ کو دیکھتا ہے کہ یہ کیا اسلام ہے جو میں نے قبول کر لیا ہے تو وہ واپس جانا چاہتا ہے تو یہ کہتے ہیں کہ نہیں صاحب! یہ تو ون وے ٹریفک ہے' تم واپس نہیں جا سکتے۔ ارے بھئی! میرا جی اس پہ نہیں ٹھکتا جو کچھ میں سمجھ کر آیا تھا یہ وہ بات نہیں ہے۔ کہنے لگے کہ نہیں صاحب! یہاں اس طرح سے رہنا ہوگا۔ وہ کہتا ہے کہ میں تو دوسرا مذہب اختیار کرتا ہوں تو یہ کہتے ہیں کہ اس کی سزا موت ہے۔ اور اس کے بعد دعویٰ یہ ہے کہ **لَاۤ اِکۡرَاہَ فِی الدِّیۡنِ** (2:256) دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔ ملاحظہ فرماؤ۔ یہ کہا کہ جب کوئی شخص بطیّب خاطر پہلے کہے کہ میں اس نظام کے تابع رہنا چاہتا ہوں' پھر اس نظام کے جو احکام و قوانین ہیں انہیں ماننا ہوگا' وہ پھر یہ نہیں

کہہ سکتا کہ میرا جی چاہے گا تو میں یہ احکام وقوانین مانوں گا اور میرا جی نہیں چاہے گا تو میں انکار کر دونگا۔ کہا ہے کہ یہ بات نہیں ہے۔ یہ تو ہوئی عام نظام کی بات۔

مومن اور مسلم میں فرق

اب مومن کی بات اور ہے۔ مومن نے تو کسی باہر کے خارجی دباؤ سے یہ اسلام اختیار نہیں کیا تھا۔ وہ جو میں نے کہا ہے کہ اعراب نے اختیار کیا تھا تو قرآن نے کہا کہ تم تو صرف اس مملکت اور اس سلطنت یا اس حکومت کی شان وشوکت کو دیکھ کر آ گئے ہو۔ کوئی بات نہیں، بسم اللہ، لیکن ابھی اپنے آپ کو مومن نہ کہو۔ مومن اس وقت کہو جب ایمان تمہارے دل کی گہرائیوں کے اندر آ جائے۔ جب آپ کے دل کی گہرائیوں میں یہ بات آ جائے کہ یہ جو مجھ سے حکم منوایا جا رہا ہے، یہ خدا کا حکم ہے، کسی انسان کا نہیں ہے اور خدا کے حکم کو آپ دل کی گہرائیوں میں تسلیم کر چکے ہیں۔ عزیزانِ من! قرآن نے یہاں عجیب بات بتائی ہے کہ اطاعت کس کو کہتے ہیں۔ ایک تو اطاعت ان کی ہے جن کو اس نے کہا ہے کہ یہ صرف مسلمان ہوئے ہیں۔ نظام کے اندر رہتے ہوئے ان کو بھی اختیار نہیں ہے کہ اس کی خلاف ورزی کریں لیکن مومن کے متعلق تو بات ہی اور ہے۔

میں نے عرض کیا ہے کہ مومن میں اور مسلم میں قرآن نے فرق کیا ہے۔ پھر سن لیجیے کہ مومن کون ہیں؟ وہ جس کے دل کی گہرائیوں کے اندر یہ چیز اتر چکی ہے کہ یہ خدا کا حکم ہے اور میں نے اس کی اطاعت برضا ورغبت، دل کے ساتھ، کرنی ہے۔ اس کا ٹیسٹ ملاحظہ فرماؤ۔ کہتے ہیں کہ قوانین کی اطاعت کیسے کرائی جائے۔ کہا کہ **فَلَا وَ رَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ** (4:65). اس کا عام ترجمہ یہ ہے کہ تیرے رب کی قسم۔ عزیزانِ من! اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ تیرا خدا اس حقیقت پہ شاہد ہے کہ جو ہم کہہ رہے ہیں کہ یہ اشخاص اپنے آپ کو مومن نہیں کہہ سکتے تاوقتیکہ وہ اپنے ہر اختلافی معاملے کو تمہارے پاس لا کر اس کا فیصلہ نہ کرائیں۔ اب نظام قائم ہو گیا ہے تو از خود آدمی فیصلہ نہیں کر سکتا بلکہ اس نظام سے فیصلہ کرانا ہوگا۔ تو پہلی شرط تو یہ ہے کہ وہ اختلافی معاملات کو فیصلے کے لیے تیرے پاس لائیں یعنی نظام کے پاس لائیں۔ تو یہ تو مسلمان بھی لے آئے گا۔ یہاں تو اس نظام کے تابع اس حکومت کے اندر رہنے والا، ہر فرد، اپنے معاملات کو انہی کی عدالت کے اندر لے کر جائے گا۔ اب مومن ہونے کا فرق ملاحظہ فرمائیں۔ کہا کہ **ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ** (4:65) اور پھر یہاں سے جو فیصلہ ہو، یہ اس کے خلاف اپنے دل میں کوئی گرانی اور کبیدگی بھی محسوس نہ کرے۔ یہ ہے مومن کی شان۔ یہ ہے فرق۔ عام باشندہ جو ہے وہ بھی حکومت کے قانون کی اطاعت کرتا ہے لیکن گالیاں بھی دیتا ہے کہ ستیاناس! کیا قانون بنا دیا ہے، کیا اس کی کوئی لم بھی ہے؟ یعنی مانتا ہے لیکن طوعاً و کرہاً۔

کافر نہ توانی شد لا چار مسلماں شو

وہ یوں مانتا ہے۔یعنی قانون کو مانتا ہے۔''اس کی اطاعت کرتا ہے لیکن کرتا اس طرح سے ہے۔ جو اس طرح سے اطاعت کرتا ہے اس کی اطاعت پہ بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ کر اس لیے رہا ہے کہ اس اطاعت نہ کرنے سے اسے پتہ ہے کہ سزا ملے گی' جرمانہ ہوگا۔ اس کی خلاف ورزی کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ جس وقت وہ دیکھے گا کہ کہیں گنجائش ہے' تو فوراً خلاف ورزی کرلے گا۔ مومن وہ ہے کہ جب تیری طرف سے یہ فیصلہ ہوجائے تو پھر وہ اپنے دل کی گہرائیوں میں بھی اس کے خلاف کوئی گرانی محسوس نہ کرے۔ اس لیے کہا کہ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (4:65) ۔ وہ اس فیصلے کو دل کی رضامندی سے تسلیم کرتے ہیں' بہ طیب خاطر قبول کرتے ہیں۔ حکم کا ماننا اسے کہتے ہیں۔ لیکن یہ نظام کس کی اطاعت کرائے گا؟ یہ اطاعت کس کی کرائی جا رہی ہے؟ یہ اطاعت احکامِ خداوندی کی کرائی جا رہی ہے۔

اسلامی مملکت میں کوئی شخص اپنی اطاعت کرا ہی نہیں سکتا

اس مملکت میں' اس حکومتِ خداوندی میں' میں نے عرض کیا ہے کہ کوئی انسان اپنی اطاعت کرا ہی نہیں سکتا۔ کہا کہ مَا كَانَ لِبَشَرٍ (3:79) کسی انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ (3:79) خواہ اس کو قانون سازی کا اختیاری ہو' Executive کے اختیارات حاصل ہوں' حکومت کے اختیارات حاصل ہوں اور خواہ وہ نبی بھی کیوں نہ ہو' اس کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (3:79) وہ کسی انسان سے کہے کہ تم خدا کے نہیں' میرے محکوم ہو۔ عزیزانِ من! نبی کو بھی اس کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم میرے احکام کی اطاعت کرو۔ کہنا اُسے یہی ہے کہ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ (3:79) تم اور میں سارے' رب کی حکومت کی اطاعت کریں۔ اب سوال یہ ہے کہ خدا کی کیسے اطاعت کریں کیونکہ خدا تو سامنے آتا نہیں تو اس کی اطاعت کیسے ہو؟ کہا کہ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (3:79) اس کی کتاب جس کو پڑھتے پڑھاتے ہو' سمجھتے بوجھتے ہو' اس کی اطاعت کرو۔ تو گویا اور تو اور' نبی کو بھی یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دوسرے انسانوں سے اپنی اطاعت کرائے۔ وہ بھی خدا کے احکام کی اطاعت کرتا ہے۔ اب دونوں آیتوں کو ملا لیجیے کہ یہ اپنے اختلافی معاملات کو اس نظام کے پاس یعنی تیرے پاس نہیں لاتے تو پھر بھی یہ مومن نہیں ہیں' تیرے پاس لاتے ہیں اور اگر وہ تیرے فیصلے کو طوعاً و کرہاً تسلیم کرتے ہیں تو پھر بھی مومن نہیں ہیں۔ مومن یہ اس وقت ہوتا ہے جب یہ تیرے فیصلے کے خلاف دل میں بھی گرانی محسوس نہ کرے۔ وہ کیوں گرانی نہیں محسوس کرتا؟ اس لیے کہ یہ نبی بھی اس سے اپنی اطاعت نہیں کراتا بلکہ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ (3:79) وہ ان سب کو کہتا ہے کہ یہ خدا کے احکام کی اطاعت ہے۔ اور خود نبی کو بھی یہ کہا گیا ہے کہ تمہیں بھی خدا کے احکام کی اطاعت کرنا ہوگی۔ گویا وہ پہلے خود اطاعت کرتا

ہے، پھر وہ دوسروں سے اطاعت کراتا ہے۔ اپنی اطاعت نبی بھی نہیں کرا سکتا' وہ بھی خدا کے احکام کی اطاعت خود کرتا ہے اور دوسروں سے بھی کراتا ہے۔ اگرچہ اس نظام کے فیصلے نبی کی طرف سے صادر ہوتے ہیں۔ اس سے رسول کی ذاتی اطاعت مقصود نہیں۔ قرآن میں کئی مقامات پہ رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے کہلایا گیا کہ اگر میں بھی خدا کی معصیت کروں تو میں خدا کے عذابِ عظیم سے ڈرتا ہوں۔ یہاں کہا یہ تھا کہ مومن مرد ہو یا عورت وہ جب اس نظام میں آیا ہے تو اس کو اختیار نہیں رہتا کہ وہ اپنے فیصلے اپنی مرضی کے تابع کرے۔ اس کو فیصلے اس نظام سے کرانے ہونگے۔ اب اگلی بات یہ آئی کہ اس فیصلے کے خلاف دل میں گوئی گرانی بھی محسوس نہیں ہوگی۔ سوال یہ ہوا کہ یہ جو فیصلے صادر کر رہا ہے جسے آپ حکومت کہہ رہے ہیں' کیا یہ اپنا کوئی فیصلہ بھی تم سے منوا سکتا ہے یا کوئی ذاتی فیصلہ بھی تم سے منوا سکتا ہے۔

اطاعت کے سلسلہ میں حضرت زیدؓ بن حارث کی مثال

عزیزانِ من! قرآن کا اعجاز دیکھیے۔ اُس نے کہنا یہ تھا کہ نبی اکرم بھی اپنی ذات کا فیصلہ نہیں منوا سکتا۔ اور اس کے لیے ایک بیّن مثال پیش کی۔ سارے قرآن میں صحابہؓ میں سے ایک ہی یہ صحابیؓ ہے جس کا نام لیا گیا ہے' اور ایک ہی یہ واقعہ ہے جس کو اس تفصیل سے بیان کیا ہے۔ وہ صحابی حضرت زیدؓ بن حارث ہیں۔ عہدِ جاہلیہ میں' جہالت کے اس زمانے کے اندر' تو یہ پکڑے ہوئے غلام آیا کرتے تھے۔ عرب میں غلامی عام تھی۔ یہ پکڑا ہوا غلام کہیں سے آ گیا' حضرت خدیجہؓ کے پاس یہ غلام تھا۔ یاد رکھیے! دو زیدؓ آتے ہیں' ایک زیدؓ بن ثابت ہیں جنہوں نے قرآن کی کتابت کی اور ایک۔ یہ زیدؓ بن حارث تھے جو حضرت خدیجہؓ کے غلام تھے۔ اور جن کا یہ واقعہ قرآنِ کریم میں بطور ایک بیّن مثال دیا گیا ہے۔

غلام سے بیٹے کا درجہ اور پھر داماد اور داماد کے بعد طلاق

نبی اکرم ﷺ کے ساتھ جب حضرت خدیجہؓ کا نکاح ہوا ہے تو انہوں نے یہ ملازم حضور ﷺ کو دیدیا۔ غلام کی حیثیت سے تو آپ ﷺ رکھ ہی نہیں سکتے تھے اس لیے آپ ﷺ نے اسے فوراً آزاد کر دیا۔ اب آزاد ہونے کے بعد جہاں اس کا جی چاہے وہ چلا جائے۔ خود جانا تو ایک طرف رہا' اس کے باپ اور چچا کو یہ معلوم ہو گیا' وہ خود یہ کہنے کے لیے آئے کہ اب تم چلو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے اس کو آزاد کر دیا ہے۔ اب یہ اپنے معاملات کا خود فیصلہ کرے گا' میں نے دخل ہی نہیں دینا۔ اس نے جہاں رہنا ہے اپنی خوشی سے رہے اور اگر جانا ہے تو بسم اللہ۔ عزیزانِ من! یہ گھر دار الرحمۃ تھا۔ اس غلام نے باپ اور چچا سے کہا کہ تمہاری نسبت یہ گھر میرے لیے زیادہ محبت اور سکونت کا باعث ہے' میں آپ کے ساتھ نہیں جانا چاہتا' میں یہاں رہنا چاہتا ہوں۔ آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ تم نے یہ

فیصلہ کیا ہے' یہ بہت بڑا فیصلہ ہے۔ باپ کے اوپر بھی تم نے مجھے ترجیح دی ہے تو اب یہی صورت ہے کہ اب اس کے بعد تم غلام بھی نہیں' آزاد کردہ غلام بھی نہیں' ملازم بھی نہیں' بلکہ تم میرے بیٹے ہو۔ اُس زمانے میں عرب کے اندر مُتَبَنّٰی بنادیا کرتے تھے۔ یہی زیدؓ ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے مُتَبَنّٰی ہیں۔ بعد میں یہ حکم آیا تھا کہ یاد رکھیے! جسے تم بیٹا کہہ دیتے ہو'وہ سچ مچ کا بیٹا نہیں بن جاتا۔ بیٹے اور بیٹیاں تو ہم ہر ایک کو کہتے رہتے ہیں۔ یہ بعد کی قانونی بات ہے۔

اب اور دیکھیے کہ رسول اللہ ﷺ اس کا مقام کتنا بلند کیے چلے جا رہے ہیں۔ آپ ﷺ کی پھوپھی کی ایک بیٹی تھیں' قریش کے معزز ترین گھرانے کی' بنو ہاشم کی' ابو مطلب کے گھرانے کی۔ ان کا نام زینبؓ تھا۔ اس کے ساتھ زیدؓ بن حارث کی شادی کردی۔ تو یہ بڑی چیز تھی کہ غلامی سے آزاد کیا' آزاد ہو گیا بیٹا بنایا' قریش کی ممتاز ترین خاتون کے ساتھ ان کی شادی کردی۔ یہ سوئے اتفاق ہے کہ وہ شادی نبھ نہیں سکی۔ ویسے تو سال ڈیڑھ سال تک کے لیے یہ نکاح رہا تھا۔ اب رسول اللہ ﷺ کی انتہائی خواہش تھی اور ہونی بھی چاہیے تھی کہ یہ نباہ ہو جائے' طلاق تک نوبت نہ پہنچے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کئی وجوہات ہو سکتی تھیں۔ آپ ﷺ نے تو وہ مساواتِ اسلامیہ قائم کرنے کے لیے یہ کوشش کی تھی۔ اعتراض ہوتا تھا کہ قریش کے ممتاز گھرانے کی خاتون اور ایک غلام کے ساتھ نکاح!! ''اے ذرا گوت ایہدی نیویں ہے''❶۔ پھر وہ جو آپ ﷺ کی پھوپھی زاد بہن تھیں انہوں نے مان تو لیا تھا لیکن بہر حال عورت تھی' اس کے دل میں بھی یہ بات تھی۔ اور پھر اگر طلاق ہو جاتی ہے تو پھر سمجھیے کہ کیا بات ہو جاتی ہے۔ میں عرض کر رہا ہوں کہ اس واقعہ کا یہ پس منظر تھا۔ آپ ﷺ کی انتہائی کوشش تھی کہ طلاق تک نوبت نہ پہنچے۔ معاملہ یہاں تک آ گیا تھا کہ آپ کو محسوس ہوا کہ بات یہاں تک پہنچ گئی ہے۔ اگرچہ زیدؓ زبان پہ تو نہیں لایا تھا لیکن بات طلاق تک پہنچ گئی تھی۔ آپ ﷺ اس کے پاس خود گئے۔ وہ رسول ﷺ کہ جس پر ایمان لانے سے یہ شخص مسلمان ہوا ہے' وہ محسن کہ جس نے غلامی سے آزاد کر کے اس کو آزادی دلائی تھی' وہ محسن کہ جس نے اپنا بیٹا بنایا ہے' وہ محسن کہ جس نے قریش کی اتنی بڑی ممتاز خاتون سے شادی کر کے اس ذرۂ ناچیز کو آسمان پہ چڑھا دیا' اور وہ کہ جو سربراہِ مملکتِ اسلامیہ ہیں' اس زیدؓ کے پاس گئے۔

طلاق کے سلسلہ میں نبی اکرم ﷺ کے مشورے سے انکار کے باوجود ان کا حسنِ سلوک

سوچیے کہ یہ کہنے کے لیے کون جا رہا ہے اور کسے کہہ رہا ہے! اسے جو غلام ابنِ غلام' آزاد کردہ غلام' گھر میں پالا ہوا' بیٹا بنایا ہوا' اپنی مملکت کا باشندہ ہے۔ یہ حیثیتیں ہیں۔ یہ کہنے والا اس سے کہہ رہا ہے کہ زیدؓ! میری بہن کو طلاق نہ دے۔ عزیزانِ من! اسی ماحول میں اس چیز کو آمنے سامنے رکھ کر دیکھیے کہ اس پوزیشن میں جو شخص ہے یعنی زید کی پوزیشن میں' تو وہ ہزار جی سے چاہتا ہو کہ میں یوں کروں' تو کیا اس کو انکار کی جرأت ہو سکتی ہے؟ اگر اس حیثیت سے بھی آپ لیتے ہیں کہ مملکت کا جو سربراہ ہے' اس کی پوزیشن دیکھیے' تو کیا کسی کو

---

❶ اس کی ذات گوت قدرے پست درجے کی ہے۔

انکار کی جرأت ہوسکتی ہے؟ یہ کسی عام خاتون کے متعلق نہیں کہتا بلکہ پھوپھی زاد بہن تھی جس کے بارے میں کہتا ہے کہ میری بہن کو طلاق نہ دے۔ رسول ﷺ اس شخص سے کہہ رہا ہے جو اس کے ہاتھ پہ بیعت کر کے ایمان لایا ہوا ہے' محسن اس سے کہہ رہا ہے جس کے اوپر اتنے احسانات ہیں۔عقیدت' سیاست اور معاشرتی تعلقات'' ان سب کا تقاضا یہ تھا کہ یہ جو شخص ہے انکار نہ کرے۔ اور خدا کا یہ حکم ہے کہ یہ مومن نہیں ہو سکتے جب تک یہ تیرے فیصلے کے خلاف دل میں بھی گرانی محسوس کریں۔ یہ بات بھی سامنے ہے لیکن وہاں تو خدا کا دوسرا حکم بھی یہ تھا کہ کسی نبی کو بھی حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی سے اپنا فیصلہ منوائے۔

عزیزانِ من! زید پوچھتا یہ ہے کہ حضور ﷺ! یہ خدا کا حکم ہے یا آپ ﷺ کا یہ ارشاد ہے؟ اور نبی ﷺ کا کردار ملاحظہ فرمایئے۔ اگر یہ کہہ دیتے کہ یہ خدا کا حکم ہے تو کوئی یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ یہ خدا کا حکم نہیں ہے کیونکہ اس کے پاس تو ثبوت ہی نہیں تھا کہ وہ کہتا کہ یہ خدا کا حکم نہیں ہے۔ وحی کے متعلق تو ثبوت ہی نہیں ہوتا۔ وہ تو اس رسول کو جو صادق مانا جاتا ہے کہ یہ سچا ہے تو اس سے مانا جاتا ہے کہ یہ وحی ہے۔ (معاذ اللہ) اس پوزیشن میں کوئی بھی ایسا کوئی دھوکا باز ہوتا تو Situation (صورتِ حال) کو Exploit (سلب ونہب) کر جاتا۔ پوچھنے والے کی جرأت یہ ہے۔ یہ تعلیم نبوی ہے۔ وہ یہ پوچھتا ہے کہ کیا یہ آپ ﷺ کا اپنا فیصلہ ہے؟ کہا کہ ہاں زید! تم جانتے ہو کہ معاملہ کتنا نازک ہے! یہ میرا فیصلہ نہیں بلکہ تم کو مشورہ دیتا ہوں۔ زیدؓ کہتا ہے کہ معاف رکھیے! میں اپنے معاملات کو آپ ﷺ سے بہتر سمجھتا ہوں اور زیدؓ نے طلاق دیدی۔ اور زیدؓ اسی محمد ﷺ کے ساتھ عمر بھر اسی حیثیت سے رہا۔ اتنی بڑی حیثیت سے کہ زیدؓ کا جو بیٹا اسامہؓ تھا' وہ نبی اکرم ﷺ کے آخری لشکر میں سالار تھا۔ حضور ﷺ جب حج کے لیے تشریف لے گئے ہیں تو اس اونٹنی کے اوپر اسامہؓ بیٹھا ہوا حضور ﷺ کے اوپر چادر تانے ہوئے تھا۔ یہ اسی زیدؓ کا بیٹا تھا۔ کوئی رنجش نہیں' دل میں گرانی نہیں۔ جرأتیں یہ ہیں۔

حضرت زیدؓ کے واقعہ کی اہمیت کیوں؟

عزیزانِ من! جسے آپ اسلامی مملکت یا اسلامی نظام کہتے ہیں' وہ یہ ہے۔ حضرت زیدؓ پوچھ رہے ہیں کہ کیا یہ آپ ﷺ کا فیصلہ ہے یا خدا کا فیصلہ ہے؟ میں نے عرض کیا ہے کہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں پہنچنے کے بعد قرآن اس واقعہ کو Quote (نقل) کر رہا ہے۔ کہہ یہ رہا ہے کہ کسی مومن کو حق نہیں پہنچتا کہ جب حضور ﷺ خدا کا کوئی حکم دیدیں تو وہ اس میں کسی طرح بھی اپنا اختیار استعمال کرے یا دل میں بھی گرانی محسوس کرے۔ اس کے بعد یہ واقعہ زیدؓ کا ہے۔ سوچیے تو سہی کہ یہ واقعہ یہاں کیوں بیان کیا گیا ہے۔ ساری تاریخ میں رسول اللہ ﷺ کی سیرت میں' صحابہؓ میں' کیا یہی ایک اہم واقعہ تھا جو یہاں لانا تھا؟ یہی اہم ترین واقعہ تھا یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اسلامی حکومت کسے کہتے ہیں۔ عزیزانِ من! اس سے زیادہ نکھری ہوئی محسوس مثال اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی کہ ایک طرف کہا جائے کہ

تیرے فیصلے کے خلاف دل کی گہرائیوں میں بھی گرانی اور کبیدگی محسوس نہ کرے اور دوسری طرف یہ کہا کہ یہ فیصلہ تیرا فیصلہ نہیں بلکہ جب تو خدا کا حکم نافذ کرے تو یہ اس کے متعلق بات ہے۔ تیرے فیصلے کے متعلق تو جیسا تو بشر ہے ویسا ہی وہ بشر ہے' تم صرف مشورہ دے سکتے ہو' تم سربراہِ مملکت کی حیثیت سے بھی اپنا حکم نہیں منوا سکتے۔ اس کو اختیار ہے کہ جی چاہے مانے' جی چاہے تو نہ مانے۔ اس سے رسول کی ذاتی اطاعت مقصود نہیں۔ رسول کی ذاتی رائے یا مشورہ سے تمہیں اختلاف کا حق حاصل ہے۔ اس اختلاف کا نام ''معصیت خدا اور رسول'' نہیں ہوگا۔ یہ ہے اس باب میں حضرت زیدؓ کے واقعہ کی ایک بیّن مثال جو اس نکتے کی وضاحت کے لیے یہاں بیان کی گئی ہے۔

حضرت زیدؓ کے دل میں پیدا ہونے والا خوف

عزیزانِ من! یہ ہے جو یہاں واقعہ آیا ہے۔ کہا ہے کہ وَ اِذۡ تَقُوۡلُ لِلَّذِیۡۤ اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِ (33:37) زید پر اللہ کے بھی بہت سے احسانات تھے اور اے رسول! تیرے ذاتی احسانات بھی بہت تھے اور تو اس سے کہہ رہا تھا کہ: اَمۡسِکۡ عَلَیۡکَ زَوۡجَکَ وَ اتَّقِ اللّٰہَ (33:37) طلاق نہ دے۔ تو اپنی بیوی کو اپنے نکاح میں رہنے دے اور قانونِ خداوندی کی نگہداشت کر' اس میں کچھ اور راستے نکل آئیں گے۔ کہا کہ وَ تُخۡفِیۡ فِیۡ نَفۡسِکَ مَا اللّٰہُ مُبۡدِیۡہِ وَ تَخۡشَی النَّاسَ (33:37) میں نے اندازہ لگا لیا ہے کہ تُو یہاں تک تو پہنچا ہوا ہے لیکن تیرے دل میں لوگوں کا ڈر ہے جس لیے اس بات کو ابھی تک زبان پہ نہیں لاتا۔ وہ ڈر بھی نکال رہے ہیں۔ اگر زید کے دل میں یہ بات تھی کہ میں نے یہ قدم اٹھا لیا تو یہ پورا قریش کا گھرانہ' یہ سارا معاشرہ پوچھے گا کیا کہتا۔ اور رسول اللہؐ کی پھوپھی زاد بہن کے ساتھ' او قریش کی خاتون کے ساتھ' او تیری حیثیت کیا تھی۔ یعنی یہ باتیں تھیں۔ قرآن نے جو کہا ہے کہ وَ تَخۡشَی النَّاسَ (33:37) وہ لوگوں سے ڈرتا تھا۔ وَ تُخۡفِیۡ فِیۡ نَفۡسِکَ (33:37) وہ اپنے دل میں اس چیز کو چھپائے ہوئے تھا۔ یہ جو اس کے اندر Psychological (نفسیاتی) کشمکش ہو رہی تھی' اس سے بھی کس طرح سے حضور نبی اکرم ﷺ اسے نکال رہے ہیں کہ تم جو جی میں آئے کرو تمہیں کسی کا ڈر کا ہے کا ہے۔ وَ اللّٰہُ اَحَقُّ اَنۡ تَخۡشٰہُ (33:37) کیوں انسانوں سے ڈرتے ہو۔ اگر بات یہاں تک پہنچ گئی ہے تو خدا کے قانون نے اس کی اجازت دی ہے کہ اگر یہاں تک بات پہنچ جائے تو قاعدے قانون کے مطابق علیحدگی ہو سکتی ہے۔ ڈرنے کا حق تو صرف قانونِ خداوندی سے ہے کہ اس کے خلاف کوئی بات نہ ہو جائے۔

بیٹے کی بیوی سے شادی کا قصہ: منہ بولا بیٹا نہیں ہوتا

عزیزانِ من! اب قرآن بتا رہا ہے کہ فَلَمَّا قَضٰی زَیۡدٌ مِّنۡہَا وَطَرًا زَوَّجۡنٰکَہَا لِکَیۡ لَا یَکُوۡنَ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ حَرَجٌ فِیۡۤ اَزۡوَاجِ اَدۡعِیَآئِہِمۡ اِذَا قَضَوۡا مِنۡہُنَّ وَطَرًا (33:37) لیکن زیدؓ نے تیرے مشورے کو نہ مانا اور طلاق دیدی' اپنی بیوی

سے قطع تعلق کر لیا۔ اس کے بعد تم نے قانونِ خداوندی کے مطابق' اس کی مطلقہ بیوی سے شادی کر لی تاکہ اسے' اس حادثہ سے جو صدمہ پہنچا ہے' اس کی تلافی ہو جائے۔ ہم نے اس باب میں واضح ہدایت نازل کر دی تھی۔ جب کہا تھا کہ منہ بولا بیٹا' حقیقی بیٹا نہیں بن جاتا' نکاح حقیقی بیٹے کی بیوی سے جائز نہیں (4:23)۔ منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے شادی کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

عزیزانِ من! ایک طرف وہ خاتونِ محترمہ (حضرت زینبؓ) کس قدر دل شکستہ ہوگی اور دوسری طرف چیز یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کو اپنا بیٹا بنا لیا ہوا ہے۔ قرآن نے یہ کہا ہوا تھا کہ بیٹے کی بیوی سے شادی نہیں کر سکتے (4:23)۔ یہ جو محرمات قرآن نے گنائی ہیں جن کے ساتھ نکاح حرام ہے' ان میں بیٹے کی بیوی بھی شامل ہے۔ دوسروں کے ذہنوں میں یہ تھا کہ جسے بیٹا کہہ کر پکارا جاتا ہے وہ بیٹا ہی ہوتا ہے' اس پہ بھی یہ حکم لاگو ہے۔ قرآن نے بتایا کہ نہیں' یہ تعلقات محبت اور پیار کی بنا پہ ہیں۔ جس کی بنا پہ تم کسی کو اپنا بیٹا کہہ دیتے ہو' وہ بیٹا بن نہیں جاتا۔ جیسے اس نے کہا تھا کہ تم غصے میں بیوی کو ماں کہہ دیتے ہو تو وہ ماں نہیں بن جاتی۔ اس نے کہا ہے کہ قانون کی حیثیت سے یہ بیٹا نہیں بن جاتا۔ اس جہت سے بھی کہ یہ چیز معاشرے میں معلوم ہو جائے کہ مُتَبَنّٰی بیٹا نہیں بن جاتا اس لیے اس کی مطلقہ بیوی سے شادی قرآن کی رو سے جائز ہے۔ بہر حال خدا کے اس قانون کے مطابق خود رسول اللہ ﷺ نے اس سے شادی کر لی۔ اور اس کی تسکینِ خاطر کے لیے اور عزت افزائی کے لیے یہی کیا جا سکتا تھا۔ آپ علیہ السلام نے یہ کچھ کر لیا۔ قرآنِ کریم نے کہا کہ **وَ كَانَ اَمۡرُ اللّٰهِ مَفۡعُوۡلًا** (33:37)۔ رسول اللہ کا یہ عمل' قانونِ خداوندی کے عین مطابق تھا اور اس طرح سے یہ جو بات تھی وہ طے ہو گئی۔

اب آپ دیکھیے کہ قرآن نے کہاں یہ واقعہ بیان کیا ہے اور اسلامی نظام کا کس طرح سے صحیح نقشہ کھینچ کر سامنے رکھ دیا ہے کہ ایک طرف جب نبی خدا کا حکم صادر کرے تو اس کی اطاعت میں' دل کی گہرائیوں میں بھی' گرانی محسوس نہ ہو اور دوسری طرف نبی کا ذاتی معاملہ کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو' اگر تمہارا جی اس کے ماننے پہ نہیں چاہتا' تو تمہیں اس کا حق حاصل ہے کہ اس سے انکار کر دو۔ عزیزانِ من! دونوں میں یہ فرق کرنا' دنیا کی کسی مملکت' کسی نظام میں بھی' جو بھی برسرِ اقتدار آ جائے' تو کیا وہ اپنی دونوں پوزیشنوں کو الگ الگ رکھ سکتا ہے؟ کس قدر حسین ترین طریقے سے قرآن نے دونوں طرف Extreme (انتہا) پہ پہنچا کر اس فرق کو بتایا ہے۔ اسی نبی کا فیصلہ دل کی گہرائیوں میں ایسا کہ اس کے خلاف گرانی بھی محسوس نہ ہو' اسی نبی کا حکم ہے۔ لیکن اُدھر یہ تربیت نبوی ﷺ ہے کہ وہ بھی یہ پوچھتے ہیں کیا کہ یہ اللہ کا حکم یا آپ ﷺ کا ذاتی حکم ہے؟ اور اِدھر سے بھی یہ کیفیت ہے کہ سربراہِ مملکت بھی کہتا ہے کہ یہ میرا ذاتی فیصلہ ہے۔ ذاتی فیصلے کے ماننے کی مجبوری کوئی نہیں ہے۔

تاریخ میں بریرہ نامی ایک لونڈی کا واقعہ

یہ حضرت زیدؓ تو پھر بھی وہ ہیں کہ جن کے ساتھ اتنے تعلقات تھے۔اسی تاریخ میں یہ واقعہ بھی تو ہے کہ بریرہ نامی ایک لونڈی تھی۔وہ کسی دوسرے کی آزاد کی ہوئی تھی اوراس کے ساتھ ایک صحابی نے نکاح کیا ہوا تھا۔یہ اپنی آزادی سے اس سے الگ ہونا چاہتی تھی اوراس کو چھوڑ کر اُدھر آ گئی تھی۔اس صحابیؓ نے رسول اللہ ﷺ سے کہا تھا کہ اسے ذرا سمجھاؤ کہ یہ نہ جائے۔وہ کہیں حضور ﷺ کو مل گئی' آپ ﷺ نے اس کو کھڑا کیا۔آپ ﷺ سربراہِ مملکت بھی ہیں اور رسول ﷺ بھی ہیں۔اس سے یہ کہا کہ بریرہ! اپنے اس خاوند کو کیوں چھوڑتی ہو؟ بریرہ حضور ﷺ سے یہ پوچھ رہی ہے کہ فرمایئے! کیا خدا نے کچھ ایسا ارشاد کیا ہے؟ اور آپ ﷺ اس سے کہہ رہے ہیں کہ نہیں بریرہ! یہ میرا مشورہ ہے۔کہا کہ آپ ﷺ کے مشورے کا شکریہ' میں نہیں جانا چاہتی۔آپ ﷺ بھی تبسم فشاں اِدھر چلے گئے اور وہ اُدھر چلی گئی۔عزیزانِ من! ہمارے ہاں بحثیں چلی ہوئی ہیں کہ اسلامی نظام کیا ہے؟ اسلامی نظام کچھ لائنیں کھینچنے کی بات نہیں ہے' اسلامی نظام اس سیرت وکردار کا مطالبہ کرتا ہے۔یہ ہے وہ نظام۔

قرآنی معاشرے میں آزادیٔ رائے کے احترام کی اہمیت

سربراہِ مملکت کے سامنے ایک لونڈی (اس معاشرے میں ابھی لونڈی کی ہی حیثیت ہی تھی) یہ کہہ رہی ہے۔کسی حضرت صاحب کے فیصلے کے خلاف یہ بات کر کے بتایئے۔وہ تو ایک طرف ہو کر خاموش رہتے ہیں لیکن وہ جو ساتھ ہوتے ہیں' وہ کہتے ہیں کہ اوٗ ڈرو! ان کا غضب تباہ کر دے گا' پوچھو نہیں ان کا غصہ کیا ہوتا ہے' خاندان کے خاندان تباہ کر دیتے ہیں۔وہ بھی کانپنے لگ جاتے ہیں' یہ بھی کانپنے لگ جاتے ہیں' اپنے گھر میں بیٹھے کانپ رہے ہیں کہ حضرت صاحب کا حکم نہیں مانا۔دوسری طرف آپ سربراہِ مملکت کا حکم سوچ لیجیے۔یہاں دونوں پوزیشنیں موجود ہیں۔حضرت صاحب ایک رسول کے سامنے کیا ہے۔عقیدت کے اعتبار سے یہ مقام ہے' مملکت کے اعتبار سے مملکت کے سربراہ ہیں۔وہاں کی رہنے والی ایک لونڈی کو وہ کہتے ہیں کہ بریرہ! اپنے خاوند کے پاس چلی جا اور یہ آپ ﷺ کا ذاتی مشورہ تھا اس لیے وہ انکار کر دیتی ہے۔

عزیزانِ من! اس نظام کی یہ جرأت آموزیاں ہیں۔پہلے یہ ذہنیتیں اور کردار تیار کیے جاتے ہیں کہ وہ اگر کہہ دیں کہ یہ خدا کا حکم ہے تو اس کے دل میں بھی اس کے خلاف کوئی گرانی نہ ہو۔یہ ہے قانون کا احترام کیونکہ خدا کا قانون یہ منوا رہا ہے۔اور اپنی ذاتی بات کہہ رہا ہے تو لونڈی کو یہ جرأت ہے کہ وہ یہ کہہ دے کہ معاف رکھیے' میں اپنے معاملات آپ ﷺ سے بہتر سمجھتی ہوں۔ماتھے پر کوئی شکن نہیں آئی' دل کے اندر کوئی رنجش نہیں آئی کہ اس نے کیا کہہ دیا۔گھروں کے اندر معاملات آپ دیکھیے کہ ذرا سا کوئی بڑا ہے یعنی اس کے

بھی اختیار میں نہیں اور تمہارے بھی اختیار میں نہیں تھا کہ وہ دو برس پہلے پیدا ہوگیا' تو اس کے بعد بس یہ ہوتا ہے ''وڈے دے سامنے ہوگیا ایس یعنی ایہناں نال ای وڈا بن گیا[1]''۔عزیزانِ من! پہلے افراد کی تربیت ہوتی ہے پھر وہ قانون کا احترام کرتے ہیں کہ دل کی گہرائیوں میں بھی اس کے خلاف کوئی گرانی نہ ہو اور اگر آپ اپنے ذاتی احکام منوانے شروع کر دیجیے تو پھر دل کی گہرائیاں تو ایک طرف' پھر تو جسم بھی نہیں مانتا۔آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن کیا تعلیم دیئے چلا جا رہا ہے۔

جنگِ احزاب کی بات چلی آ رہی تھی اور وہیں سے عائلی زندگی کی طرف' گھر کی زندگی کی طرف' میاں بیوی کے تعلقات کی طرف' چلے آئے۔وہاں سے آئے تو اس بات کے اوپر پہنچے کہ ہم نے مرد اور عورت دونوں کو ہمدوش چلانا ہے۔اگلی بات یہ کہی کہ اس نظام کے اندر'اس مملکت کے اندر' کیفیت یہ ہے کہ کوئی جبر نہیں ہے۔جو بہ طیب خاطر خدا کے احکام کی اطاعت کرنا چاہتا ہے پھر وہ اطاعت یوں کی جائے گی کہ دل میں بھی کوئی گرانی محسوس نہ ہو اور اگلی بات یہ کی کہ اس مملکت کے اندر آزادی اور حریت کی یہ کیفیت ہے کہ اطاعت صرف خدا کے احکام کی ہوگی'اس میں سربراہِ مملکت کی ذاتی اطاعت قطعاً نہیں کی جائے گی۔تمہارا اختیار ہے کہ جی چاہے مانو'جی چاہے نہ مانو۔باقی رہے رسول تو کہا کہ **مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيْ مَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ** (33:38) قرآن نے رسول کو جن باتوں کی اجازت دی ہے تو کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ ان باتوں کو مانے' اطاعت اس نے بھی قرآن ہی کی کرنی ہے۔**سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ** (33:38) اے رسول! کوئی نئی بات تم سے نہیں کہی جا رہی' پہلے بھی جو انبیائے کرامؑ آئے تھے وہ یہی نظام نافذ کرنے کے لیے آئے تھے۔ان سے بھی یہی کہا گیا تھا کہ اطاعت صرف خدا کی ہے۔رسول بھی وہی کچھ کر سکتا ہے جس کے متعلق خدا نے اس کو اجازت دی ہے کہ تم اپنی ذات کے لیے یہ کر سکتے ہو'اس سے زیادہ نہیں۔**وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرَا** (33:38) اسی لیے تو خدا نے یہ قوانین کے پیمانے دیدیئے ہیں کہ یہ بدل نہیں سکتے۔یہ ہنگامی حوادث سے متاثر ہو کر نہیں بنا کر دیئے۔اسی لیے یہ غیر متبدل اور ابدی ہوتے ہیں۔ پہلی امتوں میں' پہلے رسولوں کے ہاں بھی' ہم نے قوانین کے یہی پیمانے دیئے تھے۔یہ وہ رسول تھے' یہ وہ انبیائے کرامؑ تھے جو **الَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَ يَخْشَوْنَهٗ وَ لَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ط وَ كَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا** (33:39) خدا کے احکام کو دوسروں تک پہنچاتے تھے۔یہ ہے رسالت۔اور اس معاملے کے اندر خدا کے سوا کسی کا خوف ان کے دل میں نہیں ہوتا تھا۔جب وہ یہ بات پہنچاتے تھے تو **وَ كَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا**(4:45) کتنی ہی مخالفتیں کیوں نہ ہوں خدا کی مدد ان کے لیے کافی ہوتی تھی۔

---

[1] بڑے کے مقابلے پہ آ ٹھہرے ہو یعنی ان کے ساتھ بھی بڑا بن بیٹھے۔

کسی کا بیٹا ہونے کی حیثیت سے نبی اکرم کے متعلق قرآن حکیم کی وضاحت

اوراب رہا ان لوگوں کا اعتراض کہ اس نے اپنے منہ بولے بیٹے کی بیوی سے شادی کر لی تو کہا کہ ان سے کہدو کہ **مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ** (33:40) محمدﷺ تم میں سے کسی لڑکے کا بھی باپ نہیں ہے۔ یہ بھی وہی بات ہے کہ مُتبنّیٰ حقیقی بیٹا نہیں ہوجاتا۔ اب رہا یہ کہ یہ جو قوانین ہیں' قرآن نے کہا ہے کہ پہلے بھی جو انبیاء آئے تھے' ان کی طرف بھی یہی قانون دیئے گئے تھے' تمہاری طرف بھی یہی قانون دیئے گئے ہیں۔ سوال یہ تھا کہ کیا اس کے بعد بھی یہی قوانین رہیں گے؟ جو ابدی قوانین خدا کی طرف سے آتے رہے ہیں' آپﷺ کو بھی وہی قوانین دیئے گئے ہیں تو اس کے بعد کی کیا صورت ہوگی؟ کہا کہ اس کے بعد کی صورت تو بڑی اہم ہے اور بڑی صاف ہے کہ **وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ** (33:40) نبوت ہی تم پہ ختم ہوگئی' یعنی خدا کی طرف سے وحی ملنے کا سلسلہ ہی تم پر ختم ہوگیا۔ اس لیے یہ جو اب احکام دیئے ہیں' یہ تو قیامت تک کے لیے غیر متبدل ہوگئے۔ **وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمًا** (33:40)۔ اور یہ سب کچھ اللہ کے لامحدود علم کی بنا پر ہوا' اس لیے کہ ہمیں علم ہے کہ کہاں آ کر کس معاملے کو ختم کرنا چاہیے۔ نبوت کا جو سلسلہ چلا آ رہا تھا' ہم جانتے ہیں کہ اسے کہاں ختم کرنا چاہیے تھا۔ سو ہم نے ختم کر دیا۔

خاتم النبین کے سلسلہ میں زیر اور زبر کا قصہ نیز احمدی اور غیر احمدی کے سلسلہ میں بہاولپور کا مقدمہ

عزیزانِ من! خاتم النبین کے اوپر بڑے جھگڑے ہوتے ہیں کہ خاتم 'ت کی زبر کے ساتھ ہے' یا ت کی زیر کے ساتھ ہے۔ اندازہ لگائیے کہ ''اپنی نبوت'' کو چمکانے کے لیے خاتم کے ت پر زبر یا زیر کا قصہ ہے' اس پہ لمبی چوڑی بحثیں ہیں۔ یہ ہمارے ہاں جو مرزا مدعیٔ نبوت ہوا تو اس سلسلے میں بھی حیرت تھی کہ قریباً سو سال تک بحثوں پہ بحثیں چلی جارہی ہیں:

ڈور کو سلجھا رہے ہیں اور سرا ملتا نہیں

پھر اپنی بات درمیان میں آ گئی۔ قانونی طور پر یہ بات سب سے پہلے 1926ء میں بہاولپور کی ریاست میں چھڑی تھی۔ اب میں یہ احمدی اور غیر احمدی کے الفاظ استعمال کرونگا کیونکہ وہ مرزائی اپنے آپ کو یہی کہتے تھے (اور آج بھی کہتے ہیں)۔ ایک غیر احمدی لڑکی نے یہ دعویٰ کر دیا تھا کہ یہ شخص جس کے ساتھ میری شادی ہوئی ہے' معلوم ہوا ہے کہ یہ احمدی ہے تو اس کے ساتھ میری شادی نہیں ہوسکتی کیونکہ یہ مسلمان نہیں ہے۔ یہ وہاں دعویٰ ہوا تھا اور یہ پہلا دعویٰ تھا جو ہوا ہے۔ اس دعوے نے شخصی حیثیت سے آگے بڑھ کر قومی حیثیت اختیار کر لی تھی یعنی وہاں یہ ایسا مسئلہ آ گیا تھا کہ کیا یہ احمدی یا مرزائی مسلمان ہیں یا نہیں؟ مسئلہ یہ آ گیا تھا اور لڑکی کے نکاح کا مسئلہ پیچھے چلا گیا تھا۔ ہندوستان بھر کے جو تمام علمائے کرام تھے' وہ بھی وہاں پہنچتے تھے اور احمدی بھی وہاں پہنچتے تھے۔ وہاں نو سال تک یہ مقدمہ چلتا رہا۔

1935ء میں وہاں کے جو ڈسٹرکٹ جج (محمد اکبر) تھے' انہوں نے اس کا فیصلہ لکھا۔ فیصلہ چھپا ہوا آج موجود ہے۔ اس فیصلے میں انہوں نے لکھا کہ اتنے سالوں تک یہ مقدمہ چلتا رہا' دونوں طرف سے علمائے کرام آتے رہے۔ میں کسی صحیح فیصلے پہ نہیں پہنچ سکا تھا کہ رسول اللہ ﷺ خاتم النبین ہیں اور جو اس طرح سے رسول اللہ ﷺ کو خاتم النبین نہ مانے اور حضور ﷺ کے بعد نبی کا دعوے کرے' وہ مسلمان نہیں رہتا۔ میرا ذہن اس میں صاف نہیں ہو رہا تھا۔ نو سال تک یہ بحثیں ہوتی رہی تھیں۔ اس کے فیصلے میں لکھا ہوا ہے کہ اتفاقاً میں نے ایک رسالہ (اعظم گڑھ سے المعارف رسالہ جو نکلتا ہے' اس زمانے میں اس میں میرے مضامین چھپا کرتے تھے) دیکھ رہا تھا اور اس شخص (پرویز) کا یہ مضمون جو میں نے پڑھا تو ساری بات ہی واضح ہو گئی۔ اس نے صبح اٹھ کے فیصلہ لکھ دیا کہ اس سے مجھے بات سمجھ میں آ گئی کہ یہ کوئی الجھنے والی بات ہی نہیں ہے یہ تو مسئلہ ہی بڑا صاف ہے۔ یہ مسلمان کہلا ہی نہیں سکتے۔ ان کے خلاف اس نے فیصلہ دیدیا کہ یہ مسلمان نہیں ہیں اور نکاح کو فسخ کر دیا۔

معاف کیجیے گا کہ میں وہ میں نہیں لاتا لیکن جب بات ہے تو کس طرح سے اور بیان کروں۔ وہ لکھا ہوا چھپا ہوا فیصلہ موجود ہے۔ یہ جو ابھی یہاں ختمِ نبوت کی تحریک ہوئی تھی اس میں پھر انہوں نے اس کو چھاپ کر بہت عام کیا تھا۔ اگرچہ جہاں یہ علماء حضرات اس کو Quote (نقل) کرتے تھے تو درمیان میں یہ حصہ حذف کر جاتے تھے کہ یہ کس کا مضمون تھا جس پہ اس نے یہ فیصلہ دیا تھا۔ ''ہندواں دیاں زنانیاں ناں نہیں لیندیاں ہوندیاں اپنے پتی دا' ناں نہ لین تداں وی او پتی رہندا ہیگا اے[1]''۔ وہ بات کیا تھی؟ اس نے لکھا تھا کہ اگر خاتم النبین کا لفظ قرآن نہ بھی کہتا' جب بھی نبوت کا اختتام تھا۔ نبی آتا ہے اور اللہ کے احکام کو آگے پہنچاتا ہے۔ تو خدا نے یہ کہہ دیا کہ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا (6:115) ہم نے جو کچھ پیغام بھیجنا تھا وہ یہاں مکمل ہو گیا اور اب لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (6:34) ان میں تبدیلی بھی نہیں ہو سکتی۔ یعنی اضافہ نہیں ہو سکتا' تبدیلی بھی نہیں ہو سکتی اور وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (15:9) ہم اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں' اس میں کسی قسم کی تحریف نہیں ہو سکتی۔ خدا کی طرف سے جو پیغامات تھے نبی وہی پہنچانے کے لیے آتا تھا تو جب اس نے کہہ دیا کہ جو کچھ ہم نے انسانوں کے لیے پیغام پہنچانا تھا' وہ پہنچا دیا اور یہ قرآن ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ (6:90;12:10; 38:87;68:52) ہے۔ یعنی یہ تمام نوعِ انسانی کے لیے ہے قیامت تک کے لیے ہے۔ اور اس میں ہماری ساری باتیں مکمل ہو گئی ہیں اور غیر متبدل ہیں اور محفوظ ہیں۔

---

[1] ہندو عورتیں اپنے خاوندوں کا نام نہیں لیں۔ نام نہ بھی لیں تب بھی وہ ان کا خاوند تو رہتا ہی ہے۔

میں نے کہا کہ اس کے بعد نبی کیا کرنے آئے گا۔یعنی وہ کہتا ہے کہ باتیں مکمل ہوگئیں، ختم ہوگئیں، ہم نے کچھ اور کہنا ہی نہیں ہے۔میں نے کہا ہے کہ خاتم النبین اللہ تعالیٰ نے کہدیا ہے تو یہ الگ بات ہے اگر وہ نہ بھی یہ کہتا تو وہ تو اس سے بات ختم ہوگئی تھی کہ نبی کا فریضہ ہے کہ خدا کے احکامات جو اس پر نازل ہوتے ہیں، وہ ان کو آگے پہنچائے یُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ (33:39)۔تو جب آیات ہی خدا کی طرف سے نہیں آنی تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ (6:115) خدا کی باتیں ختم ہوگئی ہیں، ان میں تبدیلی بھی نہیں ہونی تو پھر اس قرآن کی موجودگی میں خدا کی طرف سے کسی اور آنے والے کی ضرورت اور گنجائش نہیں ہے۔اس کے اوپر فیصلہ ہوگیا کہ کسی آنے والے کی گنجائش ہی نہیں رہتی لیکن ان کے اوپر یہ زد پڑتی تھی کہ انہوں نے تو کوئی آنے والے مقرر کر رکھے ہوئے ہیں۔آپ کو معلوم ہے کہ میرے اس مضمون پر عدالت نے فیصلہ 1935ء میں دیا تھا۔ان کو چاہیے یہ تھا کہ آگے بحث ہی نہ کرتے اور عدالت کا فیصلہ آگے لے جاتے اور بات ہی آگے نہ چلتی لیکن پھر بھی بحثیں چلتی رہیں کیونکہ وہ تو کوئی آنے والے اور آتے تھے۔اور میرے جس مضمون پہ یہ فیصلہ ہوا تھا، مجھے ہی منکرِ رسالت قرار دیدیا:

جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

جس کے مضمون کے اوپر عدالت نے فیصلہ دیدیا کہ یہاں سے بات سمجھ میں آئی کہ واقعی حضور ﷺ پہ نبوت ختم ہوگئی ہے، اسی کو کہہ رہے ہیں کہ یہ رسالتِ نبوی ﷺ کا منکر ہے۔

کیا ختم نبوت کے بعد قرآنی نظام کا خاتمہ ہو جائے گا؟

آگے کہا ہے کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا (33:41) اے جماعتِ مومنین!۔یعنی یہ بات محمد ﷺ تک ہی نہیں ہے کیونکہ حضور ﷺ تو اپنے وقت پہ دنیا سے تشریف لے جائیں گے۔حضور ﷺ کے متعلق کہا ہے کہ انہیں بھی موت آئے گی اور آپ نے بھی ایک دن چلے جانا ہے، چلے گئے تو کیا یہ بات بعد میں ختم ہوگئی؟ کہا کہ یہ بات نہیں ہے۔صرف نبوت ختم ہوئی ہے، اس نظام نے قیامت تک رہنا ہے کیونکہ کتاب اللہ کو محفوظ ہی اس لیے رکھا گیا ہے۔اب یہاں يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا (33:41) کہا گیا ہے کہ اے جماعتِ مومنین! اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا (33:41) اب تم یہ جو قوانینِ خداوندی ہیں ان کو زیادہ سے زیادہ شدت سے اپنے سامنے رکھو۔ وَّ سَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا (33:42) صبح شام، دن رات اس نظام کو باعثِ حمد وستائشِ خداوندی بنانے کے لیے پوری پوری

جدوجہد کرتے رہو۔اب انہوں نے سَبِّحُوْهُ کا ترجمہ یہ کردیا کہ ”تسبیحاں پھیر دے رہیا کرو، تے اوہدے ضابطیاں دی خلاف ورزی کر کے جوتیاں کھاندے رہیا کرو❶“۔کہا ہے کہ هُوَ الَّذِىْ يُصَلِّىْ عَلَيْكُمْ وَ مَلٰٓئِكَتُهٗ (33:43)او جماعتِ مومنین! اللہ اور اس کے فرشتے تم پہ درود بھیجتے ہیں۔ہمیں تو اتنا ہی بتایا گیا ہے کہ اللہ اور اس کے ملائکہ نبی ﷺ پر درود وسلام بھیجتے ہیں، یہ بات نہیں بتائی گئی کہ اللہ اور اس کے فرشتے جماعتِ مومنین پر بھی درود بھیجتے ہیں۔درود شریف بھیجنے کی یہ بات تشریح طلب ہے اس لیے اسے ہم آئندہ درس پر اٹھار کھتے ہیں۔

عزیزانِ من! سورۃ الاحزاب کی آیت 42 تک ہم آ گئے۔43ویں آیت کو ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

❀❀............❀❀............❀❀

---

❶ تسبیحیں کرتے رہا کرو اور اس کے ضابطوں کی خلاف ورزی کر کے جوتے کھاتے رہا کرو۔

چھٹا باب: **الاحزاب** (آیات 41 تا 44: درود شریف کا مفہوم)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج جنوری 1980ء کی 18 تاریخ ہے۔ اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الاحزاب کی آیت 43 سے ہونا تھا' چونکہ مقام ذرا مشکل آیا ہے' اس لیے آیت 41 سے ہی ہو رہا ہے: (33:41)۔

مذہب اور دین میں ایک بنیادی فرق ہے

جیسا کہ میں نے پچھلے درس میں عرض کیا تھا کہ یہ درود شریف کے متعلق ہے۔ قبل اس کے کہ میں اس موضوع کو شروع کروں' ایک تنبیہ' ایک وارننگ یا گزارش نہایت ضروری سمجھتا ہوں۔ میرے درس کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں دین' مذہب میں تبدیل ہو چکا ہے' مذہب میں دین کے پروگرام کے جتنے بھی ضوابط ہوتے ہیں' ان کی شکلیں باقی رہ جاتی ہیں' ان کی روح' ان کی غرض و غایت' ان کا نتیجہ جو مرتب ہونا چاہیے تھا' وہ باقی نہیں رہتا۔ یہ ہے مذہب اور دین میں ایک بنیادی فرق۔

نماز' حج' زکوٰۃ' کے سلسلہ میں پرویزؒ کا مسلک

قرآنِ کریم میں جہاں جہاں اس پروگرام کے اجزا آتے ہیں' میں قرآن کی روشنی میں یہ پیشِ خدمت کرتا ہوں کہ قرآن نے کیا کہا ہے اور یہ کہ اس سے کیا نتیجہ مرتب ہوگا۔ اس کے بعد میں کہتا ہوں کہ یہ جو چیزیں ہم اس طرح سے کر رہے ہیں' قرآن کی روشنی میں ہمیں کھڑے ہو کر سوچنا چاہیے کہ جب یہ اللہ تعالیٰ کی منشا کے مطابق سرانجام دی جائیں گی تب یہ وہ نتیجہ پیدا کریں گی جو خدا نے ان

کے لیے کہا ہے۔مثلاً صلوٰۃ کے متعلق میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن کہتا ہے کہ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡھٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَ الۡمُنۡکَرِ (29:45) صلوٰۃ سے برائیاں اور بے حیائیاں معاشرے سے دور ہوجاتی ہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن نے ہمارے لئے یہ پرکھنے کے لئے ایک کسوٹی دی ہے' ایک معیار دیا ہے' ایک اصول دیا ہے کہ صلوٰۃ وہ ہے جو خدا نے مقرر کی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ معاشرے سے برائیاں اور بے حیائیاں ختم ہوجائیں گی۔ میں نے کہا یہ تھا کہ اس وقت جس چیز کا نام ہم صلوٰۃ رکھ کر یا جس کو ہم نماز کہتے ہیں' ادا کرتے ہیں تو اس کا نتیجہ یہ مرتب نہیں ہورہا تو ہمیں کھڑے ہوکر سوچنا چاہیے کہ ہم سے کہاں غلطی ہورہی ہے۔اور اُس وقت مطمئن ہونا چاہیے جب صلوٰۃ کا یہ نتیجہ مرتب ہوجائے پھر ہم کہیں گے کہ یہ خدا کے حکم کی واقعی اطاعت ہورہی ہے۔عزیزانِ من! اس کے ساتھ ہی آپ کو یاد ہوگا کہ میں بار بار دہرائے چلا جارہا ہوں کہ ہماری مسلمانوں کی حیثیت ایک قوم کی ہے' ہمارے ہاں کچھ قومی یا ملی شعائر ہیں' وہ چلے آرہے ہیں۔ یہ چیزیں مذہب کے اندر نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ کی شکل میں ہمارے ہاں چلی آرہی ہیں۔ میں اس کے ساتھ ہی تاکید کرتا چلا آرہا ہوں کہ کم از کم میرا مسلک یہ ہے کہ ان کو بہ حالہٖ اسی طرح سے' قائم رکھا جائے۔اس لیے کہ ان سے ہمارا ایک قومی تشخص وابستہ ہے۔کوشش یہ کی جائے کہ یہ وہ شکل اختیار کرلیں جس سے وہ نتائج مرتب ہوں جو قرآن نے بتائے ہیں۔ میرا مسلک یہ ہے کہ یہ جس حالت' جس شکل' میں بھی امت کے اندر چلے آرہے ہیں ان کو اسی طرح سے قائم رکھا جائے۔اور میں نے یہ کہا ہے کہ میں خود اس پر عمل پیرا ہوں۔اُسی طرح سے کرتا ہوں جس طرح سے ملت میں یہ کیا جارہا ہے' اس میں' میں نہ کسی ردوبدل کو جائز سمجھتا ہوں' نہ کوئی نیا طریقہ وضع کرنے کو جائز سمجھتا ہوں بلکہ اس کی بڑی سخت مخالفت کرتا ہوں۔

فرقہ اہل قرآن سے میری مخالفت کی وجہ

یہ جو اہلِ قرآن آپ کے ہاں فرقہ ہے' میری ان سے سخت تریں مخالفت اسی وجہ سے ہے کہ انہوں نے اپنے ہاں ایک نئی نماز اختیار کرلی' نئی نئی وضع کے اور مسائل اختیار کرلیے۔ میں قطعاً اسے جائز نہیں سمجھتا۔اور ان چیزوں کو علیٰ حالہٖ قائم رکھنے کی بڑی تاکید کرتا ہوں۔

میری مخالفت کرنے والوں سے میری گزارش: پرویزؒ

میں نے اس کے بعد دیکھا یہ ہے کہ بات تو میں یہ کہتا ہوں اور باہر سے یہ آوازیں آرہی ہیں کہ صاحب! وہ جو آپ کے ہاں درس میں لوگ آتے ہیں' انہوں نے آکر بتایا ہے کہ پرویز صاحب کہتے ہیں کہ نماز تو فضول ہے' پڑھنی ہی نہیں چاہیے۔ایسا کہنے والوں کو' میں سمجھتا ہوں کہ دو شقوں میں تقسیم کردینا چاہیے۔ایک تو یہ کہ

بزم میں اہلِ نظر بھی ہیں تماشائی بھی

ایسے احباب بھی ہونگے جو شاید میری اس بات کو سمجھ ہی نہ سکتے ہوں کہ جو میں کہتا ہوں وہ ہے کیا۔ شاید ان کی فکری سطح اتنی بلند نہ ہو۔ میں اگرچہ کوشش کرتا ہوں اور بار بار دہرا کر کوشش کرتا ہوں' پہلے اوپر بات کہتا ہوں' پھر اور سلیس کہتا ہوں' پھر اور آسان کہتا ہوں' عام فہم الفاظ میں بھی سمجھاتا ہوں لیکن اس کے باوجود ہوسکتا ہے کہ ایسے احباب ہوں جو میری لم اور غایت کو نہ سمجھ سکتے ہوں۔ ان کی یہ جہالت ہے۔ ان سے تو میں یہ گزارش کرونگا کہ اگر آپ اسے پورے طور پر نہیں سمجھ پاتے تو کم از کم میری طرف اس قسم کی باتیں منسوب کرکے باہر نہ کہیے۔ میرا تو اس میں کوئی نقصان نہیں' یہ میرا پروفیشن نہیں' مجھے اس سے آمدنی نہیں لیکن قرآن کے خلاف یہ بات جاتی ہے۔ لوگ اس سے بدک جاتے ہیں' پہلے ہی کچھ کم پروپیگنڈہ میرے خلاف نہیں کیا گیا اور وہ تو خاص سازش کے ماتحت کیا تھا کہ قوم قرآن کی طرف نہ آنے پائے۔ لیکن یہ جو چیزیں ہمارے نادان دوست کرتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عام طور پر یہ بات پھیلائی جاتی ہے کہ صاحب! اس درس میں کہا جاتا ہے کہ نماز فضول چیز ہے' پڑھیے ہی نہیں۔ اگر کوئی شخص آنے کے لیے تیار بھی تھا یا قرآن کے قریب آنے کے لیے آمادہ بھی ہوتا تھا تو وہ یہ سن کر کہہ دے گا کہ لاحول ولا اس قسم کے آدمی کے درس میں جانے کا کیا فائدہ ہے۔ کچھ تو یہ حضرات ہیں اور کچھ وہ ہیں' جو مجھے معلوم ہے کہ کچھ سازش کے تحت یہ کرتے ہیں۔ اور وہ آتے اس لیے ہیں کہ وہ ذرا معتبر اور مستند بن کر بات کریں کہ ہم نے خود وہاں جا کر سنا ہے۔ یہ بڑی بات ہوجاتی ہے کہ ہم کسی سے سنی سنائی بات نہیں کر رہے بلکہ ہم نے وہاں خود سنا ہے۔ تو ان کا تو میرے پاس کوئی علاج نہیں۔ ان کے لیے ان کا علاج آپ کے پاس ہے کہ باہر کہیں آپ کے کان میں اس قسم کی بات پڑے تو جو کچھ میں کہتا ہوں آپ وہاں یہ کہیے کہ وہ یہ نہیں کہتا جو یہ لوگ کہہ رہے ہیں' وہ تو یہ کہتا ہے۔ ہم خود وہاں جا کر سنتے ہیں اور وہ یہ چیز ہے۔ اس طرح سے کسی حد تک آپ اس کا ازالہ کر سکتے ہیں۔

عزیزانِ من! ایسے لوگ بھی آتے ہیں' جو مثلاً نماز نہیں پڑھتے۔ ان سے پوچھا جاتا ہے کہ نماز کیوں نہیں پڑھتے تو بجائے اس کے کہ اس کی ذمہ داری اپنے اوپر لیں' اگر کوئی اس کو مفید نہیں سمجھتا تو ذرا جرأت سے کہیں کہ صاحب! ہم اسے مفید نہیں سمجھتے اس لیے نہیں پڑھتے۔ بجائے اس کے کہ وہ اپنے ذمے یہ بات لیں' وہ کہتے یہ ہیں کہ ہم تو خود پرویز صاحب سے سن کر آئے ہیں کہ یہ نماز ہے ہی فضول' اس کا کچھ فائدہ ہی نہیں ہے۔ یعنی وہ بندوق میرے کندھے پہ رکھ کر چلاتے ہیں۔ میں تو خود یہ نماز پڑھتا ہوں' اسی طرح سے پڑھتا ہوں جس طرح سے یہ عام امت پڑھتی ہے' اس میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے سے سختی سے ٹوکتا ہوں۔ ذرا جرأت پیدا کیجیے' کہیے کہ صاحب! ہاں ٹھیک ہے ندامت ہے تو کہیے کہ مجھے افسوس ہے کہ میں اس پہ کاربند نہیں ہوں۔ اسے آپ مفید نہیں سمجھتے تو اپنے اندر جرأت پیدا کیجیے کہ میں اس کو مفید نہیں سمجھتا۔ آپ پرویز (1985-1903) کو کیوں بدنام کرتے ہیں۔ یعنی میں یہ نہیں کہتا کہ جو کچھ میں حق کی بات قرآن

سے کہتا ہوں آپ وہ نہ کہیں۔ میں کہتا یہ ہوں کہ جو کچھ میں نہیں کہتا اسے تو میری طرف منسوب نہ کریں۔ یہ چیز ہے کہ جو قومی شعار ہیں' ان کو قائم رکھا جاتا ہے۔

درود کے تصور' اس کے احترام اور مقام کی وضاحت کے علاوہ' اس کا قرآنی مفہوم

میں پھر عرض کرونگا کہ آپ اپنا نام عبداللہ رکھتے ہیں حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ اللہ کے عبد نہیں ہیں۔ اللہ کا عبد ہونا' اللہ کا محکوم ہونا' اس کا اطاعت گزار ہونا' تو بڑی چیز ہے۔ آپ کو عبداللہ کہلانے کا حق اس وقت ہوگا جب آپ واقعی خدا کی عبدیت' محکومیت اختیار کیے ہوئے ہوں۔ اگر نہیں کیے ہوئے تو آپ کو یہ حق حاصل نہیں کہ اپنا نام عبداللہ رکھیں لیکن اس کے باوجود آپ عبداللہ نام کیوں رکھتے ہیں؟ آپ کیوں رام داس نام نہیں رکھتے۔ بات یہ ہے کہ حقیقت میں اس کا مفہوم وہ نہیں' آپ عبداللہ نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود آپ عبداللہ نام رکھتے ہیں اس لیے کہ یہ ہمارا قومی شعار ہے۔ مسلمان کی پہچان نام سے بھی ہو جاتی ہے۔ جب ایسی چیزیں جن کا مفہوم مقصود وہ نہیں ہے' اُسے آپ اختیار کرتے ہیں' تو اس کے متعلق آپ یہ کیا کہتے ہیں کہ صاحب! اس کا فائدہ کچھ نہیں ہے' مفید نہیں ہے' اس لیے ہم اختیار نہیں کرتے۔ اگر آپ کہتے بھی ہیں تو میں نے عرض کیا ہے کہ اپنی طرف سے کہیے' میری طرف سے نہ کہیے۔ میں پھر عرض کردوں کہ اس سے میرا نقصان نہیں ہے' میری تو ساری عمر انہی تیروں کو سہارتے ہوئے گزر گئی۔ اس سے قرآنِ کریم کے راستے میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ لوگ باہر سے ہی اس قسم کا پروپیگنڈہ شروع کر دیتے ہیں۔ اس تنبیہ کے بعد اب میں آگے آتا ہوں۔

میں نے یہ بات آج ضروری سمجھی ہے کہ یہ مقام جسے آپ درود شریف کہتے ہیں' بہت ہی نازک آ رہا ہے۔ نماز کے متعلق تو پھر بھی شاید کچھ برداشت کرلیں لیکن اگر کسی سے یہ کہہ دیا جائے کہ وہ تو درود شریف کا بھی منکر ہے تو اسے تو برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بڑا نازک مقام ہے' اس کی اہمیت' اس کا احترام' دل کی گہرائیوں میں ہے۔ میں پہلے ہی عرض کردوں کہ آپ نے تو دیکھا ہوگا کہ جب بھی نبی اکرم ﷺ کا اسمِ گرامی آتا ہے تو صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ساتھ میں التزاماً کہتا ہوں اور لکھتا بھی ہوں۔ اسے ہی تو درود کہا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ جو چیز ہے' یہ یوں نہ سمجھیے جو کچھ قرآن کہتا ہے اسے سمجھنے کی کوشش کیجیے کہ وہ کہتا کیا ہے۔ کہا ہے کہ **یٰٓاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اذۡكُرُوا اللّٰهَ ذِكۡرًا كَثِیۡرًا ۙ- وَّ سَبِّحُوۡهُ بُكۡرَةً وَّ اَصِیۡلًا** (33:41-42)۔ یہ سورۃ الاحزاب ہے جس میں مخالفین قبائل کے لشکر ایک متحدہ محاذ بنا کر مسلمانوں کے مقابلے میں آ گئے تھے اور یہ جنگِ خندق بڑی زلزلہ انگیز اور ہولناک جنگ تھی۔ پہلے اس کی تفصیل چلی آ رہی ہے۔ اور اس کے بعد جماعتِ مومنین سے تاکید کی جا رہی ہے کہ **یٰٓاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اذۡكُرُوا اللّٰهَ ذِكۡرًا كَثِیۡرًا**- (33:41) اے جماعتِ مومنین! خدا کے قانون کو اس طرح سامنے رکھو کہ یہ کبھی تمہاری نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پائیں۔ زندگی کے ہر گوشے میں' ہر

میدان میں، کاروبارِ حیات کے ہر شعبے میں، جہاں بھی تم ہو، ذِكْرًا كَثِيْرًا کثرت سے اس کو اپنے سامنے رکھو کہ یہ کیا کہتا ہے۔ جو قدم اٹھانے لگو تو پہلے سوچو کہ اس کی بابت قرآن کیا کہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کو ''ذکر'' کہا ہے۔ اب یہیں سے بات شروع ہو جائے گی۔ ہمارے ہاں تو ذکر یہ ہے جو آج کل خاص طور پر بہت زیادہ کثرت سے مسجدوں کے اندر ہوتا ہے۔ نماز کے بعد بھی اور صبح بھی وہ جو قلب کے اوپر ضربیں لگاتے ہیں، اس کا نام ذکر رکھا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو قرآن کو ''ذکر'' کہا ہے، ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ (38:87) کہا ہے۔ ''ذکر'' کے معنی ہوتا ہے ''کسی چیز کو ہمیشہ سامنے رکھنا''۔ تاکید یہ کی جا رہی ہے کہ مخالفین کا ہجوم بڑھ کے آ رہا ہے، مخالفت بڑی شدت سے ہو رہی ہے اس کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک ہی پروگرام ہے۔ اور وہ یہ کہ تم قوانین و ہدایاتِ خداوندی کو بکثرت اپنے سامنے رکھو۔ جتنی شدت کی مخالفت ہے، اسی کثرت سے تم اس پہ توجہ دو اور اس کو زندگی کے ہر شعبے میں اپنے سامنے رکھو کہ خدا کا اس باب میں ہمارے لیے کیا حکم ہے، قرآن کیا تلقین کرتا ہے، وہ کیا تعلیم دیتا ہے۔ کہا کہ ذِكْرًا كَثِيْرًا ۙ وَّ سَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا (33:41-42) اور پھر یہاں وہ سَبِّحُوْهُ کا لفظ آ گیا۔ آپ کو پتہ ہے، میں نے بتایا ہوا ہے کہ تسبیح کے معنی کیا ہیں۔ تسبیح کے معنی ہیں ''سرگرداں رہنا، انتہائی کوشش کرنا، پوری پوری جدوجہد کرنا'' یہاں کہا ہے کہ اس پروگرام کی تکمیل میں جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے سپرد کیا ہے، صبح شام دن رات امکان بھر کوشش کرتے رہو، شدت سے سرگرداں رہو، اس کے لیے پوری پوری جدوجہد کرو۔ یہ ایک پروگرام بتایا گیا ہے۔

درود کا مفہوم

اس کے بعد کہا کہ هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَ مَلٰٓئِكَتُهٗ (33:43)۔ میں نے پچھلی دفعہ (جنوری 1980 کی 11 تاریخ کے درس میں) بھی عرض کیا تھا اور میں اب پھر اس چیز کے اوپر آتا ہوں۔ یہ جو ہمارے سامنے ابھی یہ آیت آگے آتی ہے، وہ 56 ویں آیت ہے۔ اس میں کہا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ (33:56)۔ اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ اللہ اور اس کے ملائکہ نبی پر درود بھیجتے ہیں۔ گویا ہمارے سامنے یہی چیز آتی ہے کہ اللہ اور اس کے ملائکہ نبی پر درود بھیجتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ آیت کبھی بھی سامنے نہیں لائی گئی ہو گی کہ هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَ مَلٰٓئِكَتُهٗ (33:43)۔ وہی اللہ اور ملائکہ کا ذکر ہے اور وہی يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ کے الفاظ ہیں۔ یہ مومنین کے متعلق ہے۔ جو کچھ خدا اور اس کے ملائکہ نبی کے ساتھ کرتے ہیں بعینہٖ وہی الفاظ مومنین کے متعلق ہیں۔ ترجمہ اگر آپ نے کرنا ہے کہ اللہ اور اس کے ملائکہ نبی پر درود بھیجتے ہیں تو وہ آیت 56 ہے اور یہاں ہے کہ اللہ اور اس کے ملائکہ تم پر درود بھیجتے ہیں۔ یہاں تک آپ نے غور فرما لیا کہ یہ کوئی ایسی چیز ہے جو خدا اور اس کے ملائکہ صرف نبی کے ساتھ ہی نہیں کر رہے

بلکہ وہ جماعتِ مومنین کے ساتھ بھی کرتے ہیں۔ وہ کیا کرتے ہیں' تو وہ بات آگے آئے گی لیکن قرآنِ کریم کی ان دو آیتوں سے یہ تو آپ نے دیکھ لیا۔ ان دونوں کے حوالے ذہن میں رکھیے۔

عزیزانِ من! میں نے اسی لیے عرض کیا ہوا ہے کہ قرآن کے چھوٹے چھوٹے نسخے لے آیا کیجیے تو قرآن بڑی عمدگی سے سمجھ آئے گا۔ اس سورۃ کی 43ویں آیت اور 56ویں آیت دونوں کے الفاظ وہی ہیں: **هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَ مَلٰٓئِكَتُهٗ** (33:43) اور **اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ** (33:56)۔ یہاں بات واضح ہوگئی کہ جو کچھ بھی وہاں نبی کے متعلق خدا کہہ رہا ہے کہ اللہ اور اس کے ملائکہ کر رہے ہیں' یہاں اللہ اور اس کے ملائکہ وہی کچھ مومنین کے ساتھ بھی کر رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ اس کے معنی اگر آپ درود بھیجنا کہتے ہیں تو پھر خدا اور اس کے ملائکہ نبی پر درود بھیجتے ہیں' خدا اور اس کے ملائکہ جماعتِ مومنین پر درود بھیجتے ہیں۔ اس میں دونوں شریک ہیں۔

درود کا لفظ قرآن کریم میں نہیں آیا اور نہ ہی یہ عربی کا لفظ ہے

درود کا لفظ قرآنِ کریم میں نہیں ہے۔ قرآنِ کریم میں تو ایک طرف' یہ عربی زبان کا لفظ ہی نہیں ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں نے عرض کیا ہے اور خاص طور پہ میں نے اپنی کتاب ''شاہکارِ رسالت'' میں بڑی وضاحت سے یہ لکھا ہے کہ دین جو خدا نے رسول اللہ ﷺ کی وساطت سے بھیجا تھا وہ جب مذہب میں تبدیل ہوا ہے تو اس میں ایران کے جو مجوسی مذہب والے تھے' جن کو مسلمانوں نے فتح کیا تھا' یہ ان ایرانیوں کا وضع کردہ ہے۔ تصورات ان کے ہیں' عقائد ان کے ہیں' نظریات ان کے ہیں۔ کہا یہ گیا کہ اس دین کے جیسے قرآن کے الفاظ تو وہی رہنے دیئے' تفسیر بدل دی۔ اب آپ الفاظ تو قرآن کے دہراتے ہیں اور مطلب وہ لیتے ہیں جو اُن تفسیروں میں ہیں جس میں سارے تصورات ان ایرانیوں کے ہیں جو مجوسی تھے جن کو آپ پارسی کہتے ہیں۔ اب تو وہ دنیا میں بہت کم رہ گئے ہیں' ایران میں بھی بہت کم مجوسی ہیں' ہندوستان میں ہمارے ہاں بمبئی کے اردگرد وہاں آباد ہیں۔ کچھ کاروبار سا وہ کرتے ہیں' ان کی کوئی مذہبی یا قومی حیثیت باقی نہیں رہی لیکن یہ پورے کا پورا ایران اُس وقت مجوسی تھا جب مسلمانوں نے اسے فتح کیا ہے۔ اور یہ تھا وہ ہرمزان جو حضرتِ عمرؓ کی خلافت (634-644/45AD) میں سامنے آیا تھا تو اس نے یہ کہا تھا کہ ہماری شکست کی وجہ یہ ہے کہ پہلے ہم ایرانی اور تم عرب اکیلے اکیلے لڑتے تھے۔ اب جو ہم میدانِ جنگ میں آتے ہیں تو ایرانی تو اکیلے ہوتے ہیں اور تمہارے ساتھ تمہارا خدا ہوتا ہے' تمہارے خدا کو تم سے چھڑا دیا جائے تو پھر مقابلہ کر کے بتانا۔

قرآنی مفہوم کو بدلنے کے سلسلہ میں قرآن حکیم کی اصطلاحات کے خلاف ایک گہری سازش

انہوں نے خدا کو چھڑانے کے لیے سازش کی کہ آپ کے دین ہی کو بدل دیا لیکن انہیں پتہ تھا کہ اگر دین کے یہ شعائر' یہ چیزیں' جن کو یہ مسلمان ادا کرتے ہیں' یہ قرآنِ مجید کو بدلا تو اس کو تو کبھی بھی یہ لوگ قبول نہیں کریں گے۔ جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ انہوں نے قرآن کے اندر ایک لفظ کا ادھر اُدھر اضافہ نہیں کیا لیکن معنی بدل دیئے۔ یہ آپ کے ہاں کی اصطلاحات' یہ صوم حج زکوٰۃ' کی شکلیں وہی رہنے دیں ان کی غرض وغایت بدل دی۔ یہاں تک کہ ان کے تو نام بھی بدلے مثلاً صلوٰۃ کی جگہ نماز (یہ عربی زبان کا لفظ ہی نہیں ہے)' صوم کی جگہ روزہ (یہ بھی عربی زبان کا لفظ نہیں ہے)' **یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ** کا ترجمہ درود (یہ بھی عربی زبان کا لفظ نہیں ہے)۔ مجوسیوں کے ہاں وہ جو اپنی پرستش کرتے تھے' اسے وہ نماز کہتے تھے' پرستش کے بعد جو وہ دعا مانگتے تھے' اسے وہ درود کہتے تھے اور روزہ تو لفظ ہی روز سے ہے' یہ ان کے ہاں روزہ رکھتے تھے۔ یعنی ان چیزوں کے مقاصد اور غایت ہی نہیں بدلی' ان کے تو نام ہی بدل دیئے۔ وہ اس طرح سے بدلے ہوئے ہیں کہ اب ہمارے ہاں نماز کی جگہ کوئی صلوٰۃ کہے تو سمجھ میں ہی بات نہیں آتی۔ یعنی اذان میں تو ہم کہتے ہیں کہ حی علی الصلوٰۃ لیکن ترجمہ یہ کرتے ہیں کہ آؤ نماز کی طرف۔ نماز کا لفظ ہمارے ہاں اتنا عام ہو گیا ہے کہ اس کی جگہ صلوٰۃ کا لفظ ہی نہیں آتا جیسے فجر کی نماز' ظہر کی نماز' عصر کی نماز یا جیسے نمازی یا نماز پڑھنے جا رہا ہوں۔ کبھی آپ نے کسی سے نہیں سنا ہوگا کہ یہ مصلی ہے' صلوٰۃ کے لیے جا رہا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ الفاظ ہی بدل دیئے۔ صلوٰۃ رہتی تو کبھی کھڑے ہو کر سوچتے کہ قرآن میں جو صلوٰۃ کہا گیا ہے یہ ہے کیا چیز۔ نماز کہا تو قرآن کی طرف تو ہم آ ہی نہیں سکتے کہ نماز کا تو اس میں لفظ ہی نہیں ہے۔ اور یہ جو چیز تھی اس کے لیے لفظ درود آ گیا۔ نماز بھی پڑھنا **سَبِّحُوْهُ** تسبیح پھیرنا **اُذْكُرُوا اللّٰهَ** جو کہا تو ذکر کرنا ہو گیا اور درود شریف بھی پڑھنا ہو گیا۔ یہ سب کچھ کرنے کی چیزیں تھیں جو پڑھنے پہ آ گئیں۔

قرآنِ حکیم کو بغیر سوچے سمجھے پڑھنے کی گہری سازش

قرآن بھی عمل کرنے کی چیز تھی۔ اس کے متعلق تو پہلی چیز یہ کہی کہ صاحب! قرآن ناظرہ پڑھنے سے بھی ثواب ہوتا ہے یعنی بغیر مطلب سمجھے ہوئے الفاظ کو دہراتے چلے جانا۔ آپ سوچیے تو سہی کہ یہ کتنی بڑی سازش ہے جو قرآن سے دور لے جائے گی کہ ایک کتاب جو آپ کے لیے زندگی کا ضابطہ ہے' اس میں پروگرام دیا ہوا ہے' اس ضابطۂ حیات کے لیے یہ ہے کہ اسے آپ ساری عمر پڑھتے رہتے ہیں لیکن ایک لفظ نہیں سمجھتے کہ اس میں کیا لکھا ہے۔ کیا اس کے مطابق آپ کچھ کر سکتے ہیں کہ جب آپ سمجھتے ہی نہیں ہیں کہ اس کے معنی کیا ہیں؟ لیکن اس کے اوپر زور اتنا دیا ہے کہ پوری قوم مطمئن ہے۔ ہمارے ہاں بچپن میں صبح صبح گھروں کے اندر سے یہ دو

آوازیں آیا کرتی تھیں: چکی پیسنے کی آواز اور اس کے ساتھ ساتھ قرآنِ کریم کی تلاوت کی آواز۔ الفاظ کو دہراتے تھے۔ اب ہمارے ہاں حفظ کرنے والے قرآنِ کریم کو دہراتے ہیں' تلاوتِ قرآن کی اب بھی ہوتی ہے۔ قرآن کی خدمت یہ ہوتی ہے کہ قرآن تجوید سے حفظ کیا جائے قرأت کا فن سکھایا جاتا ہے کہ فلاں حرف کہاں سے نکلے گا' حلق سے نکلے گا' سینے سے نکلے گا' دو دانتوں کو ملایا جائے گا' زبان یہاں آئے گی۔ یہ جتنے بڑے بڑے مدرسے ہیں یا ان میں حفظ کرایا جاتا ہے یا یہ قرأت کا فن سکھایا جاتا ہے۔ بڑے بڑے قاری آپ کے ہاں مصر سے بھی' عرب کے ممالک سے بھی' آتے ہیں' وہ قرآن کو پڑھتے ہیں۔ ہمارے ہاں یہاں والے تراویح کے اندر سارا قرآن ختم کر دیتے ہیں وہ جو آگے پڑھنے والا ہوتا ہے نہ وہ ایک لفظ سمجھتا ہے نہ سننے والے کچھ سمجھتے ہیں۔ عزیزانِ من! کبھی کھڑے ہو کر سوچیے تو سہی کہ یہ کتنی بڑی سازش ہے جو ہمارے ساتھ ہوئی ہے۔ خدا کے لیے سوچیے کہ کیا دنیا کی کوئی اور کتاب ایسی ہے' جسے آپ پڑھتے رہیں اور اس کا ایک لفظ نہ سمجھیں۔ یہ اس کتاب نے کیا کیا ہے کہ جس کے ساتھ یہ ہو رہا ہے۔ اور اس کے بعد یہی نہیں ہے کہ ہم یہ کہیں کہ ایک فریضہ ادا ہو گیا بلکہ ہم اس کے اوپر اتنے مطمئن ہوتے ہیں' اس کے بعد دلوں میں ایسا ہوتا ہے کہ کوئی بہت بڑا ثواب ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ قرآنِ کریم کے ایک ایک حرف سے دس نیکیوں کا ثواب ملتا ہے تو الٓمّ کے تین حرف ہیں اور تیس نیکیوں کا ثواب آپ کے کریڈٹ کے رجسٹر میں درج ہو گیا۔ عقیدہ یہ ہوا کہ الفاظ کے دہرانے سے ثواب ہوتا ہے۔ عزیزانِ من! دنیا میں قرآن کو جتنا پڑھا جاتا ہے' دنیا کی کسی کتاب کو اتنا اس تکرار اور اصرار سے نہیں پڑھا جاتا۔ اگر اس کے لاکھویں حصے کو بھی کہیں سمجھ لیا جائے تو اس قوم کی کایا پلٹ جائے۔

قرآنِ حکیم نوعِ انسانی کے لیے اپنے اندر ایک عظیم انقلابی پروگرام لیے ہوئے ہے

لفظ تلاوت کے معنی ہی پیروی کرنا ہیں' تلاوتِ قرآنِ مجید کے معنی ہیں کہ قرآن کی پیروی کرنا' اتباع کرنا' پیچھے پیچھے چلنا۔ کیا کبھی کسی کے ذہن میں تلاوتِ قرآن شریف کے یہ معنی آئے ہیں؟ آپ نے غور کیا کہ یہ کتنی بڑی سازش ہے جو ہمارے ساتھ ہوئی ہے۔ اب یہی چیز جو تھی کہ اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوۡنَ عَلَی النَّبِیِّ (33:56) آپ دیکھیں گے کہ اس کے اندر کتنا عجیب انقلابی پروگرام ہے جو دیا گیا ہے۔ اس انقلابی پروگرام کو یہ کیا کہا کہ یہ درود شریف ہے اور درود شریف ہمیں پڑھنا چاہیے پھر درود شریف کی برکات' اس کی سعادات' اس کے ثواب' اس کی برکتیں' اس کے فوائد کے تحت اس قدر لکھا گیا ہے' کہ کتابوں کی کتابیں اس کے متعلق بھری ہوئی ہیں۔ پھر وہ قسم قسم کے درود شریف ہمارے ہاں ہیں: درودِ تاج اور درود لکھی اور درودِ ہزارہ اور بہت سے درود شریف ہیں۔ یعنی پڑھنا ہی ہے' کرنا نہیں ہے۔ وہاں یہ تھا کہ ھُوَ الَّذِیۡ یُصَلِّیۡ عَلَیۡکُمۡ وَ مَلٰٓئِکَتُہٗ (33:43) اللہ اور اس کے ملائکہ یہ کرتے

ہیں۔ اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوۡنَ عَلَی النَّبِیِّ (33:56) اللہ اور اس کے ملائکہ نبی کے ساتھ یہ کرتے ہیں۔ جب ہم نے اپنے لیے کہا کہ اس کے معنی پڑھتے ہیں تو اب یہ بات ہوگئی کہ اللہ اور اس کے ملائکہ بھی اوپر بیٹھے ہوئے یہ پڑھتے رہتے ہیں۔

''کروٗ'' کی بجائے ''پڑھوٗ'' کے ترجمہ نے ملتِ اسلامیہ کی سوچ کا رخ ہی بدل دیا

عزیزانِ من! سوچیے گا جس خدا نے یہ الفاظ دیئے تھے قرآن کے اندر درج کیا تھا' رسول اللہ ﷺ کو دیئے' امت کو دیئے تو اس خدا نے خود بتا دیا تھا کہ ہم کیا کرتے ہیں' ہمارے فرشتے کیا کرتے ہیں۔ یہ واضح نہ کیا جائے کا سوال ہی نہیں ہے۔ حکم ہمیں دیا کہ یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا صَلُّوۡا عَلَیۡہِ وَ سَلِّمُوۡا تَسۡلِیۡمًا (33:56) ہم یہ کرتے ہیں تم بھی یہ کرو۔ یہ ''کروٗ'' کا ترجمہ ہم نے اپنے ہاں ''پڑھوٗ'' کرلیا تو پہلی آیت کا ترجمہ بھی یہ کرو کہ خدا اور اس کے ملائکہ درود شریف پڑھتے ہیں' اے مسلمانو! تم بھی درود پڑھا کرو۔ کیا آپ اس ترجمے سے مطمئن ہو جائیں گے؟ اور اگر یہ ہو کہ ہم اور ہمارے ملائکہ یہ کرتے ہیٗ اے جماعتِ مومنین! تم بھی یہ کرو تو بات کتنی بڑی ہو جائے گی۔ خدا یہ کرتا ہے' اس کے ملائکہ یہ کرتے ہیں' تو جب ہم کریں گے تو ہم تو اس صف میں شامل ہو جائیں گے جس میں خدا اور اس کے ملائکہ کھڑے کچھ کر رہے ہیں۔ اس نے مومن کو اتنا بڑا مقامِ بلند عطا کیا ہے۔ خدا اور اس کے ملائکہ یہ کرتے ہیں تم بھی آؤ ہمارے ساتھ مل کر یہ کچھ کرو۔ یُصَلِّیۡ عَلَیۡکُمۡ (33:43) یہ ہیں الفاظ۔ صلی علیٰ کا لفظ تو آپ روز پڑھتے ہیں: اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ' صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ۔ مجھ سے نہ پوچھیے عربوں سے پوچھیے عربوں کی لغت سے پوچھیے۔ میرے لغات القرآن کو بھی نہ لیجیے' کسی کو شبہ ہوگا۔ امام راغب اصفہانی (متوفی قریب ۵۰۲ھ) کا لغت جسے ''المفردات فی غریب القرآن'' کہتے ہیں وہ ان سب کے ہاں مستند مانا جاتا ہے' اس لغت میں یہ لکھا ہے کہ صَلِّ عَلٰی کے معنی ہیں کہ ''کسی کی تعظیم کرنا' شاباش دینا' دعا دینا' حوصلہ افزائی کرنا' کامیاب کرانا' نشو ونما کرنا' کسی قسم کی خرابی یا فساد پیدا نہ ہونے دینا' اس کی مدد کرنا''۔ آپ نے دیکھا کہ اس کے کیا معنی ہیں یعنی ''حوصلہ افزائی کرنا' مدد کرنا' پروان چڑھانا' کامیاب بنا دینا' نشو ونما کرنا' کسی قسم کی خرابی پیدا نہ ہونے دینا''۔ لمبی بات تو آگے آئے گی' یہیں کھڑے ہو کر ایک معنی اس کے لے لیجیے اور کر لیجیے کہ اللہ اور اس کے ملائکہ رسول کے نظام کو' پروگرام کو' کامیاب کرنے کے لیے اس کی تائید کرتے ہیں' اس کی مدد کرتے ہیں' اے جماعتِ مومنین! صَلُّوۡا عَلَیۡہِ وَ سَلِّمُوۡا تَسۡلِیۡمًا (33:56) تم بھی اٹھو اور یہ کچھ کرو۔

خدا تعالیٰ اور اس کے فرشتوں کی طرف سے مجاہدین کے لیے تحسینی جذبات کے اظہار کی تلقین

عزیزانِ من! ان معانی سے کچھ بات سمجھ میں آنے کے قابل تو ہوگئی۔ یہ جو الفاظ کے معنی دیئے ہیں' آیئے دیکھیں قرآن

میں۔ ایک چیز ہوتی ہے جسے آپ Moral Support (اخلاقی سہارا) کہتے ہیں یعنی کسی کے اچھے کام کے اوپر اتنا ہی کہنا کہ شاباش' زندہ باد' بہت اچھے۔ آپ نے دیکھا کہ اتنے سے ہی کتنی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ کسی سے کہیے کہ تم یہ کر رہے ہو ہم تمہارے ساتھ ہیں' ہم تمہاری تائید کرتے ہیں' ضرورت ہوئی تو ہم تمہاری مدد بھی کریں گے' تمہارے پروگرام کو پروان چڑھانے کے لیے تمہارا ساتھ دیں گے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ جس سے یہ کہا جائے گا اس کے حوصلے کتنے بلند ہوتے ہیں' اس کو کس قدر تسکین حاصل ہوتی ہے کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں صحیح کر رہا ہوں' مجھے ان کی تائید حاصل ہے' یہ میرا ساتھ دیں گے' یہ اسے کامیاب بنائیں گے۔ ان کی طرف سے اتنی تائید' اتنی حوصلہ افزائی! پہلی چیز تو یہی بہت بڑی ہوتی ہے۔ یہ **صَلِّ عَلٰی** کے پہلے معنی ہیں جو ابھی عرض کیے ہیں۔ قرآنِ کریم میں ہے کہ نظام قائم کیا' ابتدائی ادوار تھے' مالی امداد کی بڑی ضرورت تھی۔ جماعتِ مومنین کے افراد صحابہ کبارؓ اپنی اپنی بساط سے کہیں بڑھ کر اس کے لیے لاتے تھے' حضورﷺ کی خدمت میں پیش کرتے تھے' اس کو عطیات کہہ لیجیے۔ قرآنِ کریم میں نبی اکرمﷺ سے کہا گیا کہ **خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً** (9:103) یہ جو عطیات لے کر آتے ہیں ان کو قبول کیا کرو۔ **تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا** (9:103) اور یہ جو کچھ دیتے ہیں' اسے اس طرح سے صرف کرو کہ ان کی نشو و نما ہوتی چلی جائے' ان میں پاکیزگی سیرت و اخلاق پیدا ہوتا چلا جائے۔ یہ تو وہ لائے اور حضورﷺ نے قبول کیا۔ کہا کہ اس کو اس طرح سے صرف کرو۔ پھر سن لیجیے کہ لانے والے یہ جماعتِ مومنین کے افراد ہیں۔ حضورﷺ سے کہا گیا کہ **وَصَلِّ عَلَيْهِمْ** (9:103) ان کو شاباش بھی دیا کرو۔ آپ نے دیکھا کہ حوصلہ افزائی کی کتنی ضرورت ہے۔ کہا ہے کہ انہیں: شاباش بھی دیا کرو۔ شاباش کے لفظ سے یاد آیا' تعریف کرنے میں لوگ کتنا بخل کرتے ہیں۔ **اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ** (9:103) تیری شاباش ان کے لیے وجۂ سکون ہوتی ہے۔ لانے والے صحابہ کبارؓ ہیں' اپنا ایمان کا جزو سمجھ کے وہ لا رہے ہیں حضورﷺ قبول کر رہے ہیں۔ کہا کہ ان کو اس طرح سے خرچ کرو اور **صَلِّ عَلَيْهِمْ** شاباش دو: **اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ** (9:103) تیری صلوٰۃ ان کے لیے بڑے ہی تسکینِ قلب کا باعث ہوتی ہے۔ آج آپ بھی کسی برخوردار کی کامیابی کے اوپر اس کی حوصلہ افزائی کیجیے کہ شاباش بیٹا! کیا بات ہے یہ لو تمہیں انعام دیتے ہیں۔ تو اس سے اس کا دل کتنا بڑھتا ہے! آئندہ بھی فرسٹ آنا' جی ضرور آؤں گا' ابا جان! آپ نے دیکھا کہ صل علیٰ کے ایک معنی حوصلہ افزائی تھے' کام کی تائید کرنا' اس کے کام کو Approve کرنا کہ اس کام کو صحیح کر رہے ہو' ہماری منشا کے مطابق کر رہے ہو' ہم تمہارے ساتھ ہیں' جیتے رہو اور آگے بڑھو۔ **اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ** (9:103) تیری صلوٰۃ ان کے لیے بڑی ہی باعثِ تسکین ہے۔ **اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ** (33:56) ساتھ ساتھ آتے چلے جایئے پھر۔ **هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَ مَلٰٓئِكَتُهٗ** (33:43) اور کچھ نہیں تو یہاں کھڑے ہو کر اتنا ہی کہیے کہ یہ جو تم میدانِ جنگ میں کر رہے ہو' جانیں ہتھیلی پہ دے کر' مخالفت کے ہجوم کے اندر اس طرح سے تم پہاڑ کی طرح کھڑے ہو' جیتے رہو' کیا بات ہے! اللہ اور اس کے فرشتے

تمہارے اوپر تحسین اور تبریک کے پھول نچھاور کرتے ہیں۔ عزیزانِ من! یہ جنگِ احزاب ہے۔ جس انداز سے انہوں نے وہاں ہجومِ مخالفت کا مقابلہ کیا ہے، یعنی یوں نظر آتا ہے کہ جیسے وہ دیکھنے والا ان کو اوپر سے دیکھ رہا ہے کہ یہ کچھ کر رہے ہیں، بے ساختہ زبان پہ آ جاتا ہے کہ او شاباش، تمہاری کیا بات ہے، ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ ابھی عرض کروں گا کہ ساتھ ہونے کے معنی کیا ہیں۔ **اِنَّ صَلٰوتَکَ سَکَنٌ لَّھُمْ** (9:103) تمہاری صلٰوۃ ان کے لیے بہت وجہ تسکین ہوتی ہے۔ **یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوۃِ** (2:153) مخالفتوں کا ہجوم آئے گا، بڑی بڑی معرکہ آرائیاں ہونگی، تم استقامت دکھانا صلٰوۃ کے ساتھ۔

خدا تعالیٰ کسی کی آزمائش نہیں کرتا بلکہ انسان نے اپنے آپ کو آزمانا ہوتا ہے

قرآن کریم نے کہا ہے کہ **وَ لَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَ الْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ** (2:155) ایسے ایسے مواقع آئیں گے جہاں تمہیں اپنے آپ کی آزمائش کرنا ہوگی کہ ہم کس پانی میں ہیں، ہمارے اندر مدافعت کی کتنی قوت ہوگئی ہے، ایسے ایسے مقامات آئیں گے جہاں خوف ہوگا، بھوک ہوگی، مال و دولت کا زیاں ہوگا، کھیتی باڑی اجڑ رہی ہوگی۔ اس قسم کی مخالفتوں کے ہجوم میں یہ سب کچھ ہوگا۔ یہ جو کہتے ہیں کہ اللہ آزمائش کرتا ہے، اللہ آزمائش نہیں کرتا، اس کو آزمانے کی ضرورت کیا ہے، وہ تو ہمارے دلوں کے حالات سے واقف ہے۔ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ "تم اپنا ٹیسٹ کر کے دیکھو، اپنی آزمائش کر کے دیکھو کہ ہم کس مقام پہ کھڑے ہیں، ان مخالفتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے کتنی قوت ہم میں ہے"۔ یہ ہے جو آزمائش ہوتی ہے جسے ابتلاء کہتے ہیں۔ کہا کہ یہ مقامات آئیں گے جہاں تمہیں اپنے آپ کی آزمائش کرنا ہوگی کہ ہم کس حد تک ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ کہا کہ **وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ** (2:155) بشارت دیدو ان لوگوں کو جو ایسے مقام کے اوپر ثابت قدم رہتے ہیں۔ کہ **الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْھُمْ مُّصِیْبَۃٌ** (2:156) جب اس قسم کے واقعات، اس قسم کی مخالفتوں کا ہجوم آتا ہے تو چٹان کی طرح اس کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں۔

صلٰوت بھیجنے کا قرآنی مفہوم

کہا ہے کہ **قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ** (2:156)۔ وہ جو میں نے کہا ہے کہ یہ الفاظ بھی ہمارے ہاں انتہائی غم کے زمانے میں، افسردگی کے زمانے میں، عام طور پر مرنے والے کے متعلق کہتے ہیں کہ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یعنی (معاذ اللہ معاذ اللہ) یہ انا للہ ایسا بدنام ہوا ہے کہ کسی اور موقعہ کے لیے استعمال ہی نہیں ہوتا۔ کہا کہ **اُولٰٓئِکَ عَلَیْھِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَ رَحْمَۃٌ** (2:157)۔ یہاں وہی صلٰوت کا لفظ آ گیا۔ یہ ہیں جن پہ خدا اور اس کے ملائکہ صلٰوت بھیجتے ہیں۔ مجھے مجبوراً یہی ترجمہ کرنا پڑتا ہے کیونکہ ہمارے ہاں اس کے لیے الفاظ ہی نہیں ہیں۔ یہ "بھیجتے" نہیں ہیں، میں ابھی عرض کرتا ہوں کہ کیا کرتے ہیں۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ قرآن میں یہ لفظ صلوٰت کہاں استعمال ہوا ہے؟ وہاں رسول اللہ ﷺ سے کہا گیا' یہاں میدانِ جنگ میں ثابت قدم رہنے والوں' ہر امتحان میں پورے اترنے والوں' کے متعلق کہا گیا کہ اُولٰٓئِکَ عَلَیۡھِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّھِمۡ وَ رَحۡمَۃٌ (2:157)۔ پھر اسی آیت کی طرف آیئے۔ کہا ہے کہ ھُوَ الَّذِیۡ یُصَلِّیۡ عَلَیۡکُمۡ وَ مَلٰٓئِکَتُہٗ (33:43) خدا اور اس کے ملائکہ یہ کرتے ہیں۔ یہ کاہے کے لیے یہ کرتے ہیں؟ لِیُخۡرِجَکُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ (33:43) تا کہ تمہیں زندگی کی تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئے۔ یہ کرتا ہے خدا اور اس کے ملائکہ تا کہ یہ ہو جائے۔ عزیزانِ من! سوچیے تو سہی کیا خدا اور اس کے ملائکہ تسبیحاں لے کر درود پڑھتے ہونگے؟ کہا یہ ہے کہ لِیُخۡرِجَکُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ (33:43)۔ یہ ظلمٰت کیا ہیں؟ یہ نور کیا ہے؟ ویسے تو زندگی کی ہر ناخوشگواری' نامساعدت اور مخالفت ظلمٰت میں آ جائے گی۔ قرآن کی عجیب بات ہے۔ ظلم کے معنی تو تاریکی ہی ہوتا ہے۔ اسے قرآن نے ہر جگہ جمع کے صیغے میں استعمال کیا ہے یعنی ظلمٰت۔ یہ مختلف قسم کی تاریکیاں ہونگی اور اس کے مقابلے میں روشنی کو نور کہا ہے' وہ ہمیشہ واحد کے صیغے میں آیا ہے۔ تاریکیاں کئی قسم کی ہوتی ہیں' روشنی تو ایک ہی ہوتی ہے۔ کہا یہ ہے تا کہ وہ تمہیں تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آئے۔ سوال پیدا ہوا کہ یہ تاریکیاں کیا ہیں' نور کی طرف آنے کے کیا معنی ہیں؟ آپ دیکھتے جا رہے ہیں کہ قرآن اپنے مطالب کو کس طرح خود واضح کرتا چلا جاتا ہے۔

وحی خداوندی انسانیت کو ظلمات سے نور کی طرف لے جاتی ہے

عزیزانِ من! قرآن سمجھنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس سے پوچھو کہ کیا کہتے ہو۔ کہا تا کہ تمہیں تاریکیوں سے روشنی کی طرف لے آئیں۔ سورۃ ابراہیم کی پہلی آیت ہے۔ کہا ہے کہ الٓرٰ کِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰہُ اِلَیۡکَ (14:1 یہ کتاب تیری طرف ہم نے نازل کی۔ لِتُخۡرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ (14:1) تا کہ تُو اس کے ذریعے انسانوں کو تاریکیوں سے نور کی طرف لے آئے۔ عزیزانِ من! نور کا' روشنی کا' پہلا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ہر شے اپنی اصلی شکل میں نظر آ جاتی ہے۔ اندھیرے میں ہم رسی کو بھی سانپ سمجھ لیتے ہیں' ہو سکتا ہے کہ سانپ کو رسی سمجھ لیں لیکن ایک ماچس جلا لیجیے تو سانپ سانپ کی شکل میں نظر آ جاتا ہے' رسی رسی کی شکل میں آ جاتی ہے۔ اور قرآن کے نور ہونے کا پہلا فائدہ تو یہ ہے کہ ہر شے اپنی اصلی حقیقت میں سامنے آتی ہے اور یہ خدا کا بہت بڑا کرم ہے۔ اگر یہ نگاہ پیدا ہو جائے تو جو جیسا ہے' وہ ویسا ہی ہمارے سامنے نظر آ جائے۔ چار ہی آیتوں کے بعد بتایا کہ یہ بات یونہی مبہم نہ سمجھنا یا اپنے ذہن سے اس کے معنی نہ متعین کرنا کہ ظلمٰت سے نور کی طرف کیسے آیا جاتا ہے۔ حضرتِ موسیٰؑ نے کیا کیا تھا۔ بنی اسرائیل فرعون کی غلامی میں اس کے استبداد کی چکی کے پاٹ میں پس رہے تھے' محکومی اور محتاجی کی انتہا ہو رہی تھی۔ حضرتِ موسیٰؑ گئے۔ وَ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا مُوۡسٰی بِاٰیٰتِنَآ (14:5) ہم نے موسیٰ

کو بھی اپنے قوانین دے کر فرعون کی طرف بھیجا۔

تاریکیوں سے نور کی منزل سے متعارف کرنے کا مفہوم

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی طرف کیوں بھیجا؟ اس سے کہا کہ **اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَکَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ** (14:5) جاؤ اور اپنی قوم کو ظلمت سے نور کی طرف لے آؤ۔ ظلمت کی ایک قسم یہ ہے کہ وہ قوم ایک طرف ہامان کی مذہبی پیشوائیت کی افسانہ سازیوں کے چنگل میں پھنسی ہوئی تھی، اس میں توہم پرستیاں تھیں اور دوسری طرف سیاست میں فرعون جیسے مستبد ڈکٹیٹر کی استبداد کی چکیوں میں پس رہی ہے۔ کہا کہ وہ ان تاریکیوں سے انہیں نور کی طرف لے آئے۔ یہ کونسا نور تھا؟ ابا سینیا کی فضاؤں میں جہاں تمہیں خدا کی حاکمیت کے علاوہ کسی اور کی حاکمیت کے نیچے نہیں رہنا پڑے گا۔ عزیزانِ من! یہ نور ہے۔ **اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوْرٍ** (14:5) جو بات ہم نے کہی ہے اس میں مقصد تک پہنچنے کے لیے ہر اس ایک کے لیے بہت بڑی نشانیاں ہیں، جو مخالفتوں کے ہجوم میں ثابت قدم رہتا ہے اور جس کی محنتیں بھرپور نتائج پیدا کرتی ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ قرآن نے جو یہاں کہا تھا کہ **هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ وَ مَلٰٓئِکَتُهٗ لِیُخْرِجَکُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ** (33:43) تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ خدا اور اس کے ملائکہ کچھ کرتے ہیں تاکہ تمہیں تاریکیوں سے نور کی طرف لے آئیں۔ یہ کس طرح سے ہوگا؟ عزیزانِ من! یہ قرآن کے ذریعے ہوگا۔

مومنوں کے لیے نعمائے خداوندی کے حصول کو خدا تعالیٰ نے اپنے ہاں مشروط کر رکھا ہے

حضرتِ ابراہیمؑ سے کہا کہ تیری طرف کتاب نازل کی تاکہ تُو نوعِ انسانی کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف لے آئے۔ خدا کی مدد حاصل ہوتی ہے۔ **اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا** (2:257) اللہ جماعتِ مومنین کا دوست بن جاتا ہے، مددگار بن جاتا ہے۔ **یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ** (2:257) تاکہ تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئے۔ خدا مومنین کو مدد دیتا ہے۔ تو کیا یہ مدد غیر مشروط ہے، ایسے ہی دیئے جلا جاتا ہے یا اس نے کوئی شرط بھی عائد کی ہے؟ کہا ہے کہ ایک شرط ہے۔ **یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ یَنْصُرْکُمْ** (47:7) اے جماعتِ مومنین! اگر تم خدا کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا۔ پہلے اپنی مدد کی شرط لگا دی۔ یہ کتنی بڑی شرط ہے۔

خدا کی مدد سے مراد خدا کے عطا کردہ نظام کو عملاً متشکل کرنا ہے

یہ خدا کی مدد کیا ہوئی، کیا وہ ہماری مدد کا محتاج ہے؟ کہا کہ **هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ** (9:33) ہمارا پروگرام یہ ہے کہ ہم نے یہ نظام تمہیں دیا ہے۔ اس نظام کو دنیا کے تمام نظاموں کے اوپر غالب کرنا

تمہارا کام ہے۔خدا کی مدد یہ ہوئی کہ اس نے یہ دین اس مقصد کے لیے دیا تھا' اس مقصد کو کامیاب کرنا جماعتِ مومنین کا خدا کی مدد کرنا ہے۔کہا کہ اگر تم ہماری مدد کرو گے تو ہم بھی تمہاری مدد کریں گے۔تو یہ جو تھا کہ **هُوَ الَّذِیٓ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی** (33:43) مدد کرنے کی بات' تو وہ معنی اب واضح ہو گئے۔یہ مشروط تھا اس چیز سے کہ **اِنۡ تَنۡصُرُوا اللّٰهَ یَنۡصُرۡکُمۡ** (47:7)۔اگر تم اس کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا۔اس مدد سے ہوگا کیا؟ کیا ہم وہاں سے تمہارے لیے میزائل بھیجیں گے' کوئی بم بھیجیں گے' تباہیوں کے سامان بھیجیں گے؟ کہا کہ نہیں! بلکہ **وَیُثَبِّتۡ اَقۡدَامَکُمۡ** (47:7) تمہارے اندر ایسی کیفیت پیدا کر دی جائے گا کہ تم میدانِ جنگ میں جم کر کھڑے ہو جاؤ۔

میدانِ جنگ میں ثابت قدم رہنے والوں کی مدد کرنا خدا کی ذمہ داری قرار پاتی ہے

عزیزانِ من! یہ سب سے بڑی مدد ہے۔میدانِ جنگ سے بھاگ جانے والوں کی کوئی اسلحہ' کوئی توپ' کوئی تفنگ' مدد نہیں کر سکتا۔کہا کہ یہ کچھ ہم کریں گے مگر تیر تم چلاؤ گے اور **وَیُثَبِّتۡ اَقۡدَامَکُمۡ** (47:7) تمہیں ثابت قدم ہم کریں گے۔دیکھتے ہیں کہ خدا کیا کرتا ہے۔تم اگر ہماری مدد کے لیے کھڑے ہو گئے تو ہم تمہاری مدد کریں گے۔مدد کیا ہوگی؟ یہ ہوگی کہ **وَیُثَبِّتۡ اَقۡدَامَکُمۡ** (37:7)۔وہ تمہارے قدم جما دے گا' تم میں ثابت قدمی پیدا ہو جائے گی' دوسری جگہ کہا ہے کہ **کَانَ حَقًّا عَلَیۡنَا نَصۡرُ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ** (30:47) یہ مدد ایسے ہی نہیں کر دی' یہ ہمارا فریضہ ہے' یہ ہم پر واجب ہے کہ ہم تمہاری مدد کریں۔کتنی بڑی لا انتہا قدرتوں اور اختیارات کا مالک اپنے اوپر ایک پابندی عائد کر رہا ہے یعنی ہم اپنے اوپر یہ پابندی عائد کر رہے ہیں کہ یہ ہم پہ فرض ہو گیا ہے' ہمارے اوپر واجب ہو گیا ہے کہ مومنین کی ہم مدد کریں بشرطیکہ **اِنۡ تَنۡصُرُوا اللّٰهَ** (47:7) وہ ہماری مدد کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔عزیزانِ من! بات واضح ہو گئی کہ یہ **هُوَ الَّذِیۡ یُصَلِّیۡ عَلَیۡکُمۡ وَ مَلٰٓئِکَتُهٗ** (33:43) کیا بات ہوئی؟ یہ کہ اے جماعتِ مؤمنین! اگر تم اس کے دین کو غالب کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تو پھر ہم اور ہماری کائناتی قوتیں تمہاری مدد کریں گی' تمہاری تائید کریں گی' تمہاری تحسین و آفرین کریں گی' حوصلہ افزائی کریں گی' نشوونما کا سامان دیں گی' تمہارے پروگرام کو کامیاب بنانے میں تمہاری مدد کریں گے۔یہ کرتے ہیں ہم اور ہمارے ملائکہ۔اب اس کے بعد اس سورۃ کی آیت 56 کی طرف آ جایئے۔کہا کہ **اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِکَتَهٗ یُصَلُّوۡنَ عَلَی النَّبِیِّ** (33:56)۔وہی الفاظ (33:43) میں مومنین کے لیے ہیں' وہی الفاظ ہیں جو یہاں (33:56) میں نبی کے لیے آئے ہیں کہ ہم اور ہمارے ملائکہ یہی کچھ نبی کے لیے کریں گے۔

صحابہ کبارؓ کا مرتبہ

یہاں تو صرف النبی آیا ہے اور وہ جو مومنین والا ٹکڑا ہے' وہ کیسے ساتھ ملے گا۔قرآن کہتا ہے کہ **یٰۤاَیُّھَا النَّبِیُّ حَسْبُکَ اللّٰہُ وَ مَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ** (8:64) اے نبی! خدا تمہارے لیے کافی ہے اور سنو! صرف خدا ہی نہیں بلکہ یہ جماعتِ مومنین بھی' جو تیرا اتباع کرتی ہے۔خدا اور یہ جماعت جو تیرا اتباع کرتی ہے' یہ مل کر تیرے لیے کافی ہیں۔عزیزانِ من! یہ ہے صحابہ کبارؓ کا مرتبہ' یہ ہے مومنین کا مرتبہ۔یہ پروگرام تو قیامت تک رہنے کے لیے تھا۔ہم پہ قیامت گزر گئی کہ وہ دین مذہب میں بدل گیا ورنہ یہ جو چیز تھی کہ جہاں نبی کو جو کہا گیا ہے کہ تیرے لیے خدا ہی اکیلا نہیں بلکہ یہ جماعتِ مومنین ساتھ ہوگی تو پھر خدا اور یہ مل کر تیرے لیے کافی ہونگے۔اب دونوں کو ملا دیجیے۔خدا اور اس کی کائناتی قوتیں کچھ کرتی ہیں۔جو مومن ہیں ان کو یہ کرنا ہوگا' تب مل کر یہ دونوں ہونگے۔ **اِنَّ اللّٰـہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ** (33:56)۔یہ تو اللہ اور ملائکہ کرتے ہیں۔ **یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ** (33:56) اے جماعتِ مومنین! تم بھی یہی کرو جو ہم کرتے ہیں۔

من و ساقی بہم سازِ ایم

نبی علیہ السلام کے پروگرام کی تکمیل کی خاطر خدا اور صحابہ کبارؓ کی رفاقت

آؤ تم اور ہم دونوں مل کر نبی علیہ السلام کے پروگرام کی مدد کریں۔آپ نے سمجھ لیا کہ **صَلُّوْا عَلَیْہِ** کے کیا معنی ہوئے۔یہ وہ چیز ہے کہ خدا اور جماعتِ مومنین دونوں مل کر یہ مقصد پورا کریں گے۔اس لیے کہا کہ اِدھر ہم یہ کر رہے ہیں کہ **اِنَّ اللّٰـہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ** (33:56) آؤ خدا اور تم دونوں اس کام میں مل جائیں۔یہیں بات نہیں چھوڑ دی۔کہا کہ **وَ تُعَزِّرُوْہُ وَ تُوَقِّرُوْہُ** (48:9) اس کی مدد کرو' اس کی عظمت کو قائم رکھو' اس کے وقار کو قائم رکھو۔ **صَلُّوْا عَلَیْہِ** کے معنی یہ ہوئے کہ تم رسول کے نظام' پروگرام' کو کامیاب کرنے کے لیے یہ کرو۔جاں فروشانہ میدان کے اندر آجاؤ' اس کی مدد کرو' اس کی عظمت اور وقار کو دنیا میں قائم رکھو۔ایک اور مقام پہ اس کو اور واضح کیا ہے۔کہا کہ **عَزَّرُوْہُ وَ نَصَرُوْہُ** (7:157) اس کی مدد کرو۔''عزر'' کے اندر تعظیم' احترام' وقار سب چیزیں آجاتی ہیں۔کہا کہ **وَ اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَہٗ** (7:157) یہ جو ہم نے قرآن نازل کیا ہے' اس کا اتباع کرتے چلے جاؤ' رسول کی مدد ہو جائے گی۔جو ہم کر رہے ہیں وہی کچھ تم بھی کرنے لگ جاؤ گے۔ **اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ** (7:157) بس یہ End (مقصود بالذات) ہے کہ اکٹھے ہو جاؤ گے تو کامیاب ہو جاؤ گے۔ **اِنَّ اللّٰـہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ** (33:56) خدا اور اس کے ملائکہ یہ کرتے ہیں' رسول کو' نظام کو' کامیاب

کرنے کے لیے ہم مدد دیتے ہیں، اے جماعتِ مومنین! تم بھی اس مقصد کے لیے رسول کی مدد کرو، اس کی عظمت کو قائم رکھو۔

رسول ﷺ کی عظمت کو قائم رکھنے کا طریق

اب سوال یہ ہے کہ رسول ﷺ کی عظمت کو قائم رکھنے کے لیے کیا طریقہ ہو؟ وہاں تو یہ تھا کہ قرآن کا اتباع کرو۔ سنیئے! یہاں اس آیت کے اگلے لفظ ہیں کہ **وَسَلِّمُوۡا تَسۡلِيۡمًا** (33:56) اطاعت کرو کہ جو اطاعت کرنے کا حق ہے۔ عزیزانِ من! یہ ہے جسے آپ درود پڑھنا کہتے ہیں۔ اور یہ تسلیم جو ہے، اطاعت جو ہے، آپ کو معلوم ہے کہ کس انداز کی اطاعت ہے۔ قرآن سے پوچھیں کہ اطاعت کس قسم کی ہے۔ کہا کہ **فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوۡكَ فِيۡمَا شَجَرَ بَيۡنَهُمۡ** (4:65) تیرا رب اس کی شہادت دیتا ہے کہ یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے تاوقتیکہ اپنے ہر اختلافی معاملے کے اندر تجھے اپنا حَکم یا فیصلہ کرنے والا تسلیم نہ کریں۔ اور اس کے بعد ہے کہ **ثُمَّ لَا يَجِدُوۡا فِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيۡتَ** (4:65) جو تُو فیصلہ دے اس کے خلاف اپنے دل کی گہرائیوں میں بھی گرانی محسوس نہ کریں۔ یہ ہے **وَ سَلِّمُوۡا تَسۡلِيۡمًا** (33:56). اسے کہتے ہیں اطاعت کرنا۔ یہاں تو سب ترجمہ یہی کرتے ہیں کہ اطاعت کرو۔ سرِ تسلیم خم کرنا ہمارے ہاں بھی کہا جاتا ہے۔ **وَيَسَلِّمُوۡا تَسۡلِيۡمًا** اطاعت کرو۔ ہم نے جو وہ **صَلُّوۡا عَلَيۡهِ** کو صلی اللہ علیہ اور **وَسَلِّمُوۡا تَسۡلِيۡمًا** کو 'وسلم' بنایا لفظ وہی لے لیے۔ یہ ہے جو ہم پڑھتے رہتے ہیں۔

عزیزانِ من! سوچیے تو سہی کہ یہ ایک پروگرام تھا کچھ کرنے کا یا کیا اس طرح سے بیٹھ کر پڑھنے کی چیز تھی؟ پرکھنے کا معیار خدا نے کیا بتایا تھا؟ یہ بتایا تھا کہ **لِيُخۡرِجَكُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ** (33:43) زندگی کی تاریکیوں سے تم روشنی کی طرف آ جاؤ گے۔ اور قوم صدیوں سے درود پڑھتی چلی آ رہی ہے، آج بھی جتنی شدت سے، کثرت سے، اختصار سے، پڑھا جاتا ہے کوئی اور چیز نہیں دہرائی جاتی۔ اور تاریکیاں ہیں کہ وہ بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ قریباً نوے کروڑ یا ایک ارب کے قریب آج دنیا میں مسلمان ہیں۔ ہمارے اس ایک ارب کی کیفیت یہ ہے کہ دنیا کے کسی ملک کے اندر ذرا سی کوئی تبدیلی ہوتی ہے، امریکہ کے صدر کے انتخاب کا قصہ ہوتا ہے یا افغانستان میں کہیں روس کے آنے کا قصہ ہوتا ہے تو پورے کے پورے عالمِ اسلام کے اندر ایک تزلزل آ جاتا ہے، خوف طاری ہو جاتا ہے۔ ظلمت یہی تھے۔ اس نے تو ہمیں ظلمت سے نور کی طرف لانا تھا، **لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ** (9:33) کرنا تھا تمام نظام ہائے عالم کے اوپر اس کو غالب کیا گیا ہے۔ قرآن نے کہا کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ کفار مسلمانوں کے اوپر غالب آ جائیں۔ یہ تو **الۡاَعۡلَوۡنَ** (3:139) ہیں، یہ تو دنیا میں سب کے اوپر غالب رہنے کے لیے ہیں۔ یہ کیا ہے کہ ذرا سا کہیں سے کوئی واقعہ ہوتا ہے اور ہمارے دل دھڑکنے شروع ہو جاتے ہیں اور ہم کانپنا شروع ہو جاتے ہیں؟ یہ ظلمت نہیں ہیں تو اور کیا ہے۔ قرآن نے تو مومن کو اعلون کہا تھا۔

میں نے کہا ہے کہ جنگِ احزاب کا ذکر ہو رہا ہے۔ کہا ہے کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِیْرًاۙ وَّ سَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِیْلًا (33:41-42) اے جماعتِ مومنین! شاباش! تم نے بہت اچھی ثابت قدمی کا ثبوت دیا ہے' ہم خوش ہیں' ہم تمہاری تائید کرتے ہیں' ہم تمہارے اوپر تحسین وتبریک کے پھول نچھاور کرتے ہیں۔

فتوحات کے ثمرات کو دوام بخشنے کی خاطر پہلے سے زیادہ تگ وتار سے کام لینا ہوتا ہے

اب اس کے بعد یہ نہ سمجھ لینا کہ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ . وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا (110:1-2) جب فتوحات کی راہیں یا اسلام کے آگے بڑھنے کے راستے میں کشاد پیدا ہو جائے' موانعات ہٹ جائیں اور لوگ جوق در جوق آنا شروع ہو جائیں تو پھر سمجھ لو کہ اب تو راوی عیش لکھتا ہے' کچھ کرنے کی بات ہی نہیں ہے۔ اس کو قائم رکھنے کے لیے تمہیں پہلے سے بھی زیادہ سرگرداں رہنا ہونا' کوشش کرنا ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہاں جنگِ احزاب کی فتح کے بعد کہا گیا ہوگا کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِیْرًاۙ وَّ سَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِیْلًا (33:41-42) اور زیادہ توجہ کے ساتھ خدا کے قانون کو سامنے رکھو' اس کے استحکام کے لیے' اس کو آگے بڑھانے کے لیے' اور زیادہ کوشش کرو۔ یاد رکھو! اس پروگرام میں تم تنہا نہیں ہو' یہ پروگرام تمہارا اور ہمارا مشترکہ ہے۔ ان تنصر الله ینصر کم (47:7) تم خدا کے دین کی اس طرح سے مدد کرو گے' تو ہم تمہاری مدد کریں گے۔ سن لو کہ ہم کیا کرتے ہیں۔ هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْكُمْ وَ مَلٰٓئِكَتُهٗ (33:43) ہم اور ہمارے جو ملائکہ ہیں وہ تمہاری مدد کرتے ہیں' تمہاری تائید کرتے ہیں' تمہارے ساتھ ہیں۔ لِیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ (33:43) تاکہ تمہیں تاریکیوں سے روشنی کی طرف لے آئیں۔ وَ كَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا (33:43) یہ اس لیے ہے کہ تمہاری صلاحیتیں نشوونما پاتی ہوئی چلی جائیں' تم آدمی سے انسانیت کے درجے پہ آتے چلے جاؤ' تمہیں احسن تقویم حاصل ہو جائے' یہ سب اس لیے ہے۔ اور یہ کچھ میں نے عرض کیا کہ مومنین کے متعلق کہا اور خود نبی اکرم ﷺ کے متعلق کہا۔ حضور ﷺ ہی تو سربراہ تھے' لیڈ کر رہے تھے۔ اس جنگ میں بھی نبی علیہ السلام کی یہ چیز تھی کہ وہ صرف وعظ نہیں کہا کرتے تھے بلکہ میدانِ جنگ میں اپنی فوجوں کو لیڈ کرتے تھے۔ آج کے الفاظ میں وہ اپنی افواج کے کمانڈر ان چیف بھی ہوتے تھے۔ ان افواج سے یہ کہا کہ خدا اور اس کے فرشتے یہ کرتے ہیں اور نبی سے بھی کہا کہ اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ (33:56) ہم تمہاری مدد کرتے ہیں۔ مومنین سے یہ کہا کہ خدا مدد کرتا ہے تو تم نے کچھ نہیں کرنا بلکہ اس کی مدد تو تمہاری ہی وساطت سے یہاں آنی ہے۔ اس لیے کہا کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ (33:56)' اے جماعتِ مومنین! تم بھی یہی کچھ کرو' تم بھی اس کے لیے دین کو کامیاب بنانے کے پروان چڑھانے کے لیے' اس کو آگے بڑھانے کے لیے' دنیا کے اوپر غالب کرنے کے لیے'

جس طرح سے ہم مدد کرتے ہیں تم بھی اس کے ساتھ اس کی مدد کرو۔ خدا اور جماعتِ مومنین مل کر اس مقصد کے لیے کافی ہونگے۔ تم یہ کچھ کرو۔ اب سوال یہ ہے کہ کیسے کرو؟ کہا کہ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (33:56)۔ اس انداز کی اطاعت کرو کہ تمہارے دل کی گہرائیوں میں بھی اس کے خلاف کسی قسم کی کوئی گرانی اور کوئی کبیدگی محسوس نہ ہو۔ عزیزانِ من! یہ تھا وہ مقصد ان آیات کا جسے ہم صلوٰت وسلام کہتے ہیں اس کے بھیجنے کا۔

نبی کا فریضہ صرف وعظ کرنا ہی نہیں تھا بلکہ ایک نظام کی تشکیل بھی تھا

جیسا میں نے شروع میں بھی کہا تھا کہ یہ کرنے کے کام تھے' یہ بھیجنے کی بات نہیں تھی' یہ پڑھنے کی بات نہیں تھی۔ قرآنِ مجید بھی' جیسا میں نے عرض کیا ہے' سمجھ کر پڑھا جائے گا تو ہمیں بھی معلوم ہوگا کہ یہ کیا کہتا ہے۔ پہلی شرط تو یہ ہے کہ اس کو پڑھا جائے گا اور سمجھ کر پڑھا جائے گا لیکن اس کا سمجھ لینا ہی مقصود بالذات نہیں ہے۔ سمجھا اس لیے جائے گا کہ اس کے مطابق عمل کیا جائے گا' اس کے مطابق کام کیا جائے گا یعنی منتہٰی تو کام کرنا ہے۔ اسی کام کے پروگرام کے اندر یہ چیز آئی ہوئی ہے جسے کہا ہے کہ يَاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَ سَلِّمُوا تَسْلِيمًا (33:56) ہم بھی یہ کرتے ہیں اور تم بھی یہ کرو' اس دین کو کامیاب بنانے کے لیے' غالب کرنے کے لیے' ہم اور ہماری کائناتی قوتیں اس مقصد کے لیے' مدد کرتی ہیں لیکن اکیلے ہمارے سے کام نہیں ہوگا بلکہ تمہیں بھی ساتھ دینا ہوگا' تم بھی یہی کچھ کرو جو کچھ ہم کرتے ہیں تاکہ تم زندگی کی تاریکیوں سے روشنی کی طرف آ جاؤ۔ عزیزانِ من! یہ اس کا مقصود تھا۔

اس سے اگلی آیت اس کے ساتھ تو ملتی ہے وہ اس آیت کے Contrast (تقابل) میں ہے۔ کہا ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ وَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِيْنًا (33:57) جو لوگ اذیت دیتے ہیں۔ یعنی جو اللہ اور اس کے رسول (یعنی نظامِ خداوندی) کے لیے کسی تکلیف کا یا ضعف کا موجب بنتے ہیں' وہ دنیاوی زندگی کی خوشگواریوں سے بھی محروم رہتے ہیں اور آخرت کی سرفرازیوں سے بھی۔ وہ ذلت آمیز تباہی کے عذاب میں ماخوذ ہوں گے۔ اب یہ جو اذیت کی چیز ہے' اُدھر اس کے مقابلے میں صلوا علیہ (33:56) ہے۔ یہ لفظ اس کے بالکل Contrast (بالمقابل) آیا ہے۔ ایک وہ لوگ ہیں جو یہ کچھ کرتے ہیں' دوسرے وہ ہیں جو یہ کرتے ہیں۔ اور پھر آپ یہ دیکھیے کہ یہاں اللہ اور رسول دونوں کا لفظ آیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے متعلق تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ ان لوگوں کے اندر تھے اور محسوس شکل کے اندر اذیت کی ایک بات ہو سکتی ہے کہ حضور ﷺ کو اذیت پہنچائی اور تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ان لوگوں نے حضور ﷺ کو بڑی اذیت پہنچائی لیکن یہاں تو يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ (33:57) رسول کے ساتھ یؤذن اللہ بھی ہے تو یہ خدا کو اذیت پہنچانے کے کیا معنی ہوئے؟ کیا (معاذ اللہ) کوئی خدا کو بھی اذیت پہنچا سکتا ہے؟ یہ بات

پھر تفصیل طلب آ گئی کہ اللہ اور رسول کو اذیت پہنچانے کی بات کیا ہے؟ میں نے اس لیے کہا ہے کہ درس کا وقت تو پانچ منٹ باقی ہے لیکن یہ بات پانچ منٹ میں نہیں طے ہوگی۔

اللہ تعالیٰ کی بذات خود ذات اور ملائکہ' مومنین کے میزبان ہوں گے

کہا کہ تم یہ کرو جو ہم کہہ رہے ہیں۔ ہم بھی یہ کرتے ہیں اور تم بھی کرو اور اس کے بعد آ ؤ۔ اب سوال یہ ہے کہ ہمارے سامنے آ ؤ تو کیا ہوگا؟ کہا کہ **تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ ۚ وَّ اَعَدَّ لَهُمْ اَجْرًا كَرِيْمًا** ❶ (33:44) تم ہماری طرف آ ؤ' ہم بڑھ کر تمہیں سلام کہیں گے' ہماری طرف سے تمہارے لیے سلامتی ہے۔ یہ جو ''سلام'' ہے' میں نے کہا ہے کہ ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ یہ ''سلام'' ہماری طرف سے ہے۔ عزیزانِ من! پتہ نہیں آپ کے دل میں بھی حرارت اور جنبش پیدا ہوتی ہے یا نہیں' میرے دل میں تو ہوتی ہے۔ یہ کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔ کہا ہے کہ **يَلْقَوْنَهٗ** (33:45) ہماری ملاقات کے لیے تم آ ؤ تو ہم پہل کریں گے' ہاتھ بڑھانے میں ''او آ یار کتھے رہیا ایں تو اینا چر؟ سانوں چنگی طرح پتہ اے توں کی کچھ کردا رہیاں ایں ❷'' کیا بات ہے تمہاری آ ؤ! آ ؤ' گلے سے لگ جاؤ۔ میں نے کہا ہے کہ یہ خدا کی طرف سے ہے جو کہا گیا ہے کہ یہ سلام ہماری طرف سے ہوگا۔ کہا ہے کہ **لَهُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ وَّلَهُمْ مَّا يَدَّعُوْنَ** (36:57)۔ اس میں ان کے لیے' ان کے اعمال کے پھل ہوں گے۔ اس میں وہ سب کچھ ہوگا جو وہ طلب کریں گے۔ اُف بڑی چیز ہے صاحب! بہت کچھ وہاں ہوگا' جو مانگو گے وہاں ملے گا۔ سب سے بڑی چیز تو یہ ہوگی کہ **سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ** (36:58) یہ اس لیے ہوگا کہ ان کی ذات کی نشو ونما اور صلاحیتوں کی تکمیل میں کسی قسم کی کمی نہ رہ جائے۔ نہ ہی انہیں' ان کے چھن جانے کا کوئی خطرہ لاحق ہو۔ یہ سب کچھ اس خدا کے قانونِ ربوبیت کے مطابق ہوگا جس نے تکمیلِ انسانیت کے لیے اس قدر سامان مہیا کر رکھا ہے۔ یہ واضح کر دیا کہ یہ خدا کی طرف سے کلام ہے۔

جنت کی نعماء کا ذکر چلا آ رہا ہے۔ کہا کہ ٹھیک ہے یہ سب کچھ ملے گا' ایک بات اس سے بڑھ کر بھی ملے گی کہ خدا خود کہے گا: سلام علیکم۔ یہاں تھا کہ **اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ** (33:56) یہ اس کے ملائکہ جو ساتھ ہیں' ان کو ان مقامات میں' کسی مقام پہ بھی' خدا الگ نہیں کرتا۔ مومنین کے متعلق ہے کہ جب ان کو وفات ہی ملتی ہے تو **يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ** (16:32) ملائکہ بھی ان کو سلام علیکم کہتے

---

❶ (ان مومنین کی موجودہ زندگی بھی درخشندہ و تابناک ہوگی اور) اس کے بعد بھی' جب وہ اپنے اعمال کے نتائج کا سامنا کریں گے' حقیقی زندگی اور سلامتی کی جانفزا اور روح پرور دعائیں ہر طرف سے ان کا استقبال کریں گی اور انہیں نہایت باعزت مقام عطا کیا جائے گا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص 977)۔

❷ اے دوست! تم اتنا عرصہ کہاں رہے ہو؟ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔

ہیں۔ یہ وہی ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ (33:56) خدا بڑھ کر ان کو سلام کرتا ہے اس کے ملائکہ بھی یہی کہتے ہیں۔ اور جب خدا بھی کہہ رہا ہو اور اس کے ملائکہ بھی یہ کچھ کہہ رہے ہوں تو اس فضا کی کیا ہی کیفیت ہوگی! عزیزانِ من! عجیب حسین نقشے ہیں۔ کیا بات ان مومنین کی جو اللہ کے ہاں سے ان کو یہ کچھ ملا! وہاں کہا کہ خدا کی طرف سے اور ملائکہ کی طرف سے سلام علیکم ہے۔ کہا کہ **لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْھَا لَغْوًا وَّ لَا تَاْثِیْمًا** (56:25) وہاں کوئی بیہودہ بات نہیں ہوگی **اِلَّا قِیْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا** (56:26) چاروں طرف سے تحسین و آفریں وسلام' اور تمہارے اوپر سلام ۔عزیزانِ من! خدا بڑھ کر کہہ رہا ہے سلام علیکم' اس کے ملائکہ کہہ رہے ہیں سلام علیکم۔ کہا کہ چھوڑو خدا اور ملائکہ جو کہہ رہے ہیں' فضا گونج اٹھے گی' چاروں طرف سے سلامتی کی آوازیں آئیں گی۔

عزیزانِ من! یہ ہے وہ صلوٰت وسلام جسے ہم کہتے ہیں یوں خدا صلوٰت بھیجتا ہے' یوں خدا کی طرف سے سلامتی کی آوازیں آتی ہیں۔ کیا یہ سلامتی کوئی چھوٹی چیز ہے جو خدا اور ملائکہ یعنی چاروں طرف سے اس کی کائناتی قوتیں تمہاری سلامتی کے لیے نعرے بلند کرتی ہیں؟ اور تم ہو کہ کہیں پتہ کھڑکا تمہارا دل دھڑکا۔ عزیزانِ من! خدا تو یہ بتا تا ہے کہ چاروں طرف سے **سَلٰمًا سَلٰمًا** کی آوازیں آتی ہیں۔ تمہاری ہی سلامتی نہیں ہے بلکہ اس نے تو کہا تھا کہ **وَ مَنْ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا** (3:97) اور جو بھی تمہارے ''اس نظام'' میں آجائے گا اس کو بھی امن نصیب ہو جائے گا۔

عزیزانِ من! آیت 44 تک ہم آگئے اور 45 ویں آیت سے اگلے درس میں آگے لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

❀❀............❀❀............❀❀

ساتواں باب: **الاحزاب** (آیات 45 تا50)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج جنوری 1980ء کی 25 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الاحزاب کی آیت 45 سے ہو رہا ہے: (33:45)۔

ختمِ نبوت کے بعد آپؐ کے متبعین کا فریضہ اور پھر اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کا رتبہ

آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ آیات میں یہ کہا گیا تھا کہ هُوَ الَّذِیۡ یُصَلِّیۡ عَلَیۡکُمۡ وَ مَلٰٓئِکَتُهٗ (33:43)۔اس کے عام ترجمے میں، جسے درود بھیجنا کہتے ہیں، میں نے عرض کیا تھا کہ یہی الفاظ نبی اکرمﷺ کے متعلق اسی سورۃ کی آیت 56 میں آتے ہیں۔ وہ تو خصوصیت سے نبی اکرمﷺ کے متعلق ہیں۔ بعینہٖ وہی الفاظ خدا اور اس کے ملائکہ کی طرف سے مومنین کے متعلق آتے ہیں۔ یہ ایک بڑی اہم حقیقت ہے۔ نبوت تو ذاتِ رسالت مآبﷺ سے مختص تھی اور وہیں ختم ہوگئی لیکن جسے رسالت کہتے ہیں یعنی اس پیغام کا آگے پہنچانا، اس پیغام کے مطابق عملی نظام قائم کرنا، یہ فریضہ حضورﷺ کے بعد امت کے سپرد کیا گیا، جماعتِ مومنین کے سپرد کیا گیا۔ نبوت کو

چھوڑ کر یہ جو باقی فرائضِ زندگی تھے، جتنی خصوصیاتِ کبریٰ تھیں، اب ان کی حامل یہ امت ہوئی، حضور ﷺ کے متبعین ہوئے۔ اور یہی ختمِ نبوت ہے کہ یہ جتنے فرائض اور ذمہ داریاں تھیں، اب یہ امت سرانجام دے گی، مومنین سرانجام دیں گے۔ قرآنِ کریم نے اسی لیے اس امت کو کہا ہے کہ اب تم وارثِ کتاب ہو۔ یہ کتاب ہے جو مکمل ہے، غیر متبدل ہے، محفوظ ہے، قیامت تک کے انسانوں کے لیے ضابطۂ حیات ہے اس لیے خدا کی طرف سے کسی وحی کے آنے کی ضرورت نہیں رہی، یوں ختمِ نبوت تو ہوئی لیکن جو وحی ہے وہ تو اس دنیا کی زندگی میں انسانوں کے نظم و نسق کے لیے، ہدایات دینے کے لیے، آئی ہے تو جب تک دنیا میں انسان ہیں، اب یہ کتاب ان کے لیے ضابطۂ ہدایات ہے۔ کتاب تو الفاظ اور حروف اور نقوش میں لکھی ہوئی ہوتی ہے، یہ ضابطۂ حیات ایک زندہ نظام کی شکل میں انسانوں کے ہاتھوں سے قائم ہوتا ہے اور وہی انسان ہیں جنہیں مومنین کہا گیا ہے، جنہیں حضور ﷺ کی امت کہا گیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ جتنے فرائض نبی اکرم ﷺ کے اس نظام کو قائم کرنے کے سلسلے میں تھے، اب وہ فرائض اس امت کے ذمے آتے ہیں۔ اور یہ وجہ ہے کہ وہاں نبی اکرم ﷺ کے متعلق ہے کہ اللہ اور اس کے ملائکہ **يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ** (33:43) ہیں اور وہی الفاظ یہاں امت کے متعلق آئے تھے کہ **هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَ مَلٰٓئِكَتُهٗ** (33:43)۔ بتایا یہاں یہ تھا کہ یہ اس لیے کیا جاتا ہے کہ خدا کی تائید اور نصرت اور اس کے ملائکہ کی تائید ہو **لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ** (33:43) تاکہ وہ تمہیں تاریکیوں سے روشنی کی طرف لے آئے۔ تاریکیوں سے روشنی کی طرف آ جانا بہت بڑی چیز ہے۔ اب یہی امت ہے۔ جیسا میں نے عرض کیا تھا کہ وہ نظام آگے چلنا ہے، رسول اللہ ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے، نظام کو قائم کر کے اس کی بنیاد حضور ﷺ نے رکھ دی، دکھا دیا کہ یہ اس کی عملی شکل ہوگی اور اس کے بعد یہ فریضہ امت کے سپرد ہوا۔

اب آگے چلیے۔ نبی اکرم ﷺ کے متعلق اگلی آیت میں ہے کہ **يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ۙ وَّ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِيْرًا** (33:45:46) اے نبی! ہم نے تجھے اس لیے بھیجا ہے کہ تو، وحیِ خداوندی کے مطابق ایسا نظام قائم کر دے جو تمام انسانوں یعنی اقوامِ عالم کے اعمال کی نگرانی کر کے اور لوگوں کو بتا دے کہ اس کے مطابق چلنے کا انجام کیسا خوشگوار ہوگا اور اس کی خلاف ورزی کے عواقب کس قدر تباہ کن ہوں گے۔ ہمارا یہ رسول، ہمارے ضابطہ کے مطابق نوعِ انسانی کو نظامِ خداوندی کی طرف دعوت دیتا ہے اور انسانی، زندگی کی تاریک راتوں میں، سورج کی طرح جگمگاتا ہے۔ عزیزانِ من! کس قدر عالم تاب خصوصیات کا ذکر یہاں آ گیا ہے۔ ایک ایک لفظ کے اندر ایک دنیا جھلک رہی ہے۔ پہلی چیز ہے کہ **اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا** (33:45)۔ شاہد کے معنی نگران ہوتا ہے یعنی اب یہ جو نگرانی تھی، آپ یہ دیکھیے کہ یہ کس چیز کی نگرانی تھی کن لوگوں کی نگرانی تھی۔ پہلے تو اس نور کو لیجیے، وہ جسے کہا گیا ہے کہ ظلمت سے نور کی طرف لے آئیں گے۔ یہ مومنین کی جماعت تو ظلمت سے نور کی طرف نکل آئی۔

قرآن حکیم کے ہاں قوموں کی موت وحیات کی کیفیت کو بیان کرنے کا انداز اور ہر ایک کا فریضہ

اب سوال یہ ہے کہ کیا بس پھر یہ معاملہ یہاں ختم ہو گیا' یہ روشنی میں آ گئے تو کیا انہی تک یہ بات ہے' اس کے بعد کوئی اور فریضہ عائد نہیں ہوتا؟ کہا کہ یہ بات نہیں ہے۔ اور یہ ہے جہاں سے اہم فریضہ شروع ہوتا ہے کہ یہ تو روشنی میں خود آ گئے۔ **اَوَ مَنۡ کَانَ مَیۡتًا فَاَحۡیَیۡنٰهُ وَ جَعَلۡنَا لَهٗ نُوۡرًا یَّمۡشِیۡ بِهٖ فِی النَّاسِ** (6:123)۔ یہاں تقابل ہے۔ کہا ہے کہ یہ سوچو! کیا یہ لوگ ان لوگوں کے برابر ہو جائیں گے جو مردہ تھے' وہ قوم جو مردہ تھی' یہ انسانیت ایک مردہ قوم تھی' خدا نے اسے زندہ کیا؟ اب آپ یہاں دیکھیے کہ قوموں کی حیات اور ممات کے لیے یہی الفاظ آئے ہیں۔ یہ تو ہے نہیں کہ یہ سچ مچ مردہ تھے' قبرستان میں قبروں کے اندر لیٹے ہوئے تھے اور وہاں جا کر **قم باذنہ** کہا اور ان کو زندہ کر دیا۔ ہمارے ہاں بھی یہ ''مردہ قومیں'' محاورہ ہے' جن کے لیے ان کو حیاتِ نو عطا ہونا' نشاۃ ثانیہ عطا ہو جانا کہا جاتا ہے۔ کہا کہ وہ جو پہلے مردہ تھے' اب اسلام سے پہلے کی حالت کو قرآن نے موت سے تعبیر کیا ہے' ان میں زندگی کے کوئی آثار نہیں تھے' سانس تو لیتے تھے' زندہ تھے' چلتے پھرتے تھے' دنیا کے سارے کام کاج کرتے تھے لیکن انسانیت مردہ ہو چکی تھی' پھر انہیں زندہ کیا۔

قرآن کا یہ اعجاز بتایا قرآن کا یہ مقصد بتایا کہ یہ کرتا کیا ہے؟ یہ مردہ قوموں کو حیاتِ تازہ عطا کر دیتا ہے۔ پہلی چیز تو پرکھنے کی یہ ہے کہ اگر کوئی قوم رونا روتی رہتی ہے کہ صاحب! ہم تو مردہ کے مردہ ہیں تو یہ مردہ قوم ہے' ان کو دوبارہ زندگی عطا کرنا ہے۔ سنیے! مردہ قوم میں تو قرآن نہیں ہوتا۔ قرآن نے تو اپنا فریضہ یہ بتایا ہے کہ جو قوم اسے اپنا لے گی' وہ مردہ نہیں رہ سکتی' وہ زندہ ہو گی' اس کا شمار زندہ قوموں میں ہو گا۔ کہا ہے کہ اس نے اسے زندہ کیا۔ میں نے کہا ہے کہ یہ بھی ان افراد تک یا اس قوم تک بات ہو گی کہ وہ زندہ ہو گئی جیسے وہاں تھا کہ وہ ظلمت سے نکل کر نور میں' روشنی میں' آ گئی۔ کیا پھر یہ فریضہ ختم ہو گیا کہ یہ روشنی میں آ گئی؟ عزیزانِ من! یہ انہی تک بات نہیں ہے۔ کہا ہے کہ **وَ جَعَلۡنَا لَهٗ نُوۡرًا** (6:123) اور اسے نورانی قندیل دے دی جائے۔ یہ وہی نور سے جس میں وہ خود آئے تھے۔ انہیں ایک روشنی دی کہ وہ خود روشنی میں رہیں تاکہ **یَّمۡشِیۡ بِهٖ فِی النَّاسِ** (6:123). اس مشعل کو لے کر' اس قندیل کو لے کر' اس شمع کو لے کر' وہ دنیا میں لوگوں کے اندر پھریں اور انہیں بھی اسی طرح سے راستہ دکھاتے چلے جائیں۔ یہ بڑی اہم چیز آئی۔ یہ نہیں ہے کہ خود ہی صحیح راستے پہ ہوں' خود ہی روشنی میں آئیں بلکہ یہ ہے کہ وہ خود روشنی میں آئیں اور پھر وہ عالمِ انسانیت میں' لوگوں میں' دوسری قوموں میں' اس شمع کو لے کر پھریں۔ آپ نے سمجھ لیا کہ اس شمع کو لے کر پھرنے کے معنی کیا ہیں۔ یہ اس امت کا فریضہ ہو گیا۔ نبی اکرم ﷺ کی بعثت میں وہ جو ایامِ جاہلیہ میں مردہ قوم تھی' اس کو زندہ کیا تو جماعتِ مومنین بنائی۔ جماعتِ مومنین تاریکی سے روشنی میں آئی۔ اب حضور ﷺ کے بعد اس جماعتِ مومنین کا' اس امت کا' یہ فریضہ ہے کہ اس روشنی کو لے کر پھریں۔ یہی نہیں ہے کہ خود ہی روشنی میں رہیں تو بس ٹھیک ہے

صاحب! ہم تو روشنی میں ہیں' ہمارا اور فریضہ کیا ہے؟ کہا کہ تمہارا فریضہ یہ ہے کہ دنیا میں جہاں جہاں تاریکیاں ہیں' وہاں روشنی پھیلاؤ' یہ قرآن تمہیں اس لیے دیا گیا ہے۔ اس قوم کے اوپر بہت بڑا فریضہ عائد ہوتا ہے۔ کہا کہ کیا یہ کبھی اس کے برابر ہو سکتے ہیں جو یہ کچھ نہیں ہیں۔

انسانی نظامِ حیات کے گرد پیدا کردہ تاریکیوں کے جال سے نکلنے کا طریق اور مومنین کی ذمہ داری

کہا کہ کَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا (6:123) کیا یہ لوگ ان کے برابر ہو سکتے ہیں جو تاریکیوں کے اندر ہیں اور تاریکیاں ایسی ہیں کہ وہ ان سے نکل نہیں پاتے۔ جہنم کے متعلق بھی یہ بتایا ہے کہ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ (2:167) لاکھ چاہیں گے کہ نکلیں مگر جہنم اس طرح سے چاروں طرف سے محیط ہوگا' اس طرح سے انہیں گھیرے ہوئے ہوگا کہ وہ وہاں سے نکل نہیں پائیں گے۔ یہاں بھی یہ کہا کہ یہ وہ تاریکیاں ہیں جن سے وہ نکل نہیں پائیں گے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ تاریکیاں وہ ہیں' جہاں سے انسان از خود نکل نہیں سکتا بلکہ اس کو وحی کی روشنی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لیے تو جماعتِ مومنین سے کہا کہ تم اس شمعِ قرآنی کو لے کر انسانوں میں پھرو تا کہ جس طرح سے تم تاریکیوں سے نکل کر روشنی میں آ گئے ہو' اسی طرح سے تم دوسری اقوامِ عالم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آؤ۔ یہاں اتنی ہی بات نہیں ہے کہ ٹھیک ہے صاحب! میں تو اچھا ہو گیا' میں تو ٹھیک ہو گیا۔ ہم دیکھتے یہ ہیں کہ ہم ان چیزوں کو اس فرد تک محدود رکھتے ہیں کہ وہ اگر اچھا ہو گیا تو مجھے دوسروں سے کیا واسطہ ہے۔ یہاں یہ سوال ہی نہیں ہے۔ یہاں تو یہ ذمہ داری اس کے اوپر عائد ہوتی ہے جو روشنی میں آتا ہے' اس کی ذمہ داری ہے کہ جو تاریکیوں میں ہیں' انہیں جا کر روشنی میں لائے۔ یہ اس امت کا فریضہ تھا۔

تاریک راہوں کا طویل سفر آخر کار انسانی نفسیات کو زنگ آلود کر دیتا ہے

کہا ہے کہ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (6:123) یوں تو تمہارے ذہن میں ہی نہیں آئے گا کہ کبھی تاریکیوں میں رہنا بھی کسی کو پسند آتا ہے۔ ان تاریکیوں میں رہتے رہتے پھر کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ جو اندھیروں کی' تاریکیوں کی' زندگی ہے' جن سے وہ نکل نہیں سکتے' وہی ان کو خوش آنے لگتی ہے۔ چمگادڑ روتا ہے جب سورج چڑھتا ہے' اسے روشنی راس ہی نہیں آ سکتی۔ مدت العمر کی تاریکیوں میں زندگی گزارنے کے بعد کیفیت پھر یہ ہو جاتی ہے کہ تاریکی ہی خوش آنے لگ جاتی ہے روشنی ان کی آنکھوں میں' نگاہوں میں' چکا چوند پیدا کر دیتی ہے' وہ آنکھیں بند کر لیتے ہیں' روشنی سے دور بھاگتے ہیں' دہائی دیتے ہیں کہ پرے ہٹو' جاؤ سونے دو۔ قرآن کی روشنی دکھانے والوں کے خلاف ان کا ردِ عمل یہ ہو جاتا ہے۔ کہا ہے کہ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (6:123)

تاریکی ان کو خوش آنے لگ جاتی ہے‘ اس میں خوب مست رہتے ہیں‘ اس میں سوتے ہیں‘ روشنی آ جاتی ہے تو پھر نیند میں خلل واقع ہو جاتا ہے۔ کہا ہے کہ یہ جو چیز ہے کہ مسلسل تاریکی میں رہتے ہیں اور تاریکی میں رہنا پسند کرتے ہیں تو کیا یہ ازخود ہو جاتا ہے؟ کہا کہ یہ ازخود نہیں ہوتا‘ یہ تو بہت بڑی سازشیں ہیں۔ تاریکیوں میں چوری کرنے والے‘ ڈاکا ڈالنے والے‘ یہ جس قسم کے جرائم پیشہ ہیں‘ ان کے لیے بھی تاریکی‘ اندھیرا بڑا خوش آئند ہوتا ہے‘ وہ بھی نہیں چاہتے کہ وہاں کوئی روشنی پہنچ جائے۔ کہا ہے کہ یہ جو قوموں کو مستقل تاریکیوں میں رکھا جاتا ہے تو یہ قومیں کیسے اس طرح سے رہتی ہیں‘ کیسے ان کے لیے یہ اندھیرا مستقل کیا جاتا ہے؟ یہ سوال بڑا ہی اہم ہے۔

زندگی کی ان تاریک راہوں کو دوام بخشنے والوں کی تکنیکی کوشش کا ذکر

قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ **وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِیْ كُلِّ قَرْیَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِیْهَا** (6:124) قوم کے اندر تو چھوٹے چھوٹے جرائم کرنے والے ہوتے ہیں مگر ان میں جو بڑے بڑے جرائم کرنے والے ہیں یعنی **اَكٰبِرَ مُجْرِمِیْهَا** (6:124) ہیں‘ وہ اس قسم کے پلان بناتے رہتے ہیں کہ روشنی نہ آنے پائے۔ روشنی آنے سے سب سے پہلے تو یہ خود ننگے ہوتے ہیں۔ اب اس کے بعد یہ جو ان کے پیچھے چلنے والے‘ چھوٹے جرائم کرنے والے‘ ہوتے ہیں‘ ان کے ساتھ یہ کیفیت ہوتی ہے لیکن انہیں اُن کا خیال نہیں ہوتا بلکہ اپنا خیال ہوتا ہے کہ روشنی آئی تو ہم برہنہ ہو جائیں گے۔ روشنی کا کام یہ ہے کہ وہ ہر شے کو اپنی اصلی حقیقت میں دکھا دیتی ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ کمرے کے اندر ہوسکتا ہے کہ آپ سانپ کو رسی سمجھتے رہیں‘ رسی کو سانپ بھی سمجھتے رہیں لیکن جونہی ایک ذرا سی ماچس بھی آپ نے جلائی‘ ایک کرن بھی روشنی کی پڑی تو سانپ کی شکل میں رسی‘ رسی کی شکل میں آ جائے گی۔ یہ جو **اَكٰبِرَ مُجْرِمِیْهَا** (6:124) ہیں‘ ذرا سی روشنی ہو جائے گی تو نظر آ جائے گا کہ یہ مجرم ہی نہیں ہیں مجرموں کے سرغنہ ہیں‘ اکابر ہیں۔ اس لیے **لِیَمْكُرُوْا فِیْهَا** (6:124) وہ اس قسم کے پلان بناتے رہتے ہیں کہ ان کو تاریکیوں میں رکھا جائے‘ انہیں اگر روشنی میسر آ جائے گی تو یہ ہمیں بھی دیکھ لیں گے کہ یہ کیا ہیں۔ پلانز ان کے یہ ہوتے ہیں کہ قوم کو تاریکی میں رکھا جائے تا کہ یہ ہمیں ہماری اصلی شکل میں دیکھنے نہ پائیں۔ **وَ مَا یَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَ مَا یَشْعُرُوْنَ** (6:124) پلان بنا کر خوش ہو جاتے ہیں کہ ہم بڑے کامیاب ہوئے‘ ہماری سازشیں بڑی کامیاب ہوگئیں‘ قوم تاریکی میں رہی‘ ہمیں کوئی پہچان ہی نہیں سکا کہ ہم کیا ہیں۔ کہا ہے کہ انہیں پتہ نہیں ہے کہ یہ پلان‘ یہ سازشیں‘ خود ان کی اپنی ذات کے خلاف ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ اس وقت یہ اس کا شعور نہیں رکھتے کہ تباہی تو سب سے پہلے انہیں آئے گی۔ کہا کہ جب کوئی تباہی اس طرح سے آئے گی جسے نہ قوم دیکھ سکے گی‘ نہ یہ دیکھ سکیں گے تو وہ تباہ ہوں گی‘ یہ بچ نہیں جائیں گے۔ **وَ مَا یَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَ مَا یَشْعُرُوْنَ** (6:124) یہ سارے پلان‘ یہ ساری سازشیں‘ جو قوم کو تاریکی میں رکھنے کی ہیں‘ یہ پلٹ کر

انہی کے خلاف جا پڑیں گی۔قوم اگر ڈوبے گی تو یہ بھی نہیں بچیں گے۔وَ مَـا یَشۡعُـرُوۡنَ (6:124) اے کاش! یہ اپنے شعور سے کام لیتے تو بات بڑی آسان تھی کہ اندھیرے کے اندر‘ خواہ وہ اپنے Followers (پیروکار) کو یا عوام کو یا قوم کو رکھیں یا اس کے ساتھ خود رہیں‘ تاریکی کے جو نقصانات ہونگے یہ ان سے بھی نہیں بچ سکیں گے۔یہ تو سب سے پہلے اس میں آئیں گے۔

تاریکیوں کے اس دور میں مومنین کا فریضۂ حیات

عزیزانِ من! میں کہہ یہ رہا تھا کہ جماعتِ مومنین کا فریضہ یہ بتایا ہے کہ یہ نہیں ہے کہ یہ خود تاریکیوں سے نکل کر روشنی میں آ گئے تو انہوں نے کہا کہ بس ٹھیک ہے۔کہا کہ اس کے بعد ان کا فریضہ یہ ہے کہ یہ شمعِ قرآنی کو لے کر دنیا میں چلیں پھریں‘ جہاں جہاں یہ تاریکیاں چھائی ہوئی ہوں‘ وہاں یہ روشنی پھیلائیں۔اور تاریکیوں کے متعلق کہا کہ یہ پھیلائی کیسے جاتی ہیں اور ان کو مستقل کیسے کیا جاتا ہے‘ ان پردوں کو دبیز سے دبیز تر کیسے بنایا جاتا ہے؟اَکٰبِـرَ مُـجۡـرِمِیۡـهَا(6:124) جو سرغنے ہوتے ہیں‘ان کے پلانز یہ ہوتے ہیں کہ روشنی آنے نہ پائے۔ان کا فریضہ یہ بتایا گیا ہے کہ خود روشنی میں آ گئے ہو تو مطمئن ہو کر نہ بیٹھ جاؤ کہ کوئی بات نہیں ہمارا خطہ تو روشن ہو گیا‘ ہمیں تو روشنی مل گئی۔اس نے کہا کہ نہیں صاحب! روشنی ملی ہے تو اس شمع کو لے کر نکلو اور جہاں جہاں اکابرِ مجرمین نے یہ پلانز بنا رکھے ہیں‘ یہ سازشیں کر رکھی ہیں کہ انسان روشنی میں نہ آنے پائے‘ وہاں جاؤ اور یہ روشنی پھیلاؤ۔ان اکابرِ مجرمین کی ان سازشوں کو ناکام بناؤ۔

آپ نے غور فرمایا کہ ختمِ نبوتﷺ کے بعد یہی فریضہ جو نبی اکرمﷺ کا تھا‘ یہ کس طرح منتقل ہو کر حضورﷺ کے متبعین کی طرف یا امتِ مسلمہ کی طرف‘ جماعتِ مومنین کی طرف‘ منتقل ہو کر آ جاتا ہے۔یہ اس قوم کا فریضہ تھا۔اب اس کے بعد آگے مجھے کچھ کہنے کی ضرورت تو ہے نہیں۔

روشنی کے چراغ خود ہی بجھا دینے والے کو روشنی کی افادیت سے کوئی روشناس نہیں کر سکتا

قرآن نے کہا یہ تھا کہ وہ جو مردہ تھا‘ اسے زندگی عطا ہوئی ہو اور پھر روشنی ملی ہو‘ تو کیا وہ اس کے برابر ہو سکتا ہے جو مردے کا مردہ ہی رہے اور پھر روشنی بھی نصیب نہ ہو؟ اور جو زندہ ہونے کے بعد مردہ ہو جائے‘ جو اپنی پھونکوں سے اس چراغ کو بجھا دے کہ کہیں میری نیند میں خلل نہ آنے پائے‘ اسے کون روشنی میں لے جائے گا؟ یہ جو دنیا کی تاریکیوں کو مٹانے کے لیے مامور ہوئے تھے‘ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ خود اپنے کمرے میں بھی دیا سلائی نہیں جلانے دیتے کہ میاں! کیا کر رہے ہو تم؟ اس سے میری نیند اچاٹ ہوتی ہے۔روشنی میں نیند اچاٹ ہو جاتی ہے۔چمگادڑوں کو تاریکی بڑی راس آتی ہے۔سورج نکلتا ہے تو وہ غالباً بد دعائیں دیتے ہونگے۔یہ تاریکیاں کیا ہیں؟ وَمَـا یَشۡعُـرُوۡنَ (6:124) نے بات صاف کر دی کہ عقل وبصیرت کے‘ شعور کے‘ فکر اور تدبر کے‘ سوئچ آف کیے جاتے ہیں۔سوئچ

آف کیے تو تاریکی آ گئی۔ یہ مَا یَشْعُرُوْنَ (6:124) کی بات ہے۔

سوچنے کی یا عقل و شعور کی صلاحیتوں کے سلب ہو جانے سے ہی تو انسان اندھا ہو جاتا ہے

عزیزانِ من! قرآن کا ایک ایک لفظ ہے، وہ تو یوں معنی واضح کرتا چلا جاتا ہے۔ تاریکیاں یہ ہیں کہ ان کے شعور، علم اور فکر کی شمعیں بجھا دو، یہ سوچنے کے قابل ہی نہ رہیں۔ اور جب یہ ہوگا تو ہر قسم کی اوہام پرستیاں، توہم پرستیاں عام کرتے چلے جاؤ، پھر اس تاریکی کے اندر جس چیز کو تم کہو کہ وہ سونا ہے، وہ سونا ہونگے خواہ وہ پتھر ہی کیوں نہ ہو، یا لوہے کا ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو، جو تم کہتے چلے جاؤ گے یہ مانتے چلے جائیں گے۔ اکابرِ مجرمین کا تو کام ہی یہ ہوتا ہے، جس چیز کو یہ اچھا کہہ دیتے ہیں وہ اچھا سمجھیں گے۔ تاریکی میں تمہیں نظر ہی نہیں آئے گا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔ یہ کہتا ہے کہ خالص سونا ہے، روشنی ہوگی تو پتہ چل جائے گا کہ یہ تو لوہے کا ٹکڑا ہے۔ کہا کہ یہ ہوتی ہے اکابرِ مجرمین کی سازش اور اس کا علاج روشنی کی ایک کرن ہے۔ ان کی سازش یہ ہے کہ یہ روشنی نہ لانے پائیں اور اس سازش سے کیا یہ کہ جو قندیل کے شمع بردار تھے یعنی اس قندیل کو لے کر چلنے والے تھے، انہیں ہی سلا دیا۔ پھر انتہائی کوششیں یہ ہوتی ہیں کہ یہ جاگنے ہی نہ پائیں:

مست رکھو ذکر و فکر وصبحگاہی میں اسے
پختہ تر کردو مزاجِ خانقاہی میں اسے

عزیزانِ من! یہ افیونیں جو پلائی جاتی ہیں، وہ عقل و فکر کے چراغوں کو گل کر دیتی ہیں۔ اس کے بعد کسی وقت ان کا خمار اترتا بھی ہے تو افیون ہی دوبارہ مانگتے ہیں، سلانے والی چیز دوبارہ مانگتے ہیں، نہیں ملتی تو تڑپتے ہیں، پھڑکتے ہیں، مضطرب و بیقرار ہوتے ہیں، مارے مارے پھرتے ہیں، جان دیدیتے ہیں۔ یہ ہوتا ہے جسے قرآن نے اکابرِ مجرمین کی سازش کہا ہے کہ یہ جاگنے ہی نہ پائیں۔ اب بات یہ تھی کہ امت کا فریضہ یہ بتایا کہ خود روشنی میں آ گئے ہو تو اب اس شمع کو انسانوں کی دنیا میں لے کر چلو:

دیکھا ہے جو خود تُو نے اوروں کو بھی دکھلا دے

یہ امت کا فریضہ تھا۔ اس کی روشنی میں اب اگلی آیت سمجھ میں آتی ہے۔

مقامِ نبوت، مقامِ رسالت، سنّتِ رسول

رسول اللہ ﷺ کے متعلق فرمایا کہ اِنَّـآ اَرْسَلْنٰکَ شَاهِدًا (33:45) ہم نے تمہیں نگران مقرر کیا ہے۔ آیئے اب دیکھیں کہ اس نگرانی کے معنی کیا ہیں، فریضہ کیا ہے، کس کے متعلق یہ نگرانی ہے اور پھر امت کا فریضہ کیا ہے؟ جماعتِ مومنین سے خدا مخاطب ہے۔ کہا ہے کہ وَ کَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّةً وَّسَطًا (2:143) ہم نے اس قرآن کے ذریعے تمہیں ایک قوم بنایا ہے۔ یہ جو دائرے کا

نقطہ مرکز (Centre) ہوتا ہے' اس دائرے کے محیط سے ہر مقام ایک ہی فاصلے کے اوپر ہوتا ہے۔ جو پورا دائرہ ہے' دائرے کے کسی مقام پہ بھی ہو' نقطہ اس سے برابر کے فاصلے پہ ہوتا ہے۔ یہ ہے مساوات کی حقیقت۔ کہا کہ ہم نے تمہیں وہ قوم بنایا کہ تم دنیا کی ہر قوم' ہر انسان سے یکساں فاصلے کے اوپر ہو۔ عزیزانِ من! عدل اور انصاف اور مساوات کی اس سے بہتر تشبیہ نہیں ہوسکتی۔ آپ اس تشبیہ کے اعتبار سے اس کا Substitute (بدل) لا کر تو دکھایئے۔ دائرے کو آپ کتنا ہی بڑھا دیجیے' محیطِ کل کر دیجیے' پوری کائنات کے اوپر دائرے کو محیط کر دیجیے لیکن وہ جو اندر کا نقطہ ہے وہ Equal Distance (مساوی فاصلے) پہ رہے گا۔ اور وہ قوم جو نہ کسی کی رورعایت کرے' نہ خوامخواہ کسی کی مخالفت کرے' نہ کسی سے دور ہو جائے' نہ یونہی قریب ہو' یہ قوم پوری انسانیت سے یکساں فاصلے کے اوپر ہوگی۔ دنیا میں انصاف کرنے والی قوم کی اس سے بیشتر تشبیہ کوئی اور نہیں ہوسکتی ہے۔ یہ ہے **اُمَّةً وَّسَطًا** (2:143)۔ کاہے کے لیے یہ سب کچھ کیا؟ **لِتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ** (2:143) تاکہ تم اقوامِ عالم کے اعمال کی نگرانی کر سکو کہ کون راستے سے بھٹکا' کس نے ناانصافی کی' کس نے مظلوم کا گلا دبایا' کون محنت کش کی محنت کا استحصال کر کے لے گیا۔ یہ سب کچھ دیکھتے رہو۔ یہ ہے **شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ** (2:143)۔ او بابا! میں کیا عرض کروں اور کن سے یہ عرض کروں کہ یہ کن کے متعلق کہا جاتا ہے!

ملتِ ابراہیمی کا فریضہ یہ تھا کہ وہ فکرِ قرآنی کی روشنی سے اس کرۂ ارض کو منور کر دے

عزیزانِ من! قرآن اور خدا اور محمدﷺ کے نام لینے والو! آپ کے متعلق یہ کہا گیا تھا کہ اس مقصد کے لیے اس امت کو بنایا گیا تھا کہ خود تاریکی سے روشنی کی طرف آئے' پھر روشنی لے کر ساری دنیا میں پھرے اور اس کے بعد **شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ** (2:143) ہو' نوعِ انسانی کی نگران ہو۔ یہ جو **اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ** (3:139) کہا تھا کہ تم ساری دنیا کے اوپر غالب آ کر رہو گے تو یہ غلبہ جو تھا' یہ ملوکیت کا غلبہ نہیں ہے' قوت اور استبداد کا غلبہ نہیں ہے بلکہ وہ مقام کا اعلیٰ ہونا ہے۔ یہ جو اس قوم کو بلند تریں مقام دیا ہے اب یہ بھی تشبیہ دیکھ لیجیے کہ وہ جو نگرانی کرنے والا ہوتا ہے' اونچے مقام پہ ہوتا ہے' مینارے پہ کھڑا ہوتا ہے' قلعہ کی فصیل پہ کھڑا ہوتا ہے' جو نیچے کھڑا ہو وہ تو نگرانی کر ہی نہیں سکتا۔ نگرانی کرنے والے کے لیے بلند مقام پہ ہونا نہایت ضروری ہے۔ یہ جو ان کو **انتم الاعلون** کہا تھا' تو یہ نہیں تھا کہ تم سب پہ غالب آ جاؤ گے' وہ سب تمہارے طفیل ہو جائیں اور تم ان سب کے اوپر چڑھ کر بیٹھ جاؤ گے بلکہ یہ کہ بلند مقام کے اوپر تمہیں بیٹھنا ہوگا تاکہ تم اقوامِ عالم کے اعمال کی نگرانی کر سکو۔ یہ تھا مومن کا فریضہ۔ اب اس کے بعد یہ ہے کہ تمہاری اپنی کیفیت کیا ہوگی یعنی کیا تمہارے اوپر بھی کوئی نگران نہیں رہے گا؟ کہا کہ **وَ يَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا** (2:143) یہ جو مرکزِ ملت ہے' یہ جو رسول ہے' یہ جو سربراہ ہے' یہ تمہارے اعمال کی نگرانی کرے گا۔ عزیزانِ من! یہ اسلامی نظام ہے۔ اب یہ جو شاہد ہونا ہے تو سیدھی سی

بات ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی زندگی کے اندر تو یہ بات ہوگئی کہ حضور ﷺ خود بجسدِ عنصری موجود تھے لیکن سوال تو اس Physical Life (طبعی زندگی) کا نہیں تھا۔ جس طرح سے اس امت کا وہ جو اعلون مقام ہے' جہاں وہ اونچے کھڑے ہیں' اسی طرح سے یہ مرکزی مقام ہے' جو رسول کا تھا' حضور ﷺ سربراہ تھے۔ یہ جسے میں نے مرکزِ ملت کہا ہے یہ وسطًا کی تشبیہ تھی۔ میرے خلاف ایک ڈگڈگی لگی ہوئی ہے کہ دیکھیے صاحب! یہ تو ان کو مرکزِ ملت بنا رہا ہے۔ یہ غلام [1] محمد (1956-1895) کو مرکزِ ملت کہہ رہا ہے' یہ اس کو رسول بنا رہا ہے۔ یعنی یہ تاریکی میں بسنے والے' جن کو روشنی راس نہیں آتی' جو روشنی کی طرف تم کو بلائے' جو ذرا ماچس چلائے تو للکار کر کہتے ہیں کہ پھونک کر بجھا دو اور اس کے منہ کے اوپر تھپڑ دو حالانکہ قرآنِ کریم نے یہ ایک ایسا عجیب و غریب نظام دیا ہے کہ وہ ایک امت بناتا ہے جو اقوامِ عالم کے اعمال کی نگران ہو اور اس امت کو اس طرح سے چھوڑ نہیں دیتا کہ بے راہرو ہو اور اسے دیکھنے والا کوئی نہ ہو' کہتا ہے کہ اس امت کا ایک مرکز ہونا چاہیے' یہ امت اقوامِ عالم کے دائرہ محیط کے' کل کے' مرکز پر ہو' اسی طرح سے ان کے اوپر بھی ایک مرکز ہونا چاہیے۔ اور یہ ہے وہ مرکز ملت۔ حضور ﷺ کی زندگی میں رسول کا نام لیا ہے۔ حضور ﷺ کی وفات کے بعد اس نظام کا جو مرکز ہوگا جس کے ہاتھ میں مرکزی کنٹرول ہوگا' وہ باقی امت کے اعمال کی نگرانی کرے گا۔ یہ ایک پورا نظام دیا گیا ہے۔

آسمانی انقلاب ہر قسم کی تاریکیوں کے لیے سامان موت ہے

کہا ہے کہ وَ يَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (2:143)۔ اور تمہارے یعنی اس قوم کے اپنے اعمال کا محاسب و نگران ان کا رسول ہو جسے اس نظام خداوندی کی مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اب اس سے یہ نظر آ گیا کہ ان کا خود جو روشنی میں آ جانا تھا یہی ان کی زندگی کا آخری مرحلہ نہیں ہے بلکہ اس روشنی کو لے کر دنیا میں چلنا پھرنا ہے کہ جو بھی تاریکیوں میں ہیں ان کو تاریکیوں سے نکالا جائے۔ باطل عقائد کی تاریکیاں' توہم پرستی کی تاریکیاں' استبدادِ ملوکیت کی تاریکیاں' ہامان کی رسیوں کو سانپ بنا کر دکھانے والی تاریکیاں' قارون کی تاریکیاں کہ اسی قوم کا وہ زیور لیتا ہے اور اس کو لکشمی دیوی کہہ کر ان سے اس کی پرورش کراتا ہے۔ یہ ہیں وہ تاریکیاں جن سے نکالنا اس قوم کا فریضہ تھا بشرطیکہ پہلے یہ خود تاریکی سے روشنی میں آئے' جو خود اندھیرے میں ہے' وہ دوسرے کو روشنی کیا دکھائے گا۔ عزیزانِ من! اس کے معنی یہ تھے کہ ان کو اقوامِ عالم کے اعمال کا نگران ہونا تھا' شاہد ہونا تھا اور ان کے اعمال کی نگرانی ان کے نظام کے مرکزی کنٹرول نے' مرکزی اتھارٹی نے کرنی تھی۔ حضور ﷺ کے بعد ہم نے اس کا نام خلفائے راشدینؓ رکھا' حضور ﷺ کے جانشین ان کا نام رکھا۔ یہ جو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ تم پر میرا طریقِ زندگی جو ہے اس کا اتباع اور میرے بعد جو میرے سچے جانشین راہِ راست پہ چلنے والے

---

[1] غلام محمد' ملک گورنر جنرل پاکستان (19-اکتوبر 1951 تا 15-اکتوبر 1955)

آئیں گے ان کا اتباع، تم پر لازم ہے تو حضورﷺ نے تو خود فرما دیا کہ میرے بعد یہ نظام کیا ہوگا۔ قرآن نے کہا تھا کہ یہ مت سمجھ لو کہ رسول کے چلے جانے کے بعد ہم پھر اپنے نظامِ کہن پہ لوٹ جائیں گے۔ جو لوٹ جائے گا وہ خود تباہ ہوگا، خدا کا کیا بگاڑے گا۔

خلفائے راشدینؓ کے دور کے بعد ہی روشنی کا یہ مینار نظروں سے اوجھل ہونا شروع ہو گیا تھا

حضورﷺ کے بعد اس نظام نے ان کے ہاتھوں قائم رہنا تھا جنہیں آپ نے اپنے خلفاءؓ کہا ہے۔ اب ہم نے تو اپنے خلفاء کو چار خلفاءؓ تک محدود کر دیا اور آگے یہ سلسلہ ہی ختم کر دیا۔ رسول اللہﷺ تشریف لے گئے اور جو حضورﷺ کے جانشین ہونے تھے یعنی اسی نہج پہ چلنے والے شاہد، نور کی شمعیں ہاتھ میں لیے ہوئے، تو ہم نے ان کا چار تک سلسلہ ہی ختم کر دیا۔ عزیزانِ من! سوچیے کہ اس کے بعد ہمارے لیے طریقِ زندگی کیا رہ گیا ہے۔ اس نظام نے قیامت تک قائم رہنا تھا اور جو بھی اس نظام کو قائم رکھنے والے تھے، وہی تھے جو رسول اللہﷺ کے خلفاء ہونے تھے، جانشین ہونے تھے۔ اس سلسلے کی گاڑی ایک دوسری پٹڑی پر جا پڑی اور وہ روشنی کا مینار نظروں سے اوجھل ہو گیا[1]۔

عزیزانِ من! درمیان میں بات آ گئی۔ ابھی میں اعلان کرونگا۔ یہ ہماری خوش بختی ہے کہ ہمیں پھر ایک ہفتے کے بعد عید میلاد النبیﷺ کی تقریبِ سعید میں شرکت کا موقعہ ملے گا۔ وہ یکم فروری کو اگلا جمعہ آتا ہے تو وہ اس جمعہ کے دن جیسا کہ یہاں معمول ہے، تو اس معمول کے مطابق وہ خصوصی درس سمجھ لیجیے۔ نبی اکرمﷺ کی سیرت اور ان کے جو کارنامے ہیں، ان کے لیے وہ مختص ہوتا ہے تو اگلے جمعہ کا درس جو ہے وہ خصوصی درس انﷺ کے لیے مختص ہوگا کیونکہ آج اسلامی نظام کا چرچا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا پچھلے سال بھی اس تقریب پر میرا عنوان تھا کہ نظام مصطفیٰﷺ کیا ہے؟ آگے میں نے دیکھا کہ یہ بحثوں پہ بحثیں چلی ہوئی ہیں کہ اس کا طریق کیا ہے، وہ ہوگا کیسا، وہ کس طرح قائم ہوگا؟

ڈور کو سلجھا رہے ہیں اور سرا ملتا نہیں

بہرحال اپنے متعلق کچھ زیادہ نہیں کہنا چاہتا۔ اگلے جمعہ کا جو خصوصی درس ہے، اس میں، میں نے عنوان ہی یہ رکھا ہے: اسلامی نظام کیسے قائم ہوگا؟ یعنی اب تو ہے نہیں اور کوشش یہی ہو رہی ہے کہ اس کو قائم کریں تو سوال یہ ہے کہ وہ کیسے قائم ہوگا۔ میں نے پہلے تو یہ بتایا ہے کہ وہ ہوتا کیا ہے اور اگلا سوال یہ ہوگا کہ وہ قائم کیسے ہوگا۔ تو یہ ابھی میں عرض کر دوں۔ اعلان کے کارڈ تو چھپے ہوئے ہیں، یہ درس تو ساڑھے نو بجے ہوتا ہے کیونکہ اس میں عام لوگوں کے پاس بھی یہ اعلان جائے گا اور اس میں دور دور سے لوگ آئیں گے تو ساڑھے نو بجے کی بجائے دس

---

[1] اس تفصیل کے لیے دیکھیے: شعلۂ عشق سیاہ پوش ہوا ترے بعد (پرویزؒ: شاہکار رسالت، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور۔ 1987ء ص ص 439 تا 528

بجے کا وقت رکھا گیا ہے۔ اگلے جمعہ کو صبح کا درس دس بجے اسی مقام پہ ہوگا اور عنوان ہوگا ''اسلامی نظام کیسے قائم ہوگا؟'' یہ کارڈ چھپے ہوئے ہیں آپ جاتے وقت لیتے جائیے گا' جو احباب اس سے دلچسپی رکھتے ہوں ان تک پہنچا دیجیے گا۔ کوشش کیجیے گا کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں یہاں آئیں تاکہ یہ چیزیں جو آپ تک محدود ہیں اس سے ذرا اور آگے بھی بڑھ جائیں۔

اس بین الاقوامی امت کا فریضہ اقوام عالم کے اعمال کی نگرانی کرنا ہے

بہرحال اب میں پھر اسی درس کے اوپر آتا ہوں۔ اس نظام میں اس امت کا مقام اتنا بلند تھا کہ وہاں بیٹھ کر یہ اقوامِ عالم کی نگران رہے اور ان کا مرکزِ ملت' ان کی سنٹرل اتھارٹی' رسول اللہ ﷺ کے بعد ان کے اعمال کی نگران رہے۔ یہ ہے جو قرآن نے بتایا ہے۔ کہا ہے کہ **اِنَّآ اَرۡسَلۡنٰکَ شَاھِدًا** (33:45) نبی اکرم ﷺ کو شاہد کہا اور یہ جو بھی سورۃ البقرہ کی آیت میں یہ کہا کہ تمہیں ہم نے ایک بین الاقوامی امت بنایا ہے' تمہارا فریضہ یہ ہے کہ تم اقوام عالم کے اعمال کی نگرانی کرو اور تمہارے اعمال کی نگرانی تمہارا مرکزِ ملت کرے تو رسول اللہ ﷺ کو جو شاہد قرار دیا تو اس کے بعد جماعتِ مومنین کو بھی اسی طرح سے قرآن نے شاہد کہا ہے۔ وہی بات پھر آ گئی کہ جس طرح نبی اکرم ﷺ کے متعلق اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اللہ اور اس کے ملائکہ **یُصَلُّوۡنَ عَلَی النَّبِیِّ** (33:56) ہیں اور یہاں کہا کہ **ھُوَ الَّذِیۡ یُصَلِّیۡ عَلَیۡکُمۡ وَ مَلٰٓئِکَتُہٗ** (33:43)۔ آپ نے دیکھ لیا کہ کس طرح یہ اقدارِ مشترک چلی آتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ شاہد ہیں اور شاہد ہے یہ پوری کی پوری امت۔ کہا کہ **وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیۡرًا** (33:45) نگرانی کرنے والے کا کام کیا ہے؟ یہ کہ آواز دیتا چلا جائے کہ ادھر نہ مڑنا' راستے میں ڈاکو بیٹھے ہیں' خطرات ہیں' نقصان ہوگا' اِدھر آؤ' صحیح راستہ یہ ہے' یوں نصب العین کے اوپر منزل پہ پہنچ جاؤ گے۔ یہ کام ہوتا ہے اس کا۔ وہ ڈنڈا پکڑے ہوئے نہیں ہوتا۔ وہ شاہد ہوتا ہے وہ دیکھ رہا ہوتا ہے کہ کدھر جا رہے ہیں۔ شاہد کی ڈیوٹی (فرائض) یہ ہیں کہ وہ یہ بتائے کہ اُدھر نہ جانا' اُدھر خطرات ہیں بلکہ اِدھر آؤ' اِدھر تمہارے لیے خوشحالیاں ہیں۔

علم و بصیرت سے بھٹکے ہوئے راہی کو صحیح راستے کی طرف راغب کرنے والی امت

کہا ہے کہ **وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیۡرًا** (33:45) اور لوگوں کو بتا دے کہ اُس نظام کے مطابق چلنے کا انجام کیسا خوشگوار ہوگا اور اس کی خلاف ورزی کے عواقب کس قدر تباہ کن ہوں گے۔ اب یہ کچھ کرنے کے یہ سارے فرائض اس امت کے ہو گئے۔ جن کے اعمال پہ یہ امت شاہد ہوگی انہیں یہی بتائے گی کہ اُدھر نہ جانا' اِدھر آؤ۔ اور اس کے لیے جو اگلے الفاظ ہیں یہ ان کا ترجمہ ہیں: **وَّ دَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذۡنِہٖ** (33:46) یہ بلاوا ہے' یہ دعوت دیتے ہیں' یہ راستے سے بھٹک جانے والوں کو کہتے ہیں کہ اُدھر نہ جانا تباہ ہو جاؤ گے' اِدھر اللہ کے راستے کی طرف آؤ۔ یہ اللہ کی طرف بلانے والے ہیں۔ یاد رکھیے! اذن کا جو لفظ ہے یہ ہمارے ہاں تو اجازت کے معنوں میں آتا ہے۔

تاریکیوں میں رہنے والوں نے بڑی آسانیاں پیدا کیں۔ پوچھا کہ صاحب! یہ کچھ تم کرتے کیوں نہیں ہو؟ کہا کہ اس نے تو بِـــاِذْنِـــهٖ (33:46) کہا ہے یعنی ہماری اجازت ہے' ہمارے حکم کے مطابق' تم کرو گے مگر ہمیں تو اس نے ابھی تک اجازت ہی نہیں دی' تو ہم کریں کیسے' بیٹھے ہیں جب اجازت ملے گی' جائیں گے۔ انہوں نے اذن کا ترجمہ اجازت کیا اور اس کے بعد کہتے ہیں کہ اس کی طرف سے اذن تو ملا ہی نہیں تو ہم کیا کریں۔

عزیزانِ من! ایک ایک لفظ پہ غور کرنے کی بات ہے۔ اس اذن کے معنی قانون ہوتے ہیں کہ ''فلاں قانون کے مطابق تم دعوت دو''۔ اور وہ قانون کیا ہے؟ کہا کہ قُل (12:108) اے رسول! ان کو آواز دیدو کہ هٰـذِهٖ سَبِيْـلِـىْٓ (12:108) یہ ہے وہ راستہ جس کے اوپر مجھے چلنے کا حکم ہوا ہے اور میں چل رہا ہوں۔ اور اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ (12:108) میں تمہیں بھی دعوت دیتا ہوں کہ آؤ اس راستے پہ جو اللہ کی طرف لے جاتا ہے۔ خدا نے حضورﷺ سے کہا کہ ان سے کہہ دو کہ میں اس راستے پہ چل رہا ہوں اور تمہیں بھی دعوت دیتا ہوں کہ اس راستے کی طرف آؤ۔ عَلٰى بَصِيْرَةٍ (12:108) علم و بصیرت کی رو سے دعوت دیتا ہوں۔ مذہب کی دنیا میں یہ کہنا کہ خدا کی طرف میری دعوت' علم و بصیرت پہ مبنی ہے' یہ بات کہیں اور نہیں ملے گی۔ حضورﷺ سے خدا نے فرمایا کہ اعلان کر دو کہ میں تمہیں خدا کی طرف لے جانے والے راستے کی دعوت دیتا ہوں اور علم و بصیرت کی رو سے' Reason پر مبنی' Rationally دعوت دیتا ہوں۔ یہ حکمت پر مبنی ہے' فکر و تدبر اور شعور پر مبنی ہے' بصیرت پر مبنی ہے۔ کہا کہ اَنَـا وَ مَنِ اتَّبَعَنِىْ (12:108) میں بھی یہی کرتا ہوں اور جو میرے Followers (پیروکار) ہونگے' امتِ محمدیہﷺ کہلائیں گے' وہ بھی یہی کریں گے۔ اس میں پھر امت آ گئی۔ وہ جو خدا نے رسول کا فریضہ بتایا ہے' اسی خدا نے رسول کی زبان سے کہلوا دیا کہ میں ہی نہیں تمہیں بھی یہی کرنا ہے' ورنہ بات ختم ہو جاتی۔ حضورﷺ دنیا سے تشریف لے جاتے ختمِ نبوت سے کوئی نبی آنا نہیں تھا تو معاملہ تو وہیں ختم ہو کر رہ جاتا۔ آپ دیکھیں قدم قدم کے اوپر کیسے بعد میں آنے والی امت کے ذمہ رسول اللہﷺ وہ فریضہ لگا رہے ہیں جو فریضہ خدا رسول کا قرار دیتا ہے۔ اس طرح اس سلسلے نے آگے رہنا تھا' یوں اس کے بعد نبوت کی ضرورت نہیں رہی۔ یہ ہے وَدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ (33:46)۔

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم کو سراجاً منیراً کہا ہے

میں نے عرض کیا ہے کہ حضورﷺ کو شاہد کہا' امت کو شاہد کہا' نبی کو بشیر کہا' وَدَاعِيًـا اِلَى اللّٰهِ ❶ (33:46) کہا اور حضورﷺ نے خود امت کو اس کے اندر شامل کر لیا۔ کہا کہ وَ سِـرَاجًـا مُّـنِـيْـرًا (33:46) روشنی کی طرف لانا تھا تو چھوٹا سا دیا ہی نہیں کہا بلکہ سورج

---

❶ ہمارا یہ رسول' ہمارے ضابطہ کے مطابق' نوعِ انسان کو نظامِ خداوندی کی طرف دعوت دیتا ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 977)

کہا۔سورج خود روشن ہوتا ہے اور آگے مُنِيرًا کا لفظ ہے۔سورج ہی کہا جاتا تو اتنا ہی کافی تھا لیکن مُنِيرًا کہا کہ خود روشن ہوتا ہے اور دوسروں کو روشنی دیتا ہے۔تاکیداً اس کے ساتھ منیرًا کا لفظ لگا دیا۔منیر کے معنی ہوتا ہے ''دوسروں کو روشنی دینے والا''۔یہاں پھر وہی بات آ گئی کہ خود ہی روشن نہیں ہے بلکہ دوسروں کو بھی روشنی دیتا ہے۔اب یہ حضورﷺ کے بعد روشنی جو ہے' یہ کیا ہوئی؟ قرآنِ کریم کو اللہ تعالیٰ نے وَسِرَاجًا مُّنِيرًا کہا ہے۔طبعی طور پہ حضورﷺ دنیا سے تشریف لے گئے۔وہ آفتابِ جہاں تاب جو ہے' اب قرآن کی شکل میں اس امت کے پاس ہے۔خود روشن ہے دوسروں کو روشنی دینے والا ہے۔کتابِ منیر کا لفظ قرآن کے لیے بھی ہے اور یہی لفظ جو سراج ہے یہ قرآن کے لیے بھی ہے۔اب حضورﷺ کے تشریف لے جانے سے یہاں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔سراجِ منیر کو قیامت تک محفوظ رکھا ہے۔سورۃ النور کی آیت میں' میں نے کہا تھا کہ یہ کیسے محفوظ رکھا ہوا ہے: وہ ایک فانوس نہایت محفوظ شیشے کے لیمپ کے اندر اس طرح سے جلتا ہوا یعنی زمانے کی آندھی' جھکڑ ہوا' اسے بجھا ہی نہ سکے۔ وہ تو یوں محفوظ ہے لیکن اگر آپ اسے تہ دامن رکھ چھوڑیں تو اس کا سراجِ منیر ہونا کیا فائدہ دے گا' وہ تمہارے ہی راستے کو روشن نہیں کرے گا تو دنیا کو کیا روشن کرے گا۔

جو قوم بھی قرآنِ حکیم کو پسِ پشت رکھے گی' اس کا مستقبل ہمیشہ تاریک رہے گا

اگر آپ اندھیری رات میں چل رہے ہوں اور آپ کی جو روشنی ہے وہ پیچھے رہے تو نہ صرف یہ کہ آپ کا راستہ روشن نہیں ہوگا بلکہ اور زیادہ تاریک ہو جاتا ہے۔ہوتا یہ ہے کہ ماضی تو آپ کا چمکدار ہوتا ہے لیکن مستقبل آپ کا تاریک ہوتا ہے۔یہ ہوتا ہے ان قوموں کے ساتھ۔جب بھی ان سے پوچھو' یہ کہیں گے کہ ہمارے اسلاف نے یہ کہا ہے' فلاں امام نے یہ کہا ہے' فلاں مفسر نے یہ کہا ہے' فلاں دور میں ہماری سلطنت دیکھیے' بڑے بڑے سائنٹسٹ ہم نے پیدا کیے۔یعنی ان کا ماضی ہی سارا روشن ہو رہا ہے۔یہ لیمپ انہوں نے پیچھے رکھا ہوا ہے' اپنا راستہ تاریک کا تاریک ہے۔قرآنِ کریم نے پہلے اوراق میں یہ کہا تھا کہ وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (2:4) مستقبل پر ایمان رکھنے والی قوم ہے جبکہ یہ ماضی پر ایمان رکھنے والی قوم بن چکی ہے۔

چودہ سو سال پہلے کے انکشافات

کہا ہے کہ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا (33:46)۔اب یہاں یونہی بات میں سے بات نکل آئی ہے۔قرآنِ کریم کے متعلق یہ ہے کہ یہ واقعی علمِ خداوندی پر مبنی ہے۔چاند بھی روشن ہوتا ہے' سورج بھی روشن ہوتا ہے۔دونوں کی روشنی میں کیا فرق ہے؟ اس سے پہلے کوئی انسان نہیں بتا سکتا تھا کہ ان دونوں کی روشنی میں کیا فرق ہے۔آج کی سائنس کی دنیا یہ بتاتی ہے کہ سورج تو از خود روشن ہے' چاند از خود روشن نہیں ہے' یہ سورج کی روشنی ہے جو اس پہ پڑتی ہے اور پھر وہ اس کو منعکس (Reflect) کرتا ہے' چاند کی اپنی روشنی نہیں ہوتی۔اور

اب تو چاند پر جا کر انہوں نے دیکھ لیا ہے کہ وہ خود روشن نہیں ہے۔ یہ آج کی سائنس کا انکشاف بتایا جاتا ہے اور ٹھیک ہے، یہ بہت بڑا انکشاف ہے۔ سائنس کا کام ہی یہ تھا کہ وہ یہ کرے لیکن ذرا ایک لفظ تو دیکھیے جو چودہ سو سال پہلے کہا گیا۔

پہلے میں یہ بتاؤں کہ ہمارے ہاں جو یہ ہے کہ قرآنِ مجید کی تلاوت کیا کرو تو تلاوت کے معنی تو یہ لیتے ہیں کہ پڑھا کرو، ناظرہ ہی پڑھا کرو، معنی وغیرہ بیشک کچھ نہ ہوں۔ لفظِ تلاوت کے معنی ہیں کہ ''کسی کے پیچھے پیچھے چلنا، پیروی کرنا، اتباع کرنا''۔ قرآن کی تلاوت کے معنی ہیں کہ قرآن کا اتباع کرنا۔ بنیادی طور پر اس لفظ کے یہ معنی ہیں کہ کسی کے پیچھے پیچھے چلنا۔ قرآن نے کہا ہے کہ **وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا** (91:1) سورج اور اس کی روشنی۔ **وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا** (91:2) اور چاند جو اس کی روشنی کے لیے اس کے پیچھے پیچھے بھیک مانگتا ہوا پھرتا ہے۔ وہ جواب کروں کی گردش بتا رہے ہیں جسے ہم نظامِ شمسی کہتے ہیں کہ یہ کس طرح سے اس کے گرد گھوم رہے ہیں۔ اور یہ بات یوں ہے کہ وہ (سورج) تو از خود روشن ہے اور یہ (چاند) اس سے روشنی کی بھیک مانگنے کے لیے، روشنی مستعار لینے کے لیے، اس کے پیچھے پیچھے پھر رہا ہے۔ چودہ سو سال بعد آج علم الافلاک کا ماہر یہ کہہ رہا ہے کہ چاند کی روشنی اپنی نہیں ہوتی، یہ سورج سے مستعار لیتا ہے۔ عزیزانِ من! قرآن کا دور آ رہا ہے، اس قرآن پہ یہ قومیں ایمان لائیں گی، یہ وجد میں آ جاتی ہیں جب اس قسم کا لفظ ان کے سامنے آتا ہے۔ کہا ہے کہ **وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا** (33:46) سورج از خود روشن اور روشنی بانٹنے والا ہے۔ یہ ہے قرآن: از خود روشن اور دوسروں کو روشنی دینے والا۔ یہ بتانے کے لیے کہ یہ سورج ہے کیا، کسی لیمپ کی ضرورت پڑتی ہے۔ کیا موم بتی جلا کر دیکھتے ہیں کہ وہ سورج ہے؟

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

وہ تو خود اپنے وجود کی آپ دلیل ہوتا ہے، روشن جو ہوتا ہے۔

قرآنِ حکیم اپنے مفہوم کو از خود بیان کرنے کے لیے کافی ہے

قرآنِ کریم اپنے مفہوم کے بیان کرنے میں کسی خارجی روشنی کا محتاج ہی نہیں ہے۔ وہ تو سورج ہے، روشنیاں دے گا۔ تم انسانوں کے ذہنوں کی موم بتیاں لیے پھرتے ہوئے دکھاتے ہو کہ وہ آفتاب ہے۔ عزیزانِ من! قرآن تہ داماں اسی لیے آ گیا کہ ہم نے اس کو انسانوں کی روشنیوں کا محتاج سمجھا ہے۔ انسانوں کے ذہنوں میں تو روشنی اس نے پیدا کرنی تھی۔ اس کی طرف سے آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں اور اپنے دیوں اور موم بتیوں سے کہہ رہے ہیں کہ ہم تمہیں دکھا رہے ہیں کہ سورج کیا ہے اور کیسا ہے اور کہاں ہے۔ یونہی بات ذہن میں آ جاتی ہے۔

اہلِ تصوف کے بالمقابل مقامِ نبوت کا فریضہ

ہمارے ہاں تصوف آ گیا۔ یہ اہلِ تصوف ایسے سوئے ہوئے ہوتے ہیں کہ انہیں قیامت تک جاگنا نہیں ہے۔اس نے اس عمل وفکر کی روشنی کوختم ہی کر دیا۔قرآن نے کہا کہ ان مومنوں کی پہلی چیز تو یہ تھی کہ مومن ضابطۂ حیات یعنی قرآنِ کریم کی روشنی میں نکلتا ہے تو اس کا فریضہ یہ تھا کہ وہ دوسروں کو بھی روشنی دے مگران اہل تصوف کے ہاں' تصوف کے اندرصورت یہ ہے کہ وہ جو کچھ کسی کو کہتے ہیں کہ ملتا ہے' وہ کسی دوسرے کو نہیں دے سکتا۔ پوچھو کہ حضرت صاحب! آپ کے اوپر کیا منکشف ہوا' کیا الہام ہوا' کس طرح سے تم نے خدا کو دیکھا؟ کہا کہ بھائی! بیٹے!

ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی!

بھئی! یہ تو شراب ہے' میں تمہیں کیا بتاؤں کہ اس کا نشہ کیا ہوتا ہے؟ یہ تو پینے والے کو ہی پتہ چل سکتا ہے' خود پیئو تو پتہ چلے۔یعنی اہلِ تصوف کا یہ علم اسی تک محدود ہوتا ہے۔ جسے یہ مغز اسلام کہتے ہیں' مغزِ دین کہتے ہیں' اس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ اسی تک محدود ہوتا ہے۔اقبالؒ (1877-1938) نے اپنے خطبے ❶ میں بڑی عجیب تشبیہ دی ہے۔شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ بہت بڑے صوفی بزرگ گزرے ہیں۔ان کا ایک قول نقل کیا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ عبدالقدوس گنگوہیؒ نے کہا ہے کہ''محمد عربی ﷺ عرش کی بلندیوں پہ جانے کے بعد پھراسی دنیا میں واپس آ گیا۔خدا کی قسم! اگر میں وہاں جاتا تو کبھی واپس نہ لوٹتا''۔اقبالؒ (1877-1938) نے کہا ہے کہ دین میں اورتصوف میں یہ فرق ہے۔وہ اگر کہیں پہنچ بھی جاتا ہے تو دنیائے انسانیت کی طرف واپس نہیں آتا' وہ خود ہی اپنے نشے کے اندر محو ہوتا ہے۔رسول کا فریضہ یہ ہے کہ جب اُسے خدا کی طرف سے کوئی چیز ملتی ہے تو اس کو لے کر دنیائے انسانیت کی طرف آتا ہے:

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

یہ ہے فرق اور یہی امتِ مسلمہ کا فریضہ تھا۔تصوف میں تو کسی دوسرے کو بتا ہی نہیں سکتے اور شریعت میں بھی تو اپنی اپنی نجات کی ہی فکر ہوتی ہے''توں اپنی سنبھال تینوں ہورنال ❷ کی''۔ ہر فرد کو اپنی نجات کی فکر ہے۔قرآن میں کہا گیا ہے کہ اگر تم تاریکیوں سے روشنی میں آ گئے تو جا کر دنیا کو روشنی دکھاؤ۔تم تو شاہد ہو' مبشر ہو' نذیر ہو' داعی الی اللہ ہو' سراجِ منیر ہو۔کہا کہ اے رسول! یہ جو ہم نے مومنین کا

---

❶ تشکیلِ جدیدِ الٰہیاتِ اسلامیہ (انگریزی) کے پانچویں خطبے The Spirit of Muslim Culture (روحِ مسلم کلچر) میں۔
❷ تُو اپنا سنبھال، تجھے دوسروں سے کیا!

فریضہ بتایا ہے' اُس کے بارے میں وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ (33:47) تو جھوم جھوم کر اس جماعتِ مومنین کو خوشخبری دے کہ تم نے یہ کچھ کیا ہے اور یہ کہ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا (33:47) تمہیں خدا کی طرف سے بڑی خوشحالیاں اور فارغ البالیاں ملیں گی۔ قرآن کے اندر فضل کا لفظ بڑا جامع ہے لیکن یہ زندگی کی خوشحالیوں کے لیے آتا ہے' فارغ البالیوں کے لیے آتا ہے۔ یہاں فَضْلًا كَبِيْرًا آیا ہے کہ بہت بڑی بڑی فارغ البالیاں اور خوشحالیاں تمہیں ملیں گی' اگر یہ فریضہ سرانجام دو گے لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ (33:48)۔ تو اس پیغام کو عام کرتا جا' اور مخالفین' کافرین اور منافقین' کی کوئی بات نہ مان۔ ان سے مفاہمت کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ یہاں کفار اور منافق دونوں کہہ دیا۔ کفار وہ جو اس دین سے اعلانیہ انکار کرتے ہیں' مخالفت کرتے ہیں' ان کی بھی کوئی اطاعت نہ کرنا' ان کی کوئی بات نہ ماننا اور دوسرے یہ منافقین کہ جو بظاہر اقرار تو کرتے ہیں لیکن دل سے اسے نہیں مانتے' ان کی بھی کوئی بات نہ ماننا۔ قرآن نے یہ احتیاط بتائی ہے۔

قدم قدم پر منافقین اور کفار کی محتاج قوم کی حالتِ زار

تاریکیوں' پستیوں اور محتاجیوں میں رہنے والی جو قوم ہے' وہ اپنا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لے' وہ تو قدم قدم پر منافقین اور کفار کی محتاج ہوتی ہے۔ یہی نہیں ہے کہ وہ ان سے اپنی اطاعت کراتے ہیں بلکہ یہ تو ہر معاملے میں ان کی طرف منہ کر کے دیکھتے ہیں کہ حضور! کیا ارشاد ہے' کیا حکم ہے۔ مومن جو اعلون ہوتا ہے' اس نے تو ان کے اعمال کی نگرانی کرنی ہے۔ کیا وہ ان کی اطاعت کرے گا؟ اسی لیے یہ کہہ دیا کہ یاد رکھو! یہ احتیاط برتنا۔ یہ دو چیزیں اکٹھی نہیں ہو سکیں گی۔ تم نے تو انہیں راستہ دکھانا تھا اور تم ان کی راہنمائی کے محتاج ہو رہے ہو۔ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ (33:48) یاد رکھو کہ اس طرح اس قسم کی یہ جو بڑی بڑی قومیں ہیں ان کو یوں منہ پھٹ جواب دیدینے والی بات ہے کہ ہم تمہاری کوئی بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں' خواہ تم کفار ہو خواہ منافقین بھی کیوں نہ ہو' خواہ مسلمانوں کے بھیس میں ہی کیوں نہ آئے ہو۔

حق کی خاطر دنیا بھر کی دشمنی

کہا کہ ہم جانتے ہیں تمہارے دل میں یہ خیال ہوگا کہ یہ تو ساری دنیا سے لڑائی مول لے لینے والی بات ہے۔ ٹھیک ہے' یہ لڑائی تو مول لینی پڑے گی۔ حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ عرب وعجم کے ساتھ جنگ مول لینی پڑے گی۔ جب تم صرف ایک کی طرف منہ کرو گے تو باقی سب کی طرف تمہاری پیٹھ ہوگی۔ بیک وقت دو کی طرف تو تم منہ نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہا کہ وَدَعْ اَذٰىهُمْ (33:48) ان مخالفتوں کی پرواہ نہ کرو' بلکہ وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (33:48) قوانینِ خداوندی پہ پورا بھروسہ رکھو' تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ وَ كَفٰى

بِـاللّٰـهِ وَ كِيْلاً (33:48) جس کا اعتماد ان قوانین کے اوپر ہو' اسی دنیا میں اسے کسی اور کی کیا ضرورت رہتی ہے۔ تمہارے لیے قوانینِ خداوندی کے اوپر اعتماد کافی ہے۔ یہ دیا بجھے گا ہی نہیں' یہ سراجِ منیر ہے' یہ کہیں تاریکی رہنے ہی نہیں دیتا۔ اسے لے کر چلتے جاؤ:

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

عزیزانِ من! درمیان میں قرآن کی یہ ایک بات آئی تھی سو میں نے کہہ دی۔

معاشرتی طور پر ازدواجی زندگی کی اہمیت

بات چلی آ رہی تھی معاشرتی زندگی کی۔ نبی اکرم ﷺ کے گھر کی زندگی سے قرآن نے بات شروع کی تھی۔ یہ اس لیے کہا تھا کہ ہم یہ ہدایات درمیان میں دیتے چلے جاتے ہیں کہ گھر کی زندگی اگر سکون اور مودت اور محبت اور رحمت کی نہیں ہے تو باہر کی زندگی میں تم کبھی کسی اطمینانِ قلب سے کوئی کام کر ہی نہیں سکو گے۔ اسی لیے درمیان میں وہ وہی بات لے آتا ہے یعنی گھروں کی' زندگی کی عائلی زندگی کی۔ یہاں پھر عائلی قوانین کی بات آ گئی۔ کہا کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا فَمَتِّعُوْهُنَّ وَ سَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا [1] (33:49)۔ یہ جو عائلی زندگی کے متعلق احکام ہیں یعنی نکاح اور طلاق اور مہر اور عدت' یہ مختلف مقامات پر ہیں' جامع طور پر تو سورۃ البقرۃ میں بھی یہ دیئے گئے ہیں' پھر یہ سورۃ النسآء میں بھی دیئے گئے ہیں سورۃ الطلاق میں بھی دیئے گئے ہیں' میں وہ سارے قوانین آپ کے سامنے نہیں لانا چاہتا۔ درس میں ان چیزوں کی ضرورت نہیں۔ وہ جو قوانین ہیں وہ جمع ہیں' آپ کو ضرورت پڑے تو میں نے آپ احباب کی سہولت کے لیے ان کو الگ اپنی کتاب ''قرآنی قوانین'' میں درج کر دیا ہے۔ یہاں جہاں جہاں قوانین آئیں گے' میں ان پر چھچھلتی ہوئی ایک نگاہ ڈالتا چلا جاؤں گا' ان کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ جب کوئی معاملہ آ کر پڑے گا تو وہاں دیکھا جائے گا کہ قرآن اس کے متعلق کیا کہتا ہے۔

---

[1] اے جماعتِ مومنین! جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو اور پھر انہیں (قانون کے مطابق) طلاق دے دو' قبل اس کے کہ تم نے انہیں چھوا ہو تو تمہارے لیے ضروری نہیں کہ تم ان کی عدت کا شمار کرو جس میں ان کا نان ونفقہ تمہارے ذمہ ہوتا ہے اور جس میں وہ دوسری جگہ شادی نہیں کر سکتیں۔ تم انہیں مناسب سامان دے کر' نہایت خوشگوار انداز سے رخصت کر دو۔ (نکاح) ایک معاہدہ ہے۔ جب دیکھا جائے کہ وہ معاہدہ نبھ نہیں سکتا تو قاعدے اور قانون کے مطابق اسے فسخ کر دیا جائے۔ اس میں تلخی پیدا ہونے کی کون سی بات ہے؟ (2:238-236;65:1-4) (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔978)

میاں بیوی کے مابین نکاح کے معاہدہ کی نوعیت اور ہمارے ہاں کے فقہی قوانین کی شکل وصورت

یہاں میں صرف یہ ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ یہ بات وہاں کہی ہے جہاں میاں بیوی کی ازدواجی زندگی کے اندر وہ مرحلہ آ گیا جہاں آپس میں ان کی نبھ نہیں سکتی۔ قرآن نکاح کو ایک معاہدہ قرار دیتا ہے۔ معاہدہ دو فریقین کی باہمی رضا مندی سے قائم ہوتا ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ جو معاہدہ دونوں کی رضا مندی سے قائم ہوگا' وہ رضا مندی سے معاہدہ ٹوٹ بھی جائے گا لیکن یہاں آپ کے ہاں جو فقہ کے قانون رائج ہیں ان کی رو سے یہ چیز ہے کہ اس لڑکی یا اس عورت سے کہا جاتا ہے کہ تم اس کی رضا مندی لے لو اور جونہی اس نے قبول کہا تو اس سے کہا کہ اب یہ معاہدہ تم سے ٹوٹ نہیں سکتا۔ مرد کو تو یہ حق حاصل ہے کہ زندگی میں جب چاہے کھڑا کھڑا وہ طلاق طلاق طلاق کہے تو معاملہ ختم اور جو فریقِ ثانی ہے' جس کی رضا مندی کے بغیر یہ معاہدہ ہو ہی نہیں سکتا تھا' اب اس کو اس کا کوئی اختیار ہی نہیں ہے۔ وہ جوان حالات میں آتی ہے تو پھر پوچھو نہیں کہ اس کے راستے میں کیا کیا قیامتیں برپا کی جاتی ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ میں یہ قانون کی بات نہیں چھیڑونگا لیکن معاف رکھیے گا' مجھے چھیڑنی پڑ گئی۔ وہ ایک چھوٹی سی بات ہے' اس لیے کہ قریباً قریباً کوئی ہفتہ نہیں گزرتا کہ میرے پاس اس قسم کے استفسارات نہیں آتے اور وہ وہی بات ہے کہ قوم جذباتی ہے اور آدمی فوراً غصے میں آ جاتا ہے۔ کسی دن ہنڈیا کے اندر نمک زیادہ پڑا اور کھڑے کھڑے ہی اس نے کہہ دیا کہ طلاق طلاق طلاق اور وہ قصہ ہوا ختم۔ وہ بیٹھی ہوئی رو رہی ہے اور یہ ملاّ جی کے پاس جا رہے ہیں۔ ملاّ جی نے کہا کہ صاحب نکاح تو فسخ ہو گیا اور اب تو حلالہ کرنا پڑے گا۔ یہ میں نے پہلے بھی کہا تھا اور دہراتے ہوئے شرم آتی ہے۔ یعنی اس کی بیوی کو دوبارہ حلال کرنا پڑے گا ''بکری نوں چھری پھیر' تے تیرے لئی حلال ہو جائے گی''۔ کہا کہ ''جی مولوی! کیویں حلالہ کراں ❶''۔ ایک شب کے لیے اس کا نکاح کسی دوسرے کے ساتھ کر دیجیے۔ عزیزانِ من! میں نہیں چاہتا تھا یہ باتیں کرنا۔ غصہ اس کو آیا طلاق اس نے دی اور ذبح وہ بیچاری ہو رہی ہے۔ مجھے ہر ہفتے یہ جواب دینے پڑتے ہیں۔

مصالحتی کوشش کے لیے ایک بورڈ کی تشکیل اور رائج الوقت قانون کی نوعیت

اس فقہ کو بھی چھوڑ دو اور نہ ہی قرآن کی بات پوچھو کیونکہ اس ملک میں قرآن کا قانون تو ہے نہیں۔ اس وقت اتفاق سے یہ فقہ کا قانون بھی رائج نہیں ہے۔ رائج الوقت جو قانون ہے' جو اس وقت Family Laws (عائلی قوانین) ہیں' دعا کیجیے کہ وہ کسی طرح سے ان کی دست برد سے محفوظ رہیں۔ جب سے وہ بنے ہیں' بیس سال ہو گئے ہیں' یہ اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے ہیں کہ اس کو توڑ دیں۔ اس کا ایک ٹکڑا تو شریعت بنچ نے توڑ دیا کہ یتیم پوتے کو وراثت نہیں مل سکتی۔ تو وہ جو رائج الوقت قانون ہیں

---

❶ بکری کو ذبح کرو تو پھر وہ تمہارے لیے حلال ہو جائے گی۔ کہا کہ مولوی صاحب! حلالہ کیسے کروں؟

جن کو Family Laws (عائلی قوانین) کہتے ہیں' میں آپ کی اطلاع کے لیے عرض کر دوں کہ لوگوں کو اس کا پتہ ہی نہیں ہے کہ یہ قانون تو قرآن کا ہے ہی نہیں۔ اتفاق سے یہ جو فقہ کا قانون ہے کہ طلاق طلاق طلاق تو وہ بھی آج کل رائج نہیں ہے۔

ملک کے Family Laws (عائلی قوانین) جو رائج الوقت ہیں ان کے تحت جو طلاق ان کے مطابق نہیں ہے' وہ قانوناً طلاق ہی نہیں ہے' وہ طلاق ہوتی ہی نہیں ہے۔ اور یہ سن لیجیے کہ وہ قانون کیا ہے؟ یہ کہ میاں بیوی میں جب کوئی مناقشہ ہو۔ اسے اتفاق سمجھیے یا حسنِ اتفاق کہ یہ قرآن کے مطابق ہے۔ قرآن نے یہ کہا تھا کہ جب آپس میں کوئی مناقشہ اس قسم کا ہو کہ وہ خود نہ سلجھا سکیں تو رائج الوقت قانون یہ ہے کہ یہ جو کونسلر ہے' اسے درخواست دینی پڑتی ہے' خواہ وہ میاں ہو یا بیوی ہو کہ ہم میں مناقشہ ہو گیا ہے۔ اس قانون میں یہ ہے کہ وہ جو کونسلر ہے' وہ ایک ثالثی بورڈ قائم کرے گا' وہ ثالثی بورڈ تین مہینے تک ان میں مصالحت کرنے کی کوشش کرتا رہے گا۔ اگر مصالحت ہو جائے تو ٹھیک ہے اور اگر نہ ہو تو اس کے بعد وہ یہ فیصلہ کرے گا کہ بھئی! یہ مصالحت نہیں ہو سکی اس لیے یہ نکاح کا جو رشتہ ہے' فسق ہوتا ہے۔ اس Procedure (طریقہ کار) کے بغیر رائج الوقت قانون کے مطابق طلاق ہو ہی نہیں سکتی۔ کم از کم اسے تو آپ سن رکھیے کہ ایسا کوئی معاملہ آ پڑے تو انہیں بتائیے کہ آج کل رائج الوقت قانون ہے اور اس کا بڑی دور تک اثر رہے گا۔ اگر یہ طلاق رائج الوقت قانون کے مطابق نہیں ہوئی ہے اور آپ نے سمجھ لیا ہے کہ طلاق ہو گئی اور آپ نے دوسری شادی کر لی ہے تو اس قانون میں یہ بھی ہے کہ پہلی بیوی کی رضامندی کے بغیر آپ اگر دوسری شادی کر لیتے ہیں تو سال بھر کی قید بھی ہو جاتی ہے کیونکہ قانون کی رو سے وہ آپ کی بیوی ہے اور اس کو قانوناً طلاق تو نہیں ہوئی۔ پھر آپ کی وفات کے بعد بیوی آپ کے ترکے میں حقدار ہوتی ہے جبکہ آپ سمجھے بیٹھے ہیں کہ میں نے طلاق دیدی ہے اور اس کا تو حصہ ہی کوئی نہیں ہے۔ اور پھر دوسری طرف یہ سوچ لیجیے کہ وہ قانوناً ابھی بیوی ہے آپ اس کے خاوند ہیں اور وہ دوسری طرف نکاح بھی نہیں کر سکتی۔ دیکھتے ہیں کہ کہاں تک اس کا اثر پڑ رہا ہے اور یہاں مذاق سمجھا ہوا ہے۔ روز یہ آ جاتے ہیں کہ یہ کچھ کہا اور اس کے بعد اس نے طلاق سمجھ لی' اس نے نکاح کر لیا اور اُس نے بھی نکاح کر لیا۔ تو بابا! تم نے قرآن کو تو چھوڑا تھا ملک کا یہ رائج الوقت قانون جو ہے' اس کو ہی اپنے سامنے رکھو۔

عائلی قوانین کے سلسلہ میں رائج وقت قانون کی مخالفت

وہ انہیں اس لیے سامنے نہیں رکھتے کہ جب یہ عائلی قوانین لاگو ہوئے ہیں تو ملک کے اندر ان حضرات کی طرف سے شور مچ گیا کہ ہم انہیں قانون ہی نہیں مانتے' یہ ہیں ہی نہیں۔ یعنی ان کے نہ ماننے سے گویا وہ قانون رہے گا ہی نہیں۔ آپ کے ہاں کے اس دورِ جدید کے مفسرین نے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر کوئی شخص ان قوانین کے مطابق طلاق دے گا تو ہم اسے طلاق ہی تسلیم نہیں کریں گے۔

ملاحظہ فرماؤ کہ یہ ہم کون ہیں۔ دوسروں کو کہتے چلے گئے۔ سوات میں ایک مولوی صاحب تھے' وہ بڑے جری مولوی تھے' قرآنی مولوی تھے' ان کے خلاف کفر کا فتویٰ لگ گیا۔ پٹھانوں کا علاقہ تھا۔ یہ کہہ دیا گیا کہ صاحب! جو اِن کو جا کر مار دے گا تو وہ مارنے والا اگر پھانسی پہ چڑھا تو شہید ہوگا اور سیدھا جنت میں چلا جائے گا۔ ایک شخص ان کے پاس پہنچ گیا۔ مولوی صاحب نے کہا کہ کیا بات ہے تم اس طرح سے خنجر بدست چلے آ رہے ہو۔ کہنے لگا کہ ملاّ نے فتویٰ دیدیا ہے کہ جو تم کو قتل کردے گا وہ شہید ہوجائے گا اور سیدھا جنت میں چلا جائے گا۔ کہنے لگے کہ ٹھیک ہے میں یہیں کھڑا ہوں' میں ایک بات کہتا ہوں' وہ کرآؤ اور پھر آ کر بیشک مجھے مار دینا۔ کہنے لگے کہ جی! کیا بات ہے۔ کہنے لگے کہ ملاّ سے پوچھو کہ تمہیں جنت میں جانے کی ضرورت نہیں ہے جو مجھے تیار کر رہے ہو۔ وہ پھر واپس نہیں آیا۔ بات یہاں ہو رہی تھی قرآن کی۔ میں نے اس لیے عرض کیا ہے کہ لوگوں کو بالکل پتہ نہیں ہے کہ آج کل تو ایک رائج الوقت قانون ہے۔ یہ پورا ضابطہ ہے ایک قانون نہیں' اس کے اندر کئی قوانین ہیں۔ قانوناً یہ چیزیں اس صورت میں Valid (باضابطہ) ہوسکتی ہیں' اگر ان کے مطابق کچھ کیا جائے۔ اگر اس کے مطابق نہ کیا جائے تو نہ نکاح نکاح ہوتا ہے' نہ طلاق طلاق ہوتی ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک ازدواجی زندگی کا ضابطۂ حیات

میں کہہ یہ رہا تھا کہ میں قانون نہیں بتاؤنگا' قرآن بتاؤنگا۔ اگر مناقشہ ہوتا ہے' اختلاف ہوتا ہے' مخاصمت ہوتی ہے' آپس میں نہیں بن سکتی' الگ ہوئے۔ یہ جو چیزیں ہیں تو پھر ان سے ظاہر ہے کہ آپس میں محبت کے تعلقات تو نہیں رہتے۔ قرآن نے کہا ہے کہ یہ جو تم نے اپنے ساتھ محبت کا عہد استوار کیا تھا' اس زمانے کی تو بات چھوڑو' اس میں تو ہر چیز تم نے خوش آئند طریق سے کی تھی۔ کہا کہ اگر اس چیز کو توڑنے لگے ہو تو وَ سَرِّحُوۡهُنَّ سَرَاحًا جَمِیۡلًا (33:49) نہایت حسن کارانہ انداز سے آپس میں تعلق توڑو۔ قرآن ان تعلقات کو توڑتے وقت یہ کہتا ہے کہ حسن کارانہ انداز سے توڑو۔ میری بیٹیو! تم پوچھتی کہ عورت کو قرآن نے کیا دیا ہے؟ میری بیٹیو' میری بہنو! تم لوگوں کو کون بتائے کہ جس کی یہ کیفیت ہے کہ او بابا! وہ عہد باندھتے ہوئے تو یہ کچھ کیا ہی تھا کہ ''واجے وجائے سن' گھوڑی تے چڑھے سو' جہیز دیا تھا' مہر باندھا تھا' جشن باندھا تھا❶۔'' کہتا ہے کہ اس وقت تو تم نے یہ کیا تھا۔ ہم تمہیں یہ کہتے ہیں کہ اگر ایسا وقت آ جائے کہ اختلاف ہے' تو کوئی بات نہیں' توڑنی بھی پڑے تو حسن کارانہ انداز سے توڑو' ورنہ دنیا میں تو یہی ہوتا ہے' معاف رکھیے گا کسی اور معنی میں یہ مصرعہ نہ لے لیجیے گا: ''میری لگدی کسے نہ ویکھی' تے ٹُٹدی نوں جگ ویکھدا❷''۔ یعنی یہ جو ٹوٹتی ہے' یہ دنیا میں بدترین

---

❶ باجے بجائے تھے، گھوڑی پہ چڑھے تھے، جہیز نذر کیا تھا، مہر باندھا، جشن کا ساسماں باندھا تھا۔

❷ جب رشتۂ تعلقات باندھا تو کسی کو خبر تک نہ ہوئی اور جب اسے توڑا تو اسے تمام جہاں میں خوب خوب نشر کیا۔

شکل اختیار کیے ہوئے ہوتی ہے' دنیا میں ذلت ہوتی ہے اور مطلقہ عورت کی تو ہمارے معاشرے کے اندر وقعت ہی نہیں رہتی۔ یہ کیفیت اس بیچاری کی ہوتی ہے۔ قرآن نے کہا کہ نکاح کے وقت تو سامان لائے تھے لیکن ''جے ایہنوں گھر تو ٹورن لگاں ہیں ناں ❶''، تو جس طرح اس وقت بری لائے تھے تو ایسی ہی بری دے کر اس کو ٹورو (وداع کرو)۔ کہا ہے کہ وَ سَرِّحُوۡهُنَّ (33:49). سرحن کے معنی آزاد کرنے کے ہیں یعنی معاہدہ کو تم نے فسخ کیا ہے' الگ ہونے لگے ہو' الگ ہونا ہے تو جَمِیۡلًا (33:49)۔ حسن کارانہ انداز سے ہو جاؤ۔ عزیزانِ من! خوش آئندگی وغیرہ کے لیے بھی عربی میں بہت سے الفاظ ہیں لیکن یہ جمیل کا جو لفظ ہے' اس کی داد نہیں دی جاسکتی۔ یہ ہے جو قرآن درمیان میں عائلی قوانین کی بات لاتا ہے۔

اس میں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ وہ کہتا کیا ہے؟ نبی اکرم ﷺ کے متعلق بھی وہی قوانین تھے جو عام مومنین کے متعلق تھے لیکن بعض مقامات ایسے تھے جہاں ان کے لیے خصوصیت سے ایک بات کہی تھی اور وہ جو خصوصیت سے کہی تھی کہ یہ تمہارے ہی لیے ہے' وہ عجیب بات ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اور نہیں تو بہر حال رسول ہیں' سربراہِ مملکت ہیں' ان کے لیے جو Exception (استثنا) کی گئی تو ان کو باقیوں سے کچھ زیادہ مراعات دینی چاہئیں بلکہ یہاں تو باقیوں کے مقابلے میں پابندی زیادہ لگائی جارہی ہے اور کہا ہے کہ یہ ہم تم پہ ہی لگا رہے ہیں' ان پہ نہیں لگا رہے:

جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے

عائلی زندگی کے سلسلہ میں نبی اکرمؐ کے متعلق ایک خاص شرط کا اضافہ

سورۃ النسآء میں قرآن نے کہا ہے کہ کون کونسے رشتے حرام ہیں اور کون کون سے حلال ہیں۔ ان حلال رشتوں کے اندر چچا کی بیٹیاں' ماموں کی بیٹیاں سب ہیں یعنی یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَحۡلَلۡنَا لَکَ اَزۡوَاجَکَ الّٰتِیۡۤ اٰتَیۡتَ اُجُوۡرَهُنَّ وَ مَا مَلَکَتۡ یَمِیۡنُکَ مِمَّاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَیۡکَ وَ بَنٰتِ عَمِّکَ وَ بَنٰتِ عَمّٰتِکَ وَ بَنٰتِ خَالِکَ وَ بَنٰتِ خٰلٰتِکَ ❷ (33:50)۔ رسول اللہ ﷺ کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ یہ تمام تمہارے لیے اسی صورت میں حلال ہیں کہ یہ وہ ہوں الّٰتِیۡ هَاجَرۡنَ مَعَکَ (33:50) جنہوں نے تیرے ساتھ ہجرت کی ہے۔ مومنین کے متعلق یہ نہیں تھا کہ جنہوں نے تمہارے ساتھ ہجرت کی ہے تو ان میں سے صرف وہی تمہارے لیے

---

❶ اگر اسے گھر سے نکالنے لگے ہو۔

❷ اے نبی! تیرے لیے تیری وہ بیویاں حلال ہیں' جن کے مہر ادا کرکے' تو نے ان سے نکاح کیا ہے۔ نیز وہ عورتیں جو کفار کی طرف سے لوٹ کر تمہاری طرف آئی ہیں (60:10)۔ نیز' تیرے چچا کی بیٹیاں اور پھوپھی کی بیٹیاں اور تیرے ماموں کی بیٹیاں اور خالہ کی بیٹیاں (لیکن اس کے لیے ایک شرط ہے)

جائز ہیں۔ وہاں جو عام مومنین کے لیے سورۃ النسآء میں احکام ہیں' وہاں مومنین کے اوپر یہ شرط نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے متعلق یہ شرط عائد کی ہوئی ہے کہ یہ جو مہاجر بن کر آئے ہیں' یہ بیچاریاں پناہ کی تلاش کریں گی۔ اب بھی ہمارے ہاں جو ہم اس زمانے میں آئے تھے تو ہمیں پناہ گیر ہی کہا جاتا تھا۔ آگے کہا کہ وَامۡرَاَةً مُّؤۡمِنَةً اِنۡ وَّهَبَتۡ نَفۡسَهَا لِلنَّبِیِّ اِنۡ اَرَادَ النَّبِیُّ اَنۡ یَّسۡتَنۡكِحَهَا (33:50) یہ جو مومن عورتیں آ رہی ہیں' یہ بے ساز و یراق آ رہی ہیں' ان کے ماں باپ بھی شاید وہاں رہ گئے ہیں' کوئی ان کا ساتھی نہیں ہے' کوئی ان کے ساتھ شادی کرنے والا ملے گا بھی نہیں۔ رسول اللہ ﷺ پہ پابندی لگا دی گئی کہ اگر شادی کرنی ہے تو یہ جو بیچاری پناہ ڈھونڈنے کے لیے یہاں آ رہی ہیں' یکتا و تنہا رہ گئی ہیں' ان کا کوئی مونس و غمخوار نہیں رہ گیا' تم صرف ان سے شادی کرو۔ یہ Exception (استثنا) دی جا رہی ہے سربراہِ مملکت کے حق میں۔ کہا ہے کہ خَالِصَةً لَّكَ مِنۡ دُوۡنِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ (33:50) یہ صرف تمہارے ہی لیے ہے [1]۔ مکے سے بہت سی عورتیں اس زمانے میں چلی آ رہی تھیں۔ وہ عجیب نقشہ تھا۔ عزیزانِ من! قرآن کے ان اصولوں کو سمجھنے کے لیے اس پس منظر کا سامنے رکھنا بڑا ہی ضروری ہے تب بات سمجھ میں آتی ہے۔

ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت جن حالات میں دی گئی

مکے میں سارے کفار تھے' غیر مسلم تھے۔ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ ہجرت کر کے خاندان تک آ گئے' بہت سی مسلمان عورتیں وہاں رہ گئیں جن کے خاوند ابھی تک کافر تھے۔ وہ انہیں ادھر چھوڑ چھوڑ کر چلی آئیں۔ آگے چل کر میں بتاؤں گا کہ قرآن نے اس باب میں کتنے بڑے عدل اور انصاف کا حکم دیا تھا لیکن وہ تو ان کو چھوڑ کر چلی آئیں۔ وہ اس طرح سے آئیں تھیں۔ یہ ان کے متعلق خصوصی حکم دیا گیا تھا۔ کہا یہ گیا تھا کہ ان کو واپس نہ بھیجنا' وہ تو ان کی تکا بوٹی اڑا دیں گے۔ یہ کس طرح واپس جائیں گی جو اپنا سب کچھ چھوڑ کر ایمان کی خاطر' اسلام کی خاطر' یہاں آئی ہیں تو یہ ان کی Provision (گنجائش) تھی جس کے لیے یہ خصوصی احکام دیئے گئے تھے نبی اکرم ﷺ کو بھی اور مومنوں کو بھی کہ ایک سے زیادہ شادی کر لو۔ وہ صرف اس واقعہ کے متعلق تھا' اس قسم کے حالات کے متعلق تھا کہ اب یہ جو آ گئی ہیں' جوان عورتیں ہیں' بیوہ ہیں ان کو یتمٰی کہا ہے' ان کو پناہ دینی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کہاں پناہ دی جائے؟ یہ بہت بڑی حکمت تھی۔ جوان لڑکی' جوان عورت کو گھر کے اندر لا کر یونہی رکھا جائے تو ایک تو پناہ کی بھی ضمانت نہیں ہوتی' ایک وہ بھی اس طرح رہنے میں شرف اور

---

[1] یعنی یہ دونوں احکام (کہ عم زادہ وغیرہ کے سلسلے میں صرف وہ جو ہجرت کر کے آئیں اور نکاح بلا مہر) صرف تیرے لیے مخصوص ہیں۔ عام مومنین کے لیے نہیں۔ عام مومنین کے لیے' ان کی بیویوں اور لونڈیوں کے ضمن میں' جو ان کے معاشرے میں پہلے سے موجود تھیں' جو احکامات دیئے جا چکے ہیں' ان کا ہمیں علم ہے۔ (وہ قرآن میں دیگر مقامات پر موجود ہیں)۔

عزت محسوس نہیں کر سکتی کہ میں کس حیثیت سے اس گھر میں ہوں۔ کہا کہ شرف وعزت کے اعتبار سے گھر میں اپنی بیویوں کی رضا مندی سے ان سے کہو کہ تمہاری ایک بہن اس وقت سہارے کی محتاج ہوگئی ہے' میں اسے لانا چاہتا ہوں۔

عورتوں کا ''یتیم عورتوں'' سے سلوک

آپ حیران ہونگے کہ ہمیں اس مسخ شدہ تاریخ میں بھی یہ واقعات ملتے ہیں کہ ان حالات کے اندر اگر کوئی دوسری بیوی آتی تھی جو قرآن نے اجازت دی ہے' تو یہ گھر کی بیویاں اس کے استقبال کے لیے باہر آیا کرتی تھیں کہ آؤ بہن' کوئی بات نہیں ہے' مل کر گزارہ کریں گے' تمہارا کوئی سہارا نہیں ہے تو ہم تمہارے سہارے ہیں' فکر نہ کرو۔ آگے کہا کہ **قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْ اَزْوَاجِهِمْ وَ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَيْكَ حَرَجٌ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا**(33:50) ہمیں معلوم ہے کہ ہم نے بیویوں اور لونڈیوں کے ضمن میں جو ان کے معاشرہ میں پہلے سے موجود تھیں' کیا کیا باتیں ہیں جو ہم نے واجب قرار دی ہیں۔ اور تمہارے لیے یہ خصوصی احکام اس لیے دیئے ہیں تا کہ تجھے معاملات کے سلجھانے میں دِقت نہ ہو۔ اس لیے بھی واجب قرار دی ہیں کہ خدا چاہتا ہے کہ ان کی حفاظت ہو جائے' کسی طرح ان کی نشو ونما کا سامان پیدا ہو جائے' اس لیے یہ Exceptions (مستثنیات) کی گئی ہیں' قانون کے اندر استثنا کیا گیا ہے۔

عزیزانِ من! سورۃ الاحزاب کی آیت 50 تک ہم آ گئے۔ (اس آیت کی مزید وضاحت کرتے ہوئے ہم) 51ویں آیت سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

❀❀............❀❀............❀❀

آٹھواں باب: **الاحزاب** (آیات 50 تا 71)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عزیزانِ من! آج فروری 1980ء کی 8 تاریخ ہےاور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الاحزاب کی آیت 50 سے ہی ہو رہا ہے: (33:50)۔

تجدید یادداشت

سابقہ درس میں چونکہ موضوع خصوصی تھا' اس لیے تجدیدِ یادداشت کے لیے عرض کردوں کہ قرآنِ کریم میں سورۃ الاحزاب میں جنگِ احزاب کے ہولناک واقعات اور حوادث کا ذکر کرنے کے بعد' ساتھ ہی عائلی زندگی' گھروں کی زندگی' کے متعلق ہدایات دینی شروع

کیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ اس نے کہا یہ ہے کہ اگر گھر کی زندگی اطمینان بخش نہیں ہے تو آپ باہر کی زندگی میں بھی کوئی کام اطمینان سے نہیں کر سکتے۔ اس لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ پہلے اپنے گھر کے اندر یہ جو نظام آپ باہر چاہتے ہیں' اس کا چھوٹے پیمانے پہ ایک نقشہ قائم کیجیے تو پھر پوری زندگی جنّتی بن جائے گی۔ معاشرہ ہوتا کیا ہے؟ دن کے وقت ہم لوگ باہر نکل جاتے ہیں تو یہ معاشرہ ہو جاتا ہے' شام کو اپنے اپنے گھروں میں آ جاتے ہیں تو یہ اجزا میں بٹ جاتا ہے۔ یہ وہی معاشرہ ہوتا ہے جس کے حصے ہو جاتے ہیں۔ یہ دو الگ الگ زندگیاں نہیں ہیں۔ گھروں کے اندر کی زندگی اگر قرآنی نظام کے مطابق ہو جائے تو باہر معاشرہ خود بخود اس کے مطابق ہو جاتا ہے تو اس لیے اس نے بڑی تاکید سے گھروں کے اندر کی زندگی' عائلی زندگی' کے متعلق پہلی چیز یہی دی۔ قرآنِ کریم کی رو سے اصولاً Monogamy (وحدتِ زوج) کا حکم ہے یعنی جسے وحدتِ زوج کہتے ہیں: ایک وقت میں ایک بیوی۔ یہ دو تین چار بیویوں کی اس قانون میں صرف ایک استثنا (Exception) تھی اور اس کی وجہ بتائی گئی تھی۔ نبی اکرمﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی جو ابتدائی دور کی زندگی تھی' مکے کے بعد مدینے میں آپﷺ ہجرت کر کے آئے' مخالفین نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ قریب سات سال تک انہیں مختلف قسم کی جنگیں لڑنا پڑیں۔ مورخین بتاتے ہیں کہ اگر غزوات اور سرایا کو اکٹھا کیا جائے یعنی وہ جنگیں جن میں حضورﷺ خود شریک ہوئے یا چھوٹی چھوٹی جھڑپیں جن میں آپ شریک نہیں تھے، تو یہ قریباً اسی بیاسی کے قریب بنتی ہیں۔ جنگوں کا ایک نتیجہ تو یہ ہوتا ہے کہ یا بچے رہ جاتے ہیں یا بوڑھے رہ جاتے ہیں' جوان جنگوں میں' میدانِ جنگ میں' کام آ جاتے ہیں۔

عزیزانِ من! یہ چھوٹی سی کمیونٹی تھی' مختصر سی ایک جماعت تھی۔ اس کے اندر نوجوان طبقے کے اس طرح سے کم ہوتے چلے جانے سے' جوان لڑکیاں ہیں جو شادی کے قابل ہیں اور جو شہید ہو جاتے ہیں' ان کی بیوائیں ہیں' ان کے یتیم ہیں' اُدھر مکے سے اور دوسرے مقامات سے عورتیں' اپنے خاوندوں کو چھوڑ کر مدینے آ رہی تھیں' انہیں واپس نہیں بھیجا جا سکتا تھا۔ قرآن نے اس کا حکم دیا کہ انہیں واپس نہ بھیجو۔ یہ عورتیں مسلمانوں کے سوا کسی اور سے شادی نہیں کر سکتی تھیں' یہ شادی جائز ہی نہیں ہے۔ اس سے تعداد بہت زیادہ بڑھ گئی ایسی عورتوں کی جنہیں قرآن نے یَتٰمٰی کہا ہے۔ اس کے معنی یتیم بچے ہی نہیں ہوتے بلکہ عربی زبان میں ''وہ عورت جسے خاوند نہ مل رہا ہو' شادی نہ ہوئی ہو' اس کو بھی یتیم کہتے تھے''۔ قرآنِ کریم نے ان حالات سے نپٹنے کے لیے یہ کہا کہ **وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ** (4:3) ۔ یہ ایک پرابلم آ گئی ہے: مرد بہت کم ہیں' عورتوں کی تعداد زیادہ ہو گئی' کمیونٹی بہت چھوٹی سی ہے' تو تمہارے لیے یہ ایک نئی پرابلم پیدا ہو جائے گی اس لیے ہم اپنے اس اصول میں استثنا کی اجازت دیتے ہیں کہ اگر ان عورتوں کا مسئلہ' جن کو خاوند نہیں مل رہے' منصفانہ طور پر کوئی اور حل نہ نظر آئے' تو پھر اس اصول میں استثنا کر لو اور جو یہ عورتیں چاہیں' تم چاہو' تمہاری پہلی گھر والی چاہیں' تو باہمی رضامندی سے ایک سے زیادہ شادی کر لو۔ جوان عورتوں کو بغیر شادی

کے گھروں کے اندر لانا ایک تو ویسے ہی خرابی کا موجب ہوسکتا ہے پھر وہ عورت بھی اس گھر کے اندر اپنے آپ میں کچھ Respect (عزت) محسوس نہیں کرتی' اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کس پوزیشن میں اس گھر کے اندر ہوں۔ انہیں بھی Self Respect (عزتِ خویش) کا لحاظ رکھتے ہوئے کہا گیا کہ اس کا حل یہ ہے۔ یہ بھی صرف اس وقت تک ہے جب تک یہ پرابلم (مسئلہ) حل نہ ہو جائے۔

نکاح نامے کے فارم پر ''خفتم'' کے الفاظ محذوف کردیئے جاتے ہیں

پہلے یہ شرط ہے کہ اِنْ خِفْتُمْ (4:3) اگر یہ صورت پیدا ہوجائے اور کوئی حل نہ ملے تو پھر اس کی اجازت ہے لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اس کے بعد اِنْ خِفْتُمْ کہیں آتا ہی نہیں ہے۔ یہ میں نے ایسے ہی نہیں کہا کہ کہیں نہیں آتا' یہ جو نکاح نامے کے فارم چھپے ہوئے ہیں ان میں آپ دیکھیے اوپر یہ آیت لکھی ہوئی ہوتی ہے اور اِنْ خِفْتُمْ کے الفاظ وہاں محذوف ہوتے ہیں' لکھے ہی نہیں جاتے۔ میں نے نکاح خوانوں کو دیکھا کہ نکاح پڑھاتے ہوئے یہ آیت ان کو درمیان میں لانی پڑتی ہے تو وہ اِنْ خِفْتُمْ بھی چھوڑ دیتے ہیں اور یہیں سے شروع کرتے ہیں کہ فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ (4:3) تو چار کے جواز کے لیے قرآن کے اندر تحریف ہوجاتی ہے۔ اور ذرا اسے بھی دیکھیے کہ نکاح بیٹی والے کے گھر میں ہوتا ہے' لڑکا بیٹھا ہوا ہو اور نکاح پڑھا جا رہا ہو تو وہ آہستہ آہستہ کان میں یہ بات کہتے ہیں کہ فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ (4:3) تو وہ غنیمت ہے کہ نہ لڑکا جانتا ہے کہ کیا کہہ رہا ہے' نہ لڑکی کے باپ بھائی جانتے ہیں۔ اگر انہیں معلوم ہوجائے کہ یہ اس کے کان میں یہ کہہ رہا ہے کہ اسی ایک پہ اکتفا نہ کرنا' چار چار اور بھی کر لینا' تو وہ اسے کان سے پکڑ کر باہر نکال دیں لیکن یہ ہو رہا ہے' کوئی نہیں پوچھتا کہ اِنْ خِفْتُمْ قرآن نے لکھا ہے' اسے بھی تو سامنے لاؤ۔ شرط کے بغیر تو آگے جو جزا ہوتی ہے اس کے معنی ہی کچھ نہیں ہوتے جیسے ''اگر وہ ہو تو یہ کرو''۔ اگر آپ ''اگر وہ ہو'' کو چھوڑ دیں اور ''تو یہ کرو'' کہیں تو فقرہ ہی نہیں بنتا۔

چار چار شادیوں کی گنجائش نکالنے کی خاطر عائلی قوانین کو ختم کروانے کی کوشش

1962ء میں جو عائلی قوانین (Family Laws) Introduce (متعارف) ہوئے تھے' وہ بھی پورے کے پورے قرآن کے مطابق نہیں تھے لیکن موجودہ حالات میں کچھ تھوڑی سی اصلاح اس میں ہوگئی تھی۔ ایک سے زیادہ بیوی کے سلسلے میں اس میں شرط یہ عائد کی گئی تھی کہ پہلی بیوی کی رضا مندی ضروری ہے اور یہ بھی کہ آپ کونسل کو مطمئن کریں کہ آپ دو بیویوں کا بوجھ اٹھا سکیں گے کیونکہ قرآن میں دوسری شرط یہ ہے کہ تم ان میں عدل بھی کرسکو۔ اگر یہ نہ کرسکو تو پھر اجازت نہیں ہے۔ ان عائلی قوانین میں اتنی سی شرط رکھ دی گئی تھی کہ پہلی بیوی کی رضا مندی ہو اور یہ اطمینان دلا دینا ہو کہ تم جو اخراجات زیادہ ہوں گے ان کا بوجھ اٹھا سکو گے۔ ان قوانین

کے خلاف اس زمانے سے طوفان مچایا جارہا ہے کہ ان کو منسوخ کرو۔ اتنی سی شرط بھی گوارہ نہیں کی جاسکتی۔ کہا یہ جارہا ہے کہ جو مردوں کے حقوق ہیں ان پہ زیادتی ہو رہی ہے یعنی عورتوں کا تو کوئی حق ہے ہی نہیں' اس کا تو اپنا کوئی وجود نہیں ہے' بابا آدم کی پسلی سے نکلی ہوئی ہے' یہ تو پیدا ہی نہیں ہوئی یعنی یہ خدا کی (آدم کی طرح الگ سے) پیدا کردہ نہیں ہے' آدم نے اسے پسلی سے نکالا ہوا ہے۔ مردوں کے حقوق کی پامالی ہو رہی ہے۔ اتنی سی بات کہ ذرا پہلی بیوی کی رضامندی تو ہو جائے یا اضافی خرچ اٹھانے کا اطمینان دلا دو' یہ بھی انہیں گوارہ نہیں ہے:

میری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی

شیخ کہتا ہے کہ ہے یہ بھی حرام اے ساقی!

ہجرت کے دوران مکہ مدینہ میں پیدا ہونے والے خاندانی حالات

قرآنِ کریم نے یہاں سے معاملہ لیا۔ ان حالات میں ابتدائی دور کے مسلمانوں کے گھروں میں ایک سے زیادہ بیویاں نظر آتی ہیں۔ وہ اس اجازت' اس مصلحت اور اس ضرورت' کے ماتحت تھیں۔ نبی اکرم ﷺ کے گھرانے میں بھی بڑے معزز گھرانے کی خواتین تھیں جو بیوہ ہوگئی تھیں۔ بعض ایسی تھیں جن کے خاوند اسلام نہیں لائے تھے۔ دیارِ غیر میں کئی ایسی تھیں جنہوں نے انہیں چھوڑ دیا تھا۔ یہ بڑے بڑے ممتاز قبائل کی خواتین تھیں۔ بے سروسامان تھیں' کہاں جاتیں؟ مدینے میں آئیں' حضور ﷺ کے گھر میں ہی ان کو حفاظت اور عزت مل سکتی تھی' وہ یہاں آ گئیں۔ بات یہاں سے شروع ہوئی تھی جو میں نے دہرایا ہے کہ جب یہ حالات جو Exceptional (استثنائی) تھے' ہنگامی حالات تھے' وہ ختم ہوگئے' معاشرہ نارمل حالات پہ آ گیا' اعتدال پہ آ گیا تو اس وقت پھر یہ کہا گیا کہ جو عورتیں ان حالات میں آئی تھیں' انہیں اجازت دیدی جائے کہ وہ اس طرح سے رہنا چاہیں تو رہیں' نہ رہنا چاہیں تو انہیں یہاں سے رخصت کر دیا جائے۔ اسی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کن حالات میں یہ اجازت دی گئی ہے اور اس کی ابتدا خود نبی اکرم ﷺ کے گھرانے سے ہوئی۔ حضور ﷺ سے کہا گیا کہ انہیں کہہ دیجیے کہ اب ہنگامی حالات نہیں رہے' اب تم از سرِ نو اپنے متعلق فیصلہ کرو کہ ان حالات میں ان گھروں میں رہنا چاہتی ہو یا جانا چاہتی ہو تو چلی جاؤ۔ اور ''جانا چاہتی ہو'' کی صورت میں تو میں نے بتایا تھا کہ قرآن تو یہ کہتا ہے کہ اگر طلاق بھی دو تو وَ سَرِّحُوۡهُنَّ سَرَاحًا جَمِيۡلًا (33:49) اس کو نہایت حسن کارانہ انداز سے گھر سے وداع کرو۔ یہ اجازت آپ کو دی گئی۔ دوسری بات آپ ﷺ نے یہ کہی کہ اب ٹھیک ہے' ایک مملکت قائم ہوگئی ہے' حالات بہت بہتر ہو گئے ہیں' پہلی زندگی کے اندر تو کتنے کتنے دنوں تک چولہے میں آگ بھی نہیں جلا کرتی تھی۔ کہا کہ مملکت تو مل گئی ہے اور میں سربراہِ مملکت بھی ہوں لیکن تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ میں ویسے کا ویسا فقیرِ بوریہ نشیں ہوں' یہ نہ سمجھ لینا کہ میں سربراہِ مملکت ہوں اور تم ملکائیں بن جاؤ گی بلکہ ایسی ہی غریبانہ زندگی بسر کرنا ہوگی

جیسی ہم بسر کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اگر یہ منظور ہے تو پھر رہو نہیں تو چلی جاؤ۔ یہی صورت حضورﷺ کے ساتھ تھی اور یہی صورت باقی مسلمانوں کے ساتھ تھی۔ یہ جو 50 ویں آیت تھی' اس میں یہ چیز کہی۔ یہ اس زمانے کی آیت ہے جب یہ عورتیں ہجرت کر کے آ رہی تھیں۔ اور پھر میں نے یہ عرض کیا تھا کہ

جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے

شادی کے سلسلہ میں نبی اکرمؐ کے متعلق خصوصی احکام اور آپ کی عملی زندگی

قرآنِ کریم کے نبی اکرمﷺ کے لیے بعض احکام خصوصی ہیں۔ وہ خصوصی احکام زیادہ رعایتیں نہیں ہیں بلکہ باقیوں کے مقابلے میں زیادہ پابندیاں ہیں۔ اس میں ایک یہ بھی پابندی تھی کہ قرآنِ کریم نے جو رشتے حلال قرار دیئے ہیں' اُن میں چچا کی بیٹی' ماموں کی بیٹی' خالہ کی بیٹی سے بلا مشروط شادی جائز ہے لیکن نبی اکرمﷺ کے متعلق تھا کہ آپﷺ کے لیے بلا مشروط ان کے ساتھ شادی جائز نہیں ہے بلکہ اُن مہاجر عورتوں کے ساتھ جائز ہے اگر وہ ہجرت کر کے آپ کے پاس آئیں' اگر وہ اس صورت میں آپﷺ کے پاس آئیں تو آپؐ ان میں سے شادی کر سکتے ہیں[1] اور یہ کہا کہ وہ **خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ** (33:50) یہ حکم صرف تیرے لیے مخصوص ہے' یعنی ایک پابندی اور عائد کی جا رہی ہے۔ یہ دونوں احکام (کہ عم زادہ وغیرہ کے سلسلہ میں صرف وہ جو ہجرت کر کے آئیں' اور نکاح بلا مہر) صرف تیرے لیے مخصوص ہیں' عام مومنین کے لیے نہیں ہیں اور اس کے ساتھ ہی یہ ہے کہ **قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْۤ اَزْوَاجِهِمْ وَ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ** (33:50) باقی مسلمانوں کے متعلق اُن کی بیویوں اور لونڈیوں کے ضمن میں' جو ان کے معاشرہ میں پہلے سے موجود تھیں' جو احکام ہم نے دیئے ہیں' ان کا ہمیں علم ہے' وہ قرآن میں' دیگر مقامات پر موجود ہیں' ان کا دائرہ وسیع ہے' یہ تجھ پر خصوصیت سے پابندی عائد کی جا رہی ہے کہ **لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَيْكَ حَرَجٌ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا** (33:50) تُو اپنے معاملات کے حل کرنے میں کسی قسم کی دقت محسوس نہ کرے۔ ضابطۂ خداوندی میں اس قسم کے

---

[1] یہ آیت یوں ہے: يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْۤ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَ مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَ بَنٰتِ عَمِّكَ وَ بَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَ بَنٰتِ خَالِكَ وَ بَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ وَّ امْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا (33:50) اے نبی! تیرے لیے تیری وہ بیویاں حلال ہیں جن کے مہر ادا کر کے' تو نے ان سے نکاح کیا ہے۔ نیز وہ عورتیں جو کفار کی طرف سے لوٹ کر تمہاری طرف آئی ہیں (60:10)۔ نیز' تیرے چچا کی بیٹیاں اور پھوپھی کی بیٹیاں' اور تیرے ماموں کی بیٹیاں اور خالہ کی بیٹیاں' جنہوں نے تیرے ساتھ ہجرت کی ہے۔ اور وہ مومن عورتیں بھی جو بلا مہر طلب کیے، تیرے نکاح میں آ جانا چاہیں' اور تو بھی اس سے نکاح کرنا پسند کرے (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص ص 978 تا 979)۔

خصوصی احکام کی گنجائش اس لیے رکھی گئی ہے تا کہ ان سے معاشرہ کی حفاظت ہوجائے اور افراد کی نشوونما میں فرق نہ آئے۔ یہ خدا کی عین مرحمت ہے۔ باقی رہا یہ عورتیں جن کے متعلق یہ کہا تھا کہ تمہارا جی چاہے تو اس گھر کو چھوڑ کر چلی جاؤ' میں بڑے حسن کارانہ انداز سے تمہیں وداع کرونگا اور اس کے بعد یہ کہا ہے کہ **تُرۡجِیۡ مَنۡ تَشَآءُ مِنۡهُنَّ وَ تُـٔۡوِیۡۤ اِلَیۡکَ مَنۡ تَشَآءُ ؕ وَ مَنِ ابۡتَغَیۡتَ مِمَّنۡ عَزَلۡتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡکَ ؕ ذٰلِکَ اَدۡنٰۤی اَنۡ تَقَرَّ اَعۡیُنُهُنَّ وَ لَا یَحۡزَنَّ وَ یَرۡضَیۡنَ بِمَاۤ اٰتَیۡتَهُنَّ کُلُّهُنَّ ؕ وَ اللّٰهُ یَعۡلَمُ مَا فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ ؕ وَ کَانَ اللّٰهُ عَلِیۡمًا حَلِیۡمًا**(33:51) ان میں سے بھی وہ جو رہنا چاہے اور وہ کہے کہ صاحب! اس گھر کے اندر میری آنکھوں کو جو ٹھنڈک نصیب ہے' وہ اور کہاں نصیب ہوگی تو ٹھیک ہے' ان کو رہنے دو لیکن ان پہ واضح کر دو کہ اس گھر میں ملے گا وہی کچھ جو میں نے تمہیں بتایا ہے' یہاں اس قسم کی زندگی بسر کرنا ہوگی' شاہانہ زندگی بسر نہیں کی جاسکتی' بڑی غریبانہ زندگی ہوگی۔ اس لیے کہ وہاں اصول یہ تھا کہ سربراہِ مملکت کی زندگی مملکت کے غریب تر فرد کے معیار کے مطابق ہوگی۔

جیسا میں نے پچھلے درس میں عرض کیا تھا' آپ نے سنا ہوگا' میں نے اسلامی نظام کا پورا تصور دیا تھا' اس میں ایک یہ بات بھی سامنے آئی تھی کہ سربراہِ مملکت حضرت عمر فاروقؓ (581-644/45AD) سے جو کہا گیا تھا کہ آپ جو کی روٹی کیوں کھاتے ہیں' آپ گیہوں کی روٹی کیوں نہیں کھاتے؟ اُنہوںؓ نے کہا تھا کہ مجھے اس کا تو یقین ہے کہ مملکت کے ہر فرد کو جو کی روٹی مل رہی ہے' جس دن مجھے یہ یقین دلا دو گے کہ مملکت کے ہر فرد کو گیہوں کی روٹی ملتی ہے میں اس کے بعد گیہوں کی روٹی کھا سکتا ہوں۔ انہیں (ازواجِ مطہرات کو) یہ کہا گیا کہ ایسا فیصلہ کرتے وقت یہ سمجھ لو کہ یہاں یہ ملے گا' یہ زندگی بسر کرنا ہوگی۔ ایسی زندگی بسر کرنی ہے تو بسم اللہ' تمہاری آنکھوں کو اس سے ٹھنڈک نصیب ہوتی ہے تو میری آنکھوں کو بھی اس سے ٹھنڈک نصیب ہوگی لیکن یہ دیکھ لو کہ اس زندگی کے اندر مطمئن رہنا ہوگا۔ اور کہا کہ یہ نہیں ہوگا کہ کسی مصلحت کی خاطر' میری خاطر' اپنی خاطر' یونہی یہ بات کہہ دو کہ ہمیں منظور ہے۔ **وَ اللّٰهُ یَعۡلَمُ مَا فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ** (33:51) دلوں کو الگ بیٹھ کے ٹٹول لو' پھر سوچ لو کہ یہ زندگی تمہیں منظور ہے۔ اگر منظور ہے تو بسم اللہ۔ اس سب کو چھوڑ کر کسی نے کسی جگہ جانا منظور نہ کیا تھا۔ جو عزت اور آنکھوں کی ٹھنڈک اس چھت میں نصیب ہوسکتی تھی وہ اور کہاں ہوسکتی ہے۔ یہ باتیں اس لیے واضح کر دی گئی ہیں کہ **وَ کَانَ اللّٰهُ عَلِیۡمًا حَلِیۡمًا** (33:51) اللہ خوب جانتا ہے کہ تمہارے دلوں میں کیا کیا خیالات آسکتے ہیں۔ اللہ ہر بات کا علم رکھتا ہے اور اس کا ہر فیصلہ حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔

حضرت زیدؓ نبوت کے گھرانے کا فرد بن گیا

عزیزانِ من! یہ تو بیویاں تھیں' وہ زید غلام جو حضرت خدیجہؓ نے انہیں دیا' اس زمانے میں غلام ہی کہتے تھے' ہم بھی اس نسبت

سے صرف غلام کہتے ہیں ورنہ وہ تو جونہی مسلمان ہو جاتا تھا' اسلام لے آتا تھا' غلام رہتا ہی نہیں تھا۔ لیکن میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ وہ اس حیثیت سے آیا ہوا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے ہاں جب آیا تو آپ ﷺ نے اسے آزاد کر دیا۔ آزادی کے معنی تھے کہ جہاں جی چاہے تم جاؤ۔ اس کے باپ اور چچا کو یہ معلوم ہو گیا کہ وہ ہمارا جو بیٹا یا بھتیجا ہے' اسے آزاد کر دیا ہے تو وہ ان کو لینے کے لیے حضور ﷺ کے پاس آئے اور کہا کہ آپ ﷺ نے آزاد کیا ہے تو ہم لے جانا چاہتے ہیں۔ آپ ﷺ نے کہا بسم اللہ یہ کھڑا ہے۔ باپ اور چچا دونوں کھڑے تھے۔ اُنہوں نے کہا کہ آؤ بیٹا! تم آزاد ہو گئے ہو' گھر چلو۔ اُنہوںؓ نے کہا کہ میں آزاد ہو گیا ہوں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ میں اپنی مرضی کے مطابق اب فیصلہ کر سکتا ہوں۔ اُنہوںؓ نے باپ سے کہا کہ اس گھر کو چھوڑ کر میں باپ کے گھر نہیں جانا چاہتا' یہ باپ کے گھر سے کہیں زیادہ عظیم گھر ہے۔ باپ اور چچا واپس چلے گئے لیکن زیدؓ [1] ان کے ساتھ نہیں گیا۔ اس گھر سے یہ امہات المومنینؓ بھلا کیوں جاتیں لیکن انہیں یہ کہہ دیا گیا تھا کہ جانا چاہتی ہو تو جاؤ' رہنا چاہتی ہو تو یہ سمجھ کر رہو کہ زندگی اسی قسم کی غریبانہ ہو گی۔ دل کو ٹٹول کر پھر اس کے متعلق فیصلہ دو' عجلت میں فیصلہ نہ دینا۔

آپ ﷺ کو مزید کسی شادی سے ممانعت کا حکم

یہ سب کچھ کرنے کے بعد رسول اللہ ﷺ پہ پھر اور پابندی عائد کی اور کہا کہ **لَا یَحِلُّ لَکَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَ لَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَکَ حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَکَتْ یَمِیْنُکَ** (33:52) اس کے بعد تمہارے لیے کسی نئی عورت سے شادی کرنا جائز نہیں ہو گا۔ نہ ہی یہ کہ ان بیویوں میں سے کسی کو طلاق دے کر اُن کی جگہ کسی اور عورت سے نکاح کر لے' خواہ اس کی خوبیاں تمہیں کتنی ہی اچھی کیوں نہ لگیں۔ اب تیری بیویاں وہی رہیں گی جو تیری بیویاں بن چکی ہیں۔ کہا کہ یہ معاملہ طے ہو گیا۔ یہ پابندی خاص طور پر تیرے لیے ہے' دوسرے مسلمانوں کے لیے نہیں۔ یاد رکھو کہ **وَ کَانَ اللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ رَّقِیْبًا** (33:52) جب یہ پچھلا معاملہ طے ہو گیا ہے تو اے رسول! اب اس کے بعد تمہیں اجازت نہیں ہے کہ کوئی اور شادی کر سکو یا ان میں سے کسی کو چھوڑ کر' طلاق دے کر' اس کی جگہ کوئی دوسری بیوی لے آؤ' تمہیں اب اس کی اجازت نہیں ہے۔ یہ خصوصی احکام رسول ﷺ کے متعلق آ رہے ہیں' اس لیے کہ رسول ﷺ کی زندگی نے تو اسوہ بننا تھا' باقیوں کے لیے ماڈل بننا تھا۔ تو ان ﷺ پہ خاص طور پہ پابندی عائد کی جا رہی ہے' جو دوسرے مسلمانوں پہ پابندی نہیں تھی۔ جو پہلے سے آ چکی ہیں' بیویاں بن چکی ہیں' وہی ہیں' اس کے بعد اب اور اجازت نہیں ہے: نہ نئی بیوی کرنے کی' نہ تبدیل کرنے کی۔

---

[1] یہ حضرت زیدؓ بن حارث ہیں اور دوسرے زیدؓ بن ثابت ہیں جنہوں نے قرآنِ کریم کی کتابت کی تھی۔

ظہورِ اسلام کے وقت عربوں کی معاشرتی زندگی اور حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے وقت خود انؓ کی اپنی کیفیت

اب اس کے بعد یہ جواز دواجی زندگی تھی اس سے آگے بڑھ کر معاشرتی زندگی کے کچھ احکام آتے ہیں۔اس ضمن میں دو باتیں ذہن میں رکھیے۔ایک تو یہ کہ ظہورِ اسلام سے پہلے' یہ عرب جو وہاں کے تھے' ان کی تمدنی حالت کیا تھی' اسے کہتے ہی زمانۂ جاہلیت ہیں۔ عربوں کی کیفیت یہ تھی کہ ایرانی ان کے ساتھ دوستی کا معاہدہ تو ایک طرف' وہ اُن کے ساتھ جنگ کرنا بھی اپنے لیے ہتکِ عزت سمجھتے تھے۔ فردوسی جیسا اپنے شاہنامہ میں لکھتا ہے کہ یہ عرب زشیرِ شُتر خوردن سوسمار۔کیفیت ان کی یہ ہے کہ ان کو دودھ بھی اونٹنیوں کا نصیب ہوتا ہے اور یہ گوہ کھانے والے' اونٹنی کا دودھ پینے والے' کیا یہ انسانوں کی صف میں کھڑے ہونے کے قابل ہیں۔ جاہلیتِ عرب میں ان کی کیفیت یہ تھی۔اور پھر میں نے عرض کیا تھا کہ اس کے بعد جب حضرتِ عمرؓ جب حضرت عمر نہیں' عمر ابنِ خطاب تھے تو انہوں نے خود بتایا تھا کہ میں اسلام کیسے لایا۔اُنھوں نے کہا تھا کہ ہم شام کو ایک جگہ بیٹھ کر شراب پیا کرتے تھے' اُس دن محفل کہیں جمی ہوئی نہیں تھی' شراب مجھے کہیں مل نہیں رہی تھی تو میں نے کہا کہ روز تو آدھی رات کو گھر جاتا تھا' آج جلدی کیوں چلا جاؤں' چلو اور کچھ نہیں تو کعبے کا طواف ہی کرلوں۔یعنی ان کی کیفیت یہ تھی۔

وحی کی طرف سے دنیا بھر کے انسانوں کے لیے معاشرتی آداب اور ان کی اہمیت

اگلی بات یہ ہے کہ یہ لوگ اس قسم کی معاشرتی' تمدنی سطح کے اوپر تھے' تربیت و تعلیمِ نبوی ﷺ نے انہیں یہاں سے اٹھا کر افلاک پر پہنچا دیا تھا کہ آج تک دنیا کی قومیں اس مقام تک پہنچنے کے لیے کوشش کر رہی ہیں۔کہا ہے کہ **وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ** (2:129) رسول اللہ ﷺ ان کی تعلیم اور تربیت کرتے ہیں۔گویا ان لوگوں کی یہ سطح تھی جن کی طرف رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے تھے۔اب یہ دیکھیے کہ قرآن ان کے متعلق کچھ ذکر کرتا ہے۔بات تو وہ ان کی کر رہا ہے کہ اس قسم کی سطح کے یہ لوگ تھے' روزمرہ کے معاملات میں ان کی حالت یہ کیا تھی تو بات یہ انہی کی نہیں کر رہا بلکہ قرآنِ کریم جو بات بھی بیان کرتا ہے' اس میں آنے والوں کے لیے اور قیامت تک کے لیے ایک اصولی ہدایت ہوتی ہے۔سنیے کہ کیا بات کہتا ہے۔

کہتا ہے کہ **يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّاۤ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ** (33:53) پہلی بات یہ کہ دیکھیے! یونہی جب جی چاہے' منہ اٹھایا اور رسول اللہ ﷺ کے گھر آ بیٹھے' ایسا بالکل نہ کیا کرو۔ پہلے Appointment (وقتِ ملاقات) لیا کرو' پہلے اجازت لیا کرو اور پھر آیا کرو۔پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ لوگ ایسے تھے جنہیں اس کا بھی پتہ نہیں تھا کہ دوسرے کے گھر میں جانا ہو تو پہلے اس سے پوچھا کرتے ہیں' اجازت لیا کرتے ہیں' Appointment (وقتِ ملاقات) لیا کرتے ہیں۔یعنی انہیں یہ بھی پتہ نہیں تھا اس

کے متعلق وحی کی رو سے انہیں کہنا پڑا کہ اجازت لے کر جایا کرو۔ اور وہ جو میں نے کہا ہے کہ یہ بات اس زمانے کی نہیں ہے' ہمارے لیے بھی ہے۔ مغرب نے تو اپنے ہاں یہ اصول اپنا لیا ہے' وہاں Without Appointment (بلا اجازت) کوئی کسی کے ہاں نہیں جاتا اور وہ بڑے سکھی ہیں۔ ہمارے ہاں اس معاشرے کے اندر یہ اصول تو کیا' کسی نے اس کو عادتاً بھی نہیں اپنایا کہ اس کی بھی ضرورت ہے کہ دوسرے کے ہاں ملنے کے لیے جانا ہو تو پہلے پوچھ لیجیے کہ آیا تمہیں فرصت بھی ہے۔

ہمارے ہاں صورتِ حال یہ ہے کہ (مثلاً) میں یہاں سے گزر رہا تھا' میں نے کہا: ''جا تو رہا ہوں تو ذرا سلام ہی کرتا جاؤں''۔ کچھ معلوم نہیں کہ وہ کس کام میں مصروف ہے' کیا کر رہا ہے' دگڑ دگڑ اندر آ گئے: ''سلام علیکم جناب''! اب آپ کچھ کہہ بھی نہیں سکتے۔ اور اگر آپ کسی وقت خدانکردہ آپ کی شامتِ اعمال کہہ دے کہ ''صاحب! اس وقت مجھے فرصت نہیں'' تو دیکھیے باہر چوراہے میں جا کر وہ کرتا کیا ہے کہ ''ہاں' نواب ہو گئے' کل تک دھکے کھایا کرتا تھا' ٹکے کا کلرک تھا' غرور کی یہ کیفیت ہے' ہم کوئی بھیک مانگنے آئے تھے' ہمیں کیا ضرورت ہے تمہارے ہاں آنے کی۔ یہ ہے ان کا مزاج''۔ اور پھر اگر میرے جیسا آدمی ہے تو پھر ایک قدم آگے کہ ان کا قرآن دیکھیے اور ''ان کے عمل دیکھیے۔ ''ہر ویلے پھاٹک کھلا کیوں نہیں رکھیا❶''۔ میں نے اس لیے اپنی مثال دی ہے کہ میرے ساتھ یہ روز بیتتی ہے اور آپ لوگوں کے ساتھ بھی تو یہ بیتتی ہوگی۔ اگر آپ بدقسمتی سے اس طرح گھر میں اپنے کام میں بیٹھے ہوں' نہ بھی بیٹھے ہوں' مہمان تک بھی پہلے اطلاع دے کر نہیں آتا۔ دس بجے رات کو آپ کھاپی کے سونے کی تیاری کر رہے ہیں اور کنڈی کھڑک رہی ہے' چلے آ رہے ہیں: تین مسمات ہیں' دو خاوند بھی ہیں اور بچے بھی ساتھ ہیں' ٹرنک بھی اٹھایا ہوا ہے اور چلے آ رہے ہیں۔ ''روٹی کا سناؤ' جی روٹی تے اج کھانی اے۔ گھر والے کھاپی کر سونے کی فکر میں بیٹھے ہوئے ہیں ''او کنبے دا کنبہ تریا اون ڈیا اے''❷۔ بچے یا تو پہلے ہی کچھ رو رہے تھے ''یا اونہاں دا تھوڑا جیا کن مروڑ دتا جاندا اے' تے او رونا شروع کر دیندے نیں''❸۔ ''او بھئی! چپ کراؤ ان بچوں کو''۔ ''جی چپ کی کراواں اینوں دوپہر دا دودھ نہیں ملیا ہیگا۔ گھر وچ بھاگڑ پئی ہیگی اے' کوئی منجی ڈاہندا پیا اے' کوئی بستر البھدا پیا اے''❹۔ اندازہ لگائیے روز ہمارے ہاں یہ کچھ ہوتا ہے۔ ان حالات میں جب میں نے قرآن کی ہدایت دیکھی تو عش عش کر اٹھا کہ بات کتنی چھوٹی سی ہے لیکن اس سے معاشرے میں تکلیف کتنی ہوتی ہے' تعلقات بگڑ جاتے ہیں۔ ''گئے سی جناب! تے روٹی تک دا نہیں پوچھیا' پانی تک دا نہیں

---

❶ آنے جانے والوں کے لیے ہر وقت دروازہ کھلا کیوں نہیں رکھا؟

❷ وہ پورا خاندان چلا آ رہا ہے۔

❸ یا ان کا تھوڑا سا کان مروڑ دیا جاتا ہے تو وہ رونا شروع کر دیتے ہیں۔

❹ اجی! اسے خاموش کیا کراؤں، اسے دوپہر کا دودھ نہیں ملا۔ گھر میں بھگدڑ مچی ہوئی ہے' کوئی چارپائی لگا رہا ہے تو کوئی بستر ڈھونڈ رہا ہے۔

پوچھیا' نہیں پوچھیا تے کھلائی تے ہیگی سی۔ لے کی کھلائی سی؟ اور وٹی ہیگی سی جیہڑی کھوائی ہیگی سی!! دال بھن کے لے اوندی سی اوہنے۔ یعنی اوس ویلے رات دے بارہ بجے مرغی کیوں نہیں پکائی"❶۔ ہمارے معاشرے میں یہ چیزیں عام ہیں۔ مغرب والے اس جہت سے تو بڑے سکھی ہیں۔ یہ چیز ان کے ہاں نہیں ہوتی۔ اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ قرآن نے قیامت تک اپنی دفتین میں ان ہدایات کو کیوں محفوظ رکھا ہوا تھا۔

کہا ہے کہ اے جماعتِ مومنین! پہلے اجازت لیے بغیر یہاں گھر میں مت آیا کرو(33:53)۔ یہ پہلی چیز ہے اور اگلی چیز اور ہدایت یہ ہے کہ **اِلٰی طَعَامٍ غَیۡرَ نٰظِرِیۡنَ اِنٰىهُ** (33:53) یہ تمہیں کھانے کے لیے کبھی دعوت دیتا ہے تو تمہاری کیفیت ہے کہ ابھی ہنڈیا چولہے پہ چڑھی ہوتی ہے اور تم آ کر بیٹھ جاتے ہو۔ کہا کہ یہ نہ کیا کرو۔ **وَ لٰکِنۡ اِذَا دُعِیۡتُمۡ فَادۡخُلُوۡا** (33:53) جب کھانے کے وقت پہ بلایا جائے' اس وقت آؤ۔ ہمارے ہاں تو صبح سے ناشتے کی چیز جو شروع ہوتی ہے تو بارہ ایک بجے تو وہی چلتی رہتی ہے' اب یہ آ گیا' اب وہ آ گیا۔ جتنا جی چاہے زور لگا لیجئے' یہ گھر کے افراد ایک وقت میں بیٹھ کر ناشتہ کر لیں لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ گھر میں یہ بیچاریاں پکانے والی چولہے کے اوپر بیٹھی ہوئی ہیں۔ ادھر سے فارغ نہیں ہوتیں کہ دوپہر کے کھانے کا وقت ہوتا ہے اور دوپہر کا کھانا تین تین چار چار بجے تک چلتا ہے۔ یہ گھر والوں کا وقت ہی کوئی نہیں ہے۔ یہ جو باہر سے آنے والے ہیں' ان کے متعلق تو آپ کو معلوم ہوگا یا تو وہ چیز ہے کہ ابھی ہانڈیاں چولہے پہ چڑھی ہوئی ہیں اور آ بیٹھے ہیں اور یا یہ کیفیت ہے کہ پکا ہوا رکھا ہوا ہے ٹھنڈا ہو رہا ہے انتظار ہو رہا ہے اور کوئی آ ہی نہیں رہا۔ دو گھنٹے بعد چلے آ رہے ہیں۔ پوچھا کہ بھئی! آپ نے اتنی دیر کر دی" کہن لگے اپنا ہی گھر ہیگا سی جتھے میں اوناں سی ❷"۔ کھانا کھالیا۔ **فَاِذَا طَعِمۡتُمۡ فَانۡتَشِرُوۡا وَ لَا مُسۡتَاۡنِسِیۡنَ لِحَدِیۡثٍ** (33:53) کھانا کھالیا ہے تو اب اس کے بعد تم جاؤ' پھر بیٹھ جاتے ہو باتیں کرنے کے لیے۔ "اک ترے کھانے سے پہلے' اک ترے کھانے کے بعد"۔ بیٹھے ہیں باتیں چلی جا رہی ہیں' کھانا تو اب کھا ہی چکے ہوئے ہیں' اب انہوں نے جانا کاہے کے لیے ہے۔

اس قسم کی معاشرتی عادات سے خدا کے نبیؐ کی ذہنی کیفیت

عزیزانِ من! سنیے ہمارے آپ پہ سب پہ بیتتی ہے۔ کہا ہے کہ **اِنَّ ذٰلِکُمۡ کَانَ یُؤۡذِی النَّبِیَّ** (33:53) اسے اس سے

---

❶ ہم گئے تھے ان کے ہاں۔ روٹی پانی تک کا نہیں پوچھا۔ پوچھا نہیں' مگر کھلایا پلایا تو تھا۔ ابے لو! کیا کھلایا تھا؟ ابے! وہ کوئی روٹی تھی جو کھلائی تھی۔ وہ تو دال تھی جو وہ بھون کرلے آیا تھا۔ یعنی اس وقت رات کے بارہ بجے مرغی کیوں نہیں کھلائی۔

❷ کہنے لگے کہ اپنا ہی گھر تھا جہاں مجھے آنا تھا۔

بڑی تکلیف پہنچتی ہے لیکن **فَيَسْتَحْيِ مِنْكُمْ** (33:53) یہ شرم کا مارا تم سے کہتا نہیں ہے۔ **وَ اللّٰهُ لَا يَسْتَحْيِ مِنَ الْحَقِّ** (33:53) لیکن ہمیں تو شرم نہیں آتی' خبردار جو ایسا کیا تو! رسول تم سے کہتا نہیں ہے' حیا مانع ہوجاتی ہے' شرم مانع ہوجاتی ہے۔ ہے ناں یہی بات! اسی لیے ہم لوگ نہیں کہتے' دل میں آپ ہر وقت کڑھ رہے ہوتے ہیں کہ اٹھے بھی' یہ جائے بھی کسی طرح۔ اس لیے خدا نے یہ بات صاف صاف کہہ دی ہے۔

معاشرتی آداب کے سلسلہ میں خدا سچی بات کہنے سے بالکل نہیں شرماتا

کہا کہ **وَ اللّٰهُ لَا يَسْتَحْيِ مِنَ الْحَقِّ** (33:53) خدا سچی بات کہنے سے بالکل نہیں شرماتا۔ اس نے تو صاف صاف کہدی ہے۔ اب یہ جو بات ہے کہ صاحب! رسول اللہ ﷺ کے وقت تو خدا نے ان سے یہ بات کہدی' ہمارے وقت میں یہ بات کون کہے گا؟ ہمارے وقت میں ان سے خدا ہی یہ بات کہے گا' جو قرآن میں خدا نے کہد یا وہ ہمارے لیے بھی کہد یا ہے لیکن یہاں تو خدا کی بات بھی کہنے کے بعد آپ دیکھیے کہ حشر کیا ہوتا ہے۔ آج جب ہم قرآن کی یہ بات دہرا دیں گے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا آج یہ بات کہہ رہا ہے۔ کہا ہے کہ **وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ** (33:53)۔ وہاں کی رہائش قریباً قریباً ہمارے گاؤں جیسی رہائش ہی سمجھ لیجئے' کھلے کھلے سے گھر تھے۔ اس آیت میں کہا ہے کہ جب تم نے گھر والوں سے کوئی چیز مانگنی ہو یا لینی ہو تو اس صورت میں بھی یہ نہیں ہے کہ یونہی گھر کے اندر بے محابا جا پہنچو اور وہاں جا کر یہ بات کہو کہ او بی بی جی! مجھے ایک گلاس دینا۔ کہا کہ پہلے پردے کے باہر کھڑے ہو کر آواز دیا کرو' Privacy (تخلیہ) کا تو خیال کیا کرو۔ اندر کوئی کسی حالت میں ہوتا ہے' کوئی کسی حالت میں ہوتا ہے۔ آپ سوچیے کہ اسلام سے پہلے اس قوم کی معاشرتی سطح کیا تھی۔ یہاں رسول اللہ ﷺ اتنے تھوڑے سے وقت کے اندر سات سال کے دوران اتنی جنگیں بھی لڑتے رہے' مملکت کے امور بھی سرانجام دیتے رہے' فرائضِ رسالت بھی سرانجام دیتے رہے جبکہ اس قوم کی معاشرتی حالت یہ تھی کہ انہیں یہ بھی سمجھانا پڑتا تھا کہ کسی گھر سے چیز مانگنی ہو تو باہر کھڑے ہو کر مانگا کرتے ہیں۔ تمدن کی اس سطح کے اوپر جو قوم تھی اس کو اس بلند مقام کے اوپر لے گئے کہ ان کے تمدن کے نظام کی سطح دنیا بھر کے لیے ایک ماڈل بنی ہوئی ہے۔ اب اس بات کی حکمت بتاتے ہوئے کہا ہے کہ **ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَ قُلُوْبِهِنَّ** (33:53) یہ نہایت پاکیزہ بات ہے جو ہم تم سے کہہ رہے ہیں' یہ ان کے لیے بھی ہے' گھر والوں کے لیے بھی۔ یہ یونہی رسمی عزت واحترام کے طور پر نہیں کہا گیا بلکہ مختصراً یہ بات کہی کہ **وَ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَ لَآ اَنْ تَنْكِحُوْا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمًا** (33:53) کوئی ایسی حرکت نہ کرو جو رسول پہ گراں گزرے' جس سے انؑ کو اذیت پہنچے۔ اگلی بات تو وہی ہے جو پہلے کہی تھی کہ

رسول کی بیویاں تمہارے لیے مائیں ہیں (33:6) اور یہاں اس کی وضاحت کر دی کہ ایک تو وہ صورت ہوتی ہے کہ آپ ہر چھوٹی لڑکی کو بیٹی کہتے ہیں' ہر بڑی عورت کو اماں جی کہتے ہیں۔ وہ رسماً یا احتراماً ایسا کہا جاتا ہے' وہ رشتہ ایسا نہیں ہو جاتا۔ کہا کہ یہ جو ہم نے کہا ہے کہ نبی کی بیویاں تمہارے لیے ماؤں کی بمنزلہ ہیں تو وہ سچ مچ کی ماؤں کی طرح ہیں۔ جس طرح سے اپنی ماں سے نکاح حرام ہوتا ہے' ان سے بھی نکاح تمہارے لیے حرام ہے۔ یاد رکھو! ان کا مقام یہ ہے۔ یہ ساری ہدایات دے کر کہا کہ **اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمًا** (33:53)۔ یہ باتیں تو تمہیں چھوٹی چھوٹی سی نظر آئیں گی لیکن حقیقتاً یہ باتیں بہت بڑی بڑی ہیں جو ہم نے کہی ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ معاشرے کی اصلاح کے لیے یہ باتیں بھی کتنی اہمیت رکھتی ہیں۔

وحی کی طرف سے ملنے والی معاشرتی ہدایات کی اہمیت کے پیشِ نظر قرآنِ حکیم کا ارشاد

جو ہدایات دیں' ان کے متعلق کہا کہ **اِنْ تُبْدُوْا شَيْئًا اَوْ تُخْفُوْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا** (33:54) ان معاشرتی آداب میں بھی اس بات کا خیال رکھو کہ اس سے مقصود تمہارے قلب و نگاہ کی تربیت ہے اس لیے انہیں یونہی دکھاوے کے لیے رسمی طور پر ادا نہ کرو بلکہ دل کے جھکاؤ کے ساتھ ضبط خویش کے لیے ان کی پابندی کرو۔ معاشرے کے اندر عام طور پہ اور مغرب کے معاشرے سے خصوصی طور پر اب یہ چیزیں مختلف ہو گئی ہے کہ وہاں Formally (رسماً) یہ چیزیں کی جاتی ہیں' صرف Formality (رسم) ہوتی ہے' دل سے یہ بات نہیں ہوتی۔ یہاں کہا کہ ہم تمہارے دلوں کو بدلنا چاہتے ہیں' یہ چیزیں تمہاری زندگی کا جزو بن جانی چاہئیں' تمہارے خون میں انہیں حلول کر جانا چاہیے۔ غیر شعوری طور پر بلا ساختہ بھی تمہارا کیریکٹر اور کردار یہ ہو جانا چاہیے۔ اس لیے اسے یاد رکھو کہ یہی نہیں کہ تم ظاہر داری میں ان کی پابندی کرو' ہماری نگاہ تمہارے دلوں کے اوپر بھی ہے۔ ان چیزوں کی اہمیت اور احترام اپنے دلوں کے اندر رکھو۔

اب رسول اللہ ﷺ کے اہلِ خانہ کے متعلق بات آئی۔ پردے کے احکام کے متعلق پہلے تفصیل سے میں عرض کر چکا ہوں۔ سورۃ النور (24:31) میں یہ تھا کہ اے رسول! مومن عورتوں کو یہ بات کہہ دو۔ یہ پردے کا مسئلہ بھی ہمارے ہاں انہی مسائل میں لیا جا رہا ہے کہ جس میں

ڈور کو سلجھا رہے ہیں اور سرا ملتا نہیں

کہ یہاں تک کا حکم ہے' یہاں تک کا حکم نہیں۔

قرآنِ حکیم نے زینت کی چیزوں کو حرام قرار دینے کی بجائے ان کا مقام متعین کیا ہے

میں ابھی عرض کرونگا' میں نے پہلے بھی وضاحت سے کہا تھا کہ قرآنِ کریم درحقیقت عورت کو اس کے مقام سے شناسا کرانا چاہتا ہے۔ وہ اسے کہتا ہے کہ مرد نے یہ جو تیرے دل کی گہرائیوں میں ڈال دیا ہے کہ تم مرد کے لیے ہو' تمہارا اپنا ذاتی تشخص نہیں' کوئی Personality (شخصیت) نہیں ہے۔ یہ بات بالکل غلط ہے۔ تم اُسی قسم کی Personality (شخصیت) رکھتی ہو جس قسم کی مرد رکھتا ہے۔ اب یہ جو مرد نے تمہارے دل میں خیال ڈال دیا ہے کہ تم تو اس کے لیے ہو تو تمہارے ذہن میں بھی یہ بات آ گئی کہ مجھے ہر وقت اس کی نگاہوں کے اندر جاذب بن کر رہنا چاہیے اور اس کے لیے تم اپنے حسن اور زینت کی نمائش کرتی ہو۔ کہا کہ یہ جذبہ غلط ہے۔ زینت کی چیزیں ہم نے حرام قرار نہیں دیں لیکن اس جذبے کے ماتحت زینت یا بناؤ سنگھار یا باہر نکلنا کہ میں مردوں کی نگاہوں کے اندر جاذب اور پرکشش بن جاؤں' اس کے معنی یہ ہیں کہ تم اپنی ذاتی حیثیت کو کچھ نہیں جانتیں' تم یہ سمجھتی ہو کہ میرا وجود ان کے لیے ہے' میں وہ کچھ کروں کہ میں ان کی نگاہوں کے اندر وجۂ کشش بن جاؤں۔ یہ غلط ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک پردے کی وضاحت اور عورت کی معاشرتی حیثیت

کہا کہ تم اپنے مقام سے آشنا ہو جاؤ۔ یہ تھا جو قرآن نے کہا تھا۔ اس کے اندر ''تبرج'' (33:33) کا لفظ ہے۔ یعنی اس قسم کا ابھار جس سے مردوں کے سینے میں' جذبات میں' طوفان پیدا ہو جائے۔ کہا ہے کہ یہ نہ پیدا ہونے دو۔ بس یہ ہے مقصد جسے تم پردہ کہتے ہو ورنہ قرآنِ کریم زندگی کے ہر گوشے میں' ہر شعبے میں' مرد اور عورت کو دوش بدوش لے جاتا ہے۔ Biological Differences (حیاتیاتی اختلافات) کے علاوہ دونوں کا اپنا اپنا مقام ہے۔ ان دونوں میں فرائض کا' وظائفِ زندگی کا طبعی حیاتیاتی تفاوت ہے' وہ فرائض دونوں کے الگ الگ ہیں' اس میں بھی یہ بات نہیں ہے کہ اس بنا پر عورت مرد سے کمتر درجے کے اوپر ہو کہ یہ بچے کو پیدا کرتی ہے۔ وہ تو ایک تقسیم ہے۔ دونوں کا اپنا اپنا مقام ہے۔ قرآن عورت سے کہتا ہے کہ تمہاری اپنی مضمر صلاحیتیں ہیں' ان کو نشو و نما دو۔

حضورِ اکرم ﷺ کی اہل خانہ خواتین کے لیے خاص ہدایات

سورۃ النور کی جو آیات پردے کے متعلق تھیں' ان میں یہ چیز واضح طور پہ کہی گئی تھی اور میں نے اپنے کئی درسوں میں اس کی وضاحت کی تھی' اس کو دہرانے کی ضرورت نہیں [1]۔ میں نے اس کا نمایاں پہلو واضح کیا کہ قرآن کہتا کیا ہے۔ وہاں تمام خواتین کے متعلق بات تھی اور یہاں خصوصیت سے نبی ﷺ کی عورتوں کو امہات المومنینؓ بھی کہا ہے' مومنین کی مائیں بھی کہا ہے۔ ان کے گھر کے اندر جو

---

[1] اس وضاحت کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورۃ النور' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور' 2007' ص ص۔ 130 تا 136 اور 248 تا 257۔

خواتین تھیں، بہر حال وہ بھی مومنوں کے نزدیک واجب الاحترام تھیں۔ ہم تو آج بھی حضورﷺ کی صاحبزادیوں کا نام لیتے ہیں تو ساتھ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہتے ہیں۔ اس کے باوجود قرآنِ کریم ان کو خاص طور پہ کہتا ہے **لَا جُنَاحَ عَلَيۡهِنَّ فِىۡۤ اٰبَآئِهِنَّ وَ لَاۤ اَبۡنَآئِهِنَّ وَ لَاۤ اِخۡوَانِهِنَّ وَ لَاۤ اَبۡنَآءِ اِخۡوَانِهِنَّ وَ لَاۤ اَبۡنَآءِ اَخَوٰتِهِنَّ وَ لَا نِسَآئِهِنَّ وَ لَا مَا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُهُنَّ وَ اتَّقِيۡنَ اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ شَهِيۡدًا** (33:55) ان سے کہدو کہ ہم نے جو کہا تھا کہ اس طرح سے اپنی زینت کا اظہار نہ کیا کریں تو ان سے کہو کہ یہ تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہارے بھانجے بھتیجے، گھر کے ملازم، ان کے متعلق یہ بات نہیں ہے کہ یہاں بھی تمہارے سر سے دوپٹہ نہ سرک جائے۔ جیسے وہاں استثنیٰ تھی یہ نسآء النبی جو ہیں رسول اللہﷺ کے گھر کی عورتوں کے متعلق بھی یہی چیز کہی۔ ان کے متعلق کبھی عورت کے دل میں یہ بات پیدا نہیں ہوتی کہ میں جاذب بنوں۔

جنسیاتی طور پر اُبھرنے والے جذبہ محرکہ کا دارومدار انسان کے اپنے تصورات پر منحصر ہے

گھر کے اندر جوان لڑکی جو ہے، اس کے اندر یہ چیز ہے کہ میں باہر دوسرے مردوں کے سامنے جاذبِ نگاہ بنوں، اپنے گھر کے اندر وہ سب کچھ میک اپ بھی کرتی ہے تو کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ میں باپ کی نگاہ میں حسین نظر آؤں۔ عزیزانِ من! میں اپنی بہنوں اور بیٹیوں سے معذرت کے ساتھ عرض کرتا ہوں۔ یہ سارا جذبہ جنسی ہوتا ہے۔ جہاں یہ چیز نہیں ہوتی، وہاں عورت کے دل میں یہ خیال ہی پیدا نہیں ہوتا، نہ دوسری طرف مرد کے دل میں خیال پیدا ہوسکتا ہے۔ اوباش سے اوباش لڑکے بھی، جو باہر آوارہ ہوتے ہیں، گھر کے اندر اپنی بہن، اپنی بیٹی، کتنی ہی زیادہ جاذبِ نگاہ اور حسین وجمیل کیوں نہ ہو، اسے دیکھ کر اس کے دل میں کبھی وہ خیالات نہیں ابھرتے جو باہر ابھرتے ہیں۔ قرآن نے اس کی بھی تفریق کی ہے۔

اب آئی وہ آیت جو میں نے پہلے عرض کی تھی۔ رسول اللہﷺ کی وہ زندگی جس میں آپﷺ نے اتنے معرکے مارے، جنگیں لڑیں، ایک مملکت قائم کی، مملکت کا ایک اتنا بڑا نظام بنایا، خدا کے پروگرام کو اس جانفشانی اور جدوجہد سے تکمیل تک پہنچایا، گھر کے اندر کی زندگی اس قدر قابلِ اطمینان بنائی، یہ سارا کچھ رسول اللہﷺ نے مسلسل جدوجہد کی بنا پہ کیا۔

درود کا لفظ عربی کا نہیں بلکہ فارسی زبان کا ہے جو مجوسیوں کے ہاں رائج تھا

عزیزانِ من! یہ کہنے کے بعد یہ آیا ہے کہ **اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوۡنَ عَلَى النَّبِىِّ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا صَلُّوۡا عَلَيۡهِ وَ سَلِّمُوۡا تَسۡلِيۡمًا** (33:56)۔ میں نے ایک درس خاص طور پر درود [1] کے لیے وقف کیا تھا اور میں نے بتایا تھا کہ اس سے مراد کیا

---

[1] اس کے لیے دیکھیے اسی کتاب کا ساتواں باب۔

ہے'اس کے معنی کیا ہیں۔ یہ درود بھیجنا نہیں ہے۔ میں نے کہا تھا کہ قرآن تو ایک طرف 'درود' عربی زبان کا لفظ ہی نہیں ہے۔ یہ تو فارسی کا لفظ ہے اور مجوسیوں کے ہاں رائج تھا: نماز کا لفظ بھی اور درود کا لفظ بھی۔ تو یہ جو چیز کہی گئی ہے' میں ایک دفعہ پھر دہرا دوں کہ یہاں رسول اللہ ﷺ کے متعلق ہے کہ اللہ اور اس کے ملائکہ **یُصَلُّوۡنَ عَلَی النَّبِیِّ** (33:56) ہیں۔ اسی سورۃ میں چار ہی آیتیں پہلے 43ویں آیت میں ہے کہ **ھُوَ الَّذِیۡ یُصَلِّیۡ عَلَیۡکُمۡ وَ مَلٰٓئِکَتُہٗ** (33:43)۔ یہاں سارے مومنین کے متعلق ہے۔ یہ بات صرف رسول کے ہی متعلق نہیں ہے بلکہ تمام مومنوں کے متعلق ہے کہ اللہ اور اس کے ملائکہ تمہارے ساتھ بھی یہ کرتے ہیں۔ اور یصلون کے معنی میں نے بتائے تھے کہ ''کسی کی تائید کرنا' نصرت کرنا' شاباش دینا' Moral Support (اخلاقی مدد) دینا کہ کیا بات ہے جو تم نے کر کے دکھایا ہے!!!''۔ اے رسول اللہ ﷺ اور جماعتِ مومنین! کیا بات تم نے کر کے دکھا دی ہے! خدا اور اس کی جو کائناتی قوتیں ہیں تمہارے اوپر تہنیت اور تبریک کے پھول نچھاور کرتی ہیں' تائید کرتی ہیں' نصرت پہنچاتی ہیں' تمہارا ساتھ دیتی ہیں۔ اور اس کے بعد یہ کہا کہ **یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا صَلُّوۡا عَلَیۡہِ** (33:56) اے جماعتِ مومنین! تم بھی اس رسول ﷺ کے پروگرام میں اس کی تقویت کا باعث بنو' اس کی تائید کرو' اس کا ساتھ دو۔ **وَ سَلِّمُوۡا تَسۡلِیۡمًا** (33:56) اس کی اطاعت کرو جیسا کہ اطاعت کرنے کا حق ہے۔

درود کا مفہوم: اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ پروگرام کی تکمیل کے لیے ہر آن کوشاں رہنا

عزیزانِ من! یہ تھا درود کہ اس کے پروگرام کی اطاعت کرو' اس کے احکام کی اطاعت کرو' اس کے ارشادات کی اطاعت کرو۔ یہ ہیں معنی اس کے کہ واقعی تم اس کی تائید کرتے ہو' نصرت میں اس کے ساتھ ہو' رفاقت ادا کرتے ہو' پروگرام کو تکمیل تک پہنچانے میں اس کی مدد کرتے ہو' اس کا ثبوت اس سے ہے کہ تم احکامِ خداوندی کی اطاعت کتنی کرتے ہو۔ عزیزانِ من! یہ تھا درود۔ تو میں نے کہا ہے کہ مجھے تفصیل میں جانے کی زیادہ ضرورت نہیں کیونکہ میں تو پورا درس اس کے لیے وقف کر چکا ہوں اور آپ ہی احباب تھے اس وقت بھی۔ یہ تو تائید اور تقویت پہنچانا ہے' ان کے لیے راحت کا سامان بننا ہے' تسلی کا موجب بننا ہے۔ اس کے مقابلے میں کہا کہ **اِنَّ الَّذِیۡنَ یُؤۡذُوۡنَ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ لَعَنَھُمُ اللّٰہُ فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ وَ اَعَدَّ لَھُمۡ عَذَابًا مُّھِیۡنًا** (33:57) اس کے برعکس جو لوگ کسی طرح سے بھی اللہ اور اس کے رسول یعنی نظامِ خداوندی کو اذیت پہنچاتے ہیں اس نظام کے لیے کسی تکلیف یا ضعف کا موجب بنتے ہیں تو ان کے لیے دنیا اور آخرت میں' ان تمام مراعات سے محرومی ہے۔ لعنت کے معنی ہوتے ہیں محروم کر دینا' کسی کی مراعات سے محروم ہو جانا' زندگی کی خوشگواریوں اور سرفرازیوں سے محروم ہو جانا۔ کہا ہے کہ ان کے لیے بڑا ذلیل کن عذاب ہے' وہ ذلت آمیز تباہی کے عذاب میں ماخوذ ہوں گے۔

اللہ اور رسول کے اکٹھے الفاظ کے معنی ''نظام خداوندی'' ہوتا ہے

یہاں کہا ہے کہ جو لوگ اللہ اور رسول کو اذیت پہنچاتے ہیں، رسول اللہ ﷺ کو تو اذیت پہنچائی جا سکتی تھی اور پہنچاتے تھے، اللہ کو اذیت کیسے پہنچائی جا سکتی ہے؟ یہ بات بڑی غور طلب ہے۔ کیا کوئی خدا کو اذیت پہنچا سکتا ہے؟ نہیں، قطعاً نہیں۔ قرآن کریم میں جہاں اللہ اور رسول کے یہ دونوں الفاظ اکٹھے آتے ہیں تو اس کے معنی ''وہ نظام، وہ پروگرام ہوتا ہے جو خدا نے اس کے لیے دیا ہے۔ خدا کا طے کردہ پروگرام یا نظام جو رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں متشکل ہوتا ہے''۔ جب اللہ اور رسول کے الفاظ اکٹھے آتے ہیں تو اس کے معنی دو الگ الگ ہستیاں نہیں ہوتے بلکہ نظامِ خداوندی ہوتا ہے، خدا کا پروگرام ہوتا ہے، دینِ خداوندی ہوتا ہے جو خدا نے دیا اور رسول اللہ ﷺ نے اسے پروان چڑھایا۔ یہاں کہا یہ ہے کہ جو لوگ اس نظام کے لیے کسی قسم کی مضرت اور ضرر رسانی کا موجب بنتے ہیں، یہ اس دنیا میں وہ لوگ ہیں جو اس نظام کی مراعات سے محروم کیے جائیں گے، آخرت میں بھی خدا کی مراعات سے محروم کیے جائیں گے۔ اور ان کے لیے بہت ہی ذلت آمیز سزا ہوگی۔

قانونِ خداوندی کی نظر میں تہمت تراشی سنگین ترین جرم ہے

قرآن مجید کہتا ہے کہ **وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا** (33:58)۔ اذیت پہنچانے کی یہ بات صرف اس نظام خداوندی کی مرکزی شخصیت تک ہی محدود نہیں، جو لوگ مومن عورتوں اور مومن مردوں کو اذیت پہنچاتے ہیں کہ ان کے خلاف بہتان تراشی کرتے ہیں، تہمتیں لگاتے ہیں، ان پر ناکردہ گناہوں کا الزام دھرتے ہیں۔ یاد رکھیے! وہ بہت بڑے جرم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ میں ابھی عرض کرونگا کہ یہ جو ناحق تہمتیں تراشنا ہے، دوسروں کے خلاف الزام لگانا ہے، یہ بارگاہِ خداوندی میں یا عدالتِ قرآنی میں، بڑا سنگین جرم ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ قرآن نے اگر زنا کی سزا سو درے بتائی تھی تو جو بہتان تراشی ہے، جو کسی کے خلاف تہمت لگانا ہے، اس کی سزا 80 درے ہے، تہمت لگانا اتنا بڑا جرم ہے۔ آپ معاشرہ میں ہزار خرابیاں دیکھیں گے جو اس قسم کی تہمت تراشی سے پیدا ہوتی ہیں۔ ایک بات کسی کے متعلق کہی اور Whispering Campaign (محاذِ کانا پھُوسی) شروع کر دیا: تم نے آج کچھ سنا ہے، وہ دیکھتے ہو میاں صاحب، کتنے معتبر بنے پھرتے ہیں، نمازیں دیکھو اور آپ کو پتہ ہے کہ کیا کرتے ہیں، او ہم نے کسی کی قبر میں تھوڑا جانا ہے، میں نے تو یونہی تم سے بات کر دی، آگے نہ کسی سے کہنا'' یہ کہا اور چلے گئے اور شام تک سارے شہر کے اندر یہ بات اس تاکید کے ساتھ گونج اٹھتی ہے کہ کسی سے نہ کہنا۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک سب سے خطرناک عنصر وسوسہ اندازی ہے

میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن کریم میں الحمد سے والناس تک اتنا لمبا چوڑا پروگرام ہے' ہدایات کا ضابطہ ہے' اس میں قیامت تک کے لیے ابدی ہدایات ہیں اوراس کے آخر میں جو بات کہی ہے وہ یہ ہے کہ **الَّذِیۡ یُوَسۡوِسُ فِیۡ صُدُوۡرِ النَّاسِ** (114:5-6) ان لوگوں سے بچنا جو معاشرے میں اس قسم کے وسوسے ڈالتے ہیں۔ خناس ہوتا ہے کہ ''کسی چور کا دبے پاؤں آنا' چپکے سے کچھ کرنا' اور دبے پاؤں ہی واپس چلے جانا''۔ اس طرح سے جو وسوسہ اندازی کرنے والے لوگ ہیں ان کے متعلق کہا کہ بس ان سے محتاط رہنا۔ یہ وسوسہ اندازی بنیادی خرابیوں کا موجب بنتی ہے۔ میں نے کہا ہے کہ یہ بات شام تک سارے شہر میں گونج اٹھتی ہے اور آپ کسی کو پکڑ ہی نہیں سکتے کہ ملزم کون ہے۔ یہ چیز تھی کہ جو مومن عورتوں اور مومن مردوں کے خلاف اس قسم کی تہمتیں تراشتے ہیں' بہتان تراشتے ہیں' میں ابھی عرض کرونگا کہ قرآن نے ان کے لیے کیا سزا تجویز کی ہے۔

نبی اکرمؐ کے گھرانے کے علاوہ مومن عورتوں کے لیے چوغہ Overall پہن لینے کا حکم کیوں؟

پہلی چیز یہ کہی کہ **یٰۤاَیُّہَا النَّبِیُّ قُلۡ لِّاَزۡوَاجِکَ وَ بَنٰتِکَ وَ نِسَآءِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ یُدۡنِیۡنَ عَلَیۡہِنَّ مِنۡ جَلَابِیۡبِہِنَّ** (33:59)۔ یہ بھی ایک بڑی اہم آیت ہے۔ اس میں کہا ہے کہ اے رسول! اپنی بیویوں کو' اپنی بیٹیوں کو بھی' مومن عورتوں کو بھی' یہ تاکید کردو کہ وہ باہر نکلیں تو جو کچھ انہوں نے پہنا ہوا ہو' اس کے اوپر ایک Overall (چوغہ) سا پہن لیا کریں۔ اب یہاں سے یہ چیز ہوئی کہ صاحب! عورتوں کے لیے حکم یہ ہے کہ وہ نکلیں تو عام کپڑوں کے اندر نہ ہوں بلکہ ان کے اوپر ایک Overall (چوغہ' کشادہ سا کپڑا) پہن لیں۔ یہ نہیں دیکھا کہ قرآن کیوں یہ کہتا ہے کہ یہ کچھ کریں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ مدینے کی زندگی میں ابھی یہودیوں کی خاصی تعداد تھی اور وہ ہر ممکن طریقے سے خرابیاں پیدا کرتے تھے' یہ کھلے ہوئے دشمن نہیں تھے' یہ منافق جو ہوتے ہیں یہ کھلے بندوں کبھی بات نہیں کرتے۔ قریش تو کھلے بندوں آتے تھے' گرجتے ہوئے آتے تھے' لرزہ دینے کے بعد جاتے تھے۔ یہ جو مدینے کے یہودی تھے' یہ اس قسم کی نہ دیکھی جانے والی پھانس چبھی ہوئی ہوتی تھی کہ نظر تو نہ آئے لیکن رات بھر سونے نہ دے۔ عورتیں باہر جاتی تھیں' یہ انہیں چھیڑتے تھے۔ جب کہا جاتا کہ تم کیوں چھیڑتے ہو تو وہ کہتے تھے کہ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ یہ شریف زادیاں ہیں یا بازاری عورتیں ہیں۔ قرآن نے یہ کہا ہے کہ ایسا کرو جب باہر نکلو تو تم اس قسم کا Overall (چوغہ' کشادہ سا کپڑا) پہن لیا کرو اور یہ اعلان کردیا کہ یہ جو Overall (چوغہ سا) پہننے والی ہیں' یہ شریف عورتیں ہیں۔ **ذٰلِکَ اَدۡنٰۤی اَنۡ یُّعۡرَفۡنَ فَلَا یُؤۡذَیۡنَ** (33:59) یہ اس لیے ضروری ہے کہ تم پہچانی جاؤ کہ تم شریف عورتیں ہو اور اس طرح سے یہ بدقماش تمہیں اذیت نہ دیں' تنگ نہ کریں **وَ کَانَ اللّٰہُ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا** (33:59)

اس طرح خدا چاہتا ہے کہ تمہاری حفاظت کا سامان پیدا کردے تمہیں مرحمت دے۔

احتیاطی تدابیر کے باوجود اگر فتنہ پرور باز نہ آئیں تو پھر ان کی سزا

یہ Overall (چوغہ سا) اس بات کا ایک نشان تھا کہ یہ کوئی آوارہ عورتیں نہیں ہیں' یہ شریف زادیاں ہیں۔اگلی آیت میں واضح کردیا کہ لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ (33:60) یہ اس بات کے لیے تدبیر تھی کہ یہ منافق اس بہانے تنگ نہ کریں۔اتنی احتیاطی تدابیر برتنے کے باوجود اگر یہ منافق اپنی شرارتوں سے باز نہ آئیں تو سنو! یہ وہ لوگ ہیں جو منافق ہیں' ان کے دلوں کے اندر مرض ہے' خباثتیں ہیں۔کہا ہے کہ وَّ الْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ (33:60) اور مدینے کے اندر یہ اس قسم کی فتنہ انگیزیاں' فتنوں کی چنگاریاں' پھیلاتے رہتے ہیں۔اگر ایسی احتیاطی تدابیر کے باوجود یہ باز نہ آئیں تو لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ (33:60) ہم تمہیں اتنی قوت اور اختیار دیں گے کہ تم ان سے اچھی طرح نپٹ سکو۔ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا (33:60) ان کو جلا وطن کردو' شہر بدر کردو' مدینے سے نکال دو۔ہم تمہیں اتنے اختیار اور قوت دیں گے۔اس سے پہلے تم کمزور تھے' ایسا نہیں کرسکتے تھے۔اب تمہیں یہ اختیارات اور قوت حاصل ہے۔اب یہ نہ کرو کہ یہ ہمارے شہر کے شہری ہیں' رعایا ہیں' ذمی ہیں' ان کو ہم کیوں نکالیں۔اس قسم کے جو ناسور ہیں' سرطان بننے والی جو چیز ہے' کینسر کے جو جراثیم ہیں' کہا کہ اب تمہیں اس کی قوت اور اختیار حاصل ہے۔اگر یہ باز نہ آئیں تو انہیں یہاں سے نکال دو۔ مَّلْعُوْنِيْنَ (33:61) رہیں تو ان کو ان تمام مراعات سے محروم کردو جو پرامن شہریوں کو یہاں حاصل ہیں۔یہ دوسری سزا ہے۔اس سے بھی اگر یہ نہ رکیں تو اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا (33:61) پھر اشتہاری مجرموں کی طرح ان کے وارنٹ جاری کردو کہ یہ جہاں کہیں بھی ہوں' یہ گرفتار کیے جائیں۔ وَ قُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا (33:61) ان کا سراڑا دو۔میری بیٹیو اور بہنو! اللہ تعالیٰ کو تمہاری حفاظت کا سامان اتنا منظور تھا کہ اتنی سنگین سزا کسی اور جرم کی نہیں ہے۔کہا ہے کہ ملک بدر کرو' جب تک رہیں ان تمام رعایات سے ان کو محروم کردو جو یہاں ایک پرامن شہری کی حیثیت سے لوگوں کو حاصل ہیں' اس کے باوجود بھی نہیں مانتے اور کہیں بھاگتے ہیں تو گرفتاری کے وارنٹ جاری کرو' گرفتار ہوکر آتے ہیں تو موت کی سزا دو۔

شریف عورتوں کی حفاظت کا ذمہ خدا تعالیٰ نے اپنے اوپر لے رکھا ہے

اس کے بعد کہا ہے کہ یاد رکھو! بظاہر یہ بات نظر آئے گی کہ بڑا ہی سخت قدم ہے جو اٹھایا جارہا ہے لیکن سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (33:62) شریف عورتوں کی یہ حفاظت تو ہم نے پہلے دن سے اپنے ذمے لے رکھی ہے' یہ سنت اللہ ہے۔اومیری بیٹیو! سنو! خدا کی نگاہ میں تمہاری کتنی عزت ہے! یہ نئی بات نہیں جو ہم کہہ رہے ہیں' یہ سنت اللہ ہے اور سنت

اللہ میں تم کبھی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔

الساعۃ کا لفظ صرف قیامت کے لیے ہی مخصوص نہیں ہے

یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ انقلاب جس کے متعلق تُو اتنی تنبیہات دے رہا ہے' ڈرا رہا ہے' دھمکا رہا ہے کہ آئے گا تو ان کو یہ کہتا ہے تو **یَسْـَٔلُکَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَ مَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِیْبًا** (33:63)۔اس پر یہ منافقین اور فتنہ پرداز پوچھتے ہیں کہ جس انقلابی دور کے متعلق تم کہتے ہو کہ اس میں شریر النفس' بدقماش لوگوں کو ایسی سزا ملے گی' وہ دور کب آئے گا؟ ان سے کہو کہ اس کے ظہور کے ٹھیک وقت کے متعلق خدا ہی جانتا ہے' میں نہیں بتا سکتا مگر یہ اپنے ذہن میں کہہ رہے ہیں کہ جن سے تو ڈرا دھمکا رہا ہے' وہ کب آئے گا؟

عزیزانِ من! یہاں الساعۃ یک لخت آنے والے حادثے کے متعلق یہ کہا جاتا ہے' قیامت جو آخرت میں آنے والی ہے' اس کے لیے بھی یہ لفظ آتا ہے لیکن یہ مخصوص اسی کے لیے نہیں ہے بلکہ اس دنیا کے اندر بھی اس قسم کے جو عظیم انقلابات آتے ہیں' ان کے لیے بھی قرآن نے یہ لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ انقلاب' جو محمد رسول اللہ ﷺ والذین معہ کے مقدس ہاتھوں سے آنے والا تھا' اس کے لیے قرآن نے الساعۃ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ بہت بڑا انقلاب تھا جو آیا تھا۔ پرانی معاشرتیں تہذیبیں ہی نہیں اجڑی تھیں' قیصر اور کسریٰ کی جو اتنی اتنی عظیم مملکتیں تھیں' وہ بھی زیر وزبر ہوگئی تھیں۔ یہ اتنا عظیم انقلاب تھا۔اس کے لیے ''الساعۃ'' کا لفظ آیا ہے۔

اس آیت (33:63) میں کہا یہ ہے کہ یہ پوچھتے ہیں کہ یہ جو تم کہہ رہے ہو کہ ایسا ہو جائے گا' یہاں اتنا بڑا عظیم انقلاب آجائے گا' یہ کب آئے گا؟ جواب دیا کہ یہ جو کب کی بات ہے' یہ تو ہم جانتے نہیں ہیں۔ یہ سوال نہیں ہے کہ ان کو بتایا جائے کہ وہ کب آئے گا' یہ البتہ آرہا ہے' اس کے ظہور کے ٹھیک وقت کا خدا ہی جانتا ہے۔ کہا کہ **وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِیْبًا** (33:63) ان کو کیا معلوم ہے کہ وہ الساعۃ ان کے دروازے پہ دستک دے رہی ہو اور ان کو خبر ہی نہ ہو کہ وہ آرہی ہے۔ یہ تو قوت کے نشے میں مدہوش ہیں' ان کی آنکھیں کھلی ہوتیں تو یہ دیکھ لیتے کہ وہ آنے والا انقلاب تو سامنے کھڑا ہے۔قرآن نے کہا ہے کہ جہنم ان کو چاروں طرف سے محیط ہے۔اور دوسرا لفظ بڑا ہی حسین ہے۔ کہا ہے کہ وہ تو انہیں دیکھ رہی ہے' کمبخت یہی اسے نہیں دیکھتے۔ **اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِیْنَ وَ اَعَدَّ لَهُمْ سَعِیْرًا۔ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا ۚ لَا یَجِدُوْنَ وَلِیًّا وَّ لَا نَصِیْرًا** (33:64-65)۔ یہ مخالفین رفتہ رفتہ اس مقام تک آپہنچے ہیں جہاں انہیں زندگی کی خوشگواریوں سے محروم کر دیا جائے' ان کے لیے ان کے اعمال نے بڑا تباہ کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔ وہ انقلاب آئے گا تو پھر یہ جو اس طرح مخالفتیں کر رہے ہیں اور منافقتیں برت رہے ہیں' تم دیکھو گے کہ ان کے لیے کس قدر

شدید سزائیں ہونگی' ان کا اس وقت کتنا برا حال ہوگا' کس قدر تباہ و برباد ہونگے' کوئی ان کا مددگار نہیں ہوگا' اس وقت کوئی ان کا والی وارث نہیں ہوگا۔ تاریخ نے ہم کو بتایا ہے کہ چند ہی دنوں کے بعد جب یہ انقلاب آیا ہے تو یہ لوگ خاص طور پہ یہ یہودی' جو مدینے میں بیٹھے ہوئے' یہ کچھ کرتے تھے' وہ Wandering Jews کی حیثیت سے' دنیا میں ذلیل وخوار پھرتے رہے' کہیں گھر تک ان کو نصیب نہیں تھا' بے خانہ بدوش تھے۔ ان کو ساری دنیا Wandering Jews کہتی ہے۔ یہ کچھ ہوا تھا ان کے ساتھ۔ اس وقت **یَوۡمَ تُقَلَّبُ وُجُوۡهُهُمۡ فِی النَّارِ یَقُوۡلُوۡنَ یٰلَیۡتَنَاۤ اَطَعۡنَا اللّٰهَ وَ اَطَعۡنَا الرَّسُوۡلَا. وَ قَالُوۡا رَبَّنَاۤ اِنَّاۤ اَطَعۡنَا سَادَتَنَا وَ کُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوۡنَا السَّبِیۡلَا** [1] (33:66-67)۔ بڑی عظیم چیزیں آئی ہیں۔

تشبیہات کی شکل میں جہنم میں لیڈروں اور عوام کا باہمی مکالمہ بازی کا منظر

قرآنِ کریم نے تشبیہات کے رنگ میں یہ ایک بات بیان کی ہے کہ دوزخ میں جب یہ لیڈر اور ان کے Followers (پیروکار) جمع ہونگے تو ان کا ایک دوسرے کے ساتھ یہ مکالمہ ہوگا۔ وہ Followers (پیروکار) کہیں گے کہ تمہارا ستیاناس' تم نے ہمارا بیڑہ غرق کر دیا اور ہم کو جہنم کے عذاب میں پھنسا دیا۔ وہ ان سے کہیں گے کہ کیا اس میں ہماری ذمہ داری ہے' کیا ہم نے تمہیں مجبور کیا ہوا تھا' کیا تمہیں ہم گھسیٹ کر لے آئے تھے؟ ہم نے آواز دی تھی' تم ہمارے پیچھے آ گئے' تمہارے اپنے دل کے اندر سب کچھ تھا' ہم نے تو اتنا ہی کیا تھا کہ آواز دی۔ وہ کہیں گے کہ اس سے زیادہ مجبوری اور کیا ہوتی ہے کہ تم ایسی سازشیں کیا کرتے تھے جو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں آتی تھیں' تمہارے جال اس قدر دامِ ہم رنگِ زمین تھے کہ ہم ان کو دیکھ ہی نہیں پاتے تھے' ہم ان میں پھنس جاتے تھے۔ یہ مکالمے بڑی تفصیل میں ہیں۔ یہ اس جہنم کے مکالمے ہیں جس کے اندر قومیں آ کر گرفتار ہوا کرتی ہیں۔ اس وقت پھر لیڈر بے نقاب ہوتے ہیں' اُس وقت عوام کا شعور بھی بیدار ہوتا ہے۔ اس وقت وہ سوچتے ہیں کہ ہمارے ساتھ یہ کس نے کیا' پھر وہ ایک دوسرے کو طعن دیتے ہیں کہ ہمارے ہاں کے اس قسم کے لیڈر تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ جیسا دودھ ہوتا ہے اس کے اوپر ویسی ہی بالائی (Cream) آتی ہے۔ قرآن نے مختلف مقامات پہ کہا ہے' یہاں بھی یہ کہا ہے کہ جب ان کے اوپر اس قسم کی شدید تباہی آئے گی تو وہ یہ کہیں گے کہ اے کاش! ہم خدا اور رسول کی اطاعت کرتے' ہم نے اپنے ان بڑے بڑے سرداروں کی' ان لیڈروں کی اطاعت کی' ان کے پیچھے چلے اور

---

[1] اس وقت اِن کی حالت یہ ہوگی کہ یہ اُس کی آگ میں اوندھے منہ جھونک دیئے جائیں گے' اور یہ بصد حسرت و یاس کہیں گے کہ اے کاش! ہم بھی اللہ اور رسول (نظامِ خداوندی) کی اطاعت کرتے (تو ہماری آج یہ حالت نہ ہوتی۔ اس وقت ان کے عوام کہیں گے کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہم نے اپنے لیڈروں کی جو ہم میں بڑے بنے ہوئے تھے' اطاعت کی تو انہوں نے ہمیں زندگی کے صحیح راستے سے بہکا دیا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص984)۔

انہوں نے ہمیں اس قدر گمراہ کر دیا۔ کہا کہ **رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَ الْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا** (33:68) اے ہمارے نشوونما دینے والے! ان لیڈروں کو ہم سے دوگنی سزا دے۔ یہاں تو اتنا ہی آیا ہے' دوسرے مقام پہ ہے کہ وہ جب کہیں گے کہ ان کو دوگنی سزا دے تو جواب ملے گا کہ تم دونوں کو دوگنی سزا ملے گی۔ انہیں تو اس لیے کہ خود پہلے انہوں نے آپ جرم کیے اور تمہیں بھی ورغلایا' تمہیں اس لیے کہ ان لیڈروں کے اندر اپنی قوت کیا تھی؟ یہ تمہارے ہی بنائے ہوئے لیڈر تھے:

تمہیں تو ''تو'' کے سوا کوئی کچھ نہ کہتا تھا

''جناب'' ہم نے بنایا ''حضور'' ہم نے کیا

کیا بات ہے قرآن کی کہ ان کے پاس کونسی ایسی قوت تھی!! یہ تمہاری دی ہوئی قوت کے بل بوتے کے اوپر اتنے بڑے لیڈر بنے تھے۔ تمہیں دہرا عذاب اس لیے ہے کہ ان کو تم نے اتنے اختیارات اور قوتیں دیں جس کی بنا پہ انہوں نے یہ جرائم کیے اس لیے تم بھی برابر کے مجرم ہو۔ بہرحال یہ اس مقام پہ تفصیل آئے گی۔ وہاں کہا تھا کہ خدا اور رسول کو مت ایذاء پہنچایا کرو۔

قرآنِ حکیم نے اپنے ہاں بنی اسرائیل کا تذکرہ بڑی تفصیل سے کیا ہے

کہا ہے کہ **يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا وَ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا** (33:69) اے جماعتِ مومنین! یاد رکھو' انہوں (یہودیوں) نے اپنے پیغمبر موسیٰؑ کو بڑا ہی ستایا تھا' تم ایسی بات نہ کرنا کہ تم اس طرح سے رسول کو ستاؤ۔ بات تو بڑی صاف ہے۔ قرآنِ کریم نے بنی اسرائیل کی تمام روش کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ حضرتِ موسیٰؑ نے اس قوم کے اوپر اتنا بڑا احسان کیا کہ فرعون جیسے مستبد حاکم کی غلامی سے چھڑا کر سینا کی فضاؤں میں آزاد کر دیا' مملکت قائم ہوئی' ان لوگوں کو اتنی بڑی سلطنتیں ملیں لیکن ان کی کیفیت یہ تھی کہ کہیں ذرا پانی کی دقت ہوئی تو موسیٰؑ کو کہنے لگے تو کہاں ہمیں تباہ کرنے کو لے آیا ہے' وہاں جنگلوں میں من وسلویٰ ملتا ہے۔ بیٹھ گئے کہ صاحب! ہمیں تو چٹنی چاہیے' پکوڑے چاہئیں' بھنے ہوئے کباب چاہئیں' تکے چاہئیں۔ وہ کہنے لگے کہ وہاں تمہیں کیا ملتا تھا؟ کہنے لگے کہ ملتا نہیں تھا بلکہ ہم ان کی ہانڈیاں پکاتے تھے اور جو نیچے باقی بچتا تھا' ہمیں اُسے چاٹا کرتے تھے۔ کہنے لگے کہ تمہارا ستیاناس! غلامی کی حیثیت میں جو ہانڈیاں چاٹتے تھے' وہ تمہیں اس سے زیادہ مرغوب تھیں جو اس آزادی میں من وسلویٰ تمہیں مل رہا ہے۔ تمہیں وہاں سے نکال کر ایک خدائے واحد کی غلامی کے اندر دینے کے لیے لائے ہیں۔ اب وہ چلے جا رہے ہیں۔ گاؤں میں جاتے ہوئے دیکھا کہ لوگوں نے ایک بت بنایا ہوا ہے اور اسے پوج رہے ہیں۔ وہیں کہنے لگے کہ موسیٰ!

ہمیں بھی اس قسم کا ایک دیوتا بنا دو یا ہمیں دکھاؤ کہ تمہارا خدا کونسا ہے' ہم تو دیکھیں گے تو مانیں گے' ہم دیکھے ہوئے خدا کو ہی مانیں گے۔ کہا کہ اس خدا کی نعمتوں کو یاد کرو' تم کیوں قدم قدم کے اوپر مجھے تنگ کر رہے ہو۔ وہ چند دن کے لیے کہیں باہر گئے تو پیچھے سے وہ سامری (سامری کے معنی داستاں گو ہوتا ہے) نے' انہی کا زیور لیا اور ایک چھوٹا سا بت سا بنا دیا اور یہ سارے اس کی پرستش کرنے لگ گئے۔ وہ آئے' اُنہوں نے دیکھا اور کہا او تمہارا ستیاناس ! میں نے تمہاری خاطر اتنی جان ماری اور تمہاری حالت یہ ہے۔ یعنی اس طرح سے حضرت موسٰی علیہ السلام کو تنگ کیا تھا۔ قرآنِ کریم نے یہاں یہ کہا ہے کہ بنی اسرائیل کی یہ خصلتیں کہیں تمہارے اندر نہ آ جائیں' اس قسم کی باتیں نہ کرنے لگ جانا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق بخاری شریف کی ایک روایت

کہا جاتا ہے کہ قرآنِ کریم تفاسیر کی رو سے سمجھ میں آتا ہے اور جو تفسیریں ہیں وہ احادیث پر مبنی ہیں' روایات پر مبنی ہیں۔ یہ جو آیت آئی ہے اس کی تفسیر ہمارے ہاں ہے۔ بخاری شریف میں اس کے متعلق ایک روایت ہے کہ موسیٰؑ کو کیسے تنگ کرتے تھے اور خدا نے ان کو کس طرح سے باعزت بچایا۔ اس میں لکھا ہوا ہے کہ ''یہ بنی اسرائیل جو تھے وہ یونہی دریا کے کنارے ننگے ہی نہا لیا کرتے تھے' حضرتِ موسٰی علیہ السلام کو بہت حیا تھی اور یہ ان سے بہت دور نکل جاتے اور الگ جا کے تخلیے میں نہاتے تھے۔ انہوں نے مشہور کرنا شروع کر دیا موسٰی کو کوئی اس قسم کی بیماری ہے جس کی وجہ سے یہ دوسروں کے سامنے ننگا نہیں ہونا چاہتے' کسی طرح سے اس کو دیکھیں کہ وہ کیا بیماری ہے۔ یعنی یہ اپنا تہمد اٹھا کے دکھانے سے تو رہے تھے کہ مجھے کوئی ایسی بیماری نہیں ہے۔ اس کے لیے خدا نے ایک تدبیر کی کہ ایک دن حضرتِ موسیٰؑ وہاں ندی کے کنارے نہا رہے تھے اور انہوں نے اپنے کپڑے ندی کے کنارے پتھر پہ رکھے اور آپؑ نہانے لگ گئے۔ جب نہا کے باہر نکلے تو اُس پتھر نے بمعہ کپڑوں کے آگے آگے چلنا شروع کر دیا۔ وہ آگے آگے چلا گیا' یہ پیچھے پیچھے چلتے رہے۔ وہ اور آگے چلا گیا اور یہ اور پیچھے پیچھے جاتے رہے اور وہ جو پتھر تھا' وہ اس قبیلے کے اندر آ گیا جہاں یہ باقی لوگ تھے اور وہاں ان لوگوں نے موسٰی کو ننگا دیکھ لیا اور کہا کہ اس کو کوئی بیماری نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس طرح حضرت موسیٰؑ کو اس اذیت سے پار کر دیا تھا۔'' عزیزانِ من! یہ ہے اس آیت کی تفسیر۔

قول و فعل کے سلسلہ میں مومنین کے لیے قرآن حکیم کی راہ نمائی اور اس کا ثمر

کہا کہ يَـاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا (33:70) اے جماعتِ مومنین! تم اس قسم کی باتوں

کی طرف نہ آؤ جو موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے اس کے ساتھ کیا تھا۔ صاف ستھری بات کیا کرو۔ عزیزانِ من! میں یہ ''سدید'' کبھی نہیں بھولتا۔ وزیر خاں کی مسجد کے پیچھے جو دیوار ہے کبھی اس کو جا کر دیکھنا' دنیا کے بڑے بڑے سیاح اس کو دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔ وہ اتنی لمبی اور اونچی دیوار ہے کہ اس زمانے میں جب ابھی ایسے آلات بھی نہیں بنے ہونگے' وہ اس قدر سیدھی ہے کہ اس کے اندر وہ کہتے ہیں کہ ذرا سا فرق نہیں ہے۔ یہ جو اس قسم کی سدھ ہوتی ہے کہ بالکل صاف ہو' وہ ہوتی ہے ''قولِ سدید''۔ کہا کہ ایسی بات کہو جس میں کہیں ٹیڑھ نہ ہو' کجی نہ ہو' کوئی پیچ نہ ہو' کہیں سے کوئی خم نہ ہو' یہ نہیں کہ کہیں سے نیچے ادھڑی ہوئی ہو۔ ایسی باتیں کیا کرو' پیچ دار باتیں نہ کیا کرو۔ یہی وہ چیز ہے۔ کہا کہ **یُّصۡلِحۡ لَکُمۡ اَعۡمَالَکُمۡ وَ یَغۡفِرۡ لَکُمۡ ذُنُوۡبَکُمۡ** (33:71) اس طرح سے تم دیکھو گے کہ تمہارے اعمال میں اصلاح پیدا ہو جائے گی' تمہاری جو چھوٹی موٹی سی لغزشیں ہوتی ہیں' اس قسم کے حسنِ عمل کے وزن سے' ان کا پلڑا اوپر رہے گا اور حسنِ عمل کا پلڑا جھکتا چلا جائے گا۔ **وَ مَنۡ یُّطِعِ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ فَقَدۡ فَازَ فَوۡزًا عَظِیۡمًا** (33:71) اور جس نے بھی اس نظامِ خداوندی کی اطاعت کی' یاد رکھو! **فَازَ فَوۡزًا عَظِیۡمًا** جو قوم بھی اللہ اور اس کے رسول (نظامِ خداوندی) کی اطاعت کرے گی اسے عظیم الشان کامرانیاں نصیب ہوں گی۔

مذاہبِ عالم میں حسنِ عمل کا ماحصل صرف نجات کا ہی تصور ہے

تمام مذاہب کے اندر انسان کے حسنِ عمل کا منتہیٰ نجات ہے۔ نجات (Salvation) کے معنی ہیں ''کسی عذاب سے چھٹکارا حاصل ہونا''، یعنی کوئی چیز حاصل نہیں ہوتی۔ مثلاً اگر کوئی چھ مہینے کی قید کے بعد جب وہ واپس آتا ہے تو وہ قید سے رہائی ہوتی ہے اور کچھ ملتا نہیں ہے۔ نجات کے معنی یہ تھے جیسے بیماری کے بعد آدمی جب تندرست ہوتا ہے تو پہلی حالت پہ آ جاتا ہے' یہ As you were ❶ ہو جاتا ہے' اسے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ تمام مذاہب کے اندر' مذہبی اطاعات کی' عبادات کی' احکام کی' پیروی کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان جس مصیبت میں پھنسا ہوا ہے اس سے چھٹکارا حاصل کر لے جیسا پہلے تھا ویسا ہو جائے۔ یہ ہوا کیا؟ یعنی اندازہ لگائیے کہ جیسا پہلے تھا ویسا پھر ہو گیا۔ قرآن نے نجات کا یہ تصور نہیں دیا۔ کہا ہے کہ جس نے یہ کچھ کیا تو **فَقَدۡ فَازَ فَوۡزًا عَظِیۡمًا** (33:71)۔ فاز اور فوز کے معنی Achievement ہوتے ہیں۔ اس نے اتنا کچھ حاصل کیا۔

---

❶ جیسے تم پہلے تھے مثلاً ایک تصور کے مطابق کہا جاتا ہے کہ Death is only to be as you were before your birth. (پیدا ہونے سے پہلے جیسے آپ تھے' اسی طرح ہو جانے کا نام موت ہے)

عزیزانِ من! سورۃ الاحزاب کی آیت 71 تک ہم آ گئے ۔ آ گے وہ مشہور آیت آ گئی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی امانت کو زمینوں اور آسمانوں کے سامنے رکھا اور اُنہوں نے اسے اٹھانے سے انکار کر دیا کہ نہ بابا! ہماری توبہ' ہم تو اس کو نہیں اٹھا سکتے' اور انسان نے کہا کہ بھئی! اگر اور کوئی نہیں لیتا ہے تو یہ تو بڑی بُری بات ہے تو اس نے کہا ہے کہ جی' یہ نہیں اٹھاتے تو ہمیں دید یجیے۔ خدا نے اس کے سر پہ رکھدی اور اس کے بعد کہا کہ **اِنَّـہٗ کَـانَ ظَلُوْمًا جَھُوْلًا** (33:72) بڑا ہی جاہل تھا' اٹھا کے لے گیا۔ عزیزانِ من! یہ آیت اگلے درس میں ہم لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

❀❀............❀❀............❀❀

نواں باب: **الاحزاب** (آیات 72 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج فروری 1980ء کی 15 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الاحزاب کی آیت 72 سے ہو رہا ہے:(33:72)۔

''کائنات کی ہر شے خدا کی طرف سے پیش کردہ امانت اٹھانے سے انکاری تھی'' غلط ہے

جیسا کہ میں نے سابقہ درس کے آخر میں یہ کہا تھا کہ آج کے درس کا آغاز ایک ایسی آیت سے ہو رہا ہے جو اس اعتبار سے بڑی اہم ہے کہ قرآنِ کریم کی نہج سے اس کا مفہوم سمجھا جائے تو وہ دین کا بنیادی نکتہ بنتی ہے لیکن جو مفہوم اس کا لیا جاتا ہے یا چلا آ رہا ہے' اسے سامنے رکھا جائے تو خدا کے متعلق ایک ایسا تصور آتا ہے جو قطعاً ایسا نہیں ہے کہ اسے صحیح باور بھی کیا جا سکے۔ اُسے عام طور پہ آیۂ امانت کہتے ہیں۔ یہ اسی سورۃ کی 72ویں آیت ہے۔ کہا ہے کہ **اِنَّا عَرَضۡنَا الۡاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ الۡجِبَالِ فَاَبَيۡنَ اَنۡ يَّحۡمِلۡنَهَا وَ اَشۡفَقۡنَ مِنۡهَا وَ حَمَلَهَا الۡاِنۡسَانُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوۡمًا جَهُوۡلًا** (33:72)۔ آپ کسی ترجمہ میں دیکھیے' کسی تفسیر میں دیکھیے' متقدمین کے ہاں دیکھیے' متاخرین کے ہاں دیکھیے' اس کا ترجمہ ہر جگہ یہ ملے گا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم نے الامانت کو زمین آسمان پہاڑوں کے سامنے پیش کیا' اُنہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا' خالی معذرت ہی نہیں کہ معاف فرمایئے یہ تو نہیں اٹھایا جا سکے گا بلکہ بڑی سختی سے انکار کرنے والی بات ہے' وہ اس سے ڈر گئے۔ اُنہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور انسان نے اس کو اٹھا لیا یعنی تصور میں یہ آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے خارجی کائنات میں ایک ایک کے سامنے لے کر گیا کہ بھئی! اسے اٹھا لو اور انہوں نے کہا کہ ہم نہیں اٹھا سکتے' ڈر بھی گئے اور انکار بھی کر دیا۔ نظامِ کائنات کے یہ عناصر ہیں اور انہیں اللہ تعالیٰ ایک امانت کے اٹھانے کے لیے

کہہ رہا ہے اور وہ شدت سے انکار کر رہے ہیں' اٹھا نہیں رہے۔

ذرا تصور میں لائیے ہم تو خیر اس ایمان کی بنا پر' اس عقیدت کی بنا پہ جو ہمیں احترام ہے' تکریم ہے' یہ کہہ کر آگے گزر جائیں گے لیکن غیر مسلم' خاص طور پہ مغرب کی قومیں' وہ یہاں پہنچنے کے بعد تو آپ کو آگے نہیں بڑھنے دیں گی کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں' آپ خدا کا یہ تصور دے رہے ہیں کہ اس کی مخلوق میں سے یہ کائنات کے تمام مظاہر ہیں' ان کے سامنے وہ ایک چیز پیش کرتا ہے' انہیں حکم دیتا ہے اور وہ اس کی تعمیل سے انکار کرتی ہیں۔

کائنات کی کوئی قوت بھی خدا کے کسی حکم کو تسلیم کرنے سے انکار نہیں کر سکتی: ایک غلط تصور

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ شروع سے آج تک' ہر تفسیر میں وہاں سے لے کر آج تک' یہی اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے' یہی اس کا مفہوم بتایا جاتا ہے۔ میں ابھی آگے چل کر عرض کرونگا' اپنے ہی ذہن سے نہیں کہ ہمارے دل میں ایک اعتراض ابھرتا ہے یا غیر مسلم اس قسم کا اس کے اوپر اعتراض کرتے ہیں کہ اس سے تمہارے خدا کا کیا تصور سامنے آتا ہے' اتنی ہی بات نہیں ہے بلکہ یہ ترجمہ اور تفسیر قرآنِ کریم کے دیگر مقامات میں سے ہر ایک کے خلاف ہے۔ کائناتی قوتوں میں اس کا مجالِ انکار ہی نہیں ہے' یہ تصور ہی نہیں ہے کہ وہ کسی طرح سے اطاعتِ خداوندی سے انکار کر دیں' سرکشی برتیں۔ میں ابھی عرض کرونگا' چند آیات پیش کرونگا کہ خود قرآن کی آیات اس تصور کے خلاف جاتی ہیں۔ تو اسے تو چھوڑیئے کہ دوسرے کیا اعتراض کرتے ہیں یا اپنا بھی دل مطمئن ہوتا ہے یا نہیں' یہ چیز قرآنِ کریم کے دیگر مقامات کے خلاف جاتی ہے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ قرآن کو تو سمجھا ہی اس طرح سے یا سمجھایا ہی اس طرح سے جا رہا تھا کہ ایک ایک آیت کو لیجیے اور اس کے متعلق کچھ کہہ دیجیے۔ یہ خیال ہی نہیں کہ قرآن کے دوسرے مقامات کے متعلق کیا بات آئے گی' اس سے تضاد واقع آتا ہے' یہ چیز اس کے خلاف جاتی ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے اور ہماری تو قرآن فہمی کی بنیاد ہی اس چیز کے اوپر ہے کہ وہ تصریفِ آیات سے اپنے معانی کو واضح کرتا ہے۔ اور تصریفِ آیات یہ ہے کہ ایک مقام پہ آپ نے دیکھا ہے' قرآن کے دیگر مقامات میں دیکھیے کہ وہ کیا کہتا ہے' ان مقامات کو سامنے لائیے تو مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ ارض وسماوات کی اطاعت کے متعلق قرآنِ کریم میں سینکڑوں آیات ہیں۔ وہ تمام کی تمام نگاہوں سے اوجھل رکھی گئیں' سامنے ہی نہیں رکھی گئیں۔ وہاں پہنچیں گے تو وہاں ان کے متعلق کہیں گے کہ یہ سب کی سب اس کے سامنے سربسجود ہیں' اطاعت گزار ہیں' مجالِ انکار نہیں ہے' یارۂ سرکشی نہیں ہے لیکن یہاں اس آیت کے متعلق دیکھیے کہ سب نے انکار کر دیا۔ کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ ان دونوں کو ملا کر دیکھیں کہ بات کیا بنتی ہے۔ اور جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ خود خدا کے متعلق کیا تصور آتا ہے۔ بہرحال خدا نے ان کے سامنے پیش کیا اور یہ انکار کرتے چلے گئے کہ ہم نہیں اٹھا سکتے۔

انسان نے اس امانت کو اٹھا لیا اور پھر ظالم بھی بنا اور جاہل بھی کہلایا

آپ سوچیے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کا کیا تصور آتا ہے کہ وہ پیش کر رہا ہے اور وہ انکار کر رہے ہیں۔ وہیں کہیں انسان کھڑا تھا' اس نے کہا کہ یہ اس طرح سے خدا کا واپس چلے جانا تو بڑی بری بات ہے' یہ آگے بڑھا اور اس نے کہا کہ جی' کوئی بات نہیں ہے' اگر یہ انکار کرتے ہیں تو چلیے' مجھے دیجیے' میں اٹھائے لیتا ہوں۔ اس پہ تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ ''بھئی شاباش شاباش! اے اللہ تیرا بھلا کرے' بچے جیون [1]'' اس پہ شکریہ ادا کرنا چاہیے' شاباش دینی چاہیے۔ آپ کہیے کہ کیا اس کے بعد' اس کے سوا' کچھ اور تصور آپ کے ذہن میں آتا ہے کہ شکریہ ہی ادا کرنا ہوگا' شاباش دینی ہوگی؟ لیکن اس کے بعد یہ ہے کہ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (33:72) کہنے لگے کہ بڑا ہی بیوقوف ہے' ظالم بھی ہے' جاہل بھی ہے کہ اٹھا لیا اور ''ماذ اللہ''۔ رکھ دیا اس کے سر پہ اور آپ چلے گئے اور کہا کہ پھنسے رہو۔ عزیزانِ من! سوچیے تو سہی۔ یعنی اس کے بعد یہ کہنا کہ اس نے جو بڑھ کے یوں اٹھا لیا تو یہ بڑا ہی جاہل اور بڑا ہی ظالم ہے۔ اتنی سی بات سے ہی دیکھیے کہ انسان کھڑا ہو جاتا ہے۔

دل میں پیدا ہونے والی ایک کسک' اس کسک کا علاج ''تتفکرون'' میں ہے

آپ کو عربی زبان کا زیادہ علم نہ سہی' آپ نے ان تفاسیر کو دیکھا ہو' یہ اگر اتنی سی چیز کو ہی آپ دیکھیں تو آپ کھڑے ہو جائیں گے کہ بات کچھ ایسے بنتی نہیں ہے' اس کے بعد یہ تو نہیں آنا چاہیے تھا۔ جو اصل بات ہے' وہ نہ بھی آپ کے سمجھ میں آئے لیکن اس کے متعلق تو آپ کو کھٹک پیدا ہو جائے گی کہ خدا پیش کر رہا ہے اور وہ انکار کر رہے ہیں' وہ کچھ نہیں کہہ رہا' انسان بڑھ کر اٹھا لیتا ہے' وہ اس کے بعد کہتا ہے کہ یہ بڑا ہی بیوقوف تھا' بڑا ہی ظالم تھا تو آپ کے دل میں کھٹک پیدا ہو جائے گی۔ یہ ہزار سال کے اندر کیوں کسی کے دل میں کھٹک پیدا نہ ہوئی؟ اس لیے کہ آپ نے کھڑے ہو کر سوچا ہی نہیں ہے' وہاں سوچ کے دیئے گُل کر دیئے جاتے ہیں' سوچنا نہیں ہے۔ پہلے کسی نے یہ لکھ دیا' ہمیں آج کیا معلوم کہ اس نے یہ کیسے لکھ دیا' کیوں لکھ دیا اور اس کے بعد یہ عقیدہ چلا آیا کہ جو کچھ اسلاف نے کہہ دیا ہے اس کے خلاف کہا ہی نہیں جا سکتا' سمجھ کا تو خیر کچھ سوال ہی نہیں ہے۔

قرآن قدم قدم کے اوپر آپ کو تدبر کا' تعقل کا' شعور کا' علم کا' بصیرت کا' تفکر کا' تاکید کرتا چلا جا رہا ہے کہ کھڑے ہو کر سوچو۔ وہ جو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا تھا کہ میں تو ایک ہی بات تم سے کہتا ہوں کہ ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا (34:46)۔ وہ کتنی بڑی ہے! ایک بات جو کہی گئی ہے کہ میں تم سے کوئی لمبے چوڑے وعظ نہیں کہنا چاہتا' ایک ایک دو دو کر کے کھڑے ہو کر سن لو' بات یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تَتَفَكَّرُوْا (34:46) سوچا کرو۔ کھڑے ہو کر سوچ ہی لیتے۔ میں عرض کر رہا ہوں کہ آگے محنت کرنا تو یوں رہا کہ بھئی! پھر اس کے معنی کیا ہیں' اتنا تو

---

[1] اللہ تعالیٰ تیرا بھلا کرے اور تیرے بچے سدا جییں' سدا خوش و خرم رہیں۔

ہو جاتا کہ یہ بات تو نہیں بنتی لیکن چلا آ رہا ہے، وہاں سے بھی چلا آ رہا ہے، آج بھی چلا جا رہا ہے، یہ آگے بھی چلا جائے گا۔ جب تک یہ تصور رہے گا کہ سوچنا نہیں، جو کچھ کہا گیا ہے وہ حرفِ آخر ہے، اسی کو لیے چلے جانا ہے، یہ تدبر اور تفکر اور شعور اور فہم جو قرآن نے کہا ہے یہ ہو چکا ہے جتنا ہونا تھا، ہمارے لیے یہ نہیں ہے۔ اتنی سی بات تو آپ کی سمجھ میں آ گئی۔ میں عرض کر رہا ہوں کہ اگر یہ نہ بھی کہتا تو آپ احباب کو جو قرآن سے اتنا ذوق ہے، آپ احباب خود بھی دیکھتے تو کھڑے ہو جاتے کہ صاحب! بات سمجھ میں نہیں آئی۔ اتنا تو ہو گیا کہ یہ تو نہیں ہے کچھ اور ہے۔ آیئے دیکھیں کہ یہ ہے کیا؟ پہلے تو دیکھیے کہ یہ امانت کیا ہے جسے پیش کیا ہے؟ امانت کہتے کس کو ہیں؟

دروسِ قرآنی کی اہمیت کے پیشِ نظر انہیں محفوظ کرنا نہایت ضروری ہے

عزیزانِ من! میں نے پہلے بھی کہا تھا لیکن آپ احباب مانتے نہیں ہیں کہ قرآنِ کریم کا بڑا نسخہ نہیں اٹھایا جاتا تو چھوٹے چھوٹے نسخے بھی ملتے ہیں، وہ نہیں اٹھاتے تو کم از کم پنسل کاغذ تو اپنے پاس رکھیے۔ یہ باتیں دوبارہ نہیں آئیں گی، ہوا میں چلی جائیں گی، آپ کو حوالے نہیں ملیں گے۔ کیا آپ نے (معاذ اللہ) وقتی طور پر یہ کوئی تماشہ دیکھنا ہے کہ ٹھیک ہے آج بیٹھ گئے اتنا سا سن لیا اور اگلے جمعہ کو پھر آ گئے؟ کیا چیز ہے آپ کے پاس ان درسوں کی جو محفوظ رکھی ہوئی ہے؟ معاف رکھیے گا، یہ دکھے ہوئے دل کی بات ہے جو میں کہہ رہا ہوں، یہ میں کسی پہ اعتراض نہیں کر رہا، میرا تو اس میں کچھ نہیں ہے۔

لفظ امانت کا لغوی اور قرآنی مفہوم

امانت کا لفظ وہی مادے کے اعتبار سے ''ا م ن'' ہے، جس سے یہ لفظ بنا ہے یہ وہی ''ا م ن'' ہے، جسے آپ امن کہتے ہیں، یہ وہی ہے جہاں سے ایمان کا لفظ نکلا ہے، یہ وہی ہے جہاں سے مومن کہا جاتا ہے۔ امن کا ہمارے ہاں بھی مفہوم یہ ہے کہ جہاں لڑائی جھگڑا نہ ہو، وہاں امن ہوتا ہے اسی لیے اس کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہوا تو Peace ہوا ہے اور یہ تو ایک Negative (منفی) چیز ہے کہ لڑائی جھگڑا نہ ہو، یہ کسی چیز کا نہ ہونا ہے۔ اس قسم کا جو Peace ہے، اس قسم کا جو امن ہے، وہ تو پتھروں میں ہوتا ہے، اتنے اتنے سخت ہوتے ہیں کہ کسی کے سر پہ آ گئے تو کچل کر رکھ دیتے ہیں لیکن مجال ہے کہ آپس میں ٹکرائیں۔ یہ تو زندگی کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ امن تو قبرستان میں ہوتا ہے، آپس میں کوئی جھگڑا ہی نہیں ہوتا، مردے پہ مقدمہ ہی نہیں چل سکتا۔ عربی زبان میں امن کے یہ معنی نہیں ہیں۔

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا ہے کہ ان عربوں سے پوچھو جن کی زبان میں قرآن نازل ہوا تھا کہ اس کے معنی کیا ہیں۔ اور آپ کو پتہ ہے کہ ان کے ہاں مرادفات کی کیا کیفیت تھی کہ ایک ایک چیز کے لیے سو سو الفاظ، ہزار ہزار الفاظ ان کے ہاں ہوتے تھے۔ امن کے بنیادی معنی یہ ہیں کہ ''کسی پر اتنا بھروسہ اور اعتماد ہونا اس کی ذات پر اتنا اعتماد ہونا کہ اگر کوئی چیز اس کے سپرد کر دی جائے یا وہ

آپ کو یہ بات کہہ کر یقین دلا دے کہ ہاں ٹھیک ہے، یہ میرے ذمہ رہا، تو اس کے بعد آپ کو جو سکون میسر آ جائے گا کہ اب اس کے خلاف نہیں ہو سکتا، وہ اسے امن کہتے تھے''۔ اس کے بنیادی معنی ''کسی کے اعتماد اور بھروسے'' کے ہیں۔ خدا پر ایمان کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم نے خدا کو مان لیا بلکہ اس کے معنی ہیں کہ اتنا قابلِ اعتماد ہے، اتنا بھروسے کے قابل ہے کہ جو اُس نے کہا ہے، جسے آپ قوانینِ خداوندی کہتے ہیں، اس کو لے لیجیے تو پھر آپ کو کسی قسم کے خطرے یا وہم کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ ایمان کے معنی ہوتا ہے کہ ''کسی کے اعتماد اور بھروسے پہ اتنا یقین کر لینا کہ کبھی اس کے خلاف آپ کے دل میں وہم تک بھی نہ گزرے کہ شاید یہ ہو یا نہ ہو۔'' اب دیکھیے یہ جو آپ کو امن نصیب ہوا ہے، یہ جو کیفیت آپ کے اندر پیدا ہوئی ہے، یہ وہ نہیں ہے جو پتھروں کی دنیا میں یا قبرستان کے اندر رہوتا ہے۔ یہاں تو جب ایک کا دوسرے کے ساتھ معاملہ پڑے تو آپس میں کیفیت یہ ہو کہ ''جو اس نے کہہ دیا ہے، اس کے خلاف نہیں ہوگا، جو میں نے اس سے کہا ہے اور اس نے ہاں کر دی ہے تو اس کے خلاف نہیں ہوگا، جو میں نے اس کو دیا ہے تو اس کی واپسی میں اس کے عہد و پیمان کے خلاف نہیں ہوگا۔ دوسرے کے اوپر یہ جو یقین ہے، اس کے اوپر یہ جو بھروسہ ہے، یہ ایمان کہلاتا ہے۔

اللہ پر ایمان کا حقیقی مفہوم

میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ اللہ پر ایمان کو کبھی سوچو تو سہی کہ اس کے معنی کیا ہوتے ہیں۔ تم مانتے ہو کہ خدا ہے، دوسرا کہتا ہے کہ نہیں ہے تو دونوں میں کیا فرق ہے۔ آیئے ہم بتائیں کہ قرآن کیا کہتا ہے، ایمان کسے کہتے ہیں۔ کہا ہے کہ **لَآ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ** (2:256) قانون کو تسلیم کرنے میں، ماننے میں، اس کی اطاعت کرنے میں، جبر کا کوئی دخل نہیں ہے۔ جبر کا جو منوایا ہوا ہوتا ہے، وہ کسی کے اعتماد اور یقین پر نہیں مانا جاتا، وہ تو استبداد ہوتا ہے۔ آپ نے سمجھ لیا کہ **لَآ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ** کے معنی کیا ہیں؟ آگے ہے کہ **قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ** (2:256) دونوں راستے تمہارے سامنے آ گئے۔ اگر تمہیں اس کا یقین ہے کہ یہ راستہ مجھے منزل پہ پہنچائے گا تو اختیار کر لو، یقین نہیں تو دوسرے راستے چلو۔ پہلے یہ یقین ہونا ضروری ہے کہ یہ راستہ مجھے منزل پہ پہنچا دے گا۔ اس یقین کے بعد اگر آپ وہ راستہ اختیار کر لیں تو یہ اکراہ نہیں ہے، جبر نہیں ہے۔ جبر سے چلائے ہوئے میں تو قدم قدم پہ یہ ہوگا کہ پتہ نہیں پہنچائے یا نہ پہنچائے، پتہ نہیں یار! کیا ہو آگے کوئی خطرہ ہی ہو'' کھوہ اچ ای لے ڈوبے مینوں''[1]۔ **فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ** (2:256) ہر غیر خدائی قوت جو اس سے انکار کیے چلا جاتا ہے کہ یہ بھی نہیں، اس کا بھی نہیں، مجھے نہیں بھروسہ، مجھے نہیں اعتماد، یہ کچھ کرتا چلا جائے۔ **وَ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ** (2:256) جسے یقین ہو کہ خدا کبھی دھوکا نہیں دے سکتا، وہ کبھی دغا نہیں کر سکتا، اس پہ میرا کامل اعتماد ہے، پورا بھروسہ ہے۔ جس نے ہر غیر

---

[1] مجھے کنوئیں میں ہی لے ڈوبے۔

خداوندی قوت کے متعلق یہ کہہ دیا کہ مجھے اعتماد نہیں ہے اور یہ کہا کہ خدا پر اعتماد ہے۔ جس نے اس کا یقین کر لیا دیکھیے وہ کیا کہتا ہے۔ یہ کہ **فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا** (2:256)۔ عام ترجمہ ان الفاظ میں ہوگا کہ اس نے ایک سہارے کو تھام لیا جس کا ٹوٹ جانا تو ایک طرف رہا ''ایہدے اچ تریڑ وی نہیں[1] اونی'' اسے تڑخ (چیخ) جانا کہتے ہیں، اتنا قابلِ اعتماد ہے وہ بھروسہ، وہ دستہ، وہ سہارا کہ ٹوٹنا تو ایک طرف رہا اس میں کہیں تڑخ (چیخ) بھی نہیں آ سکتی۔

عربوں کے ہاں عروۃ الوثقٰی کا اور یومن باللہ کا مفہوم

بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى کے لیے آیئے عربوں سے پوچھیں کہ وہ عروۃ[2] کسے کہتے ہیں۔ ان کی معیشت گلہ بانی تھی، اونٹ چراتے تھے، بھیڑ بکریاں پالتے تھے اور جہاں رہتے تھے زمین ان کی صحرا تھی، ریگستان تھی، کہیں کہیں نخلستان ہوتا تھا، پانی ہوتا تھا، تھوڑے سے علاقے میں وہاں گھاس وغیرہ ہوتی تھی لیکن یہ ہمارے ہاں بھی جو تھل کا علاقہ ہے یا یہ علاقے جو ریگستانی ہیں، ہمیں معلوم ہے کہ وہاں اس قسم کے درخت ہوتے ہیں، جنہیں پیلو کے، جنڈ کے اور تریر کے درخت کہتے ہیں، انہی میں کیکر بھی ہے۔ ان درختوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اتنی نیچے ان کی جڑیں چلی جاتی ہیں کہ پتہ نہیں کہاں سے جا کر وہ پانی لیتی تھیں لیکن کیفیت ان کی یہ ہوتی ہے کہ ان کے پتے کبھی خزاں میں بھی نہیں سوکھتے، بارہ مہینے ہمیشہ ان کے اوپر پتے رہتے ہیں۔ یہاں بھی ہمارے ہاں اس کی ایک مثال کیکر کا درخت ہوتا ہے۔ آپ نے خزاں میں بھی کبھی نہیں دیکھا ہوگا کہ باقی درختوں کی طرح اس کی ٹہنیاں خشک ہوگئی ہوں اور پتے جھڑ گئے ہوں۔ اس قسم کا جو درخت ہوتا تھا، اس کے متعلق ان کو یہ یقین اور اعتماد ہوتا تھا کہ سال بھر میں کبھی ایسا وقت نہیں آئے گا کہ اس پہ پتے نہ رہیں، اسے وہ عروۃ کہتے تھے۔ دیکھتے ہیں کہ اس میں اعتماد کی کیا کیفیت ہے اس طرح سے ہر وہ شے جس پر بھروسہ کیا جا سکے عُرْوَةٌ کہلاتی ہے۔ نیز ڈول وغیرہ کا دستہ جس سے اسے پکڑا جائے عُرْوَةٌ کہلاتا ہے۔ یہ ہر وہ سہارا ہے جسے پکڑ کر کوئی لٹک جائے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن کہاں یہ لفظ عُرْوَةٌ استعمال کر رہا ہے۔ عُرْوَةٌ ہی کوئی چھوٹی چیز نہیں تھی۔ اسی اعتبار سے وہ کسی ہینڈل کو، کسی ایسے سہارے کو، جس سے انسان لٹک جائے اور وہ ایسا قابلِ اعتماد ہو کہ وہ کبھی نہ ٹوٹا ہو، ایسا پیراشوٹ کہ جس نے کبھی دھوکا نہ دیا ہو۔ یہ آگ بجھانے والوں کے دستے جن سے وہ لٹک جاتے ہیں، اس اعتماد سے جو پیراشوٹسٹ ہے، پائلٹ اپنے جہاز سے چھلانگ لگا دیتا ہے۔ اپنے پیراشوٹ پر یہ اس کا ایمان ہی تو ہوتا ہے کہ وہ بے خطر کود پڑتا ہے۔ اسے عُرْوَةٌ کہتے ہیں، اب اس کے بعد الْوُثْقٰى ہے۔ وثاق اس رسی، بیڑی یا بندھن وغیرہ کو کہتے ہیں، جس سے

---

[1] اس میں درز (Crack) بھی نہیں آئی۔

[2] اس کا مادہ ''ع ر و'' ہے۔

کسی چیز کو باندھا جائے۔ **وَثَقَ الشَّیءُ** کے معنی ہیں' وہ چیز محکم اور مضبوط ہوگئی۔ جو ٹوٹ نہ سکے۔ **وثق بہ** کے معنی ہیں' کسی پر اعتماد کرنا' اسے امانتدار سمجھنا۔ یہ ہے **بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰی**۔ اب معلوم ہوا کہ یؤمن باللہ کے معنی کیا ہوئے؟ یہ کہ وہی اعتماد اور بھروسہ۔ جس نے قوانینِ خداوندی کے اوپر یقین کیا کہ یہ قابلِ اعتماد ہیں' یہ میرا سہارا ٹوٹ نہیں سکتا' خزاں ہو یا بہار' اس کے پتے کبھی خشک نہیں ہونگے۔ یہ وہی ہے جو اقبالؒ (1877-1938) کہتا ہے کہ

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند

بہار ہو کہ خزاں' لا الہ الا اللہ

(ضربِ کلیم)

عزیزانِ من! اب یومن باللہ کے معنی سمجھ میں آ گئے: وہی امن کہ اتنا اعتماد ہو' کسی کے اوپر اس قدر بھروسہ ہو' اس بات کا یقین ہو کہ یہ سہارا کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ ابھی میں عرض کرتا ہوں کہ اسی لفظ **عُرْوَةُ الْوُثْقٰی** کو دوسری جگہ کیسے استعمال کرتے تھے۔ یہاں کہا ہے کہ **لَا انْفِصَامَ لَهَا** (2:256)۔ فصم ہونا یعنی تڑخ (چیخ) جانا' تو کہا کہ اس میں فصام بھی نہیں آ سکتا۔ وہ ایسا قابلِ اعتماد سہارا سنبھال لیتا ہے کہ پھر کوئی دل میں شک وشبہ بھی نہیں ہوتا۔ اب سوچیں کہ امن کسے کہا گیا ہے۔ یہ Negative (منفی) چیز نہیں ہے یہ تو بہت بڑی Positive (مثبت) چیز ہے۔ اس رسے کا اتنا مضبوط ہونا' اس ہینڈل کا اتنا قابلِ اعتماد ہونا' اس درخت کا اتنا بھروسے کے قابل ہونا' Positive (مثبت) ہے' مثبت چیز ہے۔ نہ ہونا تو لا الہ ہے' یہ تو **یکفر بالطاغوت** ہے۔ الا اللہ مثبت ہے۔ یہ ہے جسے ایمان باللہ کہا جاتا ہے۔ عزیزانِ من! یہ ماننا نہیں ہے بلکہ یہ اتنا بھروسہ ہونا ہے کہ ٹوٹ نہیں سکتا۔ اسی لیے خدا نے اپنی ایک صفت بھی تو المؤمن کہی ہے۔ اگر مومن کے معنی جیسے ہمارے ہاں ہے' ایمان لانے والا کہیں تو خدا کس پر ایمان لاتا ہے جو اس کا نام المؤمن ہے۔ ''اسی وی مؤمن تے او وی مومن''[1]۔ وہ المؤمن ہے' ایسا بھروسے کے قابل کہ کبھی تڑخ بھی نہ آئے کہ یہ سہارا ٹوٹ سکتا ہے' امنِ عالم کی اتنی بڑی ضمانت دینے والا ہے۔ مجھ پہ اعتماد کرو کہ میں دھوکا نہیں دونگا۔ اور جو اس طرح سے اعتماد کرنے والے ہیں یہ ہیں جن کو جماعتِ مومنین کہا جاتا ہے۔ اس اعتماد اور بھروسے کو ایمان کہا جاتا ہے۔ اس سے وہ شے نصیب ہوتی ہے جسے امن کہا جاتا ہے۔

---

[1] ہم بھی مومن اور وہ بھی مومن۔

عربی زبان کی وسعت اور ابوالفضل فیضی کی قرآنی تفسیر بغیر کسی نقطہ کے

میں نے کہا ہے کہ دوسری طرف آیئے۔ عربوں کی تشبیہات چند چیزوں کے گرد گھومتی تھیں یعنی پانی، نخلستان، بھیڑیں، خیمے، تلوار اور گھوڑے۔ اتنی تھوڑی چیزیں تھیں لیکن زبان کی وسعت یہ ہے کہ ایک اونٹ کے لیے ہزار الفاظ تھے۔ اتنی وسیع زبان کہ اس زبان کا انتخاب خدا نے قرآن اتارنے کے لیے کیا۔ اس کی وسعت کا اندازہ لگایئے کہ یہ زبان کتنی وسیع ہے۔ یہ ابوالفضل فیضی کا نام آپ نے سنا ہوگا۔ اکبر (1556-1605ء) کے زمانے میں دو بھائی تھے۔ ان میں فیضی بڑا قابل آدمی تھا۔ اس نے قرآنِ کریم کی تفسیر لکھی ہے یہ تفسیر دو ضخیم جلدوں میں عربی زبان میں ہے۔ ان میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں آیا جس پہ نقطہ ہو۔ پوچھو نہیں کہ یہ زبان کیا تھی۔ ان کی محسوس تشبیہات سے قرآن نے جو الفاظ لیے ہیں اس سے وہ اصول سمجھ میں آتے ہیں کہ وہ کہتا کیا ہے۔ یہ اعجاز ہے قرآن کا۔ عربوں کے ہاں **نَـاقَةٌ اَمُوْنٌ** اس اونٹنی کو کہتے تھے کہ جس کو سفر میں لے کر جائیں تو نہ تو چلتے ہوئے کبھی ٹھوکر کھا کر گر جائے اور نہ ہی سفر سے تکان اتنی ہو کہ تھک کر بیٹھ جائے اس پہ اتنا بھروسہ ہو کہ یہ منزل تک لے جائے گی۔ یہ تھی امن دینے والی اونٹنی ❶۔

امانت کے بالمقابل خیانت کا مفہوم

بات میں سے بات آ گئی کہ امانت کے مقابلے میں خیانت آتا ہے۔ وہ جو میں نے کہا ہے کہ **بِـالْـعُرْوَةِ الْوُثْقٰى** یعنی مضبوط سہارا جسے قرآن نے حبل اللہ کہا ہے یہاں ہمارے ہاں تو یہ ہے کہ ہم اس قدر مہذب ہوگئے ہیں کہ ہماری اگلی نسل نے کنویں کا منہ ہی نہیں دیکھا۔ بہت سی چیزیں آہستہ آہستہ ان کی لغات سے ہی ختم ہو جائیں گی ان کی Vocabulay (ذخیرۂ الفاظ) میں ہی نہیں آئیں گی۔ انہیں پتہ ہی نہیں ہوگا کہ کنواں کیا ہوتا ہے۔ نئی آبادیاں جتنی مہذب ہیں ان میں تو کنواں نہیں ہے۔ تو اب میں ان کو کیا سمجھاؤں۔ پہلے تو کنواں ''تے فیر کھوہ' تے پوھنی'' اردو والے اس کو چرخ یا چرخی کہتے تھے اس کے اوپر رسہ ہوتا تھا ڈول ہوتا تھا پانی کا ڈول بھر کر اس چرخی کو اس طرح سے کھینچتے تھے۔ بھرے ہوئے پانی کے ڈول کو بڑے زور سے کھینچنا پڑتا تھا۔ یہ سارا پروسیس آپ کس بھروسے پہ کر رہے تھے؟ اس پہ کہ یہ جو رسی ہے جس کے ساتھ یہ ڈول بندھا ہوا ہے یہ ٹوٹے گی نہیں اوپر آئے گی۔ اگر وہ بھرا ہوا ڈول اوپر چڑھ رہا ہو اور قریب ہی آ جائے تو وہ رسی ٹوٹ جائے تو آپ سوچیے کیا کیفیت ہوتی ہے۔ یہی نہیں کہ وہ ڈول نیچے چلا جاتا تھا بسا اوقات یہ اوپر کھینچنے والا کنویں میں گر جاتا تھا۔ یہ جو رسی کا اس طرح سے ٹوٹنا تھا اسے وہ کہتے تھے **خان الدلْوَ الرِّشَاءُ** کہ رسی نے خیانت کر دی۔ کیا بات تھی ان عربوں کی!

---

❶ اس کا حوالہ ہے عربی لغت ''تاج العروس'' اور اردو لغت ''لغات القرآن'' (پرویزؒ)

وہ **عُـرْوَۃ الْوُثْقٰی** تھا کہ جس میں تریڑ بھی نہیں آ سکتی اور یہ اس طرح سے اس رسی کا ٹوٹ جانا' وہ خیانت ہے۔اب سمجھ میں آیا کہ خیانت کیا ہوتی ہے؟ یہ کہ اس رسی نے آپ کا اعتماد ضائع کیا ہے۔اگر آپ کو شروع میں پتہ ہو کہ یہ رسی بوسیدہ ہوگئی ہے تو آپ کبھی اس کو کنویں میں نہیں لٹکائیں گے۔آپ لٹکاتے اس لیے ہیں کہ آپ کو اس کا یقین ہوتا ہے' اعتماد ہوتا ہے' بھروسہ ہوتا ہے کہ یہ ٹوٹے گی نہیں۔ٹوٹ کر' اُس نے آپ کے بھروسے کو دغا دیا ہے۔وہاں یہ لفظ خیانت بولتے تھے۔

اب آیئے دیکھیے کہ قرآنِ کریم کن معنوں میں اس کو استعمال کرتا ہے۔نظامِ خداوندی' حکومتِ الٰہیہ کے لیے اربابِ نظم ونسق ہیں' ان کے ہاتھوں سے خدا کے احکام وقوانین کو نافذ ہونا تھا' ان کے ذمے یہ فرائض عائد کیے جاتے تھے' یہ ان کی ذمہ داریاں تھیں جو ان کو سونپی جاتی تھیں۔کہا کہ **اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا** (4:58) خدا تمہیں یہ حکم دیتا ہے' محض اخلاقی بات نہیں' محض تلقین کی بات نہیں ہے۔اسلامی مملکت میں ایک چیز یہ بھی ہوتی ہے کہ جو امانات ہیں وہ ان کے سپرد کیا کرو جو ان کے اہل ہوں۔حکومت کے معاملے میں امانات کا مطلب سمجھ میں آ گیا۔یہ اختیار' یہ اتھارٹی' بڑی چیز ہے۔یہ اُسے دو جو قابلِ اعتماد ہو' جو بھروسے کے قابل ہو' جو مومن ہو۔اب سمجھ میں آیا کہ مومن کیا ہوا۔چھان پھٹک کر دیکھو کہ اتنا قابلِ اعتماد ہو' یہ نہ ہو کہ اس طرح سے ڈول کی رسی ٹوٹ جائے' جو پیرا شوٹ ہے وہ کسی وقت میں دغا دے جائے' تم اس پہ اعتماد کرو اور اس کی یہ کیفیت ہو جائے۔ابھی میں نے حکومت کے نظم ونسق کے متعلق کہا ہے اور یہ بات میں نے اگلے فقرے سے لی۔کہا کہ **وَ اِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ** (4:58) ان کو دو کہ جب وہ لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کریں تو وہ عدل کے مطابق فیصلہ کریں۔

اگر کوئی قانون ہی عدل پر مبنی نہ ہو تو کوئی فیصلہ بھی پھر عدل پر مبنی نہیں کہلا سکتا

عدل قرآن کی رو سے یہ نہیں ہے کہ جو ہمارے ہاں عدل کی Definition (تعریف) ہے کہ مروجہ قانون کے مطابق فیصلہ کر دیا جائے تو وہ عدل ہوتا ہے' وہ Justice ہوتا ہے۔اگر وہ قانون جس کے مطابق فیصلہ کیا جا رہا ہے' وہی عدل پہ مبنی نہ ہو' ظلم پہ مبنی ہو' تو اس کی رو سے جو فیصلہ دیا جائے گا وہ عدل کیسے کہلائے گا لیکن مروجہ Definition (تعریف) جو آپ کے ہاں عدل کی ہے' اس کی رو سے وہ عدل ہی ہوگا۔یہ کورٹ سے بھی اگر آپ کہیں کہ صاحب! یہ جو آپ نے جس قانون کی رو سے فیصلہ کیا ہے وہی غلط ہے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ ہمارا کام نہیں ہے' جاؤ جا کر قانون بدلواؤ۔ہمارا کام تو اس مروجہ قانون جو پاس ہو کے آ گیا ہے' کے مطابق فیصلہ دینا ہے۔قرآن کہتا ہے کہ یہ عدل نہیں ہے۔**یَّھْدُوْنَ بِالْحَقِّ** (7:181) وہ الحق جو خدا نے اتارا ہے اس کے مطابق فیصلہ دو گے تو پھر یہ عدل کہلائے گا ورنہ ظلم کہلائے گا۔چھ چھ مہینے سے بحثیں ہو رہی ہیں کہ اسلامی مملکت کیا ہوتی ہے' اس کا نظام کیا ہوتا ہے۔جس سے پوچھنا

چاہیے اس سے نہیں پوچھتے۔ اُسے بلالؤ اُسے بلالؤ ہر ایک ان میں سے آ کر کہتا ہے کہ صاحب! اسلام یہ کہتا ہے' اسلام کی رو سے ایسا نہیں۔ تو ایسے سمجھ میں آتا ہے جیسے باہر کوئی کھڑا ہے کہ جس کا نام محمد اسلام ہے اور یہ کہہ رہے ہیں کہ جی اسلام یہ کہتا ہے "میں ہُنے پوچھ کے آیاں"[1]۔ کبھی کسی نے اسلام کہتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ اس ایسا کہنے کی کیا اتھارٹی ہے۔ جس کا جی چاہے وہ یہ کہدے کہ اسلام یہ کہتا ہے۔ وہ جو قانون ان کے سامنے ہے' وہ تو بات ہی یہ کرتے ہیں' انتہائی عادل وہ جج ہوتا ہے جو قانون کے بالکل مطابق فیصلہ کردے۔ قرآن کہتا ہے کہ پہلے یہ دیکھو کہ وہ جو قانون ہے' وہ بھی عدل پہ مبنی ہے؟ قانون الحق کے مطابق جو فیصلہ ہوگا وہ عدل کہلائے گا۔

لفظ امانت کا تفصیلی اور متعین قرآنی مفہوم اور اس کے راستے میں حائل ہونے والی خطرناک گھاٹیوں کی نشاندہی

کہا ہے کہ **اَنۡ تُؤَدُّوا الۡاَمٰنٰتِ اِلٰۤی اَهۡلِهَا** (4:58)۔ اب امانات کے معنی یہاں آ گئے: اتھارٹی' ذمہ داری' فریضہ۔ یہ فیصلہ کرنے کے فرائض' یہ ذمہ داریاں' ان کے سپرد کرو جو اس کے اہل ہوں۔ اور اہل کے متعلق کہہ دیا کہ **اَنۡ تَحۡكُمُوۡا بِالۡعَدۡلِ** (4:58) اہلیت کا معیار یہ قرار دیا کہ وہ عدل کے مطابق فیصلہ کرے اور عدل کے متعلق کہہ دیا کہ وہ حق کے مطابق ہو۔ کڑی سے کڑی ملتی چلی جاتی ہے۔ عزیزانِ من! اس کے لیے کمیشن بٹھانے کی کیا ضرورت ہے؟ اس کے لیے رٹیں دائر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں نے جیسا عرض کیا ہے جس سے پوچھنا چاہیے کہ صاحب! یہ کیا ہے' اس سے کوئی نہیں پوچھ رہا۔ وہ کہتا ہے کہ **اُجِيۡبُ دَعۡوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ** (2:186) او بابا! ادھر اُدھر جو مارے مارے پھرتے' ہو ہر دروازے پہ دستک دیتے ہو' وہ کہتا ہے کہ بابا! معاف کرو یا "رات دی سوکھی روٹی تہاڈی جھولی اچ پا دیندا ہیگا اے"[2]۔ **اُجِيۡبُ دَعۡوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ** (2:186) میرے دروازے پہ دستک دو میں جواب دونگا جو تم پوچھتے ہو۔ او بابا! اس سے پوچھو جو کہتا ہے کہ مجھ سے پوچھو میں جواب دونگا۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ امانت کے معنی قرآن کی رو سے کیا ہوئے' ایمان کے معنی کیا ہوئے' مومن کسے کہا گیا ہے۔ یہ امانت کے متعلق آیا اور اس کے برعکس خیانت کا لفظ ہے۔ کہا کہ **يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا** (8:27) اے وہ لوگو جو ہم پر بھروسہ کیے ہوئے ہو۔ اب تو ترجمہ ہی یوں ہونا چاہیے کہ جنہیں ہمارے اوپر کُلی اعتماد ہے۔ کہا ہے کہ **لَا تَخُوۡنُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوۡلَ** (8:27) یہ نظام جو ہمارے قوانین کے رائج کرنے کے لیے

---

[1] میں ابھی پوچھ کر آیا ہوں۔

[2] یا رات کی بچی ہوئی سوکھی روٹی تمہاری جھولی میں ڈال دیتا ہے۔

رسول نے قائم کیا ہے' اس سے خیانت نہ کرو۔ وہ امانت تھی جو ان کے سپرد کی گئی تھی اور یہ خیانت ہے۔ پوری ذمہ داری کے طور پر جو فرائض کسی کو تفویض کیے جائیں' ان میں خیانت نہ کرو' خدا اور اس کے رسول سے خیانت مت کرو۔ **وَ تَخُوۡنُوۡۤا اَمٰنٰتِكُمۡ** (8:27) یہ امانات جو تمہارے سپرد کی گئی ہیں' یہ ذمہ داریاں' یہ فرائض جو تمہارے سپرد کیے گئے ہیں' ان میں خیانت نہ کرو۔ یعنی وہاں بات ہو سکتی تھی کہ اللہ اور رسول سے خیانت کے کیا معنی ہیں کہ اس سے خیانت نہ کرو' وہ تو آپ کو کہیں جانے ہی نہیں دیتا۔ بحثیں کرتے رہیے کہ اللہ سے مراد کتاب اللہ ہے اور رسول سے مراد احادیث ہیں۔ وہ تو وہیں کہہ دیتا ہے کہ **وَ تَخُوۡنُوۡا اَمٰنٰتِكُمۡ** (8:27) یعنی جو امانات تمہارے سپرد کی گئی ہیں' وہ اس نظام نے سپرد کی ہیں وہ جسے اسلامی حکومت کہتے ہو' وہ اس نے تمہیں سپرد کی ہیں' ان امانات میں خیانت نہ کرو' ان فرائض کو پوری پوری طرح سرانجام دو۔ یہ بات ہوگئی اب امانت کی۔

کہا ہے کہ اس معاملے میں کس کس گوشے سے احتیاط برتنے کی ضرورت ہوگی۔ یہ بڑی بات ہے۔ کسی انسان کو اتنے اختیارات دیدینے' کوئی چھوٹی چیز نہیں ہے۔ مومن ہے تو وہ اس کو امانت سمجھے گا لیکن جب اختیارات دیئے گئے ہیں تو کسی کے پاس بہت بڑی قوت آجاتی ہے۔ اس کے اندر بڑی ترغیبات ہوتی ہیں۔ کہا کہ یاد رکھو! اس کے راستے میں کچھ خطرناک مقام آتے ہیں۔ ان کے لیے یاد رکھو کہ: **وَ اعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَاۤ اَمۡوَالُكُمۡ وَ اَوۡلَادُكُمۡ فِتۡنَةٌ** (8:28) یاد رکھو! اس معاملے میں دولت کی خواہش' اولاد اور بیویوں کے تقاضے' بیگمات کی شاپنگ' بچوں کی ملازمتیں' پیسہ جمع کرنے کی ریس' یہ اس راستے میں خطرناک گھاٹیاں آئیں گی اس لیے یہ جو امانات تمہارے سپرد کی گئی ہیں' یہ اختیار تمہارے پاس پہلے نہیں تھے' یہ تمہیں دیئے گئے ہیں' ان میں خیانت نہ کرنا' یہ پھسلنے کے مقامات آئیں گے۔ یہ فتنہ بھی بڑا عجیب لفظ ہے۔ سنار کی جو کٹھالیاں ہوتی ہیں کہ پیتل ہو' اس میں ڈال دیا جائے گا تو پگھل جائے گا' سونا ہے تو کندن بن کر نکلے گا۔ ان کٹھالیوں سے نکل کر ان امانات میں خیانت نہ کرتے ہوئے آؤ گے تو ابنِ خطاب[1] 'فاروقِ اعظمؓ' بن جاؤ گے۔

انسانوں کے علاوہ خارجی کائنات یعنی ارض وسماوات کے سپرد فرائض

کہا ہے کہ **اِنَّا عَرَضۡنَا الۡاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ الۡجِبَالِ** (33:72) کچھ فرائض ہم نے خارجی کائنات کی چیزوں کو سپرد کیے۔ اللہ تعالیٰ قرآن میں ارض وسماوات کی اصطلاح استعمال کرتا ہے کہ جیسی بھی یہ خارجی کائنات ہے' اس سب کے لیے قرآن کی یہ جامع اصطلاح ہے۔ کہا ہے کہ ان کے ذمے کچھ فرائض لگائے' اس پروگرام کی کچھ ڈیوٹیاں ان کے سپرد کی گئیں۔

---

[1] یہ حضرت عمر بن خطاب کی طرف اشارہ ہے کہ وہ خطاب کے بیٹے سے حضرت عمرؓ فاروقِ اعظم بن گئے۔

مثلاً سورج سے کہا گیا کہ اس طرح سے تم نے طلوع ہونا ہے' یہ راستے طے کرتے ہوئے غروب ہونا ہے' روشنی بھی دینی ہے' حرارت بھی دینی ہے' وقت پہ نکلنا ہے' وقت پہ غروب ہونا ہے' یہ راستہ ہے تمہارے لیے' پانی سے کہا کہ اوپر سے نشیب کی طرف آنا ہے' زندگی بخشنی ہے' ہوا سے کہا کہ جہاں جہاں کوئی جاندار ہے وہاں تم نے موجود رہنا ہے' یہ تمہارا فریضہ ہے۔

کائنات کی کوئی شے اپنے فرائض کی بجا آوری میں ذرا خیانت نہیں کرتی

کائنات کی کوئی شے بھی جس پر یہ فرائضِ خداوندی یا ذمہ داریاں عائد کی گئی ہیں یا جو احکامِ خداوندی ہیں' جن کو آپ Laws of Nature (قوانین فطرت) کہتے ہیں' ان میں کوئی شے خیانت نہیں کرتی۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر ہمارے اقتدار کے سوا کسی اور کا بھی اقتدار ذرا سا آ جائے تو لَفَسَدَتِ (23:71) یہ سلسلۂ کائنات تہس نہس ہو جائے۔ سائنسدانوں سے پوچھیے۔ وہ کہتے ہیں کہ سورج کے چلنے میں یا رفتار میں انچ کے کروڑویں حصے کا بھی کبھی فرق پڑ جائے تو یہ سارے کرّے آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا جائیں۔ یہ اس میں جو کششِ ثقل ہے اگر یہ کروڑواں تو کچھ شے ہی نہیں ہے' فرق آ جائے تو لَفَسَدَتِ (23:71) ہو جائے' کوئی شے اپنے مقام کے اوپر باقی ہی نہ رہے۔ یہ خارجی قوتیں اپنے فرائضِ مفوضہ کو اس طرح سے ادا کر رہی ہیں۔ نظامِ کائنات کی کیفیت کے متعلق چند ایک حوالے لے لیجیے۔ یعنی یہ تو محسوسات کی دنیا ہے جس میں ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

ابھی ابھی میں عرض کرونگا کہ ایک فریضہ آپ اپنے اوپر بھی عائد کرتے ہیں اور ایک فریضہ سورج پر بھی عائد کیا ہوا ہوتا ہے۔ کہا ہے کہ وَ لِلّٰہِ یَسۡجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ (16:49) کائنات کے اندر جو شے ہے' وہ قانونِ خداوندی کے سامنے سجدہ ریز ہے اطاعت گزار ہے۔ مِنۡ دَآبَّۃٍ وَّ الۡمَلٰٓئِکَۃُ (16:49) خواہ وہ جاندار ہے یا یہ فطرت کی قوتیں ہیں۔ وَ ھُمۡ لَا یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ (16:49) وہ کبھی سرکشی نہیں کرتیں' کبھی انکار نہیں کرتیں۔ یَخَافُوۡنَ رَبَّھُمۡ مِّنۡ فَوۡقِھِمۡ (16:50) وہ خدا کی بالادستی سے خائف رہتی ہیں۔ وَ یَفۡعَلُوۡنَ مَا یُؤۡمَرُوۡنَ (16:50) ایک دفعہ جو ان کو اشارہ بھی ہم نے کر دیا ہے' وہ اس کے مطابق سرگرمِ عمل ہیں۔ عزیزانِ من! اسی نظام کے اوپر یہ کائنات قائم ہے۔ کہا ہے کہ لَا یَسۡتَکۡبِرُوۡن (16:49) وہ استکبار نہیں کرتیں' وہ سرکشی نہیں کرتیں۔ ایک چیز تو سرکشی کرنا ہے۔ وہ نَاقَۃٌ اَمُوۡنٌ کے معنی آپ نے دیکھے تھے کہ وہ اونٹنی راستے میں تھکتی بھی نہیں ہے' وہ انکار نہیں ہوتا' استکبار نہیں ہوتا' صرف تھک جانا ہوتا ہے۔ سورج استکبار نہ ہی کرے' انکار نہ ہی کرے' کبھی یہی کہہ دے کہ صاحب! پہلے دن سے جو تم نے مجھے پیدا کیا ہے' آج تک روز دن رات ''نہ کتھے بیہن نوں آرام' نہ کتھے سون نوں جگہ' میں تے تھک گیاں آ بھائی! تے بیٹھ

گیاں"❶۔تھکنا جرم نہیں ہے۔

کائنات کی کوئی شے فرائض کی ادائیگی میں نہ تھکتی ہے اور نہ ہی سرکشی اختیار کرتی ہے

عزیزانِ من! اندازہ لگائیے کہ کس کس انداز سے قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ یہ جوارض وسماوات اور یہ خارجی کائنات ہے اور اس کے عناصر اور یہ قوتیں ہیں' ان کے لیے کہا ہے کہ وَلَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (21:19) اس خارجی کائنات میں جو کچھ بھی ہے' وہ خدا کے پروگرام کی تکمیل کے لیے سرگرمِ عمل رہتے ہیں۔لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ (21:19) اپنی اطاعت میں وہ کبھی سرکشی اختیار نہیں کرتے۔وَ لَا یَسْتَحْسِرُوْنَ (21:19) وہ تھکتے بھی نہیں ہیں۔ یُسَبِّحُوْنَ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ لَا یَفْتُرُوْنَ (21:20) دن رات سرگرداں رہتے ہیں' اپنے فرائض کی تکمیل میں کبھی انکار نہیں کرتے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ عربوں کے معنی کو سامنے رکھیے تو نَاقَةٌ اَمُوْنٌ میں اُنہوں نے تھکنا بھی لے لیا تھا کہ وہ تھکتی بھی نہیں ہے❷۔تو یہ نہیں ہے کہ وہ چلنے سے انکار کرے' ویسے سرکشی برتے بلکہ وہ تو تھکتی بھی نہیں ہے۔کیا بات تھی اس قوم کی!

آج آپ کی سمجھ میں آئے گا کہ جسے آپ حسرت کہتے ہیں اس کے معنی کیا ہوتے ہیں یعنی کسی کے انتظار میں تھک کر بیٹھ جانا۔ وَ لَا یَسْتَحْسِرُوْنَ (21:19) تھکتے بھی نہیں ہیں۔یہ کیوں اس طرح سے یہ سب کچھ کرتے چلے جاتے ہیں؟ کہا کہ اس لیے اِنْ كُلُّ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اِلَّاۤ اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا (19:93) یہ کائنات کے اندر جتنے بھی مظاہرِ فطرت ہیں' خدا کی مخلوق ہے' یہ جتنے بھی ہیں' وہ یوں سمجھو جیسے کسی کے غلام اس کے سامنے ہاتھ باندھے ہوئے کھڑے رہتے ہیں۔ یہ "عبد" ان کے ہاں استعمال ہوتا تھا کہ سدھایا ہوا گھوڑا' جو وحشی نہ ہو' Undomesticated نہ ہو' جس کو سدھا دیا جاتا ہے وہ پھر لگام کے اشارے کے اوپر چلتا ہے' سرکشی اختیار نہیں کرتا۔کہا کہ ان کی کیفیت ہمارے سامنے یہ ہے۔ساتھ ہی یہ بات بھی کہہ دی کہ عبد سے شاید تمہارے ذہن میں یہ بات آئی ہوگی کہ مجبور اُغلاموں کی طرح کھڑے ہیں۔کہنے لگے کہ نہیں! اس اعتبار سے ہم نے نہیں کہا کہ مجبوری کا عالم ہے۔ثُمَّ اسْتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ وَهِیَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا (41:11) ہم نے اس کائنات کو' سماوات و ارض کو' ان سب کو' پیدا کیا اور پھر ان سے کہا کہ آؤ' اٹھاؤ اس امانت کو' ان فرائض کی سرانجام دہی کے لیے چلے آؤ۔یہ طوعاً وکرہاً ہمارے ہاں بھی استعمال ہوتا ہے کہ "بھئی! کرنا تو ہوگا" قَالَتَاۤ اَتَیْنَا طَآئِعِیْنَ (41:11) حضور ہم پہ جبر کرنے کی کیا بات ہے! سرِ تسلیم خم ہے

---

❶ نہ کہیں بیٹھنے پہ آرام ہے اور نہ کہیں سونے کی جگہ ہے۔ بھائی صاحب! میں تو تھک چکا ہوں اس لیے بیٹھ گیا ہوں۔

❷ حوالے کے لیے دیکھیے عربی لغت تاج العروس' اور پرویزؒ: لغات القرآن۔

جو مزاجِ یار میں آئے' ہم تو پکی ہوئی کھجور کی طرح خود گر پڑیں گے۔ اَطَاعَ النخل کے معنی عربی زبان میں یہ ہیں کہ کھجور کو جھانپل سے نہ اتارنا پڑے بلکہ پک کر خود ہی گرے۔ کہا کہ طوعاً او کرھاً کے کیا معنی ہیں؟ آپ یہ کیا فرما رہے ہیں کہ ہم اور کسی جبر کے ماتحت یہ کریں گے!! ہم تو اپنی رضامندی سے یہ سب کچھ کریں گے۔ تو ''عبد'' بھی ایسا ہے کہ جو طوعاً یہ کچھ کر رہا ہے' رضامندی کے ساتھ یہ کچھ کر رہا ہے' یہاں جبر نہیں ہو رہا۔

مظاہرِ فطرت اگر اپنے فرائض میں تساہل برتتے یا انکار کرتے تو یہ کائنات وجود میں ہی نہ آتی

کہا ہے کہ وَ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ (30:26) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ بھی ہے' ہر ایک اس کے مقرر کردہ فرائض کی سرانجام دہی میں' اپنی ساری صلاحیتوں کو صرف کرتا چلا جاتا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ اس قسم کی آیات قرآنِ کریم میں سینکڑوں ہیں لیکن اس سے زیادہ کی ضرورت ہی کیا ہے۔ انسان اور کائنات میں تو فرق ہی یہ ہے کہ کائنات کی ہر شے قوانینِ خداوندی کی اطاعت میں سرگرمِ عمل رہتی ہے' وہاں کسی کو نہ یارۂ سرکشی ہے' نہ مجالِ انکار ہے۔ اسی سے یہ نظم و نسق کائنات اس حسن و خوبی سے چل رہا ہے۔ اب ان تمام آیات کی موجودگی میں' جو ہمارا مشاہدہ ہے اس کی موجودگی میں' کیا اس کے یہ معنی ہو سکیں گے کہ ہم نے اپنی امانت (فرائض' ذمہ داریاں' Duties) جو ان کے سپرد کیں تو انہوں نے انہیں ادا کرنے سے انکار کر دیا؟ امانات کا لفظ بتا رہا ہے کہ پورے اعتماد کے ساتھ فرائض و ذمہ داریاں سپرد کی جاتی ہیں۔ ہمیں ان کے اوپر اعتماد تھا اس لیے یہ ذمہ داریاں ان کے سپرد کیں۔ تو یہ سارا کچھ جو ہم نے بتایا ہے' قرآنِ کریم کی یہ تمام آیات جو ہم نے دی ہیں اور جو کچھ ہمارا مشاہدہ کہہ رہا ہے' وہ بتایا ہے' تو کیا اس کے بعد یہ ہوگا کہ ہم کو انہیں یہ فرائض عطا کرنے چاہیے تھے' پورے بھروسے سے ان کو یہ ذمہ داریاں سونپنی چاہیے تھیں کہ یہ اس میں نہ تساہل برتیں' نہ تغافل برتیں' نہ تھکیں' نہ انکار کریں' نہ سرکشی کریں؟' اس اعتماد کے ساتھ ہم نے یہ فرائض اور ذمہ داریاں ان کو سونپنی چاہیں تو کیا اس کے معنی یہ ہونگے کہ انہوں نے اس سے انکار کر دیا؟ عزیزانِ من! اگر انکار کر دیا ہوتا تو یہ کائنات وجود میں ہی نہ آتی۔

کائنات کی ان قوتوں کے حسنِ عمل کے برعکس حضرت انسان کی حالت اور ہمارے ہاں کی تفاسیر اور قرآنی تراجم کی نوعیت

اب کہا یہ جاتا ہے کہ اس کے برعکس انسان نے یہ اٹھا لیا۔ یہ خود ہمارے مشاہدے کے خلاف ہے کہ خدا کے عطا کردہ فرائض کو اگر یہ اس طرح سے اٹھا لیتا تو کیا انسانی دنیا کی یہ حالت ہوتی؟ یہ چیز مشاہدے کے خلاف ہے' تصورِ خداوندی کے خلاف ہے' کائنات کے نظم و نسق کے خلاف ہے اور قرآن کی آیات کے خلاف ہے۔ پھر آپ کہیں گے کہ بات آگے کرو' کیوں ہمارے Passion

(جذبات) کو ٹیسٹ کر رہے ہو؟ ضرورت ہے اس کے بعد بات آئے گی تو پھر دل میں اترے گی۔ یہ لا الٰہ بڑا ضروری ہوتا ہے۔ یہ تو بات آپ نے مان لی کہ یہ بات تو نہیں ہوسکتی' یہ تو غلط ہے۔ عزیزانِ من! یہ جتنی بھی انہوں نے یہ تفسیریں لکھیں یا ترجمے لکھے ہیں' میں کیا عرض کروں' بات وہاں یہ آجاتی ہے کہ صاحب! کیا ان میں سے کسی کو بھی عربی زبان آتی ہی نہیں "تے ایہہ نواں کتھوں جم پیا ہیگا❶" یہی وہ چیز لے آیا ہے جو ہزار برس سے نہیں ہے۔

مجھے نہ الہام ہوتا ہے' نہ کوئی وحی آتی ہے: پرویزؒ

عزیزانِ من! مجھے تو نہ کہیں وحی اور الہام کا دعویٰ ہے کہ کوئی بات جو ہزار برس سے عربی جاننے والوں کے سامنے نہیں آئی تھی' وہ اللہ میاں نے مجھے بتا دی کہ اصل بات یہ ہے۔ ٹھیک ہے میں غلام احمد (1903-1985) تو ہوں مگر مرزا غلام احمد (1835-1908) نہیں ہوں۔ یہ چیز عربوں کے ہاں موجود ہے' ان کے ہاں کی جو مستند کتبِ لغت ہیں' ان میں موجود ہے جو میں کہنے لگا ہوں۔ حیرت تو آپ کو بھی ہوگی' حیرت مجھے بھی ہوئی تھی جس دن یہ بات آئی تھی اسی لیے میں نے جلدی سے Accept (قبول) نہیں کیا تھا' بڑی تحقیق کی کہ کہیں غلطی تو نہیں ہو رہی۔ عربوں کے ہاں "حملِ امانت" کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ "امانت میں خیانت کرنا"۔❷ ہم نے ان فرائض کو' ذمہ داریوں کو' ارض و سماوات کے سامنے پیش کیا۔ انہوں نے اس امانت میں خیانت نہیں کی لیکن **وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ** (33:72) کم بخت یہ انسان' اس کے اندر خیانت کرتا ہے' یہ بڑا ہی ظالم اور جاہل ہے❸۔

حملِ امانت' امانت میں خیانت کرنے کو کہتے ہیں

میں نے اپنے "لغات القرآن" میں اس کے حوالے دیئے ہیں کہ ان کے ہاں "حملِ امانت" ان کے ہاں "امانت میں خیانت کرنے کو کہتے ہیں"۔ اب اس سے بات کتنی صاف ہوگئی۔ ہم نے ان ذمہ داریوں کو' پورے بھروسے کے ساتھ کائنات کی قوتوں کے' مظاہرِ فطرت کے' سامنے پیش کیا۔ اُنہوں نے اس امانت کو لیا اور وہ اس میں کبھی خیانت نہیں کرتے۔ وہ ڈرتے ہیں کہ اس کے خیانت کرنے کا انجام کیا ہوگا لیکن **وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ** (33:72) انسان کے ذمہ جب کچھ ذمہ داریاں' کچھ فرائض لگائے' تو یہ ان میں خیانت کرتا ہے۔ اب دیکھیے تو سہی یہ کتنا ظالم ہے' کتنا جاہل ہے! جاہل ہے اتنا بھی نہیں سمجھتا کہ میں خود اپنا نقصان کر رہا ہوں' ظالم ہے

---

❶ یہ نیا کہاں سے پیدا ہو گیا۔

❷ اس سند کے لیے تاج العروس اور محیط المحیط کے علاوہ پرویز: لغات القرآن' طلوع اسلام لاہور' دیکھیے۔ وہاں یہ معنی موجود ہیں۔

❸ اِنہ کان ظلوماً جَھُولاً (33:72)۔

اپنے آپ پہ ظلم کر رہا ہے۔

ہر ظالم اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے: اس کی صلاحیتیں ہی سلب ہو جاتی ہیں

قرآنِ کریم میں بیشمار مقامات پہ یہ آیا ہے کہ یہ جو دوسروں پہ ظلم کرتے ہیں' یہ سمجھتے ہیں کہ ہم دوسروں پہ ظلم کر رہے ہیں **وَ لٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ** (2:57) او! یہ تو اپنے آپ پہ ظلم کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ہر ظالم اپنے آپ پہ ظلم کرتا ہے گو کہ بظاہر وہ دوسرے پہ ظلم کر رہا ہوتا ہے۔ اس سے اس کی اپنی انسانیت میں کمی آ جاتی ہے' انسانیت ختم ہو جاتی ہے' وہ شرفِ انسانیت سے عاری ہو جاتا ہے' اس طرح وہ اپنے آپ پہ ظلم کرتا ہے۔ آج کے سائیکولوجسٹ سے پوچھیے۔ وہ آپ کو بتائے گا کہ یہ جو بظاہر دوسروں کے خلاف بے انصافیاں اور استبداد اور یہ سب کچھ کیا جاتا ہے' اس سے خود انسان کی اپنی Personality (شخصیت) کے اوپر کیا اثر پڑتا ہے۔ عزیزانِ من! یہ تحقیق ابھی سے شروع ہوئی ہے۔ خیانت کی یہ باتیں قرآن کہتا ہے' یہ چودہ سو سال پہلے یہ باتیں کر رہا ہے۔ کہا ہے کہ **وَ لَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ** (4:107) جو لوگ خود اپنے آپ سے خیانت کر رہے ہیں' ان کی طرف سے وکیل بن کر جھگڑنے کے لیے نہ اُٹھ کھڑے ہو' اب بھلا تو ان کے متعلق ہم سے کیا بات کرے گا۔ خیانت کرنے والا تو یہ سمجھتا ہے کہ اس سے اسے کچھ مل گیا ہے' حالانکہ اس سے اس کی ذات میں ایسی کمزوری آ جاتی ہے' جس سے اُس کی انسانی صلاحیتیں مضمحل ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اسی کو خود اپنی ذات سے خیانت کہتے ہیں **اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا** (4:107) بارگاہِ خداوندی میں اس بات کو کبھی پسند نہیں کیا جاتا۔ سو ایسے لوگ قانونِ خداوندی کی نگاہ میں کیسے پسندیدہ قرار پا سکتے ہیں؟ **خَوَّانًا** خیانت کرنے والا ہوتا ہے۔ **اَثِيْمًا** سے اثم ہے۔ ان کے ہاں **نَاقَةُ الْآثِمَه** اس اونٹنی کو کہتے تھے جو بہت جلدی تھک جائے اور بیٹھ جائے۔ کہا ہے کہ اپنی ذات کے خلاف خیانت کرتے ہو تو تمہاری صلاحیتیں اتنی کمزور ہو جائیں گی کہ سفرِ حیات کے قابل نہیں رہو گے۔ ظالم اور جاہل اپنے آپ پہ یہ کچھ کرتا ہے۔

وحی کی راہنمائی انسانی صلاحیتوں کو جلا بخشتی ہے

عزیزانِ من! استبداد کرنے والا انتہائی بزدل ہوتا ہے' اثیم ہوتا ہے' اپنے آپ پہ ظلم کر رہا ہوتا ہے' اپنے آپ سے خیانت کر رہا ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم نے جہاں کہا ہے کہ انسان یہ کرتا ہے تو ہر جگہ اس بات کو یاد رکھیے کہ انسان جب وحی کی راہنمائی کو چھوڑ کر اپنی ہی خواہشات کے تابع چلتا ہے تو وہ یہ کرتا ہے۔ اصولاً اسے یاد رکھیے کہ قرآن کو سمجھتے وقت' مطالعہ کرتے وقت' جہاں یہ آئے کہ انسان تو جاہل ہے' ظالم ہے' ضعیف ہے' تو یہ وہ انسان ہے جس کو تنہا چھوڑ دیا جائے' جو وحی کی راہنمائی میں راستہ طے نہ کرے۔ وہ تو ہے وہ انسان' اور اس

کے برعکس جو دوسرے ہیں ان کے لیے کہا ہے کہ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ (23:1) وہ کامیاب ہیں‘ ان کی کھیتیاں پروان چڑھتی ہیں۔ کسان کی کھیتی اس لیے پروان چڑھتی ہے کہ اسے قانونِ زراعت کی صلاحیت کے اوپر یقینِ کامل ہوتا ہے‘ اعتماد ہوتا ہے‘ بھروسہ ہوتا ہے۔ جبھی تو وہ بچوں کو بھوکا رکھ کر اپنے دانے مٹی میں ملا آتا ہے۔ چھ مہینے روز صبح جاتا ہے‘ شام کو خالی ہاتھ واپس آتا ہے‘ سارے دن کی محنت سے اسے ایک ٹکا نہیں ملتا۔ پھر دوسرے دن اٹھ کر وہ چلا جاتا ہے‘ چھ مہینے یہی کچھ کرتا رہتا ہے۔ وہ مومن ہے‘ اسے اس بات کا یقین ہے کہ یہ دانہ اگے گا‘ یہ فصل بڑھے گی‘ یہ جنس دے گی‘ غلہ پیدا ہوگا۔ اس کے برعکس وہ بھی تو انسان تھا جو وحی کی روشنی کو چھوڑ کر اپنی ذات کے ساتھ خیانت کرتا تھا۔

عہد کی اہمیت کو نظر انداز کرنا اپنی ذات سے خیانت کرنا ہے

کہا ہے کہ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ (23:8) مومن یہ ہیں جو اپنی امانات اور اپنا جو عہد کسی سے کیا ہوتا ہے‘ اس کی نگہداشت کرتے ہیں۔ یہاں دو الفاظ آئے ہیں: امانات اور عہد۔ یہ ان دونوں کی بڑی نگہداشت کرتے ہیں۔ امانت تو میں نے کہا ہے وہ ہے کہ جو کوئی دوسرا ذمہ داری عائد کرے‘ دوسرا اپنی چیز اس کو دے کہ اس کی حفاظت کرو‘ دوسرا اس کے اوپر بھروسہ کرے۔ یہ تو وہ دوسرا ہے جو آپ کے ساتھ یہ کرتا ہے لیکن جب آپ یہ عہد کرتے ہیں‘ مثلاً کہا جاتا ہے کہ صبح کی سیر تمہاری صحت کے لیے اچھی ہے‘ آپ سوتے وقت عہد کرتے ہیں کہ میں صبح پانچ بجے اٹھونگا اور سیر کو جاؤنگا۔ یہ آپ نے اپنے اوپر خود ایک ذمہ داری عائد کی ہے‘ یہ بھی امانت ہے۔ یہاں قرآن دو الفاظ استعمال کرتا ہے: امانت اور عہد۔ سوچیے کہ اس میں کیا فرق ہے؟ یہی نہیں کہا کہ جو دوسرا تمہارے اوپر فرائض یا ذمہ داریاں عائد کرے‘ تم خود بھی اپنے اوپر ذمہ داریاں عائد کرتے ہو‘ اپنا فرائض سمجھتے ہو‘ ان کا نبھانا بھی بڑا ضروری ہے۔ میں نے کہا ہے کہ آپ اپنے آپ سے عہد کرتے ہیں کہ میں صبح پانچ بجے اٹھونگا۔ سردیوں کی رات ہے‘ لحاف اوپر لیا ہوا ہے‘ آپ نے ٹائم پیس کے اندر الارم بھی لگا لیا‘ وہ کر کر بھی کر رہا ہے‘ ذرا سر باہر نکالا تو کچھوے کی طرح جھٹ سے لحاف کے اندر ہو گئے کہ ابھی تو پانچ ہی بجے ہیں‘ ابھی تو بڑا وقت ہے‘ چھ بجے اٹھیں گے۔ چھ بھی بج گئے۔ اُٹھتے ہو تو کہتے ہو کہ کل سے سہی‘ آج سے ہی ضروری نہیں ہے۔ عزیزانِ من! یہ آپ اپنے اوپر عائد کردہ ذمہ داری سے خیانت کر رہے ہیں۔ یہ عہد کرنے کے بعد کہ میں صبح پانچ بجے اٹھونگا‘ کون اٹھتا ہے؟ وہ کہ جسے اپنے آپ پہ بھروسہ اور اعتماد ہوتا ہے۔ یہ Self Confidence (خود اعتمادی) کی چیز ہے۔

بدعہدی سے انسان Self Confidence (خود اعتمادی) کی نعمت سے محروم ہو جاتا ہے

دو قسم کے Confidence (اعتماد) ہیں: ایک وہ ہے جو دوسرا آپ کے اوپر کرے یعنی With Confidence

(اعتماد کے ساتھ) وہ کوئی چیز آپ سے کہتا ہے اور ایک وہ ہے جو خود آپ کا اپنی ذات پہ ہے۔ قانونِ خداوندی کہتا ہے کہ کبھی اگر تمہاری ذمہ داری میں کہیں کوتاہی ہوئی ہے تو اب ہم ہیں' اس کا ازالہ ہو سکے گا' اس کی ندامت بھی ہو جائے گی' کچھ توبہ بھی ہو جائے گی لیکن یہ جو تمہارے اندر اپنے اوپر عائد کردہ فریضہ ہے' اُس سے جو تم نے خیانت برتی ہے' تو اس سے تمہارے اندر اتنی کمزوری پیدا ہو جائے گی کہ Self Confidence (خود اعتمادی) ہی نہیں رہے گا اور جب Self Confidence (خود اعتمادی) نہیں رہتا تو تم ختم ہو گئے۔ یہ جو عہد ہے قرآن نے کہا ہے کہ یہ Self Confidence (خود اعتمادی) ہے' یہ کوئی دوسرا آپ کے اوپر فریضہ عائد نہیں کرتا' یہ آپ خود اپنے اوپر فریضہ عائد کرتے ہیں۔ کہا ہے کہ Self Confidence (خود اعتمادی) ختم ہو جائے گا' تو تمہیں اپنی ذات پہ اعتماد نہیں رہے گا۔ عزیزانِ من! میں کیا کچھ بیان کرتا جاؤں کہ Self Confidence (خود اعتمادی) کیا چیز ہے' یہاں تو وقت بھی ختم ہو گیا ہے۔

جانے کہ دادند دیگر نگیرند

خدا نے جو تمہیں یہ جان دیدی ہے' زندگی دیدی ہے' وہ اسے واپس نہیں لیتا' اس نے تو دیدی ہے' اس نے اسے واپس لے کر کیا کرنا ہے! وہ واپس نہیں لیتا۔

آدم بمیرد از بے یقینی

آدمی مرتا ہے تو اپنی بے یقینی کے ہاتھوں مرتا ہے۔ جب اس میں Self Confidence (خود اعتمادی) ختم ہو جاتا ہے تو یہ موت ہے۔ اس لیے اس نے کہا ہے کہ مومن اپنی ذات پہ بھی اعتماد کرنے والا ہے' خدا پہ بھی اعتماد کرنے والا ہے اور جب جماعتِ مومنین ہو گی تو پھر ایک دوسرے کے اوپر اعتماد کی جو شکل ہو گی تو وہ کیسی جنت کا سماں ہو گا! اتنا یقین کہ کبھی خیانت نہیں کرے گا۔ اپنی ذات کے ساتھ جو تم نے عہد کر رکھا ہے' یہ وہی نبھا سکتا ہے جس میں Self Confidence (خود اعتمادی) ہے۔ جتنا زیادہ اس طرح سے اپنے اوپر عائد کردہ ذمہ داریوں کو نبھاتے چلے جاؤ گے' Self Confidence (خود اعتمادی) اتنا ہی بڑھتا چلا جائے گا۔ جتنا یہ بڑھتا چلا جائے گا اتنا ہی زیادہ تم زندہ ہو گے۔ یہ جو قرآن نے کہا ہے کہ یہ امانت جو تم نے اپنی ذات کے اوپر عائد کر کے لے لی ہے' اس میں بھی خیانت نہ کرو۔

انسان کی اپنی ذات کے متعلق نیٹشے کا ایک قول

عزیزانِ من! یہ وہی کچھ ہے جو میں نیٹشے (1844-1900) کا قول دہرایا کرتا ہوں۔ وہ بڑے خوبصورت انداز میں کہہ گیا

ہے کہ ''جو برائی تم نے میرے ساتھ کی ہے' جو خیانت تم نے میرے ساتھ کی ہے' اس کو تو میں تمہیں معاف کر دونگا لیکن اس سے جو تم نے اپنے خلاف خیانت کی ہے' اسے کون معاف کرے گا''۔ عزیزانِ من! معاف کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس ازالے کو' اس نقصان کو' تم نے خود ہی پورا کرنا ہے۔ کہا ہے کہ کائنات کی قوتیں مجبور پیدا کی گئی ہیں' ان کو اختیار وارادہ نہیں دیا گیا لیکن انسان کو صاحبِ اختیار وارادہ بنایا تھا کہ یہ ازخود اپنے اوپر یہ چیزیں عائد کرے اور پھر ان کے اندر خیانت نہ کرے تا کہ اس کا Self Confidence (خوداعتمادی)' اس کی انسانیت' اس کا شرفِ آدمیت' احترامِ آدمیت' بڑھتا چلا جائے۔

اپنی ذات سے خیانت کرنے والا قرآنِ حکیم کی نظر میں منافق ہے' مشرک ہے

یہ جو اس میں خیانت کرتا ہے تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ کہا ہے کہ **لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتِ وَ الْمُشْرِكِيْنَ وَ الْمُشْرِكٰتِ** (33:73)۔ یہ ایک تو منافق ہے' مرد ہو یا عورت' آپ سے کہتا ہے کہ میں چار بجے آپ سے ملونگا اور اسی وقت دل میں ہوتا ہے کہ اس وقت تو کسی طرح بلا ٹل جائے' بعد میں دیکھا جائے گا۔ منافق ہے جو اپنے عہد سے پھرتا ہے۔ دوسرا مشرک ہے' مرد ہو یا عورت جو بیک وقت دو سے عہد کرتا ہے: اُس سے بھی کرتا ہے' اپنے آپ سے بھی کرتا ہے' لوگوں سے کچھ کہتا ہے' اپنا Interest (مفاد) کچھ اور ہوتا ہے' دو Interests (مفادات) سامنے رکھتا ہے۔ کہتا ہے کہ انسان جو امانت میں خیانت کرتا ہے' تو وہ یہ کچھ ہوتا ہے اور اس کی سزا بہر حال بھگتتا ہے۔

سفرِ زندگی میں کسی لغزش یا تساہل کے احساس کی شکل میں خدا کا قانون انسان کے ساتھ ہوتا ہے

اس کے برعکس جو مومن ہے' مرد ہو یا عورت اس نے اعتماد کیا' ہم نے اس کو بھی ذمہ داریاں سونپیں' ہوسکتا ہے کہ اس میں کبھی کوتاہی ہو جائے' تساہل ہو جائے' تغافل ہو جائے تو اس کے لیے کہا کہ **وَ يَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ** (33:73) یہ جو بھروسہ کرنے والے تھے' کبھی کبھی کسی قسم کی کوئی لغزش' کوئی تساہل ہو گیا ہے تو کوئی بات نہیں' اگر ہم آگے نکل گئے ہیں اور تم تھک کر پیچھے رہ گئے ہو' تو تم اس سفر میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرو گے' ہمیں آواز دو' ہم یہ نہیں کریں گے کہ بھاگ کر تم سے مل جائیں' ہم پیچھے ہٹ کر تمہارے ساتھ چلیں گے کہ آؤ بیٹا! ہمارے ساتھ چلو۔ اور پھر اب جو اُس کے بعد ہے' وہ تو عجیب بات ہے۔ اگر جتنا قدم یہ اٹھاتا ہے اتنا ہی قدم وہ اٹھائے تو پھر تو یہ ملنے کی بات نہیں ہوگی۔ انسان کو قرآن نے ہمیشہ ''تائب'' کہا ہے یعنی پھر پلٹ کر ہمیشہ اسی قدم سے آنے والا۔ خدا کو اس نے ہمیشہ ''تواب'' کہا ہے یعنی تم ایک قدم چلو' ہم دو قدم پلٹ کر آئیں گے۔ تم اس کا احساس تو کرو کہ اس خیانت سے کچھ نقصان ہوا ہے' ہم یوں تمہارا نقصان پورا کریں گے' ہمارے انعامات کا سحاب کرم جھوم کر آئے گا۔ ہاں! اگر

کہیں سہو وخطا سے کوئی لغزش ہو جائے تو **وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا** (33:73) جو نقصان ہوا ہے اس سے تمہاری حفاظت بھی کریں گے اور اس خیانت سے جو تمہاری نشوونما میں کمی آئی ہے' وہ بھی ہم پوری کریں گے' ہم تو ''تو ّاب'' واقع ہوئے ہیں۔ یہ بات اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان صاحبِ اختیار وارادہ ہو۔

عزیزانِ من! یہ ہے اس آیہ جلیلہ کا مفہوم جو قرآنِ کریم کی رو سے میری سمجھ میں آیا ہے۔ اب آپ سوچ لیجیے کہ جب قرآن سے قرآن سمجھا جائے تو پھر بات سمجھ میں آتی ہے۔ سورۃ الاحزاب تو آج ختم ہوگئی۔ آئندہ درس میں ہم سورۃ سبا' 34 ویں سورۃ' لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

❀❀............❀❀............❀❀

سُــورَةُ السَّجْدَةِ

پہلا باب: سورة سبا (آیات 1 تا 5)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج فروری 1980ء کی 22 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ سبا سے ہوتا ہے: (34:1)۔

حضرت انسان کے علاوہ کائنات کی کوئی شے بھی خدا کی طرف سے مقرر کردہ قانون سے سرتابی اختیار نہیں کرتی

آپ کو یاد ہوگا کہ سورۃ الاحزاب کی آخری دو آیات کے لیے ہم نے پچھلا پورا درس وقف کیا تھا۔ اس کی 72 ویں آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ ہم نے اپنی امانت کو زمین و آسمان اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا۔ مروجہ تراجم اور تفاسیر کی رو سے' انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور انسان نے اٹھا لیا۔ یہ بات تو واضح ہوگئی تھی کہ یہ ترجمہ اور تفسیر خود عربی لغت کی رو سے بھی اور قرآن کے مفہوم کی رو سے نہ صرف غلط ہے بلکہ خدا کے متعلق' کائنات کے متعلق' انسان کے متعلق' اتنا خلافِ قرآن تصور پیدا کرتا ہے کہ اس کی وجہ سے بہت ہی غلط فہمیاں اور پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں ۔ میں نے اس کا صحیح مفہوم بیان کیا تھا کہ کائنات کی کوئی شے

بھی قانونِ خداوندی سے سرتابی کرنے کی مجال نہیں رکھتی اوراس کے لیے متعدد مقامات پیش کیے تھے۔ وہ مثال کے طور پر یونہی دو چار مقامات تھے ورنہ سارا قرآن اس سے بھرا پڑا ہے۔ اوراس کے بعد اگلی ہی سورۃ سبا کی جو پہلی ہی آیت ہے' وہ خود اس کی تفسیر کرتی ہے کہ اشیائے کائنات میں یہ بات ہی نہیں ہے کہ وہ خدا کی امانت اٹھانے سے انکار کردیں یا اپنے فرائض کی سرانجام دہی سے انکار کردیں' جو ذمہ داریاں انہیں سونپی گئی ہیں' وہ ان کی ادائیگی میں کسی قسم کی کوتاہی کریں' تساہل برتیں' انکار اور سرکشی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم کی ان سورتوں میں بھی عجیب ربط اور ترتیب ہے۔ آخری آیت وہ تھی اور اس آیت کی صحیح تفسیر اگلی سورۃ سبا کی پہلی آیت میں ہوجاتی ہے۔

کہا ہے کہ **اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ** (34:1)۔ یہ پہلی ہی آیت اس کی تفسیر کررہی ہے۔ یہ جو **لَهٗ** ہے خواہ اس کے معنی ملکیت کے کیجیے یا یہ کہ اس کے پروگرام کی تکمیل کے لیے یہ تمام اشیائے کائنات سرگرمِ عمل رہتی ہیں تو دونوں صورتوں میں یہ بات ہوگئی کہ اشیائے کائنات میں سے کسی کو یہ مجال نہیں کہ وہ خدا کے عائد کردہ فرائض کی سرانجام دہی میں سرتابی برتیں یا تساہل برتیں۔ کہا ہے کہ **لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ** (34:1) یہ عجیب چیز ہے اگرچہ یہ قاعدہ کلیہ تو نہیں لیکن عربی زبان میں عام طور پہ ''ما'' غیر جانداروں کے لیے آتا ہے اور ''من'' کے اندر جاندار بھی شامل ہوتے ہیں۔ من کے اندر تو انسان بھی شامل ہوجائیں گے پھر اس کی تو صورت یہ ہے کہ یہ اس امانت میں خیانت کرتا ہے جبکہ اشیائے کائنات نہیں کرتیں۔ جہاں **مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ** ہے تو وہ اشیائے کائنات کے متعلق ہے۔ ایسی آیات آئیں گی' جہاں الگ انسانوں کے متعلق ہوگا کہ یہ کیسے سرکشی کرتا ہے۔ بعض آیات میں یہ ہوگا کہ اشیائے کائنات نے تو کبھی بھی سرتابی نہیں برتی۔ انسانوں میں سے بعض اس کو تسلیم کرتے ہیں' بعض اس سے انکار کرتے ہیں۔ یہ واقعاتی چیزیں ہیں جو قرآن کے اندر آئی ہوئی ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ **لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ وَ لَهُ الْحَمْدُ** (34:1) یہ جو کارگہ کائنات کا سلسلہ اس حسن و ترتیب سے چل رہا ہے' اس کے اندر ایسا عمدہ نظم ونسق ہے کہ جو لوگ بھی اس کے اوپر غور وفکر کرتے ہیں' ان کی زبان پہ بے ساختہ تحسین و آفریں کا نعرہ بلند ہوجاتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ''حمد'' کے متعلق میں نے پہلے بھی یہ بتایا تھا اور یہ بات تو قرآن کی پہلی ہی آیت میں ہے جہاں سے الحمدللہ سے بات شروع ہوتی ہے۔ حمدیت کے معنی کے لیے ہم عام جو تعریف کرتے ہیں تو وہ یہ ہے کہ سب تعریف خدا کے لیے ہے۔ تعریف کرنا اس لفظ کے معنی نہیں ہوتا' اس کے لیے تو ''مدح'' کا لفظ ہے' ثناء کا لفظ ہے۔

اس پوری کائنات کا ذرہ ذرہ حمدیت کا مظہر ہے

کسی تخلیق کرنے والے کے شاہکار کو جو تکمیل تک پہنچا ہو اور اتنا حسین اور منفعت بخش ہو کہ اسے دیکھ کر بے ساختہ زبان پر تحسین کا نعرہ بلند ہو بے ساختہ 'واہ واہ' نکلے اسے الحمد کہتے ہیں۔ اب کارگۂ کائنات پہ غور کیجیے تو اس میں آپ کو یہ حمدیت ہی نظر آئے گی لیکن اس میں آگے ایک لفظ ہے: فِي الْاٰخِرَةِ (34:1)۔ یہ بڑی عجیب چیز قرآن کہہ گیا ہے۔ کائنات میں بہت سی چیزیں آپ کو ایسی نظر آئیں گی جنہیں آپ دیکھیں گے تو کہیں گے کہ صاحب! اس سے تو شر ہی پیدا ہوتا ہے' تکلیف ہی پیدا ہوتی ہے۔ سانپ کے متعلق کون کہے گا کہ ''اس کو اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے اور سبحان اللہ کیا بات ہے''! نظر بظاہر ایسی چیزیں آتی ہیں جیسے گرمی آ رہی ہے' یہ بھڑیں نکلیں گی۔ اس قسم کی چیزوں کے بارے میں ہمارے ذہنوں میں تو یہ ہے کہ ان کا تو فائدہ ہی نظر نہیں آتا کیونکہ ہم نے کبھی غور نہیں کیا' تحقیق نہیں کی لیکن جنہوں نے اس پہ تحقیق کی ہے' وہ یہ بتاتے ہیں۔ اگلے دنوں پاکستان ٹائمز میں ایک محقق کا آرٹیکل نکلا تھا' جس میں اس نے سانپوں کی قسمیں بھی گنائی تھیں اور اس نے یہ کہا تھا کہ ان سے اپنی حفاظت کا سامان کیجیے لیکن ان کو تلف نہ کیجیے۔ اس نے بتایا تھا کہ یہ سانپ کس کس قسم کے کیڑوں کو' جراثیم کو' چیزوں کو' تلف کرتے ہیں کہ اگر وہ زندہ رہیں تو کھیتی میں تمہارے لیے کھانے کو کچھ نہ ملے۔

میرا ایک ذاتی واقعہ جس سے مجھے دوبارہ زندگی ملی: پرویزؒ

یہ تو شاید آپ کو یاد ہوگا میرا جو ذاتی واقعہ تھا کہ جب میرا آپریشن ہوا ہے تو اس کے بعد ایک ایسی صورت پیدا ہوگئی تھی کہ اس میں بالکل جان کے لالے پڑ گئے۔ ہمارے عزیز و محترم ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب (1908-2001ء) نے یہ کیا تھا۔ وہ وقت آ گیا تھا کہ ان کے گھر کی بچیوں نے بھی جاءنماز بچھا لیے تھے آخری صورت پیدا ہوگئی تھی۔ کچھ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ اس کے بچنے کی کوئی صورت ہو سکے گی۔ اس وقت انہوں نے ایک انجکشن دیا' وہ آخری چیز تھی' اس سے سنبھالا ہو گیا اور زندگی بچ گئی۔ میں نے بعد میں انہیں پوچھا تھا کہ ڈاکٹر صاحب! اتنی مایوسی کے بعد یہ کیا چیز تھی جو کارگر ہوگئی۔ کہنے لگے کہ یہ سانپ کے زہر کا انجکشن تھا جو آخری تدبیر ہو سکتی تھی۔ اس وقت میرے ذہن میں وَ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاٰخِرَةِ (34:1) آیا۔ میں نے کہا کہ کیا بات کہہ گیا ہے قرآن! یونہی نظر بظاہر پہلی چیز جو ہم دیکھتے ہیں تو ہمارے سامنے یہ Evil (شر) نظر آتے ہیں' ان کی خرابیاں ہی نظر آتی ہیں۔ تحقیق کرنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ آخرالامر یہ چیزیں بھی Evil (شر) نہیں ہیں۔ اُس نے تو اپنے متعلق کہا ہے کہ بِيَدِكَ الْخَيْرُ (3:26) اُس کے ہاتھ میں تو خیر ہی خیر ہے۔ یہ جو چیزیں جن کو ہم شر کے پہلو میں دیکھتے ہیں' ہم اس کے خیر کے پہلو تک پہنچتے نہیں

ہیں تو یہ جتنی بظاہر ہمیں شر نظر آتی ہیں' ان کو ذرا آگے چل کر دیکھیں تو تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ یہ خیر ہوتی ہیں۔

انسانی زندگی میں مہلت کا وقفہ بھی ایک نعمت ہے

اسی طرح سے انسانوں کی دنیا کے اندر بھی جو یکسر شر نظر آتا ہے' استبداد ہے' یہ سلب ونہب (Exploitation) ہے یہ ظلم ہے۔ عام طور پہ لوگ کہتے ہیں کہ صاحب! خدا اگر ایسا ہی عادل ہے' خدا ایسا ہی قادر ہے تو ان کو روک کیوں نہیں دیتا۔ اُس نے اس کے لیے ایک نظام بنا رکھا ہے' ایک مہلت کا وقفہ ہوتا ہے اور یہ بھی اس کا خیر کا پہلو ہے کہ وہ فوراً گلا نہیں دبا دیتا کہ ذرا سی غلطی ہوئی اور ختم کر دیا اور ہلاکت کر دی۔ وہ اس دوران میں اس کو مہلت کا وقفہ دیتا ہے' اس امر کی گنجائش دیتا ہے کہ اپنی اصلاح کر لو' بچ جاؤ گے لیکن اگر اس سے کوئی عبرت نہیں پکڑتا' اپنی اصلاح نہیں کرتا' جسے کہتے ہیں کہ پلٹ کر صحیح راستے پہ نہیں آتا تو پھر رفتہ رفتہ اس کا جو Accumulative Effect (مجموعی اثر) ہے' وہ بارگراں اتنا زیادہ بن جاتا ہے کہ پھر وہ اس کی تباہی اور موت کا باعث بن جاتا ہے۔ اور جب اس وقت اس کی تباہی آتی ہے تو سوال یہ ہے کہ یہ حمدیت کیا ہے۔ کہا کہ **فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ** (6:45) تو اس طرح سے خدا نے ان ظالمین کی جڑ کاٹ دی اور دیکھو کہ کس طرح سے خدا کے لیے حمدیت ہے۔ ظالم کی جڑ کٹ جانا مظلوم کے لیے وجۂ حمدیت ہوتا ہے لیکن یہ فوری نہیں ہو جاتا۔ اس نے اپنے نظام کے اندر ایک مہلت کا وقفہ رکھا ہے۔ یہ بھی اس کے خیر ہونے کی بہت بڑی دلیل ہے۔ اور یہ بات ہے جس کے لیے انتظار کرنا چاہیے' جلدی سے فیصلہ نہیں کر گزرنا چاہیے۔ انتظار کیجیے' یہ اس کے دونوں پروسیس ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے اپنے مخالفین سے کہا تھا کہ تم بار بار اس کے متعلق کہتے ہو کہ وہ جلدی سے کیوں نہیں آتا۔ اُنہوں ﷺ نے کہا کہ ذرا ٹھہرو **اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ** (6:136) تم اپنی جگہ اپنے پروگرام کے مطابق عمل کرو' **اِنِّیْ عَامِلٌ** (6:136) میں اپنی جگہ اپنے پروگرام پہ عمل کرتا ہوں' میں نہ تمہارے پروگرام میں دخل دونگا' نہ تم میرے پروگرام میں دخل دو۔ **فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ** (6:136) عنقریب بات سامنے آ جائے گی کہ کس کا پروگرام خیر کا پہلو لیے ہوئے ہے' خوشگواریاں اس کے نتائج ہونگے اور کس کا پروگرام تباہی کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ بات نظر آ جائے گی لیکن پروگرام پر عمل تو کرنے دو۔ یہ ہے **وَ لَهُ الْحَمْدُ فِی الْاٰخِرَةِ** (34:1)۔ پروگرام کے آخر تک پہنچنے کے بعد نتائج نکلتے ہیں' اسے Pragmatic Test (نتائجی آزمائش) کہتے ہیں کہ کسی فارمولے کو لیبارٹری میں لے جا کر' اس پہ عمل کرکے' پھر انتظار کرکے' آخر میں دیکھو کہ وہ کیا نتیجہ برآمد کرتا ہے۔

ظلم کے مقابلے میں، کسی تعمیری پروگرام کی تکمیل کی خاطر، استقامت ہمیشہ ثمر بار ثابت ہوتی ہے

اس نے کہا یہ ہے کہ ہم جو پروگرام تمہیں دے رہے ہیں، ابتداًاس کے اندر مشکلات ہونگی لیکن ان مشکلات میں اصول یہ ہے کہ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا (94:5) اور پھر Repeat (دہرایا) کیا کہ یاد رکھو! اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا (94:5) ابتدا میں مشکلات ہونگی، صعوبات ہونگی، مخالفتوں کا ہجوم ہوگا، بڑی تکالیف ہونگی ۔ یہ سب کچھ ہوگا اگر ان کا استقامت سے مقابلہ کرتے چلے جاؤ گے تو اس کے بعد تم دیکھو کہ آخرالامر کامیابی تمہاری ہوگی، حق کی کامیابی ہوگی، آسانیاں پیدا ہوں گی ۔ یہ ہم جو درمیان میں چھوڑ دیتے ہیں، وہ ہماری استقامت نہیں ہوتی، ہم تھک جاتے ہیں، یا تنگ آجاتے ہیں یا مایوس ہوجاتے ہیں ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس پہ ہمارا ایمان نہیں ہوتا کہ آخرالامر اس نے کامیاب ہونا ہے ۔ چار قدم چلنے کے بعد ہم یہ کہتے ہیں کہ نہیں صاحب! اس میں تو مصیبتیں ہی مصیبتیں ہیں، مشکلات ہی مشکلات ہیں ۔ اگر یہ صورت ہے تو پھر تو ٹھیک ہے کہ شر کی قوتیں آپ کے اوپر غالب آتی جائیں گی ۔ اور اگر آپ استقامت کے ساتھ ان کا مقابلہ کرتے چلے جائیں گے اور استقامت اس یقین کے ساتھ نصیب ہوگی کہ یہ جو خدا نے پروگرام دیا ہے، اس کی ابتدا میں تو مشکلات ضرور ہیں لیکن بالآخر اس خارہ شگافی کے بعد یہ شیریں دودھ کی نہر، ضرور نکلے گی ۔ اگر انسان کا یہ یقین ہو تو پھر استقامت ہوتی ہے اور استقامت اس نے شرط قرار دی ہے ۔ کہا ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِکَةُ (41:30) جو یہ اقرار کرتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اپنے اس ایمان پر جم کر کھڑے ہوجاتے ہیں، استقامت ہوتی ہے، مسلسل اس کے اوپر قائم رہتے ہیں، تو آخرالامر وہ دیکھیں گے کہ ان کے اوپر ملائکہ کا نزول ہونا شروع ہوجاتا ہے، ان کے اوپر فرشتے اترتے ہیں بشرطیکہ استقامت ہو ۔ یہ جو استقامت ہے، یہ جو حق پر مبنی پروگرام ہے یا حق اور باطل کے اندر جو تخاصم اور تزاحم ہوتا ہے، اس میں یہ انتظار کرنا ضروری ہوتا ہے کہ پروگرام تکمیل تک پہنچ جائے تو پھر اپنے جو نتائج پیدا کرے گا وہ حق پر مبنی پروگرام کے سارے دعاوی کو سچا کر دکھائے گا ۔ کہا کہ وَ لَهُ الْحَمْدُ فِی الْاٰخِرَةِ (34:1) اسی طرح کائنات میں بھی جتنی چیزیں بظاہر نظر آتی ہیں کہ یہ بڑی نقصان دہ ہیں، ضرر رساں ہیں، ان کا تو فائدہ ہی کچھ نظر نہیں آتا، ذرا ان کے متعلق تحقیقات کیجیے تو وہاں آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ چیزیں جو بظاہر ہمیں ضرر رساں نظر آتی تھیں، جو فی الاخرة ہیں، آخرالامر ان کو اگر دیکھیے گا تو یہ خیر کا پہلو لیے ہوئے ہونگی ۔ کائنات کی کوئی شے کسی صورت میں آخرالامر شر کا پہلو اپنے اندر نہیں رکھتی ۔ یہ شر تو ہمارے پیدا کردہ ہوتے ہیں، خدا کے نہیں ہوتے ۔ وہ جو میں کہا کرتا ہوں:

میرے ساقی نے عطا کی ہے مے بے درد و صاف
رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانے کا ہے

یہ تو ہم ہیں جو اپنی عجلت سے' بے صبری سے' انتظار نہ کرنے کی وجہ سے' درمیان میں اس کو چھوڑ دیتے ہیں' پھر وہ شر غالب آ جاتا ہے۔ اگر تھوڑی سی بھی ہمت اور حوصلہ سے اور صبر سے اور استقامت سے کام لیا جائے تو سوال ہی نہیں ہے کہ باطل حق پر کبھی بھی غالب آ جائے۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے ملنے والا پروگرام الحمد فی الاخرۃ Trial & Error (سعی وخطا) کی خامیوں سے ہمیشہ مبرا ہوتا ہے

کہا ہے کہ وَ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاٰخِرَةِ (34:1) اور جب اس پورے سلسلۂ کائنات کے مجموعی پروگرام کے آخری نتائج پر غور کیا جائے' تو وہ اس کی حمد وستائش کا آئینہ دار نظر آئے گا اور وہ اس لیے ہے کہ وَ هُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ (34:1) اُسے معلوم ہوتا ہے' یہ بات نہیں ہے کہ اس نے ایک پروگرام دیدیا ہے اور اس کو معلوم ہی نہیں ہے کہ انجام کار اس کا نتیجہ کیا نکلنا ہے۔ جیسے Trial & Error (سعی وخطا) کی بنا پہ تم تجربے کرتے چلے جاؤ' وہ غلط نکلے گا' پھر دوسرا تجربہ لے لینا' پھر کوئی دوسرا عمل اختیار کر لینا' ٹھیک نکلے گا تو ٹھیک ہے' پھر کوئی اور سہی۔ ایسی چیزیں کوئی بے خبر تو کر سکتا ہے' جو خبیر اور باخبر ہے' سوال ہی نہیں ہے کہ وہ اس طرح سے آپ کو Trial & Error (سعی وخطا) کی بنا پر کوئی تجرباتی چیزیں دیتا چلا جائے لیکن خبیر کے ساتھ وہ الحکیم بھی ہے۔ یہ اس کی حکمت کا پہلو ہے کہ اس کے لیے اس پورے پروسیس (عمل) سے گزرنا پڑتا ہے' اس لیبارٹری کے ٹیسٹ میں سے یا تجربے سے گزرنا پڑتا ہے۔ آخر میں جا کر پھر یہ نظر آتا ہے کہ اُس خبیر نے صحیح ہی کہا تھا کہ وہ خبیر ساتھ الحکیم بھی ہے۔ قرآن پیش پا افتادہ مثالیں دیدیتا ہے کہ چودہ سو سال پہلے کا عرب کا بدو بھی سمجھے اور آج کا سائنٹسٹ بھی سمجھے۔

عزیزانِ من! آگے کہا ہے کہ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَ مَا يَخْرُجُ مِنْهَا (34:2)۔ کسان کو دیکھیے! کاشت کرنے کے لیے خاص طور پر وہ نہایت اچھا عمدہ دانہ بیج Select (منتخب) کرتا ہے۔ جو روزمرہ کے کھانے میں بھی بہترین غلہ اور اناج ہوتا ہے' وہ بیج اس کے لیے سلیکٹ کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے Select (منتخب) کیے ہوئے دانے ہوتے ہیں اور وہ باہر جا کر مٹی میں ملا آتا ہے۔ وہ ہر روز صبح جاتا ہے درانتی اور رسی لیے ہوئے' سارا دن اس کھیت میں محنت کرتا ہے' شام کو اسی طرح سے باہیں لٹکائے ہوئے واپس آ جاتا ہے۔ ایک پیسہ بھی اس کو نہیں ملتا' روٹی کا ایک ٹکڑا بھی نہیں ملتا' مشقت ہی مشقت ہے' محنت ہی محنت ہے' بظاہر بلا معاوضہ محنت ہے۔ اب اس کو آخر تک پہنچانے کے لیے استقامت کی ضرورت ہے کہ وہ روز یہ کرے' راستے میں تھک کر نہ بیٹھ جائے۔ اس پروگرام نے اپنا ایک وقت لینا ہے۔ یہ جو اس نے گیہوں بویا ہے' اس نے چھ مہینے کے بعد جا کر فصل بننا ہے۔ اب اس کو چھ مہینے تک استقامت سے اسی پروگرام کے اوپر کارفرما رہنا پڑے گا۔ روز جانا ہوگا' روز بغیر کسی معاوضے کے واپس آنا ہوگا۔

یہ کسان روز کیوں چلا جاتا ہے؟ اس لیے کہ اُسے اس پر ایمان ہے کہ اگر میں نے اس قاعدے کے مطابق اس پودے کی پرورش کی تو ایک ایک دانے کے بدلے میں سات سات سو دانے مجھے ملیں گے۔ یہ اس کا ایمان ہے کہ وَ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاٰخِرَةِ (34:1) آخرِ کار اس کا نتیجہ وہ برآمد ہوگا' جو وجہِ حمد و ستائش ہوتا ہے۔

عدمِ استقامت کا عمل خیر کو شر میں بدلنے کا موجب بن جاتا ہے

کہا ہے کہ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَ مَا يَخْرُجُ مِنْهَا (34:2)۔ یہ پیش پا افتادہ روزمرہ کی مثال کی بات ہے۔ اگر وہ درمیان میں چھوڑ دے تو کچھ ملنا تو ایک طرف' وہ بیج بھی ضائع گیا' محنت بھی ساری ضائع گئی۔ اس سے زیادہ شر اور کیا ہوتا کہ اچھا بھلا بیج بھی ضائع جائے اور اتنے مہینوں کی محنت بھی ضائع چلی جائے! وہ اس لیے نہیں ہے کہ خدا نے یہ شر پیدا کیا ہے بلکہ یہ اس کا عدمِ استقامت ہے جس کی وجہ سے وہ خیر' شر کے اندر بدل گیا ہے۔ ذرا اور ہمت کرے' تھوڑا سا اور صبر سے کام لے' چار دن چار مہینے اور اسی طرح سے محنت کرے تو وَ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاٰخِرَةِ (34:1) ہوگا۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ روزمرہ کی بات ہے۔ اس سے آگے بڑا نظام ہے' کہتا ہے کہ وَ مَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَ مَا يَعْرُجُ فِيْهَا (34:2) یہ زندگی کا پروسیس تمہاری ہی زندگی کا نہیں' ہر جاندار کی زندگی کا ہے۔ جانداروں کے اندر یہ پودے نباتات بھی شامل ہیں' ان کی زندگی کا مدار پانی پر ہے۔ کہا ہے کہ تمہارے ہاں کرہ ارض کا 3/4 حصہ تو پانی ہے' خشکی 1/4 حصہ ہے۔

سمندر کے کڑوے پانی کو خیر ثابت کرنے کے لیے زمین سے تیرہ لاکھ گنا بڑے سورج کی تخلیق

کہا گیا ہے کہ اتنی فراوانی سے پانی تمہارے پاس موجود ہے لیکن ذرا اس سمندر میں سے ایک گھونٹ پانی کا پیجیے تو وہ وجہِ حیات بننے کی بجائے باعثِ موت بن جاتا ہے۔ جسے کہا ہے کہ وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (21:30) ہر زندہ شے جو ہے' وہ تو پانی سے بنتی ہے' پانی پہ زندگی کا مدار ہے۔ جہاں پانی کا نشان ہو تو وہاں یہ چیز Believe (یقین) کی جاتی ہے کہ واقعی یہاں زندگی ہوگی لیکن اُس نے کہا ہے کہ اتنا فراوانی سے پانی تمہارے ہاں سمندر میں موجود ہے اور جو سارا پانی ہے' وہ تو باعثِ ہلاکت ہوتا ہے۔ یہ جو تمہارے سامنے پڑا ہوا پانی ہے' وہ وجہِ حمدیت یوں نظر نہیں آتا لیکن وہ کہتا ہے کہ ذرا اس پروسیس کے اوپر تو غور کیجیے کہ یہ پروسیس کتنا لمبا ہوتا ہے۔ اس کے لیے ایک سورج بنایا' سورج میں حرارت بھی دی اور روشنی بھی دی' اس کا نظام یہ بنایا کہ وہ سمندر پہ چمکتا ہے۔ وَ مَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَ مَا يَعْرُجُ فِيْهَا (34:2) تم ذرا غور تو کرو کہ تمہارے لیے زندگی بخش سامان پیدا کرنے کے لیے ہم نے یہ نظام کیوں بنایا ہے۔ وہ سارے ہلاکت آمیز جتنے بھی عناصر پانی کے اندر ہوتے ہیں' وہ نیچے رہ

جاتے ہیں اور اس میں سے کشید کیا ہوا جو پانی ہے' سورج کی کرنوں کے ڈول اس کو اٹھا کر اوپر لے جاتے ہیں۔ عزیزانِ من! آپ غور کیجیے دونوں پہلوؤں میں شر اور خیر کا نقشہ سامنے آ جاتا ہے۔ وہ شرِ مجسم 3/4 ❶ حصہ کرۂ ارض کے اوپر پھیلا ہوا ہے۔ اس شر میں سے خیر نکل رہا ہے۔ اس کے لیے کتنا نظم ونسق ہے' کتنا اہتمام ہے کہ ایک اتنا بڑا آتشیں گولہ عین اپنے وقت کے اوپر طلوع ہوتا ہے اور خاص راستے سے جاتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ طلوع ہوتا ہے' غروب ہوتا ہے' ورنہ وہ تو نہ طلوع ہوتا ہے' نہ غروب ہوتا ہے۔

سورج عملِ خیر کی تکمیل کی خاطر استقامت کے عمل کو پوری دل جمعی سے اپنائے ہوئے ہے

وہ تو ہر صبح سفر' ہر شام سفر ہوتا ہے' وہ تو پیہم اسی سفر کے اندر رہتا ہے' وہ تو ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ وہ غروب ہو گیا ہے۔ وہ تو غروب نہیں ہوتا۔ اس نے کیا غروب اور طلوع ہونا ہے' اس کے ذمے تو یہ کام لگا ہوا ہے۔ اس نے تو یہ امانت سر پہ اٹھائی ہوئی ہے۔ وہ کرتا یہ ہے کہ اس پانی میں سے جس میں زندگی اور موت اس طرح سے گھلی ملی ہوئی ہے کہ وہاں سمندر کے کنارے پانی کو کشید کرنے کے لیے آج دنیا کے اندر اتنی محنت ہو رہی ہے کہ اس پہ وہ کہتے ہیں کہ اتنا خرچ پڑتا ہے کہ کوئی بھی اسے Afford (برداشت) نہیں کر سکتا کہ سمندر کے پانی کو کوئی پینے کے لیے کشید کرے۔ یہ آپ کے ہاں بھی کشید کردہ پانی' جو دوائیوں میں استعمال ہوتا ہے' تو اتنی سی ٹیوب کے لیے وہ پانچ روپے لے لیتے ہیں۔ وہ کہتا ہے دیکھو تو سہی کہ ہم نے کشید کے لیے یہ کارخانہ بنایا ہے' اس میں تمہیں نہ آگ جلانی پڑتی ہے' نہ بھٹی لگانی پڑتی ہے' نہ تم اس کو خود کشید کرتے ہو۔ چلا ہوا ہے ہمارا وہ سورج اور وہ اوپر سے دھوپ ایسی دیتا ہے کہ نیچے سے سارے مادے جتنے بھی ہلاکت آفریں ہیں' وہ وہیں کے وہیں رہ جاتے ہیں اور اس کے بعد اس میں سے کشید کیا ہوا پانی اوپر چلا جاتا ہے۔ پھر ہوائیں پانی کے ان مشکیزوں کو جن کے منہ بند ہوتے ہیں' لیے لیے پھرتی ہے کہ جہاں جہاں ضرورت ہوتی ہے ہمارا پروسیس ہے کہ وہاں اتنی سی ٹھنڈک پیدا ہو جاتی ہے کہ جس سے پانی کے بخارات بھاری ہو کر قطرات کے اندر تبدیل ہوتے ہیں۔ یہ پانی کے قطرات ہیں جو آبِ حیات بن کر' زندگی بخش پانی بن کر' مقطر پانی بن کر' آپ کے لیے آ جاتا ہے۔ اور پھر ہمارا پروسیس جتنا زیادہ ہوتا ہے' اس کے لیے پہاڑوں پر ریزروائر ہیں' برف کی شکل میں منجمد کر دیتے ہیں۔ وہ آج کل ہمارے ہاں کولڈ اسٹوریج (سرد خانہ) نکلا ہے۔ یہ خدا کا بنایا ہوا' کتنا بڑا کولڈ اسٹوریج (سرد خانہ) ہے۔ گرمیوں میں پانی کم ہوتا ہے تو سورج کی شعاعیں اس کو پگھلا کر پھر ہمارے پاس بھیج دیتی ہیں۔ ہم ضرورت کے مطابق لیتے چلے جاتے ہیں' اس کے اندر پھر وہ اس قسم کی چیزیں ملتی ہیں اور وہ سارا سمندر میں چلا جاتا ہے۔ یعنی یہ جو ہے جس کو یہ مادے کی Conservation

---

❶ یہ سمندر کی طرف اشارہ ہے۔

(محفوظیت) کہتے ہیں اس میں سے ایک قطرہ بھی کم نہیں ہوتا‘ اس سارے پروسیس میں ضائع نہیں ہوتا‘ یہ عجیب وغریب چیز ہے‘ ورنہ اگر جو پانی باہر آیا تھا اور وہ باہر کا باہر ہی رہے تو خواہ اس سے بڑے اور کتنے ہی سمندر کیوں نہ ہوں‘ اِس وقت تک سارے خشک ہوگئے ہوتے۔ وہ سارے کا سارا واپس چلا جاتا ہے‘ دریاؤں کی شکل میں اور کہیں زمین کے اندر کنویں کی شکل میں۔ وہ کہتا ہے کہ آپ دیکھیے تو سہی کہ یہ اَلْحَمْدُ فِی الْاٰخِرَةِ (34:1) ہے یا نہیں؟

اور اب سوال یہ ہے کہ یہ سارا کیوں ہو رہا ہے؟ اس لیے کہ وَ هُوَ الرَّحِيْمُ الْغَفُوْرُ (34:2) وہ سامانِ نشوونما تمہارے لیے پیدا کرنا چاہتا ہے اور اس طرح سے وہ جو ہلاکت آفریں مادے ہیں‘ ان سے تمہاری حفاظت بھی کر رہا ہے۔ اس لیے وہ سمندر میں ہی رہ جاتے ہیں اور اس کی جو رحمتیں ہیں‘ وہ اس طرح سے کشید ہو کر سورج کی کرنوں کے ساتھ لپٹی ہوئی اوپر پہنچتی ہیں اور یوں تمہیں زندگی بخش پانی مل جاتا ہے۔ کہا کہ کہیے تو سہی کہ فی الاخرۃ یہ باعثِ حمدیت ہے یا نہیں‘ ورنہ اگر تم صرف سمندر کے پانی کا ہی ایک چلو بھرو تو وہ تو تمہیں نظر آئے گا کہ خدا نے تو اس کے اندر زہر بھر کر رکھ دیا ہے۔

انسان کی اخلاقی‘ تمدنی‘ معاشرتی اور معاشی موت مفادِ عاجلہ کی بنا پر واقع ہوتی ہے

کہا ہے کہ عجلت میں تم کرو گے تو یہ نتیجہ نکلے گا۔ اس نے کہا ہے کہ انسان مرتا اس لیے ہے کہ عاجلہ ہے‘ صبر نہیں کرتا‘ انتظار نہیں کرتا فوری نتیجہ چاہتا ہے‘ جو اس کے لیے نقصان دہ ہوتا ہے۔ اسی لیے اُس نے یہ کہا ہے کہ وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ ج (34:3) یہ لوگ جو حق کی مخالفت کر رہے ہیں اور تم انہیں بار بار کہتے ہو کہ یاد رکھو! اس کے بعد ایک انقلاب آئے گا اور اس کی رو سے تمہاری تباہی ہو جائے گی‘ کیوں اپنے ہاتھوں خودکشی کرتے ہو‘ کیوں تباہی کی طرف چلے جاتے ہو؟ کہا کہ تو انہیں بار بار یہ کہے چلا جاتا ہے اور چونکہ اتنی جلدی وہ انقلاب نہیں آتا‘ اس لیے یہ کہتے ہیں کہ یہ یونہی باتیں ہیں‘ جو یہ شخص کر رہا ہے۔ ہر ظالم اور مستبد جس کے پاس جتنی بڑی قوت ہوتی ہے اس کے ذہن میں ہی نہیں آتا کہ میں بھی آخر الامر ناکام ہو جاؤنگا اور تباہ ہو جاؤنگا۔ وہ کہتا ہے ”کیہڑ اماں دالعل ایہو جیا ہیگا“ ❶۔ قوت کا نشہ آدمی کو واقعی شرابی کر دیتا ہے۔ کہا ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ تم روز دھمکیاں دیتے ہو‘ یہ سب چیزیں دھمکیاں ہی ہیں‘ ہم پہ انقلاب نہیں آسکتا ہے‘ ہم نے بڑے انتظامات کیے ہوئے ہیں‘ بڑی قوتیں ہمارے پاس ہیں۔ کہا کہ یہ کیوں ہے کہ یہ کہتے بھی ہیں اور اس کے باوجود **الساعۃ** جلدی سے نہیں آتی‘ وہ انقلاب جلدی سے نہیں آتا۔

---

❶ وہ ایسا کونسا ماں کا لعل ہے (جو یہ کچھ کرے گا)۔

خدا کا قانون انسان کی طعن آمیزی کے باعث جذباتی نہیں ہوتا' خدا تعالیٰ کی ذات بڑی حکیم ہے

کہا ہے کہ وہ الساعة اس لیے جلدی سے نہیں آتی کہ ہم اپنے اس پروگرام کے اندر اس قسم کی طعن آمیز باتوں سے بھی غصے میں نہیں آجاتے کہ اچھا تو کہتا ہے کہ نہیں آتا ''لے دیکھ فیر اونداا ے کہ نہیں اوندا❶''! خدا نے اپنے آپ کو ''حلیم'' کہا ہوا ہے۔ یہ بڑی عجیب چیز ہے۔ میں نے کہا تھا کہ یہ جو ''حلیم'' ہے وہ ہمارے ہاں ایسا ہوتا ہے کہ وہ رڑ کے ہی نہ' یہ بات نہیں ہے۔ خدا کی صفتِ حلیم ایسی نہیں ہوسکتی کہ کوئی اس کو طمانچہ بھی مار دے تو وہ کچھ نہ کہہ سکے۔ یہ بڑی عجیب صفت ہے۔ عرب اپنے اُس اونٹ کو ''حلیم'' کہتے تھے جس میں بھرپور قوت ہو لیکن قوت کے بعد وہ مچل نہ جائے بلکہ اس کی کیفیت یہ ہو کہ بچے آئیں' کوئی گردن سے لپٹ رہا ہے' کوئی دم کھینچ رہا ہے' کوئی اوپر چڑھ رہا ہے اور وہ ہے کہ اسی طرح سے مزے میں بیٹھا ہوا جگالی کر رہا ہے یعنی چھوٹی چھوٹی سی باتوں کے اوپر اس طرح سے وہ بپھر نہ جائے۔ جس کی یہ کیفیت ہو' جس کا حوصلہ اتنا بڑا بلند ہو' اس کو حلیم کہتے ہیں۔ یہ جو چیز ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ روز یہ آکر اس قسم کے طعنے بھی دیتے ہیں' یہ کہتے بھی ہیں کہ لاؤ تو وہ انقلاب کہاں ہے۔ کہا کہ یہ کہتے ہیں کہ نہیں آرہا۔ قُلْ بَلٰى وَ رَبِّىْ لَتَاْتِيَنَّكُمْ لا عٰلِمِ الْغَيْبِ ج (34:3)۔ ان سے کہو ''بلٰی'' وہ آئے گا' و ربی میرے رب کی قسم' وہ اس بات کے اوپر شاہد ہے لَتَاْتِيَنَّكُمْ کہ وہ آئے گا۔ میرا خدا عٰلِمِ الْغَيْبِ ہے۔ یہ ہے وہ چیز۔ تمہارے سامنے جو کچھ موجود ہے تم اسی کو دیکھتے ہو' اس کے بعد جو آنے والی چیزیں ہیں' ان کا علم اس کو ہے اور اس انداز سے اس کا علم ہے کہ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِى السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِى الْاَرْضِ وَ لَآ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرُ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (34:3) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں کسی کا کوئی بھی عمل ہو' اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوتا۔ خواہ وہ ایک ذرے کے برابر بھی انسان کی حرکت ہو یا اس سے بڑی یا چھوٹی ہی کیوں نہ ہو' اس کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی اور وہ حرکت بھی محسوس اور مرئی ہی کیوں نہ ہو' اس سے پوشیدہ نہیں۔ وہ تو کہتا ہے کہ يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِى الصُّدُوْرُ (40:19) نگاہوں کی خیانت اور دل کے اندر گزرنے والے خیالات سے بھی وہ واقف ہے۔ اور وہ تمام چیزیں جو تمہارے ہاں کا Ledger (اندراج کا بہی کھاتہ) ہے' اس کے اندر درج ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اور وہ کتاب مبین ہے جس میں یہ درج ہوتی ہیں۔

---

❶ لو دیکھ کہ وہ پھر آتا ہے یا نہیں!

خدا کی ذات کائنات کے ذرے ذرے کی مالک ہوتے ہوئے غفور بھی ہے اور عدل واحسان کی حامل بھی

تم اتنی جلدی جو مچاتے ہو کہ وہ الساعة جلدی سامنے کیوں نہیں آتی۔ کہا کہ وہ اس لیے جلدی سے نہیں آتی کہ وہ غفور بھی تو ہے۔ وہ جلدی سے تمہاری ہلاکت نہیں چاہتا۔ جو اتنی بے پناہ قوتوں کا مالک ہو' بظاہر تو یہی ہونا چاہیے کہ پکڑے اور گلا دبا دے۔ کہتا ہے کہ وہ تو تمہاری حفاظت چاہتا ہے' مہلت دیتا ہے' وقفہ دیتا ہے' بار بار سمجھاتا ہے کہ اس آنے والے خطرے کو ٹال دو لیکن یہ بات نہیں ہے کہ وہ تمہارے حساب کے مطابق اگر نہیں آتا جیسے تم کہتے ہو کہ اب آ جانا چاہیے' تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ اس سے بے خبر ہے یا یہ تمہارے جتنے بھی اعمال ہیں' جو کچھ تم یہ کرتے ہو' یہ نتیجہ خیز نہیں ہو رہے۔ ایک ایک چیز نتیجہ پیدا کر رہی ہے۔ وہ جو قرآن نے کہا ہے کہ وہ تو میزان ہے' دونوں پلڑوں کے اندر ایک ایک خیر کا ذرہ اور ایک ایک شر کا ذرہ' اس میں ڈالتے چلے جاتے ہیں۔ عزیزانِ من! یہ ایسی عمدہ مثال ہے کہ وہ پلڑوں کی صورت یہ ہے کہ جو بھاری پلڑا ہوتا ہے' وہ جھکتا جاتا ہے۔ یہ صورت ہے جس وقت کسی کی ہلاکت ہوتی ہے تو یہ نہیں ہوتا کہ دوسرا خیر کا پلڑا بالکل خالی ہوتا ہے بلکہ انسان کے ہلاکت انگیز اعمال زیادہ وزنی ہو جاتے ہیں خیر کے مقابلے میں۔ وہ جو آج کی طِب کی سائنس بھی کہتی ہے کہ جب انسان مرتا بھی ہے تو یہ نہیں کہ اس کے اندر قوت کا ایک ذرہ بھی باقی نہیں رہتا بلکہ اس کے اندر قوت توانائی جینے کی صلاحیت ہوتی ہے لیکن یہ جو تباہ کرنے والی چیزیں اندر ہیں وہ اس کے اوپر غالب آ جاتی ہیں یہ شر کا پلڑا جھک جاتا ہے۔ اُس نے کہا کہ یہ جو چیز ہے یہ تو کتابِ مبین ہے۔

یہ کتابِ مبین کی بات سامنے آ گئی۔ اسے ہم اعمالنامہ کہتے ہیں۔ قرآن نے بڑی عجیب امثال دی ہیں۔ اسی کو کتابِ مبین کہا ہے یعنی واضح کتاب۔ کہا کہ وَ كُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ (17:13) یہ کوئی ایسی بات نہیں کہ ہمارے فرشتوں نے اپنے پاس تمہارا اعمالنامہ رکھا ہے اور وہ لکھ کر اپنے بستے میں باندھ لیتے ہیں' تمہیں اس کا پتہ ہی نہیں چلتا بلکہ ہر شخص کا اعمالنامہ تو اس کی گردن میں لٹکا ہوا ہوتا ہے۔ وَ نُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا (17:13) فرق یہ ہوتا ہے کہ اس وقت یہ جو اس کا اعمالنامہ ہے' یہ کاغذ یوں لپٹا ہوا ہوتا ہے جب یہ نتائج پیدا کرنے کا پلڑا جھک جائے گا تو اس وقت صرف اتنا ہوگا کہ یہ کھول دیا جائے گا۔ مثال تو بہت پرانی ہے۔

انسانی اعمال کے سلسلہ میں آج کی سائیکالوجی (نفسیات) کی تحقیق

ہمارا آج کا زمانہ آہستہ آہستہ اس تک پہنچ رہا ہے' یہ جو سائیکولوجی (Psychology) ہے' یہ انسانی علم کے اندر بڑی پیش رفت ہے۔ انہوں نے جو یہ تحقیق کی ہے کہ انسان کے اندر ایک Conscious Mind (نفسِ شعوریہ) ہے اور ایک

Unconscious Mind (نفس غیر شعوریہ) ہے' اور وہ بتا رہے ہیں کہ انسان کا ہر عمل' اس کی ہر حرکت' اس کے خیالات' اس کی خواہشات' اس کی آرزوئیں' اس کے ارادے' خواہ وہ عمل میں نہ بھی آئیں' ان میں سے ہر چیز اس کے نفسِ غیر شعوریہ کے اسٹور کے اندر جمع ہوتی رہتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ شعوریہ کے حصے Unconscous Mind (نفسِ غیر شعوریہ) میں 9/10 ہوتا ہے۔ یہ جسے انسان اپنے ہاں بہت بڑا شعور اور عقل اور تدبر بنائے پھرتا ہے' تو وہ سارا اس پروسیس کا 1/10 بھی نہیں ہوتا۔ اور اس کے بعد انہوں نے یہ بتایا ہے کہ ایک پروسیس (عمل) ایسا ہے' جس میں 9/10 حصہ ہے۔

ظہورِ نتائج کے وقت نفسِ شعوری اور نفسِ غیر شعوری میں تکرار کا نتیجہ

کیا بات ہے جو قرآن نے کہا ہے کہ نتیجہ سامنے آنے کے وقت میں' **كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا** (16:111) انسان کے یہ جو دو نفس ہیں' یہ آپس میں جھگڑتے ہوئے آئیں گے۔ وقت وہ آجائے گا کہ شعوری نفس یہ کہے گا کہ یہ باتیں سامنے نہ آئیں جب کہ یہ جو غیر شعوری نفس ہے' یہ اپنے اسٹور کو باہر لانا چاہے گا۔ عزیزانِ من! چودہ سو سال پہلے یہ کہنا کہ یہ دو نفس آپس میں جھگڑتے ہوئے آئیں گے' خدا کے سوا کون کہہ سکتا تھا۔ اُس زمانے میں تو ابھی نفسِ انسانی کے متعلق ہی تحقیق نہیں تھی چہ جائیکہ جو دو نفس Conscious & Unconscious Mind (نفس شعوریہ اور نفس غیر شعوریہ) ہیں' یہ کسی کے ذہن میں ہو۔ یہاں لفظ **تجادل** (16:111) آتا ہے۔ سائیکاٹرسٹ (Psychiatrists: اَطباءِ نفسی[1]) کرتے یہ ہیں کہ جس کو یہ اتنی جذباتی اور ذہنی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں' وہ ہوتا یہ ہے کہ جو نفسِ غیر شعوریہ (Unconscious Mind) کے اندر ان کی دبی ہوئی پھانس ہوتی ہے' اس کے Conscious Mind کو اس کا پتہ نہیں ہوتا کہ وہ پھانس کیا ہے' جس کی وجہ سے وہ تڑپ رہا ہے' بلبلا رہا ہے' اضطراب ہے' سو نہیں سکتا' بے چین ہے۔ اس کی وجہ تو شعور ہی کو معلوم ہوتی تھی اور وہ وجہ نفسِ غیر شعوریہ کے اسٹور کے اندر چھپ گئی ہے' وہ اس کی تہوں کے اندر ہے۔ سائیکولوجی کے علاج کا پروسیس آجکل کا یہ ہے کہ وہ آہستہ آہستہ ان تہوں کو Unconscious Mind (نفسِ غیر شعوریہ) سے اٹھاتے چلے جاتے ہیں' نیچے وہ جو دبی ہوئی پھانس ہوتی ہے' جس کو شعور چاہتا ہے کہ بھولا رہے' کیونکہ اس سے ندامت ہوتی ہے' اس سے سزا ملتی ہے' یہ چاہتا ہے کہ جرم چھپا ہی رہے' وہ باہر نہیں آنے دیتا' یہ کرتے یہ ہیں کہ اس میں سے پردے اٹھا اٹھا کر اسے Dig-out (نکال باہر) کرتے ہیں اور جب بھی وہ بات جس کو یہ چھپانا چاہتا تھا' وہ نفسِ شعوریہ کے اوپر آجاتی ہے تو یہ کہتا ہے کہ وہ معاملہ تو ہو ہی گیا' قصہ ختم ہو گیا اور اسی دن آرام آجاتا ہے۔ ہمارے ہاں اس دور میں یہ چیزیں آئیں۔

---

[1] جذباتی اور ذہنی انتشارات کی تشخیص اور علاج کے اَطبا' طبِ نفسی کے ماہرین۔

انسان کا اعمال نامہ اس کی گردن میں Unconscious Mind (نفسِ غیر شعوریہ) کی شکل میں لپٹا ہوا ہوتا ہے

یہ جو قرآن نے کہا تھا کہ نتیجہ برآمد ہونے کے وقت میں یہ دونوں نفس آپس میں تجادل کرتے ہوئے آئیں گے' اُس نے کہا ہے کہ یہ تو اس کی گردن میں لپٹا ہوا ہے لیکن Unconscious Mind (نفسِ غیر شعوریہ) کے اندر لپٹا ہوا ہے' نُخۡرِجُ لَهٗ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ (17:13) نتائج محسوس طور پر برآمد ہونے کا جو وقت ہوگا' اس میں اس کو کھول دیں گے۔ كِتٰبًا يَّلۡقٰهُ مَنۡشُوۡرًا (17:13) لپٹی ہوئی اس کی کتاب کو کھول دیا جائے گا اور اس کے بعد کہا جائے گا کہ اِقۡرَاۡ كِتٰبَكَ (17:14) یہ اپنا اعمالنامہ آپ ہی پڑھ۔ وہ جو آ گئی' غیر شعوری سے شعوری کے اندر وہ بات' تو اب آ گیا کہ اسے آپ ہی پڑھ۔ اتنے عرصے سے تو کوشش کر کے چھپا رہا تھا کہ اوپر نہ آنے پائے اور اب بات اوپر آ گئی ہے۔ یہ بھی نہیں ہے کہ کوئی فردِ جرم ہے جو وہاں کا ریڈر (قاری) پڑھ کر سنائے گا بلکہ آپ پڑھ' بآوازِ بلند پڑھ۔ پڑھ لیا' دیکھ لیا' اس میں غلطی تو نہیں' یہ بات تو نہیں جو (مرزا اسداللہ خاں) غالب (1797-1869) کہہ رہا تھا کہ

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

کہا کہ ہم اس لیے اس جھگڑے سے بھی الگ رہنا چاہتے ہیں۔ وہاں کہیں گے کہ آپ پڑھ' پھر کہو کہ کوئی غلطی تو نہیں ہے۔ اب اس کے بعد اگلی بات یہ ہے کہ پھر یہ جو تمہارے جرائم ہیں' بتاؤ کہ ان کی کیا سزا ملے۔ کہا کہ یہ بات بھی ہم نہیں کہیں گے بلکہ وہاں تو كَفٰى بِنَفۡسِكَ الۡيَوۡمَ عَلَيۡكَ حَسِيۡبًا (17:14) تو خود فیصلہ کر لے کہ اس کا نتیجہ تمہارے لیے کیا ہونا چاہیے۔ گواہ بھی تو' قاصد بھی تو' عدالت بھی تو' مجسٹریٹ بھی تو' اپنے متعلق آپ فیصلہ کر لے۔ کہا کہ اِلَّا فِىۡ كِتٰبٍ مُّبِيۡنٍ (34:3) یہاں تو نگاہوں کی خیانت تک بھی اُس کتاب کے اندر لکھی ہوئی ہوتی ہے۔ تیری غلطی یہ ہے کہ تو لپٹے ہوئے کے متعلق سمجھتا ہے کہ یہ کھلے گا نہیں' سامنے نہیں آئے گا' اس لیے اس کے اندر اور زیادہ Entries (اندراجات) ہوتی چلی جاتی ہیں' کہا کہ بَلٰى وَ رَبِّىۡ (34:3) میرا رب اس کے اوپر شاہد ہے کہ یہ لپٹا ہوا کھلے گا' یہ انقلاب آئے گا' تم اس سے بچ نہیں سکتے۔ یہ بڑی چیز ہے۔

قرآنِ حکیم کے پیش کردہ نظامِ حیات کا ماحصل اور اس کی نوعیت

عزیزانِ من! یہ بڑی چیز ہے۔ جب بھی استبداد کی قوتیں غالب آتی ہیں تو عام طور پر مایوسی چھا جاتی ہے کہ صاحب! اس کا تو

حل ہی نہیں، اس کا علاج ہی نہیں، اس کا کوئی مداوا ہی نہیں، ہمارے بس کی بات ہی نہیں ۔ یہ مایوسی ہے ۔ وہ کہتا ہے اگر تم واقعی حق کے اوپر ہو تو تھوڑی سی استقامت دکھاؤ، تھوڑا سا انتظار کرو، اس لپٹے ہوئے اعمالنامہ کو کھلنے دو، اس وقت تم دیکھو گے کہ اتنی بڑی بڑی جو استبداد کی قوتیں ہیں، وہ کس طرح سے ملیامیٹ ہو جاتی ہیں ۔ یہ سارا پروسیس اس لیے ہے کہ ایک تو لَـهُ الْـحَـمْـدُ فِـى الْاٰخِـرَةِ (34:1) ہے۔ اور دوسرا یہ ہے کہ لِّيَـجْـزِىَ الَّـذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (34:4) تا کہ وہ لوگ جنہوں نے خدا کے قوانین کے مطابق کام کیے ہوئے ہیں، ان کو ان کے کاموں کے فطری نتائج مل جائیں ۔ اس کے لیے اجر اور بدلا کے الفاظ کچھ اچھے نہیں ہیں ۔ یہ ٹھیک ہے کہ کسان جتنی محنت کرتا ہے جب اسکی فصل آتی ہے تو کہا جائے گا کہ اس کی محنت کا یہ بدلا ہے ۔ دانے سے فصل کا اگنا تو فطرت کا ایک امر چلا آ رہا ہے ۔ کہا ہے کہ یہ سارا جتنا بھی ہے، آخرالامر یہ چیز طے ہونی ہے، حق نے آخرالامر اپنے مثبت نتائج پیدا کرنے ہیں، تو ہی بے صبرا ہوا چلا جاتا ہے ۔ کہا ہے کہ اُولٰٓـئِكَ لَهُـمْ مَّغْفِرَةٌ (34:4) ۔ سب سے زیادہ مایوسی یہ ہوتی ہے کہ انسان اپنے آپ کو Unprotective (غیر محفوظ) سمجھ لیتا ہے ۔ یہ ہوتا ہے ظلم و استبداد کا معاشرہ کہ ہر شخص اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھتا ہے ۔ بچپن میں ایک فقیر مانگنے آیا کرتا تھا ۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ''بابا! کریئے تاں وی ڈریئے' نہ کریئے تاں وی ڈریئے'' ❶ ۔ اس زمانے میں تو پتہ نہیں چلتا تھا کہ نہ کریئے تے کیوں ڈریئے لیکن جس معاشرے کے اندر آپ کے ہاں قانون کی بالا دستی نہ رہے اور قانون بھی جو ہے وہ حق پہ مبنی نہ ہو، تو اس میں نہ کرنے والے تو بیچارے زیادہ ڈرتے ہیں ۔ اُس نے کہا ہے کہ ہمارے پاس وہ نظام مَّغْفِرَةٌ ہے ۔ ہمارے پاس سامانِ حفاظت ہے، ڈرنے کی بات نہیں ہے ۔ یہ تو Negative (منفی) پہلو ہو گیا ۔

رزق کریم کی بنیادی خصوصیت: لینے والا کسی قسم کی سبکی تک محسوس نہ کرے

کہا ہے کہ وَّ رِزْقٌ كَـرِيْـمٌ (34:4) ۔ رزق میں روٹی ہی نہیں، ضروریاتِ زندگی کی ہر چیز آ جاتی ہے اور وہ بھی اگر بروقت ملے تب رزق ہے ۔ خالی رزق کی بات ہی نہیں بلکہ یہاں رِزْقٌ كَرِيْمٌ کہا ہے ۔ عربوں کے ہاں انسان کے شرف و مجد کے لیے اس لفظ سے جامع کوئی دوسرا لفظ نہیں تھا ۔ جس کے متعلق وہ معاشرے میں یہ ایک لفظ کہہ دیتے تھے، اس کے متعلق کچھ اور پوچھنے کی ضرورت نہیں رہتی تھی ۔ رزق کے معاملے میں جہاں یہ لفظِ کریم ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی ہوتا ہے کہ اس طرح سے دینے والا کہ جس میں لینے والے کی کسی قسم کی سُبکی نہ ہو ۔ عزیزانِ من! اس سے بہتر اور رزقِ کریم کی بات کیا ہو سکتی ہے! وہ لوگ کتنی جامع بات کرتے تھے کہ لینے والا اس میں اہانت محسوس نہ کرے، اس کے اندر سُبکی نہ ہو ۔ اور وہ یہ کہتے تھے کہ وہ دینے والا جس کے دینے میں

---

❶ کریں تو بھی ڈریں اور نہ کریں تو بھی ڈریں ۔

لینے والا سُبکی یا اہانت محسوس کرے، خود کمینہ شخص ہے۔ وہ اسے کریم نہیں کہتے تھے۔ یہ جو اس انداز کا ملنا ہے، قرآن اسی لیے اس قسم کے رزق کو شخصیتوں سے اوپر لے گیا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ شخصیت درمیان میں آجائے تو لینے والے کی نگاہ جھک جائے۔ دینے والے کے اندر کچھ تو احساس برتری پیدا ہوسکتا ہے، انسان ہی تو ہے ناں۔ اس لیے اُس نے یہ چیز کہی کہ یہ انفرادی نہیں ہے انفرادی تو خیرات ہوتی ہے۔

خیرات سے دل کی موت ہوتی ہے اس لیے خدا نے رزق کو شخصیتوں سے بالاتر رکھا ہے:

آپ ﷺ کا فرمان

عزیزانِ من! خیرات کے متعلق تو حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ اس سے دل کی موت ہوتی ہے۔ یہ عجیب چیز ہے جو آپ ﷺ نے فرمایا ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پہ کہتے ہیں کہ ''اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہوتا ہے''۔ آپ ﷺ نے کہا کہ یہ غلط ہے کیونکہ دینے والے کے دل میں نخوت اور تکبر پیدا ہوسکتا ہے، لینے والے کے دل کے اندر احساسِ کمتری پیدا ہوسکتا ہے۔ اس لیے اس میں اس نے انفرادی چیز رکھی ہی نہیں۔ اُس نے کہا ہے کہ یہ جو سارا کچھ ہے، یہ ایک نظام کے تابع ہے، وہاں جمع ہو، کچھ پتہ نہ ہو کہ کس کا کتنا آیا ہے اور اس کے ساتھ ہر ضرورت مند کو وہاں سے ملے، درمیان میں شخصیت آئے ہی نہیں۔ اور یہ وجہ ہے کہ جو دینے والے ہیں ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جب وہ کچھ دیتے ہیں تو اس کے بعد کہتے ہیں کہ **اِنَّمَا نُطۡعِمُكُمۡ لِوَجۡهِ اللّٰهِ** (76:9) یہ جو کچھ دیا جا رہا ہے، یہ نہ سمجھیں کہ تمہیں ہم کچھ دے رہے ہیں، اور اس کے لیے کوئی کسی قسم کا بدلا مانگتے ہیں **لَا نُرِيۡدُ مِنۡكُمۡ جَزَآءً وَّلَا شُكُوۡرًا** (76:9) اس کے بدلے میں تم سے کچھ لینا تو ایک طرف، ہم تو شکریہ کے بھی متمنی نہیں ہیں۔ دینے والا شکریئے کا بھی متمنی نہیں ہے۔ اور اس کے لیے وہ نظام ہے، جو خدا نے بنایا ہے۔ یہ ہے اصل چیز کہ ہوسکتا ہے کبھی کسی کے دل میں یہ بات آجائے۔ اُس نے کہا کہ اس میں شخصیتوں کا سوال ہی نہ ہو، افراد کا سوال ہی نہ ہو۔ سارے کا سارا اکٹھا کرو اور یہ لسٹ بھی مت شائع کرو کہ اس نے کتنا دیا اور اُس نے کتنا دیا۔ اس کے بعد ہر ایک کی جو ضرورت ہے، وہ اُس کے مطابق آ کر لیتا چلا جائے اور اس ضرورت کے مطابق لینے میں خود امیر المومنین بھی موجود ہو۔ یہ نہ ہو کہ لینے والا آئے تو سب دیکھیں کہ صاحب! یہ کوئی غریب آدمی یا مفلس ہے جو مانگنے کے لیے آیا ہے۔ یہ تو سوال ہی نہیں ہے۔ اُس میں سے ہر شخص وہاں سے لے۔ یہ ہے رزقِ کریم کہ جس کے لینے میں سُبکی محسوس نہ ہو:

کس دریں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

دوسری جگہ ہے کہ

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں ایں است و بس

اسلام، اسلامی نظام، یہ ساری شریعت، یہ قوانین، یہ سارا کچھ، اس تمام کے لیے وہ کہتا ہے کہ اس کی لِم، اس کی علتِ غائی یہ ہے کہ

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس

دنیا میں کوئی شخص کسی دوسرے کا محتاج نہ ہو۔

نکتۂ شرعِ مبیں ایں است و بس

عزیزانِ من! ساری بات احترامِ انسانیت کے اندر ہے۔

اصلِ تہذیبِ احترامِ آدم است ❶

دنیائے انسانیت میں سب سے مقدم شے احترامِ آدمیت ہے

کوئی ایسا عمل جس میں احترامِ آدمیت کے اندر فرق آ جائے تو وہ عمل عملِ خیر نہیں، وہ عمل عملِ صالح نہیں، وہ ایمان ایمان نہیں۔ آپ کو یاد ہے میں نے ایک درس کے اندر یہ بتایا تھا کہ گورنر صاحب نے کسی ایک ذمی سے یہ کہہ دیا تھا کہ خدا تجھے ذلیل کرے۔ کہہ تو دیا اور اس کے بعد ذرا سا بھی اس پہ سوچا کہ یہ کیا ہوا، فوراً آ گئے، بابِ خلافت کے اندر اپنا استعفیٰ پیش کر دیا اور رو رہے تھے۔ یہ بڑے بلند پایہ صحابیؓ تھے۔ یہ وہ تھے جن کے متعلق حضرتِ عمرؓ (581-644/45ء) نے کہا تھا کہ اگر وہ میرے قریب ہوتا تو میں اس کے مشوروں سے کتنا فائدہ اٹھا سکتا۔ یہ وہ شخص تھا۔ وہ آیا اور اس نے آ کر استعفیٰ دیدیا اور رو رہا تھا۔ سارے صحابہؓ جمع ہو گئے اور انہوں نے کہا کہ کیا کہہ رہے ہو۔ کہنے لگے کہ میں نے ایک شخص کو یہ کہہ دیا ہے کہ تجھے خدا ذلیل کرے، کہنے لگے کہ جس شخص سے کسی ایک انسان کی بھی تذلیل ہو جاتی ہے اسلامی نظام میں وہ کسی عہدہ کے لینے کا مستحق نہیں ہے۔ لہٰذا میں اس کا اہل ہی نہیں ہوں، مجھ میں ابھی کمی ہے، جس دن یہ بات نکل جائے گی، پھر میں اس کے لیے آ جاؤں گا۔ خدا کہتا ہے کہ وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (17:70) ہم نے ہر آدم کے بیٹے کو واجب التکریم بنایا ہے، واجب الاحترام بنایا ہے۔ اس لیے کسی سے کچھ چھیننا یا سلب ونہب سے اس کی بے

---

❶ برتر از گردوں مقامِ آدم است　اصلِ تہذیبِ احترامِ آدم است　(اقبالؒ: جاوید نامہ)
(آدم کا مقام آسمان سے بلند ہے۔ تہذیب کی اصل آدم کا احترام ہے۔

عزتی کرنا تو ایک طرف رہا' کسی کو دے کر بھی اگر اس کی اہانت ہوتی ہے تو بارگاہِ خداوندی میں یہ بھی جرمِ عظیم ہے کہ اس نے تکریمِ آدمیت کے خلاف یہ کچھ کیا ہے۔ اسی لیے رزق کریم کہا ہے۔

کہا ہے کہ **وَ الَّذِیْنَ سَعَوْ فِیْ اٰیٰتِنَا مُعٰجِزِیْنَ اُولٰٓئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِیْمٌ** (34:5) یہ جو ہمارے نظام کی مخالفت کرتے ہیں' وہ کوشش کر رہے ہیں کہ یہ ہمیں اپنے اس ظلم اور استبداد کی قوتوں کے مقابلے میں بے بس کر دیں' ہمارا پروگرام بار آور نہ ہو' ہم ناکام رہ جائیں اور یہ کامیاب ہو جائیں۔ یہ ''عذاب'' کا لفظ تو وہی ہے کہ جن کے اس قسم کے جو جرائم ہیں' ان کے جو نتائج پیدا ہوتے ہیں' انہی کو ہم سزا بھی کہہ دیتے ہیں۔ یہاں رِجْزٍ اَلِیْمٌ کہا ہے۔ یہ لفظِ رجز جو ہے' بڑا اہم ہے۔ سورۃ المدثر میں دیکھیے۔ کہا جاتا ہے اور نظر بھی کچھ ایسا ہی آتا ہے کہ یہ ابتدائی چیزیں ہیں جب نبی اکرم ﷺ کو منصبِ نبوت پہ فائز کیا گیا یعنی ایک عظیم پروگرام ان کے ذمے لگایا گیا۔ منصب پہ فائز تو ہم اس احترام کی بنا پہ کہتے ہیں جو حضور ﷺ کا ہماری ذات میں ہے۔ خدا کی طرف سے تو ایک اتنا بڑا عظیم پروگرام' اتنا بڑا فریضہ' سپرد کیا گیا جس کے بارے میں کہا کہ تیری کمر اس کے بوجھ سے ٹوٹ رہی تھی۔ نظر آتا ہے کہ یہ اس ابتدائی دور کی آیت ہے۔ عزیزانِ من! اس کے اندر اتنا عظیم پروگرام ہے۔ یہ چیزیں کئی دفعہ آ بھی چکی ہیں لیکن قرآن کا بھی انداز تصریف آیات ہے' بار بار چیزیں سامنے آتی ہیں تو بات اور زیادہ وضاحت سے سمجھ میں آتی ہے۔ وہ کسی نے کہا ہے کہ یہ نہیں ہے کہ کسی حسین یا حسن کو بار بار دیکھیے تو اس سے جی بھر جاتا ہے' حسن سے تو جی نہیں بھرتا' تاج محل کو جب بھی دیکھیے' ہر بار اس کی ایک نئی تصویر سامنے آتی ہے۔ قرآن کے یہ حقائق جتنی بار بھی سامنے آئیں' اُن میں ایک نئی چیز پیدا ہوتی ہے۔

قرآنِ حکیم کے مروجہ تراجم نے قرآنی حقائق کو مکمل طور پر نظروں سے اوجھل کر دیا ہے

سورۃ المدثر میں کہا ہے کہ **یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ . قُمْ فَاَنْذِرْ . وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ . وَثِیَابَکَ فَطَھِّرْ . وَالرُّجْزَ فَاھْجُرْ . وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَکْثِرُ** (74:1-6)۔ یہ جو لفظ ''رجز'' ہے' اس کے لیے میرے ذہن میں آیا تھا کہ عرض کروں کہ کہاں آیا ہے۔ ہمارے ہاں جو مروجہ ترجمے چلے آ رہے ہیں پہلے انہیں دیکھیے کہ انہی کی رو سے کہتے ہیں کہ قرآنِ مجید کو سمجھنا چاہیے۔ مولانا محمود الحسن شیخ الہند کا ترجمہ ہے۔ اس میں یہ ہے کہ اے لحاف میں لپٹنے والے! اُٹھ کھڑا ہو اور ڈر سنا دے اور اپنے رب کی بڑائی بول اور اپنے کپڑے پاک رکھ اور گندگی سے دور رہ۔ نبی اکرم ﷺ کو خدا کی طرف سے ایک پروگرام دیا جا رہا ہے۔ یہ چیزیں کہ مثلاً اپنے رب کی بڑائی بول' اس سے آپ کیا سمجھے؟ عزیزانِ من! اگلی چیز جو ہے اس سے آپ سوچیے تو سہی کہ حضور ﷺ کو چالیس سال کی عمر میں یہ نبوت ملی ہے' آپ سوچیے انہیں یہ کہا جا رہا ہے کہ اپنے کپڑے پاک رکھا کر اور گندگی اور غلاظت سے دور رہا کر (معاذ اللہ)۔ یعنی

حضور ﷺ کے متعلق یہ بات کہ وہ اپنے کپڑے بھی صاف نہیں رکھا کرتے تھے' اس کے لیے بھی وحی دینا پڑی (دل کانپ اٹھتا ہے) ۔یہی ہمارے ہاں تفسیریں ہیں اور یہی ترجمے ہیں: مدثر کا ''ترجمہ اے لحاف میں لپٹنے والے'' اور مزمل کا ترجمہ ''کملی والے'' کیا جاتا ہے اور پھر وہ کملی والا تو پوچھو ہی نہیں ''اک دنیا نوں کملا کیتا ہویا اے او ہنے''❶ ۔دین شاعروں کے ہتھے چڑھ جائے تو پھر پوچھو نہیں کہ کیا سے کیا ہو جاتا ہے ۔پوچھو کہ یہ کملی کیا ہوئی' تو کہتے ہیں کہ جی! یہ تو آپ ﷺ کی ادا اللہ کو بہت پسند آئی تھی ۔اسی وجہ سے یہ جتنے بھی فقیر' درویش ہیں' وہ کملی لیے پھرتے ہیں ۔

قرآنِ حکیم کے لفظ نذیر اور مدثر کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! عربی زبان کا کوئی لغت اٹھا کر اس لفظِ مدثر کے معنی اور مفہوم دیکھیے ۔حیرت ہے کہ یہ چیزیں معانی اور مفاہیم اس طرح سے چلے آتے ہیں ۔میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ جب خزاں کے موسم میں کوئی ایک پتہ بھی کہیں نظر نہ آئے' زندگی کی تر و تازگی تو ایک طرف' وہاں زندگی کا نشان بھی نظر نہیں آیا کرتا تو اس کے بعد نئے شگوفے پھوٹتے ہیں تو اس عمل کو تدثیر کہتے ہیں ۔گلشنِ عالم کی جب یہ کیفیت ہو جائے کہ اس میں کسی ایک درخت کے اوپر زندگی کا کوئی نشان' تر و تازگی کی کوئی علامت' بھی باقی نہ رہے' اس کے بعد بہار کے موسم کے اندر ان میں سے جو نئے شگوفے پھوٹتے ہیں' اس کو تدثیر کہتے ہیں ۔مدثر کے معنی ہیں ''اے اس جہان کے خزاں دیدہ گلشن پر بہارِ نو لانے والے''! قم ۔

لفظِ قم کی عظمت اور پھر حضور ﷺ کی عملی زندگی کے نقوشِ قدم

عزیزانِ من! اس قم کے اندر قیامت لپٹی ہوئی ہے ۔تاریخ سے پوچھو' ساری تاریخ بتا رہی ہے کہ اس زمانے میں انسانیت کے عالم میں کہیں زندگی کا نشان نظر نہیں آتا تھا جب حضور ﷺ کا ظہور ہوا ہے ۔عزیزانِ من! ہم نہیں کہہ رہے۔ آپ Emotion as the Basis of Civilization❶ دیکھیے کہ کتاب کیا نقشہ کھینچ رہی ہے ۔اس کے بعینہٖ یہ لفظ ہیں کہ صحنِ کائنات کے اندر کسی درخت کے اوپر زندگی کا نشان نظر نہیں آتا تھا ۔مدثر کے معنی وہ سمجھ گیا ۔مدثر کے معنی ہیں ۔

اے اس گلشنِ خزاں دیدہ پر بہارِ نو لانے والے!

---

❶ اس نے تو ایک دنیا جہاں کو پاگل بنا رکھا ہے۔

J.H.Denison کی اس کتاب کا مکمل حوالہ یہ ہے:

Denison, J.H: Emotion as Basis of Civilization, Charles Scribner`s Sons, New York, 1928.

بزبانِ اقبالؒ خدا تعالیٰ کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کی اور اہلِ تصوف کی رفاقت کے بنیادی فرق کی وضاحت

عزیزانِ من! میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بہتر نعت کا شعر نہیں ہوسکتا‘ خدا جب حضور ﷺ کی نعت میں کہے گا تو وہ اس سے کم کیا کہے گا۔ کہا کہ قم: اٹھ۔ یہ ہے رسالت کا فریضہ۔ فریضۂ نبوت تو وہ ہے کہ جو پروگرام حضور ﷺ کو خدا کی طرف سے مل گیا‘ وہ اس لیے نہیں مِل گیا کہ وہ صرف ان کی ذات تک رہے۔ مثلاً خدا کے ساتھ ہمکلامی ہے‘ باتیں ہو رہی ہیں‘ اس کی محفل میں گئے ہوئے ہیں‘ اس کے ساتھ یہ سارے تعلقات ہیں۔ کیا یہ سب کچھ اپنی ذات تک رکھا جائے؟ یہاں تک تو وہ نبوت ہے جو اس کی ذات تک آتی ہے۔ نبوت دی اس لیے دی جاتی ہے کہ جو فریضۂ رسالت ہے‘ اس کی ادائیگی ہو۔ اب رسالت اس کائنات کے اندر انقلاب لے آنا ہے۔ کہا کہ یہ پروگرام تمہیں مل گیا‘ قم اٹھ۔ ’’قیامت‘‘ کے لفظ کا مادہ بھی تو ’’ق و م‘‘ ہی ہے جس سے یہ لفظ قم ہے۔ اٹھ اور قیامت برپا کردے۔ یہ جو فرق ہے‘ میں نے کبھی تفصیل میں جا کر تصوف کی باتیں نہیں کیں‘ وہ بڑی لمبی چوڑی بات ہے۔ میری کتاب ’’حقیقتِ تصوف‘‘ کی کتابت ہو رہی ہے شاید وہ میری زندگی کی آخری کتاب [1] ہو۔ اس میں جو ایک نکتہ یہاں لانے کا ہے جس کو اقبالؒ (1877-1938ء) نے بیان کیا ہے‘ وہ بڑا اہم ہے۔ وہ کہتا ہے کہ صوفی یا اولیاء اللہ کہتے ہیں کہ جو کچھ بھی ملتا ہے‘ خدا کی طرف سے ملتا ہے یعنی خدا کی طرف سے ہمکلامی ہوتی ہے‘ خدا باتیں کرتا ہے‘ وہ روز خدا کے پاس ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کچھ بھی ہے لیکن کسی دوسرے انسان کو تو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا‘ عالمِ انسانیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے‘ یہ تو صرف اس کی ذات میں ہے۔ اس سے اگر کہا جائے کہ صاحب! ہمیں بھی بتایئے کہ یہ کیا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ

ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا! تانہ چشی

بھائی یہ تو شراب کا نشہ ہے جو پیئے گا اس کو تو نشہ آئے گا‘ جو نہیں پیئے گا تو میں تمہیں کیا سمجھا سکوں کہ نشہ ہوتا کیا ہے۔

کہا کہ یہ چیز فی الواقعہ اگر ان کو میسر بھی آجاتی ہے تو

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

ابنِ مریم کا وجود تو اس لیے ہمارے لیے باعثِ احترام ہے کہ وہ میرے دکھ کی دوا کرتا ہے۔ اگر نہیں کرتا تو ہر شخص‘ ہر کوئی‘ ابنِ مریم ہوا کرے۔

---

[1] یہ کتاب ’’تصوف کی حقیقت‘‘ کے نام سے ستمبر 1981ء میں بارِ اوّل طبع ہوگئی تھی۔

زاہد نہ خود پیؤ نہ کسی کو پلا سکو

کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

'نہ خود پیؤ' تو نہ سہی مگر یہ کہتے ہیں کہ ''اسیں تے پیتی ہوئی ہیگی اے''❶۔

علامہ اقبالؒ کے چھٹے لیکچر کا ایک پُر معنی اقتباس

سوال تو یہ ہے کہ عالمِ انسانیت کو اس سے کیا ملا؟ یہاں سے اقبالؒ (1877-1938ء) کے الفاظ ہی سامنے آ جانے چاہئیں۔ میرے ذہن میں آج یہ آیا کہ یہ بات یوں سامنے آ جائے تو زیادہ اچھا ہے'اس سے بات آپ کی سمجھ میں آ جائے گی۔ ان کے جو یہ چھ لیکچر❷ ہیں'ان میں سے یہ پانچواں لیکچر ہے❸۔ انہوں نے لیکچر کے شروع میں ہی ایک کوٹیشن دی ہے' کہ یہ ایک بہت بڑے صوفی بزرگ گزرے' یہ عبدالقدوس گنگوہیؒ (D.945/1538) ہیں۔ یہ جو مولانا اشرف علی تھانوی (1863-1943AD) ہیں' مولانا امداد اللہ ہیں' مولانا عبدالقدوس گنگوہی ہیں' یہ تصوف کے سلسلے کے بڑے بڑے بزرگ گزرے ہیں۔ اقبالؒ لکھتے ہیں: کہ ''انہوں نے یہ کہا تھا کہ ''محمد عربی ﷺ فلک الافلاک کی بلندیوں پر پہنچ کر واپس تشریف لائے۔ خدا شاہد ہے کہ اگر میں اس مقام پر پہنچ جاتا تو کبھی واپس نہ آتا''❹۔ اقبالؒ (1877-1938ء) لکھتا ہے کہ یہ الفاظ ایک بہت بڑے صوفی بزرگ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے ہیں۔ تصوف کے تمام لٹریچر میں ان جیسے اور الفاظ کا ملنا غالباً مشکل ہے کہ جو ایک فقرے کے اندر شعورِ نبوت اور تصوف کے اس قدر لطیف نفسیاتی فرق کو اس طرح واضح کر دے۔

یہ بڑی اہم بات کہی ہے کہ ایک صوفی اپنے انفرادی تجربہ کی تجرگاہ سے واپس نہیں آنا چاہتا اور جب واپس آتا بھی ہے تو اس

---

❶ ہم نے تو پی ہوئی ہے۔

❷ پہلے یہ چھ لیکچرز ہی تھے۔ علامہ محمد اقبالؒ (1877-1938ء) نے ان میں ساتویں لیکچر کا اضافہ بعد میں فرمایا۔ اس میں تصوف کھل کر سامنے آ گیا۔ اس ساتویں لیکچر کا عنوان ہے: ?Is Religion Possible (کیا مذہب کا امکان ہے؟) ان کے لیکچرز کے مجموعے کا نام ہے:

The Reconstruction of Religious Thought In Islam

یہ لیکچرز ان کی عالمگیر شہرت کا باعث ہیں۔

❸ اس لیکچر کا عنوان ہے: The Spirit of Islamic Culture

❹ Muhammad of Arabia ascended the highest Heaven and returned. I swear by God that if I had reached that point, I should never have returned.

کی یہ مراجعت نوعِ انسانی کے لیے کچھ معنی نہیں رکھتی۔ اس کے برعکس ایک نبی کی مراجعت تخلیقی مقصد کے لیے ہوتی ہے' اس کے اندر Creative Purpose (تخلیقی مقصد) ہوتا ہے۔ وہ آتا ہے کہ زمانے کے طوفان پر تسلط پا کر تاریخ کی قوتوں کو اپنے قابو میں لے آئے اور اس طرح مقاصد کی ایک نئی دنیا تعمیر کر دے۔ ایک صوفی کے لیے اس کے انفرادی تجربہ کی تجردگاہ آخری مقام ہوتی ہے لیکن ایک رسول کے دل میں اس سے ولولہ انگیز نفسی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں' جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام دنیائے انسانیت میں ایک انقلاب پیدا کرے۔ یہ آرزو نبی کے دل میں پیش پیش ہوتی ہے کہ جو کچھ اس نے دیکھا ہے وہ ایک جیتی جاگتی دنیا کے پیکر میں متشکل ہو جائے۔ اسی لیے ایک صاحبِ وحی کے تجربہ کی قیمت جانچنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ دیکھا جائے کہ اس نے انسانیت کو جس قالب میں ڈھالا ہے وہ کیسا ہے اور اس کے پیغام کی روح سے جس قسم کی دنیائے ثقافت یعنی کلچر ابھر کر سامنے آ گئی ہے وہ کس انداز کی ہے۔ نبی کا فریضہ یہ ہوتا ہے۔

نبی کی ذات کو لفظِ قم کی روشنی میں' انسانی دنیا کے اندر ایک انقلاب برپا کرنا ہوتا ہے

یہ ہے وہ چیز جس کے لیے کہا گیا کہ قـم: اٹھ۔ نبوت تک تو جیسا اگر سمجھا جائے تو وہ صوفی کا صوفی ہی ہے' تجردگاہ ہے' اس کی ذات ہے لیکن وہ اس لیے نہیں تھی کہ وہ خود اپنے طور پر اس سے لذت اندوز ہوتا رہے' اس نشے میں سرشار رہے۔ اس لیے پروگرام دیا گیا ہے کہ قم: اٹھ' اب تو بیٹھ نہیں سکتا' اب اٹھنا ہوگا' قیامت برپا کرنا ہوگی۔ پروگرام دیا جا رہا ہے۔ قُمْ فَاَنْذِرْ (74:2) پہلی چیز تو یہ ہے کہ انسانیت سے Proclaim (اعلان) کر دے کہ جس روش کے اوپر تم چلے جا رہے ہو' یہ تمہیں تباہیوں کے جہنم کی طرف لے جائے گی۔ وارننگ دیدے۔ پہلی چیز تو وارننگ ہوتی ہے اور یہ بڑی ضروری چیز ہے کہ جو راستہ تم نے اختیار کیا ہے' وہ تمہیں تباہی اور بربادی تک لے جائے گا۔ فَـاَنْذِرْ پہلی چیز تو یہ ہے کہ پکارتا چلا جا کہ یہ بھی غلط ہے' یہ بھی غلط ہے' یہ بھی غلط ہے اور اس کے بعد پروگرام یہ ہے کہ رَبَّکَ فَکَبِّرْ (74:3)۔ یہاں رب کا لفظ ہے۔ رب کے معنی ہیں: ربوبیتِ عالمینی کا ذمہ دار۔ خدا کی ربوبیتِ عالمینی ہے' وہ تو خدا ہے' وہ رب ہے لیکن اس کو دنیا کے اندر بروئے کار لانا ہے' ایک عملی نظام پیدا کرنا ہے' جس سے واقعی کوئی رات کو بھوکا نہ سوئے۔ خدا کی ربوبیت خدا تک رہے تو دنیا کے اندر لاکھوں انسان بھوک سے مر جاتے ہیں۔

رَبَّکَ فَکَبِّرْ کی عملی تفسیر اور عالم گیر سطح پر کبریائی کا مفہوم: نظامِ ربوبیت کا قیام ہے

عزیزانِ من! میں سمجھتا ہوں کہ ایک ایک لفظ کے اوپر' ایک ایک کتاب لکھی جائے۔ کہا ہے کہ رَبَّکَ فَکَبِّرْ (74:3) اس کی ربوبیت کو دنیا کے اندر کبریائی عطا کر کہ سب سے اونچی اس کی ربوبیت ہو' اٹھ یہ کام کر۔ خدا کی ربوبیت خدا تک نہ رہنے

دے۔ اگر وہ سارا دن تسبیح کے اوپر پڑھتا رہے کہ تو میرا رب ہے' تو نشو ونما دینے والا ہے تو اس سے پیٹ نہیں بھرتا۔ اس کے لیے لفظ فَكَبِّر کی ضرورت ہے۔ اس کی کبریائی کو دنیا کے اندر قائم کر کہ سب سے اونچی خدا کی ربوبیت چھا جائے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ترجمہ ہو رہا تھا 'اس کی بڑائی بول' اس سے کیا بات سمجھ میں آ سکتی تھی؟ کہا کہ اس کے لیے سب سے پہلے اپنے اندر بھی تغیر کی ضرورت پڑے گی۔

ثِيَابَكَ فَطَهِّرْ اور مزمل کا قرآنی مفہوم

دوسرے کو کچھ کہنے سے پہلے ثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (74:4) کر۔ اس کا ترجمہ یہ کیا کہ اپنے کپڑے پاک صاف رکھ۔ ان کو پتہ نہیں ہے کہ عربی زبان میں یہ جو ثــوب کا لفظ ہے' یہ Personality (شخصیت) کے لیے آتا ہے۔ وہ کپڑے کے لیے تو اس لیے ہوتا ہے کہ اس شخصیت نے اس کو پہنا ہوا ہوتا ہے' ورنہ یہ لفظ شخصیت کے لیے آتا ہے۔ اور طھــــر کے معنی یہ نہیں کہ پہلے کوئی غلاظت لگی ہوئی ہوتی ہے اور اس کو پاک کیا جاتا ہے بلکہ اس کے معنی ''دور رکھنا ہوتا ہے' ہر قسم کی ایسی چیز جو تمہاری تحریک کے لیے کسی قسم کی خرابی کا موجب ہونے والی ہے۔'' یہاں کہا ہے کہ اپنی شخصیت کو اس سے دور رکھ۔ آگے کہا کہ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ (74:5)۔ عام مروجہ ترجمے کی رو سے یہ ہے کہ گندگی سے دور رہو۔ اس سے پہلی سورۃ سورۃ مزمل تھی کہ یہ کام تیرے تنہا کرنے کا نہیں ہے' یہ ایک قافلہ ہوگا' رفقا کی جماعت ہوگی' وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ہوگا' اپنے ساتھیوں کو لینا ہوگا۔ عربی زبان میں مزمل ''اس کارواں سالار کو کہتے ہیں جو افرادِ کارواں کے انتخاب میں بڑی احتیاط برتے''۔ عرب ایک اونٹ کے اوپر دو سواریاں بٹھاتے تھے اور اتنی احتیاط بھی برتتے تھے کہ یہی نہیں کہ وہ دو سواریاں وزن کے اعتبار سے ایسی ہوں کہ ایک طرف کہیں دو تین من کا بٹھا دیا جائے اور دوسری طرف سے کم کا تو وہ تو اونٹ کو بھی مشکل ہو جائے گی' سواریوں کی بھی مشکل ہو جائے گی لیکن مزمل اسی کارواں سالار کو نہیں کہتے جو یہ بوجھ ہی دیکھے کہ دونوں سواریاں ایک جیسا متوازی بوجھ رکھے ہوئے ہیں' بلکہ یہ بھی دیکھے کہ وہ دونوں ہم مزاج بھی ہوں کہ انہوں نے راستہ ایک دوسرے کے ساتھ کاٹنا ہے'' گلاں وی تے کرنیاں نیں ایہناں نے راہ وچ''❶۔

لفظ رجز کا قرآنی مفہوم

اب اگلی بات یہ رجز کی ہے۔ یہاں ہمارے ہاں بیلوں میں یہ بیماری ہو جاتی ہے اور اونٹوں میں بھی یہ بیماری ہو جاتی تھی کہ

---

❶ انہوں نے راستے میں باتیں بھی تو کرنی ہیں۔

اٹھتے وقت طاقتور کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اٹھتا ہے تو ایک جھٹکے میں اٹھ کھڑا ہوتا ہے' ان کو ایک قسم کا اعصابی ضعف ہو جاتا تھا' بیماری ہوتی تھی کہ وہ ایک دفعہ نہیں اٹھ سکتے تھے بلکہ ان کی ٹانگیں لڑکھڑاتی تھیں' کانپ کانپ کر کبھی بیٹھ جاتے تھے' پھر زور لگا کر اٹھتے تھے' ان کو دو چار دفعہ زور لگا کر اٹھانا پڑتا تھا۔ یہ جو کیفیت ہو جاتی ہے کہ اٹھنے کے لیے اتنی قوت نہ ہو کہ ایک جھٹکے سے اوپر اٹھ کھڑا ہو' ٹانگیں لڑکھڑا اٹھیں' لغزش آ جائے اسے وہ **رِجز** کہتے تھے۔ کہا کہ **قُمْ** ۔ میں نے کہا ہے کہ یہ عربی زبان عجیب زبان ہے' اسی قیام سے جو قم سے ہے' جب اس کے ساتھ ''ۃ'' لگتی ہے تو قیامت بن جاتی ہے اور اس کا معنی ہوتا ہے وہ ''کام فوراً' جھٹکے سے ہو جانا' ایک دفعہ ہی ہو جانا''۔ اسے کہا ہے کہ **قُمْ**' تم نے قیامت برپا کرنی ہے تو کہا کہ تم جو ساتھی چنو' ان میں یہ بھی دیکھو کہ یہ ایسے نہ ہوں کہ اٹھتے وقت ان کی ٹانگیں لڑکھڑا جائیں اور وہ کھڑے نہ ہو سکیں۔ ایسا ہو کہ تو آواز دے اور ایک جھٹکے میں کھڑے ہو جائیں۔ **وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ** (74:5) کی یہ چیز رفقا میں پیدا نہیں ہونی چاہیے۔ اس کے لیے یہ پہلی شرط ہے کہ تم اٹھے ہو تو تم نے دنیا کے محتاجوں کی احتیاج کو پورا کرنا ہے۔ پروگرام کا پہلا ٹکڑا یہ ہے۔

نظامِ ربوبیت کے لیے ایسی جماعت تشکیل دینا جس کے دل میں دوسروں سے تعریف کروانے کا جذبہ بھی پیدا نہ ہو

عزیزانِ من! کہا ہے کہ ایسا کرنا ہے تو اپنے ساتھیوں کو سمجھا دو کہ **وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ** (74:6) وہ سمجھ لیں کہ یہ جو تم دوسروں کو دے رہے ہو' اس خیال سے نہ دینا کہ تمہیں اس کے بدلے میں ان کی طرف سے اس سے زیادہ ملے گا' کچھ نہیں بدلے میں تم نے لینا۔ اس طرح کسی پہ احسان نہ کر کہ تمہارے دل میں یہ احساس پیدا ہو کہ اس سے مجھے بدلے میں زیادہ کچھ ملے گا' خواہ تعریف ہی کیوں نہ ہو۔ عزیزانِ من! یہ چار کڑیاں پہلے پروگرام کی ہیں اور ابھی تو سورۃ باقی ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن نے جو کہا کہ غلط نظام کے اوپر چلنے والوں کی قوتیں آپ کو بڑی نظر آئیں گی لیکن جب وہ انقلاب آفریں گھڑی (**الساعة**) آئے گی تو آپ دیکھیں گے کہ ان کی ٹانگیں لڑکھڑا جائیں گی' یہ اس کے سامنے کھڑے نہیں ہو سکیں گے۔ اپنی جماعت کو ایسا بنا کہ جب حکم دیا جائے کہ **قم**' تو ایک جھٹکے میں کھڑے ہو جائیں۔ جو اس طرح سے کھڑا ہوتا ہے' اسے قیامت برپا کرنے والا کہتے ہیں۔ یہی چیز تھی جو جماعتِ مومنین کے اندر ہمیشہ کے لیے رہنی چاہیے تھی۔ جیسے حضور ﷺ نے یہ کہا تھا۔ اقبالؒ (1938-1877ء) پھر سامنے آ گیا- وہ مومن کے متعلق کہتا ہے کہ

دو گیتی را صلا از قرأت اوست ❶

(اقبالؒ: ارمغان حجاز)

مومن قرآن پڑھتا ہے' اعلان کرتا ہے' تو وہ دونوں جہانوں کو دعوت دیتا ہے' وہ صرف اس کی اپنی ذات تک نہیں ہوتی۔

غار کے اندر حضرت جبریل کی حضور ﷺ کی خدمت میں پیش آوری کا قصہ

یہ قرأت کا لفظ آ گیا ہے تو بات بھی سامنے آ ہی جائے۔ یہ جو سورۃ العلق ہے کہ **اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ** (96:1). روایت کی رو سے کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے یہ آیتیں تھیں جو نازل ہوئی تھیں۔ اور اس کے ساتھ پھر وہ کہانی ہے کہ حضور ﷺ غار میں تھے اور یہ کچھ کرتے تھے تو ایک دن حضرتِ جبریل آ گئے اور حضرت جبریل نے آپ کے سامنے ایک کاغذ رکھا اور کہا کہ اقرا: پڑھ۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں تو پڑھنا جانتا نہیں ہوں۔ یعنی خدا نے کاغذ لکھ کر بھیج دیا ہے اور جبریل سے کہا کہ اس سے جا کر کہو کہ پڑھ۔ (معاذ اللہ) نہ خدا کو پتہ ہے کہ پڑھنا نہیں جانتا' نہ جبریل کو پتہ ہے۔ اندازہ لگایئے! آپ کے ہاں ان روایات کی رو سے بات کہاں جاتی ہے۔ پتہ نہیں یہ کیا دور تھا جس میں یہ چیزیں آ گئیں۔ ہاں تو روایت میں ہے کہ کہا: پڑھ' کہتے ہیں کہ میں تو پڑھنا ہی نہیں جانتا' انہوں نے پھر کہا کہ پڑھ۔ عزیزانِ من! کلیجہ شق ہو جاتا ہے' میں کیا عرض کروں کہ کیا باتیں ہیں۔ جب یہ دیکھ لیا کہ یوں بات نہیں بنتی تو جبریل نے آپ کو گلے سے لگایا اور پھر وہ جو سارا علم تھا' وہ آپ ﷺ کے اندر منتقل ہو گیا لیکن اس کے باوجود یہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ ساری عمر اَن پڑھ (Unlettered) ہی رہے تھے۔

---

❶ دو گیتی را صلا از قرأت اوست مسلماں: لا یموت از رکعت اوست

نداند کشتۂ ایں عصرِ بے سوز قیامت ہا کہ در قد قامت اوست

(مومن جب اپنی قیام صلوٰۃ میں قرآنِ کریم کی قرأت کرتا ہے تو وہ صرف خود کو اس کے الفاظ و معانی سے آشنا نہیں کرتا بلکہ ساری دنیا کو قرآن کی طرف آنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس کا قرآن سن کر لوگ باطل کو چھوڑ کر حق کی طرف لپکتے ہیں۔ ایک مومن جب عاشقانہ طرز کی صلوٰۃ قائم کرتا ہے تو خود کو غیر فانی بنا لیتا ہے۔ وہ ظاہری موت کے باوجود ہمیشہ کی زندگی اختیار کر لیتا ہے کیونکہ نظامِ صلوٰۃ میں وہ مشاہدہ حق کی منزل پر ہوتا ہے۔

بندۂ مومن جب مشاہدہ حق والی صلوٰۃ کے لیئے صلوٰۃ سے پہلے تکبیر اولیٰ میں قد قامت الصلوٰۃ کہتا ہے تو اس کے اس کہنے میں کتنی قیامتیں پوشیدہ ہیں' وہ باطل کے لیے کس طرح انقلابِ آفریں گھڑی لا سکتا ہے' اس حقیقت کو سوزِ عشق سے ناواقف موجودہ دَور کا مارا ہوا مسلمان نہیں سمجھ سکتا۔ وہ صلوٰۃ اس کی اپنی ذات تک محدود نہیں ہوتی)۔

قرآنِ حکیم کے معنی تو ''ایک منشور کا اعلان کرنے'' کے ہوتے ہیں یعنی نظامِ ربوبیت کا اعلان پوری نوعِ انسانی کے لیے

اگر یہ اِقْرَاْ پہلی وحی تھی جیسے وہ جو قم والی چیز ہے' پہلا پروگرام ہے' تو وہ جو قم تھا وہ رَبَّکَ فَکَبِّرْ(3:74) تھا۔ یہاں کہا تھا کہ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ(96:1) ۔وہی ربوبیت سے ساری ابتدا ہوتی ہے۔ یہ "اقرا" یا قرآن کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ چیز جو زیادہ پڑھی جائے۔عزیزانِ من!" اِقْـرَاْ" کے بنیادی معنی کسی چیز کا Proclaim کرنا یعنی اعلان کرنا ہوتا ہے۔کہا ہے کہ دنیا میں اعلان کردے۔قرآن کے معنی Proclamation (اعلامیہ) ہوتا ہے' یعنی وہ جو سلطنت کی طرف سے ایک منشور کا اعلان کیا جاتا ہے کہ یہ ہمارا منشور ہے۔قرآن' نظامِ خداوندی کا منشور ہے' Proclamation ہے' جو دنیا میں اس کا اعلان کیا جائے گا ۔اقرا کے معنی ہیں'' Proclaim کرنا' اعلان کرنا''۔کہا ہے کہ اٹھ اور خدا کی صفتِ ربوبیت کا عالمگیر اعلان کردے۔اس نے انسان کو پیدا کیا ہے تو یہی نہیں ہے کہ پیدا کیا اور اس کے بعد اس پہ موت طاری ہوگئی۔زندہ انسان پیدا کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اس کی زندگی کا دارومدار' جن چیزوں کے اوپر ہے' وہ بھی ساتھ دے۔کہا ہے کہ اٹھ اور اعلان کردے: اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ (96:1)۔اسی کو قرأت کہتے ہیں۔بات آئی تھی اقبالؒ (1877-1938ء) کے شعر کی

دو گیتی را صلا از قرأت اوست

مومن کی جو قرآن کی قرأت ہے' وہ قرآن کا پڑھنا نہیں ہے' وہ قرآن کے پروگرام کا اعلان کرنا ہے۔مومن دونوں جہانوں کو دعوت دیتا ہے:

مسلماں: لا یموت از رکعت اوست

لفظِ رکعت کا قرآنی مفہوم: خدا کے قانون کے سامنے جھک جانا

رکعت کے معنی' یہ جو دو رکعتیں ہم کہتے ہیں' نہیں ہیں بلکہ رکعت کے معنی ہوتا ہے'' خدا کے سامنے جھک جانا''۔خدا کے سامنے مومن جھکتا ہے تو لا یموت ہوجاتا ہے' یہ خدا کا حی لا یموت ہے پھر یہ مرتا نہیں ہے' زندۂ جاوید ہوجاتا ہے' خدا حی لا یموت ہے اور مومن۔خدا کے قوانین کے سامنے جھکنے سے حیاتِ جاوید حاصل کرلیتا ہے۔

نداند کشتۂ ایں عصرِ بے سوز

اس بے سوز زمانے کا کشتہ شدہ انسان اس حقیقت کو نہیں جانتا کہ تکبیر اولیٰ میں اس کے قَـدْ قَـامَـتِ الـصَّلٰوۃُ کہنے میں کتنی

قیامتیں پوشیدہ ہیں۔

قیامت ہا کہ در قد قامت اوست ❶

قَدْقَامَتِ الصَّلٰوۃُ کا قرآنی مفہوم

اس اعلانِ تکبیر کے بعد جب جماعت کھڑی ہوتی ہے تو اس میں یہ الفاظ ہیں: قد قامت الصلوٰۃ۔ اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ صلوٰۃ کھڑی ہوگئی۔ وہ کہتا ہے کہ یہ عصرِ بے سوز کا کشتہ' جو انسان ہے' اس کو کیا پتہ ہے کہ مومن جب کہتا ہے کہ قَدْقَامَتِ الصَّلٰوۃُ تو اس کے معنی کیا ہوتے ہیں۔ وہ تو قیامت کا اعلان کر رہا ہوتا ہے۔ اس لیے یہ کہا کہ یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ . قُمْ فَاَنْذِرْ (74:1-2)۔ اے وہ کہ جس کے ذمے عالمِ انسانیت کو سنوار کر' ایک جہانِ نو کو وجود میں لانے اور اس طرح حق کے نظام کو ہر نظامِ باطل پر غالب کرنے کا انقلابی پروگرام ہے! اٹھ اور خدا کی ربوبیت کے نظام کا اعلان ساری دنیا میں کر دے۔ اور یاد رکھو! جن کی ٹانگوں میں ابھی لڑکھڑاہٹ ہے وہ اسے قائم نہیں کر سکیں گے' اس کے لیے تو اتنی مضبوط ٹانگوں کی ضرورت ہے کہ قم کہے اور ایک جھٹکے سے کھڑا ہو جائے اور قیامت برپا کر دے۔ اور قیامت یہ نہیں ہے کہ اچھے بھلے تر و تازہ درختوں کو جڑ سے اکھاڑ دے بلکہ بے برگ و گیاہ جو خزاں دیدہ ہیں' ان کو بہارِ نو دے آئے۔ کہا ہے کہ اس کے لیے اٹھو۔

عزیزانِ من! سورۃ سبا کی آیت 5 تک ہم آ گئے' چھٹی آیت سے آئندہ شروع کریں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

❀......❀......❀

---

❶ بندۂ مومن نماز ادا کرنے کے لیے نماز سے پہلے تکبیر اولیٰ میں قد قامت الصلوٰۃ کہتا ہے تو اس کے کہنے میں کتنی قیامتیں پوشیدہ ہیں۔

دوسرا باب: سورة سبا (آیات 6 تا 13)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج فروری 1980ء کی 29 تاریخ ہے، وہ تاریخ جو چار سال کے بعد آئے گی اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ سبا کی آیت 6 سے ہوتا ہے: (34:6)۔

وحی کی طرف سے ملنے والے علم کے نتائج ایک نظام کے تحت ظہور پذیر ہوتے ہیں جو ایک حقیقت ہے

اس سورۃ کی پانچویں آیت میں یہ تھا کہ یہ لوگ جو ہمارے قوانین کے خلاف سرکشی برتتے ہیں، کیا وہ سمجھتے ہیں کہ وہ ہمیں عاجز کردیں گے، مغلوب کرلیں گے، ناکام کردیں گے، ہمیں شکست دیدیں گے؟ ایسا نہیں ہو سکے گا۔ ہمارے قانون کو کوئی بھی شکست نہیں دے سکتا، آخر الامر وہ دیکھیں گے کہ کس طرح جو اس نے کہا ہے کہ اس کی خلاف ورزی سے تباہی آتی ہے، وہ تباہی آکر رہتی

ہے۔ کہا ہے کہ وَ یَرَی الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ ہُوَ الۡحَقَّ ۙ وَ یَہۡدِیۡۤ اِلٰی صِرَاطِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَمِیۡدِ (34:6)۔ یہ ''علم'' تو بہت بڑی چیز ہے اور جب ''العلم'' آتا ہے یعنی یہ ''ال'' لگتا ہے تو یہ انگریزی زبان کا The ہے۔ عام طور پہ اس کے معنیٰ ''وحی کی رو سے جو علم ملتا ہے، وہ علم ہوتا ہے''۔ یہاں کہا ہے کہ وَ یَرَی الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ (34:6) جو لوگ علم و بصیرت رکھتے ہیں، العلم رکھتے ہیں، وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں کہ جو کچھ تیرے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے ہُوَ الۡحَقَّ (34:6) وہ ٹھوس تعمیری نتائج کا حامل، اور حقیقت ثابتہ ہے۔

عزیزانِ من! یہاں یَرَی الَّذِیۡنَ (34:6) یہ ہوتا ہے کہ جس چیز کو محسوس طور پہ اپنے سامنے دیکھ لیا جائے۔ علم تو وحی کی رو سے دیا جاتا ہے اس کے نتائج مرتب کرنے کے لیے اس نظام کی ضرورت ہوتی ہے جو اس وحی کے ذریعے متشکل ہوتا ہے اور پھر اس کے نتائج برآمد ہوتے ہیں، تو یہ ہیں جو محسوس شکل میں سامنے آجاتے ہیں۔ اور اسی لیے کہا کہ وہ پھر محسوس طور پر دیکھ لیتے ہیں کہ ہُوَ الۡحَقَّ (34:6) ہے یعنی یہ حق ہے۔ میں نے پہلے بھی کئی دفعہ کہا ہے کہ عربی زبان میں حق یا حقیقت، کسی نظریہ کی سچائی کو اس وقت کہتے ہیں، جب وہ محسوس شکل میں سامنے آجائے۔ یعنی حق کا جو محسوس شکل میں سامنے آنا ہے، وہ اس وقت حق بنتا ہے، وہ اس وقت حقیقت کہلاتا ہے جب وہ محسوس شکل میں سامنے آجائے۔

لفظ کلمہ کے معنی نظریہ حیات کے ہیں

عربی زبان میں حقیقت کا لفظ ہی اس وقت بولتے ہیں جب کسی پروگرام کے محسوس نتائج سامنے آجائیں۔ وہ جو غالباً بازنطینی مملکت کے ایک سپاہی نے، ایک مسلمان مجاہد سے پوچھا تھا کہ ہر کلمہ کی ایک حقیقت ہوتی ہے (کلمہ کے معنی ہم تو لَاۤ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ کہہ دیتے ہیں، کلمہ نظریہ حیات کو کہتے ہیں، فلسفۂ زندگی کو کہتے ہیں) تو اس نے پوچھا تھا کہ ہر کلمہ کی ایک حقیقت ہوتی ہے، تم بتاؤ کہ تمہارے کلمہ کی حقیقت کیا ہے؟ اس مجاہد نے کہا تھا کہ یہ چالیس ہزار شہر اور قلعے جو ہم نے فتح کیے ہیں، یہ ہمارے اُس کلمہ کی حقیقت نہیں ہے تو اور کس چیز کی حقیقت ہے۔ آپ نے سمجھا کہ حقیقت کے معنی عربی زبان میں کیا ہیں۔ الحق اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی صحیح نظریۂ زندگی اپنے محسوس نتائج پیدا کردے۔ اور اسی لیے تو ہم جو کچھ بھی زبان سے آج کل کہتے ہیں، مانتے ہیں، نظریات کا پرچار کرتے ہیں، اتنا دہراتے ہیں، وہ الحق نہیں ہے۔ وہ تو حقیقتِ ثابتہ بن کر ہمارے سامنے آتا ہی نہیں ہے، بے شک زبان سے دہرائے چلے جایئے یعنی یہ وَ یَرَی الَّذِیۡنَ بن جائے۔ آپ دیکھیے کہ پہلے یَرَی الَّذِیۡنَ کا لفظ آیا ہے۔ وہ تو آتا ہی اس وقت ہے جب کوئی چیز آنکھوں سے دیکھی جاسکے۔ جو لوگ اس پر ایمان رکھتے ہیں وہ دیکھ لیتے ہیں کہ یہ فی الواقعہ جن نتائج کے

پیدا کرنے کا مدعی ہے، وہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ اسے کہتے ہیں الحق۔

قرآنی نظام میں اقتدار اور حکمرانی کی بنیادی پہچان: عزیز کے ساتھ حمید کی صفت لازم ہے

وہ جانتے ہیں کہ وَ یَهْدِیْۤ اِلٰی صِرَاطِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ (34:6) اس راستے پر چلنے سے یہ ہوگا کہ وہ راستہ وہاں پہنچا دے گا، جو خدائے عزیز وحمید کا متعین کردہ ہے۔ یہ الْعَزِیْزِ قوت اور غلبہ ہے۔ یہ قوت اور غلبہ ایسا نہیں ہے کہ ہر شخص نفرت کرے، گالیاں دے بلکہ یہ تو الْحَمِیْدِ ہے کہ جس غلبے کو دیکھ کر بے ساختہ زبان سے حمد وستائش نکلے۔ یہ وہ غلبہ ہے جو مظلوم کے حق میں ظالم کی کلائی مروڑ کر رکھ دے۔ اس سے بے ساختہ مظلوم کی زبان پہ الحمد آجاتا ہے۔ تو یہ ہے وہ عزیز جو ساتھ حمید بھی ہوتا ہے۔ یہ جو کلمہ کا حق ہونا ہے، اس کی محسوس چیز یہ سامنے آتی ہے کہ وہ واقعی اتنی قوت رکھتا ہے کہ دنیا سے ظلم اور استبداد اور استحصال کو مٹا کر مظلوم اور محتاج اور محکوم کی دادرسی کرے، اس کی تقویت کا موجب بنے، اس کو حق دلائے۔ یہ چیز اگر غلبہ کا نتیجہ ہے تو وہ الحق ہے۔ اور وہ لوگ جو وحی کی سچائی پر یقین رکھتے ہیں، وہ محسوس شکل میں اسے اپنے سامنے دیکھ لیتے ہیں۔

عزیزانِ من! قرآن کا ایک ایک لفظ ایسا ہے کہ اس پہ کھڑے ہو کر دیکھیے تو پورا نظام، ایک ایک آیت، ایک ایک لفظ، میں پیش کرتا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ یہ جو العزیز کے ساتھ الحمید کہنا ہے اس سے صحیح اسلام کا تصور سامنے آجاتا ہے یا نہیں؟ یہ عزیز ہے یعنی محض وعظ ونصیحت نہیں ہے، قوت وغلبہ رکھتا ہے چنگیز اور ہلاکو کی طرح، فرعون کی طرح، آمریت اور ڈکٹیٹر شپ کی طرح، نہیں رکھتا بلکہ اس کا غلبہ حمید ہے، جس کے نتائج دیکھ کر ہر چشم حقیقت میں پیکر حمد وستائش بن جاتی ہے۔ کیا بات ہے قرآن کی اور عربی زبان کی! یہ نہیں ہے کہ ہنگامی طور پہ کوئی بات ایسی کر دی۔ حمید تو باب ''فعیل'' کے وزن پر ہے، یہ آتا ہی اس وقت اس چیز کے لیے ہے کہ وہ مستقل، لازماً، مسلسل، وہی کچھ ہوتی چلی جائے۔ اُس غلبے کا نتیجہ وقتی یا ہنگامی طور پر نہیں ہوتا کہ کسی کے حق میں آیا۔ اس قسم کی چیزیں تو ہر ایک کر سکتا ہے۔ ہر فرعون، ہر چنگیز، ہر ہلاکو، کرتا ہے۔ اس کے بھی تو مقربین ایسے لوگ ہوتے ہونگے جن کے حق میں اس کا غلبہ جاتا ہوگا لیکن یہ حمید ہے اس کا لازمی نتیجہ مسلسل متواتر ہے کہ وہ غلبہ حمید بھی ہو، وہ ٹھوس تعمیری نتائج کا حامل ہو اور حقیقت ثابتہ ہو۔

مکافاتِ عمل کے تابع لادینی نظام کا حشر اور جوئے رواں زندگی کے تصور کا ماحصل

قرآن نے کہا ہے کہ وَ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا (34:7) یہ جو اس قانون کے ماننے والے نہیں ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ کسی طرح غلبہ حاصل کر لیا جائے، اس غلبے کی رو سے دولت حاصل ہو جاتی ہے تو عزت مل جاتی ہے، فتوحات مل جاتی ہیں، حکومت مل جاتی ہے۔ تو یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر قوت حاصل کر لی جائے تو پھر دنیا میں ہمیں کوئی پوچھنے والا ہی نہیں ہے، اس کے مقابلے میں یہ ایک دین ہے،

یہ ایک نظریۂ حیات ہے' سوال یہ نہیں ہے کہ اگر یہاں تم نے ایسا انتظام کرلیا کہ جو جی میں آئے تم کرتے جاؤ' کوئی پوچھنے والا نہ ہو۔ یہ بات نہیں کہ پھر تم چھوٹ گئے' معاملہ ختم ہوگیا۔ وہ کہتا ہے کہ خدا کا قانونِ مکافات' زندگی کے ساتھ چلتا ہے اور زندگی اسی دنیا میں ختم نہیں ہو جاتی۔

عزیزانِ من! دین اسلام الحق ہے' یہ کلمہ یعنی نظریہ زندگی مبنی بر حقیقت ہے اور اس سے خدا پر ایمان ہے۔ یہ صرف اس چیز پہ ایمان ہے کہ زندگی اسی طبعی زندگی (Physical Life) کا نام نہیں ہے' زندگی آگے بھی چلتی ہے اور قانونِ مکافات کے ذریعے نتائج برآمد کرنے کے لیے چلتی ہے۔ لہٰذا اگر یہاں کسی نے انتظام بھی کرلیا ہے کہ اس کے ظلم واستبداد کے خلاف' اس کی کلائی مروڑنا تو ایک طرف' کوئی شخص زبان پہ ایک حرف بھی نہ لائے تو وہ یہ نہ سمجھے کہ میں پھر اس قانون کی گرفت سے بالا ہوگیا' مجھے اب کوئی پکڑ نہیں سکتا۔ زندگی مسلسل چلتی ہے' خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل یہاں بھی نتیجہ دیتا ہے۔ اس کے لیے تو یہاں اور وہاں کا سوال ہی نہیں ہے۔ یہ ہے اصلِ ایمان کہ زندگی ختم نہیں ہوتی' سانس کے ختم ہونے کا نام زندگی کا خاتمہ نہیں ہے۔ قانونِ مکافاتِ عمل جاری و ساری رہتا ہے' خواہ یہاں زندگی ہو یا اس کے آگے مسلسل زندگی اور آگے چلے۔ یہ ہے اصلِ ایمان۔ یہ ایمان ہے تو خدا پر آپ کا ایمان بھی کام دے گا' وحی پہ ایمان ہوگا' رسالت پہ ایمان ہوگا' قرآن پہ ایمان ہوگا اور یہ سب کام دے گا۔ یہ باقی ایمان اس لیے ہیں کہ دو قسم کے راستے بتا دیئے گئے ہیں: ایک راستے پہ چلنے کا نام تباہی اور بربادی ہے' دوسرا راستہ وہ ہے جس میں خوشگواریاں ہیں' زندگی کا ارتقا ہے۔ یہی وحی ہے' رسول نے یہی دین پہنچایا ہے۔ بات تو اتنی ہے لیکن اگر یہ ہو کہ نہیں صاحب! زندگی اسی دنیا کی زندگی ہے' اس میں جو کچھ بھی جس طرح آدمی کرلے' موت کے ساتھ اس کا خاتمہ ہوا تو پھر خدا پہ ایمان کے کیا معنی رہے؟ کچھ بھی نہیں۔ وحی پہ ایمان' رسالت پہ ایمان اس کو کیا فائدہ دے گا؟ کچھ نہیں۔ کیا ہمارا اس طرح ایمان ہے؟ ہمارا ہی نہیں' پوری دنیا کے جو مسلمان ہیں' ان کی ایک ارب کے قریب آبادی نظر آتی ہے' کیا ان کا اس طرح خدا پہ' وحی پہ' رسول پہ' ایمان ہے؟

مسلمان ہونے کے باوجود دنیا بھر میں مسلمانوں کی اس قدر زبوں حالی کی وجہ جواز

پھر یہ حالت کیوں ہے؟ وہ جو اصلِ لم ہے' جس پہ ایمان ہونا ہے یا جس کے لیے یہ سارا ایمان ہے' وہ اس لم پہ ایمان نہیں ہے۔ ایک فرد ہو' گروہ ہو' قوم ہو' جماعت ہو' حکمران طبقہ ہو' اگر اس کا ایمان یہ ہے کہ میری نگاہ کی خیانتیں اور دل میں گزرنے والے خیالات بھی ایسے ہیں جس سے میرا مواخذہ ہو جائے گا' میں پکڑا جاؤں گا' اس کی سزا ملے گی' تو اس سے جرم سرزد ہی نہیں ہوسکتا' وہ کسی پہ زیادتی کر ہی نہیں سکتا۔ اصلِ ایمان یہ ہے۔ کہا کہ یہ جو لوگ ہیں' یہ کہتے ہیں کہ وَ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰى

رَجُلٍ یُّنَبِّئُکُمۡ اِذَا مُزِّقۡتُمۡ کُلَّ مُمَزَّقٍ اِنَّکُمۡ لَفِیۡ خَلۡقٍ جَدِیۡدٍ (34:7) کہتے ہیں' مذاق کرتے ہیں' استہزاء کرتے ہیں' ایک دوسرے سے کہتے ہیں کہ آؤ! تمہیں بتائیں' تمہیں معلوم ہے کہ یہاں ایک نیا آدمی پیدا ہوا ہے' وہ کہتا یہ ہے کہ جب تم مرجاؤ گے' ریزہ ریزہ ہوجاؤ گے' ہڈیاں بھی گل سڑ جائیں گی' تو اس کے بعد پھر ایک نئی زندگی میں تم اٹھائے جاؤ گے۔ کہا ہے کہ اَفۡتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اَمۡ بِہٖ جِنَّۃٌ (34:8) اور کہتا ہے کہ یہ کچھ اسے اللہ نے بتایا ہے! ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ یا تو یہ ہے کہ یہ شخص پاگل ہوگیا ہے اور اگر پاگل نہیں ہے تو پھر یہ شخص بڑا ہی فریب کار ہے' اپنے جی سے ایک بات گھڑی ہے اور کہتا ہے کہ خدا یہ کہتا ہے۔ آپ دونوں صورتیں دیکھیے کہ کیا عجیب چیز کہی ہے کہ یا تو پاگل ہوگیا ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر بہت بڑا مکار ہے' فریب کار ہے' اپنے جی سے بات گھڑتا ہے اور کہتا ہے کہ خدا یہ بات کہتا ہے۔

قرآنِ حکیم کی پوری تعلیم کا نقطہ ماسکہ مکافاتِ عمل کا تصور اور آخرت پہ ایمان ہے

کہا ہے کہ بَلِ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَۃِ فِی الۡعَذَابِ وَ الضَّلٰلِ الۡبَعِیۡدِ (34:8)۔ یہ ہے دین کا نقطۂ ماسکہ' اس لیے سارے قرآن میں یہ چیز آتی ہے' ساری تعلیم قانونِ مکافاتِ عمل کے گرد گھومتی ہے۔ کہا ہے کہ یہ لوگ جو اس طرح سے آخرت پر ایمان نہیں رکھتے' مستقبل پر ایمان نہیں رکھتے' اس زندگی کا مستقبل یا اس زندگی کے بعد کی آنے والی زندگی' وہ بھی مستقبل (Future) ہے' جو Future ہے وہ تو ایک سانس کے بعد اگلا سانس بھی پچھلے سانس کا Future ہے' آنے والا جو کل (Tomorrow) ہے' وہ آج کا کل (Future) ہے' ایک فرد کی زندگی کے اندر جو اگلے ادوار آتے ہیں' وہ آج کی زندگی کا Future ہیں اور جب یہ Future ہے' مستقبل ہے تو اِس زندگی کے بعد جسے آپ زندگی کہتے ہیں وہ بھی اس کا مستقبل ہے' اس لیے آخرت کا لفظ قرآن لایا ہے۔ اور اگر پیش پا افتادہ بات ہی لی جائے تو سیدھی بات یہ ہے کہ جو قوم کل کا فکر نہیں رکھتی وہ قوم کبھی زندہ نہیں رہ سکتی۔ وہ قوم زندہ رہتی ہے جو یہ نہ سوچے کہ آج تو آرام سے گزرتی ہے۔ قومیں وہ زندہ رہتی ہیں جو Long Range کے اوپر سوچتی ہیں' مستقبل کا سوچتی ہیں۔ وہ قوم جس کو یہ ضابطۂ حیات دیا ہے اس کے پہلے ہی صفحے پہ یہ چیز ہے کہ وبالاٰخرۃ ھم یؤقنون (2:4) مستقبل کے اوپر وہ قوم یقین رکھتی ہے' آج ہی کا نہیں سوچتی' اپنی آنے والی زندگی کا بھی سوچتی ہے' آنے والی نسلوں کا بھی سوچتی ہے۔ یہ تو پہلے صفحہ پہ آپ کو کہا گیا ہے۔ اور یہی ہے وہ ایمان جس سے عملاً ہمارا انکار ہے جس کی وجہ سے ہماری یہ صورت ہوگئی ہے۔ کہا ہے کہ فِی الۡعَذَابِ وَ الضَّلٰلِ الۡبَعِیۡدِ (34:8) اُنہوں نے صحیح راستہ چھوڑا اور اس طرح چھوڑا کہ وہ کہیں بہت دور چلا گیا۔ یہ جو ایمان ہے یہ اس صحیح راستے سے انکار ہے یا یہ جو کفر ہے وہ آخرت یا مستقبل کے متعلق انکار ہے۔ اس سے

انسان ایسے غلط راستے پر پڑتا ہے' جو اس کی منزلِ مقصود سے اس کو بہت دور لے جاتا ہے۔

خزاں کے بعد حیاتِ جدید (بہار) موت کے بعد کی زندگی کا زندہ ثبوت ہے

کہا ہے کہ آخرت کی زندگی کے متعلق یہاں تو کسی کو کوئی کچھ دکھا نہیں سکتا کہ واقعی یہ مستقبل کی چیز ہے' غور وفکر کرنے سے ہی یہ چیز آئے گی۔ اس کے لیے وہ کہتا ہے کہ اگر یہاں بھی تم دیکھو' غور وفکر کرو تو موت اور حیات نو کا سلسلہ تمہارے گرد و پیش جاری و ساری ہے۔ اس کے لیے کہا ہے کہ **اَفَلَمۡ یَرَوۡا اِلٰی مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡهِمۡ وَ مَا خَلۡفَهُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الۡاَرۡضِ** (34:9) زمین اور آسمان میں دیکھو تو سہی کہ موت اور حیاتِ نو کا سلسلہ کس طرح کارفرما ہے۔ کس طرح ایک ننھے سے بیج سے خاک میں مل کر ریزہ ریزہ ہو جانے کے بعد جو کچھ اُگتا ہے' وہ ایک نیا لبادہ اوڑھ کر نمودار ہو جاتا ہے۔ دیکھو کہ خزاؤں کے موسم میں کہیں سر سبزی کا' زندگی کا' نشان تک نظر نہیں آتا' موت طاری ہو جاتی ہے' پورے کے پورے درخت پہ ہی نہیں' ہر جگہ یہی کیفیت ہوتی ہے۔ خود انسان کی زندگی کی تاریخ پر غور کرو اور دیکھو کہ کس طرح' چاروں طرف سے' تباہ کن عناصر میں گھرے ہوئے ہونے کے باوجود' زندہ و پائندہ آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔

عزیزانِ من! کیا کبھی آپ Autumn (موسم خزاں) کے اندر کشمیر گئے ہیں؟ وہ اپنی جگہ موت کا ایک عجیب منظر رکھتا ہے۔ کہا ہے کہ اس کے بعد تم نے دیکھا نہیں کہ وہی جو پورے کا پورا ملک' خزاں دیدہ ہے' Valleys (وادیاں) خزاں دیدہ ہوتی ہیں' واقعی وہ عجیب وغریب منظر ہوتا ہے' اور چند ہی دنوں کے بعد جب ان میں سے پھر حیاتِ نو مسکرا کر باہر آتی ہے تو جو کیفیت اس کشمیر کی ہوتی ہے وہی اس موت کے بعد یہ زندگی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر یہ دیکھیں تو نظر آجائے کہ جسے یہ ایک نگاہ میں موت اور کامل موت کہتے ہیں' اس کے اندر تو حیاتِ جدید ہے۔ وہ چھپی ہوئی ہوتی ہے' وہ ان کی اس کو نگہی کے اوپر مذاق کر رہی ہوتی ہے کہ میں نے چہرے پر سے نقاب الٹنا ہے تو عروسِ بہار نے مسکراتے ہوئے سامنے آجانا ہے مگر یہ کہتے ہیں کہ یہ درخت ختم ہو گیا' اس پہ موت طاری ہو گئی۔

ہر آن کروڑوں کی تعداد میں دنیائے افلاک کے دامن سے ٹوٹنے والے شہابِ ثاقب اور تختِ محفوظ

ارشادِ خداوندی ہے کہ زمین کو تو دیکھو۔ اگر اس میں زلزلے کا ایک مہیب سا جھٹکا آئے تو کوئی بھی باقی نہ بچے اور اُدھر تم آسمان پر بھی دیکھو تو سہی' پوچھو علم الافلاک کے ماہرین سے کہ یہ جسے ہم شہابِ ثاقب کہتے ہیں' وہ دم تارہ جو یوں جاتا ہے' قرآن کہتا ہے کہ تمہیں معلوم نہیں کہ ہر آن یہ کروڑوں کی تعداد میں کرّوں میں سے الگ ہوتے ہیں۔ اگر یہ ایک دفعہ بھی کبھی سیدھا زمین کے اوپر

آ جائے تو یہاں ایک متنفس بھی باقی نہ رہے۔ کہا ہے کہ اس ہلاکت آفریں نظام کے اندر ایک حفاظت کر رہا ہے اور وہیں سے سامانِ زندگی بھی تمہیں مل رہا ہے جو بارش کی شکل میں ہوتا ہے۔ کہا ہے کہ **اِنۡ نَّشَاۡ نَخۡسِفۡ بِهِمُ الۡاَرۡضَ اَوۡ نُسۡقِطۡ عَلَيۡهِمۡ كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ** (34:9) اگر کہیں زلزلے کا ایک جھٹکا آ جائے تو بستیوں کا نام ونشان تک مٹ جاتا ہے۔ صوبۂ بہار کے زلزلے کی داستانیں ہمیں اب تک یاد ہیں۔ زمین یوں پھٹتی تھی اور اس کے اندر پورے کا پورا شہر چلا جاتا تھا اور زمین مل جاتی تھی۔ اُس نے کہا کہ آسمان سے یہ شہابِ ثاقب اس طرح سے اتنی تعداد کے اندر ہر آن گرتے رہتے ہیں، وہ تو موت ہی موت ہوتے ہیں لیکن اس میں تمہارے لیے زندگی رکھی ہوئی ہے، سامانِ مغفرت یعنی سامانِ حفاظت رکھا ہوا ہے۔ کیا یہ ان چیزوں کو دیکھتے نہیں ہیں؟

بنی اسرائیل کی داستانِ غم میں سے شوکتِ داؤدی اور سطوتِ سلیمانی کا ظہور

قرآن کہتا ہے کہ **اِنَّ فِيۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّكُلِّ عَبۡدٍ مُّنِيۡبٍ** (34:9) یہ مثالیں، یہ بصائر جو ہم دے رہے ہیں، ان سے حقیقت تک پہنچنے کی ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں مگر صرف ان کے لیے ہیں، جو اس طرف رجوع کرنے کا مادہ اپنے اندر رکھتے ہوں، جن کی نگاہ اس کے اوپر ہو کہ یہ وحی اصل میں کہنا کیا چاہتی ہے، یہ ان کے لیے صداقت تک پہنچ جانے کی بہت بڑی نشانیاں ہیں اور یہ ہوتے ہیں مومن۔ یہ تھے ہمارے عبدِ منیب، اب ان میں سے آگے ایک دو کا ذکر آ رہا ہے۔

کہا ہے کہ **وَ لَقَدۡ اٰتَيۡنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضۡلًا** (34:10) ہم نے داؤدؑ کو بڑی قوتوں اور فضیلتوں سے نوازا تھا۔ بنی اسرائیل کی داستان پیچھے سے چلی آ رہی تھی۔ ان کا وہ زمانہ جس میں ان پہ چاروں طرف سے موت طاری ہو رہی تھی، جس کے لیے قرآن نے کہا تھا کہ **وَ ضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ وَ الۡمَسۡكَنَةُ وَ بَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ** (2:61) محکومی، محتاجی، پستی، ذلت وخواری کی موت ان کے اوپر چاروں طرف سے طاری تھی۔ اس یکسر موت کی دنیا سے ان کے اندر زندگی ابھری ہے، حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ جیسے شہنشاہ پیدا ہو گئے۔ عزیزانِ من! شوکتِ داؤدی اور سطوتِ سلیمانی ضرب المثل ہے۔ کہا ہے کہ دیکھتے نہیں ہو کہ موت کے بعد زندگی کیسے آتی ہے لیکن یہ زندگی انہیں ملی، جو عبدِ منیب تھے، جنہوں نے اپنی توجہ کا رخ اس طرف موڑا کہ قرآن بات کیا کہتا ہے، خدا بات کیا کہتا ہے۔ جنہوں نے اس طرف رخ موڑا وہ سامانِ زیست کی فراوانیوں کے مالک بنے، ہم نے انہیں حصولِ نعمت کے جس قدر اسباب اور سامان تھے وہ عطا کیے۔ آپ دیکھیے تو سہی کہ بنی اسرائیل کی جو سراپا موت تھی، اس میں سے حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ کی شکل میں مجسمۂ زندگی کے، شادابیوں کے، قوتوں کے، سطوتوں کے ابھرے۔ کہا ہے کہ **وَ لَقَدۡ اٰتَيۡنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضۡلًا** (34:10)۔ یہاں ایک ہی لفظ ''فضل''، جو بہت جامع لفظ ہے، آیا ہے۔ اس میں فضیلتیں بھی آ جاتی ہیں، قوتیں بھی آ جاتی ہیں، سطوتیں بھی آتی ہیں، دولت

بھی آتی ہے۔ یہ ھٰذا من فضل ربی والا فضل نہیں ہے۔ وہ جو عبدِ منیب ہے' یہ ان کو ملتا ہے۔ فضل کے متعلق قرآنِ کریم نے دو چار مثالیں دی ہیں کہ اس کی کیا کیفیت تھی۔ کہا ہے کہ یٰجِبَالُ اَوِّبِیۡ مَعَهٗ وَالطَّيۡرَ وَ اَلَنَّا لَهُ الۡحَدِيۡدَ. اَنِ اعۡمَلۡ سٰبِغٰتٍ وَّ قَدِّرۡ فِی السَّرۡدِ وَاعۡمَلُوۡا صَالِحًا اِنِّیۡ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ (34:10.11)۔ ہمارے ہاں کی تفسیریں اور ترجمے اٹھا کر دیکھیے۔ یہ جو کبھی کبھی میں تفسیروں اور روایات کی بات کرتا ہوں تو دیکھیے کہ اس میں ابھر کر قرآن کی کیا حقیقت سامنے آتی ہے۔ قرآن کا انداز بھی تضاد سے (By Tuxtaposition) بات سمجھانے کا ہے اور میرا بھی یہی انداز ہے۔ جو میں نے قرآن سے لیا ہے۔ ہمارے ہاں آپ تفسیریں دیکھیے' کتبِ روایات دیکھیے' ترجمے دیکھیے کہ کیا لکھا ہوتا ہے۔ لکھا ہوتا ہے کہ حضرتِ داؤدؑ جب اپنے لحنِ داؤدی سے' انتہائی موسیقی سے' گاتے تھے یا حمد و نعت پڑھتے تھے' تو ان کے ساتھ پہاڑ بھی گایا کرتے تھے' پرندے بھی گایا کرتے تھے' وہ اکیلے ہی نہیں گایا کرتے تھے۔ یہ خدا کا جو فضل ہے اس کی تفسیر ہو رہی ہے۔

روایات میں حضرت داؤدؑ کی دست کاری کا بیان: لوہے کو ہاتھ میں لیتے ہی وہ موم ہو جاتا تھا

کہا ہے کہ وَ اَلَـنَّـا لَهُ الۡحَدِيۡدَ. (34:10)۔ میں عرض کروں کہ ہماری جو تفسیریں ہیں' ان میں کوئی مفسر یہ نہیں لکھتا کہ میری سمجھ میں یہ بات یوں آتی ہے یا میں اس کے متعلق یہ لکھ رہا ہوں بلکہ جو بھی اُنہوں نے لکھنا ہوتا ہے وہ قال رسول اللہ پہلے لگا دیتے ہیں کہ ایسا حضور ﷺ نے فرمایا ہے۔ اب اس کے بعد پھر آپ اعتراض ہی نہیں کر سکتے۔ جب کہہ دیا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا ہے تو پھر کچھ کہنے کی گنجائش کہاں رہتی ہے۔ یہ کہا کہ حضرت داؤدؑ نے اللہ تعالیٰ سے کہا کہ میں اس سلطنت و مملکت سے اپنی روٹی نہیں لینا چاہتا' مجھے کوئی دست کاری تو آتی نہیں ہے تو مجھے کچھ ایسا سکھا دیا جائے کہ وہ کام کر کے اس سے روٹی کما لیا کروں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو لوہاروں کا پیشہ سکھا دیا۔ اب مشکل یہ ہوگئی کہ وہ لوہا اسی طرح سے لے کر کوٹتے پیٹتے رہتے' تو پھر اور کام کیسے کرتے۔ یہ سکھا دیا اور اس کے ساتھ معجزہ یہ دیا کہ جب وہ لوہے کو پکڑتے تھے تو وہ ان کے ہاتھوں میں آ کر موم ہو جاتا تھا' وہ ایسے ایسے موڑتے تھے تو کلہاڑی بن جاتی تھی یا چھرا بن جاتا تھا' دو منٹ میں یہ کچھ بنا کر بیچ کر گھر چلے جاتے تھے اور باقی کام کرتے تھے۔ ''یعنی اوہنے اوہنوں اونج نہیں روٹی دیدتی۔ نک نوں ایوں ہتھ لایا ہیگا کہ کم لوہاراں دا ای کر'تے کر ایس طراں کہ لوہے نوں بھٹیاں اچ نہ پا'تے نہ ہتھوڑے نال کُٹ' لوہا ہووے یا موم تے ہتھ نال موڑ کے تے جیہڑی شے مرضی بنا لے''۔ پھر وہ یہ کرتے تھے کہ لوہا ہاتھ میں آتا تھا تو اس سے کیا کچھ بنا لیتے تھے۔ کہا کہ اَنِ اعۡـمَـلۡ سٰبِـغٰتٍ وَّ قَدِّرۡ فِی السَّرۡدِ (34:11) وہ اس سے زرہ بنایا کرتے تھے۔ جنگ کے اندر حفاظت کا سامان وہ تیر اور تلوار ہی ہوتے تھے' تو وہ زرہیں پہنتے تھے' وہ لوہے کی کڑیاں ہوتی تھیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کڑیوں پہ

ایسی نگاہ کرتے تھے کہ ایک کڑی دوسری کڑی کے اندر بالکل فٹ ہوتی چلی جاتی تھی۔ یہ ہے جو ہمارے ہاں تفسیروں میں حضرت داؤدؑ کے متعلق ملتا ہے کہ یہ کچھ کیا کرتے تھے۔ یہ چیز تو ان کے ذہن میں بھی نہیں آتی کہ جو رسول اور انبیائے کرامؑ تھے ان کی سلطنتیں اور مملکتیں بڑی عظیم ہوتی تھیں یہ بڑی بڑی عظیم مملکتوں کے سربراہ ہوتے تھے۔ یعنی باقیوں کے متعلق اگر آپ چھوڑ دیں تو قرآنِ کریم میں آپ دیکھیے کہ ان چیزوں کی شہادت ملتی ہے۔

انبیائے کرامؑ کو کتاب کے ساتھ مملکت و حکمت بھی یعنی بصیرت بھی عطا ہوتی تھی

کہا ہے کہ **اَمۡ یَحۡسُدُوۡنَ النَّاسَ عَلٰی مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ** (4:54) ان کو جو ہم نے عطا کیا ہے' وہ اپنے فضل سے عطا کیا ہے۔ یہی لفظ فضل یہاں آیا ہوا ہے۔ وہ کیا چیز ملی تھی جسے فضل کہا گیا ہے؟ کہا کہ **فَقَدۡ اٰتَیۡنَاۤ اٰلَ اِبۡرٰهِیۡمَ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَةَ** (4:54)۔ آلِ ابراہیم کو ضابطۂ قانون دیا' علم و حکمت دی' پھر **وَ اٰتَیۡنٰهُمۡ مُّلۡکًا عَظِیۡمًا** (4:54) بڑی عظیم مملکت دی۔ قرآن کی شہادت ہے کہ ان کے ساتھ ان کو مملکتِ عظیم ملی۔ جنہیں ہم یہ نبی اور رسول کہتے ہیں' وہ وعظ کرنے کے لیے نہیں آیا کرتے تھے' جنازے پڑھانے کے لیے نہیں آتے تھے۔ قرآن کہتا ہے کہ انہیں ملکِ عظیم دیا اور یہ تھا وہ فضلِ خداوندی۔ خالص ملکِ عظیم جو ہے' وہ تو ہلاکو اور چنگیز (1162-1227) اور ہٹلر (1889-1945) کو بھی مل سکتا ہے لیکن قرآن نے ساتھ **الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَةَ** بھی کہا ہے۔ ابھی میں عرض کرونگا کہ کتاب کے ساتھ حکمت کیا بات ہے۔ تو یہ سمجھ لیجیے کہ یہ جن کا ذکر ہو رہا ہے' وہ عظیم مملکت تھی۔ ان کے متعلق دوسری جگہ کہا ہے کہ یہ جو انبیائے کرامؑ تھے' **اُولِی الۡاَیۡدِیۡ وَ الۡاَبۡصَارِ** (38:45) ان کو دو چیزیں حاصل ہوئی تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ صاحبانِ قوت ہوتے تھے' قوت اور اقتدار ہوتا تھا۔ قرآنِ کریم میں ''یـد'' قوت کے لیے آتا ہے' طاقت کے لیے آتا ہے۔ طاقت اور قوت بھی ان کو تھی **الۡاَیۡدِیۡ** اور ساتھ ہی **وَ الۡاَبۡصَارِ** اور بصیرت بھی تھی۔ انہیں یہ دونوں حاصل ہوتی تھیں۔ یہ ہے جو کتاب کے ساتھ حکمت میں نے عرض کیا تھا۔ کتاب تو مملکت کا ضابطۂ قوانین ہے' حکمت اس کے ساتھ بصیرت ہے۔ یہ جو ان کو مملکت ملتی تھی' ان کو ضابطۂ قوانین ملتا تھا' حکمت ملتی تھی' تو اس کے ساتھ انہیں فہم دانائی بصیرت بھی حاصل ہوتی تھی اور یہ سب کچھ وہ وحی کی روشنی میں کرتے تھے۔

---

❶ یعنی اس سے انہیں ایسے ہی روٹی نہیں دے دی۔ ناک کو یوں ہاتھ لگایا کہ کام لوہاروں کا ہی کر' مگر کر اس طرح کہ لوہے کو بھٹیوں میں نہ ڈال' نہ ہی ہتھوڑے سے کوٹ' لوہا ہو یا موم ہو' اسے ہاتھ سے (موم کی طرح) موڑ اور جو شے چاہے حسبِ منشا بنا لے۔

قوت کے ساتھ بصیرت نہ ہو تو باقی سارے کا سارا فریب رہ جاتا ہے

اب یہ دیکھیے قرآن نے اُولِی الۡاَیۡدِیۡ وَ الۡاَبۡصَارِ (38:45)۔ یہ دو چیزیں اکٹھی کی ہیں: اقبالؒ (1938-1877) نے اسی کی تفسیر کر دی ہے:

رائے بے قوت ہمہ مکر و فسوں

قوت نہ ہو اور خالی رائے ہو، حکمت ہو، سمجھ بھی ہو، تو یہ سب بیکار ہے، مکر ہے، فُسوں ہے۔

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

رائے بے قوت ہمہ مکر و فسوں۔ اگر عقل ہے، ہوشمندی ہے، تدبیر ہے اور قوت ساتھ نہیں ہے، تو پھر یہ چیز فریب کارانہ ہو گی اور محض توہم پرستانہ ہو جائے گی۔ یہ آپ کی جو ایسی سیاست ہے، یہ مکر ہے جس کے اندر ابھی قوت حاصل نہیں ہوتی۔ قوت حاصل کرنے کے لیے جو کچھ کرتے ہیں، وہ سارے کا سارا فریب کارانہ انداز لیے ہوتا ہے۔ اور اگر وہ مذہب کی دنیا ہے تو ساری توہم پرستانہ چیز ہوتی ہے۔ یہ ہے جو کہا ہے کہ

رائے بے قوت ہمہ مکر و فسوں
قوتِ بے رائے جہل است و جنوں

قوت حاصل ہو اور اس کے ساتھ پھر رائے حاصل نہ ہو، نہ سمجھ ہو، نہ بصیرت ہو تو اندھے کے ہاتھ میں لٹھ ہوتی ہے۔ یا تو وہ بالکل جہالت کی چیز ہوتی ہے یا جنوں، پاگل پن ہوتا ہے۔

عربی زبان میں جبال بڑے بڑے سرداروں کو بھی کہا جاتا ہے

عزیزانِ من! قوت کے ساتھ اگر Reason اور Rationality نہیں ہے تو پھر یہ جہل و جنوں ہے۔ اسی لیے قرآن نے اُولِی الۡاَیۡدِیۡ وَ الۡاَبۡصَارِ (38:45) کہا ہے۔ اب مثال سے بات سنیے کہ اس نے کیا کہا ہے۔ حضرت داؤدؑ کو مملکتِ عظیم دی، قوت دی، بصیرت دی، حکمت دی۔ وہ قبائلی زندگی تھی، بڑے بڑے قبیلے ہوتے تھے جن کے اوپر یہ ایک مملکت کا سربراہ ہوتا تھا، قبائل کے سردار ہوتے تھے۔ عربی زبان میں ''جبال'' بڑے بڑے سرداروں کو کہتے ہیں جو پہاڑوں کی طرح محکم ہوں۔ مصیبت یہ ہے کہ یہاں عربی زبان پہ بھی یہ لوگ نگاہ نہیں رکھتے ہیں، ہر چیز کا Literal Meaning (لفظی معنی) لیتے ہیں۔ جبال کہا تو پہاڑ ہی معنی

لیتے ہیں۔ اس کے مجازی معنی بھی ہوتے ہیں۔ عربی زبان کے اندر یہ الفاظ مجازی معنوں میں عام استعمال ہوتے ہیں۔ جبال سرداروں کو کہتے ہیں یعنی اپنے مقام پہ جم کر کھڑے ہوئے۔ یہاں کہا ہے کہ یٰجِبَالُ اَوِّبِیْ مَعَهٗ وَالطَّیْرَ (34:10)۔حضرت داؤدؑ کی مملکت میں بڑے بڑے سرکش سردار اور قبیلہ طیر کے اکابر تھے جن سے گھوڑوں کے رسالے ترتیب پاتے تھے (21:79:27:15.16)۔

گھوڑوں کو پالنے والا قبیلہ جسے طیر کہا جاتا تھا

عزیزانِ من! اب آگے یہ ''طیر'' رہا جس کو یہ پرندے کہتے ہیں۔ اب تاریخ یہ بتا رہی ہے کہ یہ حضرتِ سلیمانؑ کے عہد میں زیادہ سامنے آیا۔ وہ ایک قبیلہ تھا جس کے افراد گھوڑے پالتے تھے اور اتنی تیزی سے بھاگنے والے گھوڑوں کے رسالے ہوتے تھے۔ اس زمانے میں گھوڑوں کے رسالے ہوتے تھے' ہمارے ہاں کل تک ابھی رسالے ہوتے تھے' انگریز کی فوج میں بھی رسالے ہوتے تھے۔ اس زمانے میں تو ابھی یہ گاڑیاں وغیرہ چلی ہی نہیں تھیں' جنگ کے لیے گھوڑے ہی ہوتے تھے۔ ''طیر'' وہ قبیلہ تھا۔ تیز رفتار گھوڑوں کے لیے ''طیر'' کا لفظ آتا ہے جسے ہم پرندہ کہتے ہیں یعنی اڑ کر جانے والے گھوڑے۔ وہ گھوڑے پالتے تھے' وہ گھوڑے سپلائی کرتے تھے' گھوڑوں کو تربیت دیتے تھے۔ مملکت میں اس قبیلے کے لوگ اس کام کے لیے Specialist (ماہر) ہوتے تھے۔ حضرتِ داؤدؑ اور حضرتِ سلیمانؑ کی فوج کے جو رسالے ہوتے تھے' ان کے نگران اور تربیت دینے والے اکثر قبیلہ طیر کے لوگ ہوتے تھے۔ تاریخ بتا رہی ہے کہ یہ قبیلہ طیر تھا۔ انہوں نے اس نسبت کے ساتھ اپنے نام کے ساتھ یہ لگا رکھا ہوگا۔ کہا کہ حضرت داؤدؑ اتنی بڑی مملکت کے مالک تھے۔ جبال یعنی بڑے بڑے سردار' قبیلۂ طیر کے بڑے بڑے اسپیشلسٹ' گھوڑوں کے رسالے والے' اَوِّبِیْ تھے یعنی وہ اس کے ساتھ ہماری اطاعت کیا کرتے تھے' وہ سرکش نہیں رہے تھے۔ آگے چل کر آئے گا کہ حضرتِ سلیمانؑ کے بعد جب سلطنت کمزور ہوئی تو یہی لوگ کتنے سرکش ہوگئے تھے۔ اب اس زمانے کی مملکت آئی۔

آج تو ہمارے ہاں صنعتی (Industrial) فیکٹریاں ہیں۔ اُس زمانے میں بھی ان کو اسلحہ کی ضرورت تھی۔ عزیزانِ من! یہاں مملکت کی بات ہو رہی ہے' ایک فرد حضرت داؤدؑ کی بات نہیں ہو رہی ہے۔ مملکت کے لیے اسلحہ کی ضرورت ہوتی تھی اس لیے کہا کہ اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ (34:11)۔ اور اسلحہ کے لیے تو لفظ ہی ''حدید'' آتا ہے جسے لوہا کہتے تھے۔ وہ اسلحہ ہوتا ہی لوہے کا تھا۔ وہ لوہے کا اسلحہ بناتے تھے اور سب سے بڑی چیز جو وہ مملکت کے لیے' لشکر کے لیے' فوج کے لیے بناتے تھے' وہ اسلحہ تھا اس میں جو زرہ بکتر تھی اس کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ اور وہ ایسی بنواتے تھے کہ وَّ قَدِّرْ فِی السَّرْدِ (34:11) ان کی کڑیاں ٹھیک ٹھکانے پہ ملی

ہوئی ہوتی تھیں۔ وہ اس قسم کا اسلحہ بناتے تھے۔ اب یہ بات آپ کی سمجھ میں آئی کہ پہاڑ اور پرندے گاتے تھے' ان کے ہاتھوں میں لوہا موم بن جاتا تھا' کیا ہے۔ وہ یوں بنتا تھا کہ اسلحہ سازی تھی لیکن یہ جو سب کچھ ہے' وہ تو فرعون بھی کرتا تھا' ہلاکو بھی کرتا تھا' یہاں کیا فرق ہے؟ کہا تھا کہ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا (34:11) اتنی بڑی قوت' اتنے بڑے ہتھیار' یہ اسلحہ' یہ سب کچھ' مملکت کے لیے ضروری ہے لیکن وَاعْمَلُوْا صَالِحًا (34:11) ان سے کام یہ لو کہ انسانیت کی صلاحیتیں بیدار ہوں' ان سے انسانیت کو کچلنے کا کام نہ لینا۔

نبیؑ کی مملکت وقوت اور چنگیز کی حکمرانی میں فرق صرف حکمت کا ہی ہوتا ہے

عزیزانِ من! یہ ہے ایک نبی' رسولؑ کے اسلحہ خانے میں اور ایک چنگیز کے اسلحہ خانہ میں فرق۔ حدید اس کے پاس بھی ہوتا ہے' حدید اِن کے پاس بھی ہوتا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا (34:11) یہ سب سامانِ جنگ' انسانوں کے کام سنورنے کے لیے استعمال میں آنا چاہیے' نہ کہ دنیا میں فساد برپا کرنے کے لیے۔ اور اس کے اوپر بات وہی آ گئی جو میں نے پہلے کہی تھی کہ اس چیز پہ ایمان ہو کہ اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ (34:11) اے اتنی عظیم مملکت کے سربراہ اور شہنشاہ! سمجھ رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو ہماری نگاہ اس کے اوپر ہے۔ یہ ہے فرق انبیائے کرام یا جماعتِ مومنین کی مملکت کا اور بے راہ رو ہونے والوں کا جن کو آخرت پہ ایمان نہیں ہے' جن کے سامنے بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ (34:11) نہیں ہے۔ ان دونوں میں یہ فرق ہوتا ہے۔ اگر یہ نگاہ میں ہو کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں' کوئی دیکھنے والا ہے' پوچھنے والا ہے' میرے اوپر ایک اور پاور ہے تو دنیا میں فساد برپا نہیں ہوتا۔

انسانوں کی قائم کردہ سیاسی مملکت کے برعکس قرآنی مملکت اور قرآنی آئین کا امتیاز

دنیا کی سیاست میں سب سے بڑی چیز Sovereignty (اقتدارِ مطلق) ہے۔ Sovereignty (اقتدارِ مطلق) کے معنی یہ ہیں کہ جو Accountable to none ہو' جو کسی کے سامنے جوابدہ نہ ہو۔ کوئی بھی مملکت کا آئین آپ رکھیے کسی قسم کا آئین ہو' آخر میں ایک اتھارٹی وہ ہوتی ہے جس کے اوپر کوئی ایسی اتھارٹی نہیں ہوتی جس کے سامنے وہ جوابدہ ہو۔ یہ جسے ہم حکومتِ خداوندی کہتے ہیں' جو وحی کی رو سے' قرآن کی رو سے' نظام قائم ہوتا ہے' مملکت قائم ہوتی ہے' اس میں یہ Sovereignty (اقتدارِ مطلق) والی اتھارٹی کوئی بھی نہیں ہوتی۔ اس میں جو سب سے بالاتر اتھارٹی ہوتی ہے' اس کے متعلق کہا کہ اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ (34:11) تمہارے اوپر ہم اتھارٹی ہیں۔ عزیزانِ من! یہ ہے فرق۔ جسے آپ کہتے ہیں کہ نظامِ اسلامی کیا ہوتا ہے' نظامِ مصطفیٰ ﷺ کیا ہوتا ہے' سنو! اس میں یہ ہوتا ہے مگر یہ وہی کر رہے ہیں' وہ جو میں نے کہا ہوا ہے کہ ''ایہہ سارے پانی رڑ کدے پئے

نیں❶ '' اس میں ڈھونڈ رہے ہیں کہ اس نظام کے اندر جو Sovereignty (اقتدارِ مطلق) ہے وہ کس طرح سے قائم ہوگی۔

خارجی کائنات میں تو خدا کی حکمرانی لیکن انسانوں کی دنیا میں انسان پر انسان کی حکومت

قرآن کہتا ہے کہ انسان پر انسان کی حکومت کا یہ تصور ہی باطل ہے' اس میں تو Sovereign Power (قوتِ مطلق) اس مملکت کے اندر کوئی ہوتی ہی نہیں۔ جو بھی بڑا سربراہِ مملکت ہو' President (صدر) ہو وزیرِ اعظم ہو' آپ کوئی کیبنٹ بنا لیجئے' کچھ بھی بنایئے' وہ Sovereign (قوتِ مطلق) نہیں ہوسکتی۔ اس کے لیے تو اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ (34:11) ہونا ضروری ہے۔ ہم اس کے اوپر نگران ہوتے ہیں۔ تو❷ Sovereignt belongs to God ہے۔ الفاظ تو انہوں نے بھی اپنے آئین کی تمہید میں یہی رکھے۔ کہا تھا کہ باہر کی جو Universe (کائنات) ہے اس میں خدا کی Sovereignty (اقتدارِ مطلق) ہے مگر ہمارے آپ کے اوپر' انسانوں کے اوپر نہیں ہے۔ معاملہ انسانوں کی مملکت کا طے کر رہے تھے اور اس کے اندر یہ رکھا تھا۔ آپ دیکھیے کس طرح گاندھی جی بھی خوش رہیں' راضی رہے سرکار بھی۔ مذہب بھی راضی ہوگیا کہ دیکھیے جی ہم نے اس کے اندر لکھدیا کہ اقتدارِ اعلیٰ خدا کا ہوگا۔ کہاں ہوگا؟ خارجی کائنات میں ہوگا۔ اور یہاں؟ یہاں پارلیمنٹ کو ہوگا' پریذیڈنٹ کو ہوگا' امریکن سسٹم کو ہوگا۔ بہرحال بات دوسری طرف چلی گئی۔

یہودیت کی کتابوں میں حضرت داؤدؑ کے متعلق حیا سوز قصے جو کتبِ احادیث میں راہ پا چکے ہیں

یہ بات ہے حضرتِ داؤدؑ کی۔ ایک چیز بڑی ضروری ہے جو میں کہنا چاہتا ہوں۔ حضرتِ داؤدؑ کے متعلق اس قسم کے قصے آئے ہوئے ہیں کہ ان کو دیکھ کر حیا کی نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ یہودیوں کی تورات وغیرہ کتابیں ہیں' یہودی ان کو اپنا نبی مانتے ہیں اور ان انبیائے کرام کے کیریکٹر کے متعلق اس قسم کے شرمناک اور حیا سوز قصے ان کے اندر ہیں۔ آپ ان کو پڑھ نہیں سکتے۔ ٹھیک ہے ان کے ہاں ہوں تو ہوں مگر قرآن تو اسی لیے ان کو مسترد کرتا ہے' پھٹک کر رکھ دیتا ہے کہ یہ محرف ہے' یہ خدا کا کلام نہیں ہوسکتا لیکن وہی ان کے جو قصے ہیں' وہ ہماری کتبِ احادیث کے اندر راہ پا گئے ہیں' انہوں نے ان کے اندر درج کر دیئے ہیں۔ اب یہ تورات کا قصہ نہ رہا۔ اب آپ کے ہاں کا (معاذ اللہ) قال رسول اللہ آ گیا کہ حضور ﷺ نے فرمایا ہے۔ وہاں فرمایا ہے تو تفسیر میں آیا ہے۔ تورات میں حضرتِ داؤدؑ کے متعلق یہ لکھا ہوا ہے۔ میں اپنی بیٹیوں اور بہنوں سے معذرت کے ساتھ یہ عرض کرتا ہوں۔ اس میں یہ

---

❶ یہ تمام (مکھن نکالنے کے لیے) صرف پانی بلو رہے ہیں۔

❷ اقتدارِ اعلیٰ خدا کا ہے۔

قصہ ہے کہ ایک روز شام کے وقت داؤدؑ اپنے محل کی چھت پر ٹہل رہا تھا' انہوں نے (معاذ اللہ) حتی اور یاہ کی بیوی کو اس حالت میں دیکھ لیا کہ وہ برہنہ تھی' اور نہا رہی تھی۔ اس کے بعد داؤدؑ نے اس کے شوہر حتّی اور یاہ کو بنی عمون کے مقابلہ پر جنگ میں بھیج دیا۔ یو آب فوج کا ایک کمانڈر تھا' اس کو لکھا کہ اسے جنگ میں کسی ایسی جگہ پر مامور کر دے کہ جہاں وہ لازماً مارا جائے اور پھر اس کو اکیلا چھوڑ کر الگ ہو جاتا کہ وہ مارا جائے۔ چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا اور وہ لڑائی میں مارا گیا۔ اس طرح حتّی اور یاہ کو ٹھکانے لگانے کے بعد' داؤدؑ نے اس عورت سے نکاح کر لیا اور اس کے پیٹ سے سلیمان پیدا ہوا۔ یہ دونوں کو نبی مانتے ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ ہزار بار معذرت اور معاذ اللہ کے ساتھ میں یہ عرض کر رہا ہوں۔ آگے ہے کہ خدا کو داؤد کا یہ فعل ناگوار ہوا اور اس نے ناتن نبی کو داؤد کے پاس بھیجا۔ ناتن نے اس سے کہا کہ ایک شہر میں دو شخص تھے۔ ایک مالدار تھا' دوسرا فقیر تھا۔ مالدار شخص کے پاس بہت سی بکریاں اور گائیں تھیں' فقیر کے پاس صرف ایک چھوٹی سی دنبی تھی جس کو وہ بڑی محبت سے پالتا تھا۔ ایک مرتبہ مالدار شخص کے پاس کچھ مہمان آئے۔ اس نے نہ چاہا کہ اپنی بکریوں اور گائیوں میں سے کسی کو کاٹے۔ اس نے فقیر کی دنبی لے لی اور اس سے ضیافت کا سامان کیا۔ اس ناتن نبی نے آ کر داؤد علیہ السلام سے یہ قصہ بیان کیا۔ یہ قصہ سن کر داؤد علیہ السلام بہت غضبناک ہوا اور کہا کہ ایسا شخص ضرور مارا جائے گا اور اس فقیر کو ایک کے بدلے چار دنبیاں دلوائی جائیں گی۔ ناتن نے کہا کہ وہ شخص تو تُو ہی ہے اور اسے حتّی اور یاہ کا واقعہ یاد دلایا۔

مودودی مرحوم کے نزدیک اس واقعہ کی تصویر کشی تفہیم القرآن میں کچھ یوں ہے

میں نے عرض کیا ہے کہ یہ چیز تورات کی ہے اور آپ کے ہاں یہ روایات میں آ گئی ہوئی ہے' آپ کی کتبِ تفاسیر میں یہ آ گئی ہوئی ہے۔ اب ہمارے دور میں یہ سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم (1979-1903) ہمارے دور کے بہت بڑے مفسر مشہور ہوئے' مفکر مشہور ہوئے' مجدد مشہور ہوئے' انہیں خدا کا شاہکار بھی کہا گیا۔ جب تفسیر میں یہ آیات آئیں' یہ قصہ سامنے آیا' اُنہوں نے کہا کہ اس قصے میں حضرتِ داؤدؑ کے اخلاق کی ایسی تصویر کھینچی گئی ہے جو ایک نبی تو درکنار ایک معمولی بادشاہ کے لیے بھی انتہائی شرمناک ہے۔ اب دیکھیے وہ صفائی کیسے پیش ہو رہی ہے۔ کہنے لگے کہ اصل قصہ یہ تھا۔ مودودی مرحوم کی تفسیر تفہیم القرآن کی چوتھی جلد میں اس واقعہ کے متعلق یہ لکھنے کے بعد لکھا ہے کہ اصل واقعہ جو قرآنِ مجید کے بیان سے صاف سمجھ میں آتا ہے' وہ یہ ہے کہ حضرتِ داؤدؑ نے اور یاہ سے محض یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دیدے تاکہ میں اس سے نکاح کر لوں۔ یہ بات ہے کہ اور یاہ کو جنگ کے لیے بھیج دیا۔ توبہ توبہ ایک نبی تو درکنار' یہ تو ایک معمولی بادشاہ کے لیے بھی انتہائی شرمناک ہے۔ اصل بات جو قرآن کے بیان سے واضح ہوتی ہے وہ یہ تھی کہ انہوں نے اس حتّی اور یاہ کی بیوی کو دیکھا تو اس کے بعد اس کو بلایا اور اس سے یہ کہا کہ تم اپنی بیوی کو طلاق دو

تا کہ میں اس سے نکاح کروں۔ اور چونکہ یہ خواہش ایک عام آدمی کی طرف سے نہیں بلکہ ایک جلیل القدر فرمانروا اور ایک دینی عظمت رکھنے والی شخصیت کی طرف سے رعایا کے ایک فرد کے سامنے ظاہر کی گئی تھی اس لیے وہ شخص کسی ظاہری جبر کے بغیر بھی اپنے آپ کو اسے قبول کرنے پر مجبور پا رہا تھا[1]۔

خدا کی حکومت میں خدا کے نبی کا یہ کیریکٹر (معاذ اللہ)!!!

یہ کیا ہے حکومتِ خداوندی' سبحان اللہ خدا کا رسول سربراہ ہے اس کے اندر کیفیت یہ ہے کہ اس کی رعایا کا ایک فرد اپنے آپ کو اپنی بیوی کو طلاق دینے کے لیے مجبور پا رہا ہے تا کہ وہ اس کو لے لے۔ عزیزانِ من! ''مجبور پا رہا ہے''۔ خدا کی مملکت میں بھی' خدا کی حکومت میں بھی' اگر یہ کیفیت ہو کہ ایک شخص سربراہِ مملکت کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے اپنے آپ کو مجبور پا رہا ہو کہ اپنی بیوی کو طلاق دے کر اس کو دیدے' تو کیا یہ حکومتِ خداوندی ہے؟ خدا کی حکومت' نبی اس کا سربراہ اور اس میں بھی یہ کیفیت ہو کہ رعایا کا ایک فرد مجبور ہو رہا ہو!!! یاللعجب۔ کہتا ہے کہ ظاہری جبر کی ضرورت ہی کہاں پڑتی تھی۔ یہ تھا وہ نظام جو یہاں قائم کرنے کے لیے یہ ساری کوششیں ہو رہی تھیں۔ فرد مجبور پا رہا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے۔ اس موقعہ پر قبل اس کے کہ وہ حضرتِ داوٗدؑ کی فرمائش کی تکمیل کرتا قوم کے دو نیک آدمی اچانک حضرت داوٗدؑ کے پاس پہنچ گئے اور انہوں نے ایک فرضی مقدمے کی صورت میں یہ معاملہ ان کے سامنے پیش کر دیا۔ یعنی ان کو بھی آ کر یہ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی کہ تم یہ جو کچھ کہہ رہے ہو' یہ غلط ہے کس قدر زیادتی ہے۔ دو نیک آدمی آئے' آ کر بھی ان کو یہ جرأت نہیں ہوئی کہ براہِ راست صاف کہدیں کہ آپ کیا بات کر رہے ہیں۔ یہ اس دور کے مجدد' مفکرِ اعظم' خدا کا شاہکار ان کو کہا گیا ہے' وہ لکھ رہے ہیں۔ دو نیک آدمی آ کر فرضی مقدمے کی صورت میں یہ معاملہ ان کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ حضرتِ داوٗدؑ ابتدا میں تو یہ سمجھے کہ یہ واقعی کوئی مقدمہ ہے' انہوں نے اسے سن کر اپنا فیصلہ سنا دیا لیکن زبان سے فیصلہ کے الفاظ نکلتے ہی ان کے ضمیر نے تنبیہ کی کہ یہ تمثیل پوری طرح ان کے اور اس شخص کے معاملے پر چسپاں ہوتی ہے۔ اور جس فعل کو وہ جرم قرار دے رہے ہیں اس کا صدور خود ان پہ اس شخص کے معاملے میں ہو رہا ہے۔ یہ احساس دل میں پیدا ہوتے ہی وہ سجدے

---

[1] حوالے کے لیے دیکھیے: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ: تفہیم القرآن (جلد چہارم)' مرکزی مکتبہ اسلامی' دہلی' 1993' ص ص۔ 327 تا 329۔

میں گر گئے اور توبہ کی اور اپنے فعل سے رجوع فرمالیا۔ اس طرح آپؑ کی بریّت ہوگئی۔ ان کا شکریہ ادا کیا کہ آپ نے وہاں میری بریّت کردی۔ مودودی صاحب (1979-1903) کہتے ہیں کہ یہ قرآن سے صاف طور پر سمجھ میں آتا ہے۔ وہ طلاق دینے کو مجبور ہو رہا تھا قبل اس کے وہ یہ کرگزرتا دو نیک بندے ان کے پاس آئے' فرضی مقدمہ ان کے سامنے پیش کیا' انہوں نے فیصلہ سنا دیا کہ واقعی بڑی زیادتی ہے۔ فیصلہ سناتے ہی ضمیر نے تنبیہ کی کہ یہ تو بڑا ظلم ہو رہا ہے اور پھر ذہن میں آیا کہ یہ تو وہی بات ہے' اس شخص کے ساتھ جو میرا معاملہ ہو رہا ہے' بڑا ظلم کر رہا ہوں۔ سجدے میں گر گئے' توبہ کی' خدا کے ہاں سے معافی مانگی' اپنے فعل سے رجوع فرمالیا۔ آپ نے غور فرمایا کہ کس طرح سے تورات کے ان افسانوں کی اصلاح ہو رہی ہے' قرآن سے کیا بات صحیح ثابت ہو رہی ہے۔

مودودیؒ کی نظروں میں مقامِ نبوت

یہ لکھنے کے بعد مودودیؒ کے ذہن میں یہ بات آئی کہ اس سے تو یہ کھٹک پیدا ہوتی ہے کہ خدا کے رسول سے بھی یہ کچھ ہو جایا کرتا تھا تو اس کے لیے انہوں نے کچھ وجہ جواز (Justificatory Reason) کو پیش کرنا چاہا کہ ان سے بھی اس قسم کی بات ہو جاتی ہے۔ کہا کہ بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اس قسم کی لغزشوں کا انتساب عصمتِ انبیاء کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں یہ چیز ایمان میں داخل ہے کہ انبیائے کرام معصوم ہوتے ہیں یعنی ان سے گناہ یا خدا کی معصیت نہیں ہوتی۔ کہتے ہیں کہ بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اس قسم کی لغزشوں کا انتساب عصمتِ انبیاء کے خلاف معلوم ہوتا ہے لیکن ان حضرات نے شاید اس طرف غور نہیں کیا کہ عصمت دراصل انبیائے کرام کے لوازم ذات سے نہیں ہے' اپنی ذات سے ان کے لیے یہ بات نہیں ہوتی کہ وہ گناہوں سے بچتے ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو منصب نبوت کی ذمہ داریاں صحیح طور پر ادا کرنے کے لیے مصلحتاً خطاؤں اور لغزشوں سے محفوظ فرما دیا۔ اپنے طور پہ وہ بااخلاق صاحبِ کردار نہیں تھے خدا نے نبی بنایا اور اس کے بعد یہ آیا کہ یہ میرا بنایا ہوا نبی میرے نام پہ یہ کچھ کرے گا۔ اگر اس سے یہ کچھ ہونا شروع ہوگیا تو وہ تو ہماری بدنامی ہوگی' مصلحتاً خطاؤں اور لغزشوں سے محفوظ فرما دیا ورنہ اگر اللہ تعالیٰ کی حفاظت تھوڑی دیر کے لیے بھی ان سے الگ ہو جائے تو جس طرح عام انسانوں سے بھول چوک اور غلطی ہوتی ہے' اسی طرح ان سے بھی ہو سکتی ہے۔

عزیزانِ من! انبیائے کرام کی سیرت اور اخلاق قرآنِ کریم میں قیامت تک کے لیے اسوہ قرار دیا ہے۔ اس اخلاق و کردار کے متعلق کہا یہ جا رہا ہے کہ ذاتی طور پہ وہ ایسے نہیں ہوتے تھے کہ ان گناہوں سے' معصیت سے' وہ بچتے بلکہ اللہ تعالیٰ ان کو محفوظ رکھتا

تھا۔ یعنی وہ خدا کی طرف سے نیک ہونے پر مجبور تھے ورنہ اگر خدا کی حفاظت تھوڑے سے وقت بھی ان سے الگ ہو جائے تو وہ وہی کچھ کریں جو باقی لوگ کرتے ہیں۔ اس عقیدے سے عصمتِ انبیائے کرام کے اوپر کوئی فرق نہیں پڑتا کہ خود ذاتی طور سے وہ گناہوں سے نہیں بچا کرتے تھے' خدا ان کو جبراً بچا لیا کرتا تھا۔ عزیزانِ من! یہ جبر کی نیکی کو کیا آپ نیکی کہیں گے؟ کہتے ہیں کہ ذرا سا بھی خدا کی وہ حفاظت ان سے الگ ہوتی تو جو کچھ باقی لوگ کرتے ہیں وہی کچھ وہ کرتے:

شیخ صاحب وہی کرتے ہیں جو سب کرتے ہیں

یہ الگ بات ہے ہم ان کا ادب کرتے ہیں

ذاتِ خداوندی انبیائے کرام سے خود بھی ایک دو لغزشیں کرواتی ہے (العجب اور معاذ اللہ)

انبیائے کرامؑ کے متعلق ان کی جو بلندیٔ سیرت ہے' اس کے لیے کہہ رہے ہیں کہ وہ ان کی اپنی ذاتی نہیں ہوتی تھی۔ جس طرح حوالات میں دیا ہوا چور چوری نہیں کر سکتا (معاذ اللہ معاذ اللہ) یہ انبیاء کی سیرت پیش ہو رہی ہے۔ آگے پھر یہ ہے کہ صاحب! یہ اس قسم کی بات تو ہوگئی۔ یہ کیسے ہوئی؟ کہتا ہے کہ ایک لطیف نکتہ یہ ہے کہ اللہ نے بالا رادہ ہر نبی سے کسی نہ کسی وقت اپنی حفاظت اٹھا کر ایک دو لغزشیں سرزد ہونے دیں۔ مصلحتاً تو وہ کیا اور بالا رادہ یہ کیا تاکہ لوگ انبیاء کو خدا نہ سمجھ لیں اور جان لیں کہ یہ بشر ہیں اور خدا نہیں ہیں۔ اب دیکھیے' انبیائے کرامؑ کی مشکل دیکھیے کہ اراداتاً تو خدا ان سے لغزشیں کرا دیتا تھا' دنیا دیکھتی تھی کہ ان سے لغزش ہوئی۔ ان کے پاس اس کا ثبوت کیا تھا کہ یہ میں نے نہیں کی' یہ لغزش خدا نے کرائی ہوئی ہے۔ ثبوت تو تھا ہی نہیں' لوگ ان کی لغزش سمجھتے تھے۔ اس قدر مجبور ہیں کہ لغزش اپنی طرف سے نہیں ہوئی بلکہ لغزش اس نے کرائی ہے۔ جس نے کرائی ہے وہ اوپر بیٹھا ہے' سامنے آتا نہیں ہے یہ لوگوں کے سامنے ہیں' مصیبت میں پھنسے ہوئے ہیں۔ یہ اس کے اندر ثابت ہی نہیں کر سکتے کہ میں گناہگار نہیں ہوں۔

گناہ گرچہ نبود اختیارِ ما حافظ

تو در طریقِ ادب کوش و گو گناہ من است

ادب کا طریقہ یہی ہے کہ یہ نہ کہو کہ خدا کی طرف سے ہوا ہے بلکہ یہ کہو کہ ٹھیک ہے میں نے ہی کیا ہے۔

نبی سے غلطی خود خدا کرواتا ہے اور پھر معافی بھی نبی سے منگواتا ہے (معاذ اللہ)

خدا نبیوں سے بالا رادہ یہ کراتا تھا اور پھر ان کو جب احساس ہوتا تھا تو یہ سجدے میں گر جاتے تھے' توبہ کرتے تھے' روتے تھے

اور وہ کہتا تھا کہ جا معافی ہے۔ ''یعنی آپ ہی اوہدے کولوں کرایا ہیگا ❶'' کہا کہ جاؤ تمہیں معاف کیا۔ عزیزانِ من! یہ آپ دیکھیے' آپ کے اس دور کی یہ سب سے آخری تفسیر ہے۔ اتنی عظیم جس شخصیت کو بنایا ہوا تھا' یہ اس کی تفسیر آ رہی ہے۔ بہرحال ان کا معاملہ ان کے خدا کے ساتھ ہے۔

نوجوان نسل سب سے زیادہ متنفران تفسیروں سے ہوئی ہے

میں اتنا ضرور عرض کرونگا کہ کم ازکم ہمارے ہاں کی نوجوان تعلیم یافتہ نسل کو اسلام سے برگشتہ ہی نہیں' متنفر کرنے میں جتنا کام یہ شخص کر گیا ہے کسی اور نے نہیں کیا۔ یہ تفسیر آپ ان کے سامنے پیش کیجیے تو سوچیے کہ خدا کے متعلق کیا تصور ہوگا' خدا کے انبیاء کے متعلق کیا تصور ہوگا۔ پہلے جو کچھ آتا تھا ہم کہتے تھے کہ ہمارے ہاں یہ تورات کے افسانے داخل ہوگئے۔ وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ قرآنِ مجید سے خاص طور پہ جو بات سمجھ میں آتی ہے' وہ یہ ہے۔ اور اس کی توجیہہ یہ پیش کی جارہی ہے کہ یہ انبیاء خود گناہوں سے مجتنب نہیں رہتے تھے' وہ تو خدا ان کو حفاظت میں رکھتا تھا تو رہتے تھے۔ ذرا اس کی حفاظت اُدھر ہوئی تو جو عام آدمی کرتے ہیں وہی کچھ یہ کرتے تھے۔ اور پھر خدا بالا رادہ ان سے لغزشیں کرا دیتا تھا۔ ذرا لغزش ہو تو عام لوگ اتنا تو کہہ دیتے تھے کہ صاحب! شیطان نے یہ کچھ کرا دیا ہے یہ بیچارے نبی یہ بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ خدا بالا رادہ ان سے یہ کرا دیتا تھا اور پھر ان کی سیرت کو' ان کے کردار کو' قیامت تک کے انسانوں کے لیے خدا اسوۂ حسنہ بھی قرار دیتا تھا۔

عزیزانِ من! یہ ہے جو آپ کے سامنے قرآن کی تفسیر پیش کی جارہی ہے۔ پرویز (1903-1985) پہ کفر کا فتویٰ لگنے سے یہ چیزیں ڈھل نہیں جاتیں۔ ٹھیک ہے کافر سے زیادہ بھی کچھ کہہ لو لیکن جن تحریروں سے خدا کے انبیائے کرامؑ پر' اس کی وحی پر' اس کے رسولوں پر' اس قسم کا طعن پڑتا ہو کم ازکم میری غیرت تو اس کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ میں اس کو برداشت کروں۔ ٹھیک ہے کسی اور کا مطلب ہو یا نہ ہو' میں تیس سال سے ان کے خلاف جہاد کرتا رہا کہ خدا کے لیے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو اسلام سے متنفر نہ کرو۔ ان کے ترجمے ساری دنیا میں شائع ہو رہے ہیں' پتہ نہیں کہاں سے روپیہ آتا ہے۔ انگریزی میں ترجمے شائع ہو رہے ہیں۔ کیا کہے گی دنیا آپ کے اسلام اور آپ کے قرآن اور آپ کے خدا اور آپ کے رسولوں کے متعلق!!!

قرآنِ حکیم کی روشنی میں حضرت داؤدؑ کے اس بیان کردہ واقعہ کی اصل حقیقت

میرا خیال ہے کہ آپ انتظار میں ہونگے کہ وہ آیتیں کونسی ہیں' جن کے اندر یہ کہا گیا ہے' جن سے اوریاہ اور اس کی بیوی کا

---

❶ یعنی خود ہی اس سے کرایا ہے۔

طلاق کا قصہ آ گیا۔ مودودی صاحب نے کہا ہے کہ قرآن سے یہ بات صاف ہو رہی ہے۔ آپ کے ذہنوں میں ہوگا کہ پھر تو قرآن میں صاف لکھا ہوا ہونا چاہیے۔ آپ انتظار کر رہے ہونگے کہ وہ آیتیں تو سامنے آئیں۔ یہودیوں کی سرمایہ پرستی جو ہے' یہ تو دنیا میں ضرب المثل ہے' بڑی سرمایہ دار قوم ہے' انتہا تک سرمایہ داری پہنچتی ہے۔ سرمایہ داری کی بنیاد اس پہ ہوتی ہے کہ بڑا سرمایہ چھوٹے سرمائے کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے:

مایا کو مایا ملے کر کر لمبے ہاتھ

تلسی داس غریب کی کوئی نہ پوچھے بات

بڑا سرمایہ چھوٹے سرمائے کو کھینچتا ہے۔ وہ گاؤں کے زمیندار نے سن رکھا تھا کہ روپیہ روپے کو کھینچتا ہے۔ اس نے کہا کہ دن رات محنت کرنے کے بعد بھی کچھ نہیں بنتا۔ ایک روپیہ کسی طرح سے اس نے اکٹھا کر لیا' شہر میں اس نے دیکھا کہ صراف کی دکان کے اوپر روپے کا ڈھیر لگا ہوا ہوتا ہے۔ وہ گیا' وہاں دکان کے سامنے کھڑا ہو گیا اور اپنا روپیہ اس کے ڈھیر میں ڈال دیا۔ وہ صراف بھی یہودی بنیا تھا' دیکھتا رہا۔ اب یہ اس کے بعد انتظار میں ہے کہ میرا روپیہ دوسرے روپے کھینچ کر لائے کیونکہ روپیہ روپے کو کھینچتا ہے۔ کچھ دیر کھڑا رہا تو اس نے پوچھا کہ میاں صاحب! آپ کیسے کھڑے ہیں' کس انتظار میں ہیں؟ کہنے لگا جی! میں نے سنا یہ تھا کہ روپیہ روپے کو کھینچتا ہے' میں نے اپنا روپیہ پھینکا ہے' اب انتظار میں ہوں کہ وہ کھینچ کر لائے تو نظر آتا ہے کہ کچھ غلط ہی تھا جو میں نے سنا تھا۔ بنیا کہنے لگا: نہیں نہیں میاں صاحب! غلط نہیں تھا' وہ بالکل سچی بات ہے کہ روپیہ رپیّے کو کھینچتا ہے' اس ڈھیر نے آپ کے روپے کو کھینچ لیا' جایئے گھر اپنے۔ یہ ہے اصل سرمایہ پرستی کی۔

اس دور میں یہ ربٰو کا نظام انتہا تک پہنچ چکا تھا۔ حضرتِ داوٗدؑ کے ذمے لوگوں کے معاملات کے فیصلے کرنا بھی تھا، اس لیے کہ قرآن نے کہا کہ یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْکُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰی (38:26) داوٗد! تمہیں یہ مملکت دی ہے' تمہیں سربراہ بنایا ہے' صاحبِ اقتدار بنایا ہے تو اس لیے کہ حق کے ساتھ لوگوں کے فیصلے کرتے جاؤ اور کسی کی مفاد پرستی کی کوئی رعایت نہ کرو' کسی کے خیالات اور جذبات کا اتباع نہ کرو۔ یہ بہت بڑی چیز تھی اس لیے یہ مملکت ملتی تھی۔ اب یہ جو ربٰو کے' لین دین کے مقدمے تھے' ان میں چھوٹے سرمائے کو بڑا سرمایہ دار کھا گیا۔

کہا یہ ہے کہ ایک دن ان کے پاس ایک مقدمہ آیا۔ اس مقدمے میں مستغیثِ نے یہ کہا کہ اِنَّ هٰذَآ اَخِیْ (38:23) یہ میرا بھائی ہے۔ عزیزانِ من! یہ سرمایہ پرستی غیر قوموں کے ساتھ ہی نہیں ہوتی' یہ تو پہلے اپنی قوم میں شروع ہوتی ہے۔ قارون بنی اسرائیل

میں سے تھا‘ فرعون کی قوم میں سے نہیں تھا۔ فرعون اور ہامان تو غیر بنی اسرائیل تھے‘ قارون بنی اسرائیل میں سے تھا۔ یہ یہودی‘ اس قسم کے سرمایہ دار‘ اپنی قوم کو سب سے پہلے لوٹتے ہیں‘ اپنوں کا لہو چوستے ہیں۔ کہا کہ اس نے آتے ہی یہ کہا کہ اِنَّ هٰـذَآ اَخِـىْ (38:23) یہ کوئی غیر نہیں ہے‘ میرا بھائی ہے۔ پوچھا کہ بھائی ہے تو کہتا کیا ہے‘ کرتا کیا ہے؟ کہا کہ لَهٗ تِسْـعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً (38:23) اس کے پاس ننانوے کے قریب بھیڑیں ہیں‘ بڑا خوشحال ہے‘ اتنا ریوڑ اس کے پاس ہے گلہ موجود ہے۔ وَّلِـىَ نَـعْـجَةٌ وَّاحِـدَةٌ (38:23) اور میں غریب آدمی ہوں‘ ایک دنبی میرے پاس ہے‘ اسی پہ اپنا گزارہ کرتا ہوں جبکہ اس کی کیفیت یہ ہے کہ فَقَالَ اَكْفِلْنِيْهَا (38:23) یہ کہتا ہے کہ وہ دنبی بھی مجھے دیدو۔ اور اس کے بعد ہے کہ وَعَـزَّنِىْ فِى الْخِطَابِ (38:23) بڑا آدمی ہے‘ صاحبِ اثر ہے‘ دوسرے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔ میں جب بھی بات کرتا ہوں تو مجھے دبا لیتے ہیں‘ یہ ہے میرے اس بھائی کا رویہ! اب بتاؤ کہ اس کا یہ مطالبہ جائز ہے یا ناجائز۔ عزیزانِ من! یہ مقدمہ پیش ہوا تھا۔ داوٗدؑ نے سنا۔ قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ اِلٰى نِعَاجِهٖ (38:24) اُنہوںؑ نے کہا کہ بڑی زیادتی ہے‘ بڑا ظلم ہے جو اس غریب کی ایک بھیڑ کو بھی اس کے پاس نہیں رہنے دیتا اور مطالبہ یہ کرتا ہے کہ اپنی ننانویں دنبیوں کو سو بنالے اور اس کے پاس ایک دُنبی بھی نہ رہنے دے۔ وہ بھی اس سے چھین لے۔

عزیزانِ من! یہاں یہ بات ہوگی جو میں نے یہ کہا کہ یہ اس نظامِ سرمایہ پرستی کی جو لعنت تھی‘ یہ وہ مقدمہ تھا جو ان کے پاس آیا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ کہاں سے ثابت ہوا؟ سنیے! قرآن کیا کہتا ہے؟ یہ بات کہ یہ کاروباری معاملہ تھا جس کا یہ مقدمہ تھا‘ قرآن کہتا ہے کہ حضرتِ داوٗد علیہ السلام نے یہ بات کہی کہ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ (38:24) یہ بڑا ظلم ہے جو وہ کر رہا ہے کہ تیری ایک دنبی بھی تجھ سے لے لے۔ کہا کہ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ لَيَبْغِىْ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (38:24) اصل ہوتا یہی ہے‘ میں دیکھ یہ رہا ہوں‘ کہ جو بھی مخلوط کاروبار (Partnership in Business) کرتے ہیں‘ شراکت سے کاروبار کرتے ہیں‘ ان کی Tendency (رغبت) یہ ہوتی ہے‘ کہ بڑا سرمایہ چاہتا یہ ہے کہ میں چھوٹے والے کو کھا جاؤں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ امیر‘ امیر تر‘ اور غریب‘ غریب تر ہوتا جاتا ہے اور دن بدن معاشرے کے ان دو طبقات میں بعد زیادہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

یہودیوں نے نظامِ سرمایہ داری کے میدان میں ہمیشہ فتح حاصل کی ہے

عزیزانِ من! یہ قرآن کی آیت ہے۔ شراکت سے جو کاروبار کرنے والے ہیں‘ ان میں وہی چھوٹے سرمایہ دار کو کھا جائے گا جو مخلوط کاروبار کرنے والا بڑا سرمایہ دار ہوگا۔ کہا کہ لَيَبْغِىْ بَعْـضُهُـمْ عَـلٰى بَعْضٍ (38:24) بڑے سرمایہ والا چاہتا ہے کہ اس

چھوٹے سرمائے والے کو دبا لوں۔ اِلَّا الَّـذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (38:24) مگر ایسا صرف وہ نہیں کرتے جن کو خدا پر ایمان ہو اور ان کے اعمال صالحہ ہوں۔ وَقَـلِیۡلٌ مَّا ھُمۡ (38:24) لیکن مشکل یہ ہے کہ اس معاشرے میں بہت تھوڑے لوگ ایسے رہ گئے ہیں۔ اب میرے ذمے یہ ہے کہ میں اس معاشی نظام کو بدلوں۔ یہ چیز بہت بڑی ذمہ داری کی تھی۔ وہ مقدمہ جس کا فیصلہ درکار تھا اور یہ تھا جو حضرتِ داؤدؑ نے کہا کہ یہ ہے میرے ذمے جو خدا نے لگا دیا ہے۔ اور یہ بہت بڑی چیز تھی۔

آخر کار حضرت داؤدؑ اس مقدمہ کو سر کرنے میں کامیاب ہو گئے

عزیزانِ من! قرآن نے کہا کہ وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسۡتَغۡفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ (38:24) اُس نے یہ خیال کیا کہ یہ بڑا سخت مشکل مرحلہ ہے۔ وہ واقعی بڑا مشکل مرحلہ ہوتا ہے یعنی یہ میدانِ جنگ میں بڑی بڑی قوموں کو تو شکست دیدیتے ہیں لیکن یہودیوں کو کوئی قوم آج تک شکست نہیں دے سکی' کم بخت سرمایہ داری ایسی چیز ہے۔ حضرت داؤدؑ نے کہا کہ یہ بہت مشکل مرحلہ ہے لیکن اگر خدا کی حفاظت میرے ساتھ رہی تو کوئی بات مشکل نہیں ہے۔ اس لیے وہ خدا کے قوانین کے سامنے جھکتا ہوا اس کام کے لیے تیار ہو گیا۔ فَـغَـفَرۡنَا لَهٗ ذٰلِکَ (38:25)۔ وہ ہر معاملہ میں ہمارے قوانین سے قریب تر رہتا تھا' اس لیے اس کے تمام معاملات کا مآل نہایت حسین اور خوشگوار ہوتا تھا۔ ہم نے بھی اس کو حفاظت کا سامان پہنچایا۔ وَاِنَّ لَـهٗ عِـنۡدَنَا لَزُلۡفٰی وَحُسۡنَ مَـاٰبٍ (38:25) اس عمدگی سے اس نے اس کو سرانجام دیا کہ وہ شخص ہمارے مقربین میں سے ہو گیا۔ یہ ہے جو نبی کرتا ہے' اس لیے اُسے مملکت ملتی ہے۔ یہ تھا وہ مقدمہ جو سامنے آیا تھا۔ قرآن نے یہ بتایا ہے کہ یہ الۡخُلَطَآءِ (38:24) کاروباری شرکاء کیا کرتے ہیں۔ اور ہماری تفسیروں میں یہ ہے کہ اوریاہ کی بیوی کو دیکھا' اس پہ شیدا ہو گئے' اس کے خاوند کو بلا کر کہا کہ اس کو طلاق دیدو۔ نیک آدمی نے کہا کہ یہ اتنا بڑا ظلم کیا کر رہا ہے' اس سے احساس پیدا ہوا' خدا کے ہاں سجدے میں گئے' توبہ کی' اُس نے معاف کر دیا اور پھر آگے اس کی توجیہہ دیتے ہیں کہ خدا یہ کچھ ان سے کرا ہی دیا کرتا ہے کہ جس عورت پہ تمہاری نظر آ جائے اس کے خاوند کو بلا کر یہ کچھ کہا کرو۔

کاروباری شراکت میں بڑا فریق چھوٹے فریق پر ہمیشہ غالب آنے کی فکر میں رہتا ہے

عزیزانِ من! یہ ہے وہ آیت۔ خود دیکھیے لیکن اس کو ذہن میں رکھیے جو قرآن نے کہا ہے کہ خلطآء یعنی کاروباری شرکاء جب بھی آپس میں شراکت کے معاملے کرتے ہیں تو ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جو بڑا فریق ہے' وہ چھوٹے فریق پہ غالب آ جائے' اس کو کسی طرح سے کھا جائے۔ اسی لیے حضرت داؤدؑ سے کہا تھا کہ تمہیں اس لیے خلیفہ بنایا ہے کہ حق کے ساتھ فیصلے کر' کسی کی مفاد پرستی کی

رعایت نہ کر۔ اس لیے کہ اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ (34:11) جو کچھ بھی تم کرتے ہو ہم دیکھ رہے ہیں کہ تم کیا کر رہے ہو۔

حضرت سلیمانؑ کے پرشکوہ عہد کے متعلق ہمارے ہاں کے تفسیری قصّے

عزیزانِ من! یہ تھے حضرتِ داؤدؑ۔ ان کے بیٹے حضرتِ سلیمانؑ تھے۔ کہا کہ وَ لِسُلَیْمٰنَ الرِّیْحَ غُدُوُّھَا شَھْرٌ وَّ رَوَاحُھَا شَھْرٌ (34:12)۔ ان کی مملکت بہت بڑی تھی اور یہ دور دور تک اپنے جہازوں کو بھیجتے تھے۔ اُس زمانے میں ابھی جو جہاز تھے وہ چھوٹی چھوٹی چپوؤں سے چلانے والی کشتیاں تھیں۔ تاریخ بتا رہی ہے کہ بادبانوں کے ذریعے سے جو کشتی رانی تھی' یہ اُسی دور میں آئی تھی اور غالبًا اگر حضرتِ سلیمانؑ نے اس کو خود ایجاد نہیں کیا تھا تو اپنی مملکت کے اندر اختیار کیا تھا۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ کیفیت تھی اور اس کی مملکت دور تک پھیلی ہوئی تھی' سمندر کے راستے جانا ہوتا تھا۔ عام کشتیوں میں چپوؤں سے جو فاصلہ ایک مہینے میں طے ہوتا ہے' یہ جو ایک تکنیک اس نے اپنے ہاں اختیار کی کہ بادبانوں والی کشتیوں کے ذریعے سے' ہوا کے رخ کے اوپر' چلا جائے' تو اس سے مہینے بھر کا سفر ایک دن میں طے ہو جایا کرتا تھا۔ ہمارے ہاں تفسیروں میں لکھا ہوا ہے کہ باقی لوگوں کی کشتیوں کو تو عام انسان چلایا کرتے تھے ان کی کشتیوں کو جن چلایا کرتے تھے۔ کہا کہ وَ اَسَلْنَا لَہٗ عَیْنَ الْقِطْرِ (34:12)۔ اور یہاں بھی وہی چیز ہے۔ اس نے اپنی اسلحہ سازی میں تانبے کا اس طرح استعمال کیا کہ وہ تانبا سخت دھات نہیں' بلکہ بہتا ہوا چشمہ بن جاتا تھا۔ آپ کسی فیکٹری میں جا کر دیکھیے کہ بھٹی کے اندر سے جو لوہا یا جو بھی دھات ڈالتے ہیں' وہ پگھلے ہوئے چشمے کی طرح بہہ کر چلا آ رہا ہوتا ہے۔ وہ یہ بتاتا ہے لیکن ہماری تفسیروں میں یہاں بھی وہ معجزہ آ گیا۔

اندھی تقلید دراصل عقیدت مندی کا وہ بندھن ہوتا ہے جسے توڑنا آسان نہیں

قرآن نے کہا ہے کہ وَ مِنَ الْجِنِّ مَنْ یَّعْمَلُ بَیْنَ یَدَیْہِ بِاِذْنِ رَبِّہٖ (34:12)۔ تفسیروں میں ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے جن قابو کیے ہوئے تھے۔ دوسری جگہ یہ ہے کہ وہ پھر ان کو زنجیریں پہنا کر' بیڑیاں پہنا کر' باندھ کر' رکھا کرتے تھے۔ جن جو کسی کو نظر نہیں آتے' وہ ان کو بیڑیاں پہنا دیا کرتے تھے۔ آپ کو پتہ ہے کہ یہ جو خرکار ہوتے ہیں ان کے پاس بہت گدھے ہوتے ہیں' شام کو واپس لاتے ہیں اور ان گدھوں کی ٹانگ میں تھوڑی سی رسی باندھتے ہیں۔ اتنی رسیاں ان کے پاس بعض اوقات نہیں ہوتیں جو سب کو باندھیں تو کچھ کو باندھ دیتے ہیں۔ چونکہ روز اس طرح سے رسیاں باندھتے ہیں' گدھوں کو بھی پتہ ہوتا ہے کہ رسی باندھی جاتی ہے تو وہ جو باقی گدھے رہ جاتے ہیں وہ ان کی ٹانگوں کے پاس بیٹھ کر یوں یوں کرتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ بندھ گئے اور وہ ساری رات کھڑے رہتے ہیں۔ عقیدت مندی کی رسی ہوتی ہے جس سے بندھ جاتا ہے۔ اسے عربی زبان میں تقلید کہتے ہیں۔ رسی وسی وہ کچھ

نہیں ہوتی، وہ آپ کے خیال کا بندھن ہوتا ہے جو آپ کو باندھ رکھتا ہے۔ ''پیر مندے نوں کھاندا اے''۔ [1] عزیزانِ من! رسی ہوتی نہیں، رسی اور زنجیر سے تو بادشاہت یا حکومت باندھتی ہے۔ یہ عقیدت مندی کی رسیاں تو رسیاں ہوتی نہیں لیکن ان سے کہیں زیادہ مضبوط ہوتی ہیں۔ وہ تو پھر بھی ٹوٹ جاتی ہے یہ نہیں ٹوٹتی۔ کہا کہ **مِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ** (34:12)۔ جن کا ترجمہ انہوں نے وہ جن کیا اور ہر معاملے میں جن آ گئے۔

اہلِ عرب کے ہاں جن وانس کی نوعیت اور حضرت سلیمانؑ کا ان کے ساتھ واسطہ

عزیزانِ من! عربوں کے ہاں یہ پوچھ لیجیے کہ جن کے معنیٰ کیا ہیں؟ جن کے معنی ہوتے ہیں ''نگاہوں سے عام طور پہ دور رہنے والے، پوشیدہ رہنے والے۔ یہ جتنے بھی خانہ بدوش لوگ ہوتے ہیں، صحرانشین ہوتے ہیں، یہ بدو ہوتے ہیں، پہاڑوں کے اندر رہنے والے یہ جتنے لوگ ہوتے ہیں، ان کو عرب جن کہتے ہیں اور شہری آبادی کو الناس کہتے ہیں''۔ الناس کے معنی ہی یہ ہیں کہ متمدن طور پر ایک دوسرے میں مل جل کر رہنے والے۔ ان کے ہاں مل جل کر رہنے والے الناس کہلاتے تھے اور یہ باہر پہاڑوں کے اندر، صحراؤں کے اندر، یہ خانہ بدوش بدو، جن کہلاتے تھے۔ عرب میں اب بھی بیشتر آبادی ان بدوؤں پر مشتمل ہے۔ یہ خانہ بدوش اب تو آپ کے ہاں شہروں کے قریب آ جاتے ہیں اس لیے زیادہ نظر آتے ہیں ورنہ یہ اس سے پہلے بہت دور دور رہا کرتے تھے۔ ان میں سے کوئی بندر نچانے والا، کوئی سپیرا تو نظر آتا تھا مگر ان کے گھر بار والے کوئی نظر ہی نہیں آیا کرتے تھے، یہ سارے جن ہوتے تھے۔ یہ جو پہاڑی سرکش لوگ تھے، حضرتِ سلیمانؑ نے ان کو اپنی فوج میں لا کر رکھا ہوا تھا، یہ بہت بڑے بڑے کاریگر تھے۔ کہا ہے کہ **مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ** (34:12) قانونِ خداوندی کے مطابق وہ ان کے کام سرانجام دیتے تھے۔ **وَ مَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ** (34:12) اگر کوئی سرکشی کرتا تھا تو خدا ان کی کھال ادھیڑ دیتا تھا، یعنی خدا کے قانون کے مطابق انہیں سخت سزا ملتی تھی۔ یہ سیدھی سی بات ہے کہ ان کو فوج کے اندر رکھا ہوتا تھا، اس سے اگر کوئی سرتابی کرتا تھا تو اس کو واقعی سزا ملتی تھی۔

قرآن کریم نے ان کے لیے کہا ہے کہ **يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَ تَمَاثِيْلَ وَ جِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَ قُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ** (34:13) وہ جو لوگ کاریگر تھے، پہاڑی اور ریگستانی یہاں اکٹھے ہوئے ہوتے تھے، وہ اس کے لیے بڑے بڑے کام کرتے تھے۔ جو کچھ یہ چاہتا تھا اس کے مطابق یہ کام کر دیا کرتے تھے۔ پروگرام ان کو یہ دیتے تھے، وہ ان پروگرام کو Carry.Out (روبہ عمل) کرتے تھے۔ وہ ان کے لیے بڑے بڑے قلعے بناتے تھے۔ اب بھی تاریخ بتا رہی ہے کہ حضرتِ سلیمانؑ کے زمانے میں

---

[1] پیر اُس کو کھاتا ہے جو اُسے مانتا ہے۔

یہ جو بیت المقدس کا' ان کا ہیکل بنا ہوا ہے' یہ اس زمانے میں بنا تھا۔ اب تو زمین کے نیچے سے جو چیزیں نکل رہی ہیں' وہاں سے تاریخ مرتب ہو رہی ہے کہ کس طرح سے یہ بڑے بڑے پہاڑی لوگ جو جفاکش تھے' جو توانا لوگ تھے یا یہ افریقہ کے جو حبشی غلام بنا کر لے آتے تھے' وہ ان کے لیے ان کاموں کو کیا کرتے تھے۔ بڑے بڑے قلعے بنا دیتے تھے' بڑی بڑی دیگیں جن کے اندر فوج کے لیے کھانا وغیرہ پکتا تھا' بنایا کرتے تھے۔ اور ایک چیز و تماثیل ہے جس پہ آ کر یہاں مصیبت پڑی ہوئی ہے۔

تصویر کشی کو حرام کہنے کے باوجود تصویر کھنچوانے کے عمل پر اعتراض کا جواب

ہمارے ہاں تو فقہ کے قانون میں تصویر بنانا شرعاً حرام ہے۔ اب اس دور کے اندر جو تصویریں کھنچنی شروع ہوئیں تو کوئی اخبار ایسا نہیں جس میں یہ تصویر نہ آتی ہو۔ مجھے وہ مرحوم یاد آ گئے' انہوں نے یہ مشورہ دیا تھا کہ تصویر کھنچوانا حرام ہے اور اب ان کی تصویریں اس طرح سے آنا شروع ہو گئیں۔ ان سے ان کی جماعت کے لوگوں نے اعتراض کیا کہ پھر یہ کیوں ہے؟ کہنے لگے کہ کیا جائے آپ کو بیٹھے ہوئے کوئی آدمی بندوق کی گولی سے مار دے تو آپ اس کا کیا علاج کرتے ہیں؟ ''اے فوٹو گرافر دی بندوق دے مارے ہوئے نیں[1]''۔ مرنے والا تو فقط بات سے مر جاتا ہے۔ یعنی اندازہ لگائیے کہ شریعت کو کیا مذاق بنایا ہے۔ جس کو حرام کہا ہے تو پھر اپنے اوپر ضبط کرو۔ ان سے کہا کہ آپ کے سامنے فوٹو گرافر ہوتا ہے تو آپ اسے روکتے نہیں ہیں۔ ان کا یہ فتویٰ ہے کہ کوئی شخص جو اس طرح سے برائی بھی کرے تو اس کو زبردستی روکنا نہیں چاہیے۔ کہا اس لیے کہ گناہ اس کو ہوتا ہے' مجھے نہیں ہوتا۔

حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں جو مجسمہ سازی حلال تھی' وہ حضور کے زمانے سے حرام قرار دے دی گئی

اب یہاں آ کر مصیبت پڑی کہ خدا کا ایک نبی ہے اور قرآن میں یہ ہے کہ وہ تماثیل بھی بنواتا تھا۔ تماثیل عربی زبان میں مجسموں کو بھی کہتے ہیں اور تصویروں کو بھی کہتے ہیں۔ خدا کا ایک نبی ہے وہ اتنے بڑے بڑے کاریگر بلا کر' جہاں قلعے بنواتا تھا' وہاں تماثیل بھی بنواتا تھا۔ صرف تصویریں ہی نہیں بلکہ Statues (مجسمے) بھی بنواتا تھا۔ کہتے ہیں کہ جی! حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں وہ جائز تھا اور اب حضور ﷺ کے زمانے میں خدا نے حرام قرار دیدیا ہے۔ یعنی ایک نبی کے اوپر وہ جائز تھا اور دوسرے نبی کے ہاں آ کر حرام ہو گیا۔ یہ سارا کچھ کہنے کے بعد قرآن نے یہ کہا کہ اِعۡمَلُوۡۤا اٰلَ دَاوٗدَ شُکۡرًا (34:13) اے آلِ داؤدؑ! یہ سب کچھ تم کرو' خدا کے سامنے سجدہ ریز ہوتے رہو' جو کچھ اس نے یہ دیا ہے اس سے اس کی قدردانی کرو' سپاس گزاری کرو۔

لفظ شکر کا قرآنی مفہوم

شکر کے معنی ہوتے ہیں کہ ''جس مقصد کے لیے کوئی چیز دی جائے اسے اسی مقصد میں صرف کرنا''۔ کہا کہ وَ قَلِیۡلٌ مِّنۡ

---

[1] یہ فوٹو گرافر کی بندوق کے مارے ہوئے ہیں۔

عِبَادِیَ الشَّکُوْرُ (34:13) ہمارے بندوں میں سے بہت تھوڑے لوگ ہیں جو یہ کرتے ہیں کہ ان کو کچھ ملے تو وہ صرف وہیں کریں جہاں صرف کرنے کے لیے ان سے کہا جائے۔تم یہ چیز ایسے ہی کرنا۔عزیزانِ من! یہ ہے حضرتِ داؤدؑ اور حضرتِ سلیمانؑ کی چند آیات۔ باقی آگے چل کر آئیں گے۔

میں نے اس درس میں سید ابولاعلیٰ مودودی مرحوم (1979-1903) کے جو اقتباسات پیش کیے ہیں' مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ ان کے حوالے نوٹ کر لیں۔ وہ جو مقدمہ حضرتِ داؤدؑ کے سامنے پیش ہوا تھا اس کا حوالہ ہے: مودودی صاحب کی تفسیر تفہیم القرآن جلد چہارم صفحہ 328 طبع اول۔ اور وہ جو کہا گیا تھا کہ انبیائے کرامؑ سے لغزشیں ہوجاتی تھیں اس کا حوالہ ہے: مودودی صاحب کی کتاب تفہیمات حصہ دوم صفحہ 45 ایڈیشن اگست 1951ء۔

عزیزانِ من! آج کے درس میں ہم سورۃ سبا کی آیت 13 تک پہنچے ہیں' 14 ویں آیت سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

❀......❀......❀

تیسرا باب: سورة سبا (آیات 14 تا 21)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من ! آج مارچ 1980ء کی 7 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ سبا کی آیت 14 سے ہو رہا ہے:
(34:14)۔

سابقہ درس میں شوکتِ داؤدیؑ کے بعد سطوتِ سلیمانیؑ کا ذکر آ رہا تھا کہ انہیں بڑی عظیم مملکت عطا ہوئی تھی۔ اور اس سلسلے میں یہ کچھ قرآن نے کہا تھا کہ عام کشتیاں جو سفر مہینہ مہینہ بھر میں طے کرتی تھیں' ان کی کشتیاں ایک دن میں وہ سفر طے کر لیا کرتی تھیں۔ بادبانی کشتیوں کا سلسلہ حضرتِ سلیمانؑ نے اپنے ہاں جاری کیا تھا۔ اور پھر یہ تھا کہ اُنہوں نے بڑے بڑے قلعے تعمیر کرائے۔ ہیکلِ سلیمانی جو یہودیوں کا معبد ہے' وہ انہوں نے تعمیر کرایا' وہ بہت عظیم عمارت تھی۔ اس میں ایک لفظ جو جن آیا تھا تو میں نے عرض کیا تھا

کہ عربی زبان کی رو سے بھی' قرآنِ کریم میں استعمال کی رو سے بھی' اس قسم کے پہاڑی ریگستانی صحرائی لوگ جو عام شہروں اور بستیوں سے دور رہتے ہیں' نگاہوں سے اوجھل رہتے ہیں' انہیں عربی زبان میں' عرب آج بھی' جن بولتے ہیں۔ تاریخ اب بتا رہی ہے کہ انہوں نے پہاڑی علاقوں کے قبیلے کے بڑے بڑے جنہیں ہم دیو ہیکل کہتے ہیں ان کاموں کے اوپر لگا رکھے تھے۔ پھر جو فوجیں ان کی تھیں' گھوڑوں کا رسالہ تھا' وہاں ایک خاص قبیلہ تھا جو گھوڑوں کو پالتا تھا۔ بہت تیز رفتار گھوڑے ہوتے تھے۔ اس جہت سے قبیلے نے اپنا نام ہی قبیلۂ طیر رکھا ہوا تھا یعنی تیزی سے اڑنے والے۔ تو یہ سارے الفاظ آتے تھے۔ قرآنِ کریم میں تو یہ بات واضح تھی اور میں نے جیسا عرض کیا ہے' اب تو اس دور کی تاریخ بھی مرتب ہونی شروع ہوگئی ہے' اس میں یہ ساری چیزیں آگئی ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں تو جب تک مذہب میں عجوبہ پرستی نہ ہو' کوئی خصوصیت نہ ہو تو وہ سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی عام سی بات ہوگی۔ اسمیں کچھ کرشماتی انداز' کچھ کراماتی انداز' کچھ معجزاتی انداز اور کچھ عجوبات ہونے چاہئیں۔ اور پھر وعظ کے لیے تو دلکشی پیدا ہی ان چیزوں سے ہوتی ہے۔

یہودیوں کی تورات کی تفسیر' تالمود کے بیان کردہ اکثر افسانے' ہمارے ہاں کی تفسیروں میں راہ پا گئے

بہرحال وہ کسی مقصد کے لیے بھی ہو' ہمارے ہاں کی جو تفاسیر ہیں' جو کہا جاتا ہے کہ قرآنِ کریم تفسیروں کی رو سے سمجھ میں آتا ہے' ان میں وہ سارے افسانے آچکے ہوئے ہیں جو یہودیوں کے ہاں ان کی تورات یا ان کی تفسیروں کے اندر تھے۔ تالمود ان کے ہاں کی بڑی کتاب ہے۔ اس میں جو افسانے تھے' وہی افسانے ہمارے ہاں نقل ہو چکے ہوئے ہیں۔ اور جیسا میں نے عرض کیا تھا' ہمارے ہاں مشکل یہ ہے کہ وہی چیز تورات کی یا تالمود کی یا جسے اسرائیلیات کی کہتے ہیں' کہی جاتی تو کوئی پریشانی نہ ہوتی۔ ایسا کہنے سے ہر شخص یہ سمجھتا کہ یہ ان کے افسانے ہیں' یہ محرف کتابیں ہیں' ہم انہیں کیوں مانیں لیکن بعینہٖ وہی چیزیں جب آپ کے ہاں تفسیر کی کتاب میں آتی ہیں تو اس میں بھی گنجائش ہوسکتی تھی کہ ہم سمجھتے کہ فلاں مفسر نے ایسا لکھا ہے تو کیا ضرور ہے کہ ہم بھی اسے صحیح تسلیم کریں۔ اب ہمارے ہاں ایک چیز بنیادی ہوگئی ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ جو چیزیں اس قسم کی آئی ہیں' وہ کتبِ روایات میں آئی ہوئی ہیں اور کہا یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا فرمایا تھا۔ اور جب یہ بات حضور ﷺ کی طرف منسوب ہوجائے تو پھر بڑی دقت پیش آجاتی ہے۔ وہی تورات یا تالمود کے افسانے' کتبِ روایات کے اندر داخل ہوئے' وہاں سے تفاسیر میں آئے' ان کے ساتھ قال رسول اللہ ﷺ لکھا گیا۔ اب ان کی مخالفت کرنا' تردید کرنا' تکذیب کرنا تو بہت بڑی چیز ہے' مخالفت کرنا بھی مشکل ہوجاتا ہے۔

ہمارے ہاں کے ان افسانوں نے حضرت سلیمان کو (معاذ اللہ) جادوگر بنا رکھا ہے

جونہی آپ کسی چیز کی مخالفت لیجیے تو فوراً یہ آ جائے گا کہ یہ دیکھیے صاحب! یہ رسول اللہ ﷺ کی بیان فرمودہ تفسیر کے خلاف جا رہا ہے' یہ حدیث کے خلاف جا رہا ہے' یہ بخاری کے خلاف جا رہا ہے حالانکہ نہ وہ حضور ﷺ کی تفسیر کے خلاف ہوتا ہے' نہ حدیث کے خلاف ہوتا ہے بلکہ وہ تورات اور تالمود کے خلاف ہوتا ہے لیکن سازش کرنے والوں نے یہ کچھ کر رکھا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آپ کسی یہودی' کسی عیسائی وغیرہ' سے کوئی مناظرہ کر ہی نہیں سکتے' ان کی کتاب کی اس قسم کی خرافات کی تردید ہی نہیں کر سکتے۔ آپ اس ایک کی تردید کرتے ہیں تو وہ آپ کے ہاں کی کتابوں میں اس پہ اور اضافے کیے ہوئے بتاتے ہیں۔ یہی جو حضرتِ سلیمانؑ کا واقعہ ہے' یہ بات تورات میں' تالمود میں تھی لیکن آپ کے ہاں کی کتبِ روایات میں آ گئی اور وہاں سے تفسیر میں آئی۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے' ہمارے ہاں عام طور پہ مشہور ہے کہ حضرتِ سلیمانؑ جادو جانتے تھے اور خاص طور پہ اسمِ اعظم تو آپ نے سن رکھا ہوگا کہ انہیں اسمِ اعظم یاد تھا۔ اور یہ سارے جن اور طیر اور پرندے اور چرند جتنے تھے' وہ اس اسمِ اعظم کی وجہ سے ان کے قبضے میں تھے۔ یعنی اب آپ دیکھیے کہ ان کی وہ ساری سطوت وشوکت وحشمت' ان کی اتنی بڑی مملکت کے انتظامات' جوانہوں نے کر رکھے تھے' وہ سارے کے سارے اس بات کے اندر غائب ہوگئے کہ انہیں جادو آتا تھا' ان کے پاس اسمِ اعظم تھا' اسمِ اعظم کے زور پہ یہ سب کچھ کرتے تھے۔ اب کہیے کہ یہ جو پیغمبر یا انبیائے کرامؑ ہیں' ان کی زندگی' ان کے کوائفِ حیات' قرآنِ کریم نے محفوظ رکھے ہوئے ہیں' وہ ہمارے لیے کسی قسم کا سبق ہیں' ہمیں کوئی ہدایت دیتے ہیں اسی لیے قرآن نے انہیں اپنے اندر محفوظ کر رکھا ہے۔

ایک ضابطۂ حیات کے ناطے سے قرآنِ حکیم نوعِ انسانی کے لیے ایک بے مثل کتاب ہے

قرآن تاریخ کی کتاب نہیں ہے اور وہ تاریخ کی کتاب تو ایک طرف' اگر ان کی باتیں مانیں تو پھر تو (معاذ اللہ) وہ الف لیلیٰ کی یا طلسمِ ہوشربا کی کتاب بن جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول کی وساطت سے اپنی آخری کتاب بھیج دی۔ اس کی اہمیت کا اندازہ لگا لیجیے۔ آخری کتاب ہے۔ وہ جو میں کہا کرتا ہوں' بڑا حسین مصرعہ ہے کہ

تورا کشید و اودست از قلم کشید

''تیری تصویر کھینچی تو اس مصور نے قلم رکھ دیا کہ اس کے بعد میں کوئی اور تصویر نہیں کھینچونگا''۔

تو یہ ہے قرآن کا مرتبہ۔ قیامت تک کے لیے تمام نوعِ انسانی کے لیے ضابطۂ ہدایت ہے۔

اسم اعظم کے قصوں نے قندیل آسمانی کو (معاذ اللہ) منتر کی کتاب بنا رکھا ہے

اگر اس کے اندر آپ ان تفاسیر کی رو سے دیکھیں تو نوے نہیں تو پچھتر فیصد تو اسی قسم کی خرافات بھری پڑی ہیں۔ (معاذ اللہ) کیا اللہ تعالیٰ اپنی آخری کتاب' نوعِ انسانی کی ہدایت کے لیے' قیامت تک کے لیے' نافذ العلم رہنے کے لیے' جس کی حفاظت کا ذمہ اس نے خود لے رکھا ہے' کے اندر یہ قصے رکھے گا کہ وہ حضرتِ سلیمانؑ کی عظیم مملکت کا' اس کے انتظامات کا' اس کے سپاہیوں کا' اس کے رسالے کا' اس کے قلعوں کا' ذکر کر رہا ہے اور وہ بات اتنی سی ہوئی کہ یہ سارا قصہ اسمِ اعظم کی وجہ سے تھا؟ ہمارے آپ کے لیے اس کے اندر کیا ہدایت ہوئی؟ ہمارے پاس تو اسمِ اعظم ہے نہیں۔ یہ تو غنیمت ہے کہ یہاں یہ تصورات کچھ ماند پڑ گئے ہیں ورنہ اسمِ اعظم کی تلاش میں مارے مارے پھرتے تھے کہ فلاں ہے جی' اس کے پاس اسمِ اعظم ہے۔ اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ یہ ورد' یہ وظیفے' یہ ساری چیزیں' تمام کی تمام' انہی وجوہات کے اوپر آپ کے ہاں آئی ہوئی ہیں۔ میں کبھی کبھی درمیان میں ان چیزوں کو پیش کر دیتا ہوں تو محض اس لیے کہ آپ احباب کو اتنی فرصت نہیں ہوگی اور آپ کا تو میدان بھی نہیں ہے کہ خود ان تفاسیر کو پڑھیں تو میں اس لیے پیش کر دیتا ہوں تا کہ آپ کو کچھ معلوم ہو جو کہا جاتا ہے کہ قرآنِ کریم ان تفاسیر کی رو سے سمجھ میں آ سکتا ہے۔ جب بھی کوئی بات قرآن کے متعلق کہی جائے تو پہلا اعتراض یہ آتا ہے کہ صاحب! کسی نے پہلے بھی ایسا کہا ہے۔ اب بتائیے کہ اگر انہوں نے نہیں کہا تو ہمارا کیا قصور ہے' وہ زندہ ہوتے تو ہم ان سے کہتے کہ صاحب! جو جی میں آئے کچھ لے لیجیے آپ بھی کہہ دیجیے لیکن وہ تو اب گزر گئے ہیں۔ سند یہ مانگی جاتی ہے کہ پہلے بھی کسی نے ایسا کہا ہے اور اگر یہ نہیں تو پھر قابلِ قبول نہیں ہے۔ اب میں اس لیے یہ پیش کیا کرتا ہوں کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ یہ جو کہتے ہیں کہ قرآنِ کریم ان چیزوں سے سمجھ میں آتا ہے تو ان میں کس قسم کی چیزیں ہیں۔

حضرت سلیمانؑ کے متعلق اسمِ اعظم والی انگوٹھی کے تاثر پر مبنی کہانیاں

بات حضرتِ سلیمانؑ کی تھی۔ ہمارے ہاں کہا یہ گیا ہے کہ ان کے پاس ایک انگشتری تھی' اس پہ اسمِ اعظم کندہ تھا' بس اس کے زور پہ یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ ان کے متعلق لکھا یہ ہے اور یہ بات تالمود سے آئی ہے۔ آپ کے ہاں کی کتبِ تفاسیر میں موجود ہے' سند روایات کی رو سے لائی جا رہی ہے کہ ان کے پاس ایک انگوٹھی تھی جس پر اسمِ اعظم کندہ تھا' جس کی تاثیر سے انسان حیوان چرند پرند جنات بھوت سب آپ کے مسخر تھے۔ جب آپ کی سلطنت مستحکم ہو گئی تو آپ کو اپنی قوت کا بڑا ناز ہو گیا تو خدا کو یہ بات بڑی ناگوار گزری' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیوؤں کے بادشاہ چالاکی سے آپ کی انگشتری چرا کر لے گیا۔ تفسیروں میں اور تفصیل بھی لکھی ہوئی ہے کہ آپ بیت الخلاء جایا کرتے تھے تو اپنی انگوٹھی اپنی ایک بیوی کو دے جایا کرتے تھے۔ ایک دن اس طرح سے گئے اور انگوٹھی دے

گئے تو یہ شخص ❶ حضرتِ سلیمانؑ کا ہمشکل بن کر اس بیوی کے پاس آ گیا اور اسے کہا کہ وہ انگوٹھی دے دیجئے اس نے وہ انگوٹھی دیدی۔ اب جب انگوٹھی دیدی تو سارا قوت کا راز تو اس کے پاس آ گیا۔ اب اس کے بعد حضرتِ سلیمانؑ تشریف لائے تو انہوں نے وہ انگوٹھی مانگی تو وہ کہنے لگی کہ تم کون ہو۔ اُس نے دہائی مچادی کہ یہ کون یہاں گھس آیا۔ اور وہ جو جعلی بنا ہوا تھا چونکہ ساری قوت اور اس کا راز اور دیو اور جن اور بھوت اس کے قبضے میں تھے اس لیے انہوں نے مل کر اصلی سلیمانؑ کو نکلوا دیا۔ یہ وہاں سے بھاگ گئے۔ چنانچہ آپ جان بچا کر بھاگے اور فقیروں کا بھیس بدل کر بھیک مانگنے لگے۔ آپ کو شاید نہ معلوم ہو بچپن میں ہمارے ہاں حضرت سلیمانؑ کا منظوم قصہ ہوتا تھا ''اوہ سلیمان کولوں بھٹ جھونکاوے'' کسی بھٹیارن کے ہاں جا کر انہوں نے نوکری کی تھی تو اس بھٹیارن کا جو وہ بھٹ ہوتا ہے تو اس میں وہ ایندھن ڈالا کرتے تھے۔ بھیک مانگنے لگے۔ آخر شاہ آموں کے ملک میں پہنچ کر آپؑ نے شاہی باورچی خانے میں نوکری کرلی۔ خدا کے عظیم پیغمبر کے متعلق یہ بیان ہو رہا ہے جن کی زندگیوں کو ہمارے لیے اسوہ قرار دیا گیا ہے۔ بادشاہ کی بیٹی آپ پر عاشق ہو گئی۔ عام طور پہ ہمارے ہاں جو کہانیاں ہوتی ہیں ان میں شہزادیاں فقیروں پہ عاشق ہو جایا کرتی ہیں۔ جب بادشاہ کو اس کا علم ہوا تو اس نے ان دونوں کو جنگل میں نکال دیا۔ یعنی اس فقیر کو تو نکالنا ہی تھا بیٹی کو بھی ساتھ نکال دیا۔ ایک دن ایک ماہی گیر ایک مچھلی لے کر اُدھر سے گزر رہا تھا بھکارن شہزادی نے وہ مچھلی اس سے خرید لی۔ جس وقت مچھلی کا پیٹ چاک کیا تو اس میں سے ایک انگوٹھی برآمد ہوئی۔ حضرتِ سلیمانؑ نے، جنہوں نے اپنا نام قہلت رکھ چھوڑا تھا، اسے فوراً پہچان لیا کہ یہ وہی انگوٹھی ہے۔ اُسے فوراً اٹھالیا اور آنکھ جھپکنے کے عرصے میں یروشلم پہنچ کر اُس غدار کو قتل کیا اور خود تختِ حکومت پر متمکن ہو گئے۔ اس طرح پھر وہ سارے جنات اور بھوت پریت چرند پرند آپ کے قبضے میں آ گئے۔ آپ نے سمجھ لیا قرآن کی ان آیات کا مطلب۔ یہ ہے تفسیر۔

تورات کی رو سے اس بیان کے بعد ہمارے ہاں آپؑ کی بیوی کے متعلق مزید اضافہ بھی ہے

یہاں تو میں نے یہیں تک ختم کیا ہے۔ میری دقت یہ ہوتی ہے کہ بیٹیاں بہنیں بیٹھی ہوئی ہوتی ہیں۔ اتنا حصہ تورات میں ہے اگر وہ اتنا ہی ہمارے ہاں مفسر نقل کر دیتے تو پھر بات تو کچھ نہ ہوئی۔ وہ تو کہتے تھے کہ اتنا تو ہمارے ہاں وہاں بھی ہے اس کے بعد اس پہ اضافہ بھی ہے۔ اور ہمارے ہاں جو اضافے ہوتے ہیں اس کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہوں کہ

آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

---

❶ یہودی تالمود میں اس شخص کا نام احمودیس ملتا ہے۔

وہ ساری چیز جنسیات سے ملوث ہوتی ہے۔ وہ اگلا اضافہ جو ہمارے ہاں کی تفاسیر کے اندر آ گیا ہے تو اس سے حیا کی آنکھیں جھک جاتی ہیں۔ کہنے کی بات نہیں ہے' صرف اشارتاً عرض کرونگا کہ وہ جو جعلی بنا ہوا تھا وہ حضرتِ سلیمانؑ کی بیویاں تو اصلی تھیں۔ پھر پوچھیے کہ یہ جو صاحبِ تفسیر ہیں' پھر کیا کیا لکھتے ہیں۔ بس جنسیات کا موضوع ایک دفعہ ان کے قابو آ جائے۔ بہر حال اس قصے کو چھوڑیئے۔ یہ ہے جو اس میں وہ ایک جن کا جو لفظ آ گیا کہ انہوں نے ان کو قابو کیا ہوا تھا' زنجیریں باندھ کر ان کو رکھا کرتے تھے' ان سے یہ سب کچھ بنوایا کرتے تھے۔ اب وہ جو جنات کی تفسیر ہے وہ آپ کے ہاں کتاب میں یہ ہو رہی ہے۔

ہمارے ہاں کی تفسیروں میں حضرت سلیمانؑ کی موت کی کہانی کا بیان

اب آئی آیت 14 جس میں کہا ہے کہ **فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖٓ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِي الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ**(34:14)۔ اس آیت کے قرآنی مفہوم کی طرف تو بعد میں آؤنگا پہلے تفسیر سن لیجیے۔ جب حضرتِ سلیمانؑ کی وفات کا وقت آیا تو آپ نے اللہ تعالیٰ سے کہا کہ میرے بعد تو یہ مملکت اجڑ جائے گی' برباد ہو جائے گی' کچھ ایسا انتظام ہونا چاہیے کہ موت تو برحق ہے لیکن ان میں سے کسی کو پتہ نہ چلے کہ میں مر گیا ہوں تو اس صورت میں یہ نقشہ ایسے ہی قائم رہے گا۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ہمارے لیے یہ کونسی مشکل بات ہے۔ اُن سے کہا کہ آپ عبادت کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو وہ عصا ہاتھ میں ہوتا ہے۔ بعض روایات میں اعتراض سے بچنے کے لیے کہا کہ انہوں نے شیشے کا ایک بہت بڑا سا ڈبہ یا شوکیس بنایا' بعض کہتے ہیں کہ ہیکل میں جو عبادت گاہ تھی آپؑ اسی کے اندر کھڑے رہے۔ اس اختلاف کے بعد جو قدرِ مشترک ہے وہ یہ ہے کہ آپؑ کے ہاتھ میں عصا تھا اور کھڑے ہوگئے اور اس حالت میں آپؑ کا انتقال ہو گیا۔ آپؑ کھڑے تھے' یہ جتنے بھی جنات وغیرہ تھے' یہ سارے اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے دیکھا کہ حضرتِ سلیمانؑ کھڑے ہیں۔ اس طرح سے ان کے اوپر ایک سال گزر گیا' وہی ان کی جو لاش تھی' وہ اسی طرح سے اس کے سہارے کھڑی رہی۔ ترکیب تو یہ بڑی عمدہ رہی' بڑی کامیاب رہی لیکن اس کا کیا علاج کہ خدا کے اس پروگرام میں یا اس کی ایک تدبیر کے اندر ایک تھوڑا سا نقص رہ گیا جس کا پتہ ہی نہ چلا۔ وہ عصا لکڑی کا تھا' لکڑی کو دیمک لگ گئی اور اس کو نیچے سے کھوکھلا کر گئی۔ جب وہ اتنا کھا گئی کہ لکڑی اتنی کمزور ہوگئی اور اس کا بوجھ نہ سہار سکی تو وہ عصا ٹوٹ گیا' عصا ٹوٹا تو وہ دھڑام سے نیچے گر گئے۔ یہ جو جنات تھے انہوں نے کہا: ارے! یہ تو لاش تھی' ہم خوامخواہ کے لیے سال بھر یہاں ذلیل وخوار ہو کر یہ سب کام کرتے رہے۔ ہمیں اگر پہلے سے پتہ لگ جاتا کہ زندہ نہیں' یہ تو مردہ لاش کھڑی ہے' تو ہم اس کی غلامی سے اسی دن آزاد ہو جاتے۔ وہ اپنے آپ پہ لعن طعن کرتے رہے اور اس

کے بعد وہ سارے بھاگ گئے اور سلطنت اجڑ گئی۔ یہ ہے حضرتِ سلیمانؑ کی موت کا واقعہ جو ہماری کتبِ تفاسیر میں بھی آ گیا ہوا ہے۔

حضرت سلیمانؑ کے بعد آپ کی اس سلطنت کے زوال کی روئداد

اس کی تاریخ اب شہادت دیتی ہے' اس سے پہلے بھی اس قسم کے آثار پائے جاتے تھے۔ حضرتِ سلیمانؑ کے بعد ان کا جو بیٹا تھا وہ بڑا ہی نالائق تھا' کمزور بھی تھا۔ اتنی جو عظیم سلطنت ہو' اس کے بعد بادشاہ کے جانشین کچھ کمزور بھی ہوں' کچھ خرابیاں بھی ہوں' تو پھر بھی کچھ وقت تک تو یہ سلطنت چلتی ہے۔ آہستہ آہستہ پھر اسے گھن لگ جاتا ہے' دیمک چاٹ جاتی ہے تو پھر وہ گر جاتے ہیں۔ ان کا جو بیٹا تھا وہ بڑا نالائق تھا' کمزور تھا۔ جن کے ساتھ ان کی رفاقتیں تھیں وہ حضرت سلیمانؑ کے دشمن تھے۔ چنانچہ یہ چیز اب تاریخ میں آ گئی کہ وہ لوگ آئے اور خود بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے تو ان میں سے خود دس قبیلے اس سرکش باغی کے ساتھ مل گئے اور یہ سب کچھ ایک پروہت نے کیا۔ یہ تو درمیان میں ضرور آتا ہے سلطنتیں اسی طرح سے ڈوبتی ہیں۔ انہوں نے مل کر قریباً ایک سال کے بعد اس کو تخت سے اتار دیا' اس باغی سردار نے قبضہ کر لیا۔ اور اس طرح سے مملکتِ سلیمانیؑ جو اپنے اندر اتنی شوکت رکھتی تھی جانشینوں کی نالائقی اور نااہلی کی وجہ سے بلکہ ایک ہی جانشین کی تھوڑے ہی عرصے بعد' پیوستِ خاک ہو گئی۔

سلطنتِ سلیمانی کے جانشین حضرت سلیمانؑ کے بیٹے کے متعلق قرآنِ حکیم کا بیان

یہ ہے جو قرآنِ کریم نے اس آیت میں بھی کہا ہے۔ اس کے بعد سورۃ ص کی ایک دوسری (38:34) آیت ہے وہاں یہ بات ذرا ایک لفظ میں واضح کی ہوئی ہے۔ کہا ہے کہو **لَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ وَاَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا** (38:34)۔ جسم اور جسد دونوں ہی لفظ عربی زبان کے ہی ہیں۔ جسم کے جو معنی ہیں وہی عام طور پہ جسد کے معنی ہوتے ہیں لیکن جسد ایک بے جان سے انسان کو کہتے ہیں۔ جو ایسا پیکر ہو جیسے مٹی کا مادھو...... جسدِ بے روح' عام طور پہ ہمارے ہاں بھی استعمال ہوتا ہے یعنی پیکر تو انسان کا نظر آئے لیکن اس کے اندر وہ انسانی صلاحیتیں نہ ہوں' بے جان پیکر ہو' بے روح پیکر ہو' بے قوت کا پیکر ہو۔ قرآن نے کہا کہ سلیمانؑ کے تخت کے اوپر جو اس کا جانشین بیٹھا' دیکھنے کو تو وہ انسان تھا' ان کا بیٹا تھا لیکن ایک پیکرِ خاکی تھا' بے روح تھا۔ وہ جس زور سے پہلے سے حضرتِ سلیمانؑ کی شوکت کی ندی چلی آ رہی تھی' اس کی وجہ سے کچھ عرصہ تو یہ جو جسدِ بے روح تھا' یہ حکمران رہا لیکن آہستہ آہستہ اتنی خرابیاں پیدا ہوئیں کہ اس جسدِ بے روح کا جو تخت تھا اس کے پائے کو دیمک چاٹ گئی۔ آہستہ آہستہ سازشوں کی وجہ سے کمزور ہوتا چلا گیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن وہ دھڑام سے گر گیا۔

آفاق کے پردوں میں چھپا ہوا ایک ایک راز آخر کار بتدریج حقیقت بن کر سامنے آجائے گا

یہ ہے جو قرآنِ کریم نے کہا ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ قرآنِ کریم میں یہ ہے کہ سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِى الْاٰفَاقِ وَفِىٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (41:53) جو حقائق انفس اور آفاق کے پردوں کے اندر چھپے ہوئے ہیں' آہستہ آہستہ انسانی تحقیق ان پر سے پردے اٹھاتی چلی جائے گی' ان کو Discover (بے نقاب) کرتی چلی جائے گی اور ہر پردہ اٹھنے کے بعد جو حقیقت سامنے آئے گی وہ قرآن کے کسی نہ کسی دعوے کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچائے گی۔ یہ بڑی عظیم چیز ہے۔ یہ جتنی چیزیں Scientific Discoveries (سائنسی نقاب کشائیاں) ہیں' Discovery کے معنی ہی نقاب کشائی ہوتا ہے' یہ قرآن کے اسی لفظ کا حقیقت میں ترجمہ ہیں کہ رموزِ فطرت اور حقائقِ کائنات کے اوپر پردے پڑے ہوئے ہیں۔ جس دن کائنات وجود میں آئی تھی اس کے ساتھ ہی فطرت کے یہ سارے حقائق اور رموز' جتنے بھی تھے' یہ سارے وجود میں آگئے تھے۔ جس دن کائنات وجود میں آئی ہے' ایٹم اس دن بھی موجود تھا لیکن اس سے پہلے اس کے اوپر ایک پردہ پڑا ہوا تھا' انتظار میں تھا کہ انسان کی تحقیق کا ہاتھ اوپر اٹھتا ہوا' اس تک پہنچے' اس پردے کو اٹھا دے اور عروسِ حقیقت مسکراتی ہوئی دنیا کے سامنے آجائے۔ یہ چیزیں ایجاد نہیں ہیں' یہ Discover (بے نقاب) ہوتی ہیں۔ ایجادات تو ان کو کہتے ہیں کہ فطرت کی ان قوتوں کو یا ان عناصر کو یا ان Elements کو یا ان اجزا کو لے کر کسی نئے فارمولے کے ماتحت ایک نئی چیز پیدا کر دینا۔ اسے تخلیق کہا جاتا ہے' خلق کہا جاتا ہے' عربی زبان میں خلق کہتے ہی اُسے ہیں کہ ان چیزوں میں ترکیبِ نو سے کوئی نئی چیز بنا دینا۔ لیکن اُس سے پہلے یہ سارا کچھ موجود ہونا چاہیے۔ دوسری چیز جسے Discovery کہتے ہیں' جس کو انکشاف کہتے ہیں' قرآن کہتا ہے کہ یہ جو فطرت کی قوتوں کے اسرار اور رموز ہیں یہ اس کائنات کی فضاؤں کے اندر موجود ہیں' ان کے اوپر صرف تمہاری جہالت کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ جب بھی انسانی تحقیق کا ہاتھ اوپر اٹھتا ہوا' ان تک پہنچے گا' ایک پردے کو اٹھائے گا' حقیقت سامنے آجائے گی۔ اور یہ حقیقت جب بھی سامنے آئے گی قرآن کے کسی نہ کسی دعوے کی صداقت کا ثبوت بنے گی۔ اس کے متعلق ہم کیا بتائیں اور ہم سے آپ کیا پوچھیں' ہم نے انکشافات کیا کرنے ہیں' ہم تو ان کی جو منکشف چیزیں ہیں اس کے بھی بھیک مانگنے والے ہیں۔

کائناتی رموز کو مسخر کیے بغیر کوئی قوم محتاجی کی لعنت سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتی

یہی میں نے جو بات ابھی ایٹم کی کی ہے' ان قوموں نے فطرت کے ان پردوں کو اٹھایا' ایٹم کی قوت بے نقاب ہو کر ان کے سامنے آئی اور اس کے بعد دیکھیے کہ وہ پاور سے سپر پاور بن گئے۔ ہمیں جو قرآن نے کہا تھا کہ یہ تمہارا کام ہے کہ تم یہ کرو۔ کہا ہے کہ

الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَ يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (3:191)۔ صاحبانِ عقل وبصیرت اور اربابِ فکر ونظر وہ ہیں' جو زندگی کے ہر گوشے میں کھڑے' بیٹھے' لیٹے قانونِ خداوندی کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے ہیں۔ جماعتِ مومنین کی یہ خصوصیت بتائی تھی اور کہا ہے کہ ارض وسما کی تخلیق میں غور وخوض کرنا تمہارا فریضہ ہے کیونکہ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (45:13) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے' ہم نے تمہارے لیے مسخر کیا ہے۔ اٹھو اور اس پہ قبضہ کرو۔ قرآن تو مومن کی خصوصیت یہ بتاتا تھا لیکن مومن کی بتاتا تھا' ہماری نہیں بتاتا تھا۔ ہم کہہ یہ رہے تھے کہ انہوں نے اس میں یہ سبقت حاصل کرنی تھی' انہوں نے پردے اٹھانے تھے' اس کے بعد دنیا ان کی محتاج ہوتی' مگر آج کیفیت یہ ہے کہ پردے وہ یعنی اہلِ مغرب اٹھا رہے ہیں اور ہم ان کے محتاج ہو رہے ہیں۔ آج یورینیم نہیں مل رہا' وہ وعدہ کر کے پھر [1] گیا' وہ کینیڈا والا نہیں دیتا۔ نوے [1] کروڑ کے قریب یہ مسلمان ہیں' اس پوری کائنات کے اندر کوئی ایک بھی ایسا نہیں جو فطرت کے ان پردوں کو اٹھائے۔ اسی میں یہ تاریخ آتی۔

تباہ شدہ قوموں کی بستیوں کے کھنڈرات کو نگاہِ بصیرت سے پڑھنے کی ضرورت ہے

یہ قرآن تھا جس نے چودہ سو سال پہلے یہ بات کہی۔ اس سے پہلے یہ بات نہیں تھی کہ تاریخی حقائق کے اوپر بھی ماضی کے پردے پڑے ہوئے ہیں' تحقیق کرو اور انہیں اٹھاتے چلے جاؤ۔ ان کے اندر اقوامِ سابقہ کی سرگزشتیں' چھپے ہوئے حقائق' تمہارے لیے یہ قانون بے نقاب کریں گی کہ قوموں کے عروج وزوال کے قوانین اور اصول کیا ہیں۔ اور یہ بات جو قرآن نے کہی کہ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ (30:42) گھر میں بیٹھے ہوئے نہیں بلکہ جاؤ' پھرو' چلو' اس کرۂ ارض کے اوپر۔ اور اس کے بعد ہے کہ جو تباہ شدہ قوموں کی بستیوں کے کھنڈرات ہیں ان کو جا کر پڑھو' ان کی اینٹوں کے اوپر ان کی داستانیں لکھی ہوئی ہیں اور ان داستانوں میں وہ قوانین پوشیدہ ہیں جن کی رو سے قومیں تباہ ہوا کرتی ہیں۔ جاؤ اور ان کو پڑھو۔ عزیزانِ من! قرآن نے یہ چیز کہی تھی کہ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ (30:42) ذرا دنیا میں چلو پھرو' سیاحت کرو تو بات سمجھ میں آ جائے گی۔

تصوف کی دنیا میں سیروا فی الارض کا عملی طریق

پتہ نہیں آپ کو یاد ہے یا نہیں' میرا خیال ہے کہ ایک دفعہ میں نے بتایا تھا۔ جس طرح سے یہ کہا جائے گا کہ نماز پڑھنا حکم ہے تو اسی طرح سے سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ حکم ہے۔ حکمِ خداوندی کی تعمیل تو ضروری ہے۔ یہ جو اربابِ شریعت ہیں وہ تو پوری پوری تعمیل نہیں

---

[1] یاد رہے کہ یہ بات مارچ 1980ء کی 7 تاریخ کو کہی گئی تھی۔

کرتے لیکن جو اللہ کے مقرب بندے ہیں' وہ کرتے ہیں' ہم بھی کسی زمانے میں کیا کرتے تھے۔تصوف کے اندر ایک چلّہ ہوتا ہے۔ گئے' جا کے پوچھا کہ ہم حضرت صاحب کی زیارت کے لیے آئے ہیں۔اُنھوں نے کہا کہ صاحب! ان دنوں تو وہ مل ہی نہیں سکتے۔وہ حجرے کے اندر ہیں۔جی! کب ملیں گے؟ وہ چالیس دن کے چلّے کے بعد ملیں گے' ابھی اس میں پندرہ دن باقی ہیں۔ان سے کہا کہ وہ کسی وقت باہر نکلیں تو بہرحال ہم قدم بوسی کرلیں گے۔کہا کہ صاحب! وہ تو ایسے چلّے میں ہیں کہ وہ تو باہر نکل ہی نہیں سکتے۔جی! کس چلّے میں ہیں؟ کہنے لگے: سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ کے چلّے میں ہیں۔حجرے کے اندر چالیس دن تک محبوس اور قید رہنے سے کہ ایک قدم باہر نہیں نکالنا' یہ سیروا فی الارض کا چلّہ ہو رہا ہے۔اس لیے کہ قرآن نے حکم دیا ہے: سیروا فی الارض اور حجرے کے اندر بیٹھے ہوئے اس کی تعمیل ہو رہی ہے۔کہا کہ صاحب! پھر یہ جو ارض کی سیر ہے' وہ کیسے ہوئی۔کہنے لگے کہ وہ ٹھیک ہے یہ جو دنیا کے مادہ پرست لوگ ہیں' وہ اپنے پاؤں سے چل پھر کر' ماتھے کی آنکھوں سے جا کر' ان کو دیکھتے ہیں' ہمیں بیٹھے بٹھائے ہوئے عرش تک کی چیزیں نظر آ جاتی ہیں۔یہ سیروا فی الارض کے چلّے ہو رہے ہیں۔وہ قومیں چاند تک پہنچ گئی ہیں' مریخ تک جانے کی فکر کر رہی ہیں' وہ یہ کچھ کرتی ہے اور ان کی تحقیق سے قرآن کے دعوے کی صداقت کے ثبوت بہم پہنچتے ہیں۔

قرآنِ کریم کی حامل قوم کے حوالے سے کائنات کو مسخر کرنے کے برعکس آسمانوں کے متعلق ہماری علمی سطح

قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ کرۂ ارض اور یہ جو فضا کے اندر اور کرّے ہیں ان میں بھی جاندار مخلوق ہے' زندگی موجود ہے۔یہ فریضہ ہمارا تھا کہ اس دعوے کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچاتے کہ وہاں زندگی ہے۔اور اس سے آگے یہ ہے کہ خدا کے قانون کی رو سے یہ بھی ممکن ہے کہ کسی ایک دن زمین کے کرّے اور ان کرّوں کے اندر باہمی ربط پیدا ہو جائے بلکہ وَهُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ (42:29) ہے کہ ان کا ملاپ ہی ہو جائے' یہ بھی خدا کے قانون کی رو سے ممکن ہے' ایسا ہو سکتا ہے۔یہ ہمارا فریضہ تھا کہ ہم قرآن کے اس دعوے کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچاتے۔ہم کیسے ثبوت بہم پہنچاتے؟ ہمارے ہاں تو کتبِ تفاسیر میں یہ لکھا ہوا ہے کہ یہ جو آسمان ہے' یہ شیشے کا ایک ڈل ہے اور یہ جو ستارے ہیں' وہ اس کے اندر جواہرات جڑے ہوئے ہیں۔ڈل کی موٹائی پانچ سو سال مسافت کی ہے' پھر اس کے بعد درمیان میں خلا' پھر اس کے بعد اتنا ہی موٹا اور ڈل' پھر اس قسم کے سات یہ اوپر تلے آسمان ہیں۔آپ کو یاد ہوگا کہ وہ جو حدیث ہے کہ اس ساتویں آسمان کے اوپر ایک سمندر ہے' اس کی گہرائی پانچ سو میل کے سفر جتنی ہے اور اس سمندر کے اندر سات پہاڑی بکرے ہیں' سمندر کا پانی ان کے گھٹنوں تک آتا ہے اور ان بکروں کے سینگ کے اوپر خدا کا عرش ہے۔اب یہ

چیز کسی مفسر‘ کسی عالم‘ کی نسبت سے ہوتی تو ہم کہتے کہ صاحب! اس دور کی بات ہے‘ انہیں علم نہیں تھا کہ زمین کیا ہوتی ہے‘ یہ کرّے کیا ہیں‘ یہ فضا کیا ہے عرش سے کیا مراد ہے لیکن جب اس نے قال رسول اللہ ﷺ کہا تو پھر اس کے بعد کیا کہا جائے۔ یہ خیال نہیں آتا کہ کائنات کی عظیم ترین ہستی‘ جو الم الناس ہے‘ علمِ انسانی کی معراجِ کبریٰ کے اوپر فائز تھے‘ ان کی طرف یہ چیزیں منسوب کرتے ہیں۔

میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن نے جب یہ کہا تھا کہ زندگی (Life) یہیں نہیں ہے بلکہ اور کرّوں کے اندر بھی ہے اور ایک دن ایسا آسکتا ہے کہ جب ان میں باہمی ملاپ پیدا ہو جائے (42:29)‘ یہ ہمارا فریضہ تھا کہ ہم یہ ثابت کرتے کہ دیکھیے ملاپ بھی پیدا ہوا ہے اور پھر ایسے کرّے دریافت کرتے جن کے اندر زندگی کی نمود ہے۔ یہ اُنہوں (اہلِ مغرب) نے کیا۔

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

وہ اس کی تصدیق کرتے ہیں‘ ہم ان کا مذاق اڑاتے ہیں: ”کہتے ہیں کہ چاند پہ چڑھ گئے ہیں“۔ وہ تو آپ کو پتہ ہی ہے‘ بار بار دہرانے کی کیا بات ہے کہ کیسے مذاق ہوا تھا۔ عزیزانِ من! اسی طرح سے تاریخی حقائق ہیں۔ یہ ماضی کی داستانیں قرآنِ کریم نے چودہ سو سال پہلے بتائیں کہ اس زمانے میں جب تاریخ نے ابھی اتنی Discoveries (نقاب کشائیاں) نہیں کی تھیں۔ ہمارا کام یہ تھا کہ ہم تاریخ کی تحقیق بھی کرتے اور جو کچھ اُس نے کہا تھا‘ اس کے ثبوت بہم پہنچاتے لیکن ہم تو سیروا فی الارض کے وظیفے اپنے حجروں میں کرتے رہے۔ اُنہوں نے یہ کچھ بھی کیا۔

آج فلسطین کے علاقوں کے کھنڈرات کی کھدائی منہ بولتی داستانیں ہیں

آپ حیران ہونگے کہ یہ جتنی قومیں قرآن نے گنائی ہیں‘ یہ عاد اور ثمود اور قوم لوط اور حضرتِ ابراہیمؑ کی قوم اور بابل کے اور نینوا کے یہ سارے کھنڈرات‘ فلسطین کے علاقوں کے اندر ہیں۔ قرآن نے کہا تھا کہ جاؤ‘ ان کھنڈرات کی اینٹوں پہ لکھی ہوئی داستانیں پڑھو کہ قومیں کس طرح سے تباہ ہوا کرتی ہیں۔ یہ سارے علاقے جتنے بھی ہیں‘ مسلمانوں کے قبضے میں رہے‘ انہوں نے تو یہ کچھ نہ کیا۔ مغرب کی قومیں وہاں بھی اب کھدائیاں کر رہی ہیں اور یہ چیزیں نکال رہی ہیں۔ ابھی میں عرض کرونگا کہ قومِ سبا کا علاقہ‘ جو یمن تھا‘ اس کے متعلق قرآن نے کیا کچھ کہا ہے۔ ہم نے تو کبھی تحقیق نہ کی۔ آج وہاں کھدائیاں شروع ہو رہی ہیں‘ ایک ایک اینٹ کے اوپر جو کچھ لکھا ہوا ہے قرآن کی آیات کی تصدیق کیے چلا جا رہا ہے۔

قرآنِ حکیم کے سلسلہ میں عربی زبان کی اہمیت اور اس کا انداز

قرآن نے جن الفاظ میں بات کی ہے‘ ان کے مجازی معنی بھی ہیں۔ میں پھر عرض کردوں کہ یہ عام طور پہ بلند پایہ لٹریچر کی بھی

خصوصیت ہوتی ہے اور وحی کی رو سے جو کتابیں آتی ہیں' اور جو محفوظ ہے وہ قرآن ہی ہے' اس میں بھی یہ چیز ہے۔ یہ عربوں کی زبان ہے۔ الفاظ کے ایک تو Literal Meaning (لفظی معنی) ہوتے ہیں مثلاً جب ہم پانی کہتے ہیں تو اس کے Literary (لفظی) معنی تو یہ پانی ہی ہوتے ہیں لیکن ہم جب کہتے ہیں کہ ''پانی پانی کرگئی مجھ کو قلندر کی یہ بات'' تو یہ نہیں تھا کہ میں پانی کا ایک گھڑا بن گیا۔ اسے کہتے ہیں مجازی معنی۔ دنیا کی کوئی زبان بھی لیجیے جوں جوں اس کی سطح بلند ہوتی چلی جاتی ہے اس میں لفظی معنی کم ہوتے چلے جاتے ہیں اور مجازی معنی بڑھتے چلے جائیں گے۔ یہ جنہیں آپ مجازی معنی کہتے ہیں' ان میں استعاروں کے ذریعے سے وہ بات سمجھائی جاتی ہے۔

الفاظ کا مجازی مفہوم' زبان کی ذہنیت متصور ہوتا ہے

استعاروں سے بات سمجھانے کی یہ خصوصیت بڑھتی چلی جاتی ہے اور یہ چیز خاص طور پہ ایسی کتابوں میں ملتی ہے' جو وحی کی رو سے آتی ہیں' جس نے چودہ سو سال پہلے کے انسان کی علمی سطح کو بھی بات سمجھانی تھی اور آج کے آئن سٹائن (1879-1955) کو بھی بات سمجھانی تھی۔ اور وہ آئن سٹائن تو آج کا ہے' ابھی تو قیامت تک پتہ نہیں کہ آئن سٹائن سے بھی کتنی سطح بلند ہوتی چلی جانی ہے' تو اس نے ان کو بھی بات سمجھانی ہے۔ ایسی زبان جس میں مختلف سطح کے انسانوں کی سمجھ میں بھی بات آتی چلی جائے' اسے Figurative (تمثیلی' مجازی) بھی ہونا چاہیے' اُس کے مجازی معنی ہونے چاہئیں۔ وہ عرش کہے تو اس زمانے کا عام سطح کا انسان وہ جو تختِ حکومت ہوتا ہے' وہ سچ مچ کا وہ تخت سمجھے' بات تو یہی ہے کہ بادشاہت حکومت ہے۔ اور جوں جوں آگے بڑھے یہ نہیں ہے کہ اپنی طرف سے ان کے یہ معنی کرتے ہیں' عربی زبان کے اندر یہ عجیب چیز ہے' جس کا انتخاب کیا گیا ہے۔ قرآن کے لیے کوئی دوسری زبان متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔ اُس میں اتنے Figurative (تمثیلی) یا مجازی معنی لیے ہوئے ہوتے ہیں کہ قرآن کو اس زبان کی رو سے آپ دیکھیے تو کوئی نہ کوئی مجازی معنی اس کے لیے مل جاتا ہے۔ عرش کے معنی اُنہوں نے مرکزی Control (کنٹرول) لکھا ہے' یعنی وہ پایۂ تخت ہے' برسرِ تخت ہے' وہ تخت پر بیٹھ گیا تو ضروری نہیں کہ سچ مچ ایک تخت پوش بنا ہوا ہوتا ہے اور اس کے اوپر بیٹھ جاتا ہے۔ تختہ الٹ دیا جھنڈا سرنگوں ہوگیا۔ یہ سب مجازی معنی میں آتا ہے۔

قرآنِ حکیم کو سمجھنے کا طریق

قرآنِ کریم کی یہ جتنی آیتیں اس انداز کی آتی ہیں' جن میں حقائق پوشیدہ ہوتے ہیں' ان میں خاص طور پہ کھڑے ہوکر دیکھنا چاہیے کہ اس زبان میں ان الفاظ کے مجازی معنی کیا دیئے ہوئے ہیں۔ میں نے اپنی ''لغات القرآن'' کو مرتب ہی اس طرح سے کیا

ہے کہ ان الفاظِ قرآنی کے جو لفظی معنی ہیں' وہ بھی دوں اور عرب جن مجازی معنی میں ان کو استعمال کرتے ہیں' وہ بھی ساتھ دیتا چلا جاؤں۔ قرآن نے یہ کہا ہے کہ حضرتِ سلیمانؑ کی وفات کے بعد اس کی کرسی کمزور ہوگئی' متزلزل ہوگئی۔ اب یہ جو لفظ ہے تو یہ سچ مچ کی وہ کرسی نہیں ہے جس کے اوپر میں بیٹھا ہوں یا سچ مچ کا لکڑی کا تخت نہیں ہے جسے عرش کہیں گے۔ اگر یہ ہو تو خدا کے متعلق کیا کہا جائے گا جب قرآن یہ کہتا ہے کہ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ (2:255) خدا کی کرسی تو ارض و سماوات کے اوپر پھیلی ہوئی ہے' تو گویا وہ کوئی کرسا بنا ہوا ہوگا۔ ٹھیک ہے لفظی معنی ہم یوں لیں گے لیکن جب مجازی معنی لیں گے تو اس کے معنی اقتدار ہوگا۔ یہاں اب بھی ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں کی کرسی کے اوپر کون بیٹھا ہوا ہے' اس کی کرسی اس سے چھن گئی۔ یہ مجازی معنی ہوتے ہیں اور ہر زبان میں ہوتے ہیں۔ قرآن نے بھی انہیں استعمال کیا ہے۔

عربی زبان کے مرادفات کا کوئی زبان مقابلہ نہیں کرسکتی' فیضی کی لکھی ہوئی قرآنی تفسیر بغیر کسی نقطہ کے موجود ہے

میں نے عرض کیا ہے کہ عربی زبان کی اپنے مجازی معنی کی رو سے' مرادفات کے اعتبار سے' دنیا کی کوئی زبان آج تک بھی اس کا مقابلہ نہیں کرسکی۔ شاید میں نے بتایا ہو کہ اس زبان کے اندر مرادفات کی کس قدر وسعت ہے! اکبر (1556-1605) کے دربار میں نورتنوں میں سے ابوالفضل اور فیضی دو بھائی تھے۔ فیضی نے قرآنِ کریم کی تفسیر عربی زبان میں دو ضخیم جلدوں میں لکھی ہے اور اس پوری کی پوری تفسیر میں ایک حرف ایسا نہیں آیا جس پہ نقطہ ہو۔ کیا پوچھتے ہیں اس زبان کا! یہیں سے پتہ چلتا ہے کہ کیوں قرآن بار بار کہتا ہے کہ ہم نے اسے عربی مبین کے اندر نازل کیا ہے۔ وہ زبان کی اہمیت بتاتا ہے۔ قرآن نے یہ کہا ہے کہ اس کی جو کرسی تھی' اس کے اوپر ایک جسد (38:34) 'دَآبَّةُ الْاَرْضِ (34:14) بیٹھا۔ جسد کے معنی ہوتا ہے ایک لوتھڑا سا یا مٹی کا مادھو سا۔ ارض کے اعتبار سے لیں تو اس کے معنی پستی ہیں' مٹی کا پیکر ہیں' جسے آج جسدِ آب و گل کہتے ہیں یعنی محض سانس لینے والا۔

حضرت سلیمانؑ کے جانشین بیٹے کے تخت و تاج کی' حکمرانی کی' حالت زار

کہا ہے کہ سلیمانؑ کے اقتدار' وسعت اور شوکت کا یہ عالم تھا کہ ایک دنیا جہان اس کے لیے مزدوریاں کرتی تھی۔ اور اس کے فوری بعد اس کے جانشین کی' جو بیٹا تھا' یہ کیفیت تھی کہ وہ ایک جسدِ بے جان ہے جو اس کے تخت کے اوپر آ کر بیٹھا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خود ایسا تھا اور اس نے سلطنت کو قائم رکھنے کے لیے جو سہارے لیے' ان سہاروں کی کیفیت یہ تھی کہ وہ خود اتنے کمزور تھے۔ مثال کے طور پر کہا کہ جیسے عصا کو دیمک چاٹ جائے تو وہ گر جاتا ہے۔ خود جسدِ بے جان تھا' سارے سہارے کھوکھلے تھے۔ کچھ دنوں کے لیے

وہ جو شوکت وحشمت تھی وہ قائم رہی۔ وہ جو بڑے بڑے سرکش پہاڑی باشندے تھے جو اس کے کام میں لگے رہتے تھے' انہوں نے یہ کہا کہ اتنے عرصے تک ہمارے ذہن میں جو وہ پہلی شوکت اور حشمت کا تصور اور دبدبہ اور ولولہ چلا آتا تھا' اس کی وجہ سے ہم آنکھیں بند کر کے' یہ سب کچھ کرتے چلے گئے' ہمیں پتہ ہی نہیں چلا کہ یہ تو ایک مٹی کا مادھو ہے' جو اس کے تخت کے اوپر بیٹھ گیا ہے۔ اگر پتہ چلتا کہ اتنا کمزور ہے اور اس کے سہارے اتنے کھوکھلے ہیں' تو ہم پہلے ہی دن اس کو الٹ کر رکھ دیتے۔ اسے قرآن نے عذابِ مھین (34:14) کہا ہے یعنی ذلت آمیز تباہی۔ وہ کہنے لگے کہ اس قسم کے بادشاہ کی اطاعت ہمارے لیے بڑی ذلت آمیز تھی۔

روایات کے مطابق حضرت سلیمانؑ کا یہ بیٹا ایسا نالائق کیوں نکلا؟

سوال یہ پیدا ہوا کہ یہ بیٹا اس قسم کا کیوں پیدا ہوا اور کیوں کا جواب تو دینا ہوا کیونکہ مفسرین کے ذمے ہے۔ اب سنیے! وہ بیٹا کیسے پیدا ہوا۔ اپنی بیٹیوں سے معذرت کے ساتھ کہتا ہوں۔ یہ تو میں تفسیر کی باتیں کر رہا تھا۔ سُنیوں کے ہاں حدیثوں کی کتابوں میں چھ کتابیں مستند ہیں جن کو صحاح ستہ کہتے ہیں۔ ان میں سے جو دو ہیں ان کو صحیحین کہتے ہیں یعنی مسلم اور بخاری۔ اور ان میں سے بخاری کو اصح الکتب کہا جاتا ہے یعنی صحیح ترین کتاب بعد کتاب اللہ۔ غنیمت ہے کہ بعد کتاب اللہ کہہ دیا ورنہ ان کے ہاں تو عقیدہ یہ ہے کہ حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے۔ اور آپ کے ہاں کئی احکامِ شریعت ایسے نافذ ہیں جو قرآن کے خلاف جاتے ہیں۔ وہ حدیث کے مطابق ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اس حدیث نے قرآن کی اس آیت کو منسوخ کر دیا ہوا ہے۔ سب سے زیادہ صحیح کتاب بخاری شریف ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ بیٹا جو بتایا گیا تھا کہ نالائق ہے یعنی اس آیت کے معنی تو انہوں نے وہی کیے تھے کہ حضرتِ سلیمانؑ کی جو لاش تھی وہ عصا کے سہارے کھڑی تھی لیکن وہ جو بات آئی کہ ان کا بیٹا نالائق تھا تو وہ بیٹا کیسے نالائق پیدا ہوا۔ بچیوں اور بہنوں سے معافی کے ساتھ کہتا ہوں۔ جب تک وہ الفاظ سنا نہ دوں تو بات آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گی کہ انسان یہاں تک بھی چلا جاتا ہے۔ بخاری شریف کی حدیث ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایک بار سلیمانؑ نے کہا کہ میں آج رات اپنی ستر عورتوں کا دورہ کرونگا اور ہر عورت حاملہ ہو کر ایک ایسا شاہسوار پیدا کرے گی جو راہِ خدا میں جہاد کرے گا۔ سلیمانؑ کے ساتھی نے کہا کہ انشاء اللہ کہو جو کہہ رہے ہو کہ ستر شاہسوار پیدا ہونگے لیکن حضرتِ سلیمانؑ نے نہ کہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی عورت حاملہ نہ ہوئی صرف ایک عورت کے آدھا بچہ پیدا ہوا۔ حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ اگر سلیمانؑ انشاء اللہ کہہ دیتے تو سب شاہسوار پیدا ہوتے اور خدا کی راہ میں جہاد کرتے۔ تو وہ نہ ہوئے' وہ ایک جو تھا وہ بھی آدھا پیدا ہوا اور اس طرح سے ان کا وہ بیٹا اتنا نالائق پیدا ہوا۔

ملکہ سبا کا قصہ

حضرتِ سلیمانؑ کے بعد ملکہ سبا کا قصہ آتا ہے۔ اس سورۃ کا نام اگرچہ سورۃ سبا ہے لیکن یہ واقعہ تفصیل سے یہاں نہیں آیا۔ یہ سورۃ النمل میں بھی آیا ہے، سورۃ القصص میں بھی آیا ہے اور دوسرے مقامات میں بھی آیا ہے۔ حضرتِ سلیمانؑ کے متعلق بھی جو دوسرے واقعات ہیں، وہ آگے چل کر آئیں گے، وہ تو میں صرف ان مقامات میں لونگا۔ یہاں جتنا حصہ قرآن نے بیان کیا ہے اس میں ہمارے لیے ایک بہت بڑا سبق ہے اور عبرت ہے کہ ملکہ سبا کا جو ملک تھا، اسے انگریزی میں Sheba بھی کہا کرتے ہیں، اس کی فلمیں بھی بن کر آیا کرتی تھیں۔ یہ سبا ملک کا نام ہے اور اس کوئین (ملکہ) کو بھی اسی لیے سبا کہتے تھے۔ یہ جو شمالی یمن کا علاقہ ہے یہ ان کا علاقہ تھا۔ یہ بڑا ہی پرفضا علاقہ ہے، سرسبز و شاداب ہے۔ ان کی معیشت زرعی تھی، کھیتیاں تھیں، باغات تھے، پانی کے چشمے تھے۔ پانی کے چشموں کو انہوں نے ڈیم بنا کر محفوظ کر رکھا تھا۔ دور دور تک اس سرزمین پر ان کی مملکت میں کھیتیاں لہلہاتی تھیں، باغات سرسبز تھے اور ان کی معیشت زرعی تھی۔ یہ جو اپنی پیداوار تھی گویا یہاں یمن سے لے کر شام کے علاقے، فلسطین کے علاقے، تک کی جو راستے میں منڈیاں تھیں، ان تمام میں ان کی پیداوار جایا کرتی تھی۔ بڑا خوشحال ملک تھا۔ ملکہ سبا کے ساتھ جو معاملہ حضرتِ سلیمانؑ کا ہوا، وہ تو بات آگے چل کر آئے گی۔ یہاں قرآنِ کریم نے اس قوم کے انجام کی بات کی ہے۔ کہا ہے کہ **لَقَدۡ كَانَ لِسَبَاٍ فِىۡ مَسۡكَنِهِمۡ اٰيَةٌ** (34:15) وہ مملکت ایسی تھی کہ دور دور تک لوگ اس کی مثال دیا کرتے تھے کہ خوشحال مملکت ہو تو اس قسم کی ہو۔ **جَنَّتٰنِ عَنۡ يَّمِيۡنٍ وَّ شِمَالٍ** (34:15) دائیں اور بائیں ان کے مسلسل باغات چلے جاتے تھے۔

قرآنِ حکیم کے الفاظ میں ایک کامیاب حکومت کا نشان یہ ہے کہ "مملکت سرسبز و شادات ہو اور خدا کی حفاظت میں ہو"

ہمیشہ قرآن یہ کہتا ہے کہ **كُلُوۡا مِنۡ رِّزۡقِ رَبِّكُمۡ وَاشۡكُرُوۡا لَهٗ** (34:15) اتنا کچھ خدا نے دیا ہے تو اسے اس طرح صرف میں لاؤ جس طرح اس نے کہا ہے۔ یہ ہوتا ہے شکر۔ ایسا کرو گے تو تمہاری محنتیں بھرپور نتائج پیدا کریں گی۔ اس کے بعد چار الفاظ ہیں یا دو ٹکڑے ہیں اور میں کہتا ہوں کہ اس دنیا کی ساری حقیقتیں چار لفظوں میں سمٹ آئی ہیں۔ اور جسے آپ اسلامی مملکت کہیں گے اس کو تو بیان ہی چار لفظوں میں کر دیا ہے۔ عزیزانِ من! سنیے قرآن کا اعجاز کہ سمٹا کر بات کیسے کرتا ہے۔ کہا کہ **بَلۡدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّ رَبٌّ غَفُوۡرٌ** (34:15) مملکت سرسبز و شاداب ہو اور خدا کی حفاظت ہو بس یہ کافی ہوتی ہے۔ یہ ہے اعجاز قرآن کا۔ عزیزانِ من! کہیے کہ کیا اس میں کوئی کمی یا کسی اضافے کی ضرورت یا کسی تشریح کی ضرورت ہے؟ اس نے کہا ہے کہ بھوک خدا کا عذاب ہوتا ہے۔ وہ جو

سورۃ النحل کے اندر ہے کہ ایک قوم تھی' انہیں امن بھی تھا' اطمینان بھی تھا۔ امن یہ تھا کہ انہیں حفاظتِ خداوندی حاصل تھی' اطمینان یہ تھا کہ انہیں رزق کی طرف سے اطمینان تھا۔ رزق کی طرف سے استغنٰی تھا کہ اطمینان پیدا ہو جائے۔

خبیث کے معنی جو درخت پھل نہ دے اور لفظ مغفرت کے معنی بخشنے والا نہیں بلکہ حفاظت کرنے کے ہوتے ہیں

یہاں بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ (34:15) کہا ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ طیّب اور خبیث عربی زبان کے دو الفاظ ہیں۔ ترجمہ میں تو ہمارے ہاں طیّب کے معنی پاک اور خبیث کے معنی خبیث ہی کرتے ہیں۔ یہ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ ہے۔ طیّب اس درخت کو کہتے ہیں ''جس میں پھل آئیں'' خبیث وہ درخت ہوتا ہے جو ''درخت تو ہو مگر پھل نہ دے''۔ کہا ہے کہ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ (34:15) پوری کی پوری مملکت پھلوں سے لدی ہوئی تھی اور اُن کے شہروں کی آب و ہوا نہایت خوشگوار تھی۔ یہ تو ہو گئی مادی چیز لیکن اگلی بات بھی تو ساتھ ہے کہ امن بھی تو ہونا چاہیے۔ اس کے لیے کہا کہ وَّ رَبٌّ غَفُوْرٌ (34:15)۔ ترجمہ یہ ہے کہ خدا بخشنے والا ہے۔ یاد رکھیے! ''بخشنے والا'' نہیں بلکہ مغفرت کے معنی ''حفاظت'' کے ہوتے ہیں۔ خدا کی ''حفاظت'' ہو اور رزق کی ''فراوانی'' ہو تو اس کے بعد اور کیا چاہیے۔ خالی رزق کی فراوانی بھی تباہی لے آتی ہے۔ اور اگر یہ کچھ ایسا ہو ہی نہ کہ جس کے لیے خدا کی حفاظت کی ضرورت ہے تو پھر خدا کی حفاظت بے معنی چیز ہے یعنی وہ کاہے کی حفاظت کرے گا۔

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا' دعا دیتا ہوں راہزن کو

(غالب)

جو قوم لٹ جائے' ان کو کھٹکا کاہے کا رہتا ہے' ان کو حفاظت کی کیا ضرورت رہتی ہے' اجڑے ہوئے مکان میں کوئی بھی کبھی چوکیدار نہیں رکھتا ہے۔ کہا ہے کہ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّ رَبٌّ غَفُوْرٌ (34:15)۔ ان کی پوری کی پوری سلطنت پھلوں سے لدی ہوئی تھی اور شہروں کی آب و ہوا نہایت خوشگوار تھی' پہاڑوں میں بند بنے ہوئے تھے' جو پانی کو روک کر آبپاشی کا کام دیتے تھے' غرضیکہ اس فراواں سے جو تمہیں فطرت کی طرف سے یوں بلا مزد ور معاوضہ ملا ہے' خوب کھاؤ پیو لیکن ان نعمتوں کو قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کرو' یہی ان کی شکر گزاری اور قدر شناسی ہے۔ ایسا کرو گے تو تم تباہیوں سے محفوظ رہو گے۔ عزیزانِ من! میں نے عرض کیا ہے کہ کسی سے بھی کہیے' وہ بلند سے بلند قلم کا شناور بھی کیوں نہ ہو کہ چار لفظوں میں یوں بات بتا جائے اور اس کے بعد سارا قصہ مکمل کر دے' وہ یہ

نہیں کر سکتا۔ ساری معیشت اس کے اندر آ گئی اور ساتھ خدا کی حفاظت بھی ہے۔

مملکتوں کی حقیقی حفاظت وہاں کے باسیوں کے قلبی سکون اور راحت سے مشروط ہوتی ہے جس کا اصل محور قرآنی اقدار ہیں

صرف یہی نہیں ہے کہ سپاہ ہونی چاہیے' فوجیں ہونی چاہئیں اور توپیں ہونی چاہئیں۔ یہ بھی بڑی ضروری چیزیں ہیں لیکن حقیقی حفاظت تو وہ ہوتی ہے جو وہاں کی آبادی بس رہی ہے' ان کے قلب کو ایک اطمینان میسر ہو۔ اور وہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ معاشرے کا نظام خدا کی اقدار کے مطابق ہو' ہر فرد اپنے آپ کو مطمئن محسوس کرے۔ وہ ہے رَبٌّ غَفُوْرٌ (34:15)۔ ربوبیت کی رو سے جو مغفرت حاصل ہو۔ عزیزانِ من! ان الفاظ کے معنی کھولتے جائیے اور جھومتے جائیے۔ رَبٌّ غَفُوْر (34:15)۔ وہ مغفرت ہے جس میں ہر فرد کو ربوبیت حاصل ہو اور وہ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ (34:15) میں ہی ہوسکتی ہے۔ آگے کہا ہے کہ فَاَعْرَضُوْا (34:16) اُنہوں نے اس بات سے اعراض برتا' منہ پھیر لیا اور ملک میں فساد برپا کرنا شروع کر دیا' تو ان کے حالات نے پلٹا کھایا۔

دوسروں کی زمین ہتھیانے کی بھوک اور دور دراز چلے جانے کی ہوس کا دوسرا نام استعماریت ہے

دو آیتوں کے بعد یہ ہے' جسے آج آپ استعماریت یا Colonization کہتے ہیں کہ اپنی وہ مملکت' سلطنت' جگہ چھوٹی سی ہوتی ہے' پھر وہ اپنے پاؤں پھیلاتی ہے کہ وہ علاقہ بھی ہمارے قبضے میں آ جائے' وہ بھی ہمارے قبضے میں آ جائے۔ یوں وسعت چاہتی ہے' اپنے علاقے کے اوپر ہی مطمئن نہیں ہوتی۔ یہ ہے جسے جوع الارض کہا جاتا ہے' یہ دوسروں کی زمینیں چھین لینے کی بھوک' دور دراز تک چلے جانے کی ہوس ہے۔ دو ہی طریقے ہوتے ہیں: یا تو حکمرانی کے لیے دوسرے ممالک قبضے میں لیے جائیں یا جو زرعی پیداوار ہے اس کی بجائے تجارت اختیار کر لی جائے۔ انگریز کی East India Company (ایسٹ انڈیا کمپنی) نے یہی کیا تھا' وہ اس راستے سے آئی تھی اور وہ انگریز کی حکمرانی کا ہراول دستہ بنی تھی۔ قرآن نے کہا ہے کہ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ بھی تھا اور رَبٌّ غَفُوْرٌ بھی تھا۔ لیکن فَقَالُوْا رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا (34:19) ان کے دل میں ہوس پیدا ہوئی کہ اسی مملکت کے اندر مطمئن ہو کر بیٹھنا کیا ہے۔ یہاں تو سب کچھ حاصل ہے' چلیے! اب آگے بڑھیے۔ کہا کہ بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا (34:19) ہمارے سفر لمبے لمبے کر دے۔ فَقَالُوْا کے معنی ہیں کہ انہوں نے مانگ مانگ کر یہ چیزیں لیں۔ ظَلَمُوْا (34:19) انہوں نے کمزوروں کے اوپر جا کر ظلم کیا۔ کہا ہے کہ کمزوروں پہ ظلم کیا کرنا تھا وَ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ (34:19) اپنے آپ پہ ظلم کیا۔ اچھے بھلے مطمئن بیٹھے تھے لیکن دور دور تک ہوسِ ملک گیری کے اندر چلے گئے۔ دوسروں کا ملک تو اسی طرح سے چھینا جاتا ہے کہ وہ کمزور ہوں اور یہ قوت کے بل بوتے پر ان کی

مملکت اور سب کچھ چھین لیتے ہیں۔ کہا ہے کہ بظاہر ان پہ ظلم کیا لیکن یہ اپنے آپ پہ ہی ظلم کیا۔ آگے بات وہاں آئے گی۔

استعماریت کا نتیجہ: اصل زر بھی ختم ہوا اور صرف داستانیں باقی رہ گئیں

یہاں کہا ہے کہ **فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِیْثَ** (34:19) نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بعد اتنی بڑی مرفع الحال اور خوشگواریوں کی مالک قوم کی دنیا میں صرف اس کی داستانیں باقی رہ گئیں۔ سوال یہ ہے کہ ہوا کیا؟ سنیے کہ ہوا کیا۔ اب جو وہ دور دراز ملکوں تک چلے گئے' ان کے اپنے ملک کے اندر زرعی نظام تھا' اور اس کے لیے بند بنائے ہوئے تھے' خواہ انہوں نے تجارت کے لیے یہ کیا یا حکمرانی کے لیے کیا' وہ بہرحال دور دور تک نکل گئے' یہ جو ان کی زرعی معیشت تھی' اس کی طرف سے اعراض برتا' یہ جو بند تھے ان کی مرمت نہ کی' نگہداشت نہ کی' ان کا خیال نہ رکھا کیونکہ دوسری طرف بہت تھوڑی محنت سے دولت حاصل ہو رہی تھی۔ Overnight Millionnaire (شباشب کروڑ پتی) بننے کا جو خیال پیدا ہوا' تو یہ جو ملک کے اندر یہ سارے اسباب تھے' ان کو Neglect (فراموش) کیا۔ فاعرضوا (34:16) یہ جو انہوں نے اعراض برتا تو نتیجہ یہ ہوا کہ **فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ سَیْلَ الْعَرِمِ وَ بَدَّلْنٰهُمْ بِجَنَّتَیْهِمْ جَنَّتَیْنِ ذَوَاتَیْ اُكُلٍ خَمْطٍ وَّ اَثْلٍ وَّ شَیْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِیْلٍ** (34:16) ایک ہی دفعہ جو پانی آیا' آگے جو بند تھا' اس کی دیواریں ٹوٹیں' سارا ملک اس سیلابِ بلا کے اندر بہہ گیا۔ وہ جو باغات تھے اب وہاں جھاؤ جھڑ بیریاں کانٹے دار جھاڑیوں کے سوا کچھ نہیں نظر آئے گا۔ آج تک اُس علاقے میں یہی کچھ ہے۔ ابھی چند دن ہوئے ایک آرٹیکل (مضمون) چھپا تھا۔ وہاں جو تحقیقات کر رہے ہیں' وہ بتا رہے ہیں کہ اس بند کے نشانات' اس کی دیواریں' وہاں موجود ہیں جو کھدائی میں سے نکلی ہیں اور یہ جھاؤ اور جھڑ بیریاں اور یہ کانٹے دار جھاڑیاں ہیں۔ کہا کہ باغات تھے' بس اتنا ہی ہوا کہ وہ پھل دار درخت جو خوشگواریوں کے تھے' اُن کی جگہ جھاؤ جھڑ بیریاں اُگ پڑیں۔

خارجی کائنات کے قوانین کو نظر انداز کرنے کا دوسرا نام کفر بھی ہے

کہا ہے کہ **ذٰلِكَ جَزَیْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا** (34:17)۔ اُنہوں نے یہ کفر کیا برتا کیونکہ پہلے کوئی ایمان کی بات تو سامنے آئی نہیں۔ نظر آیا کہ قوانینِ خداوندی جو خارجی کائنات کے اندر کارفرما ہیں' ان سے انکار کرنا بھی کفر ہے۔ ان سے سرکشی برتنا' ان کو Neglect (فراموش) کر دینا' ان سے اعراض برتنا کے لیے بھی لفظ ''کفروا'' ہے۔ وہ اس لیے ہے کہ کفر قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کا نام ہے۔ انسانی زندگی کے لیے قوانین تو اس وحی کی رو سے قرآن کے اندر آ گئے۔ یہ جو باہر فطرت کے قوانین ہیں' وہ کیا بدھو کمہار کے بنائے ہوئے ہیں؟ وہ تو قوانینِ خداوندی ہیں' ان کی اطاعت بھی اسی طرح سے ضروری ہے۔ وہ مومن کہتا ہی اس کو ہے جو

الدُّنۡیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الۡاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً (2:201) پر ایمان لاتا ہے۔ جو قوانینِ خداوندی ہیں' مظاہرِ فطرت ہیں' جو فطرت کی قوتیں ہیں' ان کے مطابق کام کرنا بھی خدا کے قوانین کی اطاعت ہے۔ ان سے اعراض برتنے کو قرآن نے کفر کہا ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ آج ہمارا نام کس زمرے میں آتا ہے

عزیزانِ من! ہم تو دوہرے کفر کی مار میں ہیں۔ وہ جو فطرت کے قوانین ہیں' ہم اُدھر سے بھی اعراض برتتے ہیں اور یہ جو اقدارِ خداوندی ہیں' ہم ان کی بھی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ جَزَیۡنٰہُمۡ بِمَا کَفَرُوۡا ؕ وَ ہَلۡ نُجٰزِیۡۤ اِلَّا الۡکَفُوۡرَ (34:17)۔ یہاں پھر ''کفور'' آیا ہے۔ کہا یہ ہے کہ اس قسم کا جو بدلہ ہے وہ کفر سے ہی ایسا ہوتا ہے۔ سو انہوں نے ہمارے قوانین سے یکسر انکار کیا' اس لیے اس کا انہیں یوں بدلہ ملا۔ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ انہیں بڑی فراوانی سے رزق حاصل تھا۔

ایسی دولت جو اقدارِ خداوندی کے تابع نہ رکھی جائے' اس کا نتیجہ ایسا تباہ کن ہوتا ہے کہ جیسے کوئی بے چراغ دیہہ ہو

قرآنِ کریم نے بھوک کو' رزق کی مار کو' خدا کا عذاب کہا ہے۔ ایسا نظر آتا ہے' کہ اگر رزق فراوانی سے حاصل ہو تو یہ تو ٹھیک ہے کہ یہ خدا کی نعمت ہوتی ہے لیکن اس نے شرط لگائی ہے کہ رزق کی فراوانی میں بھی جو اقدارِ خداوندی ہیں' ان کو نگاہ میں رکھنا ہے' اس سے ہی رزق محفوظ رہتا ہے ورنہ جہاں بھوک قوموں کو تباہ کرتی ہے' وہاں دولت کی فراوانیاں بھی اگر بلا حدود تم اپنے پاس رکھو اور اقدارِ خداوندی کی احتیاط نہ برتو تو وہ بھی تباہی کا باعث ہوتی ہیں (28:58)۔ پھر عرض کر دوں' سورۃ النحل (16:112) میں ہے کہ رزق کی فراوانیاں خدا کی نعمت ہے لیکن یہاں کہا ہے کہ وَ کَمۡ اَہۡلَکۡنَا مِنۡ قَرۡیَۃٍۭ بَطِرَتۡ مَعِیۡشَتَہَا (28:58) کتنی ہی قومیں ایسی تھیں' جو دولت کی فراوانیوں کے ہاتھوں تباہ ہوگئیں۔ بھوک سے بھی آدمی مرجاتا ہے اور جو بہت زیادہ کھا جاتا ہے' اُس سے بھی مرجاتا ہے۔ دولت کی فراوانیاں بُری طرح سے تباہ کرتی ہیں۔ کہا ہے کہ فَتِلۡکَ مَسٰکِنُہُمۡ (28:58) یہ ہیں ان کی اجڑی ہوئی بستیاں جو یوں پڑی ہیں۔ جاؤ' وہاں جا کر دیکھو' ان کے جو محلات ہیں' ان کے جو قلعے ہیں' وہ ان کی دولت کی فراوانیوں کی شہادت دیں گے اور ان کے کھنڈرات ان کی تباہی اور بربادی کا ثبوت بہم پہنچائیں گے' وہ اس طرح تباہ ہوئے کہ بس معدود چند کے علاوہ لَمۡ تُسۡکَنۡ مِّنۡۢ بَعۡدِہِمۡ اِلَّا قَلِیۡلًا (28:58) ۔ وہ اجڑا ہوا دیار ہوگیا۔ ان کے بعد آج تک وہ آباد ہی نہیں ہوئے۔ ہمارے ہاں مالیہ میں ایک اصطلاح ہوتی ہے ''بے چراغ دیہہ'' یعنی وہ گاؤں جس میں رات کو دیا نہ جلے۔ بس یہ یوں ہی بے چراغ ہوگئے۔

تباہ حال قوم کی معاشرتی زندگی

عزیزانِ من! یہاں قرآن نے یہ کہا ہے کہ اس کے بعد وہاں کوئی نہیں بسا اور وہ قوم اس طرح سے تباہ ہوئی کہ کسی دوسری قوم نے بھی آ کر ان پہ قبضہ نہیں کیا۔ کہا ہے کہ وَ کُنَّا نَحۡنُ الۡوٰرِثِیۡنَ (28:58) اس کا وارث اور مالک خدا ہی رہ گیا۔ دولت کی فراوانیوں کے ہاتھوں جو تباہی آتی ہے' قرآن نے کہا ہے کہ وہاں جا کر دیکھو' ان کے مساکن کو بھی دیکھو۔ بھلا بھوک سے مرنے والوں کے مساکن کہاں ہونگے؟ ان کی تو جھونپڑیاں ہی ہونگی۔

حضرت سلیمانؑ کے عہد میں قوم کی معاشرتی حالت: رزق کی فراوانی بھی اور خدا کی حفاظت بھی

کہا ہے کہ وَجَعَلۡنَا بَیۡنَهُمۡ وَبَیۡنَ الۡقُرَی الَّتِیۡ بٰرَکۡنَا فِیۡهَا قُرًی ظَاهِرَةً وَّقَدَّرۡنَا فِیۡهَا السَّیۡرَ (34:18) اس تباہی سے پہلے ان کی یہ کیفیت تھی کہ یہ جو ان کی پہلی معیشت تھی' وہ یمن سے لے کر فلسطین کے علاقوں تک راستوں میں بڑی بڑی بستیاں آباد تھیں' جو ان کی تجارت کی منڈیاں تھیں اور راستے میں کہیں پڑاؤ اور سرائیں بنی ہوئی تھیں۔ ان تک ان کی پیداوار پہنچتی تھی' وہاں سے ان کو بہت کچھ حاصل ہوتا تھا' ربِ غفور بھی موجود تھا۔ سِیۡرُوۡا فِیۡهَا لَیَالِیَ وَ اَیَّامًا اٰمِنِیۡنَ (34:18)۔ ان کے قافلے چلتے تھے اور وہ بڑے امن سے وہاں رہتے سہتے تھے اور نہایت حفاظت سے آتے جاتے تھے۔ آگے کہا ہے کہ پھر اُنہوں نے اسی پہ اکتفا نہیں کیا۔ فَقَالُوۡا رَبَّنَا بٰعِدۡ بَیۡنَ اَسۡفَارِنَا وَ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ فَجَعَلۡنٰهُمۡ اَحَادِیۡثَ وَ مَزَّقۡنٰهُمۡ کُلَّ مُمَزَّقٍ (34:19)۔ انہوں نے ایسی حرکتیں شروع کر دیں جن سے راستے کی بارونق منڈیاں رفتہ رفتہ اُجڑ گئیں' ملک کا امن و امان فتنوں کی نذر ہو گیا۔ اس قسم کے غلط اور مفسدانہ اقدامات سے انہوں نے اپنے آپ کو تباہ کر لیا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ ان کا شیرازہ بری طرح بکھر گیا۔ اس طرح سے وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے' جیسے گوشت بوٹی بوٹی ہو جاتا ہے' وہ صرف بکھرے ہوئے ذرے رہ گئے۔ کہا کہ جاؤ اور پڑھو ان کی داستانیں ان کے مساکن سے جو وہاں رہ گئی ہیں۔ ہم یونہی تاریخ کی کتابیں نہیں لکھ رہے۔ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوۡرٍ (34:19) ان داستانوں میں موت اور حیات کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں لیکن ہیں' صرف اس قوم کے لیے جو صبّار رہے' استقامت سے کام لے اور وہ ''شکور'' بھی ساتھ ہو کہ جو کچھ حاصل ہو' وہ اقدارِ خداوندی کے مطابق صرف کرے۔ یہ کچھ کرے تو یہ بَلۡدَةٌ طَیِّبَةٌ وَّ رَبٌّ غَفُوۡرٌ (34:15) کی دونوں چیزیں آ جائیں گی اور جو ایسا نہ کرے تو ان کے کفر کی وجہ سے ان کی تباہی ہو جائے گی اور یہ تباہی اسی وجہ سے آئی۔

ابلیس و آدم کی کشمکش کے تمثیلی قصہ کی نوعیت

اس تباہی کے بعد کہا ہے کہ وَ لَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ[1] (34:20)۔ یہاں قرآن بڑی لطیف بات کہہ گیا ہے۔ ابلیس و آدم کی کشمکش تو اس سے پہلے بڑی تفصیل سے آ چکی ہوئی ہے۔ دو فقروں میں دہرا ہی دوں کیونکہ یہ باتیں ضروری ہیں کہ ان کی تجدید ہوتی چلی جائے۔ یہ قرآن کا تمثیلی انداز ہے جو بیان کیا گیا ہے۔ قصۂ آدم کسی ایک فرد کی بات نہیں ہے، نہ شیطان اس طرح سے کوئی مجسم فرد ہے۔ یہ تمثیلی بات ہے۔ جسے ابلیس یا شیطان کہا گیا ہے، یہ انسان کے جذبات ہیں جو قوانینِ خداوندی کے خلاف سرکشی برتیں اور انسان صرف اپنے ہی مفاد کے پیچھے پڑا رہے، اپنے ہی خواہشات کے پیچھے پڑا رہے، یہ اس کا ابلیس ہوتا ہے۔ جو میں نے کہا ہے کہ اس کا ابلیس ہوتا ہے تو یہ بڑی معنی خیز بات ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ کی ایک درخشندہ حدیث ہے، حدیث تو چمک کر کہہ دیتی ہے کہ میں رسول ﷺ کا قول ہو سکتی ہوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ ہر فرد کا ایک ابلیس ہوتا ہے۔ صحابہؓ نے کہا کہ کیا آپ ﷺ کا بھی ابلیس ہے؟ کہنے ﷺ لگے کہ ہاں میرا بھی ابلیس ہے لیکن میں نے اسے مسلمان کر لیا ہوا ہے۔ جذبات انسان کے اندر، ہر فرد کے اندر، ہوتے ہیں۔ انہیں نکال دیجیے تو انسان ہی نہیں رہتا۔ ان کو کافر کر دیجیے، سرکشی اختیار کر لیں تو یہ ابلیس ہو جاتا ہے، یہ شیطان بن جاتا ہے۔ ان کو اقدارِ خداوندی کے تابع رکھیے تو مسلمان ہو جاتا ہے۔ ہر شخص کا ابلیس ہوتا ہے، میرا بھی ابلیس ہے لیکن میں نے اسے مسلمان کر لیا ہوا ہے۔

دنیائے تصوف کی ساری تگ و تاز جذبات کو مارنے میں مصروفِ کار ہے

عزیزانِ من! سارا اسلام اس میں آ جاتا ہے کہ اپنے جذبات کو اقدارِ خداوندی کے تابع رکھنا ہے۔ جذبات کو آپ مار نہیں سکتے، فنا نہیں کر سکتے، نفس کشی فریب ہے، یہ مر نہیں سکتے۔ اگر آپ اس کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کو ماریں تو یہ خدا کے خلاف چیلنج ہے، جنگ ہے کہ تُو جذبات کو پیدا کرتا ہے ہم مارتے ہیں (معاذ اللہ)۔ سارا تصوف اس پہ ہے کہ جذبات کو مار رہے ہیں۔ مر کیسے سکتے ہیں!!

پری رو تابِ مستوری ندارند
چوں در بندی ز روزن سر برآرند

---

[1] حقیقت یہ ہے کہ ابلیس نے عام انسانوں کے متعلق جو خیال ظاہر کیا تھا کہ وہ قوانین خداوندی کا اتباع نہیں کریں گے بلکہ اس کی بتائی ہوئی راہ پر چلا کریں گے (15:38-41) تو اس قسم کی قوموں نے اسے بتا دیا کہ وہ اپنے خیال میں سچا تھا (یعنی ان لوگوں نے اپنی روش سے ابلیس کے خیال کو سچ کر دکھایا)، کیونکہ ان میں سے، سوائے مومنین کے ایک گروہ کے، سب اس کے پیچھے چلے (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص 993)۔

حسن کا جلوہ دکھانے والے جو ہیں' وہ پردوں کے اندر نہیں رہتے' دروازہ بند کرو تو وہ روشن دان سے' کھڑکی میں سے' جھانک لیتے ہیں۔ ان جذبات کو' اگر آپ فطرت کے مطابق' Outlets نہ دیں تو یہ اس کے بعد غیر فطری طریقے اختیار کر لیتے ہیں کیونکہ انہوں نے تو باہر آنا ہوتا ہے۔ یہ جو نفس کشی کے داعی ہیں' مدعی ہیں' ہم سے پوچھیے کہ ان کے جذبات نے باہر آنے کے لیے کیا کیا طریقے اختیار کیے ہوتے ہیں۔ Perversion (بدنہادی) اس کو کہتے ہیں۔

کس قدر حسن بھی مجبورِ کشاکش کہ آں!

سر جھکائے نہ بنے آنکھ اٹھائے نہ بنے

اسمیں یہ ہوتا ہے۔

آدم کے اعتراف اور ابلیس کی سرکشی کا نتیجہ

عزیزانِ من! بات ہو رہی تھی ابلیس کی۔ آدم سے خدا نے کہا کہ یہ نہ کرنا مگر اُس نے معصیت کی اور وہ کیا۔ ابلیس سے کہا کہ اس کے سامنے جھکنا' اس نے سرکشی برتی' نہ جھکا۔ قرآن کہتا ہے کہ معصیت تو دونوں نے کی۔ آدم سے جب کہا کہ تو نے ایسا کیوں کیا تو اس نے کہا کہ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا (7:23) میں اپنے اس گناہ کا ذمہ دار ہوں' مجھ سے غلطی ہوگئی' میں اعتراف کرتا ہوں' اسے قبول کرتا ہوں کہ مجھ سے غلطی ہوگئی۔ کہا کہ تمہیں اس کا اعتراف ہوا ہے' اس کی ندامت ہوئی ہے' تم میں اصلاح کی صلاحیت ہے۔ ابلیس کو کہا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ اُس نے کہا کہ صاحب! میں کیسے کر سکتا ہوں' میں بندۂ بے جان ہوں' تیرے حکم کے بغیر تو پتہ بھی نہیں ہلتا ہے' تُو نے مجھ سے کرایا ہے۔ کہنے لگے کہ تو اپنی ذمہ داری قبول نہیں کرتا' تیری اصلاح ہی نہیں ہوسکتی' ساری عمر کے لیے جا' تُو مردود ہوگیا۔ عزیزانِ من! قصۂ ابلیس و آدم اتنا ہی ہے۔

ابلیس نے کہا تھا کہ بہت اچھا! اس کی وجہ سے ہمیں اتنا ذلیل کیا جا رہا ہے راندۂ درگاہ بنایا جا رہا ہوں۔ اسے بھیج دے دنیا میں' اور ہمیں بھی بھیج دے' دونوں کو ایک رِنگ (Ring) میں رہنے دے' اس رِنگ کے اندر پھر دیکھ میں اس کے ساتھ کیا کرتا ہوں۔ کہنے لگے: ٹھیک ہے منظور ہے۔ کہنے لگا: ایک شرط کے ساتھ کہ تُو ہے قادرِ مطلق' ایسا نہ ہو کہ اس کو میں جب نیچے دوں' اس کی چھاتی پہ چڑھوں اور تُو میرا ٹینٹوا دبا دے۔ کہا کہ ہم تم دونوں کو یکساں موقع دیں گے' ہم Interfere (مداخلت) نہیں کریں گے۔ کہا کہ Interfere (مداخلت) نہ کرنا' پھر دیکھنا کہ میں اس کو کیسے تگنی کا ناچ نچاتا ہوں۔ ابلیس نے خدا سے یہ کہا تھا کہ پھر دیکھنا میں کیا کرتا ہوں۔ یہاں کہا ہے کہ وَ لَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ (34:20) یہ جو ابلیس نے وہاں کہا تھا' انہوں نے سوائے مؤمنین کے ایک گروہ کے اور سچ کر دکھایا کیونکہ فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (34:20) وہ سب اس کے پیچھے چلے اور اس

طرح سب ہی جذبات کے پیچھے چل پڑے' نتیجہ اس کا یہ ہے۔

قدرت کی طرف سے انسان کو اختیار وارادہ کی نعمت نے اُسے پتھر بننے سے بچالیا

قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ وَ مَا کَانَ لَهٗ عَلَیۡهِمۡ مِّنۡ سُلۡطٰنٍ اِلَّا لِنَعۡلَمَ مَنۡ یُّؤۡمِنُ بِالۡاٰخِرَةِ مِمَّنۡ هُوَ مِنۡهَا فِیۡ شَكٍّ ؕ وَ رَبُّکَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ حَفِیۡظٌ (34:21) حقیقت یہ ہے کہ ابلیس کو ایسی قوت حاصل نہ تھی کہ وہ انسان پر غالب آ جاتا۔ جب وہ کائنات کی کسی شے پر غالب نہیں آ سکتا تو انسان پر' جو اشیائے کائنات کو مسخر کر سکتا ہے' کس طرح غالب آ سکتا تھا؟ لیکن یہ ہمارے اس پروگرام کا نتیجہ ہے' جس کی رو سے ہم نے' انسان کو اشیائے کائنات کی طرح مجبور پیدا نہیں کیا بلکہ صاحبِ اختیار او ارادہ پیدا کیا ہے کہ وہ جی چاہے تو وحی خداوندی کا اتباع کرے اور جی چاہے تو اس کو چھوڑ کر اپنے جذبات کے پیچھے لگ جائے۔ جب وہ اپنے جذبات سے مغلوب ہو جاتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ ''ابلیس اس پر غالب آ گیا۔'' اور انسان کو صاحبِ ارادہ پیدا کرنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ اپنی مرضی سے حیاتِ آخرت پر ایمان لا کر' ان لوگوں سے متمیز اور ممتاز زندگی بسر کرے' جو اس بارے میں شک میں رہتے ہیں۔ اب یہاں کہا جائے گا اور اعتراض کیا جاتا ہے کہ صاحب! یہ کیا بڑی زیادتی ہے! ٹھیک ہے' آدم آیا تھا' یہ شر کی قوتیں اور یہ ابلیس اس کے ساتھ بھیج دیں' قدم قدم کے اوپر اس کے راستے میں یہ موانعات کھڑی کر دیں۔ جواباً کہا ہے کہ کیا چاہتے ہو کہ تمہیں پتھر کے بنا دیا جائے کہ تمہارے اختیار و ارادے میں کوئی بات ہی نہ رہے' پھر تو بڑے نیک رہو گے' ایسی نیکی تمہیں خوش آئے گی۔ سنو! نیکی وہ ہے جو برائی کی قدرت رکھتے ہوئے کی جائے' دیانتداری وہ دیانتداری ہے جو فریب کاری اور چوری کی طاقت رکھتے ہوئے پھر کی جائے۔ یہاں یہ بتایا ہے کہ یہ کچھ تو ہم نے اس لیے کیا ہوا ہے کہ اس قسم کی جو کششیں اور Temptations (حرص و ہوس) ہیں' اس کے باوجود ہم کس قدر اقدار اور صداقت کے اوپر قائم رہتے ہیں! اس طرح سے یہ ہے جو کچھ ابلیس کرتا ہے تا کہ لوگ اس بارے میں شک میں رہیں تو کہا ہے کہ سنو! تم نے ابلیس کا وہ دعویٰ سچا کر دکھایا اور تمہاری یہ حالت ہو گئی حالانکہ زندگی کی سرفرازیوں اور خوشگواریوں کا راز' خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان میں پوشیدہ ہے اور اس قانون پر ایمان لایا نہیں جا سکتا جب تک حیاتِ آخروی پر ایمان نہ ہو۔ کہا گیا ہے کہ تیرا نشوونما دینے والا ہر شے پر نگاہ رکھتا ہے تا کہ ہر ایک کا عمل' اس کے قانون کے مطابق' نتیجہ مرتب کرے۔

عزیزانِ من! سورۃ سبا کی آیت 21 تک ہم آ گئے۔ 22 ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ

❀......❀......❀

چوتھا باب: سورة سبا (آیات 22 تا 30)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من ! آج مارچ 1980ء کی 14 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ سبا کی آیت 22 سے ہو رہا ہے:

(34:22)۔

قرآنِ حکیم کی تعلیم کا مرکزی نکتہ توحید کے برعکس شرک کو واضح کرنا بھی ہے

(بات یہ چلی آ رہی تھی کہ زندگی کی سرفرازیوں اور خوشگواریوں کا راز' خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان میں پوشیدہ ہے اور اس قانون پر ایمان لایا نہیں جا سکتا جب تک حیات اُخروی پر ایمان نہ ہو۔ اس کے خلاف یہ لوگ جو کہتے ہیں کہ نہیں! یہاں اور ہستیاں بھی ہیں جنہیں اقتدار اور اختیار حاصل ہے تو) قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ **قُلِ ادۡعُوا الَّذِیۡنَ زَعَمۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ لَا یَمۡلِکُوۡنَ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِی الۡاَرۡضِ وَمَا لَہُمۡ فِیۡہِمَا مِنۡ شِرۡکٍ وَّ مَا لَہٗ مِنۡہُمۡ مِّنۡ ظَہِیۡرٍ** (34:22)۔ (اے رسول!) ان سے کہہ دو کہ ذرا ان ہستیوں کو بلاؤ تو سہی؟ تم دیکھو گے کہ وہ پوری کائنات میں ایک ذرّے

کے برابر بھی قوت اور اقتدار نہیں رکھتیں۔ نہ ہی وہ خدا کے اختیار و اقتدار میں کسی طرح شریک ہیں اور نہ ہی یہ صورت ہے کہ خدا کو کسی مددگار کی ضرورت ہے' اور یہ ہستیاں اس کی مددگار ہیں۔ اس طرح سے کہا یہ گیا ہے کہ سماوات اور ارض میں خدا کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اگرچہ میں گزشتہ تیس سال سے درس کے دوران جو کچھ پیش کر رہا ہوں' اس کا محوری نکتہ تو شرک اور توحید ہی ہے' دین ہے ہی اس کا نام' اسلام اسی کا نام ہے' قرآن یہی تعلیم دیتا ہے' اس کا یہی مرکزی نکتہ ہے۔ شرک کے مقابلے میں توحید ہے۔ میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ جس دین کو اس قدر اہمیت حاصل ہے' وہ جب مذہب میں بدلا ہے تو اس کی حیثیت کیا رہ گئی ہے۔ سرِ دست تو یہ دیکھیے کہ ساری تعلیم کا محوری نکتہ ہی توحید ہے۔ اس کی اہمیت کے متعلق میں نے عرض کیا ہے کہ یہ تو سارا قرآن اسی نکتے کی تفسیر ہے' توحید خدا کی وحدانیت ہے اور شرک کے خلاف ہے۔ جب یہ صورت ہے تو اسے تو پھر اچھی طرح سے سمجھ لینا چاہیئے' اس کے بغیر نہ اسلام سمجھ میں آسکے گا' نہ قرآن سمجھ میں آسکے گا' نہ دین معلوم ہو سکے گا' نہ انسانی زندگی کی غرض و غایت کے متعلق کچھ پتہ چل سکے گا۔ وہ بات ہی ساری یہ ہے کہ توحید کیا ہے اور اس کے خلاف قرآن نے جو شرک کہا ہے' وہ کیا ہے۔ شرک سے اجتناب ہے' جو توحید ہے وہ مومن کے لیے عمل کی چیز ہے۔ تو یہ ہے کیا چیز؟ اس کی اہمیت کے لیے تو اس سے زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں لیکن دو ایک مقامات ایسے ہیں جہاں سے اس کی تائید ہوگی' جو میں نے ابھی کہا ہے کہ قرآنِ کریم کا بنیادی نکتہ ہی یہی ہے۔

لفظ شرک کا مفہوم اور توحید کی اہمیت

کہا ہے کہ **اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا** (4:116)۔ اس کا عام ترجمہ تو یہ کیا جاتا ہے کہ شرک نہیں بخشا جا سکتا' اس کے سوا اور سب کچھ بخشا جا سکتا ہے۔ قرآن کی اصطلاح کا مفہوم لینا چاہیں تو یوں لیجیے کہ شرک سے کہیں حفاظت نہیں مل سکتی اور جو دیگر چیزیں ہیں' ان میں کوئی نہ کوئی سامان اس قسم کا نکل سکتا ہے لیکن شرک سے تو پھر زندگی میں کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔ یعنی اگر پہلے معنی لیجیے تو وہیں نظر آجاتا ہے کہ شرک نہیں بخشا جا سکتا اور سب کچھ بخشا جا سکتا ہے۔ آپ اندازہ لگا لیجیے کہ یہ کتنی بڑی چیز ہوئی۔ دوسرے مقام پہ شرک کے متعلق کہا ہے کہ **اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ** (31:13) شرک ظلمِ عظیم ہے۔ ظلم ہی نہیں' ظلمِ عظیم ہے۔ اور ظلم کے معنی تو آپ کو یاد ہونگے' یاد رکھا کریں' یہ چیزیں کہیں نوٹ کر لیا کیجیے' بعد میں کام آئیں گی۔ ظلم کے معنی ہیں کہ جس شے کو جہاں ہونا چاہیے وہ وہاں نہ ہو۔ جہاں خدا ہونا چاہیے وہاں خدا نہ ہو' انسان ہو' جہاں صرف انسان ہونا چاہیے وہاں انسان نہ ہو انسان کے ساتھ کچھ اور ہو۔ یہ ظلم ہے اور ظلمِ عظیم ہے۔ اس سے بڑا ظلم کوئی اور ہے ہی نہیں۔ اس سے یہ چیز تو ذہن میں آگئی ہوگی کہ دین میں توحید کو کتنی اہمیت حاصل ہے اور اس کے

خلاف شرک کی کتنی مخالفت ہے! سب کچھ بخشا جاسکتا ہے' یہ نہیں بخشا جاسکتا۔ یہ ظلم ہے' ظلم ہی نہیں ظلمِ عظیم ہے۔ یہ ہے کیا؟ پھر ظلم کو لے لیجیے کہ شرک سے نہ انسان انسانیت کے مقام پہ رہتا ہے' نہ خدا خدائی کے مقام پہ رہتا ہے۔ یہ ظلمِ عظیم ہے۔ اس کے معنی ہوئے کہ دین یا اسلام کا مقصود یہ ہے کہ خدا کو خدا کے مقام پہ رکھا جائے' انسان کو انسانیت کا مقام دیا جائے' اُس سے گرا تو توحید نہ رہی' خدا اپنے مقام پہ نہ رہا تو شرک ہوگیا۔

انسانیت کی دنیا میں سب سے بڑا شرک ''انسان کا انسان پر حکمرانی کرنا ہے''

اب آگے چلیے۔ اس سے نہ انسان اپنے مقامِ انسانیت پہ رہا' نہ خدا مقامِ الوہیت پہ رہا۔ اُس نے کہا ہے کہ جونہی کسی انسان نے کسی انسان کی حکمرانی قبول کرلی تو شرک ہوگیا کیونکہ انسانوں میں تو مساوات ہے' سب برابر ہیں۔ اپنے ہی جیسے کسی انسان کو اپنے اوپر حاکم تصور کرلیا تو جس نے ایسا تصور کیا ہے یہ مقامِ انسانیت سے گرگیا اور جسے حکمران بنایا ہے وہ خدائی کے درجے پہ پہنچ گیا۔ آپ نے خیال فرمایا کہ یہ شرک کیسے ہوا' یہ ظلمِ عظیم کس طرح سے ہوگیا؟ دونوں ہی اپنے مقام پہ نہیں رہتے۔ بات ساری محکومیت کی اور حکمرانی کی ہے۔ حکومت کس کی ہو؟ قانون کس کا چلے؟ اور انسانوں کی طرف سے کس کی حکومت تسلیم کی جائے گی؟ اطاعت کس کے قانون کی کی جائے گی؟ محکومیت کس کی اختیار کی جائے گی؟ یہ ہے وہ سارا مسئلہ۔ سارا قرآن اسی ایک نکتے کی تشریح ہے۔ وہ مومن کے متعلق بتاتا یہ ہے۔ پہلے تو وہ اس میں نفی کرتا ہے' انسانوں میں بلند ترین ہستی ہے اس کا مقام متعین کرتا ہے یعنی رسول کا نبی اکرم ﷺ کا۔ عقیدوں کے مطابق مذہب کی دنیا میں عام انسانوں سے بالاتر نبی یا رسول کا مقام تصور کیا جاسکتا تھا۔ شرک اور توحید کے ریفرنس میں اس حوالے سے کہا ہے کہ قُلۡ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ (18:110) ان سے کہہ دیجیے کہ میں اس کے سوا کچھ اور ہوں ہی نہیں کہ تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں۔

انسانوں میں سب سے بلند ہستی' نبی اکرمؐ کے مقام کا تعین

قرآنِ کریم نے رسول کا مقام' نبی کا مقام' انسان ہونے کی جہت سے جو صحیح مقام ہے' وہ متعین کردیا ہے۔ مساواتِ انسانیہ وہاں بھی باقی ہے۔ کہا ہے کہ بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ (18:110) تمہارے ہی جیسا ایک انسان اس فرق کے ساتھ ہوں کہ يُوۡحٰۤى اِلَىَّ (18:110) میری طرف یہ وحی ہوتی ہے اور وحی یہ ہوتی ہے کہ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمۡ اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ (18:110) تمہارا حکمران' تمہارا صاحبِ اقتدار و اختیار' صرف ایک ہے' واحد ہے۔ میں بھی حکمران نہیں' میں بھی صاحبِ اقتدار نہیں' میری بھی حکومت نہیں۔ میں تو بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ (18:110) تمہارے ہی جیسا انسان ہوں' میں بھی اسی کے حکم کا مطیع اور فرمانبردار ہوں' تم بھی اسی کے حکم کے مطیع

اور فرمانبردار ہو۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس کا جو حکم ہے' وہ ہر انسان تک براہِ راست نہیں پہنچتا۔ اس کا طریقہ اس نے یہ اختیار کیا ہے کہ وہ ایک انسان کے Through (توسط سے)' اس کے راستے سے' اپنا حکم دوسرے انسانوں تک پہنچاتا ہے۔ میرا فریضہ تو صرف اتنا ہے کہ میں وہ پیغام تم تک پہنچاؤں۔ اس کے بعد میں تمہارے جیسا انسان ہوں۔ تم بھی اسی کی محکومیت اختیار کرو گے' میں بھی اسی کی محکومیت اختیار کرونگا۔ وہ الہ واحد ہے۔ اب دیکھیے توحید اسی کا نام ہو گیا جسے Monotheism کہتے ہیں۔ یعنی الہ واحد (18:110) ایک صاحبِ اقتدار۔ کہا کہ فَمَنۡ كَانَ يَرۡجُوۡا لِقَآءَ رَبِّهٖ (18:110) جو چاہتا ہے کہ اس قسم کے خدا کے ساتھ میری ملاقات ہو جائے فَلۡيَعۡمَلۡ عَمَلًا صَالِحًا (18:110) اُسے چاہیے کہ وہ اس قسم کے کام کرے جن سے اس کی صلاحیتیں بیدار ہوں۔

خدا کا شریک' خدا کی عبادت' خدا کی محکومت اور خدا کے اقتدار کا قرآنی مفہوم اور مروّجہ تراجم

کہا ہے کہ وَّ لَا يُشۡرِكۡ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا(18:110) اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔ میں یہ آخر میں جا کر بتاؤنگا۔ میں کچھ وقت یہ سوچتا رہا کہ یہ بات ابتدا ہی میں کر دوں کہ ان کے ذرا سے مفہوم کو بدلنے سے بات کہاں جا پہنچی یا پہلے میں اس کی اہمیت بتاؤں کہ یہ قرآن میں شرک اور توحید ہے کیا۔ میں پہلے اس کی اہمیت بتا رہا ہوں اور یہ الفاظ ذہن میں رکھیے گا کہ الہ واحد ہے' وہی ہے صاحبِ اقتدار' وہی ہے صاحبِ حکومت' حکم اسی کا ہے۔ اور کہا ہے کہ جو خدا کا سامنا کرنا چاہتا ہے اُس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کی اس عبادت میں کسی اور کو شریک نہ کرے۔ اب یہاں عبادت کی بات آئی۔ اسی سورۃ میں یہاں تھا کہ اُسے چاہیے کہ وہ خدا کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے اور اسی میں پہلے ہے کہ مَا لَهُمۡ مِّنۡ دُوۡنِهٖ مِنۡ وَّلِىٍّ وَّ لَا يُشۡرِكُ فِىۡ حُكۡمِهٖۤ اَحَدًا (18:26) یاد رکھو! خدا اپنی حکومت میں کسی دوسرے کو شریک نہیں کرتا۔ اُسی سورۃ میں چند ہی آیات کے تفاوت سے ایک جگہ یہ ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی عبودیت اختیار نہ کرنا اور دوسری جگہ ہے کہ خدا اپنے حقِ حکمرانی میں' اپنی حکومت میں' کسی اور کو شریک نہیں کرتا۔ تو توحید ہوگئی صرف خدا کی حکومت کا ماننا۔ اس میں کسی اور کو شامل کر لینا' کسی انسان کو صاحبِ اقتدار مان لینا' یہ ہو گیا شرک۔ ایک ہی آیت کے اندر یہ دونوں باتیں آ گئیں۔ کہا کہ اِنِ الۡحُكۡمُ اِلَّا لِلّٰهِ (12:40) حقِ حکومت تو صرف خدا کو حاصل ہے۔ اَمَرَ (12:40) اُس نے حکم دیا ہے۔ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ(12:40) ۔ یہ وہی تَعۡبُدُوۡا ہے جہاں سے عبادت کا لفظ آ گیا۔ یہاں دیکھیے حکم اور عبادت دونوں باتیں' ایک ہی آیت میں دونوں الفاظ آ رہے ہیں۔ حکم خدا کا ہے۔ اُس نے کہا یہ ہے کہ اُس کے سوا کسی اور کی عبادت نہ اختیار کرو۔ عبادت کے معنی محکومیت اختیار کرنا ہیں۔ جب کہا جائے کہ حکم اور حکمرانی صرف خدا کی ہے'

اس کے سوا کسی اور کی یہ بات نہ کرنا' تو یہی معنی ہیں کہ اس کے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہیں کرنا۔ اور کہا کہ ذٰلِکَ الدِّیۡنُ الۡقَیِّمُ (12:40) دینِ محکم یہی ہے اور دین قیم بھی خود قائم ہوا اور تمہیں اپنے مقامِ انسانیت پر قائم رکھنے والا ہوا۔ حقِ حکومت کسی اور کو حاصل نہیں ہے۔

حکمراں ہے اک وہی' باقی بتانِ آزری

خدا اپنی حکم رانی کو کس طرح قائم کرتا ہے؟

پھر بات ہوگئی کہ شرک ظلمِ عظیم ہے' شرک کی بخشش نہیں ہوسکتی۔ توحید کے معنی ہیں صرف خدا کی حکمرانی' شرک کے معنی ہیں اس میں کسی اور کو بھی شریک کر لینا۔ وہ تو جہالت کا زمانہ تھا جب اُنہوں نے کہا کہ صاحب! یہ جو دیوی دیوتا ہیں' یہ بھی حکمران ہیں۔ اس جہالت میں سے انسان اس دور میں نکلا جب ہم آتے ہیں۔ اب اس میں ہم دیکھیں گے کہ اس کے معنی کیا ہیں؟ آج کے دور میں شرک کیا ہے؟ خدا کی حکمرانی کے لیے کہا ہے مگر خدا تو ہمارے سامنے نہیں آتا' وہ تو ہمیں براہِ راست کوئی حکم نہیں دیتا' اس کی حکمرانی کس طرح سے قائم ہوگی؟ اُس نے خود کہا کہ وَ مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ (5:44) جو بھی خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے انہیں کافر کہا جاتا ہے۔ یعنی سرے سے ہی خدا کی کتاب کو نہیں بلکہ کسی اور ضابطۂ قوانین کو رائج کرنا' یہ کفر ہے اور خدا کی کتاب میں کچھ انسانوں کو بھی ساتھ ملا دینا' یہ شرک ہوا۔ وہ انکار ہے' وہ انکار والا اپنے تجربے کو ناکام دیکھنے کے بعد کسی وقت اس طرف آجائے گا لیکن یہ جو غلط فہمی پیدا کی جائے گی کہ کچھ خدا کا بھی ہو اور اس کے ساتھ کچھ انسانوں کا بھی ہو' اس سے نکلنا بڑا مشکل ہے۔ وہ جو انکار ہے' اسے کفر کہہ لیجیے' الحاد کہہ لیجیے' Atheism کہہ لیجیے۔ یہ ہے جو مذہب ہے۔

مذہبی پیشوائیت کی طرف سے خود ساختہ مذہب کی ملاوٹ سب سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے

پہلے زمانے میں تو ملوکیت تھی' بادشاہیت تھی' شہنشاہیت تھی' ایک فرد کا حکم تھا۔ وہ قانون کا زمانہ نہیں تھا۔ اس دور کے بعد جو اگلا دور آیا تو وہ قانون کی اطاعت یا قانون کی حکومت کا دور آیا۔ مذہب نے اس میں شرک کس طرح سے کیا؟ خدا نے جو احکام یا جو قوانین دیئے تھے' ان کو تو مذہب میں رکھا مگر محض ثواب حاصل کرنے کے لیے' ان کی تقدیس حاصل کی۔ اور مذہب کے نام پر جو خدا بنے تھے' جنہیں مذہبی پیشوائیت کہا جاتا ہے' اُنہوں نے قانون خود نافذ کیے اور انہیں خدا کے قانون کہہ کر لوگوں سے منوانا شروع کیا۔ یہ جو سب سے بڑی خدائی ہے' وہ یہ ہے۔ براہِ راست انسان خود قانون بناتے ہیں' جیسے پارلیمنٹ قانون بناتی ہے' انسان دوسرے انسانوں کے لیے قانون بناتے ہیں' اگر خدا بالکل درمیان میں نہیں آتا تو کفر ہے اور اگر اس کے ساتھ درمیان میں انسانوں کو رکھ لیں

تو یہ شرک ہے لیکن سب سے زیادہ خطرناک گھاٹی جو ہے وہ ہے جہاں مذہب کے نام سے یہ مذہبی پیشوائیت' انسان' ان قوانین کو خود وضع کرے اور انہیں خدا کے قانون کہہ کر ان کی اطاعت کرائے۔ کہا کہ اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا (42:21) کیا انہوں نے خدا کے شریک بنا رکھے ہیں؟ کون ہیں یہ؟ کہا کہ شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ (42:21) یہ شریعت کے قانون بنانے والے ہیں اور ایسی راہیں (شریعتیں) وضع کرتے رہتے ہیں' جن کی قوانینِ خداوندی کی رو سے کبھی اجازت نہیں ہوتی۔

خدا تعالیٰ نے نوعِ انسانی کے لیے آئین کی تشکیل کے حقوق کسی انسان کو عطا نہیں کیے

عزیزانِ من! دیکھ رہے ہیں کہ قرآن کیا کہہ رہا ہے۔ خدا نے تو ان کو کبھی اس کی اجازت نہیں دی تھی' اُس نے تو حقِ حکومت صرف اپنے پاس رکھا تھا مگر یہ شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ (42:21) دین کے نام سے شریعت کے احکام وضع کرنے والے ہیں۔ دین میں تو احکام کسی اور کو وضع کرنے کا اختیار ہی نہیں ہے۔ ان قوانین کو نافذ کرنے کے' چلانے کے' جو طریقے ہیں' یہ تو وضع کیے جا سکتے ہیں لیکن قوانین نہیں وضع کیے جا سکتے۔ یہ قوانینِ شریعت بنانے والے کرتے کیا ہیں؟ کہا کہ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ (2:79) تباہی آتی ہے اس معاشرے میں' جہاں مذہبی پیشواؤں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ خود اپنے ہاتھ سے یہ قوانین لکھتے ہیں' بناتے ہیں' وضع کرتے ہیں اور ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (2:79) اور پھر انہیں دینِ خداوندی کہہ کر جاری کرتے ہیں۔ کہتے یہ ہیں کہ یہ خدا کے قوانین ہیں۔ خود وضع کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ خدا کے ہیں۔ مقصد اس سے کیا ہے؟ اس کے لیے کہا کہ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا (2:79) چار پیسے کمانا ان کا مقصد ہوتا ہے۔ اتنا بڑا جرمِ عظیم ہے جسے قرآن ظلمِ عظیم کہہ رہا ہے۔ خود قانون بناتے ہیں اور کہتے یہ ہیں کہ یہ خدا کے قانون ہیں۔

مذہبی پیشوائیت کے مقابلے میں سیکولر حکومت کا کردار

عزیزانِ من! اس مقام پہ تو وہ جو سیکولر جمہوریت ہے' وہ بھی نہیں پہنچتی' وہ بھی یہ دھوکا نہیں دیتے کہ یہ خدا کے قانون ہیں۔ وہ دھڑلے سے اس کو سیکولر کہتے ہیں کہ انسانوں کے بنائے ہوئے قانون ہیں۔ آپ اُسے کفر کہہ سکتے ہیں' آپ اُسے شرک نہیں کہہ سکتے۔ وہ جو کفر ہے وہ قابلِ تغیر ہوتا ہے' دوسرے ہی سیشن میں' دوسرے ہی الیکشن کے اندر' دوسری پارٹی آجاتی ہے' وہ ان کے لیے احکام اور قوانین وضع کرتی ہے لیکن یہ جو مذہبی پیشوائیت سے' شریعت کے نام پہ' احکام جاری ہوتے ہیں' وہ تو ہمیشہ کے لیے غیر متبدل رہتے ہیں۔ یہ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کو خدائی درجہ دینا' خدا کے قوانین کے ہم پایہ ان کو تصور کر لینا' یہ ہے اصلِ شرک۔ خدا نے کہا تھا کہ یہ جو میری کتاب ہے' اس کی حکمرانی' میری حکمرانی ہے۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ بتائی تھی کہ تَمَّتْ

كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (6:115) اس کے اندر ضابطۂ قوانینِ خداوندی مکمل ہوگیا' اضافہ نہیں ہوسکتا' اس میں تغیر و تبدل نہیں ہوسکتا' تو گویا خدا کے ضابطۂ قوانین کی یہ دو خصوصیات ہیں کہ مکمل ہے اور غیر متبدل ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ مکمل نہیں' ناتمام ہیں' اس کے ساتھ اور بھی انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین آئیں گے' تو اس سے بڑا شرک اور کیا ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اس میں تغیر و تبدل بھی ہوسکتا ہے' انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین ان کو بدل سکتے ہیں' تو اس سے بڑا شرک اور کیا ہوگا۔ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کو یہ کہنا کہ خدا کے ضابطے کا Supplement (تکملہ) کرتے ہیں' وہ (معاذ اللہ) ناتمام رہ گیا ہے' اس میں کمی رہ گئی ہے' یہ اس کمی کو پورا کرتے ہیں یا یہ کہ یہ اس کو تبدیل کر سکتے ہیں۔ عزیزانِ من! اس سے بڑا شرک اور کیا ہے۔

مذہبی پیشوائیت کی طرف سے بنائے ہوئے قانون کو نہ ماننے والا شخص ان کے نزدیک مرتد قرار پاتا ہے

سیکولرازم کے ضابطہ قانون کو یا ان کے طریق کار کو چھوڑ دیجیے' میں نے کہا ہے کہ وہ تو کفرِ صریح ہے اور وہ اس میں جھجک محسوس نہیں کرتے' وہ کہتے ہیں کہ یہی طریق کار ہے جو صحیح چلتا ہے۔ انسان اپنے عقل و فکر سے اپنے قوانین بنائے تو خدا کو درمیان میں کیوں لایا جائے۔ وہ یہ چیز کھلے بندوں کہتے ہیں' اس میں دھوکا نہیں ہے لیکن دھوکا تو وہاں ہے کہ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (2:79) خود قانون بناتے ہیں اور ان کو خدا کے قانون کہہ کر نافذ کرتے ہیں۔ شرک تو یہ ہے۔ وہاں اگر کسی پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے قانون کو کوئی چاہے تو چیلنج کرسکتا ہے۔ آپ کے ہاں کے قانونِ شریعت کو کوئی چیلنج کرے تو مرتد قرار پاتا ہے' اس کی سزا موت ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ وَ مَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَ هُمْ مُّشْرِكُوْنَ (12:106) عجیب بات تم دیکھو گے کہ ایمان کا دعویٰ کرنے والوں میں اکثریت ان کی پاؤ گے کہ دعویٰ تو ایمان کا کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود مشرک کے مشرک ہی رہتے ہیں۔ یہ کفار کے متعلق تو نہیں کہا' کافر تو مشرک نہیں ہوتا۔ کہا یہ ہے کہ ایمان کا دعویٰ کرنے کے بعد مشرک کے مشرک ہی رہتے ہیں۔

توحید صرف خدا کے قوانین کو تسلیم کرنے کا نام ہے

عزیزانِ من! بات یوں ہوئی کہ خدا کی کتاب کے مطابق چلنا' اس کے احکام کے ماتحت چلنا' اس کی حکمرانی کو تسلیم کرنا' صرف اسی کا ہو کر رہنا' صرف اس لیے کہا ہے کہ یہ توحید ہے' اگر کسی اور کو ساتھ ملایا تو شرک ہوا۔ صرف خدا کی کتاب کی حکمرانی' یہ ہے توحید۔ اس کے ساتھ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین ملا کر ان کی حکمرانی تسلیم کرنا' یہ ہے شرک خواہ ان انسانوں کا نام کچھ ہی کیوں

نہ رکھ لیا جائے۔ حضورِ نبی اکرم ﷺ سے زیادہ بلند ترین مرتبہ انسانیت کی دنیا میں کسے حاصل ہوسکتا ہے۔ ان کی زبانِ مبارک سے بار بار یہ کہلوایا جارہا ہے کہ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ (18:110) میں اس کے سوا کچھ نہیں ہوں کہ تمہارے ہی جیسا انسان ہوں۔ حضور ﷺ سے نیچے کتنے ہی بڑے ہیں' کیوں نہ آپ کوئی محدث' کوئی مفکر' کوئی فقیہہ' کوئی بھی لے لیجیے۔ یعنی دنیاوی بادشاہ وغیرہ تو چھوڑ دیجیے ان کے متعلق تو کہا گیا ہے کہ یہ ملوکیت ہے' ان کو حق نہیں ہے۔ تو یہ جو انسان ہیں' انہیں کیا حق حاصل ہے کہ خود قوانین بنائیں اور ان قوانین کو وہ درجہ دیں جو خدا کی کتاب کے قانون کو درجہ حاصل ہے یعنی غیر متبدل ہوں۔ یہ انسانوں کی محکومیت نہیں تو اور کیا ہے۔

خارجی کائنات کی طرح انسانی دنیا میں بھی کسی انسان کو قانون بنانے کا حق حاصل نہیں

قرآنِ کریم نے سماوات اور ارض میں کہا تھا کہ شرک کر کے دیکھو' پھر دیکھو انسانیت کی کیا حالت ہوتی ہے۔ خارج کی جو دنیا ہے' باہر کی یہ جو Outer Universe (خارجی کائنات) ہے' یہ یورپ کے سائنسدانوں کی تحقیق کی جولا نگاہ' یہی خارجی کائنات ہے۔ وہ خدا کو زبان سے نہ ماننے کے باوجود اپنے اس میدان کے اندر پکے مؤحد ہیں' وہ توحید کے قائل ہیں' ان کی بنیاد ہے: Law of Uniformity of Nature (فطرت کا قانون وحدانیت) اس کے معنی' ایک ہوتا ہے' توحید ہوتا ہے۔ کائنات کا نام ہی Universe[1] (کائنات) ہے۔ وہ تو چلتے ہی Uni سے ہیں یعنی ایک قانون۔ میں نے عرض کیا ہے کہ خدا کا نام وہ نہ بھی لیں' Law of Nature (قانونِ فطرت) ہی کہیں لیکن وحدانیت کے قائل ہیں۔ ساری سائنس جو ہے وہ وحدانیت یا توحید پر چلتی ہے یعنی ایک کا قانون یا ایک قانون۔ ایک خاص سطح کے اوپر پانی خاص ٹمپریچر کے اوپر جا کر اُبلنا (Boil) شروع ہوتا ہے۔ اس خاص سطح کے اوپر جہاں وہ Law (قانون) ہے کہ یہ 100 ڈگری سنٹی گریڈ کے اوپر Boil (اُبلنا) شروع کرے گا' اس سطح پر' دنیا کے کسی خطے میں' کسی مقام کے اوپر' وہ پانی رکھ دیجیے تو ڈگری کے ہزارویں حصے کا بھی فرق نہیں پڑتا۔ یہاں سے لے کر چاند تک کی تو انہوں نے جولا نگاہ دیکھ لی ہے کہ کس طرح سے Uniformity of Law (قانون کی یکسانیت) چل رہی ہے۔

---

[1] Uni+Verse یعنی نظمِ وحدت' اس لیے کہ کائنات میں قانونِ وحدانیت کارفرما ہے

آسمانوں پر خدا کی حکومت اور زمین پر انسانوں کے بنائے ہوئے قانون کی پیروی: اسی کا نام شرکِ عظیم ہے

انکی نگاہیں بہت دور گئی تھیں جنہوں نے اس کو Universe (کائنات) کہا تھا۔ توحید ہے ایک قانون: اِلٰهٌ وَّاحِد[۔ فرق یہ ہے کہ وہ اسے الہ السمآء تو مانتے ہیں' خارجی کائنات میں تو اس چیز کو مانتے ہیں کہ انسان Universe (کائنات) کے اندر کوئی قانون بنا ہی نہیں سکتا۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان ان قوانین کو Discover (بے نقاب) کر سکتا ہے' ان کے اوپر پردے پڑے ہوئے ہیں' ان پردوں کو انسان اٹھا سکتا ہے لیکن کسی قانون کو Invent (ایجاد) نہیں کر سکتا۔ یعنی ایجاد نہیں کر سکتا' نیا قانون نہیں بنا سکتا۔ ساری دنیا کے انسان مل کر بھی نہیں بنا سکتے۔ اور یہ قانون غیر متبدل ہیں۔ تَمَّتْ (6:115) ہیں' مکمل ہیں لَا مُبَدِّلَ ہیں غیر متبدل ہیں۔ وہ خدا کے قانون کی پوری Definition (تعریف) جو قرآن نے دی ہے' وہ اپنے ہاں کی Universe کے اندر مانتے ہیں۔ ان قوانین میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی' مکمل ہیں' ان میں کسی اضافے کی ضرورت نہیں۔ فرق کیا ہے؟ قرآن نے کہا یہ ہے کہ یہ الہ السمآء کو تو مانتے ہیں' الہ الارض کو نہیں مانتے۔ اسی اصول کو انسانوں کی دنیا کے اندر کارفرما نہیں کرتے۔

عزیزانِ من! کیا بات ہے قرآن کی! الہ کہنے میں سب کچھ آ جاتا ہے لیکن وہ الہ کے دو حصے کرتا ہے' دو مختلف گوشے بتاتا ہے: الہ السمآء و الہ الارض ❶ ۔ عزیزانِ من! چودہ سو سال پہلے یہ باتیں کہی جا رہی ہیں جب کسی انسان کے تصور میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ باہر کی کائنات کے اندر وحدتِ قانون ہے۔ اور اس کائنات کے یہ دو گوشے کر دینا اور کہنا کہ یہ ایک الہ السمآء ہے' اس تک تو یہ مانیں گے لیکن الہ الارض کو یہ نہیں مانیں گے۔ تو اس کے لیے کہا کہ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ (2:85) ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ ضابطۂ قانونِ خداوندی کے آدھے حصے کو تو مانتے ہیں' دوسرے حصے کو نہیں مانتے۔ ہم ان کی بات کر رہے ہیں جو آدھے کو تو مانتے ہیں۔

جناب بوعلی سینا' الرازی اور مسعودی کے بعد صدیوں سے تحقیق کے میدان میں ہماری گاڑی ایک ہی جگہ کھڑی ہے

خارجی کائنات کی اس تحقیق کا ہم جب بھی کہیں نام لیں تو یہ جناب بوعلی سینا ❷ (1980.1037) اور رازی ❸ تک جا کر ختم

---

❶ وَهُوَ الَّذِیْ فِی السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِی الْاَرْضِ اِلٰهٌ (43:84)۔

❷ ابن سینا (1037-980) نے پہاڑوں کی تخلیق' جمادیات کی تحقیق' زلزلوں کے اسباب اصول آلات' مقیاس الحرارت اور دیگر عناصر طبعی کے خواص پر بھی متعدد کتب لکھی ہیں۔

❸ الرازی (925-865) کی کتاب ''الحاوی'' ایک مدت تک یورپ کی طبی درسگاہوں میں داخل نصاب رہی۔ اس نے سب سے پہلے چیچک کو متعدی مرض ثابت کیا (پرویزؒ: فردوس گم گشتہ' طلوع اسلام ٹرسٹ (جسٹرڈ) لاہور' 1990' ص۔ 61)۔

ہو جاتا ہے' ہمارا یہ سلسلہ اس کے آگے چلتا ہی نہیں ہے۔ اس کے بعد آپ کے ہاں قانون کی بات ہی نہیں ہے' خارجی کائنات کی تحقیق آپ کے ہاں ختم ہوگئی۔ اُدھر خارجی کائنات ختم ہوگئی اور اِدھر الـٰہ الارض میں آپ کے ہاں کی ساری ملوکیت اور شہنشاہیت آ گئی۔ اب شہنشاہیت ختم ہوگئی تو مغرب کی جمہوریت آ گئی۔ جو الـٰہ السمآء ہے' اس سے آپ نے اپنے ہاں پانچ چھ سو سال سے سوئچ آف کر رکھے ہیں۔ جب بھی کسی کو کہو تو آپ کے ہاں وہی جو پانچ سات حکما گنے جاتے ہیں' آپ کے ہاں کے جو سائنٹسٹ وغیرہ ہیں' صرف ان تک ہماری بات چلتی ہے۔ جب بھی بات ہو کہ صاحب! دیکھو' مغرب نے کیا کیا ہے' کہتے ہیں کہ مغرب نے کیا کیا ہے؟ یہ تو آج کیا ہے دیکھیے' ہم نے کیا کچھ کیا ہے۔ اب صرف انہی حکما کے نام لیے جاتے ہیں: بوعلی سینا اور الرازی' ان میں مسعودی [1] کا نام بھی کہا گیا تھا۔ اس کے بعد جناب مسعودی کا نام ہی Repeat (دہراتے) کرتے چلے جا رہے ہو۔ وہ ساری کی ساری کائنات جو ہے وہ ہم سے خارج ہے۔ الٰہ الارض جہاں ہے' وہ انسانوں کی دنیا ہے۔ اس پہ کبھی غور کیجیے گا کہ قرآنِ کریم نے یہ جو کہا ہے کہ حکومت صرف خدا کے قوانین کی ہے تو یہ توحید ہے۔ انسانوں کے بنائے ہوئے قانون اگر درمیان میں ساتھ آ جائیں گے تو یہ شرک ہے۔ گویا حکمرانی تھی' یہاں حکومت کا سوال تھا' خدا کے قوانین کی اطاعت کا سوال تھا۔

دنیا بھر میں عملی طور پر امتِ مسلمہ کے ہاں قرآن کی قدر و منزلت کی نوعیت

قرآن کریم میں واضح طور پہ یہ سب کچھ موجود ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ قرآن کریم کو کہ ویدوں کی طرح گیت و دیا بنا دیا گیا ہے۔ وہ ویدوں کا تو کسی کو پتہ ہی نہیں ہے' ان کی وہ زبان سنسکرت ہی Dead (مردہ) ہو چکی ہوئی ہے۔ دنیا میں کوئی کتاب اتنی اصرار و تکرار سے نہیں پڑھی جاتی جتنی یہ کتاب قرآن پڑھی جاتی ہے' دہرائی جاتی ہے' کروڑوں تو اس کے حافظ ہیں۔ اس قرآن میں یہ آیات ہیں جو میں نے ابھی آپ کے سامنے پیش کی ہیں اور اسی لیے میں نے ریفرنسز (حوالہ جات) لکھا دیئے ہیں کہ آپ خود دیکھ لیجیے' دکھا دیجیے کہ قرآن میں یہ آیات موجود ہیں۔ یہ مقامِ حیرت ہے کہ پھر اس کے بعد اس قوم کو ہوا کیا کہ وہ اپنے توحید پرست ہونے کا دعویٰ کر رہی ہے اور عملاً وہ شرک کے اندر مبتلا چلی آ رہی ہے' جو قرآن نے کہا تھا کہ مومن ہوتے ہوئے بھی مشرک ہوتا ہے۔ ایک تو یہ تھا کہ یہ چیزیں قوم کے سامنے نہ ہوتیں تو ٹھیک تھا کہ بات نہیں سمجھی۔ یہ سارا کچھ موجود ہے' قرآن ان کے سامنے موجود ہے' پھر یہ کیا ہوا ہے؟

---

[1] مسعودی اس زمانے کا جہاں گرد (Globe Trotter) تھا' جس نے تمام آباد دنیا کا سفر پا پیادہ کیا اور اپنے مشاہدات قلمبند کرتا چلا گیا۔ اس نے تاریخ کا انسائیکلو پیڈیا لکھا ہے جس طرح مقدسی نے جغرافیہ کا لکھا تھا (پرویزؒ: فردوسِ گم گشتہ' طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' لاہور' 1998' ص ص۔ 59 اور 60 تا 61)۔

قرآنِ حکیم سے دوری کی بنیادی وجہ: گاڑی کانٹا بدل گئی

عزیزانِ من! ہوا وہ ہے جو ذرا سی سازش تھی۔ وہ جو میں کہا کرتا ہوں کہ جب گاڑی کانٹا بدلتی ہے تو وہ دو پٹڑیوں میں ایک انچ کا فرق بھی نہیں ہوتا' وہ فرق بڑا غیر محسوس ہوتا ہے' پتہ ہی نہیں چلتا۔ اور اس کے بعد جتنی تیزی سے گاڑی چلی جاتی ہے' اسے قرآن نے ضَلٰلًاۢ بَعِيۡدًا کہا تھا' اتنے ہی منزل سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جتنا کچھ کہا جائے گا کہ یہ اسلام کی خدمت ہے' وہ ساری تبلیغِ اسلام وہ گاڑی اُس پٹڑی پہ پڑی ہوئی ہے اور تیزی سے چلتی جا رہی ہے ضَلٰلًاۢ بَعِيۡدًا(4:116) جتنی تیز ہوتی ہے' اتنی ہی منزل سے بعید ہوتی چلی جا رہی ہے۔

میں کہہ یہ رہا تھا کہ ہوا کیا؟ وہ کانٹا کیسے بدلا گیا؟ یہ بہت بڑی سازش تھی۔ لفظ تو آپ نے عبادت کا سنا تھا کہ خدا کی عبادت میں شریک نہ کرو۔ اُس نے حکم دیا تھا کہ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰهَ (11:2) اُس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ عبادت کا ترجمہ پرستش کیا' سارا معاملہ حل ہو گیا۔ پرستش صرف خدا کی کرو۔ اب یہ ہو گئی توحید اور شرک ہوا بتوں کی پرستش کرنا۔ اور انہوں نے اطمینان کر لیا کہ ہم بتوں کی پرستش تو کرتے ہی نہیں ہیں تو ہم جرمِ شرک کے تو مرتکب نہیں ہیں' وہ تو ہندو ہے۔

قرآنِ حکیم کے ایک ایک لفظ کی حرمت کو پیشِ نظر رکھنا ہوتا ہے

ایک لفظ کے معنی یا اس کا مفہوم یا اس کا ترجمہ بدلنے سے گاڑی دوسری پٹڑی پہ چلی اور چلی جا رہی ہے۔ آپ کسی سے یہ مشرک ہونا کہہ لیجئے' وہ کہتے ہیں کہ صاحب! (معاذ اللہ) ہم اور شرک' ہم تو بتوں کو نہیں پوجتے۔ وہ ساری آیات جس کے اندر خدا نے **حکمه احدا** کہا ہوا ہے' اس کے معنی ہو گئے: خدا کی یہ پرستش کرنا' اس کا حکم تھا ہم پرستش کر رہے ہیں۔ اب حکومت کسی کی بھی ہو' اس سے تو واسطہ نہیں ہے۔ انگریزی میں قرآن کریم کا ترجمہ کیا گیا' اُنہوں نے بھی عیسائیت کی اصطلاحات (Biblical Terms) لیں' اس لفظِ عبادت کا ترجمہ Worship (پرستش) کیا۔ اپنے ہاں کوئی ترجمہ اٹھا لیجیے اس میں عبادت کا انگریزی میں ترجمہ Worship (پرستش) ملے گا۔ اب توحید ہو گئی صرف خدا کی پرستش کرنا' شرک ہو گیا بتوں کی پوجا کرنا اور سارا مسئلہ ہو گیا حل۔ شرک نہیں بخشا جائے گا' بت پرستی نہیں بخشی جائے گی۔ شرک ظلمِ عظیم ہے' ہو گیا بت پرستی ظلمِ عظیم ہے۔ خدا کے سوا کسی کی پرستش جائز نہیں۔ کہیے تو پھر دہرا دوں وہ تین چار آیتیں ہیں۔ وَّ لَا يُشۡرِكُ فِىۡ حُكۡمِهٖۤ اَحَدًا(18:26) وہ اپنے حکم میں' حکمرانی میں' کسی اور کو شریک نہیں کرتا۔ وَّ لَا يُشۡرِكۡ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا(18:110) اطاعت اور محکومیت صرف اپنے نشوونما دینے والے کے قوانین کی اختیار کرو۔ اس کی محکومیت میں کسی اور کو شریک نہ کرو۔ اس آیت میں وہ آ گیا عبادت کا لفظ۔ تو اب یہاں عبادت کے

معنی پرستش کیے کہ خدا کی پرستش میں کسی کو شریک نہیں کرتے اور وہاں جو وہ حکم تھا کہا کہ حکم یہی تھا۔ اب محکومیت' اطاعت' فرماں پذیری ساری کی ساری انسانوں کی کی جاتی ہے۔ ملوکیت تھی تو وہ ایک بادشاہ تھا' ڈکٹیٹر شپ آئی پھر بھی ایک فرد تھا' اس کے بعد جمہوریت آئی تو پھر بھی انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین تھے۔ وہ تو کفار کی منزل ہے۔ اپنے ہاں انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کا نام قوانینِ فقہ رکھیے' شریعت کے قوانین رکھیے' یہ سب انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین ہیں۔ قیامت تک کے لیے غیر متبدل ہیں' خدا کے قوانین کو منسوخ کرنے والے ہیں' ان میں اضافہ کرنے والے ہیں' ان میں تغیر و تبدل کرنے والے ہیں۔ یہ ہے جس کا نام آپ کے ہاں اسلامی حکومت کہا جائے گا' شریعت کے احکام کہا جائے گا' اسلام کی پیروی کہا جائے گا۔ میں نے کہا ہے کہ اسی لیے اس نے الـــــہ الارض الگ کر کے بتا دیا تھا۔ اُس نے یہ کہا کہ السمآء میں اور الٰہ' اور ارض میں اور الٰہ رکھنا جو ہے یہ ہے ثنویت (Dualism)۔ اسی لیے یہاں بھی اُس نے فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ کہا ہے۔ جہاں بھی اس نے اپنی الوہیت یا خدا کی الٰہیت کہا ہے تو خدا کی الٰہیت جو ہے' حکمرانی جو ہے اس کے قوانین کی اطاعت ہے اور یہ تو گم ہو چکی ہوئی ہے۔ اس کے باوجود ہمارا جو دعویٰ ہے' وہ توحید کا ہی دعویٰ ہے حالانکہ مَـا لَهُـمْ فِيهِـمَـا مِنْ شِرْكٍ (34:22) وہ خدا کے اختیار و اقتدار میں کسی طرح بھی شریک نہیں ہیں۔

یہ پوری کائنات ایک اکائی ہے لہٰذا ارض و سما میں صرف اسی کا قانون رائج ہوگا' اسی کی حکمرانی ہوگی

آپ دیکھیے یہیں بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس نے سماوات اور ارض الگ الگ کیوں کہے ہیں حالانکہ ارض تو اس میں آ جاتی ہے' اگر صرف کائنات کہنا ہو تو کائنات کے اندر ارض تو خود آ جاتی ہے۔ یہاں فِيهِـمَـا کیوں کہا؟ وہ یہ چیز ہے۔ عزیزانِ من! یہ قرآن ہے' آج کا دور بھی اس کے سامنے تھا' سائنس کا دور بھی سامنے تھا۔ اُس نے فِيهِـمَـا کہا کہ دونوں کے اندر خدا کے قانون کی حکمرانی ماننی ہوگی۔ یہ توحید ہوگی۔ صرف سما کے اندر مان لینے سے بات نہیں چلتی۔ اور یہاں تو بات آگے بھی جاتی ہے۔ انسانی دنیا کے اندر بھی اگر آپ وہ کہیں گے' اور وہ جو خارجی کائنات میں فطرت کی قوتیں ہیں' وہ اسی طرح سے ان سے تغافل برتیں گے' تو یہ بھی توحید نہیں ہوگی۔ توحید تو سما اور ارض دونوں میں خدا کی حکمرانی کا تسلیم کرنا ہے۔ پہلی آیت تھی جو میں نے ابھی پیش کی ہے لیکن آپ اس سے متفق ہونگے کہ جب تک یہ نکتہ نہ سمجھ لیا جائے' اسلام یا دین کی کوئی بات سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی۔ وہ تو اسی محور کے گرد گھومتا ہے۔ یہ جسے آپ خدا کی حکومت' حکمرانی' اسلامی حکومت' خلافتِ راشدہؓ' نبی اکرم ﷺ کی حکومت کہیں گے' اس کے اندر خدا کے قوانین کو نافذ کرنا حکومت کا کام تھا۔ ان کے نفاذ کے طور طریقے وضع کیے جاسکتے ہیں کہ کس طریق سے نافذ کیا جائے۔ یونہی نچلے

درجے پہ سمجھنے کے لیے مثال ہے کہ قانون تو یہ ہے کہ Keep to the left یعنی بائیں طرف چلو۔ اس قانون کے اوپر عملدرآمد کس طرح سے کرایا جائے، یہ طریقے بدلتے رہیں گے۔ کبھی صرف ٹریفک کا انسپکٹر ہی ہوتا تھا، ابھی وہ سگنل والی بات بھی درمیان میں آ گئی ہے جب سے Electrcity (بجلی) آ گئی ہے۔ یہ طریقے بدلتے رہیں گے، لیکن قانون اپنے مقام پہ رہے گا۔ میں نے یونہی مثال دی ہے۔ یا یہ کہ عدل کرو قانونِ خداوندی کے مطابق فیصلے کرو تو عدل اور فیصلہ کرنے کے طریقے بدلتے رہیں۔

عدل کا قرآنی مفہوم صرف خدا کے قانون کے مطابق فیصلے کرنا ہے

عزیزانِ من! قرآن کی رو سے عدل کے یہ معنی ہیں کہ صرف خدا کی اس کتاب قرآن کے مطابق فیصلے کرو۔ اسے عدل کہا جاتا ہے۔ اس نے اسی لیے وَ بِهٖ یَعۡدِلُوۡنَ (7:159,181) کہا تھا، اسی کو عدل کے ساتھ فیصلے کرنا کہتے ہیں، یہ تو ہے خدا کا ابدی قانون، یہ اپنے مقام پہ رہے گا۔ اب ان قوانین کے مطابق فیصلہ کرنے کے لیے جو نظامِ عدل ہے، وہ بدلا جا سکتا ہے، اُس میں اپنے حالات کے مطابق اضافے ہو سکتے ہیں۔ کسی زمانے میں کچھ اور تھا آج یہ کچھ اور ہے۔ یہ عدل کے ضمن کے اندر جتنی چیزیں آپ دیکھتے ہیں یہ اس خدا کے ایک حکم کو نافذ کرنے کے طور طریقے ہیں، Procedure (طریقہ کار) ہے۔ اسلامی حکومت صرف یہ کر سکتی ہے۔ انسان، انسانوں کے لیے قانون نہیں بنا سکتے۔ وہ صرف خدا کا قانون ہے اور خدا کا قانون صرف خدا کی کتاب کے اندر ہے، مکمل ہے، غیر متبدل ہے، محفوظ ہے۔ خدا نے یہ کہا ہوا ہے کہ اطاعت یا حکمرانی صرف خدا کی قبول کرو، وہ خدا حی لا یموت (25:58) ہے، زندہ ہے، اس کو کبھی موت نہیں آ سکتی۔ اگر خدا زندہ ہے تو ہمارا اس کے ساتھ کیوں کوئی تعلق نہیں ہے؟ (معاذ اللہ) یہاں اگر یہ کہا جائے کہ وہ ہمیشہ زندہ رہ سکتا۔ آج تو ہمارے لیے اس کا زندہ رہنا ہے مگر ہمارے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے اور وہ زندہ کس طرح سے ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جو اس تعلق کی نوعیت کے بارے میں ذہنوں میں اُبھرتے ہیں۔ اس تعلق کی نوعیت کا معلوم ہونا ازبس ضروری ہے۔

انسانوں کا ذاتِ خداوندی سے رابطہ صرف اس کی عطا کردہ کتاب کے ذریعے ہی ہے

عزیزانِ من! خدا کا اور ہمارا تعلق صرف اس کی کتاب قرآنِ کریم کے ذریعے ہے۔ اور اس کی یہ کتاب جب مکمل اور غیر متبدل ہے، محفوظ ہے تو وہ زندہ اور پائندہ ہے اس لیے ہمارا خدا ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اس کی کتاب کو الگ رکھ دیجیے تو خدا کا وجود ہی ہمارے لیے ختم ہو جاتا ہے۔ پھر وہ پرستش کرنے والا خدا رہ جاتا ہے جو صرف آپ کے ذہن میں ہے۔ خدا کی موجودگی یہ ہے کہ اس کی کتاب کے مطابق حکمرانی قائم کی جائے۔ وہ لَا یَمُوۡتُ (25:58) اس طرح سے ہے کہ یہ کتاب قیامت تک کے لیے زندہ اور

پائندہ ہے۔ یہ ہے توحید۔ Discussion (بحث تمحیص) ہمارے ہاں یہ ہوتی ہے کہ جمہوریت کس انداز کی چاہیے' الیکشن کس طرح سے ہونے چاہئیں' نظام پارلیمانی ہو یا Presidential System (صدارتی نظام) ہو؟ یہ مسائل چلے آرہے ہیں۔ یہ سوالات ہی یوں نہیں پیدا ہوتے۔ ان کے پیچھے ایک نظام کی بات آتی ہے۔

عملی زندگی کے لیے اسلامی مملکت کے نزدیک اصل سوال قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے طور طریقوں کا وضع کرنا ہوتا ہے

عزیزانِ من! اگر انسانوں کے قوانین کو ہی نافذ کرنے کے طور طریقوں پر آپ Discuss (گفتگو) کر رہے ہیں تو وہ بنیاد ہی آپ کے ہاں شرک کی ہے۔ یہی کہہ رہے ہیں کہ جو قانون بنانے والا ادارہ ہے' وہ پارلیمانی (Parlimentarian) ہونا چاہیے یا Presidential (صدارتی)۔ قرآن تو انسانوں کو قانون بنانے کا حق ہی نہیں دیتا۔ بات تو یہ طے کیجیے کہ قرآن کے اصول اور اقدار اور احکام یہ ہیں جن کو وہ حدود کہتا ہے۔ ان قوانین و اقدار کو نافذ کرنے کے لیے کیا طریقے اختیار کیے جائیں' ساری بات یہ طے کرنے کی ہے۔ اس نے کہا یہ ہے کہ اسلام خدا کے سوا کسی اور کو قانون سازی کا حق دیتا ہی نہیں ہے مگر

دہن کا ذکر کیا' یاں سر ہی غائب ہے گریباں سے

نفاذِ قانون کے سلسلہ میں شفاعت کے تصور کا غلط مفہوم

کہا ہے کہ وَ لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ (34:23)۔ اب یہاں سے شفاعت کی پھر ایک اور چیز آ گئی۔ شرک کا تعلق تو پھر بھی اسی دنیا سے تھا۔ شفاعت کا غلط مفہوم یہ لیا کہ سفارش کرکے مجرم کو چھڑا لینا۔ یہ بات متعدد بار درس میں آ چکی ہے۔ بے شمار اس قسم کی روایات آ گئی ہوئی ہیں کہ حشر کا میدان ہوگا' مجرم آئیں گے' وہاں خدا کی عدالت ہوگی' وہاں میزان کھڑی ہوگی' تمام پیش ہونگے' فیصلہ ہوجائے گا کہ یہ جہنم میں جانے والے ہیں' یہ جنت میں جانے والے ہیں۔ جہنم میں جانے والے جہنم میں بھیج دیئے جائیں گے۔ اس کے بعد کہا کہ اللہ تعالیٰ عدالت نمٹا کر جا رہے ہونگے' پیچھے دیکھیں گے تو اس میدان میں ایک شخص سجدے میں پڑا ہوا ہوگا۔ وہ مڑ کر دیکھیں گے کہ بھئی! پتہ لو کون رہ گیا ہے تو معلوم کیا جائے گا' وہ نبی اکرم ﷺ ہونگے۔ اللہ تعالیٰ کہے گا کہ آپ اس طرح یہاں کیوں ہیں؟ معاملہ تو سارا ختم ہوگیا۔ کہنے لگے: جی ختم کیسے ہوگیا؟ میرے امتی تو تم نے جہنم میں بھیج دیئے' میں کیسے جنت میں جاسکتا ہوں؟ عزیزانِ من! یہ آپ کی جو احادیث کی اصح الکتب ہے' صحیح ترین کتابیں ہیں' یہ چیز ان کے اندر ہے۔ اس کے بعد پوچھیں گے کہ آپ ﷺ کیا مانگتے ہوں۔ آپ ﷺ کہیں گے کہ میری امت کو جنت میں بھیجو۔ پہلے اتنے جہنم

سے نکالے جائیں گے پھراتنے نکالے جائیں گے پھراتنے نکالے جائیں گے۔ اوراس طرح سے آپ ﷺ کی سفارش سے وہ مجرم جن کا جرم ثابت ہوگیا' سزا ان کو دی گئی' ان کو جیل خانے میں بھیج دیا گیا' وہاں سے سارے نکال کر جنت میں لے جائیں گے۔ یہ شفاعتِ محمدی ﷺ ہے۔ ہمارے ہاں گالی ہے کہ اللہ کرے تمہیں خدا یا رسول کی شفاعت نصیب نہ ہو۔ جتنے جرم چاہو کیے جاؤ۔ یہاں قانون سازی کا حق خود انسانوں کو ہے۔ ایسے قانون بنالو کہ اس قسم کے لوگ اس میں آئیں ہی نہیں۔ قانون بدل دو' آپ نے ہی تو بنانے ہیں۔ اگلی بات یہ رہ گئی تھی کہ یہاں بدلے بھی گئے' معاف بھی ہوگئے تو آگے جا کر تو پکڑے جاؤ گے۔ ٹھیک ہے جی' پکڑے ہی جائیں گے' سزا ملنے کے بعد چھڑانے والے تو موجود ہونگے۔ اور چھڑانے والوں میں تو آپ کو یاد ہوگا' میں سنایا کرتا ہوں' بچپن میں یہی کچھ تو پڑھا۔ یہ تو رسول اللہ ﷺ کی شفاعت ہے' حضور ﷺ سے نیچے بھی جو ہیں' ان کی بھی تو سفارش چلتی ہے۔ ایسے بھی تو ریڈر ہوتے ہیں حاکم کے مزاج کو پہچاننے والے' ان کی سفارش بھی بہت کام دیتی ہے کہ پیر صاحب اپنی کملی اوڑھے ہوئے چلے جا رہے ہونگے' وہ گیٹ کیپر' وہ نگران' ان سے پوچھے گا ہی نہیں۔ وہ اندر جھانک کر دیکھیں گے کہ کتنے ہی مجرم ہونگے جو جنت میں پھر رہے ہونگے۔ ٹکٹ کلکٹر سے پوچھا جائے گا کہ انہیں Without Ticket (بغیر ٹکٹ) کس طرح آنے دیا۔ وہ کہیں گے کہ میں نے تو کسی ایک کو بھی بغیر ٹکٹ کے اندر نہیں جانے دیا۔ اب اس کی جو پھڑ و پھڑی شروع ہوئی تو حضرت نے جو کملی اوڑھی ہوئی تھی' کملی کے ایک ایک تار کے ساتھ ان کے مریدوں کی روحیں چمٹی ہوئی تھیں۔ کملی لے کر اندر گئے'' جھاڑیاں جیویں جوواں جھاڑیاں جاندیاں نیں [1] '' وہ سارے کے سارے مرید بھی جنت میں چلے گئے۔ عزیزانِ من! کیا پوچھتے ہیں کہ کہاں ہیں ہم لوگ۔ اس سے انکار کیجیے تو اربابِ شریعت کی رو سے کہ یہ شفاعت کا منکر' وہ وہاں مرتد۔ اس سے انکار کیجیے تو یہ طریقت کی رو سے کہ صاحب! دیکھ لیجیے کہ حضرت صاحب کے تقربِ بارگاہِ خداوندی کا انکار کر رہا ہے۔

اگر انسانی آنکھ کو قرآنِ حکیم کی روشنی سے محروم کر دیا جائے تو پھر اُسے کچھ دکھائی نہیں دیتا

عزیزانِ من! ایک خدا کی کتاب کو چھوڑ دینے کے بعد کتنے بڑے بڑے شرک ہیں جن کے اندر ہم مبتلا چلے آرہے ہیں۔ قرآن نے کہا تھا کہ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا (4:116) منزل سے بہت دور جا پڑو گے۔ کہا ہے کہ وَ لَا تَـنۡفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنۡدَهٗۤ اِلَّا لِمَنۡ اَذِنَ لَهٗ (34:23)۔ یہاں وہ آگیا کہ صاحب! دیکھیے اِلَّا لِـمَنۡ اَذِنَ لَهٗ (34:23) ہے یعنی ''جس کو خدا اجازت دے گا' وہ شفاعت کر سکے گا''۔ شفاعت کا ترجمہ سفارش کیا۔ سفارش پہ جب اعتراض پڑا تو کہا کہ خدا نے کہا ہے کہ جس کو خدا اجازت دیدیگا تو

---

[1] اسے یوں جھاڑا جیسے کپڑے پر سے جوئیں جھاڑی جاتی ہیں۔

ان کوتو اجازت ملی ہوئی ہوگی۔ وہ جو میں نے کہا تھا کہ وہ تو ہوتا ہی یہ ہے کہ براہِ راست اوپر کا افسر رشوت یا سفارش نہیں مانتا' وہ نیچے سے کوئی ہوتا ہے' اس کے ساتھ اس کی ساز باز ہوتی ہے' اس کی سفارش وہ مان لیتا ہے' جس کو اس نے اجازت دے رکھی ہوتی ہے۔ یہی شفارس والا معاملہ وہ یہاں کر رہے ہیں کہ خدا نے ان میں سے بعض کو سفارش کی اجازت دے رکھی ہوگی۔

لفظ شفاعت کا قرآنی مفہوم

شفاعت کے معنی سفارش ہیں ہی غلط۔عزیزانِ من! خدا کے قانونِ مکافات میں وہ سفارش کہاں؟ مکافاتِ عمل کے اس قانون میں سفارش کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ یہاں اگر آپ نام لیں کہ صاحب! اس افسر کے کیا کہنے ہیں' اس کے ہاں تو سب سفارش چلتی ہے۔تو یہ چیز بدترین قسم کی ہے کہ اگر کسی حاکم یا افسر کے متعلق یا کوئی عدل کرنے والے جج کے متعلق کہی جائے کہ وہاں تو سفارش چلتی ہے لیکن خدا کے متعلق بڑے فخر سے کہا جاتا ہے کہ وہ سفارش قبول کرتا ہے حضورﷺ سفارش کرنے چلے جاتے ہیں یاللعجب!!

قرآنِ حکیم کے ہاں قانونِ مکافات کے عمل کو سمجھانے کا طریق

اللہ تعالیٰ نے جو سمجھایا ہے وہ قانونِ مکافات کا فیصلہ سمجھانے کی ایک مخصوص شکل ہے جو اس نے عدالت کی بتائی ہے اور سارے قرآن میں یہ انداز ہے۔عدالت ہے' کرسیِ عدالت کے اوپر حاکم بیٹھا ہے' مجرم کو عدالت میں لایا جاتا ہے' وہ کٹہرے میں کھڑا ہوتا ہے۔اس کے بعد اس کے ساتھ کھڑے ہونے والا شاہد ہے یا جو شہادت والا ہے' جو گواہی دینے والا ہے وہ کھڑا ہے۔یعنی میں نے عرض کیا ہے کہ یہ باتیں ویسے سمجھانے کے لیے ہیں ورنہ خدا کے قانونِ مکافات اور اعمالنامے کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔وہ تو ہر مجرم کے گلے میں لٹکا ہوا ہوتا ہے۔اس نے سمجھایا ایسے ہے کہ وہاں یہ چیز ہوگی۔اور وہاں پھر شاہد بھی آواز دے کر بلائے جائیں گے' شہادت دینے والا ہوگا۔ وہ مجرم کے ساتھ کھڑا ہو جانے والا ہے۔اس لفظِ شفاعت کے معنی ساتھ کھڑے ہو کر شہادت دینے والا ہے۔اس کے لیے یہ ہے کہ ہر شخص عدالت کے دروازے پہ چک اٹھا کر اندر نہیں جا سکتا کہ جی' میں گواہی دینے کے لیے آیا ہوں۔ بلکہ لـمن اذن لـه (34:23) حاکمِ مجاز جس کو اجازت دیتا ہے یا قانون کی رو سے جس کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ شہادت دے تو صرف وہی اندر جا سکتا ہے۔

شفاعت کا قرآنی مفہوم' خدا کی عدالت میں سچی شہادت دینے کا نام ہے' سفارش کرنا نہیں ہے

اب' عزیزانِ من! یہاں بھی دیکھیے کہ کس طرح قرآن ہر بات واضح کرتا چلا جاتا ہے۔قرآنِ کریم میں شفاعت کے لیے یہ آیا

ہے کہ وَلَا یَمۡلِکُ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنۡ شَهِدَ بِالۡحَقِّ (43:86) یہ لوگ خدا کے سوا جن ہستیوں کو صاحبِ قوت واقتدار مانتے ہیں اور اپنی مدد کے لیے انہیں پکارتے ہیں، انہیں اس کی استطاعت ہی نہیں کہ وہ ان کی مدد کے لیے ان کے ساتھ کھڑے ہوسکیں، عدالتِ خداوندی میں کوئی کسی کے ساتھ کھڑا نہیں ہوسکے گا بجز اس کے حق کے ساتھ آئے اور آ کر سچی شہادت دے۔ اس کا نام شفاعت ہے۔ یہ شخص ہے جو مجرم کے ساتھ آ کر کٹہرے میں کھڑا ہو اور خدا کے حکم اجازت سے قانون کے مطابق شَهِدَ بِالۡحَقِّ (43:86) سچی شہادت دے۔ قرآن نے تو خود شفاعت کے معنی شہادت بتا دیا ہے۔ یہ شہادت دینے والی بات ہے۔ یہ جو شہادت ہے، یہ ٹھیک ہے کہ اس کا ساتھی، اس کا رفیق، بھی شہادت دے گا۔ اور قرآنِ کریم میں یہ ہے کہ بہ غایت مجموعی ہم رسولوں سے پوچھیں گے کہ تم نے ہمارا پیغام ان تک پہنچا دیا تھا اور وہ کہیں گے کہ ہم نے پہنچا دیا تھا۔ ہم پوچھیں گے کہ انہوں نے پھر کیا جواب دیا تھا۔ یہ بھی شہادت ہے، اس امر کی شہادت ہے کہ ہم نے تمہارا پیغام پہنچا دیا تھا۔ قرآنِ کریم نے شفاعت کو شاہد بالحق خود کہا ہے۔ اس کے معنی سچی شہادت دینا ہیں، گواہی دینا ہیں۔

عزیزانِ من! شفاعت کے معنی سفارش کرنا نہیں ہیں، یہ تو سارا تصور ہی مکافاتِ عمل کا ختم کر دیتا ہے، اس سے عدل کا تصور ختم ہو جاتا ہے۔ کہا ہے کہ لَا تَنۡفَعُ الشَّفَاعَةُ (34:23) گواہ بھی از خود آ کر یوں گواہی نہیں دے گا بلکہ اُسے بھی خدا کے قانون و قاعدے کی اجازت کے ساتھ ہی گواہی دینا ہوگی۔ اجتماعی زندگی کے اندر جتنے کسی کے ساتھ رفیق ہوتے ہیں وہ بھی شاہد کی صورت اختیار کر لیتے ہیں کہ ہم اس کے ساتھ تھے، ہم نے خود دیکھا ہے کہ وہاں یہ چیز ہو رہی تھی۔ بہر حال کوئی بھی ہو، اس کے معنی شہادت اور گواہی دینے کے ہیں، سفارش کرنے کے نہیں ہیں۔ کہا ہے کہ حَتّٰۤی اِذَا فُزِّعَ عَنۡ قُلُوۡبِهِمۡ قَالُوۡا مَاذَا ۙ قَالَ رَبُّکُمۡ ؕ قَالُوا الۡحَقَّ ۚ وَ هُوَ الۡعَلِیُّ الۡکَبِیۡرُ (34:23) یہ جو ہے عدالت میں کھڑے ہونا مقدمے میں مبتلا ہونا، عدل کے لیے یہ سارا کچھ انتظام ہونا، یہ چیز بڑی گھبراہٹ کا باعث ہوتی ہے، بڑی پریشانی ہوتی ہے کہ پتہ نہیں کیا فیصلہ ہو، کیا حکم ہو۔ کہا کہ جب یہ پریشانی اس طرح سے دور ہو جائے گی، وہ سچی شہادت آ جائے گی، یہ بری الذمہ ہو جائیں گے، یہ سب کچھ ہونگے تو پھر وہ آپس میں یہ کہیں گے کہ یہ خدا نے کیا بات کی تھی! وہ کہیں گے کہ یہ الحق ہے، سچی سچی بات تھی۔ وَ هُوَ الۡعَلِیُّ الۡکَبِیۡرُ (34:23)۔ اور وہ، اس قانون کا دینے والا خدا، بہت بلند و بالا، اور بڑی قوتوں کا مالک ہے۔ اس کے بعد کہیں اور سپریم کورٹ نہیں ہے جہاں اس کے خلاف اپیل ہو سکے، یہ فائنل کورٹ ہے، یہ جو فیصلہ ہوا ہے اس کے بعد اپیل نہیں ہوسکتی۔

شرک کی ایک دوسری قسم ''کسی دوسرے انسان کا محتاج ہونا بھی ہے''

عزیزانِ من! ایک چیز تو پہلے آئی تھی کہ حکمرانی خدا کی ہے' حکومت خدا کی ہے۔ اور اگلی چیز یہ ہے کہ محتاجی بھی صرف خدا کی ہے۔ کوئی انسان دوسرے انسان کا محتاج ہو جائے تو وہ بھی شرک ہے' توحید نہیں ہے۔ کہا ہے کہ قُلۡ مَنۡ یَّرۡزُقُکُمۡ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ (34:24) پوچھو ان سے' خارجی کائنات کے اندر ہو یا خود زمین کے اندر یا تمہاری اپنی دنیا کے اندر' سامانِ رزق کون دیتا ہے' کیا ایمان ہے تمہارا کہ کون دیتا ہے' کیا نظام ہونا چاہیے؟ پھر کہا کہ قُلِ اللّٰہُ (34:24) کہو کہ صرف خدا دیتا ہے' اسے خدا کے سوا کوئی نہیں دیتا:

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں ایں است و بس
کس دریں جا حاکم و محکوم نیست
عبد و مولا سائل و محروم نیست

جنّتی معاشرے کی بنیادی خصوصیت: وہاں کوئی انساں نہ تو کسی دوسرے کا حاکم ہوگا اور نہ ہی محتاج

یہ جنت جو خدا کے نظام کی یہاں قائم ہوتی ہے' یہی نہیں کہ اس میں کوئی انسان حاکم یا دوسرا محکوم نہیں ہوتا بلکہ وہاں حاکم اور محکوم انسان ہوتے ہی نہیں۔ اور کہیں وہ چیز بھی نہیں ہوتی کہ کوئی انسان روٹی کے لیے کسی دوسرے انسان کا محتاج ہو جائے۔ کہا کہ قُلۡ مَنۡ یَّرۡزُقُکُمۡ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ قُلِ اللّٰہُ (34:24) ان سے پوچھو کہ تم معاشرے میں رزق کی تقسیم اپنے ہاتھوں میں رکھنا چاہتے ہو تو زمین و آسمان سے جو کچھ تمہیں بطور رزق ملتا ہے' اسے کون عطا کرتا ہے؟ اور اس کے بعد چیلنج دیا گیا ہے کہ وَ اِنَّاۤ اَوۡ اِیَّاکُمۡ لَعَلٰی ہُدًی اَوۡ فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ (34:24) تم بتا دو! اے ایمان رکھنے والے' نصب العین حیات رکھنے والے تم ان سے کہہ دو کہ اسے خدا کے سوا کوئی نہیں دیتا۔ اس کے بعد ان سے کہو کہ بتاؤ! پھر ہم میں سے کون سیدھے راستے پر ہے اور کون کھلی ہوئی گمراہی میں؟ کہہ دو کہ کوئی انسان کسی انسان کا محکوم نہیں ہوگا' کوئی انسان کسی دوسرے کا محتاج نہیں ہوگا۔ یہ جو بات ہے' یہ ہے سچی' صحیح راستے پہ لے جانے والی۔ یا کیا یہ تمہارا نظام ہے جس میں ایک فرد دوسرے فرد کا محکوم بھی ہوتا ہے' محتاج بھی ہوتا ہے؟ بتاؤ دونوں میں سے کون سچا ہے؟ کفر اور اسلام کا تو فیصلہ یہاں ہو جاتا ہے۔ کہا ہے کہ اس کے باوجود اگر تم اس طرح سے نہیں مانتے۔ ٹھیک ہے'

ہم جھگڑتے نہیں ہیں'' او پنجابی جس طرح کہندے نیں کہ اسیں کوئی تہاڈی قبر اچ پیناں ہیگا❶ ''۔قُلْ لَّا تُسْئَلُوْنَ عَمَّآ اَجْرَمْنَا وَ لَا نُسْئَلُ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ(34:25) تم اگر اسے نہیں مانتے تو ٹھیک ہے۔ اجرمنا۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ یہ بہت بڑا جرم کیا جا رہا ہے جو ہم کہتے ہیں کہ انسانوں کی حکومت نہیں' انسان ان داتا نہیں ہوسکتا تو ٹھیک ہے اگر تو یہ جرم ہے تو اس جرم کی سزا ہم بھگتیں گے' تم اپنی روش پہ قائم رہو' اس کا نتیجہ تم بھگتو گے' ہم تو نہیں بھگتیں گے۔

انسانوں کے خودساختہ نظام اور قرآنی نظام کے نتائج کو پرکھنے کا طریق

کہا ہے کہ قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَ هُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيْمُ (34:26)۔ اگر تم اس پر بھی اپنی مخالفت سے باز نہ آئے' تو پھر ہمارا اور تمہارا فیصلہ میدانِ جنگ میں ہوگا۔ اس کے سوا اور چارہ ہی کیا ہوگا؟ یہ فیصلہ اسی حق وصداقت کے قانون کے مطابق ہوگا جس کی طرف ہم تمہیں دعوت دیتے ہیں۔ یاد رکھو! خدا کا قانون ہمیشہ سچے فیصلے کرتا ہے کیونکہ اس کی ہر بات علم پر مبنی ہوتی ہے۔ اب ایک روش تو یہ ہے کہ ہم تمہارے معاملے میں دخل نہیں دیتے' تم ہمارے معاملے میں دخل نہ دو۔ قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (39:39) تم اپنی جگہ اپنے پروگرام پہ عمل کرتے جاؤ' ہم اپنے پروگرام پہ عمل کرتے جائیں گے۔ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (39:39) نتائج خود بتا دیں گے کہ کون سچ پر تھا لیکن اگر تم اس باہمی سمجھوتے کے باوجود ہمارے راستے میں مزاحم ہوگے' رکاوٹیں پیدا کرو گے' مخالفت کرو گے' تصادم ہوگا' تو اسے نہیں برداشت کیا جاسکتا' اس کا ہم مقابلہ کریں گے۔ اور اس کے بعد تم پھر دیکھ لینا کہ کامیابی اور فتح کس کو حاصل ہوتی ہے۔ کہا ہے کہ وَ هُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيْمُ (34:26) اس کے قانونِ نظام کے مطابق فتح ہوگی' وہی فتاح ہے۔ فتاح کے ساتھ العلیم ہے کہ دھاندلی کے ساتھ وہ فیصلے نہیں کیا کرتا بلکہ علم کی بنا پہ فیصلہ کیا کرتا ہے۔ اُسے معلوم ہے کہ حق پر کون ہے۔

آخر عالم گیر سطح پر وہ کون ہے جو ذرائع رزق کا ذریعہ بن رہا ہو؟

کہا ہے کہ قُلْ اَرُوْنِیَ الَّذِيْنَ اَلْحَقْتُمْ بِهٖ شُرَكَآءَ كَلَّا (34:27) ذرا مجھے وہ لوگ دکھاؤ تو سہی' جنہیں تم نے خدا کا شریک بنا کر اس کے ساتھ شامل کر رکھا ہے اور حکومت کا تو تم کہتے ہو کہ یہ حکم چلاتے ہو' اور دوسرے مانتے ہیں۔ بتاؤ تو سہی کہ ان کی حقیقت کیا ہے اور خدا کے ذرائع رزق کو چھوڑنے کے بعد کون ہے جو تمہارے رزق کا ذریعہ بن سکتا ہے؟ آسمان سے بارش کون برساتا ہے؟ زمین سے اناج کون اگاتا ہے؟ کیا خدا کا قانون یہ کچھ کرتا ہے یا تمہارا کوئی اپنا قانون ایسا کچھ کرتا ہے؟ لاؤ دکھاؤ تو سہی

---

❶ جس طرح پنجابی کہتے ہیں کہ ہمیں تمہاری قبر میں نہیں جانا ہے۔

مجھے۔ جیسا میں نے عرض کیا تھا کہ اُس کا قانون تو ہے۔ اگر یہ سمندر سے Distilled Water (کشید شدہ پانی) کرنوں کے ذریعے اوپر اٹھا کر بارشیں نہ برسائے تو ساری دنیا چار دن کے اندر تڑپ کر مر جائے۔ نہ پینے کو پانی ملے نہ کھانے کو روٹی ملے۔ اس کے نظام کی یہ ایک شق میں نے ابھی عرض کی ہے۔ سمندر کا ایک گھونٹ پانی آپ نہیں پی سکتے۔ آپ آب رسانی کا اتنا بڑا نظام تو کریں یہ تو خدا کا قانون ہے جو ساری دنیا میں Distilled Water (کشید شدہ پانی) کی بارشیں برساتا چلا جاتا ہے اور اس کے اوپر تمہارا ایک پیسہ بھی خرچ نہیں ہوتا۔ لاؤ اس کو جو دعویٰ کرتا ہے کہ ہم انسانوں کو رزق دیتے ہیں۔ کہتا ہے کہ لاؤ اس کو ہم ذرا اس سے پوچھیں کہ کیا یہ تمہارے اقتدار کی بات ہے کہ رزق پیدا کرسکو؟ رزق کی تقسیم تمہارے ہاتھ میں آئی ہے تو تم نے اسے اپنی مرضی کے مطابق تقسیم کیا ہے رزق تو تم پیدا نہیں کرسکتے۔ کَلَّا (34:27) قطعاً نہیں کرسکتے۔ **بَلْ هُوَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ** (34:27) وہی ہے جو صاحبِ قدرت اور اس کا غلبہ دھاندلی کا استبداد کا نہیں ہے حکمت پر مبنی ہے۔ اور یہ جو چیز میں نے ابھی کہی ہے کہ ساری کائنات پر اس کا یہ نظام جاری و ساری ہے۔ خدا تمام کائنات کا خدا ہے وہ رب العٰلمین ہے اس کا یہ نظام اس کا یہ ضابطۂ قوانین جو قرآن میں بتایا گیا ہے جسے ذکر للعٰلمین کہا گیا ہے تمام انسانوں کے لیے ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ یہ جو توحید ہے یہ جس طرح سے Outer Universe (خارجی کائنات) میں Uniformity of Law (یکسانیتِ قانون) ہے اسی طرح اس ایک کا قانون ساری کائنات کے اوپر جاری و ساری ہے۔

قرآنِ حکیم کی تعلیم کا مقصد اور نصب العین عالمگیر برادری کے لیے ایک ضابطہ حیات عطا کرنا ہے

عزیزانِ من! قرآن کا منتہا یہ ہے کہ تمام نوعِ انسانی ایک ضابطۂ خداوندی کے تابع آجائے تاکہ نہ کوئی انسان کسی انسان کا محکوم رہے نہ کوئی انسان کسی انسان کا محتاج رہے۔ اس نے کہا ہے کہ یہ نظام غالب آکر رہے گا۔ انسان کو ٹھوکریں کھانے دو یہ اس طرف آئے گا اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ جب یہ اس کی وحدانیت ہے تو جیسی یہ سما میں ہے اسی طرح سے ارض کے اندر بھی اس کا قانون جاری و ساری ہے کہا ہے کہ **وَ مَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّةً لِّلنَّاسِ** (34:28) عالمگیر انسانیت کا تقاضا یہ تھا کہ اس قانون کا پہنچانے والا بھی تمام انسانوں کے لیے رسول ہو۔ یہ ختمِ رسالت ہوئی۔ پہلے جتنے بھی رسول آتے رہے وہ مقامی ہوتے تھے قومی ہوتے تھے نسلی ہوتے تھے اس لیے کہ اس زمانے میں انسانوں کے رہنے سہنے کا طریقہ ابھی پس ماندہ ہی تھا Means of Communication (ذرائع مواصلات) بھی نہیں تھے۔ یہاں پہنچنے کے بعد جب یہ دیکھا کہ اب انسانیت میں باہمی ربط و روابط کے تمام ذرائع وسائل عام ہوتے چلے جائیں گے تو انسانیت کو ایک برادری بن کر رہنا ہوگا۔

پوری نوعِ انسانی کی خاطر رسولِ اکرم کو ختمِ نبوت کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز کر دیا گیا

کہا ہے کہ کَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (2:213) ۔سب ایک برادری کی شکل میں رہتے تھے۔اب پوری انسانیت کو ایک امت بنانے کے لیے کہا کہ وَ مَآ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا کَآفَّةً لِّلنَّاسِ (34:28) اے رسول! ہم نے تمہیں تمام نوعِ انسانی کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے۔ کَآفَّةً لِّلنَّاسِ اس لیے کہ بَشِیۡرًا وَّ نَذِیۡرًا (34:28) تو غلط نظام کی تباہ کاریوں کے متعلق Warn (آگاہ و تنبیہ) کرنے والا ہو اور صحیح نظام کی خوشگواریوں کی بشارت دینے والا ہو وَّ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ (34:28) لیکن مشکل یہ ہے کہ انسانوں کی اکثریت ابھی تک اسی میں ہے کہ وہ اس حقیقت کو نہیں جانتی۔ اس کرۂ ارض پہ لکیریں ڈال کر انسانوں کو جو تم نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے' قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے۔ یہ صفحۂ ارض پہ تمہاری لکیریں ڈالی ہوئی ہیں' یہ خدا کی نہیں ہیں۔ پوری انسانیت کی وحدت' خدا کی توحید' اس کے قوانین کی توحید' قانون کے لانے والے رسول کی توحید' یہ ہے جو نظام ہے۔ اب اس کے بعد اُنہوں نے یہ کہا ہے کہ تم جو کہتے ہو کہ اگر ہم مزاحمت کریں گے' تصادم کریں تو فیصلہ میدانِ جنگ میں ہوگا تو وَ یَقُوۡلُوۡنَ (34:29) وہ کہتے ہیں کہ مَتٰی ھٰذَا الۡوَعۡدُ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ (34:29) ۔اگر اس چیز کے لیے سچے ہو تو بتاؤ یہ کب ہوگا؟ ہر ظلم کرنے والا یہ کہتا ہے کہ کہاں ہے تمہارا خدا' لاؤ اس کو وہ کر کے دکھائے۔ یا مظلوم یہ کہتا ہے کہ کتنا عرصہ ظلم سہتے سہتے ہو گیا' کب یہ بات ہوگی؟ کہا ہے کہ قُلۡ لَّکُمۡ مِّیۡعَادُ یَوۡمٍ لَّا تَسۡتَاۡخِرُوۡنَ عَنۡهُ سَاعَةً وَّ لَا تَسۡتَقۡدِمُوۡنَ (34:30) یہ جو مہلت کی گھڑیاں تمہیں ملی ہوئی ہیں' تم اس کی ناشکری کرتے ہو اور جلدی مچاتے ہو۔ کم بختو! کون سا عید کا چاند دیکھنا ہے جو جلدی مچا رہے ہو کہ "29 نوں نظر آجانا چاہیدا ہیگا[1]"۔ او یہ تو تمہارے لیے تباہی ہے' تم تباہی کو بلا بلا کر اپنا گھر دکھاتے ہو۔ غنیمت ہے' شکر کرو کہ کچھ مہلت کا وقفہ ملا ہوا ہے' اس سے بچ جاؤ ورنہ جب وہ وقفہ پورا ہو جائے گا تو خدا کے قانون کے مطابق انقلاب آئے گا تو پھر ایک ثانیے کی بھی تاخیر نہیں ہوگی' نہ وہ قبل از وقت پہلے آجائے گا۔

عزیزانِ من! آگے بات ذرا لمبی ہے' شروع کی تو فوراً ہی وقت ختم ہو جائے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کو آئندہ درس پہ ہی اٹھا رکھنا چاہیے۔ آج ہم سورۃ سبا کی آیت 30 تک آگئے ہیں۔ 31 ویں آیت سے آئندہ درس میں لیں گے۔ اور وہ موضوع بڑا لمبا بھی ہے اور تفصیل بھی چاہتا ہے اس کو ایک ہی نشست میں ہم ختم کریں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ

---

[1] 29 ویں کو ہی نظر آجانا چاہیے۔

پانچواں باب: **سورة سبا** (آیات 31 تا 33)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من ! آج مارچ 1980ء کی 28 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ سبا کی آیت 31 سے ہو رہا ہے: (34:31)۔

سب سے پہلے تو مجھے آپ احباب سے معذرت طلب کرنی ہے۔ پچھلے جمعہ آپ احباب کو یہاں تشریف لانے کی زحمت ہوئی۔ میری کیفیت اس دن یہ تھی کہ بالکل گلا ہی بند ہو چکا تھا اس لیے درس کا ناغہ رہا۔ آج بھی ابھی تک وہ سانپ تو نکل گیا ہے اس کی لکیریں باقی ہیں لیکن جی نہیں چاہا کہ درس کا اور ناغہ ہو جائے۔ ایک ہی ناغے کا اثر ہے کہ میں دیکھتا ہوں کہ سامعین قریباً آدھی تعداد میں رہ گئے ہیں۔

گزشتہ سے پیوستہ درس کا ایک قرض میرے ذمے ہے: دو آیتیں تھیں جن کا حوالہ میں اس وقت نہیں دے سکا تھا۔ ایک تو یہ تھی کہ قرآنِ کریم کی رو سے شفاعت کے معنی ''شہادت'' کے ہیں۔ اس کا حوالہ (43:86) ہے۔ قرآن کی رو سے شفاعت کے معنی ''شہادت دینے کے ہیں، گواہی دینے کے ہیں''۔ اور دوسرا یہ الہ الارض اور الہ السمآء تھا۔ قرآن نے یہ کہا ہے کہ دونوں مقامات میں تمہیں یہ الہ ماننا پڑے گا، خدا کو صاحبِ اقتدار ماننا پڑے گا: خارجی کائنات میں اور انسانوں کی دنیا میں بھی۔ اور اسی لیے اُس نے الہ السمآء اور الہ الارض الگ الگ بھی یہ کہا ہے۔ اس الہ السماء اور الہ الارض کا حوالہ (43:84) ہے۔

جہنم میں لیڈرانِ قوم، حکمران، محکوم اور مذہبی پیشوائیت کے مقلدین کے باہمی مکالمات کی اہمیت ذہن سے محو کر دی گئی

اب آیئے آج کے موضوع کی طرف۔ مجھے ان احباب کا افسوس رہے گا جو آج تشریف نہیں لائے۔ موضوع بڑا اہم ہے، میں نے اس دن بھی یہ کہا تھا۔ موضوع ہے جہنم میں اہلِ جہنم کا آپس میں مکالمہ۔ یہ مکالمہ کن کے درمیان ہے؟ یہ ہے لیڈران اور ان کے Followers (پیروکاروں) کے درمیان، حکمران اور محکوم کے درمیان، مذہبی پیشوا اور ان کے مقلدین کے درمیان۔ یہ سب جہنم میں ہیں اور آپس میں ایک دوسرے کو الزام دے رہے ہیں کہ ہم تمہاری وجہ سے جہنم میں ہیں۔ یہ ہے اہم موضوع لیکن ان تمام موضوعات کی اہمیت خاص طور پر ذہنوں میں کم ہی نہیں کر دی گئی بلکہ محو ہی کر دی گئی ہے۔ یہ اس بات سے کیا ہے کہ صاحب! یہ آخرت میں جا کر جہنم آئے گا، وہاں یہ کچھ باتیں ہونگی۔ جو جہنم میں جانے والے ہونگے ان کا ہم سے کوئی تعلق اور واسطہ نہیں ہے۔ انسانوں کے اندر یہ چیز ہے کہ جو بھی جزا یا سزا فوراً سامنے آجائے اس کا تو اثر ہوتا ہے اور جس میں تاخیر ہو جائے اس کا اثر کم ہو جاتا ہے۔ یہ ہے جسے Justice Delayed is Justice Denied کہتے ہیں یعنی عدل کرنے میں تاخیر ہو جائے تو اسے عدل کہا ہی نہیں جا سکتا۔ سمجھ لیجیے کہ وہ عدل ہے ہی نہیں۔ وہ اسی لیے ہے کہ اس عدل کے نتیجے میں جو کچھ بھی ہونا ہے، اگر وہ جیسے کہ ہمارے ہاں ہوتا ہے کہ دس سال پہلے کبھی کسی نے کسی کو قتل کر دیا، چوری کر دی، تو دس سال تک بھول بھلا جاتے ہیں، وہ اگر اس وقت کے بعد پھانسی بھی پا جاتا ہے تو کسی کے ذہن میں بھی نہیں ہوتا کہ کسی نے کبھی قتل کیا تھا اور آج اس کو پھانسی ملی ہے۔ اس اعتبار سے یہ جو چیز ہے، میں ابھی آگے چل کر عرض کرونگا کہ یہ خاص طور پر ذہنوں میں بٹھا دی گئی ہے کہ یہ یہاں کی دنیا کے معاملات نہیں ہیں، یہ آخرت کے معاملات ہیں۔ جنت بھی وہیں ہے، جہنم بھی وہیں ہے۔ آخرت کی جنت اور جہنم پر ہمارا ایمان ہے۔ وہاں کی جو زندگی ہے وہ ایمان بالآخرت کے تابع ہے، اس کے بغیر تو کوئی شخص مسلمان ہی نہیں ہو سکتا لیکن یہ جنت اور جہنم وہیں نہیں ہے، آخرت میں ہی نہیں ہے، اسی دنیا میں بھی ہے۔ لہٰذا یہ جو چیزیں جہنم وغیرہ کے متعلق یا جنت کے متعلق ہوں وہاں کی باتیں، تو قرآن کہتا ہے کہ ہم صرف تمثیلاً بیان کرتے ہیں۔ تمہارے شعور میں یہ آ ہی نہیں سکتا کہ فی الحقیقت وہ ہیں کس طرح کی۔ اس لیے یہ تو ہمارے شعور سے بھی بالا ہے کہ وہاں کے جہنم میں یہ Leaders (لیڈران) اور ان کے عوام، یہ حکمران اور یہ محکوم، یہ آقا اور یہ غلام اور یہ مذہبی پیشوا اور ان کے مریدوں کی آپس میں کیا باتیں ہونگی۔

جنت اور جہنم کا آغاز اور واعظ

یہ جہنم اور جنت' جیسا میں نے کہا ہے' وہیں مرنے کے بعد کا نہیں ہے' یہ یہاں کا بھی ہے' یہ یہیں سے شروع ہو جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے جو تفصیلات بتائی ہیں آپ دیکھیں گے کہ وہ یہاں کے جہنم کے متعلق ہیں۔ زیادہ قریب تر سمجھ میں آنے والی بات ہے ورنہ جیسا میں نے عرض کیا ہے بات اگر یہاں کی زندگی کی نہ ہو' صرف وہیں کی زندگی کی ہو' تو وہ زیادہ اثر انگیز نہیں ہوتی۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہ واعظ جہنم کے عذاب وغیرہ سے بہت ڈراتے ہیں لیکن وہ ڈرا اتنے عرصے تک ہی رہتا جتنے میں وہ وعظ کہہ رہا ہوتا ہے۔ اس وقت تک تو لوگ رو رہے ہوتے ہیں' جونہی وعظ ختم ہوا یہ باہر آئے اور معاملہ ختم ہوا' وہاں تو جہنم نظر نہیں آتا۔ اگر وہیں جہنم نظر آ رہا ہو تو سوال ہی نہیں ہے کہ پھر اس کو بھول پائے۔

پھر اس قسم کے قصے چلے کہ جس مصیبت میں ابھی ایک رات باقی ہو' اس سے ڈرنے کی کیا بات ہے۔ اور ہمارے ہاں جو کہا کرتے ہیں کہ "ایہہ جگ مٹھا اگلا کن ڈٹھا"۔ یہ وہی چیزیں ہیں' ان کا اثر نہیں ہوتا:

اب تو آرام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے

اس سے بھی زیادہ شریر سا شعر ہے۔ واعظ کے ساتھ بات ہو رہی ہے

وہ قصور و حور بجا بجا
یہ شباب و حسن غلط غلط
مگر اس کا کوئی جواب دے
کہ یہ نقد ہے وہ ادھار ہے

اگر یہ معلوم ہو جائے کہ یہ ادھار نہیں ہے' یہ بھی نقد ہے تو اس کا اثر بھی ہو۔ جہنم کا عذاب وہیں کا ہی نہیں ہے' یہاں سے ہی جہنم شروع ہو جاتا ہے۔ جہنم اور اس کے عذاب کی تفصیل تو بہت طول طویل ہے لیکن قرآن نے اس کو دو لفظوں میں سمٹا کر رکھ دیا ہے۔ یہ یہاں کا جہنم ہے اور آنے والی زندگی کا بھی جہنم ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک دنیائے انسانیت کا بلند ترین مقام احترامِ آدمیت ہے اور اس سے محرومی سب سے بڑا جہنم

پہلے دیکھیے کہ جہنم میں سب سے شدید ترین عذاب جسے قرآن نے کہا ہے وہ کیا چیز ہے لیکن اس سے پہلے یہ سمجھ لیجیے کہ بلند ترین مقام جو انسانیت کا قرآن نے کہا ہے، وہ کیا ہے؟ یہ ہے شرفِ انسانیت، تکریمِ آدم، عزتِ نفس۔ یہ ہے انسانیت۔ شرفِ انسانیت یا تکریمِ آدمیت یا عزتِ نفس میں کہیں فرق آجائے تو اسے ذلت کہیں۔ اگر یہ آجائے تو یہ جہنم کی بنیادی خصوصیت ہے۔ کہا ہے کہ جہاں انسان اپنے شرف اور تکریم سے محروم ہو جائے، جہاں وہ ذلیل سمجھا جائے تو یہی جہنم ہے۔ اور دیکھیے کہ قرآنِ کریم یہاں کے جہنم کو کس انداز سے کہتا ہے: فَمَا جَزَآءُ مَنۡ یَّفۡعَلُ ذٰلِکَ مِنۡکُمۡ اِلَّا خِزۡیٌ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا (2:85)۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ اور ہو ہی نہیں ہوسکتا کہ ایسی قوم کی حال کی زندگی بھی ذلت اور رسوائی کی زندگی ہو۔ اوپر آیا ہوا ہے کہ اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ الۡکِتٰبِ وَ تَکۡفُرُوۡنَ بِبَعۡضٍ (2:85)۔ تم کتاب کے ایک حصے پہ ایمان رکھتے ہو اور دوسرے حصے سے انکار کرتے ہو۔ کہا ہے کہ جن کی روش یہ ہوگی اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ اِلَّا خِزۡیٌ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا (2:85) اس دنیا کی زندگی میں ذلت اور خواری ہے۔ شدید ترین عذاب یہ ہے کہ انسان ذلت محسوس کرے، اسے ذلیل کیا جائے۔ آگے کہا ہے کہ وَ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ یُرَدُّوۡنَ اِلٰۤی اَشَدِّ الۡعَذَابِ (2:85) اور اس کے بعد قیامت کی زندگی میں اس سے بھی شدید عذاب ہے تو گویا یہ خِزۡیٌ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا (2:85) عذاب ہے۔

عزیزانِ من! انسان بھوک بھی برداشت کرسکتا ہے، تنگی بھی برداشت کرسکتا ہے، مصائب بھی برداشت کرسکتا ہے۔ اگر اس کو اپنی انسانیت کا احساس ہے تو اگر عزتِ نفس پہ حرف آتا ہے تو یہ ناقابلِ برداشت ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم خِزۡیٌ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا (2:85) کو اس دنیا کے جہنم کا شدید ترین عذاب قرار دیتا ہے۔ اور اسی کے لیے دوسرے مقام پہ ہے کہ مومن دعا مانگتے ہیں کہ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ ہٰذَا بَاطِلًا سُبۡحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (3:191)۔ اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے اس کارگہ ہستی کو نہ تو عبث اور بیکار پیدا کیا ہے اور نہ ہی تخریبی نتائج مرتب کرنے کے لیے۔ تیری ذات اس سے بہت بعید ہے کہ تو کسی شے کو بے مقصد اور بلاغرض و غایت یا تخریبی نتائج مرتب کرنے کے لیے پیدا کردے تو ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہم تباہ کن عذاب کی زندگی سے محفوظ رہیں۔ یہ دعا مانگی جارہی ہے کہ آرزو یہ ہے کہ عذاب النار سے ہماری حفاظت کر۔ اس لیے کہ رَبَّنَاۤ اِنَّکَ مَنۡ تُدۡخِلِ النَّارَ (3:192) اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو جس کو جہنم میں ڈال دے یا جو جہنم کی زندگی بسر کررہا ہو تو اب سوال یہ ہے کہ

وہ جہنم ہوتی کیا ہے؟ کہا کہ فَقَدۡ اَخۡزَیۡتَهٗ (3:192) تو وہ ذلیل ہو گیا' اس کی عزتِ نفس ختم ہو گئی۔ یہاں یہ عذاب النار پہلے کہا ہے اور خود ہی اس کی یہ تفسیر کر دی ہے کہ فَقَدۡ اَخۡزَیۡتَهٗ (3:192) وہ ذلیل ہو گیا انسان شرفِ انسانیت سے محروم ہو گیا' عزتِ نفس باقی نہ رہا' ذلیل کیا گیا' ذلیل سمجھا گیا' اس نے اپنے آپ کو بھی ذلیل محسوس کرنا شروع کر دیا۔ جہنم کی سب سے بڑی نشانی یہ خِزۡیٌ فِی الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا(2:85) بتائی ہے۔ یہ ہے النار۔

کسی انسان کا کسی انسان کے آگے محکوم ہو جانا' یہی ملوکیت ہے اور یہی جہنم ہے

عزیزانِ من! اسے سمجھ رکھیے کہ جس معاشرہ میں کسی ایک ابنِ آدم کو بھی ذلیل کیا جائے' خدا اس معاشرے سے روٹھ جاتا ہے اور اُسے ہلاکو اور چنگیزوں کے حوالے کر دیتا ہے کہ تم جاؤ اور یہاں کی پوری قوم کی عزتِ نفس کو مٹا کر اس کو ذلیل کر دو۔ خدا کا بسیرا اس معاشرے میں ہوتا ہے' جہاں کے گورنر کی زبان پہ ایک دفعہ سہواً ایک غیر مسلم ذمی کے لیے نکل گیا تھا: خزیتہ' خدا تجھے ذلیل کرے' اُس کے بعد جب احساس ہوا ہے تو کانپتے ہوئے' روتے ہوئے' بارگاہِ خلافت میں' حضرت عمرؓ (581-644/45) کے پاس آ گئے اور اپنا استعفیٰ داخل کر دیا۔ بہتیرا سمجھایا۔ یہ صحابیؓ بڑے ہی دیانتدار اور بڑے ہی قابل گورنر تھے۔ بہت سمجھایا کہ بابا! کوئی بات نہیں' یہ سہو ہے۔ کہنے لگے کہ سہو کی بات نہیں ہے' جو شخص کسی انسان کی عزتِ نفس پہ ہاتھ ڈالتا ہے' اس کی زبان سے ذلت کا لفظ نکلتا ہے' تم اسے گورنر کہتے ہو' میرے نزدیک وہ انسان کہلانے کا بھی مستحق نہیں ہے۔ اُنہوں نے دوبارہ گورنری نہیں لی۔ ہمارے ہاں کہا جاتا ہے کہ صاحب! ملوکیت اسلام میں حرام ہے۔ ملوکیت کے معنی ایک تو وراثتی بادشاہت ہے لیکن اس کے یہی معنی نہیں ہیں۔ کسی دوسرے انسان کا کسی انسان کے آگے محکوم ہو جانا' یہ ملوکیت ہے۔ یہی جہنم ہے۔ انسانیت کے تو معنی ہی مساواتِ انسانیہ ہے جو مساوات میں ہیں' وہ ایک جیسے شرفِ انسانیت کے مالک ہیں۔ اس کے برعکس ایک کا آقا دوسرے کا غلام' ایک کا حاکم دوسرے کا محکوم بن جانا تکریمِ انسانیت کے خلاف ہے۔ اور یہی چیز ہے جسے قرآن نے ملوکیت قرار دیا ہے۔ سورۃ النمل میں وہ بڑے لطیف انداز میں ہے۔ بات تو ملکہ سبا کی زبان سے آئی ہے' وہ بڑی عجیب بات ہے۔ کہا ہے کہ قَالَتۡ اِنَّ الۡمُلُوۡکَ اِذَا دَخَلُوۡا قَرۡیَةً اَفۡسَدُوۡهَا (27:34) اُس نے اپنے کیبنٹ کے مشیروں سے کہا کہ یاد رکھو! تمہیں ملوکیت کا پتہ نہیں' کیا کیا کرتی ہے۔ جب بھی وہ کسی ملک میں آتی ہے تو الٹ پلٹ کر کے رکھ دیا کرتی ہے۔ یعنی وَجَعَلُوۡۤا اَعِزَّةَ اَهۡلِهَاۤ اَذِلَّةً (27:34) وہاں کے صاحبِ عزت لوگوں کو ذلیل کر دیا کرتی ہے۔ یہ ہے ملوکیت۔

عزیزانِ من! یہ کچھ فارم آف گورنمنٹ کا سوال نہیں ہے کہ اس کی شکل کیا ہونی چاہیے۔ وراثتی بادشاہت ہو' ڈکٹیٹر شپ ہو'

آمریت ہو' جمہوریت ہو' پارلیمنٹری نظام ہو Presidential (صدارتی) نظام ہو' یہ کچھ نہیں ہے۔ اس کی بنیاد یہ ہے کہ کوئی بھی آپ کے ہاں شکل ہو' اگر اس میں انسان کی تکریم اور عزت بحیثیت انسان ہونے کے نہیں ہے تو وہ ملوکیت ہے اور وہ معاشرہ جہنم کا معاشرہ ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ لَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ (17:70) پوری نوعِ انسانی' آدم آدمی انسان کو انسان ہونے کی جہت سے ہم نے یکساں واجب التکریم پیدا کیا ہے۔ کسی انسان کو ذلیل سمجھنا' ذلیل کرنا' اس کو شرفِ تکریمِ انسانیت سے محروم کر دینا خدا کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ خدا کہتا ہے کہ ہم نے اس کو واجب التکریم پیدا کیا ہے اور وہ کہتا ہے کہ ہم اس کو الٹ کر رکھ دیں گے۔ سوچتے ہو آپ کہ یہ کیا ہے؟

دنیا کی یہ جہنمی زندگی ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کے باہمی گٹھ جوڑ کا نتیجہ ہے

میں نے عرض کیا ہے کہ جس معاشرے میں یہ کیفیت ہو کہ وہاں انسانیت کی تذلیل ہوتی ہو' وہی معاشرہ ہے جسے جہنمی معاشرہ کہا جاتا ہے۔ اور اس کے لیے آپ کو اتنی لمبی قیامت کی جو تاریخ ہے' اسے اس پر نہیں اٹھا رکھنا چاہیے۔ میں آگے چل کر ابھی عرض کرونگا کہ ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کا گٹھ جوڑ ہوتا ہے۔ مذہبی پیشوائیت کا سب سے بڑا کامیاب حربہ یہ ہوتا ہے کہ جہنم اور اس کے عذاب کو قیامت پر اٹھا رکھیں۔ یہاں کے جہنم کو سامنے آنے ہی نہ دے۔ آپ نے وعظ سنے ہونگے' آپ نے ان کے ہاں سے خطبے سنے ہونگے۔ آپ دیکھیں گے کہ یہ ہمیشہ قبر سے ہی عذاب شروع کرتے ہیں یعنی اس دنیا سے جونہی الگ ہوا اور عذاب شروع ہوا۔ اور وہاں سے پھر قیامت تک کا جہنم لے جاتے ہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ قیامت اور آخرت کی زندگی پر تو ہمارا ایمان ہے لیکن یہ اس دنیا کے اندر جو عذاب ہے' اس دنیا کا جو جہنم ہے' اس کا کبھی ذکر نہیں کریں گے۔ اس کا ذکر کریں گے تو وہ جو شرفِ انسانیت سے' عزت سے' اور تکریم سے محروم ہو رہی ہے' اُسے احساس پیدا ہو جائے گا کہ ہم تو جہنم میں ہیں۔ اب بات جہنم کی آئی ہے تو پھر سامنے آنا چاہیے۔

لفظِ جہنم کی نوعیت و ماہیت

میں نے عرض کیا ہے کہ یہ الفاظ ہی اس سامی النسل قوم کے ہیں' ان الفاظ کے اندر سارے معانی پوشیدہ ہیں۔ جہنم کا یہ لفظ کہاں سے آیا؟ یہ جنہیں ہم بنی اسرائیل کہتے ہیں' یہ اسلام سے پہلے بنی اسرائیل کی قوم تھی' جس کے ہاں یہ سارے انبیائے کرام آتے تھے۔ ان کی عبرانی زبان تھی اُسی میں یہ سب کچھ تھا۔ یہ جو بیت المقدس وغیرہ کی ساری وادیاں ہیں' ان میں وہ بستے تھے۔ انہی کے ہاں پہلے یہ لفظ تھا قرآن میں وہیں سے یہ آیا ہے۔ بیت المقدس کے شمال میں ایک وادی [1] تھی۔ جہنم جِیُ ھَنُّوم ہے۔ جِیُ

---

[1] یروشلم کے جنوب میں یہ ایک مشہور وادی تھی۔

کے معنی وادی کے ہوتے تھے۔ ھَنُّوم ایک آدمی کا نام تھا' جس کی وادی کہلاتی تھی۔ اس وادی میں ایک دیوتا مولوک (عمونیین کا دیوتا) تھا۔ وہ نہایت خونخوار قسم کا' قہرمانیت اور استبداد کا مجسمہ تھا۔ آپ لوگوں نے تو کبھی دیکھا نہیں ہوگا کہ ہندوؤں کی وہ جو دیوی ہوتی تھی ''بھیرو دیوی یا کالی ماتا'' اس کا سارا منہ خون سے سرخ ہوتا تھا' زبان باہر نکلی ہوئی' آنکھیں خشمگیں' چار ہاتھ اور چاروں میں مختلف قسم کے اوزار پکڑے ہوئے' گلے میں انسانوں کی کھوپڑیوں کا ہار ڈالا ہوا۔ ان کے مندر میں' یہ دیوتا یا دیوی ہوتی تھی' جس کی پرستش ہوتی تھی۔ یہ اسی قسم کا وہاں ایک دیوتا تھا۔ اس دیوتا کے حضور انسانوں کو ذبح کیا جاتا تھا اور پھر ان کو جلا کر اس کی راکھ اس دیوتا کے حضور بھینٹ چڑھائی جاتی تھی۔ جہنم یعنی جیِ ھَنُّوم بمعنی وادیٔ ہنوم جہاں انسان ذبح کیے جاتے اور انہیں جلایا جاتا۔

جہنم کی آگ دلوں کو لپیٹ لیتی ہے

جہنم اس معاشرے کا نام ہے جس میں انسانیت ذبح کی جائے اور جلا کر دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھا دی جائے خواہ یہ دیوتا بادشاہ کی شکل میں ہو' حکمراں کی شکل میں ہو یا پیشواؤں کی شکل میں۔ عزیزانِ من! یہ ہے جہنم۔ اسی لیے قرآنِ کریم نے جو بتایا ہے کہ یہ جہنم ہے جس میں شرفِ انسانیت کی سوختنی ❶ قربانی پیش کی جائے' جس میں اربابِ اقتدار کو معبود بنالیا جاتا ہے۔ اسی لیے قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ . الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْئِدَةِ (104:6.7) یہ تو وہ آگ ہے جس کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیا کرتے ہیں۔ یہ جسموں کو جلانے والی بات نہیں ہوتی' اس کے شعلے دلوں کو لپیٹتے ہیں۔

اب ہم اس کے قریب آتے جارہے ہیں جس معاشرے کے اندر انسانیت کی تذلیل ہو۔ اور ابھی میں عرض کرونگا کہ اسے محسوس کون کرتا ہے۔ اور اس کا احساس ہو تو پھر سوچیے کہ اس کا قلب کس قسم کے جہنم کے شعلوں کی آماجگاہ بنا رہتا ہے۔ سوچیے قرآن کی' جہنم کی تفصیل کہ اس کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیا کرتے ہیں۔ پہلی چیز یہ آگئی کہ جس معاشرے کے اندر کسی ایک انسان کی بھی عزتِ نفس محفوظ نہ رہے' شرفِ انسانیت سوختنی قربانی کی طرح بھینٹ چڑھا دی جائے' تکریمِ انسانیت سے محروم ہو جائے' تو وہ معاشرہ جہنم کا معاشرہ ہوتا ہے۔ جہنم کہتے ہی اسے ہیں کہ وہاں دیوتے کا نام مولوک ❷ ہوتا ہے۔

---

❶ سوختنی (فارسی' صفت): جلنے یا جلانے کے لائق۔

❷ یہ زمانہ قدیم میں عمونیین کے دیوتا کا نام تھا، جس کے حضور آدمیوں کو جلا کر قربانی پیش کی جاتی تھی (پرویزؒ: لغات القرآن (جلد اوّل)' ادارہ طلوعِ اسلام' لاہور' 1960' ص۔454)

انسانیت کی دنیا میں ایک انسان کی دوسرے انسان پر حکمرانی سب سے بڑا جہنم ہے

آپ کو پتہ ہے کہ قرآنِ کریم میں جہنم کے داروغے کا نام ''مالک'' ہے یعنی انسان کا دوسرے انسان پر ماسٹر (آقا) ہونا۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ چیزیں کہنا کہ صاحب! اسلام میں ملوکیت نہیں ہے' اصل تصور (Conept) کو سامنے نہیں لاتا۔ ملوکیت کے معنی بس یہ کر دیئے کہ وہ وراثتی حکومت ہے' بادشاہت نہیں ہے۔ اتنے کا نام ملوکیت نہیں ہے۔ جہنم کے داروغے کا نام ''مالک'' ہے' وہاں سے ملوکیت ہے۔ انسانوں کا انسانوں پہ حاکم ہونا' ان کے تابع فرمان ہونا' یہ ہے جہنم' اس کے داروغے کا نام مالک ہے۔ جہاں بھی کوئی انسان دوسرے انسان کا مالک ہو جائے وہ جہنم ہے۔ کہا ہے کہ یہ **خِزۡیٌ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا**(2:85) ہے۔ جہاں حال کی زندگی بھی ذلت اور رسوائی کی زندگی ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ وہ تو جہنم کی پہلی نشانی 'ذلیل ہو جانا' بتاتا ہے:۔ اب قرآن بتاتا ہے کہ آؤ پہلے تمہیں بتائیں قومیں قوموں کے مقابلے میں کیسے ذلیل ہوتی ہیں۔ زندگی ارتقائی منازل طے کر کے آگے بڑھنے اور اوپر بلند ہونے کا نام ہے۔ اسے ذہن میں رکھیے۔ مختلف قوموں میں' اس دنیا میں' اس مصافِ حیات میں' ایک Race (دوڑ) لگی ہوئی ہوتی ہے۔ اس مصافِ زندگی میں پیچھے رہ جانے والی قومیں بھی ہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ میں قرآن کی رو سے جہنم کے نمایاں خدوخال بتا رہا ہوں۔ پہلی چیز تو آپ نے یہ سوچنی ہے کہ جس معاشرے کے اندر بھی کسی ایک فرد کی بھی عزتِ نفس محفوظ نہ رہے' وہ ذلیل ہو جائے' وہ جہنم ہے۔

قوم کے مقابلے میں قوم کی تذلیل کے تقابلی اسباب

قوموں کے مقابلے میں آپ آیئے۔ قرآن کہتا ہے کونسی قومیں ہیں جو جہنم کے اندر ہوتی ہیں۔ کہا ہے کہ **لَا جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ** (16:62) اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ ان کا انجام تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ پیچھے سے چلا آ رہا ہے کہ یہ کون ہیں؟ کہا ہے کہ یقین مانو کہ یہ قوم جہنم میں ہے۔ کون ہے یہ قوم؟ کہا کہ **وَ اَنَّهُمۡ مُّفۡرَطُوۡنَ** (16:62) یہ قومیں ہیں کہ دوسری قومیں جن سے آگے چلی جائیں اور یہ پیچھے رہ جائیں۔ یہ پیچھے رہ جانے والی قوم' اپنے طور پہ تو غریب بھی ہو سکتی ہے' اس میں مادی وسائل کی کمی بھی ہو سکتی ہے۔ اس آگے بڑھنے والی قوم کی نگاہوں میں یہ قوم ذلیل ہو جاتی ہے۔ کوئی ایسی قوم کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔

عزیزانِ من! ارتقا کی میزان میں یہ آگے بڑھ جانا ہے' میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن نے بتایا ہے کہ پیچھے رہ جانے والی جو قوم ہے وہ جہنم میں ہے۔ جنت کے متعلق ساتھ ہی' تقابل میں' بات زیادہ بہتر طور پر سمجھ میں آتی ہے۔ کہا ہے کہ **وَالسّٰبِقُوۡنَ السّٰبِقُوۡنَ**

(56:10) اہلِ جنت کی نشانی یہ ہے کہ مصافِ حیات میں وہ تمام قوموں سے آگے جانے والی قوم ہوگی۔ دوسری جگہ ہے' جہاں کہا ہے کہ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (83:26) اہلِ جنت کی نشانی یہ ہے کہ جب بھی کوئی اس کے مقابل میں آئے یہ اس سے بہت آگے چلی جائے۔ وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ (3:139) اہلِ جنت وہ ہیں جو تمام کے اوپر ہوں' جو بلند تریں مقام کے اوپر ہوں۔ قرآن نے غالباً سورۃ الفرقان میں غرفۃ کی مثال دی [1] ہے۔ عجیب الفاظ ہیں اس قوم کے بھی اور قرآن کا انتخاب بھی۔ غرفۃ: ایسی ندی ہے جس میں پانی کی افراط ہو' اس میں رفتار کی تیزی ہو' بلندیوں کی طرف بھی چلی جائے تو رکے نہیں۔ قرآن اہلِ جنت کی نشانیاں بتا رہا ہے۔ جہنم کے تو معنی ابھی بتا دیئے: وادیٔ ھنوم کہ جس میں انسان کو ذبح کر کے' اس کی انسانیت جلا کر' راکھ کی بھینٹ مالک کے سامنے پیش کی جاتی تھی۔ آگے بڑھنے کے مقابلے میں قرآن میں دوسرا لفظ جحیم آیا ہے۔ جحیم کے معنی ہیں' کہیں رک جانا'۔ جو کہیں بھی رک گیا باقی قومیں آگے چلی گئیں تو وہ جہنم میں ہے۔

جس قوم کی زندگی میں روانی نہ رہے' وہ جہنم کی نذر ہو جاتی ہے

زندگی تو جوئے رواں ہے۔ اس کی روانی ختم ہوتی ہے تو یہ ندی سے جوہڑ بن جاتی ہے۔ اور جب یہ جوہڑ بنتی ہے تو پانی تو وہی ہوتا ہے' صرف اس کی روانی ختم ہوتی ہے۔ آہستہ آہستہ پانی میں سڑاند پیدا ہوتی ہے۔ یہ جحیم ہے یعنی زندگی میں کسی ایک مقام پہ رک جانا۔ رک جانے کا نام ہی پیچھے رہ جانا ہے کیونکہ باقی قومیں تو آگے بڑھ رہی ہوتی ہیں۔

مذہبی پیشوائیت کی تکنیک

میں نے عرض کیا تھا کہ مذہبی پیشوائیت کی تکنیک یہ ہوتی ہے کہ قوم کو اس باب میں پختہ تر کر دیا جائے کہ یہ جہنم اور جنت یہاں اس دنیا میں نہیں ہے' یہ مرنے کے بعد وہاں آخرت میں جا کر آئے گی۔ یہ مذہبی پیشوا تو ملوکیت کے آلۂ کار ہوتے ہیں۔ اور میں نے یہ عرض کیا ہے کہ قرآن نے جو یہ بتایا ہے کہ خِزْیٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ یُرَدُّوْنَ (2:85) تو اُس نے دو جہنمیں یہیں بتا دی ہیں۔ اس دنیا کی زندگی میں ذلت و خواری کی زندگی اور اگلی دنیا میں جو یہاں کا ذلیل ہے وہ وہاں کا مقرب نہیں ہو سکتا' وہ وہاں کا بھی ذلیل ہے۔ اور یہ جو چیز ہے' میں نے عرض کیا ہے کہ وہیں کی جہنم نہیں ہے' یہاں کی جہنم بھی ہے۔ قرآن واضح کیے چلا جاتا ہے۔ کہا ہے کہ یَسْتَعْجِلُوْنَکَ بِالْعَذَابِ (29:54) یہ لوگ کہتے ہیں کہ وہ جہنم کہاں ہے' وہ عذاب کہاں ہے' وہ سزا کہاں ہے جس کی تم دھمکیاں دیتے چلے آتے تھے؟ کہا ہے کہ انہیں کون بتائے کہ

---

[1] (25:75)

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا

علامہ اقبالؒ کی نظر میں موجودہ جہنم کی کیفیت اور واعظ کا بیان

قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ وَ اِنَّ جَهَـنَّمَ لَمُحِيۡطَةٌ ۢ بِالۡكٰفِرِيۡنَ (29:54) جہنم تو ان کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے اور یہ ہیں کہ يَسۡتَعۡجِلُوۡنَكَ بِالۡعَذَابِ (29:54) جلدی مچاتے ہیں کہ لاؤ کہاں ہے وہ عذاب۔ تم پوچھتے ہو کہ کہاں ہے؟ کہا کہ وَ اِنَّ جَهَـنَّمَ لَمُحِيۡطَةٌ ۢ بِالۡكٰفِرِيۡنَ (29:54)۔ اس سے انکار کرتے ہو وہ تو چاروں طرف سے تمہارے اوپر محیط ہے۔ عزیزانِ من! جس جہنم کے متعلق کہا ہے کہ یہاں تمہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے' کیا وہ جہنم وہی ہوگی جو قیامت میں آئے گی؟ وہ تو آئے گی۔ یہاں لَمُحِيۡطَةٌ بِالۡكٰفِرِيۡنَ آیا ہے۔ کہا کہ یہ چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تو ہے لیکن انہیں نظر نہیں آتی۔ وَمَا هُمۡ عَنۡهَا بِغَآئِبِيۡنَ (82:16) انہیں وہ نظر نہیں آتی مگر یہ اُس کی نگاہوں سے غائب نہیں ہیں۔ میں ابھی عرض کرونگا کہ نظر آتی ہے۔ وہی کہنے والا جو ہمارے دور کا ❶ تھا' اس اعتبار سے تو ہم خوش بخت تھے' خوش بخت کیا تھے ہم تو وہی محروم کے محروم رہے جو اس نے کہا تھا کہ

سخن زنامہ و میزاں دراز تر گفتی ❷

واعظ سے کہہ رہا ہے کہ میں نے تمہارا وعظ سنا ہے: قیامت میزان نامۂ اعمال جہنم۔ تم نے وہاں کے بڑے لمبے چوڑے وعظ کر دیئے۔

ہزار حیف نہ بینی قیامتِ موجود

او اندھے! اس قیامتِ موجود کو بھی تو دیکھ لے۔ اس نے اور زیادہ حسین الفاظ میں کہا ہے:

زدوزخ واعظِ کافر گرے گفت

واعظ' جس کا کام ہی دوسروں کو کافر بنانا ہے' دوزخ کے متعلق بڑی لمبی چوڑی داستان بیان کر رہا تھا اور بڑی دل پذیر اور بڑی دلچسپ اور بڑی دل نظیر تھی:

---

❶ یہ اشارہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) کی طرف ہے۔

❷ سخن زنامہ و میزاں دراز تر گفتی۔ ہزار حیف نہ بینی قیامت موجود (اقبالؒ)

حدیثے خوشتر از وے کافرے گفت

وہیں کہیں ایک کافر بھی کھڑا تھا۔ اُس نے ایک بات کہی' وہ بات اس سے کہیں زیادہ دل پذیر تھی جو اس نے کہی۔ اُس نے کہا

نداند آں غلام احوالِ خودرا

غلام کے لفظ نے ساری بات واضح کر دی: یہ غلام وہاں کی جہنم کی باتیں کر رہا ہے' اپنی طرف دیکھ ہی نہیں رہا

کہ دوزخ را مقامِ دیگرے گفت

یہ اندھا' یہ غلام' جو دوزخ کو دوسروں کا مقام بتا رہا ہے' اس کو اپنے احوال کا کچھ پتہ ہی نہیں ہے

کہ دوزخ را مقامِ دیگرے گفت

کیا خوبصورت بات ہے!

زدوزخ واعظِ کافر گرے گفت

حدیثے خوشتر از وے کافرے گفت

وہ خوش تر از وے یہ تھی کہ

نداند آں غلام احوالِ خودرا

کہ دوزخ رامقامِ دیگرے گفت [1]

نگاہ بصیرت رکھنے والا تو یہاں جہنم کو اپنی آنکھوں سے بخوبی دیکھ رہا ہے

ابھی کہا ہے کہ یہ جہنم تو انہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے' تم نہیں دیکھ رہے' وہ تو تمہیں دیکھ رہی ہے۔ کہا ہے کہ یہ نہیں ہے کہ وہ ہر ایک نگاہ سے یہاں پنہاں ہی رہے گی' پوشیدہ ہی رہے گی۔ **وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى** (79:36) جو آنکھیں کھول کر دیکھے گا' جنت ابھار کے ہم اس کے سامنے لے آئیں گے۔ یہاں لِمَنْ يَّرٰى آیا ہے یعنی جو آنکھیں کھول کر دیکھے گا۔ عزیزانِ من! قرآن ہے۔ جو دیدۂ بینا ہے' جس کا احساس بالکل مردہ ہی نہیں ہوگیا' وہ اپنی آنکھوں سے اس جہنم کے شعلوں کو دیکھ رہا ہوگا۔ جس کے ذہن میں ابھی شرفِ انسانیت اور تکریمِ آدمیت کی کچھ اہمیت باقی ہے اور وہ اس کو ذبح ہوتا ہوا دیکھ رہا ہوتا ہے' اس کے

---

[1] اقبالؒ: ارمغان حجاز' کلیاتِ اقبال' شیخ محمد بشیر اینڈ سنز' لاہور' ص۔ 772۔

سامنے تو جہنم کے شعلے لپک لپک کر آ رہے ہوتے ہیں۔ یہ **بُـرِّزَتِ الْـجَحِیْمُ لِمَنْ یَّرٰی** کیا الفاظ ہیں! عزیزانِ من! میں کیا عرض کروں ایک ایک لفظ پہ جان فدا کرنے کو جی چاہتا ہے۔ مستتر اور بارز ہمارے ہاں گرامر میں ہیں۔ چھپی ہوئی چیز کی صورت میں یہ نہیں ہوتا کہ وہ موجود نہیں ہوتی' موجود ہوتی ہے مگر ہماری نگاہوں سے چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کا تو وجود اس وقت بھی ہوتا ہے جب تم نہیں دیکھ رہے ہوتے۔ بارز ہو جاتی ہے' نمودار ہو جاتی ہے تمہاری آنکھوں کے سامنے۔ جو اپنی آنکھوں کو کھول لیتا ہے جہنم تو اس کے سامنے نمودار ہو جاتی ہے' اس کو کچھ Difficulty (مشکل) نہیں ہوتی۔ عزیزانِ من! وہ جہنم کو دیکھ نہیں رہے ہوتے جن کا شرفِ انسانیت کا احساس ہی مٹ چکا ہوتا ہے۔ ان کو اس کا احساس ہی نہیں ہوتا کہ یہ جہنم ہے اور اس سے انہیں نکلنا بھی چاہیے' وہ تو یہی کہتے ہیں کہ

اب تو آرام سے گزرتی ہے

شرفِ انسانیت سے محروم قوم آخر کار احساس کی نعمت سے بھی محروم ہو جاتی ہے

وہ اس ''اب تو آرام سے گزرتی ہے'' کے نشے میں مست ہوتے ہیں اور ان کو اس نشے میں مست بھی رکھا جاتا ہے کہ جہنم ان کے سامنے نمودار ہو کر آنے ہی نہ پائے لیکن جن کے سامنے وہ آ جاتی ہے' تو پھر ان کی کیفیت ملاحظہ فرماؤ۔ ان کے لیے کہا ہے کہ **کُـلَّمَآ اَرَادُوْا اَنْ یَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ** (22:22) یہ اس سے گھبرا کر نکل بھاگنے کی کوشش کریں گے۔ ان کی زندگی اس قدر غم آلود ہوتی ہے ان کا قلب اس قدر اضطراب انگیز ہوتا ہے کہ وہ بار بار چاہتے ہیں کہ اس جہنم سے کسی طرح سے باہر نکل جائیں۔

شرف انسانیت کو جلا دینے والا عذاب جس میں نہ زندگی ہے اور نہ موت

عزیزانِ من! اب اس حالت میں ہوتا یہ ہے کہ **اُعِیْـدُوْا فِیْـهَا** (22:22) انہیں دھکے دے کر اس میں ڈال دیا جاتا ہے کہ تم اس سے نکل نہیں سکتے۔ اُس نے کہا ہے کہ **وَقُـوْدُهَـا الـنَّـاسُ وَ الْحِجَـارَةُ** (2:24) یہ انسان نہیں' یہ تو پتھر ہوتے ہیں' جہنم کا ایندھن بھی ہوتے ہیں۔ پتھر ہوتے ہیں تو احساس نہیں ہوتا۔ جن کے سامنے جہنم نمودار ہو کر آ جاتا ہے' جو آنکھ کھول کر اس کو دیکھ رہے ہوتے ہیں' ان کی تڑپ اور خلش کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ بار بار کوشش کرتے ہیں کہ وہاں سے نکل جائیں لیکن نکل نہیں سکتے۔ یہ **مِنْ غَمٍّ** (22:22) ہے۔ دیکھا آپ نے کہ وہ آگ کے جو شعلے ہیں ان کو کس لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ وہ لفظ ہے۔ غم۔ آگے کہا ہے کہ **اُعِیْدُوْا فِیْهَا** (22:22) نکل نہیں سکتے۔ انہیں پھر وہیں دھکیل دیا جاتا ہے۔ دوسری جگہ کہا ہے کہ **وَمَـاهُمْ بِخَارِجِیْنَ مِنَ الـنَّـارِ** (2:167) نکل نہیں سکتے' ان میں اس تباہی سے نکلنے کی سکت ہی باقی نہیں رہتی' ان کے لیے کہا ہے کہ **وَ ذُوْقُـوْا عَـذَابَ**

الْحَرِیْقِ (22:22) جاؤ! اس عذاب کا مزہ چکھو جو تمہارا سب کچھ جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دے گا۔ کہا گیا ہے کہ ان کے ساتھ یہ کچھ اس دنیا میں بھی ہوگا اور مرنے کے بعد بھی۔ یہ عذاب شرفِ انسانیت کو جلا دینے والا ہے۔ اسی کے اندر رہو' تڑپو اور پھڑکو لیکن نکل نہیں سکو گے۔ قرآن نے کہا ہے کہ لَا یَمُوْتُ فِیْھَا وَ لَا یَحْیٰی (20:74) یہ وہ لوگ ہیں کہ وہاں ان کو نہ موت آتی ہے' نہ زندگی نصیب ہوتی ہے۔ دوسرے مقام پہ ہے کہ چاروں طرف سے دیکھتا ہے کہ موت آ رہی ہے مگر وَّ مَا ھُوَ بِمَیِّتٍ (14:17) لیکن مرتا نہیں ہے:

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

موت بھی وہاں نہیں آتی۔ وہ صاحبِ احساس جو جہنم کے اندر ہے' اسے موت کیسے آ سکتی ہے۔ عزیزانِ من! اس کی تو تڑپتے ہی زندگی گزر جاتی ہے۔ اور یہاں سے یہ کہنے کے بعد کہ یہ جہنم یہیں کا ہے' یہیں کی باتیں ہو رہی ہیں' ہم آج کے درس پر آ گئے۔

اہلِ جہنم کے دو گروہوں کے مابین باہمی مکالمے کا منظر

کہا گیا تھا کہ قانونِ خداوندی کی رو سے اعمال کے نتیجہ خیز ہونے کے بعد تباہی و بربادی کے آنے تک ایک مہلت کا وقفہ ہے۔ جب وہ وقفہ پورا ہو جائے گا تو اس کے آنے میں ایک ثانیہ کا بھی آگا پیچھا نہیں ہوگا۔ اب کہا ہے کہ وَ قَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِھٰذَا الْقُرْاٰنِ وَ لَا بِالَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْہِ (34:31) یہ وہ ہیں جو خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے اوپر یقین نہیں رکھتے' جن کو جہنم نظر نہیں آتا' ان کی ہٹ دھرمی کی حالت یہ ہے کہ یہ نہایت متکبرانہ انداز سے کہتے ہیں کہ ہم نہ اس قرآن کو مانتے ہیں اور نہ ہی اس تعلیم کو جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اس سے پہلے خدا کی طرف سے آتی رہی ہے اور اب قرآن' میں محفوظ کر دی گئی ہے۔ آگے کہا ہے کہ وَ لَوْ تَرٰٓی اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّھِمْ یَرْجِعُ بَعْضُھُمْ اِلٰی بَعْضِ نِ الْقَوْلَ (34:31) اے مخاطب! اے کاش تو اس منظر کو کہیں دیکھ سکتا کہ یہ جو لیڈر ہیں اور ان کے متبع (Followers) ہیں' یہ حاکم ہیں یہ محکوم ہیں' یہ آقا ہیں یہ غلام' یہ مذہبی پیشوا ہیں' یہ ان کے مرید ہیں' یہ سب کے سب جہنم میں ہیں اور یہیں انہیں احساس ہو جائے کہ یہ جہنم ہے تو پھر وہ آپس میں باتیں کس قسم کی کریں گے۔ اے کاش! تُو اس منظر کو کہیں دیکھ پاتا۔ ہے ناں یہ جاذبِ توجہ موضوع! سنیں کہ یہ آپس میں باتیں کیا کرتے ہیں۔ کہا کہ یَقُوْلُ الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْا (34:31)۔ عوام جو قوت میں کمزور ہیں اپنے لیڈروں سے کہیں گے۔ یہاں اس نے یہ دو گروہ بنا دیئے ہیں۔ اب یہ عجیب الفاظ ہیں۔ کہا ہے کہ اسْتَکْبَرُوْا (34:31) جنہوں نے اقتدار

اور قوت حاصل کر لی ہوئی تھی' تھے تو وہ انسان ہی۔ اور یہ جو دوسرے تھے یہ بھی انہی جیسے تھے۔ مگر اسۡتُضۡعِفُوۡا (34:31) ان کو کمزور بنا دیا تھا حتیٰ کہ یہ محسوس کرنے لگ گئے تھے کہ ہم ہیں ہی کمزور۔ یہ ہیں وہ دو گروہ۔ آگے وہ بتاتا ہے کہ ان میں کون کون شامل ہیں۔ یہ جو Followers (متبعین) یا کمزور یا محکوم یا رعایا والے لوگ ہونگے' یہ ان سے کہیں گے کہ لَوۡ لَاۤ اَنۡتُمۡ لَکُنَّا مُؤۡمِنِیۡنَ (34:31) اگر تم نہ ہوتے تو ہم یقیناً خدا کے احکام کی پیروی کرنے والے ہوتے' ہم یقیناً سیدھے راستے پہ چلتے' ہم یقیناً اس دعوتِ حق و صداقت کو قبول کر لیتے تم نے ہی ہمیں بگاڑا ہے۔ وہ اپنی بریت کے لیے کہیں گے کہ قَالَ الَّذِیۡنَ اسۡتَکۡبَرُوۡا لِلَّذِیۡنَ اسۡتُضۡعِفُوۡۤا اَنَحۡنُ صَدَدۡنٰکُمۡ عَنِ الۡہُدٰی بَعۡدَ اِذۡ جَآءَکُمۡ بَلۡ کُنۡتُمۡ مُّجۡرِمِیۡنَ (34:32)۔ اس کے جواب میں ان کے صاحبِ قوت یعنی لیڈران اس کمزور عوام سے کہیں گے کہ تم خواہ مخواہ کی باتیں کیوں کر رہے ہو؟ جب یہ ہدایت تمہارے سامنے آ چکی تھی تو کیا ہم نے تمہیں اس راستے سے باز رکھا تھا؟ کیا ہم نے تمہیں اس کو قبول کرنے سے روکا تھا یا تم خود ہی مجرم تھے؟ کیا تمہارے سامنے ہدایت نہیں آ چکی تھی؟ کیا صحیح راستہ تمہیں معلوم نہیں تھا؟ اصل یہ ہے کہ تمہارا ہی من چور تھا' ہم نے تو آواز ہی دی تھی' تم کیوں ہمارے پیچھے آ لگے۔ بات یہ ہے۔ قرآن یہ کہنا چاہتا ہے کہ جب معاشرہ جہنمی بنتا ہے تو اس کی ذمہ داری کس پہ عائد ہوتی ہے۔ یہ ہے اصل چیز جو قرآن مکالمے کے رنگ میں بیان کرتا ہے۔ Followers (متبعین) کہتے ہیں کہ تم نے یہ جہنم Create (پیدا) کیا ہے' اس لیے ہم جہنم میں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے تمہارے لیے کیا کیا؟ یہ سب کچھ تم پر روشن تھا۔ وَ قَالَ الَّذِیۡنَ اسۡتُضۡعِفُوۡا لِلَّذِیۡنَ اسۡتَکۡبَرُوۡا بَلۡ مَکۡرُ الَّیۡلِ وَ النَّہَارِ (34:33) Followers (متبعین) اپنے حکام سے کہیں گے کہ جس قسم کے احکام تم نافذ کیا کرتے تھے' جس قسم کے قوانین بنایا کرتے تھے' کیا ان کے ماتحت ہم میں یہ قوت تھی کہ ہم اس کا دفاع ہی کر سکتے' کیا ہم صحیح راستہ اختیار کر جاتے' تم کرنے دیتے تھے؟ تم رات دن اس قسم کی چالبازیاں اور فریب کاریاں کرتے رہتے تھے جن سے ہم اس صحیح راستے کے قریب تک نہ پھٹک سکیں۔ تم اس قسم کے قانون بناتے رہتے تھے' جن سے ہم قوانین خداوندی سے انکار کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ کیا اس کے بعد بھی تم یہی کہو گے کہ تم نے ہمیں اس راستے کی طرف آنے سے نہیں روکا تھا؟

مفاد پرست قوتوں کی طرف سے اختیار کردہ سازشوں کی نوعیت: مزاجِ خانقاہی کا نشہ آور صبحگاہی کا ورد

عزیزانِ من! آپ دیکھ رہے ہیں کہ کیا جواب مل رہا ہے۔ یہ جو کہا ہے کہ تم دن رات اس قسم کی چالیں چلتے رہتے تھے۔ یہ چالیں کس قسم کی تھیں؟ قرآنِ کریم نے (6:113) میں یہ بتایا ہے کہ یہ سرکش قوتیں اپنے مفاد کی خاطر' اپنے پیچھے چلنے والوں' جن کو

محکوم بنایا جاتا ہے' کے متعلق سازشیں کرتی تھیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان کی تدبیروں' ان کی ترکیبوں' ان کے حربوں' ان کی سازشوں کا انداز کیا ہوتا تھا؟ عزیزانِ من! ان کے لیے قرآن کے چار ٹکڑے' چار الفاظ ہی سمجھ لیجیے اور پھر سوچیے' غور کیجیے اور اپنے سامنے وہ نقشہ لائیے۔ کہا ہے کہ وَ لِتَصۡغٰۤی اِلَیۡهِ اَفۡئِدَۃُ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَۃِ (6:113)۔ ان ملمع سازیوں اور فریب کاریوں سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو دنیاوی زندگی کے مفاد ہی کو منتہا سمجھتے ہیں اور حیات اخروی اور خدا کے قانونِ مکافات پر یقین نہیں رکھتے' ان کی طرف جھکے رہیں' ان کی ہاں میں ہاں ملاتے رہیں۔ اب اس سے یہ ظاہر ہے کہ پہلی چیز یہ ہوتی تھی کہ مکافاتِ عمل کا جو قانون ہے' وہ ان کی نگاہوں سے اوجھل کر دیا جائے اور اس طرح اپنی اس قدر Popularity (شہرت) Win (جیت کر حاصل) کی جائے کہ یہ ان کی طرف کھنچے چلے آئیں' مکافاتِ عمل کے قانون کو اوجھل کر دیا جائے تو پھر یہ کچھ ہوگا۔ اس میں بھی یہ بات نہیں ہوگی کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ ان کے ہاں صرف یہ ہوگا کہ وہ یہ کچھ کریں' جس سے یہ ان کی طرف کھنچے چلے آئیں۔ یہ نہیں ہے کہ ان کی اصلاح کریں' ان کو صحیح راستے پر لائیں' ان کی غلط روشوں کی مذمت کریں بلکہ لِیَرۡضَوۡہُ (6:113) جن باتوں کو یہ پسند کرتے ہیں یہ وہی کچھ کرتے چلے جائیں' جس جہالت میں ہیں' انہیں اُسی میں اور زیادہ پختہ کرتے چلے جائیں۔

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے

پختہ تر کردو مزاجِ خانقاہی میں اسے

جہنمی معاشرے کے باسیوں کو اپنا مستقبل ہمیشہ تاریک دکھائی دیتا ہے اور ماضی روشن

قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ وَ لِیَرۡضَوۡہُ (6:113) جن باتوں کو یہ پسند کرتے ہیں' وہ بھی وہی کرتے چلے جائیں اور جو کارستانیاں یہ کرتے ہیں' وہ بھی ان میں شریک رہیں' ان میں اپنی ہم آہنگی کا اظہار کرتے چلے جائیں۔ کیا بات ہے قرآن کی! عزیزانِ من! ایک لفظ ہے کہ تم دیکھ لو یہ کس چیز کو زیادہ پسند کرتے ہیں' کس چیز سے خوش ہوتے ہیں' ان کو اس کے اندر اور داخل کردو' اور پختہ کردو۔ بھنگ کا نشہ ہے' بھنگ دیتے چلے جاؤ' افیون ہے تو دیتے چلے جاؤ۔ ذکر و فکرِ صبحگاہی کے نشے کے اندر بدمست رہتے ہیں تو انہیں اس میں اور زیادہ رکھو۔ یہ ہے۔ وَ لِیَرۡضَوۡہُ (6:113) تاکہ ان کی طرف مائل رہیں۔ یہ ایک لفظ ہے کہ سازش یہ ہے۔ وَ لِتَصۡغٰۤی اِلَیۡهِ (6:113) تاکہ یہ کہیں کہ سبحان اللہ صاحب! کیا بات ہے ان کی' یہ کیا کچھ ہمارے لیے کرتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ یہ تمہارے ساتھ چپکے رہیں' بس وہ کچھ کرتے جاؤ' جس کو یہ پسند کرتے ہیں۔ اور اگلی بات یہ ہے کہ وَ لِیَقۡتَرِفُوۡا مَا هُمۡ مُّقۡتَرِفُوۡنَ (6:113) جو کچھ وہ کر رہے ہیں' یہ بھی کیے جائیں' جن چیزوں میں وہ لگے ہوئے ہیں' یہ بھی ان میں لگے رہیں۔ جس

جس طریق سے بھی وہ دولت سمیٹتے ہیں، بس اس کی طرف سے آنکھیں بند کر کے کیے جائیں۔۔

عزیزانِ من! سوچیے تو سہی کہ کیا یہ اُس قیامت، اُس جہنم کی باتیں ہو رہی ہیں؟ جو مرنے کے بعد آئے گی؟ یہ تو اسی دنیا جہان کی باتیں ہیں۔ یہاں یہ کہا ہے کہ یہ جو استکبروا ہے۔ اس میں صرف کبریائی کی بات ہے، اس میں اقتدار کی بات آتی ہے۔ ایسا ہی نظر آتا ہے، جن کے ہاتھ میں اقتدار ہوتا ہے کہ کبریائی ہے تو یہ صرف انہی کی ہوگی، یہ صرف وہی ہونگے لیکن نہیں! عزیزانِ من!! یہ قرآن ہے۔ کہا ہے کہ یَوۡمَ تُقَلَّبُ وُجُوۡهُهُمۡ فِی النَّارِ (33:66) اس وقت، ان کی کیفیت یہ ہوگی کہ یہ اس تباہی کی آگ میں اوندھے منہ جھونک دیئے جائیں گے۔ ان کی یہ آنکھیں تو سامنے کے لیے ہوتی ہیں کہ ان سے مستقبل کا راستہ دیکھا جائے لیکن ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ آنکھیں پیچھے کی طرف گدی میں جا لگتی ہیں۔ ان کا مستقبل تاریک ہوتا ہے، مگر انہیں ماضی روشن نظر آتا ہے۔ اسی لیے کہا ہے کہ یہ مُقۡتَرِفُوۡنَ (6:113) ہوتے ہیں۔ باقی قومیں آگے چلی جاتی ہیں، یہ پیچھے رہ جاتے ہیں۔ انہوں نے درخشاں ماضی دیکھا ہوتا ہے، مستقبل ان کا تاریک ہوتا ہے، وہ جن چیزوں میں لگے ہوتے ہیں، انہی میں لگے رہتے ہیں۔

یہ کون لوگ ہیں؟ ان کے بارے میں کہا ہے کہ وَ قَالُوۡا رَبَّنَاۤ اِنَّاۤ اَطَعۡنَا سَادَتَنَا وَ کُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوۡنَا السَّبِیۡلَا (33:67)۔ اس وقت ان ''سَادَتَنَا اور کُبَرَآءَنَا'' کے متعلق عوام کہیں گے کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہم نے اپنے ان لیڈروں کی، جو ہم میں بڑے بنے ہوئے تھے، اطاعت کی تو انہوں نے ہمیں زندگی کے صحیح راستے سے بہکا دیا۔ یہاں سادتنا قیادت والے، سرداری والے، یہ مذہبی پیشوائیت، کبرآء نا یہ اقتدار والے لوگ اور فَاَضَلُّوۡنَا السَّبِیۡلَا کے معنی ہیں، تیری طرف آنے والے راستے سے انہوں نے گمراہ کر دیا۔ قرآن یہ دونوں گروہ اس کے اندر لے آیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ سادتنا جو تھے، یہ کس طرح سے گمراہ کرتے ہیں؟ کیا پٹی پڑھاتے رہتے ہیں؟ کہا کہ وَ کَذٰلِکَ مَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ فِیۡ قَرۡیَۃٍ مِّنۡ نَّذِیۡرٍ اِلَّا قَالَ مُتۡرَفُوۡهَاۤ (43:23) یہ جو پٹی پڑھاتے ہیں، ان کے لیے مترفین کی Term (اصطلاح) ہے یعنی دوسروں کی کمائی پر خوشحالی کی زندگی بسر کرنے والے۔

مذہبی پیشوائیت لوگوں کو تقلید پرستی کے جال میں الجھا سکتی ہے

ان میں دونوں طبقے اس نے گنائے تھے: سَادَتَنَا وَ کُبَرَآءَنَا یعنی مذہبی پیشوائیت بھی اور اربابِ اقتدار بھی۔ انہیں مترفوھا کہا ہے۔ یہاں مذہبی پیشوائیت کا ذکر آتا ہے کہ یہ کس طرح سے روکے رکھتے تھے۔ میں نے کہا تھا کہ اہلِ جہنم کی آنکھیں پیچھے لگی ہوئی ہوتی ہیں۔ مذہبی پیشوائیت کرتی یہ ہے کہ ان کو پڑھاتی رہتی ہے کہ اِنَّا وَجَدۡنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤی اُمَّۃٍ وَّ اِنَّا عَلٰۤی اٰثٰرِهِمۡ

مُّــقْتَــدُوْنَ (43:23) ہم نے اپنے اسلاف کو جس راستے پہ چلتے ہوئے دیکھا' ہم اسی پہ چلتے چلے جائیں گے یعنی ماضی کی طرف چلتے جائیں گے۔اس سے آگے نہیں بڑھ سکتے' اس سے انحراف نہیں برت سکتے۔ یہ نہیں سوچ سکتے کہ آج کے تقاضے کیا کہتے ہیں' یہ نہیں سوچ سکتے کہ ان کے متعلق پرکھ کے دیکھ لیں کہ وہ واقعی صحیح راستے پہ چل رہے تھے یا نہیں۔ یہ اس کے اوپر لگے ہوئے ہیں کہ اسلاف کا راستہ کیا ہے' سلفِ صالحین کا راستہ کیا ہے۔قرآن کہتا ہے کہ یہ ان کو اس میں مگن رکھتے ہیں۔اورانہیں مترفوھا کہا ہے کہ وہ خود نہیں کمائی کرتے۔ یہ ہیں دو طبقے جو ان عوام کو جہنم کے اندر رکھتے ہیں' آگے نہیں بڑھنے دیتے۔ جمود طاری ہوجاتا ہے' اس قوم کے عقل وفکر کے دیئے بجھ جاتے ہیں۔ یہ پھونکیں مار مار کر بجھاتے رہتے ہیں کہ کہیں جلنے نہ پائے۔اور یہ ہے جس جہنم کے اندر اس قوم کو رکھا جاتا ہے۔ میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ اس کا جواب اُنہوں نے یہ دیا تھا بلکہ جواب تو قرآن کی رو سے یونہی سامنے آجاتا ہے۔عوام اپنے آپ کو بری الذمہ سمجھتی ہے کہ ہمارا قصور نہیں ہے' انہی بڑوں نے ہمیں یہ سب کچھ کیا ہے۔قرآنِ کریم بتاتا یہ ہے۔ وہی ساری باتیں آرہی ہیں کہ وہ دائیں بائیں سے آتے تھے اوران کو ورغلاتے تھے اور وہ ان سے کہتے تھے کہ تم نے ہمیں تباہ کیا جو ہم تمہارے پیچھے لگے اور وہ جواب دیں گے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ ان کا جواب قرآن تو یہ بتاتا ہے کہ قَالُوْا بَلْ لَّمْ تَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (37:29) وہ کہیں گے کہ تمہارا اپنا ایمان ہی کمزور تھا' تم خود ہی سچی بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔

ایسا انسان جس کا ایمان محکم ہو وہ کسی کے سامنے جھکتا ہی نہیں

عزیزانِ من! اگر اس کا ایمان مضبوط ہو تو کوئی انسان دوسرے انسان کو اپنے سامنے جھکا ہی نہیں سکتا۔ یہ ہے قرآن نے جو بتا دیا کہ کیوں ایک دوسرے کو الزام دے رہے ہو' تمہارا اپنا ہی ایمان کمزور تھا جس لیے یہ سب کچھ ہوا لیکن اس کے باوجود وہ اس کو بھی نظر انداز نہیں کرتا کہ یہ جو سالار کارواں ہوتا ہے' اس پہ بڑا Depend کرتا ہے' وہ لے جاتا ہے۔کہاں لے جاتا ہے؟ کہا ہے کہ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا (14:28) تم نے اس قوم کی حالت پہ بھی نگاہ ڈالی ہے کہ خدا نے ان کو اس قدر نعمتیں بلا مزد و معاوضہ عطا کیں اور انہوں نے ان کی ناسپاس گزاری کی۔ کیا ہوا؟ ایک کارواں تھا' لدا ہوا چلا آرہا تھا۔وَّ اَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ (14:28) کارواں سالار نے اپنے قافلے کو اُس منڈی میں جا کر اتار دیا جہاں جنسِ کاسد کا کوئی خریدار نہیں تھا' جہاں اس کی کوئی قیمت نہیں تھی اُس منڈی میں اس کارواں سالار نے انہیں اتار دیا۔انہوں نے اس کارواں کو وہاں اتار دیا جہاں تباہی کے سوا کچھ نہیں تھا' جنسِ کاسد کا کوئی خریدار ہی نہیں تھا۔کونسا مقام ہے؟ کہا کہ جَهَنَّمَ (14:29) قوموں کے بیع وشراء کے اندر جس جنسِ کاسد کا کوئی خریدار نہ رہے وہ قوم جہنم کے اندر ہوتی ہے۔ کہا کہ ان کے کارواں سالاروں نے ان کو اس مقام میں لا کر

اتار دیا۔ اس لیے قرآن کہتا ہے کہ یہ وجہ ہے کہ یہ ایک دوسرے کو الزام دینے کی بات نہیں ہے۔ اس وقت یہ سب کے سب جہنم میں ہوتے ہیں' جہنم کے شعلوں میں گرفتار ہوتے ہیں: یہ اوپر کا طبقہ بھی اور نیچے کا طبقہ بھی' اقتدار والے بھی اور محکوم بھی' مذہبی پیشوائیت بھی اوران کے متبع بھی' سارے کے سارے جہنم میں ہوتے ہیں۔ کہا کہ وَ بَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا (14:21) تمام کے تمام نکھر کر سامنے آجائیں گے۔ فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا (14:21) وہ پیچھے چلنے والے ان سے کہیں گے کہ ہم تو تمہارے پیچھے چلتے رہے تھے' ہمارا جرم یہی تھا۔ کہا کہ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ (14:21) ہم تمہارے پیچھے چلتے تھے' تم ہمیں بڑے بڑے سبز باغ دکھایا کرتے تھے' بڑے بڑے خوشگوار وعدے کیے جاتے تھے۔ او خدا کے لیے اس عذاب سے کچھ تو ہماری تخفیف کرادو' اس کے اندر تھوڑی سی ہی تخفیف ہو جائے۔ قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ (14:21) کہتے ہیں کہ اگر ہمیں کشاد کی راہ نظر آتی تو ہم تمہیں بھی نکال کرلے جاتے۔ یہاں تو ہمیں بھی راستہ نہیں نظر آتا۔ اس واسطے سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ (14:21) یہاں سے نہ تم نکل سکتے ہو' نہ ہم نکل سکتے ہیں' خاموش برداشت کرو یا چیخو چلاؤ' بات یکساں ہے۔ یہ جہنم ہے۔

پیچھے چلنے والے ہوں یا غلط راستے پر چلانے والے' وہاں ہر دو کو دوگنا عذاب ہوگا

عزیزانِ من! وہ جو بات تھی کہ تمہارا اپنا ایمان کمزور تھا' قرآنِ کریم اسے اہمیت دیتا ہے' وہ ان کا عذر نہیں سنتا' معذرت قبول نہیں کرتا۔ جبھی تو میں نے کہا ہے کہ یہ دونوں جہنم کے اندر ہیں۔ ایک دوسرے مقام پہ ہے کہ یہ پیچھے چلنے والے کہیں گے کہ یا اللہ! ان کو دوہرا عذاب دے' ایک تو اس لیے کہ یہ خود غلط راستے پہ چلے تھے' ہمیں بھی غلط راستے پہ چلایا تھا۔ قرآن کہتا ہے کہ تم دونوں کو دوگنا عذاب ہے۔ ان کے لیے تو ہم نے بتا دیا کہ کیوں دوگنا ہے۔ اور تمہارے لیے اس لیے ہے کہ یہ جو اس قدر سرکشیاں برتتے تھے' استبداد کرتے تھے' یہ تو تمہارے جیسے انسان تھے' ان کے پاس اپنی قوت کیا تھی' انہیں تو قوت تم نے بہم پہنچائی تھی' اس لیے ان کے جرم میں تم بھی برابر کے شریک ہو۔ دونوں کو دوہرا عذاب ہے۔ جہنم کا عذاب جب قوموں پہ آتا ہے تو پھر وہ انتظار نہیں کرتا کہ یہ غریب کی جھونپڑی ہے یا یہ امیر کا محل ہے۔ عزیزانِ من! وہ تو سیلاب ہوتا ہے' دونوں کو یکساں بہا کرلے جاتا ہے۔

غلط معاشرے میں اہلِ ایمان کی ذمہ داری اور زیادہ ہوتی ہے

قرآنِ کریم نے' یہ جو عوام ہیں' جن کو آپ ہم جماعتِ مومنین کہتے ہیں' ان کو زیادہ ذمہ دار قرار دیا ہے۔ اُس نے کہا ہے کہ تم اگر محکومی اور غلامی پہ رضامند ہو جاتے ہو' اس کی وجہ سے ان کے حوصلے دراز ہو جاتے ہیں' ان کا استبداد ان کے اپنے بازو کا پیدا کردہ

نہیں ہوتا۔ وہ جو تم ان کو تقویت بہم پہنچاتے ہو' یہ اس کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس لیے اہل ایمان کی ذمہ داری اور بڑھ جاتی ہے۔

غلط روش کے پیرو کار بڑے بزدل ہوا کرتے ہیں

عزیزانِ من! محکوم کے متعلق کبھی فرصت ہوگی تو بتاؤں گا کہ اقبالؒ (1938-1877) نے کس کس انداز سے یہ بات کہی تھی۔ اقبالؒ کا انداز ہی یہی تھا' وہ پیغام ہی یہ دیتا تھا کہ انسان کو انسان کی غلامی اور محکومی سے چھڑا کر خدا کا عبد بنا دیا جائے۔ یہی قرآن کا پیغام ہے' یہی شرفِ انسانیت ہے۔ اس لیے اُس نے بار بار یہ چیز قوم کو بتانے کے لیے کہ اپنا عذر ان کے سر پہ نہ دھرو' یہ کچھ نہیں ہیں' کہا ہے کہ

ایں صنم تا سجدہ اش کر دی خدا ست

جب تک تم اس کے سامنے سجدہ کیے رہو یہ خدا ہوتا ہے

چوں یکے اندر قیام آئی فنا ست

تم سجدے سے اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ' یہ ختم ہو جاتا ہے' یہ تو برف کے بت ہوتے ہیں' سورج نہیں چڑھتا تو یہ نظر آتے ہیں' ذرا اس کی شعاعیں ان پہ پڑنے دیجیے خود پگھل کر پانی ہو جاتے ہیں۔ ان کی ذاتی قوت کیا ہوتی ہے؟ یہ تو تمہارے جیسے انسان ہوتے ہیں۔ اسی لیے قرآن نے بھی یہ جو عبدِ محکوم ہیں' ان کو زیادہ ذمہ دار قرار دیا ہے۔ اقبالؒ نے بھی یہی کچھ کہا ہے۔

عزیزانِ من! جاتے جاتے دو چار چیزیں تو سن لیجیے۔ کہتا ہے محکوم کو محکوم کی جان نکالنے کے لیے موت آتی ہے۔ زندگی تو اس کے نصیب میں بھی نہیں ہوتی' وہ تو جب زندہ ہوتا ہے' سانس لے رہا ہوتا ہے تو اس وقت بھی وہ زندہ نہیں ہوتا:

شنیدم مرگ بایزداں چنیں گفت

میں نے سنا ہے کہ موت نے خدا کے حضور یہ شکایت کی کہ

چہ بے نم چشمِ آں کز گل بزاید

یہ مٹی کا مادھو' یہ محض آب و گل کا پیکر' جو یونہی بصورتِ انسان نظر آتا تھا' اس کے اندر شرفِ انسانیت نہیں تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں نمی نہیں دیکھی' اس کی آنکھ کتنی بے نم تھی۔

چو جانِ او بگیرم شرمسارم

اس کی جان نکالنے کے لیے میں آتی ہوں' تیرا حکم ہے تو آجاتی ہوں لیکن مجھے تو شرم آتی ہے کہ میں اس کی جان نکالوں۔

محکوم کا گلا دبانے سے موت کو شرم آ جاتی ہے:

چو جانِ او بگیرم شرمسارم

ولے او را ز مردن عار ناید

لیکن اس کم بخت کو مرنے سے شرم نہیں آتی' میں اس کو مارنے آتی ہوں تو مجھے شرم آ جاتی ہے۔

عزیزانِ من! کبھی خدا نے زندگی دی تو اقبالؒ (1938-1877) بھی پڑھاؤں گا۔ سنیئے! وہ خدا سے کیا کہتی ہے؟ کہتی ہے کہ

شباتش ده که میرِ شش جهات است

تُو نے اس کو پورے کارواں کا میر بنا کر پیدا کیا تھا۔ موت خدا کو کہتی ہے کہ اس کو کوئی ثبات اور استقامت دے۔ یہ اپنے عدمِ ثبات کی بنا پر اس قدر گرا ہوا ہے' اس قدر محکومی پہ رضا مند ہو گیا ہوا ہے۔

بدستِ او زمامِ کائنات است

اس کے ہاتھوں میں تو پوری کائنات کی لگام ہونی چاہیے تھی۔

نگردد شرمسار از خواریِ مرگ

اس کو موت کی ذلت اٹھانے سے شرم نہیں آتی۔ عزیزانِ من! کیوں شرم نہیں آتی؟ وہی بات کہی ہے۔

که نامحرم ز ناموسِ حیات است

کہ وہ زندگی کے ناموس اور عزت اور شرفِ انسانیت کا محرم نہیں ہے' وہ زندگی قدر و قیمت سے ناواقف ہے' اسے معلوم نہیں کہ زندگی کو دوام بھی بخشا جا سکتا ہے' اس لیے اسے شرم نہیں آتی ہے۔ مرگ کی سی ذلت قبول کر لیتا ہے۔

عزیزانِ من! میری ایک بچی (اللہ اس کی عمر دراز کرے) نے کنونشن میں اپنی ایک تقریر میں کہا تھا۔ سوال اُس سے یہ کیا گیا تھا کہ یہ جو خودکشی کرتا ہے' تو کیا وہ موت سے ڈرتا ہے؟ کیا اس لیے خودکشی کرتا ہے؟ یہ قرآنی گھرانے کی بچی ہے۔ اُس نے جواب دیا تھا کہ مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ وہ موت سے ڈرتا ہے یا نہیں لیکن مجھے یہ یقین ہے کہ وہ زندگی سے ڈرتا ہے:

که نامحرم ز ناموسِ حیات است [1]

وہ زندگی کی قدر و منزلت اور شرفِ انسانیت سے واقف نہیں۔

---

[1] اقبالؒ: ارمغانِ حجاز' کلیاتِ اقبال فارسی' شیخ محمد بشیر اینڈ سنز' لاہور' ص۔ 815

محکوم میت پر قبر کی پکار اور اپنی سوختہ بختی کا اظہار

اقبالؒ کی ایک نظم 'قبر' ہے۔ اس محکوم اور ذلیل انسان کا مردہ (میت) جب قبر میں دفن کیا جاتا ہے تو قبر اس سے کہتی ہے:

آہ' ظالم! تُو جہاں میں بندۂ محکوم تھا
میں نہ سمجھی تھی کہ ہے کیوں خاک میری سوزناک

مجھے پتہ ہی نہیں چلا تھا کہ تیرے آنے سے میری مٹی اس قدر جل بُھن کیوں رہی ہے۔ اب پتہ چلا کہ تُو بندۂ محکوم تھا' اس لیے میری مٹی تیری وجہ سے جل رہی ہے۔

تیری میّت سے مری تاریکیاں تاریک تر
تیری میّت سے زمیں کا پردۂ ناموس چاک
الحذر' محکوم کی میّت سے سو بار الحذر
اے سرافیل! اے خدائے کائنات! اے جانِ پاک ❶

عزیزانِ من! قرآنِ کریم یہی چیز کہتا ہے کہ یہ تمہارے ایمان کی کمزوری ہے مگر تم یہ کچھ دوسروں کے اوپر ڈال رہے ہو۔ استکبار والوں کو تو چھوڑ دیجیے' وہ قوت کے نشے میں بدمست ہوتے ہیں۔ تم جو اس چیز کے اوپر رضامند ہوجاتے ہو تو اس کی معذرت اس کی ذمہ داری' دوسروں پہ نہ ڈالیے۔ یہ تمہارے اپنے ایمان کی کمزوری ہے جس وجہ سے تمہاری یہ کیفیت ہے کہ اپنے جیسے انسانوں کو اپنا حاکم اور آقائے معبود بنالیا ہے۔

قوتِ ایمانی ہی وہ قوت ہے جو تمام بیڑیوں کو اور تمام ہتھکڑیوں کو توڑ دیتی ہے

عزیزانِ من! یہی چیز ہے کہ جب یہ لیڈر ایک طرف اپنے سامنے عذاب کو تیار دیکھیں گے اور دوسری طرف اپنے متبعین کی طرف سے اس قسم کی باتیں سنیں گے تو جو قرآن نے کہا ہے کہ **وَ اَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ وَ جَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِیْٓ اَعْنَاقِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا هَلْ یُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ** (34:33) کوشش کریں گے کہ اپنی ندامت کو چھپائیں۔ وہ یہ ساری باتیں کرتے ہونگے لیکن وہ طوق اور اغلال اور بیڑیاں اور ہتھکڑیاں جو پڑی ہوئی ہونگی' وہ تو ان باتوں سے نہیں ٹوٹ جائیں

---

❶ اقبالؒ: ارمغانِ حجاز (اردو)' نیشنل بُک فاؤنڈیشن' اسلام آباد' 1996' ص۔ 39

گی۔ وہ تو ان کی قوتِ ایمانی سے ٹوٹتی ہیں جو کہ انہیں میسر ہی نہیں تھی۔ ان کی گردنوں میں زنجیریں ڈال کر انہیں کشاں کشاں عذاب کی طرف لے جایا جائے گا اور یہ سب کچھ ان کے اعمال کا بدلہ ہوگا۔ یہ ہے **هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ** (34:33)۔ عزیزانِ من! یہ بڑی عجیب ہے۔ قرآن میں کہیں **بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ** آیا ہے کہیں **مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ** آیا ہے۔ ''**بِمَا**'' تو یہ ہوتا ہے کہ یہاں جو جرم کیا جاتا ہے تو اس کی سزا خارج سے ملتی ہے مثلاً قید کر دینا وغیرہ۔

جہنم کی آگ کے شعلے انسانی اعمال کی آگ کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں

قرآن کہتا ہے کہ یہ عذاب جہنم جو تم دیکھ رہے ہو' یہ کہیں خارج سے تم پہ وارد نہیں کیا جا رہا بلکہ تمہارے اپنے ہی اعمال' یہ شعلے بن کر تمہیں لپیٹ رہے ہیں' اور تم اس میں جل رہے ہو۔ ہم نے تو یہ آگ نہیں جلائی۔ وہ جو اقبالؒ (1938-1877) کی نظم ہے' وہ جہنم میں سیر کرتا چلا گیا تھا اور آخر میں اُس نے کہا تھا کہ میں نے داروغہ سے کہا کہ ذرا مجھے جہنم بھی دکھا دو۔ تو میرے ذہن میں تھا کہ وہاں پتہ نہیں جہنم کے کتنے کتنے شعلے لپک رہے ہونگے۔ وہاں جا کر تو اسے یک دم حریر ٹھنڈا دیکھا [1]۔ میں نے اس سے کہا کہ ہم تو جہنم کے متعلق سنتے ہیں کہ بڑی آگ بھڑک رہی ہوگی۔ یہ تو ٹھنڈا نظر آتا ہے۔ کہنے لگا کہ ٹھنڈا ہے ٹھیک ہے۔ جہنم کی اپنی آگ نہیں ہوتی' بلکہ

اہل دنیا یہاں جو آتے ہیں
اپنے انگار ساتھ لاتے ہیں

شرفِ انسانیت سے محرومی جہنم ہے

عزیزانِ من! یہ ہیں وہ جو قرآنِ کریم نے جہنم میں عوام اور لیڈر' حکام اور رعایا' محکوم و آقا غلام اور آزاد مذہبی پیشوا اور ان کے متبع میں مکالمات بیان کیے ہیں۔ یہ ہیں جو میں نے آج آپ کے سامنے پیش کیے ہیں۔ دو باتیں یاد رکھیے: **خِزْىٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا** (2:85) شرفِ انسانیت سے محرومی جہنم ہے۔ احساس باقی نہیں رہتا تو انسان حیوان ہو جاتا ہے' پتھر ہو جاتا ہے۔ احساس ہوتا ہے تو اس کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیتے ہیں۔ افراد کی حیثیت سے احساس ہوتا ہے تو جہنم سے نکل نہیں سکتے۔ اجتماعی حیثیت سے یہ احساس بیدار ہو جاتا ہے تو کوئی اس کو جہنم میں نہیں رکھ سکتا۔ ان کی صورت وہ نہیں ہوتی ہے۔ یہ ہے جس کے لیے قرآن نے کہا کہ

---

[1] زمہریر

یہاں سے نکلنے کا راستہ یہ ہے جو تمہیں ہم نے بتایا ہے۔

عزیزانِ من! یوں سمجھ لیجیے کہ سورۃ سبا کی آیت 33 تک ہم آگئے ہیں۔ 34 ویں آیت سے ہم پھر لیں گے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ ان کو بہکانے والے یہ سب لوگ وہ ہیں جو ان کی کمائی پر پلتے ہیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

❀......❀......❀

چھٹا باب: سورۃ سبا (آیات 34 تا 38)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من ! آج مارچ 1980ء کی 4 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ سبا کی آیت 34 سے ہوتا ہے: (34:34)۔

بعض احباب جو سابقہ درس میں ایک غلط فہمی کی وجہ سے آنہ سکے تھے اُنہوں نے مجھ سے کہا کہ پچھلے درس کا موضوع بڑا ہی اہم تھا' ان کا تو تقاضا تھا کہ اسے Repeat یعنی دہرا دیا جائے۔ بہرحال درس یا تقریر تو دہرائی نہیں جاتی' وہ Tapes (ٹیپوں) کے اندر محفوظ ہے' آپ سننا چاہیں گے تو اوپر شیخ صاحب ❶ کے پاس کسی وقت چلے جایئے گا۔

گزشتہ سے پیوستہ یعنی جہنمی معاشرے کی پہچان جس میں تکریمِ آدمیت مفقود ہو جائے

پچھلے درس کا موضوع وہ مکالمہ تھا جو قرآن نے جہنم میں لیڈروں کا اور عوام کا' حکمران طبقہ کا اور محکوم کا' مذہبی پیشوائیت کا اور ان کے عقیدت مندوں کا' دیا ہے۔ یہ سب کے سب جہنم میں تھے' قرآنِ کریم یہ بتاتا ہے کہ وہ وہاں ایک دوسرے پر کس طرح الزام

---

❶ یہ شیخ عبدالحمید مرحوم کی طرف اشارہ ہے۔

دھرتے ہیں کہ ہم تمہاری وجہ سے اس عذاب میں گرفتار ہیں۔ اس میں بات کی اہمیت تھی جو میں نے عرض کیا تھا کہ مرنے کے بعد کی جنت اور جہنم اور قیامت اور حشر اور اعمال سب بجا اور درست ہیں' ان کے اوپر ہمارا ایمان ہے لیکن ہماری غلط نگہی یہی ہے کہ ہم اس جہنم اور حشر کو قیامت پر اٹھا رکھتے ہیں۔ وہ قیامت برحق ہے لیکن قرآنِ کریم کی رو سے جہنم تو اسی دنیا کے اندر بھی ہوتا ہے۔ اُس نے بتایا ہے کہ وہ تو تمہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہوتا ہے۔ وہ غلط معاشرہ' جس میں انسانیت کا شرف اور آدمیت کی تکریم نہ رہے' وہ جہنم ہوتا ہے۔ اُس نے کہا یہ ہے کہ تم اُس جہنم کو نہیں دیکھتے' وہ تو تمہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ اور اس کے بعد اُس نے کہا تھا کہ جن کی آنکھیں کھلی ہوئی ہوں وہ آج بھی اُسے دیکھ سکتے ہیں' محسوس کر سکتے ہیں کہ اس کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیتے ہیں۔ پھر میں نے یہ عرض کیا تھا کہ وہ مکالمے آپس کے کیا ہیں اور یہ کہ پھر وہ اس جہنم کا ایندھن کون ہیں' اس کے شعلے کیا ہیں۔ میں نے کہا ہے کہ قرآن کی رو سے بنیادی چیز یہ ہے کہ جہاں انسانیت کا شرف' احترام' تکریم نہ رہے' اسے کسی طرح سے ٹھیس پہنچے' کوئی انسان جہاں اپنے آپ کو ذلیل محسوس کرے' وہ معاشرہ جہنم کا معاشرہ ہوتا ہے۔ اور قرآنِ کریم نے پھر اس کی تفصیل بتائی تھی کہ اس قسم کے معاشرے کے اندر جن کو احساس ہو جاتا ہے' وہ وہاں سے نکلنے کی بھی کوشش کرتے ہیں تو وہاں سے نکل نہیں سکتے کیونکہ یہ احساس انفرادی ہوتا ہے' ایک فرد کا ہوتا ہے' معاشرہ اجتماعی ہوتا ہے۔ فرد اس میں جلتے بھنتے رہتے ہیں جو اجتماعیت ہے وہ اس معاشرے کو جنت میں بدلنے کی کوشش ہی نہیں کرتی کہ وہ اس جہنم کو دیکھ ہی نہیں رہی ہوتی۔ وہ خوش ہوتے ہیں کہ

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

قفس کے آرام کا خوگر معاشرہ آزادی کی نعمت سے آشنا ہوتا ہی نہیں

جس پرندے کو قفس کے گوشے میں آرام محسوس ہونے لگ جائے وہ اس قفس کی تیلیوں کو توڑ کر باہر نکلنے کی کوشش کیوں کرے گا۔ اُسے تو باہر نکال بھی دیں گے تو وہ پنجرے کا دروازہ چونچ سے کھول کر اندر جانے کی کوشش کرے گا۔ جب غلام اور محکوم اس قسم کے جہنمی معاشرے میں عادی ہو جاتا ہے تو یہ کیفیت ہو جاتی ہے۔ یہ تھا پچھلے درس کا موضوع اور آپ احباب کا تقاضا بجا ہے کہ یہ ایسا تھا کہ اس کو Repeat یعنی دہرا دیا جائے۔ وہ بہرحال اللہ کا شکر ہے اب یہ سامان موجود ہیں کہ چیزیں ہوا میں منتشر نہیں ہو جاتیں' محفوظ ہو جاتی ہیں' محفوظ رہیں گی۔ اس لیے ہم اس کے بعد آگے چلتے ہیں۔

مترفین نے قرآن حکیم کی ہمیشہ مخالفت کی ہے

میں نے پچھلی دفعہ عرض کیا تھا' اسی سلسلے میں ہی آپ اگلی آیت کو سمجھیے کہ جہنم کے اندر وہ کون لوگ تھے؟ کہا کہ وَ مَآ اَرۡسَلۡنَا فِیۡ قَرۡیَۃٍ مِّنۡ نَّذِیۡرٍ اِلَّا قَالَ مُتۡرَفُوۡهَآ اِنَّا بِمَآ اُرۡسِلۡتُمۡ بِهٖ کٰفِرُوۡنَ (34:34) جب بھی ہم نے کسی ایسی شخصیت کو' رسول کو' نبی کو اس قوم کی طرف بھیجا جو جہنم کے شعلوں میں مبتلا تھی کہ وہ اسے تنبیہ کرے' اس کو اس خطرے سے آگاہ کرے' اس تباہی کی وارننگ دے جو آنے والی ہے یا جو آ رہی ہے تو اس کی سخت مخالفت ہوئی۔ قرآن نے کہا ہے کہ وَ مَآ اَرۡسَلۡنَا (34:34) یعنی یہ ہر رسول کے ساتھ' ہر اُس شخص کے ساتھ ہوتا ہی رہا ہے' جس نے غلط رو انسانوں کو اس خطرے سے آگاہ کیا' جو ان کی غلط روی کے باعث آنے والا تھا تو مترفین نے ہمیشہ اس کی مخالفت کی۔ یہ مترفین کون ہیں جو قرآن ہمیشہ کہتا ہے کہ کوئی بھی رسول ایسا نہیں جس کے ساتھ یہ ماجرا نہ گزرا ہو؟ خاص طور پہ یہ مترفین کے متعلق کہہ رہا ہے کہ اُنہوں نے اس کی مخالفت کی۔ انہی مترفین کے متعلق شروع ہی میں عرض کر دوں۔ قرآنِ کریم نے جہنم کے متعلق بتایا ہے۔ اس کی تفصیل دینے کے بعد وہ یہ کہہ رہا ہے کہ اس کے اندر یہ جو لوگ تھے یا جو ہوں گے وہ اِنَّهُمۡ کَانُوۡا قَبۡلَ ذٰلِکَ مُتۡرَفِیۡنَ (56:45) اس سے پہلے ہی بتا چکا ہے کہ یہ مترفین تھے۔ پہلے ہی میں نے عرض کر دیا تھا کہ قرآن کا ایک تو یہ فیصلہ ہے کہ ہر رسول کی مخالفت ان مترفین نے کی اور مترفین کے متعلق بتایا کہ یہ لوگ اہلِ جہنم ہیں۔ یہ تو کوئی عجیب ہی قسم کا طبقہ ہوا جس پورے کے پورے طبقے کے متعلق یہ کہا جا رہا ہے کہ وہ جہنم میں ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ کون لوگ ہیں؟

آخر قرآن حکیم کے ہوتے ہوئے ہمیں یہ صحیح طور پر اسلام سمجھ میں کیوں نہیں آتا؟

میں نے یہ عرض کیا ہے کہ ہمارے ہاں قرآنِ کریم صحیح طور پہ سمجھ نہیں آتا اس کی وجہ سے اسلام صحیح طور پہ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ بات ہی نہیں ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا بلکہ غلط اسلام سمجھ میں آتا ہے اور اس سے خلافِ اسلام چیزیں اسلام بن جاتی ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ قرآنِ کریم جیسی کتاب ہمارے پاس موجود ہے' محفوظ ہے' ایک ایک حرف برحق ہے' اس کو اتنا پڑھا جاتا ہے کہ دنیا کی کوئی اور کتاب اتنی نہیں پڑھی جاتی؟ اس کے باوجود پھر یہ کیا ہے کہ قرآن کے خلاف سب کچھ ہے: عقائد اس کے خلاف' معاشرہ اس کے خلاف' مسلک اس کے خلاف۔ یہ ہمارے ساتھ ہوا کیا ہے؟ عزیزانِ من! یہ سمجھنے کی بڑی اہم چیز ہے۔ اور یہ اس لیے بھی آج کل اہم ہو گئی ہے کہ اب اسلام کے احیائے نو کا' نشاۃِ ثانیہ کا' بڑا چرچا ہے کہ دوبارہ اس کو زندہ کیا جائے گا۔ بڑی کوششیں ہو رہی ہیں کہ خدا کا شکر ہے' فضل ہے' اسلام دوبارہ زندہ ہو رہا ہے۔ یہ اسلام نہیں زندہ ہو رہا' یہ وہ چیز ہے جس کے خلاف ہمارا یہ نوجوان طبقہ جس اسلام سے

متنفر ہو کر الگ ہوا ہے' یہ اسی کو تقویت پہنچائی جا رہی ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ اس کی بنیادی وجہ کیا ہوئی؟ بنیادی وجہ ہوئی کہ قرآن کی ابتدائی تفسیریں یا تفسیر ملوکیت کے دور میں مرتب ہوئی۔

لفظ ملوکیت کا بنیادی مفہوم

ملوکیت صرف بادشاہت کا ہی نام نہیں ہوتا۔ وہ ایک ایسا معاشرہ ہوتا ہے جس میں جاگیرداری' سرمایہ داری' مذہبی پیشوائیت اور پھر یہ بادشاہت و شہنشاہت' یعنی انسانی حکومت' خواہ وہ ایک فرد کی حکومت ہو یا افراد کے مجموعے کی' جسے آج مغربی جمہوریت کہتے ہیں' یہ ہوتی ہے ملوکیت۔ ہماری پہلی تفسیریں جو مرتب ہوئیں یہ اس زمانے میں مرتب ہوئیں اور انہی تفاسیر کی رو سے اب ہمارے ہاں ان کے ترجمے بھی ہوئے اور قرآنِ کریم کے تراجم میں بھی وہی اصطلاحات اور وہی الفاظ استعمال ہوئے جو اس دور میں مروج تھے۔

''مترفین'' کا ترجمہ دوسروں کی کمائی پر عیش کرنے والوں کے بجائے آسودہ حال کیوں کیا جاتا ہے؟

مترفین کا آپ نے دیکھا کہ یہ کتنی اہم چیز ہے جو بتائی گئی ہے کہ ہمیشہ ان کی طرف سے مخالفت ہوتی رہی اور قرآن نے بتایا یہ ہے کہ یہ ہے وہ طبقہ جو جہنم میں ہوگا۔ مترفین کا آپ ترجمہ دیکھیے تو لکھا ہوگا: آسودہ لوگ' خوشحال لوگ یعنی یہ جو سارے آسودہ اور خوشحال ہیں یہ سب جہنم میں ہیں۔ اب دیکھیے کہ اس کی تہ میں بات کیا ہوئی۔ یہ جو دور ہوتا ہے سرمایہ داری اور جاگیرداری اور ملوکیت وغیرہ کا' اُس میں ایک جو طبقہ ہے' وہ نہایت آسودہ حال ہوتا ہے' خوشحال ہوتا ہے' وہ دوسروں کی محنت کی کمائی پر خوشحال ہوتا ہے۔ دوسرے غریب رہ جاتے ہیں' مفلس رہ جاتے ہیں اور محتاج رہ جاتے ہیں۔ اب جو غریب اور مفلس ہے اس کو اگر یہ چیز کسی طرح سے بتائی جائے کہ تمہارے افلاس اور غریبی کا ذمہ دار یہ طبقہ ہے' جو تمہاری ساری محنت کی کمائی کو لوٹ کر لے جاتا ہے' تمہیں اس حال پہ چھوڑ دیتا ہے' آپ عیش کرتا ہے تو وہ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہونگے۔ اب اس طبقے کے پاس یہ جو غریب اور مفلس ہیں غلط قسم کے مذہبی پیشوائیت والے آتے ہیں۔ وہ اس طبقے کو تھپکیاں دے دے کر سلاتے رہتے ہیں کہ یہ جو غریبی' مفلسی ہے' یہ خدا کے مقرب بندوں کی نشانی ہے۔ یہ جو تم آسودہ حال لوگ دیکھتے ہو' خوشحال لوگ دیکھتے ہو' یہ سب جہنمی ہیں۔ چار دن کی دنیا کا کھیل ہے' بس کھیل لینے دیجئے' آپ دیکھیے آخرت تو ہمارے ہی حصے میں ہے۔

ایک گہری سازش تاکہ غریبوں کی توجہ مترفین کی طرف جانے ہی نہ پائے

ان کو اس سے مطمئن کیا جاتا ہے کہ تمہاری ہی زندگی حقیقت میں خدا کی رضا مندی کے ساتھ ہم آہنگ ہے' یہی اسلام ہے۔ یہ

طبقہ جہنمی ہے، تم جنت میں جانے والے ہو۔ اور اس کے لیے پھر قسم قسم کی وہ وضعی روایات دیں۔ خود نبی اکرم ﷺ کے متعلق یہ چیز کہی کہ اتنی غریبی کی حالت میں زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ پیٹ پہ پتھر باندھے ہوئے، چالیس چالیس دن گھر میں چولہا نہیں جل رہا۔ میں عرض کرونگا کہ یہ سب کچھ استغنیٰ تھا، سب کچھ ہوتے ہوئے دوسروں کی ضروریات کو پوری کرنے کے لیئے اپنے اوپر کچھ پابندیاں وارد کی جائیں تو اس افلاس کو غریبی نہیں کہتے لیکن بتایا یہ گیا کہ یہ جو فقر ہے، جو غریبی ہے، جو افلاس ہے، یہ میرے لیے باعثِ فخر ہے۔ پھر اس قسم کی روایات وضع کی گئیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: یا اللہ! میری زندگی غریبوں میں گزار، میری موت غریبوں میں آئے، میرا حشر بھی غریبوں کے ساتھ ہو۔ غریب بڑے خوش ہوگئے کہ حضور رسالت مآب ﷺ نے دعا کی ہے۔ وہ تو اپنے دل سے چاہتے ہونگے کہ یا اللہ! ہماری غریبی نہ کہیں دور ہو جائے کہ ہم معیتِ رسول ﷺ سے محروم ہو جائیں:

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے

ہامان، فرعون اور قارون سے مل کر ہی ایک مثلث بنتی ہے

ادھر ان کی توجہ ہی نہ آنے دو کہ دیکھیں تو یہ چیز ہو کہ ہاں یہ ہے وہ طبقہ جس کے متعلق قرآن نے کہا تھا کہ یہ سب جہنمی ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اس طبقے کی طرف سے کتنی بڑی سازشیں ہوتی ہیں۔ اسی لیے جب بھی کہیں فرعون آتا ہے، ملوکیت آتی ہے تو اس کے ساتھ ہامان بھی آتا ہے، اس کے ساتھ قارون بھی آتا ہے۔ ان کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ حضرتِ موسیٰؑ کی تعلیم پیش نہ ہونے دی جائے۔ آپ کے ہاں ایک لفظ مترفین کا ترجمہ یہ آسودہ لوگ ہوگئے تو آپ دیکھیے بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ آسودگی اور خوشحالی ان کی نگاہوں کے اندر خلافِ اسلام ہوگئی، خدا کے قرب کے خلاف ہوگئی، رسالتمآب ﷺ کی تمناؤں اور دعاؤں کے خلاف ہوگئی۔ اور فقر کی، فاقے کی، افلاس کی، محتاجی کی، غریبی کی زندگی عین خدا کی منشا کے مطابق اور اس میں وہ مست ہو کر بیٹھ گئے۔ پہلے تو یہ ہے کہ قرآن کریم نے دنیا کی زندگی کی خوشحالیوں اور آسودگیوں کو اللہ تعالیٰ کی نعمت قرار دیا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی زندگی کے متعلق قرآنِ حکیم کا ارشاد

نبی اکرم ﷺ کے متعلق جو قرآن نے اسوہ پیش کیا ہے، کہا ہے کہ **وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَأَغْنٰى** (93:8) حضور ﷺ کو اپنی نعمت کو یاد دلایا ہے کہ ہم نے دیکھا تھا کہ ابتدائی زندگی میں واقعی غریب آدمی تھے اور ہم نے تمہیں غنی بنا دیا۔ قرآن تو یہ شہادت دے رہا ہے۔ یہ شہادت تو نہیں پیش کی جائے گی بلکہ بتایا یہ جائے گا کہ **الفقر فخری** غریبی اور محتاجی میرے لیے باعثِ فخر ہے اور وہ جو خدا کہہ رہا ہے کہ خدا کی نعمت تھی جو آپ کو غنی بنا دیا وہ نہیں بتایا جائے گا۔ آپ دیکھیں گے کہ قرآن سے جو ہمارا بُعد ہے، دوری ہے، اس کا

بیشتر حصہ اس کے اوپر مبنی ہے۔ مترفین کا ترجمہ آسودہ حال لوگ کر دیا گیا۔ قرآنِ کریم اس دنیا کی زندگی میں قرآن کی حامل قوم کو بلند ترین مقامات پر دیکھتا ہے کہ یہ اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ (3:139) ہیں۔ یہ مقام دیتا ہے تا کہ کوئی قوم ان کا مقابلہ نہ کر سکے۔ دولت، حشمت، قوت، سطوت، حکمرانی ان تمام چیزوں کی یہ قوم وارث ہے۔ اور اتنی بلندیوں کے اوپر ہے کہ کوئی دوسری قوم اس کا مقابلہ نہ کر سکے لیکن ایک دولت اور حشمت دوسروں کی محنت کی کمائی کو ہتھیا لینے سے آتی ہے۔ یہ چیز قرآن کے نزدیک سب سے بڑا جرم ہے، قرآن اسے کسی کی محنت کا استحصال (Exploitation) کہتا ہے جسے آپ معاشی نظام کہتے ہیں۔

قرآنِ حکیم کے معاشی نظام میں محنت کشوں کا کوئی الگ طبقہ نہیں ہوتا

قرآن نے دو ہی معاشی نظام بتائے ہیں: ایک نظام وہ ہے جس میں ہر شخص محنت کرے بجز ان کے جو کسی طرح سے محنت کرنے سے معذور ہوں اور دوسرا نظام وہ ہے جو محنت کر سکتا ہے مگر محنت کر کے نہیں کماتا اور صرف کھاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ لَّيۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (53:39) جو محنت کرنے کے قابل ہے اور محنت نہیں کرتا تو اس کو کچھ نہیں ملنا چاہیے۔ تو ایک دوسرا نظام ہے۔ محنت کرنے والا جو ہے، اس کے متعلق بھی یہ چیز کہی کہ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰى (53:38) کوئی بوجھ اٹھانے والا، کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا، ہر شخص اپنا اپنا بوجھ اٹھائے گا۔ یہ جو قرآنی معاشرہ ہے، یہ اس کی جزئیات بیان ہو رہی ہیں۔ اس میں ہر شخص جو محنت کرنے کے قابل ہے، وہ محنت کرے گا تو اس کو کچھ مل سکے گا۔ اور جتنا کچھ ویسے ملنے کی بات ہے جسے آپ صدقہ خیرات کہتے ہیں، تو اس میں صدقہ خیرات ہوتا نہیں۔ وہ معاشرے کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ ان لوگوں کی پرورش کرے جو محنت کرنے سے کسی طرح معذور ہو جائیں ورنہ جو کام کرنے کے قابل ہے وہ محنت کرے۔ اسلام کی رو سے یا قرآن کی رو سے یہ کوئی الگ طبقہ نہیں ہوتا جسے ہم آجکل محنت کش کہتے ہیں۔ ہم نے تو ایک طبقہ ہی الگ بنا دیا۔ وہ اس سرمایہ دار کو بنانا پڑتا ہے کیونکہ یہ محنت کش نہیں ہوتا۔ انہوں نے ایک طبقہ محنت کش بتایا۔ اور پھر وہ کچھ ذلیل سا ہو گیا، آہستہ آہستہ انہوں نے ان کے دلوں میں Inferiority Complex (احساس کمتری) داخل کر دیا۔ وہ محسوس کرتا ہے اپنے آپ کو کہ یہ بڑے لوگ ہیں، ہم چھوٹے لوگ ہیں۔ اسلام میں کوئی دو طبقے نہیں ہیں۔ محنت نہ کرنے والے کے لیے تو وہ ایک ڈھنگ کی روٹی بھی نہیں دیتا۔ کہتا ہے کہ لَّيۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (53:39) تو یہ طبقے کہاں سے آ جائیں گے۔ یعنی جو محنت نہیں کرتا اس کو تو کچھ ملتا ہی نہیں۔ قرآن کی رو سے یہ جو معاشرہ ہے اس میں معاوضہ محنت کا ملتا ہے۔ معاوضے کا بھی لفظ نہیں ہے، یہ میں ابھی عرض کرونگا، انہیں محنت سے ملتا ہے۔

قرآنِ حکیم کے معاشی نظام کے برعکس ربوٰ کا ایک دوسرا نظام

اس کے برعکس ایک دوسرا معاشی نظام ہے جس میں سرمائے پر معاوضہ ملتا ہے‘ محنت کا نہیں ملتا‘ صرف روپیہ Invest (لگانے) کرنے سے ملتا ہے۔ یہ کہاں سے ملتا ہے؟ روپیہ جو ہے‘ خالی رکھا ہوا ہے‘ وہ مرغی تو ہے نہیں کہ وہ انڈہ دے دیتی ہے۔ آپ کا روپیہ پڑا رہے‘ آپ دس ہزار روپیہ‘ لاکھ روپیہ‘ بکس میں بند کر کے رکھیے‘ جب نکالیے اتنا ہی نکلے گا بجز اس کے کہ آپ کا کوئی بچہ یا نوکر بیچ میں سے اڑا کر نہ لے جائے۔ روپیہ اتنا ہی نکلے گا‘ روپیہ بچے نہیں دیتا۔ یہ روپیہ جو بڑھتا ہے‘ سوال یہ ہے کہ یہ بڑھتا کس طرح سے ہے؟ اس سے کوئی کچھ Produce (پیدا) کرتے ہیں‘ یہ وہی ہے جس کو کہتے ہیں کہ کچھ پیدا کرتے ہیں۔ محنت اس کو کہتے ہیں‘ کمائی اس کو کہتے ہیں یعنی پیدا کرنا‘ اس میں کوئی پیدا کرنے والا ہے۔ محنت کش طبقہ وہ کچھ پیدا کرتا ہے۔ یہ اپنے اس روپے کے زور سے‘ جو کچھ وہ محنت کش طبقہ پیدا کرتا ہے‘ اس میں شامل کر دیتا ہے‘ اس طرح سے اس کا روپیہ بڑھتا ہے۔ یہ ایک دوسرا نظام ہے جو اس نظام کے برعکس ہے‘ جو قرآن نے قائم کیا تھا۔

قرآن کے نزول کے زمانے میں‘ کیپٹل ازم یا سرمایہ دارانہ نظام کی‘ یہ جو اصطلاحات ہیں‘ یہ ابھی رائج نہیں ہوئی تھیں۔ یہ جسے ہم Capitalistic System (سرمایہ داری نظام) کہتے ہیں‘ اس میں سرمایہ داری کا لفظ تو آ ہی نہیں سکتا تھا‘ کیونکہ یہ تو فارسی والوں کا لفظ ہے۔ قرآنِ کریم نے اس کے لیے جو اصطلاح استعمال کی ہے‘ وہ ہے ربوٰ۔ یہ ایک نظام ہے‘ جس میں صرف روپیہ ہی وہ شے ہے جو دوسرے کی محنت کے ماحصل کو چھین کر لے آتا ہے‘ روپیہ بڑھتا رہتا ہے۔ قرآن کریم نے اس نظام کو ربوٰ کا نظام کہا ہے۔ اس کا ترجمہ سود ہوا ہے۔ اب یہ ہمارے ہاں کے ماہرین بیٹھے ہوئے ہیں‘ برسوں سے طے کر رہے ہیں کہ کونسا سود حلال ہے‘ کونسا حرام ہے۔ یعنی یہ طے کر رہے ہیں کہ خنزیر کا کس حصے کا گوشت حرام ہے‘ اور کس حصے کا جائز ہے۔ کس چیز نے یہ الجھن پیدا کی ہے؟ اس کی الجھن سے ربوٰ کا یہ ترجمہ جو سود (Interest) کیا گیا ہے‘ یہاں ہمارے ہاں‘ پہلے تو وہ مہاجن ہوتا تھا بیاج والا‘ تو ذہن میں یہی ہوا کہ کسی سے قرضہ لیا جائے اور اس قرضے کے اوپر کچھ لیا جائے تو یہ تو سود ہوتا ہے اور یہ لینا حرام ہے۔ وہ قرضہ دینے کی بجائے اگر ہزار روپے کا زمین کا ٹکڑا خرید کر تمہیں دیدیتا ہے‘ اس کی آدھی بٹائی لے جاتا ہے‘ یہ حلال ہے۔ آپ نے دیکھا کہ ربوٰ کے اس ایک ترجمے نے آپ کو کہاں پہنچا دیا۔ آپ ربوٰ کا ترجمہ نظامِ سرمایہ داری کیجیے‘ ساری بات حل ہو جاتی ہے۔ وہ نظام‘ جس میں روپیہ بغیر محنت کے بڑھتا ہے‘ یہ ربوٰ کا نظام ہے‘ اسے آج کیپٹل ازم کہتے ہیں‘ سرمایہ داری کہتے ہیں‘ یہ نظام حرام ہے۔ قرآنِ کریم نے صرف اس ایک نظام کے متعلق کہا ہے کہ اگر تم اس سے باز نہ آئے تو خدا اور رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلانِ جنگ

ہوگا۔ آپ دیکھیے تو سہی کہ سوال یہ نہیں تھا کہ بنک کا سود حلال ہے اور فلاں سود حرام ہے' وہ تو دو متضاد نظام ہیں جن کے مابین تصادم ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ربوٰ کے نظام کے خلاف ہی جہاد کیا تھا

ایک قرآنی نظام ہے اور اس کے برعکس آپ کے ہاں یہ ایک نظام ہے' جسے آج کی اصطلاح میں کیپٹل ازم یا سرمایہ دارانہ نظام کہتے ہیں۔ نظام نہ بھی کہیے تو قرآن نے تشریح کر دی کہ اگر کوئی محنت کرتا ہے تو اس سے اس کو کچھ مل سکتا ہے۔ جب اُس نے کہا کہ جو محنت نہیں کرتا' اسے کچھ نہیں ملتا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خالی روپے کے اوپر کچھ نہیں مل سکتا۔ میں نے عرض کیا ہے کہ اس زمانے میں سرمایہ داری نظام کی یہ اصطلاح رائج نہیں تھی اس لیے قرآن نے ربوٰ کو اصطلاح کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اس زمانے کی اصطلاح ہی یہ تھی۔ اتنا بڑا انقلاب جو حضرتِ موسیٰؑ کے ہاتھوں لایا گیا تھا' یہ کس معاشرے یا کس نظام کے خلاف تھا؟ یہ اس نظام کے خلاف تھا' جس میں باطل کے نظام کی تینوں لعنتیں ایک جگہ جمع تھیں: فرعون ملوکیت کا مجسمہ' ہامان مذہبی پیشوائیت کا نمائندہ' قارون نظامِ سرمایہ داری کا حامی۔ اور حضرتِ موسیٰؑ کو اس کے خلاف بھیجا جا رہا ہے۔ یہ داستان تو بڑی لمبی چوڑی ہے' جہاں ان سے کہا جا رہا ہے کہ جاؤ فرعون کی طرف کیونکہ اِنَّـهٗ طَغٰى (20:24) وہ حدود فراموش ہوگیا ہے' سیلاب بن گیا ہے' اس میں سرکشی آگئی ہے' وہ تباہیاں مچا رہا ہے۔ بہت سی ہدایات دی گئی ہیں۔ سورۃ طٰہٰ کی ابتدائی آیات میں یہ سارا کچھ دیا گیا ہے۔ بڑی ہدایات دی گئی ہیں۔ حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ یہ کیا چیز ہے جو آپ کہہ رہے ہیں؟

مذہبی پیشوائیت کی تعلیم تو انسانی عقل وشعور کو مفلوج کر دیتی ہے

کہا یہ ہے کہ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا (20:15) ایک انقلاب جو اندر ہی اندر پک رہا تھا۔ یہ جو طبقہ ہے' اگر آپ اس کو کچلتے چلے جائیں گے' پامال کرتے چلے جائیں گے تو یہ ٹھیک ہے آپ اتنا انتظام کر لیجیے کہ ان کا گلہ دبا دیجیے کہ وہ آواز نہ نکال سکیں' ان کے دل پہ تو جبر نہیں کر سکتے کہ وہ محسوس بھی نہ کریں۔ یہ طبقہ محسوس کرتا ہے۔ ان میں ایک طبقہ ہے جو پیشوائیت کا سلایا ہوا ہوتا ہے' اس کو تو احساس ہی نہیں ہوتا۔ جس طبقے کو احساس ہوتا ہے' ملوکیت کا آہنی پنجہ اس کے گلے کو دبا دیتا ہے کہ آواز نہ نکلنے پائے۔ کیا بات ہے قرآن کی! اس آیت (20:15) میں کہا ہے کہ وہ انقلاب جو اندر ہی اندر غیر محسوس طور پر چل رہا تھا' اب ہم چاہتے ہیں کہ وہ نمایاں طور پر سامنے آجائے اس لیے آپ علیہ السلام کو فرعون کی طرف بھیجا جا رہا ہے کہ ذرا وہ انقلاب نمایاں طور پہ سامنے آجائے۔

ربٰو کے نظام کے برعکس قرآنی نظامِ ربوبیت کا ماحصل

کیا خصوصیت تھی اس انقلاب کی؟ کیا تھا وہ باطل کا نظام جس کو الٹنے کے لیے اس کی جگہ دوسرا نظام قائم کرنے کے لیے یہ اتنی بڑی تاکید ہورہی ہے؟ وہ شے چار لفظوں میں بات بتا دی۔ کہا ہے کہ لِتُجۡزٰی کُلُّ نَفۡسٍۭ بِمَا تَسۡعٰی (20:15) موجودہ نظام کی بجائے نیا نظام جا کر قائم کروتا کہ ہر کام کرنے والے کو اس کے کام کا صلہ مل جائے۔ یہ وہ نظام ہے۔ آپ دیکھتے ہیں' کہ قرآن کیا نظام قائم کرتا ہے؟ اس نظام کے قیام کو اتنی بڑی اہمیت دی کہ اس کے لیے دو پیغمبر بھیجے۔ بغیر سعی کے کچھ حاصل کرنے والا نظام ہوگا' یہ نظام اس کے الٹ ہے۔ اسی سورۃ میں آگے جا کر یہ جو اس کے الٹ نظام ہے جسے ہم جنتی نظام کہیں گے' کہا ہے کہ یہ ان کے ہاتھوں قائم ہوگا' جو وَ مَنۡ یَّعۡمَلۡ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَ ہُوَ مُؤۡمِنٌ (20:112) اس نظام کی صداقت پر یقین رکھے اور پھر صلاحیت بخش کام کرے کہ یہ نظام قائم ہو جائے۔ اب سوال یہ ہے اس صلاحیت بخش کام کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اس کے لیے کہا کہ فَلَا یَخٰفُ ظُلۡمًا وَّ لَا ہَضۡمًا (20:112) اس میں پھر ان کو نہ تو کسی کی طرف سے ظلم اور استبداد اور بے انصافی کا خوف ہوگا اور نہ ہی یہ کہ کوئی کسی کی محنت کو ہڑپ کر جائے گا۔ یہ ہے جنت' عزیزانِ من!

قرآن اپنے معاشی نظام میں محنت کا معاوضہ متعین کرنے کی بجائے اس کا ماحصل پیش کرتا ہے

آپ نے غور فرمایا کہ یہ دو نظام ہیں جو ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ آپ اس نظامِ سرمایہ داری کے اندر کسی قسم کی پیوند کاری سے اسلامی نظام نہیں قائم کر سکتے' وہ یہ دو نظام تو ایک دوسرے کی ضد ہیں' قرآن تو جو ربٰو کا نظام ہے' اس کے خلاف اعلانِ جنگ کر رہا ہے۔ اس نظام کے اندر آپ اصلاح کر کے اس کو اسلامی کیسے بنالیں گے؟ وہاں یا تو فرعون کا نظام رہے گا یا صاحب ضربِ کلیمؑ کا نظام آئے گا۔

عزیزانِ من! یہ نظام ان کے ہاتھوں سے قائم ہوا ہے' جنہوں نے اس نظام کی صداقت پر یقین رکھتے ہوئے صلاحیت بخش کام سرانجام دیئے ہوتے ہیں۔ اس نظام کے متعلق قرآن نے یہ بتا دیا ہے کہ یہ وہ نظام ہے جس میں کام کرنے والے کو اس کے کام کا ماحصل مل جائے۔ اب ہمارے ہاں تجزٰی کا ترجمہ بھی صحیح نہیں ہے جو کیا جاتا ہے کہ اس محنت کش کو اس کی محنت کا معاوضہ مل جائے۔ یہ تو ایک فریب ہے کہ سارا دن مزدور کام کرے' اور اس کا معاوضہ وہ متعین کرے جو کام پہ لگائے۔ یہ جو مزدور کا اس دن کی محنت کا معاوضہ ہے وہ کون متعین کرے گا کہ کتنے پیسے ہے؟ مزدور تو متعین نہیں کرتا۔ یہ جو کام پہ لگانے والا ہے وہ متعین کرتا ہے۔ وہ تو وہی بات ہوگئی کہ وہ جو متعین کرے۔ یہ جو آج کل کی اقتصادیات (Economics) ہے' نظامِ سرمایہ داری ہے' اس میں یہ چیز اس سے

متعین ہوتی ہے جسے آپ سپلائی اینڈ ڈیمانڈ (طلب و رسد) کہتے ہیں۔ مکان بنانے والا صبح مارکیٹ کے اندر جاتا ہے' یہاں سے وہاں تک مزدور بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں۔ اب تو ان میں کمی آ گئی کیونکہ ہمارا اتنا مزدور باہر چلا گیا ورنہ عام طور پہ یہاں صبح کو مارکیٹ میں مزدور بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ مکان والا جاتا ہے تو وہ جو مزدور ہیں' وہ نہیں کہتے کہ ہاں صاحب! ہم جانے کو تیار ہیں بشرطیکہ آپ ہمیں دس روپے روز دیں' یہ اس لیے ہے کہ وہاں بیٹھے ہوتے ہیں دس اور اس کو ایک صرف چاہیے' وہ اپنی شرائط کیسے منوائیں گے۔ یہ مکان بنانے والوں نے جو طے کر رکھا ہے کہ اب آجکل کی دیہاڑی ان کی یہ ہوگی۔ اگر وہ اتنے زیادہ ہیں جن میں سے اس نے یہ چننا ہے تو جس شرط پہ یہ چاہے گا وہ اس کے ساتھ آ جائیں گے کیونکہ سپلائی زیادہ ہے اور ڈیمانڈ کم' اگر وہ کم ہیں اور مکان بنوانے والوں کی ضرورت زیادہ ہے تو پھر ہوسکتا ہے کہ وہ تھوڑا سا اس کے ساتھ اصرار کریں ورنہ یہ جو بیچارہ مزدور ہے' اس کو رکھا ہوا ہی ایسے ہے کہ وہ تو Hand to mouth (بمشکل گزارہ کرے) ہے' روز اس کو ملتا ہے تو بیوی بچوں کا پیٹ پالتا ہے۔ ایک دن بھی ناغہ کر جاتا ہے تو اس کو قرضہ لینا پڑتا ہے۔ وہ اس حالت میں ہوتا ہے' وہ Afford (برداشت) ہی نہیں کرسکتا کہ اصرار کرے یا اس کے ساتھ کچھ سودا کرے کہ نہیں صاحب! اتنا نہیں' میں اتنا لونگا۔ وہ تو غنیمت سمجھتا ہے کہ مجھے مزدوری مل گئی ہے' جتنے پہ بھی یہ لے جائے گا وہ بیچارہ چلنے کو تیار ہو جائے گا۔ ہمارے ہاں ایک پنجابی محاورہ ہوا کرتا تھا' وہ اس کی بڑی صحیح تصویر تھی: ''بھا کن وگاڑیا: رات دیاں بھکیاں ❶ نیں''۔ عزیزانِ من! یہ بڑی عجیب چیز ہے ''رات دے بھوکے نوں تے جس بھاتے کہو' او تیار ہو جاندا ❷ اے''۔ نظامِ سرمایہ داری یہ ہے کہ پہلے ان کو بھوک سے مارو اور پھر آپ اپنی شرطیں منواؤ۔ اس کا متبادل (Alternate) غریب کے پاس ہوتا ہی نہیں ہے اور پھر ان اوپر والوں یعنی Capitalists (سرمایہ داروں) کا جتھہ ہوتا ہے' ہر جگہ سے وہی بھاؤ ملتا ہے' اس کو وہی مزدوری ملتی ہے۔ یہ ہے جو ایک نظام ہے۔ جسے نظامِ سرمایہ داری میں Supply and Demand (طلب و رسد) کہتے ہیں۔

ہر رسول یا ہر نبی کی مخالفت کی اصل وجہ نظام سرمایہ داری کا استحکام ہی تھا

قرآن کے نظام کے علی الرغم یہ نظام قائم ہوا ہے' یہ اس کی ضد ہے۔ اِس نظام کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ خدا اور رسول اس کے خلاف اعلانِ جنگ کریں گے۔ یہ نظام ہے جو اس دور میں ہے جسے قرآن کریم نے ربوٰ سے تعبیر کیا ہے اور یہ نظام چلانے والے

---

❶ بھاؤ کس نے خراب کیا؟ یہ کیا رات کے بھوکوں نے۔

❷ رات کے بھوکے کو تو جس بھاؤ پہ کہو گے' وہ کام کے لیے تیار ہو جائے گا۔

جو لوگ ہیں انہیں مترفین کہا گیا ہے۔ یہ ترف (ت ر ف) ہے جہاں سے مترفین ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں ''دوسروں کی کمائی پر عیش کی زندگی بسر کرنے والے''۔ یہ ترجمہ کیجیے بات سمجھ میں آجائے گی لیکن کیا یہ ترجمہ کرنے دیتے تھے؟ نہیں بالکل نہیں۔ اب بات سمجھ میں آئی کہ وَ مَآ اَرۡسَلۡنَا فِیۡ قَرۡیَۃٍ مِّنۡ نَّذِیۡرٍ اِلَّا قَالَ مُتۡرَفُوۡهَآ اِنَّا بِمَآ اُرۡسِلۡتُمۡ بِهٖ كٰفِرُوۡنَ (34:34) ''جب بھی ہمارا کوئی رسول آیا'' بات دیکھیے کس طرح سے خود سمجھ میں آجاتی ہے ''تو یہ جو اس نظام کے حامل تھے' جو دوسروں کی محنت کی کمائی پر عیش کی زندگی بسر کرتے تھے' انہوں نے اس رسول کی مخالفت کی''۔ نظر آتا ہے کہ رسول کوئی ایسا نظام لا رہا تھا' جس میں یہ جو ربوٰ کا نظام تھا' اس سے اس کی بنیادیں تک اکھڑ جاتی تھیں اور اس کی جگہ کوئی دوسرا نظام آتا تھا جسے یہ پسند نہیں کرتے تھے۔ یہ تھی اُن کی طرف سے فکر۔ ہمارے ہاں کبھی یہ بتایا ہی نہیں جاتا کہ یہ جو رسول آتے تھے' وہ کیا نظام لاتے تھے۔ اتنی سی ہی چیزیں ہمارے ہاں آتی ہیں کہ یہ بتوں کی پرستش سے روکتے تھے' بری بری رسموں سے روکتے تھے' نظام کا تصور ہی نہیں دیا جاتا۔ قرآن نے کہا کہ قَالَ مُتۡرَفُوۡهَآ اِنَّا بِمَآ اُرۡسِلۡتُمۡ بِهٖ كٰفِرُوۡنَ (34:34) اس قوم کے دولت مند طبقہ نے' جو دوسروں کی کمائی پر عیش وعشرت اور تن آسانی کی زندگی بسر کرنے کا عادی تھا' اس پیغمبر سے صاف کہہ دیا کہ تم جو کچھ لے کر ہماری طرف آئے ہو' ہم اسے ماننے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں۔ قرآنِ کریم نے ایک لفظ مترفوھا میں ساری بات واضح کر دی کہ یہ جھگڑا کیا چلا آرہا ہے' ان دونوں کی آپس میں یہ کشمکش کیا تھی' یہ کشاکش کیا تھی۔ اب' عزیزانِ من! یہ نظامِ سرمایہ داری جسے قرآن نے ربوٰ کا نظام کہا ہے' میں قرآنِ کریم کا نظام تراش رہے ہیں' اس سے اس کی اصطلاحات بدلیں گی' اس کی کچھ شکلیں بدلیں گی مگر اس کی روح تو وہی رہے گی:

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں
اگرچہ پیر ہے آدم' جواں ہیں لات و منات

[اقبالؒ]

قرآنِ حکیم کے نزدیک خوف اور بھوک خدا کا عذاب ہے

یہ ربوٰ ہے وہ نظام اور مترفین ہے وہ طبقہ جو دوسروں کی کمائی پر عیش کی زندگی بسر کرتا ہے۔ قرآن مفلسی کو' بھوک کو' خدا کا عذاب قرار دیتا ہے' اور غنی ہونے پر تو نبی اکرم ﷺ کے اوپر اللہ تعالیٰ اپنا انعام گنا رہے ہیں۔ مترفین ہیں جو اس طرح سے دوسروں کی محنت کے ماحصل سے دولت اکٹھی کرتے ہیں۔ میں کہہ رہا تھا کہ اس تُجۡزٰی (20:15) کا ترجمہ ''معاوضہ'' نہیں ہونا چاہیے' یہ تو نظام سرمایہ داری میں Wages (اجرتیں) ہیں۔ یہ ترجمہ غلط ہے' یہ نظامِ سرمایہ داری کی پیدا کردہ اصطلاح (Term) ہے جو وہ مقرر

کر دیں: مثلاً یہ کہ تمہارے تین روپے روز اور تمہارے پانچ روپے روز۔ بھئی! کوئی معیار تو ہو کوئی حساب تو ہو؟ کہا کہ جی یہی آج کا ''بھاؤ'' ہے۔ یہ ''بھاؤ'' کس نے مقرر کیا ہوا ہے؟ انہوں نے جو اوپر کے لوگ ہیں' جو ان کو Employ (ملازم) کرنے والے ہیں۔قرآن نے تجزی (20:15) کہا ہے' قرآن نے Wages (مزدوری) نہیں کہا ہے' ''محنت کا ماحصل'' کہا ہے۔نظام یہ ہے کہ ''ہر شخص کو اس کی محنت ماحصل ملے گا''۔ وہ الگ بات ہے کہ اس نظام کے اندر یہ از خود اپنی ضروریات کے مطابق لے' جو زائد ہے وہ ان کے لیے دیدیگا جن کی محنت' ان کی ضروریات کو پورا نہیں کر رہی۔ یہ غصب نہیں' یہ سلب نہیں' یہ نہب نہیں' یہ Exploitation نہیں' یہ ہضم نہیں' یہ ظلم نہیں جو قرآن نے کہا ہے۔ظلم اور ہضم کیا ہی دو الفاظ قرآن کہہ گیا ہے! نہ سیاسی استبداد' نہ معاشی سلب و نہب۔کہا یہ گیا ہے کہ یہ مترفین کونسے ہیں؟

تقدس کے روپ میں مترفین کا دوسرا گروہ

عزیزانِ من! ابھی تک تو بات یہی آ رہی تھی کہ یہ جو Capitalists (سرمایہ داروں) کا طبقہ ہے' بڑے بڑے دولتمندوں کا طبقہ ہے' کیا یہ وہی ہے جن کو قرآن میں مترفین کہا گیا ہے۔عزیزانِ من! قرآن ہے' بہت دور تک پہنچتا ہے۔ وہ فرعون تک ہی نہیں رہتا' اسے پتہ ہے کہ فرعون کی جو فرعونیت ہے' جو ملوکیت ہے' یہ قائم ہی مذہبی پیشوائیت کے سہارے سے ہوتی ہے۔ یہ مقہور اور مظلوم طبقے کو تھپکیاں دے دے کر سلاتی ہے۔آپ دیکھیے کہ اس کو بھی قرآنِ کریم نے کس طرح مترفین کہا ہے۔کہا ہے کہ **وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِیْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ** (43:23)۔ وہی الفاظ ہیں جو سورۃ سبا میں ہیں۔کہا کہ اے رسول! تیرے ہی ساتھ یہ معاملہ نہیں ہو رہا' تجھ سے پہلے بھی ہم نے جتنے رسول بھیجے' ان میں سے ہر ایک کے ساتھ یہ ماجرا گزرا کہ **اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ** (43:23) مترفین نے اس کے خلاف بغاوت کی' سرکشی کی اور یہ کہا کہ **اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ** (43:23) یہ روش جس کے اوپر یہ معاشرہ قائم ہے' ہمارے اسلاف سے اسی طرح چلا آ رہا ہے' اس لیے ہم اس میں تبدیلی نہیں ہونے دیں گے کیونکہ ہمارے نزدیک صحیح راستہ' صحیح ثواب کی جو راہ ہے' وہ اسلاف کا راستہ ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ کون کہتا ہے؟ یہ Capitalists (سرمایہ دار) طبقہ تو یہ دلیل کبھی نہیں دیتا۔ یہ دلیل آتی ہی مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ہے کہ ہمارے ہاں اسلاف سے یہ چلا آ رہا ہے' اس میں تقدس ہے' یہ غیر متبدل ہے' یہی شریعت ہے' اس میں ہم تبدیلی نہیں آنے دیں گے' یہ ہمارے مذہب کے خلاف ہے' ہمارے مسلک کے خلاف ہے' اسلاف کی روش کے خلاف ہے۔یعنی ان کی طرف سے دلیل یہ دی جاتی تھی۔عوام کے دل میں بات یہ بٹھائی گئی ہوتی ہے کہ صحیح راستہ وہی ہے جو اسلاف سے چلا آ رہا ہو۔

قرآنِ کریم میں بار بار متعدد مقامات پہ یہ کہا ہے' اُن کی دلیل یہ دی ہے اور اس کے بعد کہا ہے کہ خواہ ان اسلاف کے راستے سے بہتر راستہ بھی کیوں نہ تمہیں دیا جائے' تم تب بھی قبول نہیں کرو گے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم اسے سوچنے کو ہی تیار نہیں ہیں کہ کونسا بہتر ہے اور کونسا اس سے بدتر ہے۔ اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا' ہم اس مسلک کے متعلق کھڑے ہوکر سوچنے کے لیے بھی تیار نہیں۔ اور عوام کو یہ کہہ کر بھڑکا دیا جاتا ہے کہ یہ شخص تمہیں تمہارے اسلاف کے راستے سے بہکانے کے لیے آیا ہوا ہے۔ وہ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ آیت ذرا آگے آتی ہے' میں تفصیل تو وہاں بیان کرونگا۔

مترفین کا طبقہ نوعِ انسانی کی عقل وفکر کے چراغ کو بجھانے والا' انسانیت کا سب سے بڑا دشمن ہوتا ہے

ایک فقرے میں' میں یہ عرض کردوں کہ کوئی ایسی روش' کوئی ایسا عقیدہ' کوئی ایسا قدم' کوئی ایسا حربہ' کوئی ایسا مسلک جو انسان کی عقل وفکر کو ماؤف کردے' اس کے دیئے بجھا دے' وہ اسلام کے خلاف انسانیت کا بدترین دشمن ہے اور دلیل یہ ہے کہ ہم اس کے متعلق سوچنے کو تیار ہی نہیں ہیں۔ تم دلائل دے رہے ہو' انہیں سمجھا رہے ہو' یہ ہمارے نزدیک Open to question ہی نہیں ہیں۔ یہ اتنا بڑا مسلمہ ہے کہ ہم تو اس کے لیے سوچنے کے لیے بھی تیار نہیں۔ یہ کونسا طبقہ ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ **اِنَّا عَلٰۤی اٰثٰرِهِمۡ مُّقۡتَدُوۡنَ** (43:23)۔ یہ دیکھیے اقتداء، اقتدی اور مقتدی سے مقتدون ہے۔ یہ ساری اصطلاحات ہی ہمارے ہاں کے مذہب کی ہیں۔ یہ ایک طبقہ ہے' جسے قرآن مترفین کہتا ہے۔ شاید آپ کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ ان کے پاس تو کوئی سرمایہ ہوتا ہی نہیں' انہیں یہ کیسے کہہ دیا۔ یہ کیا کمائی کرتے ہیں؟ یہ تو کچھ پیدا ہی نہیں کرتے' قوم یا ملک کی Production (پیداوار) کے اندر ان کا حصہ ہی کوئی نہیں ہوتا۔ آپ یہ تو دیکھیے کہ دوسرے کمائی کرتے ہیں' اُن کی کمائی پر ان کا گزارہ ہوتا ہے' یہ اُن سے بہتر زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ مزدور تو سارا دن ٹوکری اٹھا اٹھا کر پیدل چلتا ہے جبکہ ان کے ہاں تو موٹریں بھی ہوتی ہیں اور کسی پیداوار میں حصہ بھی نہیں لیتے۔ اسی پر قرآن کہتا ہے کہ ''ہم نے جس مسلک پر اپنے آباؤ اجداد کو دیکھا ہے ہم اس پر چلتے جائیں گے' اسے کسی صورت میں بھی نہیں چھوڑیں گے۔''

کسی Production (پیداوار) میں حصہ لیے بغیر دوسروں کی محنت کو سلب کرنے والے

عزیزانِ من! سوال اس کا نہیں ہے کہ ہم کس طبقے کو Capitalist یا سرمایہ دار کہتے ہیں۔ بنیاد اس کی یہ ہے کہ جو Production (پیداوار) کے اندر حصہ نہیں لیتا' Produce (پیدا) دوسرے کرتے ہیں اور یہ بغیر کام کیے' بغیر محنت کیے ہوئے ان کی پیداوار سے لے جاتا ہے' جو بغیر محنت کے لیتا ہے تو پھر تو پوچھو ہی نہیں' محنت والے کا تو کچھ مقرر ہے جو ملے گا' ان کی تو حد ہی

کوئی نہیں ہوتی، دیئے چلے جاؤ، بس دیئے چلے جاؤ۔ کہا ہے کہ ان مترفین کو یہ کیا زعم ہے جس کی بنا پر یہ سرکشی پہ اتر آتے ہیں۔ ہر رسول کی، ہر اس پیغام دینے والے کی، مخالفت پہ جو اترتے ہیں، کس زعمِ باطل کے اوپر یہ اترتے ہیں؟ قرآنِ کریم نے کہا کہ وہ بات یہ ہے کہ **وَ قَالُوۡا نَحۡنُ اَکۡثَرُ اَمۡوَالًا وَّ اَوۡلَادًا** (34:35) وہ کہتے ہیں کہ ہمارے پاس اس قدر مال و دولت ہے۔ ہمارا جتھہ ایسا زبردست ہے۔ جو کچھ ہمارے جی میں ہم کریں۔ کس کی مجال ہے جو ہمارا بال تک بھی بیکا کر سکے؟ اُس زمانے میں چونکہ قبائلی زندگی خاندان کی زندگی ہوتی تھی، اس لیے جتھہ اپنے قبیلے تک محدود ہوتا تھا۔ جس کا قبیلہ بڑا ہو، اس کی بڑی طاقت ہوتی تھی۔ آج کے دور میں وہ قبائلی زندگی نہیں رہی، اب پارٹی سسٹم ہوگیا ہے، جس کے ساتھ ووٹر زیادہ ہوں، جس کی پارٹی زیادہ مضبوط ہو، اسی کی طاقت بڑی ہوتی ہے۔ اب اس جتھے کا یوں ترجمہ ہو جائے گا۔ کہا ہے کہ کیا کہہ رہے ہو ہمیں کہ ہم تباہ ہو جائیں گے، ہم برباد ہو جائیں گے، ہمارے پاس اتنی مال و دولت ہے، ہمارا جتھہ اتنا مضبوط ہے کہ **وَّ مَا نَحۡنُ بِمُعَذَّبِیۡنَ** (34:35) ہمارا کوئی بال بیکا نہیں کر سکتا، پہلے کہا ہے کہ کوئی ہمارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ اس میں ایک اگلی بات بھی ہے وہ میں ذرا دو منٹ کے بعد عرض کرونگا۔ مترفین کے متعلق دو تین آیتیں اور ہیں وہ میں پہلے پیش کر دوں تا کہ بات سمجھ میں آجائے کہ مترفین ہے کیا۔

قوم کی تباہی کا سبب کام نہ کرنے والے طبقہ کی کثرت، اور کام کرنے والوں کے احترام میں فرق کا ہونا ہے

پہلے تو ہم نے دیکھ لیا کہ دوسروں کی محنت کو سلب Exploit کر کے خوشحالی، آسودگی اور عیش پرستی کی زندگی بسر کرنے والا ہی مترفین کا طبقہ ہے۔ وہ طبقہ دولت کی بنا پہ ہو یا مذہبی پیشوائیت کی بنا پہ، کوئی بھی طبقہ جو Production (پیداوار) کے اندر حصہ نہیں لیتا اور دوسرے کی Produce (پیدا) کی ہوئی کے اوپر تن آسانی کی زندگی بسر کرتا ہے، مترفین کے اندر آ گیا۔ قرآن کہتا ہے کہ اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوتا ہے۔ یہ تو غنیمت ہے کہ یہ طبقہ محدود رہتا ہے، ان کی آپس میں ہی جو رقابتیں ہوتی ہیں، وہ اس کو زیادہ پھیلنے نہیں دیتیں ورنہ آپ سوچیے کہ اگر کسی قوم میں کام نہ کرنے والا جو طبقہ ہے، وہ عام ہو جائے تو اسی دن قوم تو ڈوبی۔ وہ کہتا یہ ہے کہ اگر ان کی تعداد کی کثرت نہ بھی ہو، تو بھی اس نظام کے اندر یہ طبقہ جس کا خون نچوڑا جاتا ہے، جسے کمزور سے کمزور تر کیا جاتا ہے، اس کے بعد ساری قوم کمزور ہو جاتی ہے۔ اب دیکھیے تباہی والے طبقے کے متعلق کہا ہے کہ **وَ اِذَاۤ اَرَدۡنَاۤ اَنۡ نُّہۡلِکَ قَرۡیَۃً اَمَرۡنَا مُتۡرَفِیۡہَا فَفَسَقُوۡا فِیۡہَا** (17:16) جوں جوں تباہی قریب آتی جاتی ہے تو یہ نہیں ہے کہ یہ اس سے سوچ لیں کہ صاحب! اس کا نتیجہ تو تباہی ہے، اس لیے ہمیں اس سے باز آنا چاہیے۔ نہیں، بالکل نہیں۔ وہ اور زیادہ آگے بڑھنے لگتے ہیں اور طریقے سوچنے لگ جاتے ہیں اور کوشش کرنے لگتے ہیں، ایک انڈسٹری فیل ہونے لگتی ہے تو دو اور لگا لیتے ہیں کہ یہ لائن ان کے خیال میں زیادہ اچھی

ہے۔ اگر ان کے ہاں یہ اتنے اتنے جو پہلے سے سینما ہاؤس ہیں، کم کرایہ دیتے ہیں تو آپ دیکھتے ہیں کہ وہ ان کو گرا کر فلیٹ بنانے شروع کر دیتے ہیں کیونکہ وہ حساب کر لیتے ہیں کہ اس سے زیادہ سرمایہ آتا ہے۔ اس طرح وہ نظام کے قالب سے باہر نکلنے لگتے ہیں۔

قرآنِ حکیم کی پکار، اس کی وارننگ اور انجام

قرآن کہتا ہے کہ جب تباہی کے آثار آتے ہیں تو بجائے اس کے کہ وہ کھڑے ہو کر سوچیں کہ یہ کس نظام کا نتیجہ ہے وہ سوچ میں اور زیادہ بڑھ جاتے ہیں، اور دیگر طریقے سوچنے لگ جاتے ہیں۔ اس پر قرآن کریم نے کہا ہے کہ **فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا** (17:16) تو تباہی ان پر مستوجب ہو جاتی ہے اور پھر انہیں اس طرح ہلاک کر دیا جاتا ہے کہ ان کا نام ونشان تک باقی نہیں رہتا ہوتا۔ یہ ہے کہ مثلاً یہ اپنے اپنے مکانوں کو یا ان سینماؤں کو، جنہیں میں سینما ہاؤس کہہ رہا ہوں، گرا کر فلیٹ بنا رہے ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں یہی ہو رہا ہے اور جہاں بھی ہو رہا ہے وہ یہی ہے کہ یہ انہیں گرا کر ان کے اوپر فلیٹس بنا رہے ہیں۔ قرآن کے الفاظ عجیب ہیں! کہا ہے کہ ہم پھر اس پہ بُلڈوزر (Bulldozer) پھیر دیا کرتے ہیں۔ ان کو اس کا پتہ نہیں ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ اس میں کچھ کمی ہوئی ہے، اس میں کچھ خسارہ ہو رہا ہے دوسری لائن اختیار کر لو۔ انہیں پتہ نہیں ہے کہ اس نظام کے ذریعے جو تباہی آیا کرتی ہے تو **فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا** (17:16) ہوتا ہے، اس کے اوپر تو بلڈوزر (Bulldozer) پھر جایا کرتا ہے۔

عزیزانِ من! ایک اور جگہ بڑے ہی خوبصورت انداز میں قرآن کہتا ہے کہ یہ جو تباہیاں ہیں، یہ وہی ہیں، جو حضرتِ موسیٰؑ سے کہا تھا کہ یہ انقلاب، یہ تباہیاں، یہ تبدیلیاں، آہستہ آہستہ غیر محسوس طور پر آتی رہتی ہیں، انہیں Warn (متنبہ) کیا جاتا ہے کہ کینسر کے جراثیم تمہارے اندر ہو رہے رہیں، لیکن وہ پرواہ نہیں کرتے۔ کہتے ہیں کہ مجھے تو کبھی بخار بھی نہیں ہوا۔ انہیں اُس وقت پتہ چلتا ہے جب ان کے خون کے قطرے کا Analysis (تجزیہ) کر کے، اور Microscope (خورد بین) کے نیچے رکھ کر انہیں بتاتے ہیں کہ یہ اتنے پرسنٹ ہو گیا، اب بچنے کی کوئی شکل نہیں ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ وہ تبدیلی یوں محسوس طور پہ سامنے آتی ہے، ورنہ غیر محسوس طور پر تو وہ بہت پہلے سے چلی ہوئی ہوتی ہے۔ کہا ہے کہ **وَ كَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّ اَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ** (21:11) تاریخ کے اوراق کو پلٹ کر دیکھو، تمہیں کتنی قومیں نظر آئیں گی، جو بڑی بلند تہذیب کی مالک تھیں، بڑی دولتمند تھیں، بہت زیادہ، قوت وحشمت ان کا امتیازی نشان تھا لیکن اس کے بعد تم دیکھو گے کہ اس قوم کا نام ونشان تک مٹ گیا، ان کی صرف داستانیں باقی رہ گئیں۔ ان کی دولت وحشمت پر ان کے رقیب پڑ، کوئی دوسری قوم آ گئی۔ پھر وہ تباہی یوں آتی ہے۔

یہ تباہی اسی دن نہیں آ گئی تھی، کہا ہے کہ **فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ** (21:12)۔ کیا بات ہے قرآن کے الفاظ کی! کہ جب وہ

تباہی محسوس طور پر سامنے آ کر کھڑی ہوگئی تو اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ (21:12) انہوں نے بھاگنا شروع کیا کہ کسی طرح سے اس تباہی سے بچ جائیں۔ سنیئے عزیزانِ من! کس ڈرامائی انداز میں قرآن بیان کرتا ہے کہ انہوں نے بھاگنا شروع کیا۔ ان سے کہا کہ لَا تَرْكُضُوْا (21:13) ہمارے قانونِ مکافاتِ عمل نے انہیں پیچھے سے آواز دی کہ مت بھاگو اب بھاگ کر تم کہیں نہیں جاسکتے۔ ہمارے ہاں تو اس دور میں عزیزانِ من! یہ مثالیں موجود ہیں کہ پھر مجرم بھاگ کر کہیں نہیں جاسکتا۔ کہا ہے کہ وَارْجِعُوْا (21:13) پلٹ کر آؤ۔ اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ (21:13) اپنے ان خزانوں اور مال و دولت کی طرف جو تم نے دوسروں کی کمائی سے سمیٹ سمیٹ کر اکٹھے کیے تھے آؤ وہیں واپس آؤ۔ وَ مَسٰكِنِكُمْ (21:13) اور یہ بڑے بڑے محلات جو تم نے تیار کیے ہوئے تھے آؤ واپس وہاں پہنچو۔ اب سوال یہ ہے کہ وہاں کیوں پہنچو؟ لَعَلَّكُمْ تُسْئَلُوْنَ (21:13) تاکہ تم سے پوچھا جائے کہ یہ کس کی محنت کی کمائی سے بنے؟ یہ جو اس قدر بلند محل کھڑے ہوئے تھے بتاؤ کہ ان کی بنیادوں میں کس کی ہڈیوں کا چونا ہے ان کے پینٹ میں کس کے خون کی رنگینی شامل ہے۔ اس کا ہمیں جواب دو۔ وہاں واپس چلو پوچھنے والا تم سمجھتے تھے کہ کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ (21:14) وہاں اس کے سوا چارہ نہیں ہوگا کہ اعتراف کریں کہ ہاں صاحب! یہ سب ہم نے ظلم اور (استحصال) Exploitation سے اکٹھا کیا تھا لیکن اس وقت اس اعتراف کا اور اس تاسف کا کوئی فائدہ نہیں۔ جب نتائج مرتب ہو کہ سامنے آجائیں تو پھر وہ پلٹا نہیں کرتے فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ (21:15) وہ اس وقت کہتے چلے جائیں گے کہ انہوں نے جو زیادتیاں کیں وہ ان پر بے حد متاسف ہیں لیکن اس وقت کہنے کا کیا فائدہ۔

عزیزانِ من! دیکھیے اس تباہی پر کیا الفاظ آئے ہیں! حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ (21:15)۔ یہاں دو الفاظ آئے ہیں جو بڑے ہی Expressive (آئینہ دار) ہیں۔ کہا کہ ان کا انجام کیا ہوا؟ ان میں ایک ہے کہ حَصِيْدًا (21:15) کٹی ہوئی کھیتی ہوگئی ''اجڑا ہو کھیت جنوں کیندے ہیگے نیں''[1] اور دوسرا ہے خٰمِدِيْنَ (21:15) بجھا ہوا شعلہ جس میں زندگی کی حرارت ختم ہوجائے۔ یہ ہے مترفین کا انجام۔ اب سوال یہ ہے کہ ان کا وہ نظام کیا ہے؟ وَ قَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا (34:35) کہتے ہیں کہ ہمارے پاس بڑی دولت ہے بڑا جتھہ ہے۔ وَّ مَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ (34:35)۔ یہاں یہ معذبین بڑا جامع لفظ ہے کہ ہمارا کوئی بال بھی بیکا نہیں کرسکتا وہ یہ کہتے ہیں۔ اس دنیا کے اندر تو یہ چیز بالکل سامنے ہے۔ ان کو یہ زعم ہوتا ہے کہ ہم نے اتنے انتظامات کر رکھے ہیں اور روپے کے زور پر اپنی پارٹی کے جتھے کے زور کے اوپر ہمارے سامنے کوئی بول نہیں سکتا۔

---

[1] جسے کٹا ہوا کھیت کہتے ہیں۔

مکافاتِ عمل کے سلسلہ میں انکارِ آخرت کا تصور

عزیزانِ من! یہ بہت ہی غور سے سننے کی بات ہے۔ میں تو جب اس آیت پہ آتا ہوں تو پوچھیے نہیں' کتنے حقائق سامنے آجاتے ہیں۔ان سے کہا جاتا ہے کہ تم کہتے ہو کہ ہم نے یہاں ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ کوئی ہمارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا' ہم کسی کی بھی گرفت میں نہیں آسکتے' یہاں ہمارا کچھ بگاڑ نہیں ہوگا۔ باقی رہا یہ کہ ان سے کہا جاتا ہے کہ بھئی! زندگی یہیں تو ختم نہیں ہوتی' آگے بھی چلتی ہے' خدا کے ہاں بھی جانا ہے' مکافاتِ عمل تو وہاں بھی ہونا ہے' وہاں تمہاری کیا صورت ہوگی؟ کہا تو کہتے ہیں کہ **وَّ مَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَـآئِمَةً** (18:36) چھوڑو میاں! یہ باتیں پرانے زمانے کے لوگوں کی باتیں ہیں' کہاں کی قیامت' اور کہاں کا وہ حشر' اور کہاں کا وہ نشر' یہ تو کچھ نہیں ہے' تمہاری یہ باتیں سب واہمہ ہیں۔ **مَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَـآئِمَةً** (18:36) ہم نہیں سمجھتے کہ وہ انقلاب کی گھڑی (قیامت) آئے گی' واقعی یہ جو کچھ کرتے ہیں' اس معاشرے میں رہنے کی وجہ سے' وہ اپنے آپ کو مسلمان کہیں یا یہ کچھ کہتے ہیں' ان کے دل میں تو قانونِ مکافاتِ عمل کا کبھی خیال ہی نہیں گزرتا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ دوسرے کی محنت کا جو میں لیتا ہوں' وہ مجھے لوٹانا نہیں ہے جبکہ قانونِ مکافات یہ کہتا ہے کہ

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب

مگر یہ بات کبھی بھی ان کے دل میں نہیں گزرتی۔ اسی کا نام ہے انکار اور یہی ہے آخرت کی زندگی سے انکار۔

ملوکیت اور خلافت میں فرق' آخرت میں بخشش کے لیے بندوبست کے قصے اور اُن کی نوعیت

عزیزانِ من! اقرار کے تو معنی یہ ہیں کہ یہ معلوم ہو کہ مجھے اس کا حساب دینا ہے۔ یہ حضرت عمرؓ (581-644/45AD) سے پوچھا گیا تھا کہ ملوکیت اور خلاف میں فرق کیا ہے؟ کہنےؓ لگے کہ میں تو اتنا ہی جانتا ہوں کہ خلافت یہ ہے کہ ''مجھ سے پوچھا جائے گا کہ کہاں سے لیا تھا اور کہاں خرچ کیا تھا۔ اگر خدا کے معیار کے مطابق میں جواب دے سکا تو میں خلیفہ ہوں' ورنہ بادشاہ ہوں''۔ یہ بڑی معیاری چیز تھی۔ یہاں (18:36) پہلی بات تو یہ ہے کہ میاں! چھوڑو یہ ان لوگوں کے کہنے کی پرانی داستانیں ہیں کہ قیامت ہے اور خدا کے ہاں جانا ہے لیکن ایک اگلی بات بھی ہے کہ کبھی کبھی یہ خیال آہی جاتا ہے کہ **وَّ لَـئِنۡ رُّدِدۡتُّ اِلٰی رَبِّیۡ لَاَجِدَنَّ خَیۡرًا مِّنۡهَا مُنۡقَلَبًا** (18:36) اگر جیسا تم کہتے ہو' خدا کے ہاں جانا بھی پڑا' تو میں نے ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ ''او تھے وی موج ای موج لٹاں گے اسی ❶''۔ معاف رکھیے! اس سے بہتر لفظ نہیں مل رہا' کہتے ہیں کہ مطمئن رہو وہاں بھی میں نے اس کا انتظام کر رکھا

---

❶ ہم وہاں بھی عیش ہی اڑائیں گے۔

ہے کہ وہاں بھی ہمارے لیے عیش ہی عیش ہوگا۔

اب سوال یہ ہے کہ اس نے کیا انتظام کر رکھا ہے؟ وہ یہ ہے جو مذہبی پیشوائیت بتاتی ہے کہ جس طرح سے جی چاہے کمائی کرو' سال کے بعد اس میں سے اڑھائی پرسنٹ دیدیجیے' باقی سارا مال پاک ہو جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ میں نے یہ کر رکھا ہے' میں اس میں سے 2.5% دیدیتا ہوں۔ اور زیادہ بوجھل ہوگیا تو ایک مسجد بنا دیجیے' فلاں دارالعلوم میں خیرات کے سکے یا ٹکڑے دیدیجیے' نیاز بانٹ دیدیجیے' جنت میں موتیوں کا گھر مل جائے گا۔ اندازہ لگایئے! قرآنِ کریم کس طرح دکھتی رگ کو پکڑتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اوکوئی بات نہیں' اول تو اصل بات یہی ہے کہ مجھے اس پہ یقین نہیں' یہ تو زبانِ حال سے کہا' کیفیت اس کی یہ ہوتی ہے کہ اگر جیسا تم کہتے ہو' یہ ہو بھی جائے تو میں نے اس کا بھی انتظام کر رکھا ہے۔ میں اس سے خیر خیرات کے چنے بانٹ دیتا ہوں' فقیر کو پیسے دیدیتا ہوں' نیاز بانٹ دیتا ہوں' مسجد بنوا دیتا ہوں۔ آپ نے غور کرلیا! آپ اس حوالے ❶ کو تو کتنی دفعہ ہی اپنے ہاں درج کیجیے۔ یہ کتنا بڑا فریبِ نفس بھی ہے اور فریبِ نفس خود اپنا کھایا ہوا نہیں ہے' ہر وعظ میں ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ جس نے یہاں مسجد بنا دی' جنت میں اس کا موتیوں کا گھر بن گیا' اڑھائی پرسنٹ دیدیا باقی سارا مال جتنا بھی ہے وہ پاک ہوگیا۔

آپ ان کے ہاں جنت کے متعلق دیکھیے گا۔ نظر آتا ہے کہ نیک کام تو وہی ہیں' جو صرف امیر ہی کر سکتے ہیں مثلاً صدقہ' خیرات' زکوٰۃ اور حج اور اس کے بعد پھر یہ مسجدیں بنا دینا' یتیم خانوں کو کچھ دیدینا' ان کے دارالعلوموں کو دیدینا۔ روپے والا ہی یہ کچھ کرے گا۔ غریب کے لیے تو ثواب کا کام بس نماز پڑھنے والی ہی بات ہے۔ باقی وہ جتنے متعین طور پر بتاتے ہیں' جن کے بدلے میں جنت ملے گی' وہ سارے دولت مندوں کے لیے ہی ہیں۔ نماز وغیرہ جس پہ پیسہ کچھ نہیں خرچ ہوتا' یہ ان غریبوں کے لیے رکھ چھوڑا ہے' ان کو اس کے اندر مست رکھو۔ یہ جو Capitalists (سرمایہ دار) بعض اوقات کرتے ہیں' وہ تو اس قسم کے' صدقہ خیرات دینے والے ہوتے ہیں اور خدا کے ساتھ جو معاملہ کرتے ہیں وہ بڑا عجیب معاملہ ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ صاحب! جو ہم نے سودا کیا ہے' اگر اس کے اندر اتنا نفع ہوگیا تو میں نے خدا کی منت مان رکھی ہوئی ہے۔ ذہن میں یہ کہتا ہوگا کہ میں اس میں سے دس پرسنٹ دیدونگا۔ ان سے پوچھنے لگے کہ کیا منت مان رکھی ہے؟ کہا کہ ''میں کہیا ہیگا اے' پئی جے میں نوں ایہدے وچوں لکھ روپیہ فائدہ ہوگیا' تے میں سو نفل پڑھاں ❷ گا''۔ غریب عام طور پہ نفل ہی پڑھ سکتا ہے۔ وہ تو بخیل ہے جو یہ کہہ رہا ہے' خدا کے ساتھ بھی وہ سوداگری کر رہا ہے ورنہ اگر یہ نہیں ہے تو دولت مند کو بتایا یہی جاتا ہے کہ جتنی جی چاہے آپ دولت اکٹھی کر لیجیے' جس طرح جی چاہے اکٹھی کر لیجیے' بس

---

❶ یہ حوالہ ہے (18:36)

❷ میں نے کہہ رکھا ہے کہ اگر مجھے اسمیں ایک لاکھ روپیہ نفع ہوگیا تو میں سو نفل ادا کروں گا۔

ساری عمر میں ایک حج، کہیں ایک مسجد بنا دیجیے۔ آپ دیکھیے کیا الفاظ وہ بیان کرتا ہے کہ صاحب! اول تو یہ بات ہی نہیں، میں تو یہ مانتا ہی نہیں لیکن اگر ایسا ہو بھی گیا تو میں نے وہ انتظام کر رکھا ہے۔

جہنمی معاشرے میں جنت کی ہوا کہاں؟

عزیزانِ من! یہ خود فریبی کی انتہا ہے۔ نظامِ سرمایہ داری کے اندر دولت کی وجہ سے کوئی کام ایسا نہیں کیا جا سکتا جس کے بدلے میں خدا وہاں جنت دے۔ وہ تو معاشرہ ہی جہنم کا ہے، جہنم کے کسی گوشے میں بھی جنت نہیں ہوتی، جس طرح جنت کے کسی گوشے میں بھی جہنم نہیں ہوتا۔ جنت کے اندر جہنم نہیں بن سکتا۔ یہ جو چیز ہے یہ فریبِ نفس ہے۔ جہنمی معاشرے میں جنت کی ہوا نہیں آ سکتی۔

پہلے غلام بنانے کا جرم کرنا پھر چھڑا کر ثواب حاصل کرنے کا نتیجہ

قرآنِ کریم نے یہودیوں کی مثال دی ہے، یہ تو عجیب عجیب مثالوں سے بات سمجھا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے وہ سورۃ البقرۃ کی آیت ہے، بڑی عجیب چیز ہے۔ یہ بالکل وہی ہے جو میں نے ابھی مثال دی ہے کہ ''کوئی بات نہیں، میں صدقہ دیدیتا ہوں، یتیم خانہ میں پیاؤ بنا دیتا ہوں، مسجد کو دیدیتا ہوں، اور اس سے جنت خرید لیتا ہے''۔ کہا ہے کہ ان یہودیوں کی یہ صورت تھی کہ وہ اپنے ہاں کے غریبوں کو پہلے اپنی بستیوں سے نکال دیتے تھے۔ جب وہ نکال دیتے تھے تو جو دوسرے لوگ ان کو پکڑ کر لے جاتے تھے۔ اُس زمانے میں غلامی ہوتی تھی۔ جو بھی اس قسم کا اپنوں کے ہاں سے دھتکارا ہوا ہو، جیسا کہ بھیڑ بکری گلہ سے الگ ہو جائے، تو کوئی بھیڑیا اس کو اٹھا کر لے جاتا ہے۔ وہ دوسرے انہیں لے جاتے تھے۔ غلام بکا بھی کرتے تھے۔ کہا کہ یہ کرنے کے بعد پھر یہ آپس میں چندے کرتے ہیں کہ بھئی! غلام کو چھڑانا ایک بڑا ہی ثواب کا کام ہے، آؤ کچھ چندہ کریں۔ چندہ کر کے پھر وہ ان غلاموں کو چھڑا کر لاتے ہیں اور بہت خوش ہو جاتے ہیں کہ ہم نے تو جنت خرید لی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ کوئی ان سے پوچھے کہ انہیں جو گھر سے نکال دینا تھا، کیا وہ بھی بڑا ثواب کا کام تھا؟ پہلے ان کو تم نے خود گھر سے نکال کر غلام بنایا اور پھر ثواب حاصل کرنے کے لیے، جنت کا ٹکٹ خریدنے کے لیے، چندے اکٹھے کر کے غلام کو چھڑا کر لاتے ہو اور یہاں آ کر مست بیٹھے ہو کہ ہم نے بڑا ثواب کا کام کر لیا ہے۔ کہا کہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ (2:85) ۔ غلاموں کا چھڑانا تو واقعی نیکی کا کام ہے لیکن آزاد کو غلام بنانا جو ہے یہ ان کی نگاہ میں نہیں گزرا کہ یہ کتنا بڑا جرم ہے۔ ضابطۂ خداوندی کے ایک حصے سے ایسا انکار، دوسرے حصے پہ اس قسم کا اقرار یا اعتراف یہ ہے تمہارا مسلکِ حیات فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ (2:85) تم میں سے جو کوئی بھی

ایسا کرے گا' اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ انہیں اس دنیا میں ذلت وخواری اور قیامت میں اس سے بھی زیادہ شدید عذاب ہوگا' یہ غلاموں کو چھڑا لینے کا جو تم اجر مانگ رہے ہو' اس اجر کے مقابلے میں وہ جو غلام بنا دینے والا جرم ہے' وہ اتنا زیادہ وزنی ہے کہ اس کے مقابلے میں اس کی حیثیت ہی کچھ نہیں رہتی۔ یہ ہے جو تم نیکی کا کام کہہ رہے ہو۔

آج دنیا بھر میں مسلمانوں کو دین کے نام پر دی جانے والی معاشرتی تمدنی معاشی اور سیاسی تعلیم کے اثرات

آج اس قسم کی غلامی تو نہیں رہی لیکن بات بڑی آسانی سے سمجھ میں آتی ہے۔ پہلے ایسا نظام قائم کر لینا' جس میں پورا ایک طبقہ مفلس' غریب محتاج اور قلاش ہو جائے' مصیبت زدہ ہو اور پھر ان کی غریبی کو' مفلسی کو' دور کرنے کے لیے چندے اکٹھے کر کے' ان کے لیے کچھ روٹی کا انتظام کرنا اور ذہن میں یہ سمجھ لینا کہ ہم نے یہ بڑا ہی نیکی کا کام کیا ہے' ثواب کا کام کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس طبقے کو پہلے جو اتنا غریب اور مصیبت زدہ بنا دینا تھا' تو کیا اس جرم کے اوپر تمہارا دھیان نہیں گیا؟ وہ اتنا بڑا جرم ہے کہ تم یہ جواب کہتے ہو کہ ہم نے ثواب اور نیکی کے کام کیے ہیں' یہ ان کا ازالہ نہیں کرتا' یہ اس کی تلافی نہیں کر سکتا۔ وہ بنیادی چیز وہی ہے' جو میں نے کہا تھا کہ یہ ہمیں جو نیکی کے کام سمجھائے جاتے ہیں' یہ مقصود بالذات نہیں ہیں' یہ ایک بلند مقصد کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔ سفر کے لیے ٹکٹ خریدنا بڑا ضروری ہوتا ہے لیکن ٹکٹ خرید کر گھر میں بیٹھے رہنے سے تو آپ منزلِ مقصود پہ نہیں پہنچ سکتے۔ ٹکٹ تو سفر کرنے کا' منزل پہ پہنچنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ یہ کام جو آپ نیکی کے کہہ رہے ہیں یہ دراصل ایک بلند مقصد کے حصول کے اور ذرائع ہیں' بلند مقصد یہ ہے کہ

کس نہ گردد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں ایں است و بس

مقصد یہ ہے کہ اس دنیا میں کوئی شخص کسی دوسرے کا نہ محکوم رہے' نہ کسی دوسرے کا محتاج رہے۔ عزیزانِ من! بس یہ ہے اصل بات۔ اس نے بڑا صحیح کہا ہے:

نکتۂ شرعِ مبیں ایں است و بس

(اقبالؒ)

یہ ہے مقصود' منتہا' نصب العین' Purpose (مدعا)۔ یہ باقی جتنی چیزیں ثواب کی اور نیکی کی آپ کے ہاں گنائی جاتی ہیں وہ اس مقصد کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔ اگر آپ یہ ذریعے کی چیزیں کرتے رہیں اور وہ جو مقصد ہے وہ حاصل نہ ہو بلکہ اس کے برعکس

ہوتا چلا جائے تو یہ ذریعے کی چیز آپ کو کوئی کام نہیں دے گی۔ یہ ٹکٹ کوئی کام نہیں دے گا جس کو لے کر آپ گھر میں بیٹھے رہے ہیں۔ یہ ہے جو قرآن کہتا ہے کہ ٹھیک ہے ان محتاجوں کی روٹی کا انتظام کرنا ایک نیکی ہے لیکن ان کو جو پہلے محتاج بنانا ہے یہ کونسا اسلام ہے۔ کہا ہے کہ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ (2:177) نیکی یہ نہیں ہے کہ ہم نے اپنا منہ مشرق کی طرف کرلیا ہے یا مغرب کی طرف کرلیا ہے۔ یہ بھی ضروری ہے لیکن میں نے عرض کیا ہے کہ یہ ایک مقصد کے حصول کے لیے ذریعہ ہے۔ بارگاہِ الٰہی میں جو وزن ہوگا وہ مقصد کے حصول کا ہوگا کہ وہ تم نے کتنا حاصل کیا۔ یہ جو ذرائع ہیں، یہ اس لیے نہیں ہیں کہ جسے تم کہو کہ بخشے جاؤ گے۔ میں ایک اور مثال بھی دیا کرتا ہوں، وہ ذرا پرانی ہے۔ آپ نے ایک ترکھان مزدوری پہ لگایا۔ کہا کہ شام تک یہ کواڑ اور یہ کھڑکیاں بنانی ہیں۔ اُس نے کہا ٹھیک ہے۔ اب وہ ترکھان (بڑھئی) صبح آتے ہی وہ جو اتنی سی پتھر کی سِل ہوتی ہے، اس پہ پانی ڈال کر کبھی وہ رندا اور کبھی وہ تیشی کو تیز کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ بھی ضروری ہے لیکن اگر وہ سارا دن یہ رندا اور تیشیاں تیز کرتا چلا جائے اور شام کو کہے کہ لیاؤ جی میرے دس روپیے۔ یہ تیشے اور تیشیاں تیز کرنا کواڑ اور کھڑکیاں بنانے کا ایک ذریعہ تھا، وہ تو کچھ نہ بنیں "تے رندے تیز کردے رہوتسی ❶"۔

جنت کے حصول کا قرآنی فارمولہ، چند غلط فہمیاں اور غلط تراجم

عزیزانِ من! قرآن فریب میں نہیں رکھتا اس لیے کہا کہ یہ جو تم کہہ رہے ہو کہ میں نے وہاں کا بھی انتظام کر رکھا ہے، یہ غلط ہے، تم فریبِ نفس میں مبتلا ہو، جنتیں اس طرح سے نہیں ملا کرتیں کہ خیرات میں چار پیسے دے کر جنت لے لو۔ کہا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (9:111) جنت اس کو ملتی ہے جو اپنا پورے کا پورا مال بھی اس کے ہاتھ بیچ دیتا ہے، اپنی جان بھی اس کے ہاتھ بیچ دیتا ہے۔ صدقے اور خیرات سے جنت نہیں ملتی۔ اس لیے اُس نے کہا کہ ان کا یہ زعمِ باطل ہے کہ ہمارے پاس بڑا مال ہے، ہمارے پاس جتھہ بھی بڑا مضبوط ہے، ہمیں یہاں بھی کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا اور باقی رہی وہاں کی بات تو کوئی بات نہیں، ہم نے وہاں کا بھی انتظام کر رکھا ہے۔ وہ جو میں نے پنجابی میں کہا تھا کہ "مولا اساں اوتھے وی عیش ای کرنے ہیگے آ۔ اسی انتظام کرلیا ہویا اے، اوتھوں دا پاس بنوالیا ہویا ہیگا ❷"۔ نہیں، عزیزانِ من! قرآن اس فریب میں نہیں رہنے دیتا۔

---

❶ مگر آپ رندے ہی تیز کرتے رہیں۔

❷ مولا! ہم نے وہاں بھی عیش ہی کرنے ہیں۔ ہم نے انتظام کرلیا ہے، وہاں کا پاس بنوالیا ہے۔

میں نے عرض کیا ہے کہ باطل کے نظام میں، پیوند لگا کر جنت نہیں مل سکتی، یہ تو پورا نظام الٹنا ہوتا ہے۔ باقی رہا یہ جو کہتے ہو کہ اگر دولت ملی تو سب کچھ ملا، اس کے لیے سن رکھو! کچھ قوانین مقرر ہیں۔ **قُلۡ اِنَّ رَبِّیۡ یَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَ یَقۡدِرُ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ** (34:36)۔ اس کے لیے پھر وہ ترجمے کی اور تفسیر کی غلطیاں ہیں جو یہ کیا جاتا ہے کہ رزق کی کیا بات ہے، یہ تو اللہ کی مرضی پہ موقوف ہے جس کو چاہے زیادہ دے، جس کو چاہے کم دے۔ یہ ایک ترجمہ کیا اور ان غریبوں سے کہا کہ تم کیا کہہ رہے ہو کہ ''ہم غریب ہیں، ان کو اتنا زیادہ ملا ہوا ہے''۔ اوبابا! یہ تقسیم تو خدا کرتا ہے، یہ کہہ کر تم خدا کو چیلنج کر رہے ہو، اس کے خلاف شکوہ کر رہے ہو، توبہ کرو، استغفار پڑھو، یہ کبھی زبان پہ نہ لانا، دل میں بھی یہ خیال نہ کرنا۔ یہ کہہ کر اس غریب کو تھپکا دیا کہ یہ خدا کی تقسیم ہے۔ مَنۡ یَّشَآءُ کا ترجمہ کر دیا کہ ''جسے وہ چاہتا ہے'' ترجمہ کیا تو جب جسے چاہتا ہے تو اُنہوں نے یہ جو کہا تھا کہ ہمارے پاس مال و دولت بہت زیادہ ہے، یہ خدا کا کرم ہے تو اس کے خلاف کیوں کہا کہ یہ تو جہنم کا ایندھن ہے جو خدا کا دیا ہوا تھا۔ بس ٹھیک ہے پہلے وہ لکڑیاں دے کر جلا دیتا ہے، ان کو خود ہی اس کے اندر ڈال دیتا ہے، آپ یہ کرتا ہے، پھر اس کے بعد یہ کہتا ہے کہ تم جہنم میں کیوں بیٹھے ہوئے ہو۔ اس آیت میں (34:36) میں کہا ہے کہ ہمارے قانون کی رو سے یہ نہیں ہوتا ہے۔ ان غریبوں کو بتاؤ کہ ہمارا رزق دینے کا وہ قانون کیا ہے جس کی رو سے اتنی دولت مل سکتی ہے اور پھر وہ ناجائز بھی نہیں ہوتی۔ یہ بتانے کی بات تھی۔

سوائے رسول! ان سے کہہ دو کہ تم مال و دولت کی اس فراوانی پر مت اتراؤ۔ رزق کی تنگی اور کشادگی قانونِ خداوندی کے مطابق ہوتی ہے، لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے اور سمجھتے ہیں کہ ہم جو بھی روش جی میں آئے اختیار کریں، ہمارے رزق میں کمی نہیں ہوسکتی۔

مغرب کی فلاحی مملکت اور قرآنی معاشرے میں ایک بنیادی فرق ہے

باقی رہا ان کا یہ کہنا کہ اس دولت کے ذریعے سے ہم خدا تک پہنچ سکتے ہیں تو کہا کہ **وَ مَاۤ اَمۡوَالُکُمۡ وَ لَاۤ اَوۡلَادُکُمۡ بِالَّتِیۡ تُقَرِّبُکُمۡ عِنۡدَنَا زُلۡفٰۤی** (34:37)۔ یہ زُلۡفٰی! کیا لفظ ہے زُلۡفٰی سیڑھیاں ہیں۔ ہر ڈنڈے سے انسان آگے بھی بڑھتا ہے، اوپر بھی چڑھتا ہے اور وہ جو منزل ہوتی ہے اس سے قریب بھی ہوتا چلا جاتا ہے۔ کہا ہے کہ یہ مال و دولت اور اولاد اور جتھہ، یہ وہ سیڑھی نہیں ہے جس کے ذریعے سے تم خدا تک پہنچ جاؤ گے۔ یہ تو اسی کے حصے میں آسکتا ہے جو **اِلَّا مَنۡ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا** (34:37) ہمارے قوانین کی صداقت پر یقین رکھے اور زندگی کو سنوارنے والے کام کرے، اولاد اور دولت سیڑھیاں ہیں، اس بات پہ یقینِ کامل رکھو کہ غیر قرآنی نظام جہنم ہے، صرف اسی کا بتایا ہوا نظام جنت میں لے جا سکتا ہے اور پھر اس کے مطابق کام کرو، صرف یہی نہیں کہ

مان لو بلکہ کام کرو۔ اس کے لیے کہا کہ فَاُولٰٓئِکَ لَھُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا(34:37) یہ جو اس قسم کے اس نظام کو قائم کرنے اور مستحکم رکھنے کے لیے کرو گے' تو ان کا دوہرا اجر ملے گا' یہ انہی کی جزا ہے' بدلا نہیں۔ جزا کا ترجمہ ''نتیجہ'' زیادہ بہتر ہے' کہا ہے کہ یہ ان کا نتیجہ ہے'۔ ''ضعف'' کہہ کر بڑی عجیب بات کہی ہے یعنی دوگناہ۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ دوگنا کیا ہے؟

عزیزانِ من! صحیح معاشرہ قائم کرنے کے لیے جو کوششیں کی جاتی ہیں وہاں سے مغرب کی Welfare State (فلاحی مملکت) اور اسلام کا جو معاشرہ ہے' قرآن کا جو معاشرہ ہے' اس میں بنیادی فرق آجاتا ہے۔ کہا ہے کہ اس سے معاشرے کے اندر تو خوشحالیوں کی یہ کیفیت' یہ بے خوفی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا ایک بدلا یہ بھی ہے لیکن اس سے خود انسان کی اپنی ذات کی بھی ساتھ ہی نشوونما ہوتی ہے۔ تو یہ دوہرا بدلا ہے۔ یہ معاشرے کی خوشحالیاں اور افراد کی ذات کی نشوونما ہے جس سے انہوں نے اگلی زندگی طے کرنا ہے۔ صرف Welfare State (فلاحی مملکت) سے یہاں کی تو جزا مل جاتی ہے' لیکن اگلی نہیں مل سکتی۔ اور اگر یہاں کا یہ معاشرہ ہی صحیح نہ ہو تو نہ یہ یہاں ملتی ہے اور نہ ہی اگلی مل سکتی ہے۔ کہا ہے کہ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا(34:37) یہ انہیں ان کے کاموں کا دہرا اجر ملے گا۔ اس کی پہچان کے لیے کہا ہے کہ وَ ھُمْ فِی الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ (34:37)۔ عزیزانِ من! ان عربوں کی زبان کے اندر ''غرفا'' بڑا جامع لفظ ہے۔ میں نے کہا تھا کہ یہ ایک ایسی ندی ہے' جس کا صاف اور شفاف پانی ہو' لباب بھری ہوئی ہو' روانی میں اتنی تیز ہو کہ اگر کہیں ذرا سی بلند زمین بھی آجائے تو وہ اس پر بھی آگے گزر جائے' راستے کے موانعات اس کی رفتار میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ کر سکیں' یہ صاف شفاف پانی کی ندی بھرپور بھی ہو' اس کے اندر صاف شفاف ہونے' کی بھرپور کثرت ہو اور اس کی روانی کے اندر قوت ہو کہ راستے کے موانعات اس کی رفتار میں کمی نہ پیدا کر سکیں' یہ سارا کچھ ہو۔ وہ اسے الغراف کہتے ہیں اور اٰمنون ہو یعنی اس کے ساتھ امن بھی نصیب ہو۔ کہا ہے کہ یہ چیزیں حاصل ہوتی ہیں تو پھر آپ اس کو اپنے اعمال اور عملِ صالح کا نتیجہ کہہ سکتے ہیں اور یہ وہ جنت ہے۔ جو اس دنیا کے اندر آپ کو حاصل ہوتی ہے' یہ ہے مغرب کی فلاحی ریاست اور قرآنی معاشرے میں ایک بنیادی فرق۔

دنیا کا کوئی شخص خدا کے قانون کو شکست نہیں دے سکتا

باقی رہے یہ لوگ' جو دوسرے طریقوں سے اتنی دولت اور جتھہ اکٹھا کر لیتے ہیں اور ذہن میں یہ سمجھتے ہیں کہ یہ جو خدا کا قانون ہے جس کے نتیجے سے ہلاکت آتی ہے' ہم وہ نتیجہ پیدا ہی نہیں ہونے دیں گے' ہم خدا کے قانون کا مقابلہ کریں گے۔ ان کے متعلق واضح الفاظ میں کہا کہ وَ الَّذِیْنَ یَسْعَوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا مُعٰجِزِیْنَ اُولٰٓئِکَ فِی الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ(34:38) جو یہ سمجھتے ہیں کہ

ہم خدا کے قانون کو شکست دیدیں گے' ان سے کہہ دو کہ تم اس کے قانون کو شکست نہیں دے سکتے' یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ برف ٹھنڈک نہ پہنچائے' حرارت پہنچائے۔ جو جی میں آئے کر کے دیکھ لو ہو نہیں سکتا کہ جو سنکھیا ہے وہ ممدِ حیات ہو جائے' ہلاکت آفریں نہ ہو۔ میں یونہی پیش پا افتادہ (Immediate) مثالیں دے رہا ہوں۔ کہا یہ ہے کہ تم خدا کے قانون کو عاجز نہیں کر سکتے' بے بس نہیں بنا سکتے۔ یاد رکھیے! تمہاری غلط روش کا نتیجہ عذاب ہوگا' تباہی ہوگا اور تم مُحۡضَرُوۡنَ (34:38) ہو گے' اس عذاب کے اندر حاضر کیے جاؤ گے۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ سبا کی آیت 38 تک آ گئے' 39 ویں آیت ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ

❀......❀......❀

ساتواں باب: **سورۃ سبا** (آیات 39 تا 49)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من ! آج مارچ 1980ء کی 11 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ سبا کی آیت 39 سے ہو رہا ہے:

(34:39)۔

سابقہ درس میں بنیادی نکتہ قرآنِ کریم نے یہ کہا تھا کہ یہ جو ہم اپنے رسولوں کی معرفت زندگی کا ایک نظام بھیجتے رہے ہیں، اس کی مخالفت ہمیشہ سرمایہ دار طبقے نے کی اور ان کی دلیل یہ تھی کہ **وَ قَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا وَّ مَا نَحْنُ**

بِمُعَذَّبِیۡنَ (34:35) اُنہوں نے کہا کہ ہمارے پاس بہت فراواں دولت ہے' ہمارے پاس افراد کی بھی کمی نہیں ہے' جتھہ بھی ہمارا بہت کثیر التعداد واقع ہوا ہے' تو ہمیں پھر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ دوسرے مقام پر ان سے یہی چیز کہی گئی کہ یہاں کی دنیا میں تو تم نے انتظام کر رکھا ہے کہ تمہیں کوئی ہاتھ نہ ڈال سکے لیکن اگر تمہارا اس پر ایمان ہے کہ زندگی یہیں ختم نہیں ہو جاتی' آگے بھی چلنا ہے' خدا کے ہاں بھی تو پہنچنا ہے' تو وہاں کے متعلق کیا کہتے ہو۔ اُنہوں نے کہا کہ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ یہ کوئی یقینی بات نہیں ہے کہ ضرور ہی قیامت آنی ہے اور جانا ہے اور زندگی آگے چلنی ہے' اگر بفرضِ محال جانا بھی ہو تو ہم نے اس کا بھی انتظام کر رکھا ہے' اس میں کچھ صدقہ دینا' خیرات کرنا' نماز پڑھنا' مسجد بنوا دینا شامل ہے' یہ سب نیکی کے کام بھی ہم نے کر رکھے ہیں' اس واسطے تم دیکھو گے کہ وہاں بھی ہم عیش ہی کریں گے۔ وہاں سابقہ درس میں بھی یہ کہا تھا اور آج کا درس بھی اس آیت سے شروع ہوتا ہے۔

مروّجہ تفاسیر کی روشنی میں قرآنِ حکیم کے تراجم اور اُن پر اُٹھنے والے اعتراضات

کہا ہے کہ قُلۡ اِنَّ رَبِّیۡ یَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖ وَ یَقۡدِرُ لَهٗ (34:39)۔ میں نے سابقہ درس میں کہا تھا اور ہر بار اسے دہراتا ہوں کہ قرآنِ کریم جو سمجھ میں نہیں آتا' تو یہ اتنا ہی نہیں ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا بلکہ اس کے مقصد کے خلاف چیز ذہن میں آتی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ ہمارے یہ ترجمے اور تفسیریں ہیں۔ قرآنِ کریم کا ترجمہ قرآن نہیں ہے اور یہ میں کئی بار عرض کر چکا ہوں کہ کس دور میں ہماری یہ تفسیریں مرتب ہوئیں' یہ ترجمے ان تفسیروں کے اوپر مبنی ہیں۔ اب اُسی کی یہ مثال لے لیجیے۔ قرآن نے کہا ہے کہ یہ جو سرمایہ داروں کا طبقہ تھا' اس کے پاس دولت کی افراط تھی' یہ ہمیشہ اس نظام کی مخالفت کرتا ہے' جو اللہ کی طرف سے رسولوں کی معرفت دنیا میں آتا رہا ہے' اس طبقہ کے افراد اس زعمِ باطل میں تھے کہ ہمارے پاس دولت کی کمی نہیں' یہ تو بہت فراواں ہمارے پاس موجود ہے۔

اب اس آیت (34:39) کا جو ترجمہ آپ کو ملے گا' آپ کوئی سا قرآنِ کریم کا نسخہ اٹھائیے' اس میں یہ ترجمہ ملے گا کہ رزق کی جو فراوانی یا تنگی ہے' وہ تو خدا کی مشیّت پہ ہے' جسے چاہتا ہے وہ زیادہ دولت دیدیتا ہے' جسے چاہتا ہے رزق کی تنگی دیدیتا ہے''۔ اب یہ ترجمہ تو ان کی تائید ہوگئی۔ اُنہوں نے تو یہیں کہہ دیا کہ صاحب! یہ جو تم ہمارے اوپر اعتراض کر رہے ہو کہ ہمارے پاس دولت کی افراط ہے' اس کی بنا پہ یہ کچھ کرتے ہیں' تم خود کہتے ہو کہ وہ تو خدا کی دی ہوئی ہے' خدا جس کو چاہتا ہے فراواں دولت دیتا ہے' ہمارا اس میں جرم کیا ہے' قصور کیا ہے جو اس کے خلاف تم اعتراض کر رہے ہو؟ یہ تو تم خود کہتے ہو کہ خدا جسے چاہتا ہے فراوانی سے دولت

دیدیتا ہے' جسے چاہتا ہے اس کے رزق کی تنگی کر دیتا ہے۔ ہمارے پاس اگر یہ فراواں دولت موجود ہے تو خدا نے دی ہوئی ہے' تم تو خود کہتے ہو' تمہارا خدا یہ کہتا ہے اور اگر یہ غریب ہیں' ان کے پاس نہیں ہے تو تمہارا خدا یہ کہتا ہے کہ ہم رزق کی تنگی کرتے ہیں' تو یہ تو سارا کچھ خدا کا کیا ہوا ہے۔ جب خدا کا کیا ہوا ہے تو صاحب! ہمارے خلاف یہ اعتراض کیوں ہو رہا ہے؟

عزیزانِ من! آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس سے بات کہاں جا پہنچتی ہے۔ آج یہ یہاں جتنے اعتراضات کرتے ہیں کہ یہ دوسروں کی محنت کا استحصال (Exploitation) کر کے' ان کے خون کا آخری قطرہ نچوڑ کر' اپنے محلات کی رنگینیوں کا سامان بہم پہنچاتے ہیں' سرمایہ دار طبقہ غریبوں کو کچلتا ہے' ان کو مفلس اور نادار رکھتا ہے' وہ ساری باتیں ایک طرف' اتنے بڑے سوال کا مختصر جواب' ایک ہی ہے کہ صاحب! تمہارا خدا یہ کہہ رہا ہے کہ ہم جسے چاہتے ہیں کثرت سے دولت دیتے ہیں' جسے چاہتے ہیں غریب بنا دیتے ہیں' تو پھر ہمارے خلاف یہ کیا کہتے ہو؟ قرآن کی ساری تعلیم ایک طرف' یہ ایک جواب ایک طرف' آپ اس کے خلاف کچھ نہیں کہہ سکتے ہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ چیز قرآن کا جواب نہیں ہے' یہ قرآن کی آیت کے غلط ترجمے کا نتیجہ ہے۔

قرآنی آیت (34:39) کا مفہوم قرآن حکیم کی روشنی میں

اس آیت میں قرآن یہ کہتا ہے کہ آؤ تمہیں بتائیں' یہ جو دولت کی کثرت ہے' دولت کی غریبی ہے' اس کے لیے ہمارے پاس قوانین موجود ہیں یہ کچھ خدا کے قوانین کے مطابق ہوتا ہے۔ یہ لِمَنْ يَّشَآءُ (34:39) ہے کہ جو چاہتا ہے ان قوانین کے مطابق زیادہ دولت اکٹھی کر لیتا ہے' جو نہیں چاہتا اپنے آپ کو غریبی میں رکھنا چاہتا ہے' وہ غریبی میں رہتا ہے۔ دولت اکٹھی کرنے یا غریبی میں رہنے کے لیے تو کچھ قانون مقرر ہیں' مثلاً محنت کیجیے' تدبر سے کام لیجیے' روپیہ آتا چلا جاتا ہے۔ روپے کا زیادہ ہونا یا کم ہونا شرف و مجد کا معیار نہیں ہے' یہ بنیادی بات نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ جو روپیہ اکٹھا کیا جاتا ہے' یہ کس مصرف میں لایا جاتا ہے؟ اصل سوال یہاں سے شروع ہوتا ہے۔ تم روپیہ اکٹھا کرتے ہو' مثال کے طور پر' روپے والا ٹرین کا پورا پورا ایک ڈبہ Reserve (مخصوص) کرا لیتا ہے' چالیس مسافر' جو ایک ہی ٹکٹ خرید سکتے ہیں' سفر کرنے سے رہ جاتے ہیں' وہ ڈبہ خالی بھیج دیتا ہے۔ وہ روپیہ کس مصرف میں لایا؟

اُس نے کہا کہ ہم سوال اس پہ نہیں کر رہے کہ تمہارے پاس دولت کیوں زیادہ ہے' ہم کہہ یہ رہے ہیں کہ اس دولت کو صرف کس طرح سے کرتے ہو؟ ہمارا قانون یہ ہے کہ مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (13:17) اسی عمل' اُسی چیز' اسی نظریہ کو' دنیا کے اندر بقا ہے جو نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے ہو۔ دولت ہے تو اس کو دوسروں کی منفعت کے لیے رکھو' اس کو نوعِ

انسانی کی نفع بخشیوں کے لیے عام کرو' پھر اس پہ کوئی اعتراض نہیں ہے مگر تم ہو کہ دوسروں کو غریب' محتاج اور مفلس بنانے کے لیے' ان کی ہڈیاں توڑ کر' روپیہ جمع کرتے ہو' جمع کرنے کے بعد بھی جس طرح' قرآن نے دوسرے مقام پہ کہا ہے کہ **وَجَمَعَ فَاَوْعٰى** (70:18) جمع کرتا ہے' اور پھر برتن میں ڈالتا ہے' اوپر سے اس کا منہ بند کر لیتا ہے: **جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ** (104:2) بنک بیلنس گنتا رہتا ہے کہ کتنا ہو گیا' یعنی وہ رکھتا ہی اپنی ذات کے لیے ہے۔ اس طرح سے وہ اکٹھا کرتا ہے اور اس کے بعد وہ اپنے ہی لیے رکھتا ہے تو وہ جو یہاں اکٹھا کرتا ہے' وہ کہاں سے لیتا ہے؟ زمین کھود کر تو نکالتا نہیں ہے؟ وہ کسی کی محنت کا پیدا کردہ ہے جس کو کسی طرح سے یہ اکٹھا کر لیتا ہے' اکٹھا کرنے کے بعد پھر یہ منفعتِ عامہ کے لیے' نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے' اس کو کھلا نہیں رکھتا' اس کو اپنے ہی لیے سمیٹ کر رکھتا ہے' ان کو محتاج بنا دیتا ہے۔ کہا ہے کہ قابلِ اعتراض بات یہ ہے' دولت کمانا قابلِ اعتراض نہیں ہے۔

قرآنِ حکیم کا معاشی نظام' نظامِ سرمایہ داری کے بالکل برعکس ہے

میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن کی تعلیم میں جہاں تک معاشیات کا تعلق ہے' یہ اپنی تعلیم میں ایک معاشی نظام دیتا ہے اور بڑی بنیادی چیز ہے جو دیتا ہے۔ اسے آپ قرآن کا معاشی نظام کہتے ہیں۔ وہ معاشی نظام آج کل کی اصطلاح میں سرمایہ داری یا کیپٹل ازم کے نظام کے بالکل علی الرغم ہے' بالکل اس کے برعکس ہے' اس کے خلاف ہے۔ سرمایہ داری کا نظام یہ ہے کہ جس طریق سے کوئی چاہے' زیادہ سے زیادہ دولت اکٹھی کرے اور جس طرح سے وہ چاہے اُسے صرف کرے' کوئی اس میں دخل نہیں دے سکتا۔ یہ ترجمہ ہے کیپٹل ازم کی ایک شق کا کہ اس میں عدمِ مداخلت ہے' اس کے کسی معاملے میں کوئی دخل نہیں دے سکتا۔ یہ جو نظام ہے کہ میں جس ''طرح سے'' جی چاہے کماؤں' اس میں ''جس طرح'' کے معنی ہیں کہ زیادہ سے زیادہ سوسائٹی کے جو مرتب کردہ قوانین ہوں' میں ان کے خلاف نہ جاؤں۔

سرمایہ داروں' جاگیرداروں' اور کارخانوں کے مالکوں کا بنایا ہوا قانون مزدوروں کے حق میں کیوں کر انصاف پر مبنی ہو سکتا ہے؟

وہ قوانین کس کے مرتب کردہ ہوتے ہیں؟ یہ دولت مندوں کا ہی طبقہ ہوتا ہے جو مرتب کرتا ہے۔ آپ نظامِ جمہوریت میں ہی دیکھ لیجیے کہ کس طرح سے یہ سرمایہ دار اس کے اندر آتے ہیں اور آنے کے بعد' یہ وہاں جمع ہوتے ہیں' پھر وہاں ایک قانون بناتے ہیں۔ وہ قانون تو سارا ان کے حق میں بنتا ہے' انہی کا تو بنایا ہوا ہوتا ہے۔ کیا آپ کبھی سوچتے ہیں کہ یہ جو کارخانوں کے مالک ہیں' وہ اکٹھے ہو کر' اکٹھے بیٹھ کر' جمہوری طریقے سے قانون بنائیں گے تو کیا وہ مزدوروں کے حق میں قانون بنائیں گے؟ اسی لیے تو قرآن

نے یہ بات کہی کہ تم جو روز کہتے ہو کہ صاحب! عدل ہے' انصاف ہے' جسٹس ہے' اس کے مطابق یہاں سب کچھ ہوتا ہے' بتاؤ تو سہی کہ تم جسٹس کسے کہتے ہو؟ تم کہتے یہ ہو کہ جو رائج الوقت قانون ہے' اس کے مطابق اگر فیصلہ کر دیا جائے تو یہ جسٹس ہے۔ آپ کے ہاں جسٹس کی یہی Definition (تعریف) ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ وہ قانون جس کے مطابق تم فیصلہ کر رہے ہو' اگر وہی عدل پہ مبنی نہ ہو' تو پھر یہ عدل کیسے ہوا۔ یہ جو آپ کے ہاں سرمایہ داری کا ایک نظام ہے' وہ دولت تک ہی نہیں رہتا۔ یہودیوں کی' آج تو بھیک سے مانگی ہوئی تھوڑی سی سلطنت' ان کو مل گئی ہے' ایک وقت تھا کہ دنیا میں کہیں ان کو سر چھپانے کے لیے جگہ نہیں ملتی تھی ان کی کیفیت The Wandering Jews یعنی خانہ بدوشوں کی تھی' اس کے باوجود ساری دنیا کی حکومتیں ان کے قبضے میں تھیں' اور آج بھی ہیں۔ اسرائیل کے خلاف جمی کارٹر[1] (1924ء) کچھ کر نہیں سکتا اس لیے کہ امریکا میں زیادہ سے زیادہ ووٹ' جو صدارت کے لیے جاتے ہیں' وہ انہی یہودیوں کے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں باطل کے نظام میں دولت کیا کچھ کرتی ہے۔ اقتدار' قیادت' سیاست اور فیصلے سارے کے سارے ان کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ اس لیے قرآن کریم نے یہ کہا ہے کہ سوال یہ نہیں ہے۔ دولت یا قوت فی ذاتہٖ کوئی بُری چیز نہیں' کوئی عیب نہیں۔ سوال یہ ہے کہ اسے تم کس مصرف میں لاتے ہو' خرچ کس طرح سے کرتے ہو۔ اس کے لیے قرآنِ کریم نے اُدھر تو یہ کہا ہے کہ وہ اوعی (70:18) تھیلی کا منہ اوپر کس کر باندھ دیتے ہیں' اسے بند رکھتے ہیں' نکلنے نہیں دیتے۔

لفظ ''انفاق'' کا ترجمہ خرچ کرنا نہیں بلکہ منفعت عامہ کے لیے کھلا رکھنا ہے

قرآن نے مال و دولت کو منفعتِ عامہ کے لیے کھلا چھوڑنے کے لیے ''انفاق'' ایک اصطلاح دی تھی۔ ہم نے اس کا ترجمہ کر دیا' خرچ کرتے ہیں'۔ کتنا ہی بڑا سرمایہ دار کیوں نہ ہو' بہر حال وہ روپیہ تو خرچ کرتا ہے گویا جرم یہی ہو گیا کہ روپیہ اکٹھا کر کے خرچ نہ کرے اور اگر خرچ کرتا چلا جائے تو پھر مقصد پورا ہو گیا۔ انفاق کا ترجمہ ہی یہ کر دیا کہ خرچ کرتے ہیں تو یہ بھی جرم نہ رہا' وہ زیادہ سے زیادہ اور انوسٹ کرتا چلا جاتا ہے' اور کارخانے لگاتا چلا جاتا ہے' خرچ کرتا چلا جاتا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ پھر یہ دوسرا ترجمہ ہے جو غلط ہے۔ پہلا تو وہ تھا کہ' خدا جسے چاہتا ہے دولت دیتا ہے' جسے چاہتا ہے غریب بناتا ہے۔ وہ ترجمہ غلط ہے۔ وہ کہتا یہی ہے جو غریب رہنا چاہتا ہے اس کو کون امیر بنا سکتا ہے۔ اگلی بات یہ آ گئی کہ انفاق کا ترجمہ ہوا ''خرچ کرنا'' حالانکہ یہ تو خرچ کرنے کی ضد ہے' ربو ہے' یہ تو ضد ہے سرمایہ داری کی۔ سرمایہ داری میں اکٹھا کیا جاتا ہے اور اپنی ذات کے لیے رکھا جاتا ہے۔ انفاق کے

---

[1] امریکا کا 39واں صدر (81-1977)

معنی ہیں ''روپیہ منفعتِ عامہ کے لیے ہی کھلا رکھنا''۔ یہ ٹھیک ہے کہ آپ نے گاڑی کا ایک ڈبہ ریزرو (Reserve) کرالیا ہے کیونکہ غریبوں کے پاس ٹکٹ کے پیسے نہیں تھے' ریزرو کرائیے' خرچ کیجیے' اس کے دروازے کھلے رکھیے' یہ انفاق ہے کہ بھئی! جس نے جانا ہے' اس کے اندر آجاؤ' میرے پاس چار پیسے فاضلہ تھے' میں نے زیادہ ٹکٹیں خرید لی ہیں' جس کے پاس پیسہ نہیں ہے' وہ اس میں آئے اور سفر کرے۔ اس کا دروازہ کھلا رکھو۔ کہا ہے کہ یہ عین اسلام ہے' اُسی ڈبے کو ریزرو (Reserve) کرا کر اس کا دروازہ بند رکھو' یہ ربوٰ ہے۔

قرآنِ حکیم کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے قرآنی اصطلاحات کا مفہوم سمجھنا ضروری ہے

انفاق کا ترجمہ ہی کھلا رکھنا ہے۔ میں نے پہلے بھی کئی دفعہ کہا ہے کہ قرآن کی یہ بنیادی اصطلاحیں (Terms) ہیں ان کا صحیح قرآنی مفہوم پہلے متعین کیجیے۔ سمجھانے کے لیے یہ جسے آپ نیفہ کہتے ہیں' عربی زبان کا لفظ **ینفق** ہے۔ اسی سے انفاق ہے۔ کیا کبھی ایسا نیفہ بھی آپ نے دیکھا ہے جو ایک طرف سے تو بند ہو اور دوسری سائیڈ سے کھلا ہو؟ وہ نیفہ ہی نہیں ہوتا' نیفہ تو وہ ہوتا ہے کہ ادھر سے بھی کھلا ہوا ہو اور دوسری طرف سے بھی کھلا ہوا ہے۔ یہ میانی ہے جس میں روپیہ رکھا کرتے تھے۔ اب تو ہمارے ہاں اس اگلی نسل کو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا' کہ یہ میانی ہے کیا۔ اب وہ روپیہ ہی نہیں ہے تو اسے رکھنا کہاں ہے ورنہ وہ اس قسم کی ایک گتھلی ہوتی تھی جس میں اوپر سے تو روپیہ ڈالا جاتا تھا' نیچے سے وہ بند ہوتی تھی۔ قرآن نے کہا ہے کہ ایک تو یہ نظام ہے کہ لیے چلے جاؤ' سمیٹتے چلے جاؤ' مگر منفعتِ عامہ کے لیے کھلا نہ رکھو اور دوسرا نظام یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ محنت کر کے کماؤ' اس میں سے اپنی ضرورت کے مطابق رکھ کر میانی کا جو دوسرا حصہ ہے' اس کو کھلا رکھو۔ اس روپے کا یہ جو جمع ہونا ہے کہ نوعِ انسانی کو اس کے مفاد سے محروم کر دیا جائے اور اپنے لیے جمع رکھا جائے' تو یہ ہے نظام سرمایہ داری کا۔ قرآن اس کے خلاف ہے۔

عزیزانِ من! **انفاق** کے معنی ہیں کہ میانی کا دوسرا راستہ کھلا رکھو' تاکہ ہر وقت جمع نہ ہونے پائے۔ اب یہاں سے بات شروع ہوئی۔ کہا کہ **قُلۡ اِنَّ رَبِّیۡ یَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖ وَ یَقۡدِرُ لَهٗ** (34:39) ان سے کہہ دو کہ رزق کی تنگی اور کشادگی' خدا کے قانون سے وابستہ ہے۔ جو اس قانون کا اتباع کرتا ہے' اسے وسعت اور کشادگی حاصل ہوتی ہے۔ جو اس سے منہ موڑ لیتا ہے اس کی روزی تنگ ہو جاتی ہے۔ یہ ہے جو ہمارا وہ قانون ہے جس کے مطابق ہم چاہتے ہیں کہ تم زیادہ سے زیادہ محنت کرو اور اس کے بعد آگے ہے کہ **وَ مَاۤ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ فَهُوَ یُخۡلِفُهٗ وَ هُوَ خَیۡرُ الرّٰزِقِیۡنَ** (34:39) اور وہ قانون یہ ہے کہ جس قدر تم' نوعِ انسان کی عام پرورش اور نشوونما کے لیے کھلا چھوڑ دو گے' اسی قدر تمہارے رزق میں وسعت اور کشادگی پیدا ہوتی جائے

گی۔ جو سامان رزق دوسروں کی پرورش کے لیے دیدیا جائے' بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ وہ ہاتھ سے گیا لیکن اس کا جانا ایسا ہی ہوتا ہے جیسے خزاں کے موسم میں درختوں کے پتوں کا جھڑ جانا' جس کے بعد ایک ایک پتے کی جگہ متعدد پتے کونپلیں اور شگوفے ابھرتے چلے آتے ہیں اور سارے درخت پر نئی بہار آ جاتی ہے۔ اس سے تم نے اندازہ لگایا کہ جو رزق' قانونِ خداوندی کے مطابق ملتا ہے' وہ کس قدر بہتر ہوتا ہے! عزیزانِ من! وہ نظام خدا کی رزاقیت کے مطابق ہے۔ یہاں **مَآ اَنْفَقْتُمْ** (34:39) ہے۔ یہ وہی **نفق** ہے' وہی **انفاق** ہے' اُس ترجمے کو سمجھیے جو یوں کیا گیا ہے کہ' جو کچھ تم خرچ کرتے ہو۔ یہ''خرچ کرتے ہو'' والی بات ہی نہیں ہے۔ یہ بات ہے کہ جو کچھ تم نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے کھلا رکھتے ہو۔ اس میں یہ بات سمجھ میں آئی۔

لفظ انفق کا قرآنی مفہوم: خزاں دیدہ درخت پر بہارِ نو کا آجانا

عزیزانِ من! یہاں قرآن نے کہا ہے کہ **مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَھُوَ یُخْلِفُهٗ** (34:39)۔ یہاں قرآن ایک لفظ میں بات کہہ گیا ہے۔ قرآن تو بڑا ہی ایجاز کے ساتھ' سمٹی فارم (Concentrated Form) کے اندر' ایک لفظ کے اندر' بات کہہ دیتا ہے۔ کہا ہے کہ **یخلفه** (34:39)۔ اس لفظ کی کیا بات ہے! کہتا ہے کہ بات تو ایسی نظر آتی ہے کہ یہ جو کچھ تم دوسروں کی منفعت کے لیے کھلا رکھتے ہو' وہ تو چلا جاتا ہے' رہتا نہیں ہے۔ اسے سمجھانے کے لیے کہا ہے کہ کبھی تم نے اس درخت کو بھی دیکھا ہے جس کا خزاں کے موسم میں ایک ایک پتہ جھڑ جاتا ہے' وہ ٹنڈ منڈ بالکل سوکھی ہوئی ٹہنیاں' سوکھا ہوا درخت رہ جاتا ہے' اس کے تمام پتے جھڑ جاتے ہیں۔ تمہارا تصور یہ ہے کہ جو ہم نے دیدیا ہے وہ پتہ جھڑ گیا' درخت پہ تو اس کا ایک نشان بھی باقی نہیں رہے' وہ خشک ہو گیا ہے۔ تھوڑا انتظار کرو' وہ جو ایک خشک زرد قسم کا پتہ گر گیا ہے' چند دنوں کے بعد اس کی جگہ تر و تازہ' شگفتہ' شاداب' کونپلیں' ہرے ہرے پتے' پھل دار پھول کس طرح سے لہلہاتے ہوئے اس درخت پہ نکل آتے ہیں۔ کہا ہے کہ **انفق** کے یہ معنی ہیں۔

اب یہاں دوسرا **یخلفه** ایک لفظ ہے' عزیزانِ من! اس کے معنی ہیں ''خزاں دیدہ درخت پہ بہارِ نو کا آجانا''۔ کہا ہے کہ اگر اس درخت کے یہ پتے گرتے نہیں ہیں' تو نئی کونپلیں نکلتی نہیں ہیں۔ خشک پتوں کو سمیٹ کر رکھنے سے کیا فائدہ ہے۔ ان کو گرنے دو' ہمارا نظام فطرت یہ ہے کہ یہ گرتے جائیں۔ جو تر و تازہ نئے پتے ہیں' وہ نکلتے چلے آئیں۔ یہ ایک دور ہے۔ ہمارے ہاں اسے **انفاق** کہتے ہیں کہ تر و تازہ بہاروں کو لانے کے لیے' جسے خزاں کے موسم کی پت جھڑ کہتے ہیں' وہ ہو جائے۔ بس اتنی سی ہی بات ہے۔ اس کے آگے کہا ہے کہ **وَ ھُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ**(34:39) اگر تمہارا یہ نظام ہے تو سنو! جو رزق خدا کے بہترین نظام کے مطابق ملتا ہے' وہ رزق یوں ملتا ہے۔ اس سے بہتر کوئی اور رزق نہیں ہوتا۔

نوعِ انسانی کو انفاق کا یہ پروگرام ایک نظام کی شکل میں اپنانا ہے

عزیزانِ من! اب ساری بات صاف ہوگئی۔ کہتا ہے کہ یہ ہے ہمارا قانون۔ اس قانون کے مطابق اگر تم کمائی کرو گے' پھر اس کو کھلا رکھو گے' پھر دیکھو اس کا کتنا ریٹرن (اجر) ملتا ہے! وہ جو ایک ایک کے سات سات سو کہتا ہے' کہتا ہے کہ وہ یوں ملتے ہیں۔ اور وہ انفرادی طور پہ نہیں' اجتماعی طور پہ ملتے ہیں۔ قرآن بتاتا ہے کہ جس معاشرے میں معیشت کا یہ نظام ہو' اس معاشرے کی فراوانیوں' خوشحالیوں اور شادابیوں کا کیا کہنا! اس کے ہاں سرسبز و شاداب درخت ہوتے ہیں' اس کے باغ کے اندر تو **تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ** (65:11) ہے۔ درخت خشک نہیں ہوتے وہاں سے رواں ندیاں گزر رہی ہوتی ہے۔ اسی کو تو جنت کہتے ہیں۔ کہا ہے کہ **وَ یَوْمَ یَحْشُرُھُمْ جَمِیْعًا ثُمَّ یَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اَھٰٓؤُلَآءِ اِیَّاکُمْ کَانُوْا یَعْبُدُوْنَ. قَالُوْا سُبْحٰنَکَ اَنْتَ وَلِیُّنَا مِنْ دُوْنِھِمْ بَلْ کَانُوْا یَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ اَکْثَرُھُمْ بِھِمْ مُّؤْمِنُوْنَ**(34:40.41)۔ یہاں اس آیت میں قرآن دورِ جہالت کی باتیں بھی لاتا ہے۔ کہا ہے کہ جس وقت ان سب کو اکٹھا کیا جائے گا تو ملائکہ سے پوچھا جائے گا کہ کیا یہ لوگ تمہاری پرستش کیا کرتے تھے اور تم نے ان سے ایسا کرنے کو کہا تھا؟ تو کہیں گے کہ اے ہمارے نشو ونما دینے والے! تو اس سے بہت بلند ہے کہ تیرے ساتھ کسی اور کو بھی شریک کیا جائے۔ باقی رہا یہ کہ ہم نے ان سے ایسا کہا ہو' تو یہ بھلا کیسے ہوسکتا ہے؟ ہمارا آقا اور سرپرست کارساز و کارفرما تو ہے نہ کہ یہ۔ اصل یہ ہے کہ یہ لوگ ہماری پرستش نہیں کرتے بلکہ جنوں کی کرتے تھے اور ان میں سے اکثر انہی کو خدا بنائے ہوئے تھے ❶۔

مسلمانوں کے معاشرے میں جہالت کا انداز

عزیزانِ من! جس زمانے میں قرآنِ کریم نازل ہوا' اُس زمانے میں بھی' اور اب بھی جو علاقے ابھی تک جہالت میں ڈوبے ہوئے ہیں' ان میں بھی توہم پرستیاں چھائی ہوئی ہوتی ہیں۔ وہاں فطرت کی قوتوں' مظاہرِ فطرت کو' اپنے دیوتا سمجھتے ہیں' مثلاً سورج دیوتا' چاند دیوتا' تارے بھی دیویاں' پہاڑ دیوتا' زلزلے دیوتا' شیر دیوتا' پھر چڑیلیں بھوت اور پریت کا بھی ڈر ہے۔ آج بھی جہاں

---

❶ جہالت کے زمانے میں انسان' فطرت کی غیر مرئی قوتوں کی پرستش کرتا تھا۔ کوئی انہیں فرشتہ کہتا' کوئی جنات سے تعبیر کرتا۔ انسانی علم نے اس قسم کی توہم پرستیوں کو تو دُور کردیا لیکن ان کی جگہ نئی قسم کی ''توہم پرستیاں'' آگئیں۔ آج کا مادہ پرست انسان' خدا کو نہیں مانتا اور فطرت کی قوتوں کو اپنا ''خدا'' بنائے ہوئے ہے۔ نتیجہ اس کا ظاہر ہے۔ فطرت کی قوتوں کو اگر وحی کے قوانین کے تابع رکھا جائے تو وہ ''ملائکہ'' بن جاتی ہیں' جو امن و سلامتی کے پیامبر ہیں۔ اگر انہیں سرکش اور آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہ ''جنات'' ہوجاتی ہیں' جو ہر طرف تباہی پھیلا دیتے ہیں۔ آج دنیا پر انہی ''جنات'' کا قبضہ ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص 999 کا فٹ نوٹ 1)۔

جہالت ہے' یہی کچھ ہے۔خود ہمارے ہاں بھی آپ دیکھیے' ذرا پیچھے نکل جائیے' وہاں دیکھیے' یہی کچھ آج بھی ہوتا ہے۔وہ درختوں کے ساتھ سرخ سرخ رنگ کی کپڑے کی پٹیاں باندھی ہوئی ہیں' یونہی ذرا سا اونچا ٹیلہ ہے وہاں دیئے جلائے چلے جا رہے ہیں' کہیں سندور لگائے چلے جا رہے ہیں' کہیں ماتا دیوی پوجی جا رہی ہے۔یہاں ادھر ہماری طرف تو بہرحال سرسیدؒ احمد خان (1817-1898) کا یہ صدقہ تھا کہ علی گڑھ بنا گیا' کچھ روشنی پھیلی' وہاں مشرقی پاکستان میں' جس کے لیے آج بھی مرحوم کا نام ہی لینا پڑتا ہے' جا کر میں نے دیکھا کہ وہاں اتنی اکثریت مسلمانوں کی ہے' وہاں مسلمانوں کی ایک مملکت قائم ہوگئی ہے لیکن کیفیت یہ ہے کہ ہر گاؤں کے باہر' یہی کہیے کہ بت لٹکے ہوئے ہیں' ڈولیاں سی ہیں اور وہی ان کا معبد تھا' وہی پرستش گاہ تھی' وہاں سے جلوس نکلتا تھا۔ارے کس کس چیز کا ذکر کروں؟ کہ یہ بڑے پیر جی کا جلوس ہے' یہ درگا ماتا کا جلوس ہے' اکٹھا ہی نکلتا ہے۔گیارھویں والے پیر جی کی وہ پوجا کرتے ہیں' ان کو اتنا ہی اسلام یاد ہے اور اس کے بعد وہ جو درگا مائی ہے' وہ بھی ساتھ رکھی ہوئی ہے' اس کا بھی مسلمانوں کے ہاں جلوس نکل رہا ہے۔قرآن توہم پرستیوں سے نکالنے کے لیے آیا ہے۔

عزیزانِ من! یہ جس آیت کی تمہید ہے وہ آگے آتی ہے۔قرآنِ کریم عقل' فکر' بصیرت' تدبر' شعور اور تفکر کی قدم قدم پہ دعوت دیتا ہے۔یہ اس کی انفرادیت ہے کہ مذہب کی اسٹیج پہ کھڑا ہوتا ہے' تو Reason (عقل) کو اپیل کرتا ہے' ورنہ ایمان تو نام ہی اس چیز کا رہ گیا تھا کہ بغیر Reason (عقل) کے کسی چیز کو ماننا ہے۔یہاں شروع سے آپ دیکھیے' میں ابھی اس پر آ رہا ہوں جس آیہ مبارکہ کے لیے' اُس نے تمہید باندھی ہے۔یہ جہالت' توہم پرستیاں' تو بہرحال یوں کہیے کہ جنوں کی پرستش تھی' ان مظاہرِ فطرت کی' دیوی دیوتاؤں کی صورت میں پرستش تھی' ویسے بھی مذہب کے معاملے میں کہا یہ جاتا ہے کہ اس میں عقل و فکر کا کوئی کام ہی نہیں ہوتا۔ یہاں کہا ہے کہ ان توہم پرستیوں کے متعلق ان سے کہو کہ ذرا سوچ کر ان کو جن کو یہ بھوت اور پریت اور فرشتوں کی پرستش سمجھتے ہیں' عملی دنیا میں لے کر آئیں۔کہتا ہے کہ **فَالْيَوْمَ لَا يَمْلِكُ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ نَّفْعًا وَّ لَا ضَرًّا ۭ وَ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ** (34:42) Matter of fact (حقائق) کی World (دنیا) کے اندر آئیے' یہ ممکنات کی جو دنیا ہے' محسوسات کی جو دنیا ہے' معاملات کی جو دنیا ہے' اُن میں اِن سے کہو کہ ذرا بات کر کے اپنی اس دیوی کو اور دیوتا کو بلائیں تا کہ وہ ان کو بتائیں کہ وہ کوئی نفع نقصان نہیں پہنچا سکتے ہیں۔انہوں نے اپنے ذہن میں عجیب تصورات قائم کر رکھے ہیں مثلاً یہ جو ماتا' جسے یہ Small Pox کہتے تھے' نکلتی ہے' وہ ماتا دیوی کو کہتے ہیں۔یہ ان کے ہاں ایک دیوی تھی' اس کے حضور نذرانے پیش کیے جاتے تھے' غنیمت ہے کہ مغرب کے ممالک کے تتبع میں ہمارے ہاں بھی یہ ایک مہم چلائی گئی ہے اور اب کہا جا رہا ہے کہ سارے ملک میں ماتا کا' چیچک کا' ایک کیس بھی نہیں ہوتا۔اب وہ ماتا' وہ دیوی یہاں سے چلی گئی۔اس آیت میں ان سے کہا

ہے کہ ذرا اس دنیا میں آ کر بات کرو اور اپنی اس ماتا کو کہو کہ اب کسی کو چمٹ کر دکھائے۔ کیا بات ہے اس کے کہنے کی! ان سے کہو کہ اگر اسی جہالت اور توہم پرستیوں میں اسی طرح سے رہنا ہے تو خِـزۡیٌ فِـی الۡـحَیٰـوۃِ الدُّنۡیَـا (2:85) دنیا کے اندر ذلیل ہو جاؤ گے‘ ساری دنیا تمہیں حقارت اور نفرت کی نگاہوں سے دیکھے گی۔ یاد رکھو! اس قسم کی جو قومیں ہوتی ہیں‘ وہ دنیا میں حیوانات کی سطح پہ زندگی بسر کرتی ہیں‘ کوئی قوم ان کی مدد نہیں کرتی‘ انہیں صرف اپنے کام میں لاتی رہتی ہے۔ جہالت کوئی چھوٹی چیز نہیں ہوتی‘ یہ تو عذاب النار ہے‘ جسے قرآن ذلت کی زندگی بسر کرنا کہتا ہے۔

دیوی دیوتاؤں سے بڑھ کر مذہب میں اسلاف پرستی کا جادو

کہا ہے کہ وَ اِذَا تُتۡـلٰـی عَـلَیۡہِمۡ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالُوۡا مَا ھٰذَآ اِلَّا رَجُلٌ یُّرِیۡدُ اَنۡ یَّصُدَّکُمۡ عَمَّا کَانَ یَعۡبُدُ اٰبَآؤُکُمۡ (34:43)۔ ایک ہی چیز ہے جو قرآن کہے چلا آ رہا ہے۔ کہتا ہے کہ وہ تو دیوی دیوتاؤں کی بات تھی‘ اس سے بھی زیادہ ایک اور جہالت کی بات تمہیں بتاؤں۔ مذہب کی دنیا کی طرف آ جاؤ۔ جب ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ صاحب! یہ ایک دعویٰ ہے‘ یہ ایک حقیقت ہے‘ یہ ایک پیام ہے جسے میں لے کر آیا ہوں‘ یہ قانون ہے جو تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ اس کو پرکھو‘ اس کی آزمائش کرو‘ اس کو سوچو‘ غور کرو‘ فکر کرو‘ سمجھنے کی کوشش کرو۔ اچھا نظر آئے تو اسے قبول کرو‘ اس کا Pragmatic Test (استنتاجی ٹسٹ) کرو‘ لیبارٹری میں جا کر اس کو ٹیسٹ کرو‘ پھر دیکھو کہ آیا وہ نتیجہ نکلتا ہے جو میں کہتا ہوں۔ میں ایک دانہ لایا ہوں‘ بیج لایا ہوں‘ اس کو بو کر دیکھو۔ سمجھنا چاہتے ہو تو میں دلائل و براہین کی رو سے تمہیں سمجھاتا ہوں کہ یہ کیا ہے۔ محسوس طور پہ دیکھنا چاہتے ہو تو اس کا امتحان کر کے‘ اس کا ٹیسٹ کر کے دیکھو۔ ان سے کہا یہ جاتا ہے کہ یہ ہے جو میں کہتا ہوں‘ یہ ہے میرا دعویٰ‘ یہ اس کی دلیل ہے‘ اس طرح سے پرکھ کر اس کو دیکھو۔ یہ کہتے ہیں کہ نہیں صاحب! ہم تو نہ اسے پرکھیں گے‘ نہ اسے مانیں گے‘ نہ اس کے خلاف کوئی دلیل دیں گے۔ بھئی! کیسے اس کو ایسے ہی Reject (رد) کر دو؟ کہنے لگے کہ Reject (رد) اس لیے کر دیں گے کہ جو کچھ ہمارے اسلاف کہتے چلے آ رہے ہیں‘ یہ اس کے خلاف ہے۔ کہا کہ یہ ان سے بھی زیادہ توہم پرست ہیں۔ کیا یہ کوئی دلیل ہے؟ ہر انسان صاحبِ فکر ہے‘ ہر دور کا علم ہے‘ بصیرت ہے‘ فکر ہے‘ تدبر ہے۔

کہا ہے کہ میں جو پیش کرتا ہوں وہ میں وجہ علیٰ بصیرت پیش کرتا ہوں۔ قرآنِ مجید میں ہے کہ اَدۡعُوۡۤا اِلَی اللّٰہِ عَلٰی بَصِیۡرَۃٍ اَنَـا وَ مَنِ اتَّبَعَنِیۡ (12:108) میں جو تمہیں خدا کی طرف دعوت دیتا ہوں تو یہ وہ Faith (عقیدہ) نہیں ہے جو Christianity (عیسائیت) کا تراشیدہ ہے کہ اس میں عقل کو دخل نہیں ہے۔ میں تمہیں علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتا ہوں: میں بھی ایسا کرتا ہوں اور جو

میری سنت کے متبع ہونگے وہ بھی ایسا ہی کرینگے۔ ان کی کیا کیفیت ہے؟ میں عقل وبصیرت کی رو سے ان کو کہہ رہا ہوں کہ هَاتُوۡا بُرۡهَانَكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ (27:64) سچے ہو تو اپنی دلیل لاؤ۔ اور یہ کہتے ہیں کہ صاحب! ہم تو جانتے ہی نہیں کہ دلیل ولیل کیا ہوتی ہے' بصیرت اور عقل کیا بات ہے۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ جو کچھ ہمارے ہاں سے ہوتا چلا آ رہا ہے' یہ اس کے خلاف ہے جو تم کہتے ہو' اس لیے ہم اسے نہیں مانتے۔ کہا ہے کہ یہ تو ہم پرستی کی انتہا ہے۔ اب اس کے بعد ان سے کیا کہا جائے۔ ان کے پاس نہ دلیل' نہ عقل' نہ فکر' نہ تدبر' نہ شعور' کچھ نہیں ہے۔ جو کچھ بڑے کرتے چلے آ رہے ہیں' وہی یہ کرتے چلے جائیں گے۔ ارے اس کو ہی کھڑے ہو کر پرکھ لو۔ وہ کہہ رہا ہے کہ میری بات نہ مانو' جو کچھ یہ کرتے چلے آ رہے ہیں' جو مانتے چلے آ رہے ہو' اس کو ہی عقل وفکر کی رو سے پرکھ کر دیکھو۔ کہتے ہیں کہ جی نہیں صاحب! جو کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے' جو اسلاف کا مسلک ہے' مذہب کا معاملہ ہے' شریعت کا معاملہ ہے' اس میں تو عقل کو دخل ہی نہیں ہوتا' یہ الحاد ہے' یہ بے دینی ہے جو کہہ رہے ہو کہ عقل وفکر کی رو سے پرکھ کر دیکھو۔ کہا ہے کہ اَنۡ يَّصُدَّكُمۡ عَمَّا كَانَ يَعۡبُدُ اٰبَآؤُكُمۡ (34:43) عوام کو یہ کہہ کر بھڑکا دیتے ہیں کہ یہ تمہیں اسلاف کے راستے سے روک رہا ہے۔ ان کو یہ کہا اور وہ اس کے خلاف جہاد کرنے کے لیے' فساد کرنے کے لیے' اٹھ کھڑے ہوئے' اب مارے گئے' تو شہید ہیں۔ ارے بھئی! فساد مچا کر یہ شہادت کس قسم کی آئی ہے؟ کہا ہے کہ ان کی یہ کیفیت ہے۔ جو پیش کیا جاتا ہے' اس کے متعلق کہتے ہیں' کہ وَ قَالُوۡا مَا هٰذَاۤ اِلَّاۤ اِفۡكٌ مُّفۡتَرًى (34:43) او یہ اپنے ذہن سے کچھ باتیں بنا لیتا ہے اور اس کے بعد کہتا ہے کہ یہ خدا کی باتیں ہیں' خدا نے ایسا کہا ہے۔ بس اس کے سر پہ یہ ایک الزام دھرا اور مطمئن ہو کر بیٹھ گئے۔

الحق کسی ذہنی اور فکری چیز کا نام نہیں بلکہ حقیقی طور پر محسوس نتائج کا نام ہے

کہا ہے کہ وَ قَالَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لِلۡحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمۡ اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ مُّبِيۡنٌ (34:43)۔ الحق ان کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ حق تو عربی زبان میں کہتے ہی اس کو ہیں جو محسوس طور پر اپنے نتائج سے' اپنے آپ کو سچا ثابت کر دے' یہ ذہنی اور فکری چیز ہے ہی نہیں۔ ہم حقیقت کے لفظ کو تو سمجھتے ہیں کہ حقیقتاً یہ ایسا ہے' ہم روز بولتے ہیں۔ جب وہی لفظ حق آتا ہے' جہاں سے حقیقت کا لفظ نکلا ہے' تو جو حق ہے وہ Faith (عقیدہ) ہو جاتا ہے' وہ حقیقت نہیں رہتی' قرآن کہتا ہے کہ جب ان کے سامنے الحق آتا ہے تو یہ کہتے ہیں کہ کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ کیوں جھوٹ ہے؟ کیونکہ جو کچھ ہمارے اسلاف کہتے اور کرتے چلے آ رہے تھے' یہ اس کے خلاف ہے' اس لیے جھوٹ ہے۔ یہ دلیل ہے۔ کہا کہ وَ مَاۤ اٰتَيۡنٰهُمۡ مِّنۡ كُتُبٍ يَّدۡرُسُوۡنَهَا وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلَيۡهِمۡ قَبۡلَكَ مِنۡ نَّذِيۡرٍ (34:44) یہ بھی نہیں ہے کہ ان سے پہلے ان کے پاس کوئی کتاب آ گئی ہو' اس میں یہ لکھا ہو کہ یہ جو کچھ کہہ رہا ہے یہ غلط ہے'

کوئی رسول ہی آیا ہو' اُس نے یہ آ کر کہہ دیا ہو' یہ بھی نہیں ہے۔ جو کچھ پہلے سے ہوتا چلا آ رہا ہے' جو کچھ اسلاف کہتے چلے آ رہے ہیں' یہ اسے ہی حق کہتے ہیں۔

عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے متعدد اور مقامات پر یہ جو رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کرنے والے کفار تھے' ان کے اقوال نقل کیے ہیں' کفار کے بھی اور یہ جو یہود و نصاریٰ اور مجوسی' جتنے بھی اسلام کے مخالفت کرنے والے تھے' ان کے بھی۔ قرآنِ کریم نے ہر مقام پر ان کی طرف سے یہی عذر پیش کیا ہے کہ یہ جواب میں یہ کہتے ہیں اور ہر دفعہ ان کو کہا کہ یہ کوئی دلیل نہیں ہے جو تم دے رہے ہو۔ میں کہتا ہوں کہ جو میں کہہ رہا ہوں' اُسے آن میرٹ پرکھو' تم کہہ رہے ہو کہ یہ اسلاف کے طریقے کے خلاف چلا آ رہا ہے' او! ہوسکتا ہے کہ وہ غلط ہی ہو یا ٹھیک ہی ہو' پرکھ کے تو دیکھو' دلیل و برہان کی رو سے وہ ٹھیک نکلے تو اسے Accept (قبول) نہ کرو۔ میں کب کہتا ہوں کہ پھر اسے Accept (قبول) کرو' کھڑے ہو کر پرکھ تو کر لو۔ مگر یہ کہتے ہیں کہ جی نہیں! ہم اس کے لیے تیار نہیں ہیں۔ وہی کریں گے جو اسلاف کا مسلک ہے۔

اسلاف پرستی کے متعلق ہمارے علما حضرات کا عقیدہ

میں نے کہا ہے کہ قرآنِ کریم نے ان کے یہ اقوال درج کیے ہیں اور اپنی طرف سے ان کی تردید کی۔ اس سے زیادہ بھی آپ کوئی انقلاب کہیں گے کہ قرآن کے ماننے والے یہی مسلمان ہیں' جواب قرآن کے خلاف دلیل دیتے ہیں۔ اہلِ مذہب میں سے جو اہلِ شریعت ہیں' جو آپ کے علماء حضرات ہیں' آپ ان میں سے کسی سے بات کر کے دیکھیں' وہ یہی کہیں گے کہ صاحب! یہ تو اسلاف کے مسلک کے خلاف ہے' یہ اس روش کے خلاف ہے جس کے اوپر ہم چلے آ رہے ہیں۔ وہی جو قرآنِ کریم کفار کا' غیر مسلموں کا' قول پیش کر کے' اس کی تردید کرتا تھا' یہی اب ہمارے ہاں سے دلیل پیش کی جاتی ہے۔ مذہب تو ہر جگہ ایک ہی ہوتا ہے۔ اسلام تو دین تھا' مذہب تھا ہی نہیں۔ یہودیوں کا مذہب تھا' عیسائیوں کا مذہب تھا' مجوسیوں کا مذہب تھا۔ بزرگوں کے متعلق مذہب یہ کچھ کہتا تھا۔ اب یہ ان کی عظمتوں کے قصیدے سنانے کے لیے پراپیگنڈہ کرتے چلے آئے' لوگوں کے ذہنوں کے اندر ان کا بہت بڑا بت بنایا اور اس کے بعد پھر کہا کہ جی! وہ فلاں حضرت صاحب' فلاں امام صاحب نے فرمایا ہے' فلاں حضرت صاحب کا ارشاد ہے' فلاں کتاب میں لکھا ہے۔ قرآن کچھ اور پیش کر رہا ہے اور' یہ کچھ اور چیزیں کہہ رہے ہیں۔ انہوں نے ان کے ذہنوں کے اندر' ان کی عظمتوں کے مینار کھڑے کیے ہوئے ہیں مثلاً یہ کہ صاحب! ان سے یہ پوچھیے کہ کیا یہ قرآن کو زیادہ جانتے ہیں اور جو حضرت صاحب تھے وہ قرآن نہیں جانتے تھے؟ یہاں اس طرح کا جاننے کا سوال نہیں ہے۔

قرآنِ حکیم ہر دور کے انسانوں کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے

قرآن تو کہتا ہے کہ تم خود دیکھ لو' پڑھ کر دیکھ لو' یہ اس کے خلاف جا رہا ہے' کہتے ہیں کہ جی! کیا اُنہوں نے قرآن نہیں پڑھا تھا؟ گویا یہ پڑھا جا چکا' قرآن کسی دور تک سمجھا جانا تھا جو کچھ سمجھا جا چکا' وہ دور ختم ہو گیا جبکہ قرآن کہتا ہے کہ **وَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَ مَا بَلَغُوْا مِعْشَارَ مَآ اٰتَيْنٰهُمْ فَكَذَّبُوْا رُسُلِيْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ** (34:45) یہ جس دولت پہ' جس قوت پہ' جس سطوت پہ' مان کر کے' اس کے گھمنڈ میں یہ باتیں کر رہے ہیں' اس سے پہلے بھی قومیں گزری ہیں۔ اِن کے پاس تو ان کا کوئی دسواں حصہ بھی نہیں ہے۔ وہ تو شوکت و حشمت اور قوت و حکومت میں ان سے اتنی زیادہ بڑھی ہوئی تھیں۔ اب دیکھیے! کہتا کیا ہے؟ یہ کہ جب ان قوموں نے عقل و فکر سے کام لینا چھوڑ دیا' تو ان کے صرف کھنڈرات باقی رہ گئے' قومیں باقی نہیں رہیں۔ کہتے وہ بھی یہی تھے کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں' یہ اسلاف کا راستہ ہے۔ جرم کیا تھا؟ یہ تھا عقل و فکر سے کام نہ لینا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآنِ کریم قوموں کے زوال اور تباہی کا بنیادی سبب کیا بتاتا ہے؟ یہ کہ علم و بصیرت اور عقل و فکر سے کام نہ لینے والی قوم برباد ہو جاتی ہے۔

اسلاف پرستی انسانوں کی دنیا پر حیوانوں کی طرح جمود طاری کر دیتی ہے

انسان کو تو حیوانات سے اشرف بنایا ہی اس بنا پہ تھا کہ اس کو صاحبِ عقل بنایا تھا' صاحبِ فکر بنایا تھا۔ اسلاف کا مسلک حیوان کے ہاں ہوتا ہے' دس ہزار یا دس لاکھ یا دس کروڑ سال پہلے بکری جو کچھ کرتی تھی' جو کچھ کھاتی تھی' جس طرح رہتی تھی' جیسے جاتی تھی' آج بھی وہ بکری اُسی طرح سے کرتی ہے' اسلاف کے مسلک پہ چلتی ہے۔ تمام حیوانات اسلاف کے مسلک پہ چلتے ہیں۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ دس کروڑ سال پہلے جہاں ان کا پہلا کوئی Self (پیکر نفس) کھڑا تھا' آج بھی وہیں ہے' آج کی بکری' آج کا بھیڑ' یا آج کا شیر بھی' وہیں کھڑا ہے' ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتا' اس میں زندگی جامد ہو کر رہ جاتی ہے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں''۔ یا تو ویسے کا ویسے ہی گزر جانا ہے یا ختم ہو جانا ہے' اب تو معلوم ہی نہیں ہے کہ کتنی اور اس قسم کی Species (انواع) ہیں جو ختم ہی ہو چکی ہیں اور جو باقی ہیں وہ اسی شکل میں باقی ہیں' ان میں کوئی ارتقائی منزل آگے نہیں طے ہوتی' اور ان میں کوئی آگے نہیں بڑھتا۔

زندہ قوموں کا اسلاف پرست قوموں سے سلوک اور ہماری حالت

جو قومیں بھی عقل و فکر سے کام لینا چھوڑ دیتی ہیں' حیوانی زندگی کی طرح' جامد زندگی کی طرح' ایک مقام پہ کھڑی رہتی ہیں' آگے بڑھنے والی جو قومیں ہوتی ہیں' وہ ان کو دھتکار دیتی ہیں' وہ ان سے جانوروں کا' حیوانوں کا کام لیتی ہیں' یہ ان کا بوجھ اٹھاتی ہیں' ان کی

جگہ ذبح ہوتی ہیں۔ یہی تو انسان اور انسان میں بنیادی فرق ہے۔ آج بھی جن قوموں کو آپ کہتے ہیں کہ وہ آپ سے بہت آگے چلی گئی ہیں ان کے اندر کیا خصوصیتِ کبریٰ ہے۔ جس کی بنا پہ وہ آگے چلی گئیں اور آپ پیچھے رہ گئے؟ وہ ہے عقل وفکر اور علم وبصیرت۔ آگے بڑھ جانے والی اقوام نے اس سے کام لیا ہے' وہ اتنے آگے چلے گئے کہ آپ روٹی تک کے لیے ان کے محتاج ہو گئے ہیں۔ کہیں پتہ کھڑکتا ہے' ہم سمجھتے ہیں کہ موت ہے' کسی سلطنت کے اندر' کسی سربراہ کا' کسی پریذیڈنٹ کا یا کسی سربراہ کا الیکشن ہونے لگتا ہے' تو ہم بیٹھے ہوئے دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ یا اللہ! یہ کس طرف کو رخ کرے گا۔ کیفیت یہ ہوتی ہے۔ کہیں زلزلہ آتا ہے' ہمارے درودیوار ہل جاتے ہیں۔ فرق کیا ہے؟ یہ کہ وہ عقل وفکر سے کام لیتے ہیں' ہم پہ عقل وفکر حرام کر دی گئی ہے۔

دنیا کی ہر مذہب پرست قوم علم وشعور کے میدان میں آپ کو پیچھے دکھائی دے گی

عزیزانِ من! دنیا کے اندر جتنی مذہب پرست قومیں ہیں' وہ ساری کی ساری آپ کو پیچھے رہی ہوئی نظر آئیں گی۔ یہ جن کو یورپ کے عیسائی کہتے ہیں' انہوں نے عیسائیت کو چھوڑ دیا ہے۔ جب تک وہ عیسائیت کے ساتھ چپکے رہے تھے' ان کی حالت بھی یہی تھی۔ اُس عیسائیت میں بھی ایک پروٹسٹنٹ تھا' وہ ذرا عقل وفکر سے کام لیتا تھا' وہ ان سے آگے ہیں۔ جو کیتھولک ہیں' وہ آج بھی گرجوں کے اندر جا کر وہی موم بتیاں جلاتے ہیں۔ مجوسی' بدھ مت والے' ہندو' دنیا کا کوئی مذہب پرست طبقہ آج بھی پیچھے ہے' مذہب کے معنی ہی یہ ہیں کہ عقل وفکر کو اپنے اوپر حرام قرار دے دینا۔ جہاں بھی آپ دیکھیں گے' تو یہ نظر آئے گا کہ جب اُنہوں نے مذہب کو چھوڑا ہے' وہ آگے بڑھ گئے' مثلاً چین نے بدھ ازم کو چھوڑا ہے' چلیے! الحاد سہی' انکار سہی' بے دینی سہی' مذہب کو تو چھوڑا ہے' عقل وفکر میں آئے' اور آگے بڑھ گئے' روس والوں نے عیسائیت کو چھوڑا ہے' ہندو اس دھرم کو چھوڑ رہے ہیں' ان کے ہاں یہ صورت پیدا ہو گئی کہ وہ آگے بڑھ گئے ہیں۔

ملتِ اسلامیہ کو فکر وعمل اور دانش وبینش سے محروم رکھنے کی گہری سازش

یہودیوں نے بھی جو یہ مملکت قائم کی ہے' تو پہلے انہوں نے یہودیت کی جو اسلاف پرستی تھی' اُسے چھوڑا ہے۔ اُنہوں نے مذہب چھوڑ دیا ہے۔ ان کے پاس دین تھا ہی نہیں' ہمیں تو مذہب چھوڑ کر ملحد اور بے دین ہونے کی ضرورت نہیں۔ آج خدا کی محفوظ کتاب قرآنِ کریم آپ کے پاس موجود ہے۔ چھوڑیئے اس مذہب کو' عقل وفکر کی بنا پر آیئے دین کی طرف۔

آج بھی' عزیزانِ من! جس کا نام احیائے اسلام لیا جاتا ہے' جسے اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کہا جا رہا ہے کہ دوبارہ زندہ ہو رہا ہے اسلام۔ اس کے لیے کیا آپ کو پتہ ہے کہ یہ زندہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ وہی اسلاف کے مسلک کا اسلام ہے جو آپ کے ہاں چلا آ رہا

تھا۔ وہ زندہ ہو رہا ہے' ہمارے ہاں کی اگلی تعلیم یافتہ نئی نسلیں (Generation) آئی ہیں' ان کے باہر کی قوموں سے کچھ Contacts (تعلقات) ہوئے ہیں' انہوں نے کچھ نئی قسم کی تعلیم حاصل کی ہے' عقل وفکر سے کام لینا شروع کر دیا ہے۔ اب اس پہ دہائی مچائی جا رہی ہے کہ انہوں نے مذہب کو چھوڑ دیا ہے' یہ اسلام سے برگشتہ ہو رہے ہیں' یہاں احیائے اسلام کے معنی ہیں' وہی جسے انہوں نے چھوڑا ہے' جس سے یہ برگشتہ ہوگئے ہیں' اس کو کسی طرح سے دوبارہ زندہ کر کے غالب کیا جائے۔ یہ وہی ہے' جس میں عقل وفکر کی کوئی گنجائش نہیں۔ اور ہم نے تو چونکہ عقل وفکر سے کام لینا چھوڑ دیا ہے' جو کچھ ہمارے ساتھ بیتتی ہے ہم اس وقت کھڑے ہو کر نہیں سوچتے کہ ہو کیا رہا ہے' ہم بعد میں سوچتے ہیں' ''قلوں کے ختم'' پر مردے کو بخشواتے ہیں' چہلم پر' اس کا چالیسواں کر کے اس کو جنت میں بھیجتے ہیں' جب زندہ ہوتا ہے اس وقت فکر نہیں کرتے کہ یہ جنت میں کس طرح سے جائے۔ ہمارے ساتھ یہ ہو رہا ہے۔ اس قوم کے ساتھ بڑی سازشیں ہوئی ہیں۔ دنیا کی قومیں ان سے ڈرتی ہیں' ان سے کانپتی ہیں' اُنہیں پتہ ہے کہ اگر ان کا دین کہیں اوپر آ گیا' اس قوم نے سوچنا شروع کر دیا' دنیا کی کوئی قوم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس کے خلاف شروع سے یہ سازش ہوتی چلی آ رہی ہے کہ اگر کبھی کوئی تحریک ان کے اندر ایسی پیدا ہو جائے' جو سوچنے کی طرف ان کو مائل کر دے' تو اس تحریک کو کچل دو اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہی ان کے اسلاف کا جو مذہب چلا آ رہا ہے' اس کی تجدید کر دو' اس کا احیا کر دو۔ یہ آپ کے ہاں آج ہو رہا ہے۔ جب آپ تباہ ہو جائیں گے' اس وقت نگہٴ بازگشت پہ دیکھیں گے تو پتہ چلے گا کہ ہمارے ساتھ ہوا کیا تھا۔ جسے ہم اسلام کی احیا کہہ رہے تھے وہ تو ہمیں تباہ کر رہی تھی۔ درحقیقت یہ سازش ہے کہ یہ قوم کہیں سوچنا نہ شروع کر دے۔

مذہب کے شعبوں کی دو بڑی خصوصیات: توہم پرستی اور اسلاف پرستی

عزیزانِ من! میں کہہ یہ رہا تھا کہ پچھلی آیات میں قرآن نے توہم پرستیاں اور اسلاف پرستیاں مذہب کی دو خصوصیات بتائیں' دو چیزیں بتائیں۔ پہلی چیز وہ ہے کہ جو دیوی دیوتاؤں کی پرستش ہوتی تھی' وہاں سے نکلے تو اہلِ مذہب آئے اور انہوں نے اسلاف پرستی شروع کر دی۔ عقل وفکر کے خلاف وہ بھی ڈنڈا لے کر چلے ہوئے ہیں' عقل وفکر کے خلاف یہ بھی چلے ہوئے ہیں۔ یہاں تک پہنچنے کے بعد آیئے اس آیہ جلیلہ کی طرف جو ہمیں ان دونوں سے نکال کر صحیح راستے پر گامزن کر سکتی ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی تئیس سالہ تبلیغ کا ماحصل صرف ایک بات: بس سوچا کرو

عزیزانِ من! کیا عرض کروں کہ کہاں کہاں اس آیہ جلیلہ کو لکھ کر رکھیے! کیا عرض کروں کہ کتنی بنیادی اہم چیز ہے جو کہی جا رہی ہے! مذہب کے اسٹیج سے یہ آواز دی جا رہی ہے! یہ سارا کچھ ہے! وہ نبی اکرم ﷺ کی مخالفت کرتے تھے' پتہ نہیں کتنے کتنے لمبے وہ

مذاکرے اور مباحثے کرتے ہونگے' باتیں کرتے ہونگے۔ تئیس سال حضورﷺ ان کے اندر رہے اور تبلیغ کرتے رہے اور سنیئے عزیزانِ من! آخر میں کہا کیا؟ یہ کہ قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ (34:46)۔ یہ وہ آیہ جلیلہ ہے' جو بیسیوں مرتبہ آ چکی ہے' اور ہزاروں مرتبہ اس قوم کے سامنے آنی چاہیے۔ ان کا رسول مخالفین سے کہہ رہا ہے کہ دیکھیے! میں تم سے کوئی لمبے چوڑے وعظ نہیں کہنا چاہتا' کوئی لیکچر نہیں دینا چاہتا' کوئی بحث نہیں کرنا چاہتا' کوئی جھگڑا نہیں کرنا چاہتا' بس اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ (34:46) میں تم سے صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں' صرف ایک بات! یہ بات کہنے کا جو انداز قرآن نے اختیار کیا ہے' اسی سے آپ سوچیے کہ اس کی کتنی اہمیت ہوگئی کہ میں تم سے کوئی لمبی چوڑی بات کہنا ہی نہیں چاہتا' بابا! میں تو تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ یقیناً اس میں ایک بڑی نفسیاتی چیز ہے۔

عزیزانِ من! سائیکولوجیکلی (نفسیاتی طور پر) دوسرے کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے بڑی لمبی چوڑی بات ہی کوئی نہیں کرتا۔ کہتا ہے کہ میں تو ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَ فُرَادٰى (34:46) سب کے سب نہیں' ہجوم کا ہجوم نہیں' تو خدا کے لیے ایک ایک دو دو کر کے رک جاؤ' یہ بات ایسی نہیں ہے کہ چلتے چلتے تم سن لو۔ حاصلِ تبلیغ رسالتﷺ' ماحصل پیغامِ خداوندی اعظکم بواحدۃ 'ایک بات' صرف یہ ایک بات ہے۔ میرے عزیزو! اس کو ہزار بار دہراؤ کہ خدا کے لیے تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں' چلتے چلتے سنانے کی بات نہیں ہے' کھڑے ہو کر سننے کی ہے' سارے کھڑے نہ ہوں' ایک ایک دو دو کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ کھڑے ہو کر سنو میری بات۔ دیکھا! تمہید کیسی عجیب ہے! اس کے اندر وہ کھڑے بھی ہو جائیں گے' بھئی! کھڑے ہو کر سن لو' کونسا لمبا وقت ہے۔ فرمایئے! آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ کہا کہ صرف ایک بات میں نے کہا تھا' بات بھی ایک نہیں' میں تو صرف ایک لفظ کہنا چاہتا ہوں۔ کہا کہ فرمایئے! کیا کہنا چاہتے ہیں؟ کہا کہ ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا (34:46) سوچا کرو' جاؤ۔ بس ایک لفظ ہے' یہ تو ایک بات بھی نہیں' عزیزانِ من! ایک لفظ ہے' ایک لفظ کے اندر قیامتیں پوشیدہ ہیں۔ اس نے مذاہب کی جڑ کاٹ کر رکھ دی' ہر مذہب خواہ وہ جہالت کی توہم پرستیوں پہ مبنی ہو یا اسلاف پرستیوں کے اوپر ہو' ہر مذہب سوچ کے خلاف تھا اور ہے "صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں کہ سوچا کرو' غور وفکر سے کام لیا کرو"۔ غور فرما لیا آپ نے!

اب اگلی بات بڑی عجیب کہی ہے۔ کہا ہے کہ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ (34:46) تم نے سوچنا شروع کر دیا تو پہلی بات تو تمہاری سمجھ میں یہ آئے گی کہ جس نے یہ کہا ہے وہ پاگل نہیں ہے' کبھی پاگل بھی کسی سے کہتا ہے کہ سوچا کرو! کہا کہ پہلی بات یہ تمہاری سمجھ میں آئے گی کہ یہ کچھ کہنے والا پاگل نہیں ہے بلکہ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَیْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ(34:46) سوچو گے تو سمجھ میں بات آجائے گی کہ یہ کہہ یہ رہا ہے کہ تمہاری یہ روش' جس پہ چل رہے ہو' اس کا نتیجہ بہت بڑی تباہی ہے' سوچو گے تو وہ تباہی

سامنے نظر آ جائے گی' اس وقت تم کہو گے کہ واقعی کسی پاگل نے یہ بات نہیں کہی تھی۔

بات تو میں نے تم سے ایک ہی کہی ہے کہ تَتَفَكَّرُوْا ۔عزیزانِ من! جیسا میں نے عرض کیا ہے حاصلِ تبلیغ رسالت ﷺ' ماحصل پیغاماتِ خداوندی ''تت کڈیا ہویا پنجابی اچ جنوں کہندے نیں''، یعنی نچوڑ ساری کی ساری تعلیم کا تَتَفَكَّرُوْا ہے۔ ذہن میں تھا کہ پتہ نہیں وہ ایک بات کیا ہے جو کہی جا رہی ہے۔ معاف رکھیے! یہ نہ سمجھیے کہ میں کچھ نماز یا روزے کی خدانکردہ تحقیر کرتا ہوں یا تنقید کرتا ہوں۔ ذہنوں میں یہی تھا کہ شاید یہ کہیں گے کہ ایک بات میں صرف تم سے کہتا ہوں اور وہ ہے کہ نماز پڑھا کرو۔ مذہب کی دنیا کے اندر یہ چیز ہوتی ہے' یہ سب چیزیں بھی ضروری ہونگی لیکن مقدم چیز یہ تَتَفَكَّرُوْا ہے۔ کہا گیا ہے کہ سوچا کرو۔

جہنم میں جانے والوں کی نشانی

سارا قرآن' عزیزانِ من! اسی اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ' اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْا' اَفَلَا تَتَدَبَّرُوْا سے بھرا پڑا ہے یعنی کیا یہ سوچتے نہیں؟ کیا یہ عقل وفکر سے نہیں لیتے؟ کیا یہ علم وبصیرت سے کام نہیں لیتے؟ ان کو کیا ہو گیا ہے' کہ یہ سوچتے نہیں ہیں؟ میں نے عرض کیا ہے کہ اس پر قرآنِ کریم کے اندر سینکڑوں آیات ہیں۔ آپ نے آیات ہی کا حوالہ لینا ہو تو میری کتاب 'تبویب القرآن' میں علم بصیرت عقل شعور کے عنوانات دیکھیے' سینکڑوں کی تعداد میں آپ کے سامنے آیات آئیں گی۔ اس وقت قرآنِ کریم کے متعلق صرف ایک آیت ہے کہ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ (47:24) کیا یہ قرآن میں غور و تدبر سے کام نہیں لیتے؟ کہا ہے کہ یہ کیا ہو گیا ہے کہ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (47:24) کیا ان کے دلوں پر تالے پڑ گئے ہیں؟ یہ غور وفکر سے کام نہ لینے والوں کے متعلق کہا ہے کہ ان کے دلوں پہ تالے پڑ گئے ہیں کیونکہ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ بِهَا (7:179) سینے میں دل رکھتے ہیں لیکن اس سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے۔ یہاں قرآن کہتا ہے کہ آؤ! تمہیں جہنم میں جانے والوں کی نشانیاں بتائیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو سینے میں سمجھنے کی صلاحیت رکھنے والا دل تو رکھتے ہیں' اُس سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔ غور فرمایئے کہا کہ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِیْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ (7:179)۔ وَ لَهُمْ اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ (7:179) ہم نے آنکھیں دی ہیں' وہ ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے' وَ لَهُمْ اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ بِهَا (7:179) کان دیئے ہیں سننے کا کام نہیں لیتے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ لَهُمْ اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ بِهَا (7:179) سمجھے سوچنے کا دل اور دماغ بھی دیا ہے' سمجھنے سوچنے کا کام ہی نہیں لیتے۔ کہا ہے کہ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ (8:22) بدترین مخلوق' انسانوں میں ہی بدترین نہیں' کہا یہ ہے کہ جانداروں میں سب سے زیادہ بدترین مخلوق وہ انسان ہیں' جو عقل وفکر سے کام نہیں لیتے۔

دلوں پر تالے پڑ جانے کی نوعیت اور اصلیت چمگادڑ کی سی ہو جاتی ہے

عزیزانِ من! آپ عقل وفکر کی اہمیت پر غور فرمائیے۔ اور یہاں جو میں نے کہا ہے کہ **اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا** (47:24) ان کے دلوں کے اوپر تالے پڑ گئے ہیں۔ بات سامنے آجاتی ہے' اسے یونہی چھوڑ کر آگے جانے کو جی نہیں چاہتا' اس میں قرآن اتنی بڑی عظیم سائیکولوجیکل حقیقت کہہ گیا ہے۔ صرف اتنا کہنا ہی کافی تھا کہ دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں۔ کہا کہ ان کے دلوں میں یہ نہیں ہے کہ باہر سے کسی نے تالا ڈال دیا ہے۔ یہاں **عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا** (47:24) ہے' کہ انہوں نے دلوں میں خود ہی اپنا ایک تالا بنایا ہے' اور خود ہی اسے اپنے اوپر ڈال لیا ہے۔ کوئی سائیکولوجسٹ اس کی داد دے سکے گا۔ یہ جو جہالتیں ہیں' عزیزانِ من! کہیں باہر سے نہیں لائی جاتیں' دلوں کو جب سوچنے سمجھنے سے باز رکھا جاتا ہے' تو یہی چیز قرآن نے دوسری جگہ کہا ہے' کہ ان کے اعمال خود زنگ بن گئے ہیں' یہ اپنے ہی اعمال اپنے ہی لیے زنگ بن جاتے ہیں۔ بس سمجھنا سوچنا چھوڑ دیجیے۔ فطرت کا قاعدہ ہی یہ ہے کہ اگر کوئی جاندار اپنے کسی عضو یا صلاحیت سے کام لینا چھوڑ دے' کچھ عرصے کے بعد فطرت کہتی ہے کہ اس کو یہ دینے سے کیا فائدہ' وہ اسے مفقود ہی کر دیتی ہے' ختم کر دیتی ہے' ان کو چمگادڑ بنا دیتی ہے' جنہوں نے کچھ عرصے کے لیے اپنی آنکھیں روشنی سے بند رکھیں تو اُس نے کہا کہ ٹھیک ہے' ان کو آنکھیں ہی ایسے دو جو روشنی میں کھل ہی نہ سکیں۔ یورپ کے اندر' امریکہ کے اندر' جانوروں کے اوپر ٹیسٹ ہو رہے ہیں۔ ان کو عمر بھر اندھیرے میں' تاریکی میں' رکھا جاتا ہے۔ اس کے بعد ان کے ہاں کے جو آگے بچے پیدا ہوتے ہیں' وہ پیدائشی اندھے ہوتے ہیں۔ فطرت اس قدر فضول خرچ واقع نہیں ہوئی ہے کہ جب اس کو پتہ چلے کہ انہوں نے اس سے کام نہیں لینا تو وہ پھر بھی اس کو دیتی چلی جائے۔ جو قومیں عقل وفکر سے کام نہیں لیتیں' ان کے دل اپنے اوپر خود تالے ڈال لیتے ہیں۔ کچھ جنریشن کے بعد دیکھیے گا' ان قوموں میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی نہیں رہتی۔ اسی لیے آپ ﷺ نے کہا یہ تھا کہ **تتفکروا** (34:46) سوچا کرو۔

دنیائے مذہب میں سب سے عقل مند انسان وہ سمجھا جاتا ہے جو عقل سے کام نہ لے بلکہ عقیدے کو مانے

عزیزانِ من! اس کے بعد وہ آیت ہے جو کئی دفعہ آچکی ہے۔ ساری دنیا میں ایمان کا ترجمہ Faith (عقیدہ) کیا گیا ہے۔ یہ وہی ترجمہ ہے' جو ہر جگہ جاتا ہے۔ ہر جگہ ایمان کا وہی ترجمہ Faith (عقیدہ) کیا ہے' Conviction نہیں کیا۔ Faith (عقیدہ) کے معنی ہیں جس چیز کو بغیر عقل وفکر کے مانا جائے۔ ہمارے ہاں بھی یہ چیز ہے کہ ایمان کے معاملے میں' Faith (عقیدے) کے معاملے میں' عقل وفکر کا کام نہیں ہے۔ پکے ایمان والا اُسے کہیں گے جو یہ کہے کہ صاحب! میں تو بغیر سوچے

سمجھے مانتا ہوں' میں بغیر دلیل کے مانتا ہوں اور پھر اس کے اوپر ہمارے ہاں پر اہل مذہب کی' کہانیاں آ گئیں۔ یہاں سے سازش شروع ہوئی۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک اہلِ ایمان کی ایک خاص خصوصیت' فتوحات اور سازش

میں عرض کرتا ہوں کہ آپ کے ساتھ سازش کیا ہوئی۔ قرآنِ کریم نے مومنین کی بہت سی چیزیں بطور خصوصیات بتائی ہیں کہ مومن وہ ہوتے ہیں' مومن وہ ہوتے ہیں اور آگے کہا ہے کہ مومن وہ ہوتے ہیں جو **وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا** (25:73) مومن تو وہ ہوتے ہیں کہ جب ان کے سامنے اور تو اور خدا کی آیات بھی پیش کی جائیں تو وہ ان کے اوپر بھی آنکھیں بند کر کے' کان بند کر کے' نہیں جھک پڑتے' اندھے بہرے بن کر ان کو Accept (قبول) نہیں کر لیتے۔ ایمان تو نام ہی آنکھیں کھول کر' کسی چیز کو فکر سے' غور سے' تدبر سے' سمجھنے کے بعد Accept (قبول) کرنے کا نام ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ مومن کی تو Definition (تعریف) ہی یہ ہے کہ اور تو اور خدا کی آیات کو بھی وہ آنکھیں بند کر کے' کان بند کر کے Accept (قبول) نہیں کرتے۔ غور وفکر سے سوچتے ہیں' جب ان کا قلب و دماغ اس پہ مطمئن ہو جاتا ہے' پھر Accept (قبول) کرتے ہیں۔ اُسے مومن کہتے ہیں' عزیزانِ من! اگر میں اسی موضوع پہ جاؤں تو میرا خیال ہے کہ چھ مہینے تک بھی درس ختم نہ ہوں۔ قرآن نے عقل وفکر کو اتنی اہمیت دی ہے لیکن میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اتنا ہی کافی ہے۔ آپ خود قرآن اٹھا کر دیکھیے' قریب قریب ہر صفحے پہ کوئی نہ کوئی لفظ عقل اور فکر اور دلیل اور شعور اور تدبر اور تفکر کا آتا ہے۔ اتنی بدیہی حقیقت کے متعلق زیادہ تفصیل میں ایک درس میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کہنے والا وہ ہے' اگر آپ اسلام کو دین کے بجائے مذہب ہی کہتے ہیں تو ان کے الفاظ میں مذہب کا بانی بلند ترین مقام پہ کہہ رہا ہے کہ تتفکروا (34:46) سوچا کرو' سارا قرآن اس سے بھرا پڑا ہے۔

اس کے بعد آپ کے ساتھ سازش ہوئی۔ یہ جو انہوں نے چند سالوں کے عرصے کے اندر' نہ ایران کی تہذیب کو چھوڑا' نہ بازنطینی ایمپائر کو چھوڑا' مصر تک چلے گئے' ملتان تک آ گئے' یہاں تک پہنچ گئے۔ انہوں نے اس زمانے میں کوئی ایٹم بم ایجاد نہیں کیے تھے' یہ سارے وہ علاقے تھے جو مذہب پرست تھے' خواہ وہ ایران تھا' خواہ وہ عیسائیت تھی' خواہ وہ مصر تھا' خواہ وہ آپ کا سندھ تھا' خواہ یہ ملتان تھا' یہاں (سندھ میں) ہندو تھے' وہاں (ایران میں) مجوسی تھے' وہاں عیسائی (بازنطینی سلطنت میں) تھے۔ یہ سب عقل وفکر سے کام نہ لینے والے مذہب پرست طبقہ کے پیروکار تھے۔ یہ عقل وفکر والے چند سالوں کے اندر ان کے اوپر آئے اور چھا گئے۔

ان قوموں نے' جنہوں نے ان کے ہاتھوں شکست کھائی تھی' بعد میں سوچا کہ ان سے انتقام کس طرح سے لیا جائے۔ انتقام کی

ایک ہی بات تھی کہ یہ ایک ہی چیز ان میں ہم سے زیادہ خصوصیت کی تھی کہ ''انہوں نے سوچنا شروع کر دیا تھا''۔ کہا یہ کہ ایسا انتظام کرو کہ یہ سوچنا بند کر دیں۔ ایک طرف آپ کے ہاں شریعت کے اندر یہ چیز آئی کہ ساری کی ساری نیکیاں اس پہ ہیں کہ ''جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے' اس پہ چلتے جاؤ''۔ یہ عقیدہ ان کے ہاں پیدا کر دو کہ جو''ہوتا چلا آرہا ہے اس میں غور و فکر کی بات نہیں ہے' سمجھ اور سوچ کی کوئی بات نہیں ہے' آنکھیں بند کر کے مانتے چلے جاؤ'' ان مخالفین نے انہیں اس میں اتنا زیادہ راسخ کیا کہ یہ عینِ اسلام بن گیا۔ شریعت نے تو یہ کیا۔ اس میں اگر تھوڑی بہت رمق باقی تھی تو پھر تصوف آ گیا۔ اس کا کارنامہ ہی اتنا ہے کہ وہ علم اور عقل کے خلاف لٹھ لیے پھرتا ہے ''اکو الف تینوں درکار علموں بس کریں او یار''۔ میں نے یہ دو الفاظ کہے ہیں' عزیزانِ من! اس لٹریچر سے لائبریریوں کی لائبریریاں بھری ہوئی ہیں کہ ساری دنیا میں تباہیاں عقل کی لائی ہوئی ہیں۔ یہ تھی وہ گہری سازش جو ہمارے ساتھ ہوئی۔

میں نے آدھی عمر تصوف اور شریعت کے میکدوں میں گزاری ہے' تعلیم یہ تھی کہ سوچنا نہیں: پرویزؒ

عزیزانِ من! یہ چیز سنی ہوئی نہیں ہیں۔ وہ تو میں کئی دفعہ کہہ چکا ہوں کہ میری پہلی آدھی عمر تو اسی میں گزری ہے' اس کی جو آپ کے سامنے اب یہ کچھ کہہ رہا ہے۔ شریعت میں بھی اور تصوف میں بھی' دونوں میں یہ کیفیت ہے کہ آدھی عمر اس میں گزری ہے۔ آپ احباب کو وہ شعر تو یاد ہو گا جو میں کہا کرتا ہوں کہ

اسیرِ زہد رہا ہے کئی برس اے شیخ
یہ میر اب جو گدا ہے شراب خانے کا

قرآن کے اس میکدے کا جو گدا[1] ہے' آپ کو کیا معلوم کہ اس کی آدھی عمر اس میں گزری ہے۔ پتہ نہیں' یہ اس کی رحمت تھی جو ہم اس دلدل سے نکل آئے' دونوں طرف سے دونوں چیزیں مجھ پہ مسلط تھیں دو خانوادوں کا مجاز تھا' تصوف والے جانتے ہیں کہ صاحبِ مجاز کیا ہوتا ہے یعنی جس کو مرید کرنے کی خود اجازت ہو' اتنے مرید تھے۔ تعلیم کیا تھی؟ یہ کہ سوچنا نہیں ہے:

بے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود زراہ و رسم منزلہا

پیر اگر کہتا ہے کہ اپنے اس مصلّے کو اٹھا کے شراب کے مٹکے میں ڈبو دے' تو ڈبو دے' مت تامل کر' مت سوچ' وہ تجھ سے زیادہ جانتا ہے۔

---

[1] یہ اشارہ بابا جی (جی اے پرویزؒ) کا اپنی ہی طرف ہے۔

طبلے کی تھاپ اور ماہرین علم نفسیات

عزیزانِ من! اگر اس کے ساتھ طبلے کی تھاپ بھی ہو تو سائیکولوجسٹ (ماہرینِ علم نفسیات) جانتے ہیں کہ سب سے زیادہ انسانی اعصاب کو فکر کو مفلوج کرنے والی چیز طبلے کی تھاپ ہوتی ہے۔ اس سے آدمی ناچنے لگ جاتا ہے جسے آپ کہتا ہے کہ بھنگڑا ڈالتا ہے۔ یہ طبلے کی تھاپ پاگل کر دیتی ہے۔ آپ کے ہاں یہ سلسلہ عینِ اسلام چلا آرہا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ جسے میں نے احیائے اسلام کہا ہے جس کا آج یہ نام رکھا جارہا ہے وہ ہے کیا؟ ایک طرف جو طبلے کی تھاپ سے کام نہیں چلا تھاپ ذرا مدھم پڑ گئی تو کہا کہ ڈھول بجاؤ ان کو نچاؤ۔ اس طرح سے ڈھول شروع کر دیا گیا۔

تصوف کے بعد اہل شریعت کی تعلیم' نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کردہ ایک حدیث

عزیزانِ من! اب دوسری طرف اہلِ شریعت آجاتے ہیں۔ بخاری میں ایک حدیث منسوب کر دی۔ منسوب میں نے اس لیے کہا ہے کہ یہ حدیثیں نبی اکرم ﷺ کی ہو نہیں سکتیں' علم انسانی کی ان بلندیوں پہ جو اعلان کر رہا ہے کہ میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں اور وہ صرف یہ ہے کہ سوچا کرو' کیا وہ آپ کو یہ تعلیم دے گا جس میں عقل وفکر کے سوچ آف کر دیئے جائیں گے؟ نہیں' قطعاً نہیں۔ یہ قرآن کی شہادت کے خلاف ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایسی باتیں کریں۔ بخاری میں حدیث ہے کہ صحابہؓ نے دریافت کیا کہ یہ گرمی اور سردی کیسے آتی ہے؟ آپ ﷺ نے کہا کہ دوزخ نے ایک دفعہ خدا سے اپنی درخواست کی' شکایت کی کہ آپ نے میرا یہ منہ بند کر رکھا ہے' اس سے میرا دم گھٹ جاتا ہے' تو مجھے سانس لینے کی اجازت دیجیے۔ کہا کہ اچھا سال میں دو دفعہ سانس لینے کی اجازت ہے: ایک دفعہ اندر کھینچنے کی' ایک دفعہ باہر پھینکنے کی۔ جب وہ باہر سانس لیتا ہے تو گرمی آجاتی ہے' جب وہ اندر سانس لیتا ہے تو سردی آجاتی ہے۔ گرمی اور سردی کے بدلنے کا سبب یہ ہے۔ یہ ہے بخاری کی حدیث جو رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک کی طرف منسوب ہے۔

عزیزانِ من! میں اسے منسوب کہتا ہوں۔ وہ تو یہ قال رسول اللہ ﷺ کہتے ہیں۔ اب آپ سوچیے کہ کیا اس میں علم' بصیرت' عقل' فکر' تعقل' کا بھی کوئی دخل ہے' یہ تو چوتھی یا پانچویں جماعت کا جو بچہ ہے وہ بھی پوچھتا ہے بابا جان! یہ کیا چیز ہے؟ ہمیں تو پتہ ہے کہ گرمی کیسے آتی ہے سردی کیسے آتی ہے' دن کیسے پڑتا ہے' رات کیسے پڑتی ہے اور اگر یہ کیفیت ہے تو سانس باہر لی تو ساری دنیا پہ ایک ہی وقت میں گرمی آنی چاہیے تھی' اس کا ٹمپریچر ایک ہی ہونا چاہیے تھا۔ یہاں یہ کیفیت ہے کہ یہی نہیں ہے کہ کسی جگہ گرمی ہوتی ہے' کسی جگہ ٹھنڈ ہوتی ہے' کسی جگہ دوسرا موسم ہوتا ہے اور پھر قطبِ شمالی جنوبی کیا کریں گے جہاں گرمی آتی ہی نہیں ہے' تو کیا وہاں

اس کی سانس نہیں پہنچتی ہے؟ اسی طرح سردی کی کیفیت ہے۔ یہ لکھ کر کہیں یہ کہہ دیا۔طلوعِ اسلام کی شامت آئی کہ اس نے لکھ دیا کہ اس قسم کی روایات نبی اکرم ﷺ کی ہو نہیں سکتیں۔ یہ اپریل 1980ء کا طلوعِ اسلام ہے۔اس میں دیکھیے۔

اسی روایت کے سلسلہ میں صحیفہ اہل حدیث اور الاعتصام ہفتہ وار کا جواب: عقل لڑانا حرام ہے

اہلحدیث کا ایک پرچہ صحیفۂ اہل حدیث نکلتا ہے۔اس نے اس کا جواب دیا اور دوسرا ہفتہ وار پرچہ الاعتصام لاہور سے نکلتا ہے اس نے اس کو اپنے ہاں نقل کیا گویا اتنی اہم بات تھی کہ وہیں نہیں رہنے دیا' اس نے نقل کیا۔ پہلے یہ سب کچھ لکھا کہ یہ لوگ اس قسم کا اعتراض کرتے ہیں تو اس کے جواب میں لکھا کہ سب سے پہلی گزارش یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وہ بندے جنہوں نے صدقِ دل سے کلمۂ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ﷺ پڑھا ہے وہ اس قسم کی کٹ حجتی نہیں جانتے' وہ تو خدا اور رسول اللہ ﷺ کے ہر ہر فرمان پر بلا چون و چراں ایمان لاتے ہیں' انہیں تسلیم کرتے ہیں اور ان میں اپنی عقل لڑانے کو حرام سمجھتے ہیں۔'' حرام سمجھتے ہیں عقل لڑانے کو!!'' سوچیے۔اب سند کیا ہے؟ ایک تو بخاری کی روایت ہوگئی۔ چنانچہ آج تک کے سلفِ صالحین' محدثین مفسرین اور شارحین میں سے کسی ایک نے بھی اس حدیثِ نبوی ﷺ پر کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ وہ اسے من وعن مانتے چلے آئے' بعد والوں کا بھی یہی فرض تھا کہ وہ اس میں اپنے عقلی گھوڑے دوڑانے کی بجائے امنا وصدقنا کہتے۔خدا اور اس کے رسول ﷺ کی باتوں میں اپنی عقل کو داخل کرنا ایک مسلمان کی شان کے منافی ہے۔اس دور کے مسلمان کی ذرا سی آنکھ کھلنے لگی تھی کہ بھئی! کچھ سوچ سمجھ کر' عقل وفکر سے بھی کام لینا چاہیے' وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ اس میں عقل کو دخل دینا حرام ہے' سلفِ صالحین جس بات کو صحیح مانتے ہیں اس کو آنکھ بند کر کے بلا سوچے سمجھے صحیح ماننا' اس میں عقل کے گھوڑے دوڑانا مسلمان کی شان کے منافی ہے۔ابھی تو ذرا سا اس کی آنکھ کھلنے لگی تھی۔ یہ ہے احیائے اسلام کی کوششیں۔

مری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی
شیخ کہتا ہے کہ ہے یہ بھی حرام اے ساقی

عزیزانِ من! جی' ہوتا رہے۔رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے یہ عجیب انداز لیے ہے' یہاں خدا نے خود اپنی طرف سے یہ بات نہیں کہی۔رسول سے کہلوایا کہ قُل کہہ دو' بتا دو۔تو خود رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے آ رہا ہے' خدا کا ارشاد رسول کی زبان سے آ رہا ہے اور یہ آیتِ خداوندی اس لحاظ سے یہ حدیثِ نبوی ﷺ ہوئی تو وہ دونوں آ گئی تھیں: میں تم سے ایک بات کہتا ہوں کہ تتفکروا (34:46) سوچا کرو مگر ''وہ'' کہتے ہیں کہ یہ حرام ہے۔

اہلِ شریعت اور اہلِ طریقت کی سوچ کا انجام

عزیزانِ من! آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کیا کہہ گیا تھا' دین نے کیا کہا تھا' حضورﷺ نے کیا فرمایا تھا' کیا نظام تھا' کیا مسلک پیش کیا تھا اور اس کے بعد پھر آپ کو سازش کہاں لے گئی۔ دونوں ہی گوشے ہیں: شریعت ہے اور طریقت ہے۔ یہ اہلِ شریعت ہیں جو سوچ کو حرام قرار دیتے ہیں' وہ اہلِ طریقت ہیں ان کا تو پوچھو ہی نہیں' وہ تو کہتے ہیں ''علموں بس کریں او یار''۔ اور جس نے ذرا بھی آپ کے ہاں عقل وفکر کی بات کہی' اس کے پیچھے ڈگڈگی لگا دی۔ آج تو پھر بھی غنیمت ہے' بہرحال ابھی تک اتنا ہے کہ وہ تو اکبرالہ آبادی (1921-1846) نے اپنے زمانے میں کہا تھا کہ

گورنمنٹ کی خیر یارو مناؤ

انا الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ

آج بھی یہ بچت ہے ورنہ اس سازش کے خلاف آپ کی تاریخ میں' جنہوں نے بھی آواز اٹھائی کہ او بابا! قرآن تو عقل وفکر کی بات کرتا ہے' یہی نہیں کہ ان کو حوالۂ دارورسن کیا' ان کی تحریروں کا ایک ایک ورق جلا دیا' آج کہیں نہیں ہے۔ اب آج آپ ان کے احوال وکوائف سے یا ناموں تک سے بھی ناواقف ہوتے مگر ان کی تفسیروں میں' ان کی کتابوں میں' ان کا نام لے کر جو انہوں نے گالیاں دی ہیں تو اس طریق سے ان کا نام آگے محفوظ رہا' ہم تک آیا ہے کہ صاحب! یہ دیکھیے اس شخص کو' خدا اور رسول کا دشمن' ملحد' بے دین' یہ کہتا ہے کہ قرآن کی آیات کو عقل وفکر کی رو سے سمجھنا چاہیے۔ یہ اس نے گالیاں دے کر لکھا تو ہم نے یہ کہا کہ 'اللہ اکبر' کوئی اس قسم کی آواز اٹھی تھی۔ یہ ہوا ہے آپ کی تاریخ میں آپ کے ساتھ۔

مملکتِ پاکستان کے اندر سب سے زیادہ پروپیگنڈہ اس پرویزؒ کے خلاف کیوں؟

آج کیا ہو رہا ہے؟ (جی۔اے پرویزؒ: 1985-1903) کیوں سب سے زیادہ قابلِ نفرت قرار دیا جا رہا ہے؟ اس ملک کے اندر سب سے زیادہ پراپیگنڈہ پرویزؒ کے خلاف ہے کہ یہ منکر' بے دین' ملحد' کمیونسٹ ہے جبکہ یہ بھی اس ملک کے اندر جتنے ہیں' ان میں سے کسی کے خلاف یہ پراپیگنڈہ نہیں ہو رہا۔ وہ جس کی پچاس سال عمر کتاب اللہ کی آواز بلند کرتے ہوئے گزر گئی ہے' یہ سب سے زیادہ پراپیگنڈہ اس کے خلاف کیوں ہو رہا ہے؟ اس لیے کہ وہ کہتا ہے کہ **تَتَفَكَّرُوْا** (34:46) سوچا کرو۔ انہیں پتہ ہے کہ جہاں قوم نے سوچنا شروع کیا' ان کا کباڑہ ہو کر رہ جائے گا۔ قرآن کہتا ہے کہ **جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ** (17:81) ان سے کہو کہ سوچا کرو' سوچا کرو' تو اس کے بعد ''الحق آجائے گا اور باطل دُم دبا کر بھاگ جائے گا''۔ انہیں یہ فکر کھا رہی ہے۔

عزیزانِ من! اب اگلی بات کیا ہی عظیم ہے! ایک بات تو یہ کہی کہ سوچا کرو پھر اس چیز کو بھی سوچو کہ میں جو دن رات اپنی جان کھپا رہا ہوں، تکلیفیں برداشت کر رہا ہوں، تمہارے مصائب جھیل رہا ہوں، تم پتھر مار رہے ہو تو ذہن میں آتا ہوگا کہ اس کا اس میں کوئی اپنا فائدہ ضرور ہے، کہا کہ قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ (34:47) او! ان سے کہو کہ میں اس کا معاوضہ بھی تم سے نہیں مانگتا۔ اور بڑی چیز ہے، عزیزانِ من! کوئی شخص بھی اگر آپ کو اس کا قائل کر دے کہ جو کچھ میں تم سے کہتا ہوں، میرا اس میں اپنا کوئی فائدہ یا مطلب نہیں ہے، تو آپ سوچنے لگ جاتے ہیں کہ پھر مجھے واقعی سوچنا چاہیے کہ یہ خودغرضی پہ مبنی نہیں ہے۔ یہ کوئی اجر نہیں مانگتا تو سوچو کہ پھر یہ کیوں یہ کچھ کہہ رہا ہے۔ کیا عجیب چیز ہے! پہلی چیز یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ سوچو گے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ یہ کہنے والا پاگل نہیں ہے۔ اگلی بات یہ بھی سوچو کہ وہ تمہارے لیے اپنی جان کھپا رہا ہے، وہ تم سے اس کا کوئی معاوضہ بھی نہیں مانگ رہا اور تم یہ دیکھ رہے ہو کہ وہ تمہاری اصلاح کر رہا ہے، تنظیم کر رہا ہے، تم میں اخلاق کی بلندیاں پیدا کر رہا ہے، ایک نیا نظام دے رہا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ جو کچھ ہے یہ میں اپنے لیے نہیں کر رہا بلکہ فَهُوَ لَكُمْ (34:47) او! یہ بھی میں تمہارے ہی لیے کر رہا ہوں۔

دعوتِ حق دینے والے کے لیے دو اہم اصول

قرآن کی طرف دعوت دینے والے کے لیے، عزیزانِ من! اب دو بنیادی چیزیں آ گئیں: ایک یہ کہ وہ عقل وفکر کو دعوت دے اور دوسرا یہ کہ اپنی ذات کے لیے کچھ نہ مانگے۔ مذہب تو عزیزانِ من! پیشہ یا پروفیشن ہو جاتا ہے۔ ان کی روٹی کا کوئی اور ذریعہ ہی نہیں ہوتا۔ وہاں تو ہوتا ہی یہ ہے کہ عوام کی فکر کے سوئچ آف کر دو۔ انہوں نے مذہب کو پروفیشن بنا دیا ہے۔ یہ دونوں ہی چیزیں دین کے خلاف ہیں اور اکٹھی آئی ہیں۔

حق کی آواز بلند کرنے والا اپنا اجر خدا سے طلب کرتا ہے، انسانوں سے نہیں

یہ قرآن کی آیات ہیں۔ کہا ہے کہ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ (34:47)۔ کیا بات ہے سائیکولوجی کی! کہا ہے کہ میں جانتا ہوں، تم کہو گے کہ یہ تو انسان کی فطرت کے خلاف ہے کہ جس میں اس کا کوئی مفاد نہ ہو، اس کے لیے یہ کچھ بلا اجر کے کرے، دلِ بے مدعا تو کہیں نہیں ملتا، انسان کا دل تو اسی کام کرنے کے لیے اٹھتا ہے، جس میں اس کو کچھ اپنا فائدہ نظر آتا ہے۔ کہنے لگے کہ میں تمہیں یہ بات بھی بتا دوں کہ یہ جو میں نے کہا ہے کہ میں تم سے اجر نہیں مانگتا تو میں نے کہا یہ ہے کہ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ (34:47) میں تم سے اس کا بدلہ نہیں مانگتا کیونکہ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ (34:47) میرا اجر دینے والا ہے، میں اس سے اجر مانگتا ہوں، تم سے نہیں مانگتا۔ اگلی چیز یہی ہے کہ اگر وہ ان انسانوں سے نہ مانگے، صرف خدا کے لیے یہ کرے اور پھر وہ یوں اجر دیتا ہے، انسانوں

نے کیا اجر دینا ہے' اس کے لیے عزیزانِ من! کہا ہے کہ وَ هُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ (34:47) اور یہ بھی بات نہیں ہے کہ میں جان مارتا ہوا یہ کرتا رہوں' اس کے بعد جاؤں وہ کہے کہ صاحب! مجھے تو پتہ ہی نہیں ہے' کیا کر رہے تھے' ساتھ کے ساتھ رپورٹ بھیجنی چاہیے تھی۔ کہا ہے کہ وَ هُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْد (34:47) وہ ہر بات پہ شاہد ہے' نگران ہے' گواہ ہے' دیکھتا ہے' جانتا ہے' اس لیے اس طرح سے میں بے فکر ہوں' تم سے کچھ نہیں مانگتا۔ کیا باتیں ہو رہی ہیں!

حق و باطل کی جنگ ہر آن جاری وساری ہے اور آخر کار فتح حق کی ہی ہوتی ہے

عزیزانِ من! باقی رہی یہ کشمکش جو ہو رہی ہے' تم مخالفت کر رہے ہو' میں اس کے حق میں یہ کچھ کہتا چلا جا رہا ہوں' یہ کشمکش کوئی نئی بات نہیں' اُس نے یہ نظامِ فطرت اس قسم کا بنایا ہے کہ تخریبی اور تعمیری قوتیں ہمیشہ برسرِ پیکار رہتی ہیں' ایک دوسرے کے خلاف جنگ لڑتی ہیں' ہم نے نظامِ فطرت ہی ایسا بنایا ہے۔ اس میں جو حقیقت پر مبنی شے ہوتی ہے' وہ غالب آ جاتی ہے۔ بات یہ بھی بڑی لمبی ہے جو میں عرض کروں کہ فطرت کا نظام ہی اس طرح سے چلتا ہے۔ میرے سامنے ڈاکٹر صاحب [1] بیٹھے ہیں' وہ زیادہ بہتر جانتے ہیں' کہ انسان کی زندگی میں تو بہر حال' ہر سانس میں Metabolism [2] اور Catabolism [3] کا ایک عمل جاری ہے۔ آپ کے اور میرے جسم کے اندر کروڑوں کی تعداد میں وہ سیلز (خلیے) ہیں' جو اندر تخریب پیدا کر رہے ہیں' جو بیماری اور موت کی طرف' لیے چلے جا رہے ہیں اور اس کے بعد کروڑوں کی تعداد کے اندر ہم ایسے سیلز (خلیے) پیدا کرتے جا رہے ہیں جو ان سے لڑتے ہیں' ان کو تباہ کرتے ہیں' ان پہ غالب آتے ہیں۔ جب یہ سیل (خلیے) ان کے اوپر غالب آتے ہیں تو یہ صحت ہوتی ہے یہ زندگی ہوتی ہے' اگر یہ مغلوب ہو جائیں' وہ غالب آ جائیں تو وہ بیماری ہوتی ہے اور اگر وہ غالب ہی آتے چلے جائیں تو ایک دن موت واقع ہو جاتی ہے۔

یہ حق اور باطل کی کشمکش کا سلسلہ زندگی کے ہر گوشے میں جاری وساری ہے۔ نظاموں میں بھی یہی بات ہے' باطل کا نظام کچھ وقت کے لیے نظر آتا ہے کہ صاحب! یہ تو قائم ہے' مستحکم ہے' چلا جا رہا ہے' اجڑتا نہیں' بدلتا نہیں۔ کہا ہے کہ وہ اس لیے ہے کہ فوری گرفت نہیں ہوتی' میزان ہے' وزن ہوتا ہے' جس کا وزن زیادہ ہوتا ہے' وہ غالب آتا ہے' حق کے نظام کا ابھی وزن زیادہ نہیں ہوا جو

---

[1] یہ اشارہ ڈاکٹر سید عبدالودود مرحوم (1908-2001) کی طرف ہے۔

[2] Metabolism: زندہ عضویہ اور خلیوں (سلز) میں وہ مجموعی کیمیائی تبدیلی' جس کے ذریعے خوراک زندہ مادۂ اولیٰ یا نخز مایہ میں تبدیل ہو جاتی ہے اور پھر جس کے ذریعے نخز مایہ یا زندہ مادۂ اولیٰ استعمال ہوتا ہے اور ٹوٹ کر توانائی مہیا کرتے ہوئے' سادہ تر مرکبات اور فضلے کی صورت اختیار کرتا ہے۔

[3] Catabolism: اجسام میں زیادہ پیچیدہ خلیوں (سلز) کا سادہ تر ذروں میں ٹوٹنا اور اس ٹوٹ پھوٹ سے توانائی کا اخراج۔

تم نے شروع کیا ہے' ذرا آگے بڑھنے دیجیے اور اس کے بعد دیکھیے۔ اس لیے کہا ہے کہ **قُـلْ اِنَّ رَبِّـىْ يَقْـذِفُ بِـالْـحَـقِّ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ** (34:48) ان سے کہہ دو کہ میرے پروردگار کا نظام ایسا ہے کہ اس میں حق اور باطل کا باہمی ٹکراؤ ہوتا رہتا ہے' جس میں حق' باطل کا سر توڑ کر' فاتح و منصور آگے بڑھ جاتا ہے ❶۔ اس لیے کہ خدا خوب جانتا ہے کہ حق میں کس قدر پناہ قوتیں پوشیدہ ہیں۔ اب یہاں **يقذف** کا لفظ آیا ہے۔ **يقذف** کے معنی ہوتا ہے کسی چیز کے اوپر پتھر مارنا جیسے اس کو توڑنے کے لیے ہتھوڑا مارتے ہیں۔ اس کو قذف کہتے ہیں۔ اس کا نظام یہ ہے کہ وہ باطل کے سر کے اوپر حق کی چوٹیں لگاتا چلا جاتا ہے اور حق میں ہی صلاحیت ہے کہ وہ باقی رہے۔ اس کے متعلق بہت سی آیات قرآن میں آئی ہیں۔ کہا ہے کہ **بَـلْ نَـقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ** (21:18) اس کا نظام یہ ہے کہ وہ تعمیری قوتوں کو تخریبی قوتوں کے اوپر ٹکراتا ہوا' مارتا ہوا' چلا جاتا ہے۔ **فَيَـدْمَغُـهٗ** (21:18) تا آنکہ وہ حق، باطل کا بھیجہ نکال کر رکھ دیتا ہے۔ **فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ** (21:18) وہ دیکھو! وہ باطل بھاگا ہوا جارہا ہے۔ کیا انداز ہے کہنے کا! **فَيَدْمَغُهٗ** (21:18) باطل کا بھیجہ توڑ کر رکھ دیتا ہے۔ اس لیے کہا کہ **قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَ مَا يُعِيْدُ** (34:49) ان سے کہہ دو کہ میں جو کچھ تمہیں دے رہا ہوں' وہ الحق ہے' علم و بصیرت پر مبنی ہے' فکر و شعور کی رو سے پیش کرتا ہوں' سوچ سمجھ کر قبول کرنے کی تاکید کرتا ہوں' ہر معاملے کو آن میرٹ پرکھنے کے لیے تائید کرتا ہوں۔ یہ چیز جو پیش کر رہا ہوں وہ الحق ہے' اس کے لیے تھوڑا سا وقت چاہیے تا آنکہ وہ باطل کا نظام جو پہلے سے چھایا ہوا چلا آ رہا تھا' زمیں گیر ہو گیا تھا' مستحکم ہو گیا تھا' اس کو جڑوں سے نکالنے کے لیے وقت کی ضرورت ہے' تھوڑے ہی عرصے کے بعد تم دیکھنا الحق چھا جائے گا۔ اور جب یہ آجاتا ہے تو **وَمَـا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَ مَا يُعِيْدُ** (34:49) باطل نے جس طرح سے شروع کیا تھا' دوبارہ اس کی موجودگی میں وہ شروع بھی نہیں کر سکتا' جو کچھ اس نے کیا تھا اس کو دوبارہ کوئی Repeat (دہرا) بھی نہیں کر سکتا جب یہ آجاتا ہے۔ طلوعِ آفتاب کے بعد رات کی تاریکی کا کوئی شائبہ باقی نہیں رہتا۔ حق میں تو بڑی قوت ہوتی ہے۔

رات کی تاریکی سورج کے نکلنے تک ہی ہوتی ہے' ضرورت تو صرف چراغ روشن کرنے کی ہے

عزیزانِ من! الحق ہونا چاہیے۔ پورا کمرہ گھٹا ٹوپ اندھیر ہوتا ہے' اسے دور کرنے کے لیے اتنی سی دیا سلائی کی بتی ہوتی ہے' ذرا سا اس کو ماچس پہ رگڑیئے اور اس کے بعد جب اس میں چمک پیدا ہوتی ہے تو سارے کمرے سے **زَهَـقَ الْبَـاطِـلُ** اندھیرا دُم دبا کر بھاگ جاتا ہے۔ اور جب تک اس بتی کی' اس ماچس کی' روشنی کی' وہ کرن موجود ہوتی ہے اس وقت تک وہ دوبارہ نہیں آتا۔ باطل میں

---

❶ (21:18)

یہ قوت نہیں ہوتی کہ وہ دوبارہ آجائے' حق کے نہ رہنے کا نام باطل ہوتا ہے' روشنی کے نہ ہونے کا نام تاریکی ہوتا ہے' تاریکی بذاتِ خود اپنا وجود نہیں رکھتی' وجود تو روشنی کا ہوتا ہے' روشنی کے نہ ہونے کا نام تاریکی ہوتا ہے۔ ہم گھبرا جاتے ہیں کہ صاحب! باطل کا نظام چاروں طرف سے محیط ہے۔ پچھلا درس تھا کہ جہنم چاروں طرف سے محیط ہے کہ ہم نکل نہیں سکتے' ہم گھبرا جاتے ہیں' اس میں مایوس ہوجاتے ہیں۔ یہ بجائے خویش اپنی اتنی قوت نہیں رکھتا' یہ اس لیے ہے کہ حق کا جو نظام ہے' وہ آیا نہیں ہے۔ کہا ہے کہ وَ قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (17:81) اس سے کہو کہ روشنی آئی' تاریکی گئی' اصل یہ ہے کہ جو تاریکی تھی وہ تو اس وقت تک ہی تھی جب تک حق نہیں آیا تھا' تاریکی تو بنی ہی جانے کے لیے تھی۔ ذرا سی حرکت پیدا ہوجائے۔

جرس ہوں' نالہ خوابیدہ ہے میرے ہر رگ و پے میں
یہ خاموشی مری وقتِ رحیلِ کارواں تک ہے

[اقبالؒ: بانگِ درا]

خاموشی آواز کے نہ ہونے کا نام ہے

اونٹوں کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیاں خاموش ہوتی ہیں کیونکہ اونٹ بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں' کارواں سویا ہوا ہوتا ہے' اٹھ کر کارواں کو چلنے دیجیے' یہ گھنٹیاں خود بجنی شروع ہوجائیں گی۔ بڑے حسین انداز میں یہ بات کرتا ہے۔ کہا ہے کہ وَ قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (17:81)۔ خاموشی کا وجود نہیں ہوتا' وہ تو آواز اور فغاں کے نہ ہونے کی وجہ سے خاموشی ہوتی ہے Untruth اپنا وجود نہیں رکھتا' وہ صرف Untruth کہلاتا ہے' Truth آجائے تو اس میں سے Un نکل جاتا ہے۔ اسی لیے یہاں کہا ہے کہ قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَ مَا يُعِيْدُ (34:49)۔

عزیزانِ من! وقت ہوگیا ہے اور اگلی آیت پھر ایک عظیم آیت آرہی ہے' میں نے کہا تھا کہ قرآنِ کریم ویسے تو سارا ہی قرآن ہے لیکن ہر سورۃ کے آخر کی جو چند آیتیں آتی ہیں' ان میں قرآن اس سورۃ کا سارا ملخص بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ اس میں دین کی ایسی بنیادی حقیقتیں ہیں' جو اس کے پیغام کو پہنچانے والے کی بیان کی ہیں۔ کیا بات ہے صاحب! دو تو یہاں آگئی ہیں: فکر و تدبر اور غور و شعور کی بنیاد کے اوپر دین کا نظام متشکل کرنا اور اپنے لیے اس کا کوئی معاوضہ نہ طلب کرنا' کوئی صلہ نہ لینا' یہ سب کچھ خدا کے لیے کرنا۔ یہ دو چیزیں آگئیں۔ آگے ایک تیسری چیز آتی ہے' اُسے ہم آئندہ لیں گے۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ سبا کی آیت 49 تک آگئے' 50 ویں آیت سے آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

آٹھواں باب: سورۃ سبا (آیات 50 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من ! آج اپریل 1980ء کی 18 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ سبا کی آیت 50 سے ہو رہا ہے: (34:50)۔

آپ کو یاد ہوگا، میں اکثر یہ بتایا کرتا ہوں، قرآنِ کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ ہر سورۃ کے آخر میں دو چار آیتوں میں، نہ صرف اس سورۃ کی تعلیم کا ملخص پیش کرتا ہے، بلکہ دین کے بنیادی اساسات کا بھی ذکر کر دیتا ہے یعنی مختصر مرتکز انداز میں وہ اس کو دہراتا چلا جاتا ہے اور پھر آگے بڑھتا ہے، اس طرح سے اس میں تسلسل بھی قائم رہتا ہے۔ یاد رکھیے! قرآنِ کریم الحمد سے والناس تک ایک مربوط کتاب ہے، الگ الگ جوڑے ہوئے ٹکڑے نہیں ہیں۔ ہم سبا کی آخری آیتوں میں پہنچے ہوئے ہیں۔

قرآنِ حکیم نظامِ زندگی کی ایک مکمل شکلِ دین پیش کرتا ہے، یہ چند ایک رسمی عقائد کا مجموعہ نہیں ہے

عام طور پر یہ چیز رہتی ہے کہ اسلام مذاہبِ عالم میں سب سے افضل، سب سے بہتر مذہب ہے۔ لاریب، اس میں کوئی شبہ نہیں، مگر بنیادی غلطی یہ ہے کہ مذاہب کی دنیا سے اس کا تقابل کیا جاتا ہے یعنی اس کو مذہب تصور کر کے دوسرے مذاہب سے اس کا تقابل کیا جاتا ہے۔ Comparitive Study of Religions (مذاہب کا تقابلی مطالعہ) ہمارے ہاں ایک خاص Subject (مضمون) سمجھا جاتا ہے حالانکہ یہ مذہب ہے ہی نہیں۔ لہٰذا جو مذہب نہیں ہے، اُسے مذہب کے مقابلے میں لا کر ان مذاہب سے بہتر ثابت بھی کر دیا جائے تو یہ تو بات بنیادی طور پہ نہیں، جو بنیادی طور پہ مذہب ہے ہی نہیں، مذاہب سے اس کا تقابل کیا۔ یہ تو دین

ہے، یہ تو نظامِ زندگی ہے۔

قرآنی نظامِ حیات میں اور دیگر مذاہبِ عالم میں ایک بنیادی فرق

بہر حال جس انداز سے یہ تقابل کیا جاتا ہے اور اس کو افضل ثابت کیا جاتا ہے، اس میں آپ دیکھیں گے، کہ یہ تو صرف ایک انداز کا ہی فرق ہے، اب تو خیر مناظروں کا، مباحثوں کا، وہ دور نہیں رہا، ورنہ اس کے اندر عام اخلاقیات کی جو چیزیں ہیں، جنہیں Universal Ethics کہتے ہیں کہ جھوٹ نہ بولو، چوری نہ کرو، کسی کو ستاؤ نہیں، دغا نہ دو، عام طور پر بیان ہوا کرتی تھیں۔ یہ تو Universal Ethics (عالمگیر ضابطۂ اخلاقیات) ہیں۔ دنیا میں جو خدا کو نہیں مانتے، وہ بھی یہ نہیں کہتے کہ جھوٹ بولنا اچھا ہے اور چوری کرنا اچھا ہے۔ بلا تمیزِ مذہب اور ملت اور ملک اور نسب اور قوم، دنیا میں عام طور پہ اخلاقیات کا ایک تصور پایا جاتا ہے۔ اسے Universal Ethics کہتے ہیں۔ اگر ہم اسلام کی یہی چیز ثابت کرتے ہیں، تو یہ تو کوئی خصوصیت نہ ہوئی۔ باقی جو چیزیں ہیں کہ عبادات کا انداز یہ ہے، اس قسم کی وہ چیزیں آتی ہیں، اس میں بھی وہ لوگ مقابل میں کہتے تھے کہ یہ تو انداز کا ہی فرق ہے۔ ان تین آیتوں میں قرآن نے بنیادی طور پہ فرق بتایا ہے۔

عزیزانِ من! یاد رکھیے! اسلام کے متعلق گفتگو کرنا ہو تو قرآن کی رو سے پہلی چیز یہ ہے کہ خدا کا جو تصور اس نے پیش کیا ہے، وہ ہے، اس کے لیے امتیازی چیز۔ مذاہب کی دنیا میں کسی مذہب میں خدا کا وہ تصور نہیں پایا جاتا جو قرآن نے دیا ہے اور ہمیں تو معلوم ہی نہیں، ہم کبھی نہ خدا پہ ایمان لائے، نہ ہمیں معلوم ہے کہ اس کا تصور کیا ہے، زندگی میں اس کی اہمیت کیا ہے۔ غالباً وہ جان لاک (1632-1704) تھا، جس نے یہ کہا تھا کہ ''تم مجھے یہ بتا دو کہ فلاں قوم نے اپنی اس پرستش کے لیے، اس قسم کا معبود تجویز کر رکھا ہے، میں اس قوم کی پوری تہذیب، تمدن، اخلاق، زندگی کی معاشرت و معیشت سب کچھ آپ کو بتا دونگا''۔ معبود کے تصور کو اتنی اہمیت حاصل ہے۔ خدا کا تصور جو قرآن نے پیش کیا ہے، وہ بے مثل و بے نظیر ہے اور خدا کے بعد پھر اس نے رسول کا جو تصور دیا ہے، وہ بے مثل و بے نظیر ہے۔ یہ ہیں بنیادی عقائد، یہ ہیں وہ چیزیں جو اس کو باقی مذاہب سے ممتاز کرتی ہیں۔ آپ مذاہب کہیے جو باقی دنیا اس کو کہہ رہی ہے، باقی ادیان سے کہیے کہ یہ دین ہے۔ یہ جس کو آپ ازم کہتے ہیں، یہ ہے اصل چیز۔ اس کی مابہ الامتیاز چیز تو خدا کا وہ تصور ہے، جو اس وقت ہمارے زیرِ نظر نہیں رہا۔ رسول کا تصور دین کی وہ امتیازی خصوصیات ہیں جو آپ کو کہیں اور نہیں مل سکتیں۔ یہ تین آیتیں ہیں جن میں یہ بات آئی۔

پہلی چیز تو یہ تَتَفَكَّرُوا (34:46) تھی۔ آپ کو یاد ہے میں نے پورا ایک درس [1] اس کے اوپر لیا تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا

---

[1] اس کے لیے دیکھیے اسی کتاب کا ساتواں باب۔

تھا کہ میں تم سے کوئی لمبی چوڑی بحث نہیں کرنا چاہتا' کوئی وعظ نہیں کہنا چاہتا' کوئی درس نہیں دینا چاہتا' میں تمھیں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ پھر کہا کہ وہ بات ایسی نہیں کہ تم چلتے پھرتے سن لو' کھڑے ہو جاؤ' خدا کے لیے کھڑے ہو جاؤ' سارے کھڑے نہ ہو جاؤ تو ایک ایک دو دو کر کے کھڑے ہو جاؤ' کھڑے ہو کر میری بات سن لو۔ اس کا انداز اس قدر سائیکولوجیکل (نفسیاتی) ہے کہ وہ پہلے ہی آدھی توجہ تو یونہی اپنی طرف مبذول کر لیتا ہے کہ بابا! صرف ایک بات کہتا ہے اور کہتا ہے کہ ذرا کھڑے ہو کر سن لو تو سن لو' حرج کیا ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ اس اہتمام کے بعد' ان کی توجہات کو مرکوز کرنے کے بعد' ایک بات کیا کہی تھی۔ مذہب کی اسٹیج سے رسول کہہ رہا ہے' ایک بات کہتا ہے کہ تَتَفَكَّرُوْا (34:46) سوچا کرو' جاؤ۔

مذہب کی دنیا میں کیا کہیں آپ نے یہ سنا ہے کہ سوچا کرو؟ مذہب کے اعتقادات' ایمان کی بنیادیں ہیں' جن کو کہا ہی Faith (عقیدہ) جاتا ہے' Faith (عقیدہ) کے معنی ہیں وہ چیز جس میں عقل کو دخل نہ ہو' جس میں Reason (عقل وفکر) نہ آئے جسے بغیر Reason (عقل وفکر) مانا جائے۔ اس کا ترجمہ ہی Faith (عقیدہ) کر دیا ہے' ان مذہب والوں نے تو کرنا تھا' ہمارے ہاں والوں نے بھی ایمان کا ترجمہ Faith (عقیدہ) کر دیا۔ تَتَفَكَّرُوْا ایک لفظ ہے۔ کہا ہے کہ میں صرف ایک بات تم سے کہنا چاہتا ہوں' وہ فقرہ بھی نہیں ہے۔ عزیزانِ من! کیا بات ہے! کہیے اہلِ مذاہب سے ساری دنیا کو چیلنج دیجیے کہ مذہب کی اسٹیج پہ کوئی شخص آج تک دنیا میں جتنے مذاہب موجود ہیں' یہ نہیں کہہ سکا۔ دین تھا خدا کی طرف سے لائے ہوئے جو رسول تھے' انہوں نے پیش کیا۔ ان سب نے تو یہ ایک ہی بات کہی ہوگی۔ وہ ادیان جو رسول لائے تھے' وہ محرف شکل میں دنیا میں' مذاہب کی شکل میں ہے۔ دنیا کے مذاہب میں کسی سے یہ کہیے' اپنے ہاں سے یہ بات بتائے' وہ کہے کہ بس میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں کہ سوچا کرو' غور وفکر کیا کرو ورنہ مذہب کی دنیا میں غور وفکر' علم وبصیرت تو بیر بتایا جاتا ہے' شریعت میں عقل کا دخل ہی نہیں بتایا جاتا۔ کہتا ہے کہ ایک بات کہتا ہوں۔ تو آپ نے غور فرمایا' مابہ الامتیاز کیا چیز آ رہی ہے۔ یہ ہیں وہ مقامات جہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ مذہب کی دنیا میں اگر تم پوچھتے تو بتائیے کہ دنیا کا کوئی مذہب' کوئی کتاب' جو آج تم پیش کر رہے ہو' ایسی ہے جس میں یہ بات کہی گئی ہو کہ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (12:108) میں جو تمھیں خدا کی طرف دعوت دیتا ہوں' علی وجہ البصیرت دعوت دیتا ہوں' Reason (عقل وفکر) سے دعوت دیتا ہوں' Rationally (حکمت سے) دعوت دیتا ہوں' علم وبصیرت کی بنا پہ دعوت دیتا ہوں' غور وفکر کی بنا پہ تمھیں دعوت دیتا ہوں۔

آخرت کے تصور کو سمجھانے کے لیے قرآنِ حکیم نے تمثیلی انداز اختیار کیا ہے

اتنا ہی نہیں ہے' میں نے عرض کیا ہے کہ آخرت کے معاملات تو بہرحال Metaphysics (مابعد الطبیعات) سے متعلق

ہوتے ہیں۔ عام طور پہ اس میں بتایا جاتا ہے کہ اس میں یہ عام Reason (عقل وفکر) نہیں چلتا۔ ٹھیک ہے آخرت کی زندگی کی کنہ وحقیقت کیا ہوگی' یہ تو ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پہ نہیں سمجھ سکتے لیکن اس میں قرآن کہتا ہے کہ تمثیلی انداز سے جو کچھ ہم نے کہا ہے' اگر تم اس پر غور وفکر کرو تو اس سے بھی بات سمجھ میں آجائے گی۔ اندازہ لگایئے قرآن کہتا ہے کہ **لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ - فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ**(2:219.220) غور وفکر کرو دنیاوی معاملات میں ہی نہیں' آخرت میں بھی۔ ایک امتیازی چیز یہ ہے۔

مذہب میں فرقوں کی بنیاد سراسر مذہبی پیشوائیت کی روٹی کے معاملے پر ہی استوار ہوتی ہے

دنیا کے ہر مذہب کی اگلی امتیازی چیز یہ ہے کہ وہ پروفیشن ہے۔ دنیا کے سارے اہلِ مذاہب یہی ہیں۔ یہ جتنے بھی مذہبی طبقے والے لوگ ہیں' یہ سب کار پردازانِ مذہب ہوتے ہیں' جن کو مذہبی پیشوائیت کہا جاتا ہے۔ وہ کلیسا کے ہوں' وہ مندر کے ہوں' وہ گردوارے کے ہوں وہ معبد کے ہوں' وہ ٹمپل کے ہوں' وہ بدھ مت کے ہوں' جین مت کے ہوں' ہندو دھرم کے ہوں' کسی کے بھی ہوں' جو مذہبی پیشوائیت ہے ان کا کمائی کا ذریعہ مذہب ہوتا ہے اور پھر کمائی بھی اتنی ہوتی ہے کہ یورپ میں یہ جو بادشاہ تھے' وہ چرچ کے مقروض ہوتے تھے۔ مذہب کو ہمیشہ ان لوگوں نے ذریعۂ معاش بنا کر رکھا اور یہیں سے ساری خرابیاں پیدا ہوئیں۔ یہ معاشی حساب سے ایک دوسرے سے بڑھنا ہے۔ یہ جو فرقے آپ کے ہاں بنے ہوئے ہیں' ان میں ایک دوسرے کے ساتھ جنگ ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ کوئی دین یا مذہب یا شریعت کی بنا پہ نہیں ہوتی۔ یہ روٹی کا مسئلہ ہوتا ہے۔ دوسری چیز یہ کہی کہ **قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ** (34:47) میں اس کے لیے تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ یہ کہہ کر الگ کر کے دکھا دیا اور یوں مذہب کی دنیا سے الگ ہٹ کر کھڑے ہوگئے۔ جو کچھ رسول کہہ رہا ہے' جو کوئی اس دین کے پیرو ہیں' اس رسول کی سنت کا اتباع کرنے والے ہیں' وہ کہتے ہیں' یہی چیز ان کو کہنی چاہیے کہ ''میں تم سے اس کا کوئی معاوضہ نہیں لے رہا''۔ یہ دوسری چیز کتنی بنیادی چیز ہے۔ اب تیسری چیز پہ آجایئے۔ آج کے درس میں یہ تیسری بنیادی چیز ہمارے سامنے آتی ہے۔

دین کا بانی صرف خدا کی ذات ہوتی ہے' کوئی رسول بھی نہیں ہوتا

کہا ہے کہ **قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰى نَفْسِيْ وَ اِنِ اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوْحِيْٓ اِلَيَّ رَبِّيْ ط اِنَّهٗ سَمِيْعٌ قَرِيْبٌ** (34:50)۔ عجیب بات ہے! تمام اہلِ مذاہب اپنے اپنے رسولوں کو مذہب کا بانی کہتے ہیں۔ یاد رکھیے! قرآن کی رو سے دین کا بانی رسول نہیں ہوتا' دین تو خدا کی طرف سے ملتا ہے' وہ رسول دین کو پہنچانے والا ہوتا ہے' بانی اور ہوتا ہے' یہ رسول Founder نہیں ہوتا۔ آپ نے دیکھا کہ ایک ایک لفظ میں کہاں فرق جا پڑتا ہے۔ بانیانِ مذاہب کا تصور دنیا میں عام چلا آتا ہے

مثلاً فلاں مذہب کا بانی یہ تھا' فلاں مذہب کا بانی یہ تھا۔ اور نبی اکرم ﷺ کو بھی بانی کہہ دیتے ہیں۔ وہ تو رسول ہے' دین تو خدا کا ہوتا ہے۔ دینِ محمدی ﷺ غلط ہے' دینِ ابراہیمیؑ بھی غلط ہے۔ دین اللہ ہے۔ یہ قرآن نے کہا ہے۔

بانیانِ مذاہب کے علاوہ بیشتر مذاہب میں خدا کا تصور

جن کو بھی وہ بانیانِ مذاہب کہتے ہیں' ان میں ہر ایک فوق البشر (Super Human Being) ہوتا ہے' عام انسانوں سے اونچا ہوتا ہے' اس کا تدبر ہی ایسا ہوتا ہے جو انسانوں سے فوق ہوتا ہے۔ بیشتر مذاہب میں تو وہی خدا ہوتا ہے' ہندوؤں کے ہاں جتنے بھی یہ ان کے ہاں کے بانی مذاہب ہیں' اوتار ہیں' وہ خود خدا ہی ہیں۔ بدھ مت' جین مت' خدا کو تو مانتے نہیں ہیں لیکن اپنے ہاں کے بت اور جین جوان کے ہاں مذہب کے بانی ہیں' ان کی پرستش کرتے ہیں۔ اسی طرح سے ان کی کیفیت ہے۔ ان کے تصور کے مطابق حضرتِ عیسیٰؑ ابن اللہ بھی ہیں آسمان پہ بیٹھے ہوئے بھی ہیں' اس کے اندر باپ بیٹا روح القدس ہیں' وہ جو تین اجزا ہیں' ان میں سے ایک جز وخود بھی ہیں' ابن اللہ بھی ہیں' خود خدا بھی ہیں' ان کی بھی یہ کیفیت ہے۔ مجوسیوں کے ہاں مذہب کے لیے زرتشت لے لیجیے یا ان کے ہاں کا جو متھرا ہے' اس کو لے لیجیے۔ اس میں الوہیت کی ساری شان پائی جاتی ہے۔ یہ جتنے بھی' جن کو بانیانِ مذاہب کہتے ہیں' یا قرآن جن کو رسول کہتا ہے' ان کے متعلق سارے مذاہب کے اندر یہ ایک متفقہ علیہ تصور ہے کہ وہ فوق البشر ہوتے ہیں' عام انسانوں جیسے انسان نہیں ہوتے' ان کی شان الوہیت کی ہوتی ہے۔

قرآنِ حکیم کی تعلیم کے برعکس مذہب کی دنیا میں رسول فوق البشر متصور ہوتا ہے

اسلام ہے ایک دین' اس کا لانے والا ہے رسول۔ آپ پورے قرآنِ کریم میں دیکھیے' شروع سے اخیر تک اعلان کیے چلا جا رہا ہے کہ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (18:110) خدا رسول سے کہتا ہے کہ اعلان کر دو۔ خدا کہلوانے والا ہے اور رسول اعلان کرنے والا ہے۔ عربی زبان جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ ''انما'' کیا بات ہے! کہا ہے کہ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (18:110) میں بھی تمہارے ہی جیسا ایک بشر ہوں۔ بَشَرٌ ہی صرف نہیں کہا' مِّثْلُكُمْ بھی کہا ہے۔ اے رسول! ان سے کہہ دو کہ میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں' فرق یہ ہے کہ يُوْحٰٓى اِلَيَّ (18:110) میری طرف خدا یہ وحی بھیجتا ہے یا اس نے وحی بھیجی ہے کہ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (18:110) اس کائنات میں صاحبِ اقتدار' تمہارے لیے حاکم' صرف ایک خدا کی ذات ہے' کوئی اور نہیں ہے۔ مجھ پر خدا کی طرف سے وحی ہوتی ہے۔ یہ ہے فرق۔ اس کے بعد اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (18:110) میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں۔

وحی کی ماہیت اور پھر رسول کا فریضہ

وحی ایک ایسی چیز ہے جس کے متعلق یہ کہدیا ہے کہ اس میں میری فکر کا' میرے کسب و ہنر کا' کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ Objectively (خارجی طور پر) خدا کی طرف سے مجھے ایک علم ملتا ہے اور حکم دیا جاتا ہے کہ اسے اپنی ذات تک نہ رکھو' اسے دوسروں تک پہنچاؤ۔ نبوت خدا کی طرف سے وحی کا علم ملنا ہے' رسالت اُس علم کا' اس وحی کا' دوسرے انسانوں تک پہنچانا ہے۔ کہا ہے کہ جب مجھے وہ وحی ملتی ہے اس میں تو میری فکر کا' عقل کا' علم کا' بصیرت کا' میرا کوئی دخل نہیں ہوتا: مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى (53:3) اس میں میرے خیالات کا دخل نہیں ہوتا' میری خواہشات کا دخل نہیں ہوتا' وہ تو ایک آواز پیچھے سے آرہی ہے' بلا تمثیل عرض کرونگا جیسے ریڈیو سیٹ میں سے ہم آواز لیتے ہیں تو اس سیٹ کا اس میں کچھ نہیں ہوتا' وہ ایک آواز آتی ہے' یہ اس آواز کا آگے پہنچانے کا ذریعہ ہے' اس میں رسول کے اپنے خیالات' آرزوئیں' فکر' علم' کسب و ہنر کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ باقی انسانی علم کے مقابلے میں یہ وحی کی ایک خصوصیت ہے۔ جتنے اور انسانی علوم ہیں' ان میں انسان کی اپنی فکر تدبر تفکر مطالعہ مشاہدہ کا خود دخل ہوتا ہے لیکن وحی ایک ایسی چیز تھی' تھی اس لیے کہ اب تو اس کا سلسلہ ہی بند ہو چکا ہوا ہے' جس میں صاحبِ وحی کے اپنے ذہن کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا' یہ تو وہاں سے ملتی تھی۔ یعنی وحی کے ملنے سے بھی رسول فوق البشر نہیں ہو جاتا کیونکہ اس میں اس کا کوئی دخل ہی نہیں ہوتا تھا۔ وہ ملتی تھی' اب اُس ملنے کے بعد کہا ہے کہ میں نے تم تک یہ پہنچا دی تو تم اور میں دونوں ایک جیسے ہو گئے یعنی اتنی سی بات کہ مجھے پہلے ملی تھی اس سے تو کوئی فرق نہیں پڑتا' میں نے پہنچا دی۔ رسول کہتا ہے کہ جس طرح سے تم اس وحی کا اتباع کرتے ہو' مجھے بھی یہ حکم ہے کہ میں بھی اسی کا اتباع کرتا ہوں: وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (6:163) میں سب سے پہلے اسلام لاتا ہوں تو سب سے پہلا مسلمان خود نبی ہے' اس وحی کا اتباع کرنے والا جیسے تم کرتے ہو۔

خدا کا تصور آپؐ کی بعثت سے پہلے بھی موجود تھا

اب آپ دیکھیے کہ یہ چیز آپ کو دنیا میں کہیں اور نہیں ملے گی۔ اس کے مقام اور خصوصیت کا بتایا ہے جس کی شہادت ہم ہمیشہ دیتے ہیں۔ کہا ہے کہ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ. لازم قرار دیدیا کہ کہو عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ خدا کا بندہ ہے یعنی اس میں کہیں الوہیت کا شائبہ تک نہ آنے پائے۔ اعتراف کرایا' کہا کہ شہادت دو' ببانگِ دہل اس کو پکارو کہ یہ رسول عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ ہے' خدا کا بندہ ہے' صرف اس کا قاصد ہے' پیغام رسان ہے' اسی پیغام کی وہ خود اطاعت کرتا ہے' اس پہ وہ اسی طرح ایمان لاتے ہیں' جیسے دوسرے لاتے ہیں۔ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ کہتا ہے' سب سے پہلے میں ایمان لاتا ہوں۔ جتنے احکام باقی مسلمانوں کے اوپر خدا کی

طرف سے فرض قرار دیئے گئے ہیں' وہ سارے کے سارے اسی طرح رسول کے اوپر فرض ہیں۔ یہ بات تھی۔ اب رسول اللہ ﷺ کے جو اس زمانے کے اولیں مخاطب تھے' بہرحال اہلِ مذہب تھے' وہ یہودی تھے' نصرانی تھے' ایران کے مجوسی تھے' عرب خود اہلِ مذہب تو نہیں تھے لیکن یہ بھی اللہ کو مانتے تھے یعنی اسلام سے پہلے ان کے نام دیکھیے' نبی اکرم ﷺ کے والد کا نام عبداللہ تھا' یہ اللہ کو مانتے تھے' یہ جو اس قسم کے اعتقادات ہیں ان کے ہاں بھی تھے' ان کے ہاں بھی تصور یہی تھا اور یہ یہودی نصرانی وغیرہ بھی یہی کہتے ہیں۔

دورِ جہالت میں اہلِ عرب کے نزدیک رسول کی ذات کے متعلق پایا جانے والا تصور

یہ عام انسان نہیں تھے کیونکہ انہوں نے یہی تصور دے رکھا ہے کہ عام انسان نہیں تھے' انسانوں سے اونچے تھے۔ اب یہ جو نبی اکرم ﷺ آئے' انہوں نے کہا کہ میں خدا کا رسول ہوں۔ سنیے کیا چیز ان کے نزدیک تعجب انگیز تھی! کہا کہ **وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِى الْاَسْوَاقِ** (25:7) کہتے ہیں او! یہ خدا کا کس قسم کا رسول ہے' یہ بازاروں میں چلتا پھرتا ہے' سودا سلف لیتا ہے' عام لوگوں کی طرح کھاتا پیتا ہے' یہ رسول کس طرح ہوسکتا ہے یعنی بازاروں میں چلتا پھرتا ہے' سودا سلف لیتا ہے۔ ان کے تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ ایک رسول بازاروں میں چلتا پھرتا ہے' سودا سلف لیتا ہے' کاروبار کرتا ہے' کھاتا پیتا ہے۔ یہ تصور میں نہیں آسکتا تھا۔ وہ تو رسول تھے ان کے متعلق یہ کہا۔

علامہؒ پرویز کی زندگی کے کچھ حقائق ان کی اپنی زبانی

آپ معاف کریں تو میں اپنا ایک واقعہ بتادوں کہ یہ تصور کہاں تک چلا گیا' خود میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ پھر ہم اسے کہاں تک لے آئے ہوئے ہیں۔ یہ لکھنے لکھانے کا' مضامین نویسی کا' شغف میرے ہاں رہا۔ افسانے لکھا کرتا تھا' ادبی مضامین لکھا کرتا تھا' لباس تراش کا انداز میرا ہمیشہ یہی رہا ہے جو آپ کے سامنے ہے: ایک کرتہ' ایک پاجامہ' اسی طرح سے عام طور پہ میں چلتا پھرتا ہوں۔ یہ زیادہ بندشیں نہیں تھیں' وہاں البتہ جہاں وہ سرکاری طور پہ بندش ہوتی تھی' وہاں تو یہ انتظام کرنا پڑتا تھا۔ بہت پہلے کی بات ہے کہ مذہب کے اوپر میرا ایک مضمون' اس زمانے میں معارف کا پرچہ بہت شہرت کا پرچہ تھا' اس میں شائع ہوا تھا تو میں حسبِ معمول دلی میں چاندنی چوک میں تھا' میرے ساتھ برادرِ کرام تھے۔ ہم دونوں اکٹھے ہوتے تھے۔ ایک صاحب' اب وہ مرحوم ہو چکے ہیں' اس مضمون کے متن (Contents) کو تفصیل سے جاننے والے تھے اور ملنے والے بھی تھے' وہ میرے پاس آئے۔ کہنے لگے: معاف رکھیے' ذرا ادھر آیئے گا' مجھے آپ سے ایک بات کہنی ہے۔ میں نے کہا: فرمایئے۔ الگ جا کر آہستہ سے کہا کہ اب آپ اس طرح سے بازار میں نہ نکلا کریں۔ میرے ذہن میں ہی نہ آیا کہ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ جی! کس طرح سے؟ کہنے لگے کہ بغیر

اچکن کے اور اس طرح سے خالی کرتے ہیں اور قمیض میں۔ میں نے کہا: اچھا جی یہ جو آپ نے فرمایا' اب نہ نکلا کریں تو کوکیا کوئی آرڈیننس ہوا ہے' کیا ہوگیا ہے؟ کہنے لگے کہ نہیں' دیکھیے! اس سے پہلے آپ ادبی دنیا کے اندر تھے' اب آپ کا وہ جو مضمون شائع ہوا ہے' آپ مذہب کی دنیا میں آگئے ہیں' آپ کرتے پاجامے کے ساتھ باہر نہ نکلا کریں' اچکن کے ساتھ آیا کریں۔ کیفیت تو یہ ہے کہ مذہب کا مضمون لکھا گیا تو انہوں نے فرمادیا کہ اب آپ بغیر اچکن کے بازار میں نہ نکلا کریں۔

ہاں تو عزیزانِ من! کہا ہے کہ اے رسول! ان سے کہدو' انہیں یہ بات نرالی سی' تعجب انگیز سی' نظر آتی ہے اس لیے کہ انہوں نے رسولوں کے متعلق' ان رسولوں کے پیروؤں کے افسانے سنے ہوئے ہیں' حقیقت نہیں سنی۔ حقیقت یہ ہے کہ **وَمَآ اَرۡسَلۡنَا قَبۡلَکَ مِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ اِلَّآ اِنَّھُمۡ لَیَاۡکُلُوۡنَ الطَّعَامَ وَیَمۡشُوۡنَ فِی الۡاَسۡوَاقِ** (25:20) تُو ہی نہیں' اس سے پیشتر جتنے رسول ہم نے بھیجے تھے' ان کی کیفیت یہی تھی' وہ بازاروں میں اسی طرح سے چلا کرتے تھے' وہ اسی طرح سے کھایا پیا کرتے تھے۔ دین لے کر جو آتا تھا' وہ اپنے آپ کو اب دوسرے انسانوں سے متمیز خصوصیت سے کوئی خاص انداز اختیار نہیں کر لیتا تھا۔

مذہبی تصورات کے باعث حُلیہ میں تبدیلی کا نمایاں عنصر

باتیں آگے چلیں گی تو معلوم نہیں کہ کہاں تک پہنچیں گی۔ جونہی کوئی شخص مذہب میں ذرا دلچسپی لینے لگتا ہے' لباس بدل جاتا ہے' اس کا حلیہ بدل جاتا ہے' وہ دور سے نظر آجاتا ہے۔ یہ کیفیت ہے۔ ذرا آپ یونہی دیکھ لیجیے' اپنے میں سے دیکھ لیجیے' اچھا بھلا آپ کے ساتھ دفتر میں کام کرتا ہو' کچھ اچھا بھلا تھا آپ دیکھتے ہیں تو نظر آرہا ہے کہ لبیں ایسے ترشی ہوئی ہیں' نگاہیں بھی جھکی ہوئی ہیں' کیا ہوا صاحب؟ کہا کہ جی! وہ ٹھیک ہے' ساری عمر دنیا داری کا کام کیا ہے' آخری عمر میں کچھ اللہ کا بھی تو کرنا ہوگا۔ یعنی تصور یہ ہے کہ مذہب کی دنیا میں آئے تو عام انسانوں جیسا انسان نہیں رہنا چاہیے۔ انہوں نے رسول کے اوپر یہ اعتراض کیا کہ کیسا رسول ہے' بازاروں میں چلتا پھرتا ہے' کھاتا پیتا ہے' بیوی بچے ہیں۔ کہا کہ ان سے کہدو کہ میں ہی نہیں' خدا کی طرف سے جتنے بھی رسول آئے تھے' ان کی یہی کیفیت تھی کہ انہوں نے اپنے آپ کو باقی عام انسانوں سے متمیز حیثیت نہیں دی تھی' انہی میں سے تھے' انہی جیسے تھے سوائے اس کے کہ **یوحٰی الی** (18:110) ان پہ خدا کی طرف سے وحی آتی تھی' اس وحی کا اتباع کرتے تھے۔ یہاں تو یہ کہتے تھے کہ بازاروں میں پھرتا ہے' کھاتا پیتا ہے۔ دوسری جگہ اور بڑی اہم چیز ہے' عزیزانِ من! جو میں عرض کر رہا ہوں' وہ مابہ الامتیاز خصوصیات جو میں بتا رہا ہوں وہ اسلام کی ہیں۔ کہا کہ اتنی سی بات نہیں کہ کھاتے پیتے تھے بلکہ **وَ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلًا مِّنۡ قَبۡلِکَ وَ جَعَلۡنَا لَھُمۡ اَزۡوَاجًا وَّ ذُرِّیَّۃً**(13:38) تم سے پہلے بھی جو رسول آئے' ان کے بیوی بچے بھی تھے' وہ تارکِ دنیا نہیں تھے۔

مقربِ بارگاہِ خداوندی کے متعلق پایہ جانے والا تصورِ حیات

بات ساتھ کے ساتھ تو نہیں کرنا چاہتا' اس کا اثر کم ہوتا ہے ورنہ آپ کے ہاں سب سے بڑے مقربِ بارگاہِ خداوندی جو اولیائے کرام ہیں' ان کی سب سے بڑی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ صاحب! ساری عمر شادی نہیں کی تھی' ان کے ہاں بیوی بچے ہی نہیں تھے' تارکِ دنیا تھے۔ جونہی آپ کے ذہن میں کوئی مذہبی چیز کرتے ہوئے یہ آیا' آپ باقیوں سے یوں الگ ہوئے تو یاد رکھیے! خدا کی بارگاہ سے آپ کو بالکل معزول کر دیا جائے گا۔ یہ تصور پیدا ہو جانا کہ ہم خدا والے ہو گئے ہیں' اس واسطے یہ باقی سارے انسان جتنے بھی ہیں ان کو وہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں' کہتے ہیں کہ یہ جہنم کے کندے ہیں' فاسق اور فاجر اور ملحد اور بے دین اور زندیق ہیں' ان کا سارا ماتھا جفر کا نقشہ بن جاتا ہے۔ جونہی آپ نے اپنے آپ کو ذرا امتیازی کیفیت دی' باقیوں سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے کہ ہم اہلِ جنت میں سے ہیں' یہ سب جہنمی پھر رہے ہیں۔ رسول کی یہ کیفیت نہیں ہوتی' وہ تو بازاروں میں چلتا پھرتا ہے' کھاتا پیتا ہے' خدا اس کی طرف سے اعلان کرتا ہے کہ کیا تصور کیے بیٹھے ہو' وہ بیوی بچے بھی رکھتا ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ بھئی! یہ جو ہماری طرح کا رسول ہے' یہ تو کچھ بات نہیں۔ رسول کا فریضہ ایک بتایا۔ کہا کہ رسول کا فریضہ اتنا ہی نہیں کہ وحی آتی ہے' وہ پہنچا دیتا ہے' اُس وحی کے اوپر عمل کر کے دکھا دیتا ہے۔ اگر رسول فوق البشر (Super Human) ہو تو وہ جو کچھ کر کے دکھائے گا وہ باقی انسانوں کے لیے تو نمونہ نہیں بن سکتا۔ آج بھی جب ان سے کہیے کہ صاحب! دیکھیے حضور رسالتمآب ﷺ کی یہ زندگی تھی' خلفائے راشدینؓ کی یہ تھی' صحابہ کبارؓ کی یہ تھی' کہنے لگے: او صاحب! معاذ اللہ' آپ کیا کہہ رہے ہیں' کیا ہم ان کی برابری کر سکتے ہیں؟ یہ تو صحابہ کبارؓ تھے' وہ تو خدا کے رسول تھے۔ یعنی یہ سارا کچھ ان کے لیے تھا ''اسی تے بندہ بشر ہوئے' تے تسی سانوں اوہناں تے مطابق لاحول ولا' معاذ اللہ' توبہ توبہ' کتھے صحابہ کبارؓ کتھے اسی [1] !!'' اندازہ لگائیے' ان کے ذہن میں کچھ یہی تھا کہ رسول کو کچھ فوق البشر ہونا چاہیے' کچھ اس قسم کے فرشتے ہونے چاہئیں جو وہ آئیں۔ سنیے! جواب کیا دیا گیا ہے؟

نبی اکرمؐ کی زندگی نوعِ انسان کے لیے ماڈل کی حیثیت رکھتی ہے

کہا کہ پہلی چیز یہ ہے کہ **وَ مَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْۤا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰۤى اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا** (17:94) کہنے لگے سب سے پہلی رکاوٹ جو لوگوں کے ذہنوں میں رسول کو ماننے میں پیدا ہوتی رہی' وہ یہی ہوتی رہی کہ وہ کہتے

---

[1] ہم تو بشر ہیں مگر آپ ہمیں اُن کے مطابق لا رہے ہیں۔ لاحول ولا قوۃ' معاذ اللہ' توبہ توبہ' کہاں صحابہ کبارؓ اور کہاں ہم۔

رہے کہ کیا ایک انسان ہمارے جیسا بشر ہو اور وہ خدا کا رسول کہنے لگے۔ یہی چیز لوگوں کے راستے میں آڑ بن کر کھڑی ہو گئی' رکاوٹ بن گئی اور جواب دیا کہ ان سے کہہ دو یہ کہتے ہیں کہ بشر رسول نہیں ہونا چاہیے' کوئی فرشتے ہونے چاہئیں۔ قُلْ لَّوْ كَانَ فِى الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا (17:95) اگر دنیا میں فرشتے بستے تو پھر ہم ان کی طرف فرشتے رسول بھیجتے' دنیا میں انسان بستے ہیں' ان میں انسان رسول آنے چاہئیں کیونکہ ان کی زندگی نے تو باقیوں کے لیے ایک ماڈل بننا ہے۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِىْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (33:21) رسول کی زندگی تم سب کے لیے' باقی انسانوں کے لیے' بہترین ماڈل ہے۔ وہ ماڈل اُسی صورت میں بن سکتا ہے کہ وہ تمہارے جیسا انسان ہو۔ اگر یہاں فرشتے آئیں اور وہ پیغام پہنچائیں اور وہ کچھ کر کے دکھائیں تو تمہارے لیے وہ ماڈل کیسے بن سکتا ہے' وہ تو کوئی فرشتہ ہی کر سکتا ہے۔ کیا انداز ہے جواب دینے کا!! فرشتے مانگتے ہو رسول' ٹھیک ہے' یہاں اگر فرشتے بستے' دنیا میں ان کی طرف فرشتے رسول آتے' یہاں انسان بستے ہیں' یہاں انسان رسول آئیں گے۔ انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے صاحب! آپ اپنے اس اصول کے مطابق انسان بھیجتے رہیے' ہم تو اس انسان کو خدا بنا کر رہیں گے۔ پتہ ہے یہ خدا بناتے کیوں ہیں؟ وہی جو ابھی اس عذر کے لیے' اس حجت کے لیے' میں نے عرض کیا ہے کہ جو کہا جائے کہ صاحب! اس کی زندگی ایسی تھی' تمہارے اس رسول کا کردار ایسا تھا' وہ کچھ اس قسم کی خصوصیات کا حامل تھا۔ تم میں وہ بات کیوں نہیں ہے؟

ہمارے ہاں اتباعِ سنت کا مفہوم اور اس کا عملی مظاہرہ

صاحب وہ تو رسول تھے' جی! ہم تو بندے بشر ہوئے۔ بس اس سے ساری ذمہ داری کا بوجھ ٹل گیا۔ اس لیے کہتے تھے کہ رسول کو عام انسانوں جیسا رسول نہیں ہونا چاہیے ورنہ ذمہ داری عائد ہو جائے گی۔ اتباعِ سنت ﷺ کے اوپر اتنا زور دیا جاتا ہے۔ زور کس چیز کے اوپر ہے؟ کہ لبیں ایسے ترشوایئے' عمامہ ایسا پہنیے' پگڑی ایسے باندھیے' یہ صورت نہیں ہے کہ سیرت اور کردار اس قسم کا پیدا کیجیے۔ سیرت اور کردار کی جب بات آئے گی آپ دیکھیں گے' وہ کہیں گے کہ صاحب! وہ تو رسول تھے' وہ صحابہؓ تھے' ہم تو بندے بشر ہیں۔ یعنی اتنا حصہ جو لبیں ترشوانا اور عمامہ پہننے کا تھا یہ تو ٹھیک تھا مگر سیرت و کردار ان کی سی نہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر ملائکہ یہاں ہوتے تو ہم ملائکہ کو رسول بنا کر بھیجتے۔ اسی کے ساتھ ہی دوسری آیت ہے۔ تصور یہ تھا کہ رسول عام انسانوں جیسا نہیں ہونا چاہیے۔

انبیائے کرام سے معجزات کا مطالبہ اور نبی اکرم ﷺ سے بھی

پہلا مطالبہ یہ ہوتا تھا کہ اگر آپ رسول ہیں تو کوئی معجزہ دکھایئے اور یہ کوئی ایک ایسی چیز نہیں ہے کہ یہ اسی زمانے میں ہی کہتے

تھے۔ رسول اللہ کے بعد کوئی رسول آیا ہی نہیں اور نہ آ سکتا ہے مگر ہمارے ہاں بھی یہی صورت ہے' معجزات پر کتابوں کی کتابیں لکھی ہوئی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے معجزات گنانے کے لیے انداز یہ ہے کہ باقی رسولوںؑ کے معجزے گنانے کے بعد دیکھا کہ اتنے ہوئے تو حضور ﷺ تو سرورِ کائنات' انبیاء کے سردار' سب سے افضل ہیں تو ان کے معجزے بھی تو ان سے زیادہ ہونے چاہئیں' کم از کم دو گنے بتاتے ہیں۔ اس زمانے میں بھی معجزہ کا مطالبہ ہوتا تھا کیونکہ ذہن میں یہ تھا کہ اسے عام انسانوں جیسا انسان نہیں ہونا چاہیے۔ جو وحی تھی' وہ ان کے لیے معجزہ نہیں بنتی تھی' تعلیم تھی' اس تعلیم کو وہ یہ کہہ کر پیش کرتا تھا کہ غور و فکر کی رو سے اس کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ معجزہ تو وہ ہے جو غور و فکر کی حدود سے بلند ہو۔ معجزہ کی لفظ ہی عجز سے ہے کہ جہاں آپ کا شعور عقل فہم اس کو سمجھنے سے عاجز آ جائے' وہ معجزہ ہوتا ہے۔ حضور ﷺ کی زندگی سیرت اخلاق کردار معجزہ نہیں' معجزہ وہ ہے' جس کے سمجھنے سے عقل عاجز آئے جسے آج Super Natural کہتے ہیں فوق الفطرت' خارج فطرت کوئی چیز ہونی چاہیے۔ فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ پتھر اوپر پھینکیے نیچے آئے گا' معجزہ یہ ہوگا کہ یہ پتھر اوپر پھینکے تو اوپر کا اوپر چلتا چلا جائے' جب تک حکم نہ دے تو نیچے نہ گرے' عقل اس کے سامنے عاجز ہے کہ یہ ہوا میں معلق کیسے رہ گیا۔

معجزوں کی مختلف نوعیتیں

کہا ہے کہ سنیے! یہ کیا کیا مطالبے کرتے ہیں۔ **وَ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَکَ حَتّٰی تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ یَنْۢبُوْعًا**(17:90) کہتے ہیں ہم نہیں ایمان لانے کے تاوقتیکہ تمہاری یہ کیفیت نہ ہو کہ زمین پہ چھڑی مارو اور وہاں سے پانی کا چشمہ ابل آئے۔ یہ کرو تو بات ہوئی کہ پھر رسول ہوا۔ کہا کہ **اَوْ تَکُوْنَ لَکَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّ عِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْھٰرَ خِلٰلَھَا تَفْجِیْرًا**(17:91) یا یہ صورت ہو کہ یہ بنجر زمین ہے' صحرا ہے' ریگستان ہے' تم اس کے اوپر یوں ایک پھونک مارو تو اس میں سے اسی وقت کھجوروں کے اور انگوروں کے اور اناروں کے لہلہاتے ہوئے درخت' یوں کھڑے ہوئے ہوں کہ پھل لگے ہوئے ہوں' ان کے نیچے پانی کی نالیاں بہہ رہی ہوں' بس تُو اشارہ کرے تو یہ کچھ ہو جائے' ہم اُسی وقت ایمان لے آئیں گے۔ **اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ کَمَا زَعَمْتَ عَلَیْنَا کِسَفًا اَوْ تَاْتِیَ بِاللّٰهِ وَ الْمَلٰٓئِکَةِ قَبِیْلًا** (17:92) یا جیسا تم کہتے ہو کہ عذاب آئے گا' ہم یوں سمجھتے ہیں کہ عذاب یہ ہے' یہ آسمان ہے اس کا ایک ٹکڑا ہمارے اوپر گرا دو۔ وہ یہی سمجھتے تھے کہ یہ شیشے کا ایک ڈل ہے' یہ ہمارے اوپر گراؤ یعنی کچھ ایسا تو کر کے دکھاؤ جس کو عقل نہ مان سکے یا خدا کو' فرشتوں کو محسوس شکل میں ہمارے سامنے لاؤ اور بتا دو کہ یہ آپ کے سامنے کھڑے ہیں' ان کو اللہ میاں کہتے ہیں' یہ ان کے ملائکہ ہیں۔ کہا کہ یہ بھی بات نہیں ہے **اَوْ یَکُوْنَ لَکَ بَیْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰی فِی**

السَّمَآءِ (17:93) یا یہ ہے کہ اپنے گھر کو یوں اشارہ کرے تو یہ سونے کا بن جائے یا یہ ہے کہ تُو یہاں سے اڑے اور آسمان کی طرف چلا جائے' دوسرے نے کہا کہ نہیں آسمان کی طرف جانے سے ہی نہیں ہے' کچھ اور بھی بات ہے۔ **وَ لَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِیِّکَ حَتّٰی تُنَزِّلَ عَلَیْنَا کِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ** (17:93) واپس آئے تو ایک لکھی لکھائی' جلد کی ہوئی' منقش کتاب وہاں سے لے کر آئے' وہ کتاب ہمارے پاس پیش کرو تو پھر ہم ایمان لائیں گے۔

آپؐ کی زندگی کا ایک اتفاقی حادثہ

مطالبات آپ نے سن لیے۔ ایمان لانے کے لیے یہ مطالبے ہو رہے ہیں۔ قرآنِ کریم نے بتایا کہ **قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ** (17:93)۔ یہ سبحان ربی کا لفظ عربی زبان میں وہاں بولتے ہیں جہاں کوئی بڑی تعجب انگیز سی بات کہہ رہا ہو۔ ''کہا کہ کیا کہتے ہو تم!!'' **هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا** (17:93) میں تو تمہارے جیسا ایک انسان ہوں' مجھ سے یہ مطالبے کر رہے ہو' میں صرف قاصد ہوں' خدا کا پیغام پہنچاتا ہوں۔ اور یہ' عزیزانِ من! بلندیٔ کردار ہے۔ قوم اس قسم کی خوگر ہے کہ مانتی ہی نہیں ہے' تعلیم پہ غور ہی نہیں کرتی' وہ معجزے دیکھنے کے لیے اصرار کرتی ہے۔ سارے قرآن میں بار بار وہ مطالبے کرتے ہیں کہ معجزہ دکھاؤ' پھر ایمان لائیں گے۔ اتفاق سے ایک حادثہ سرزد ہو گیا۔ نبی اکرم ﷺ کا بچہ ابراہیم تھا' چھوٹی عمر میں وہ انتقال کر گیا' باقی تو آپ ﷺ کے ہاں لڑکیاں ہی تھیں' لڑکا انتقال کر گیا' اُس دن سورج کو گرہن لگ گیا۔ اگر آج یہ بات ہو جائے تو آج بھی آپ دیکھیے کہ لوگ اس کے متعلق کس طرح جھوم کر نہ وہاں پہنچ جائیں کہ سبحان اللہ صاحب! معجزہ نظر آ گیا۔ وہ لوگ سارے کے سارے گروہ در گروہ حضور ﷺ کے پاس آ گئے۔ کہنے لگے کہ ہم شہادت دیتے ہیں کہ تم سچے رسول ہو' ہم آپ ﷺ کی رسالت کے اوپر ایمان لاتے ہیں۔ آپ ﷺ نے کہا کہ یہ بات تو بڑی خوشی کی ہے' موجبِ ہزار مسرت ہے' تم ایمان لے آؤ' اللہ کا صحیح راستہ اختیار کر لو' میرے لیے اس سے زیادہ خوش کن بات کونسی ہے لیکن میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ ابھی کل تک یا صبح تک تو تم میرے اس قدر دشمن تھے' اتنی سخت مخالفت کرتے تھے' یہ اب کیا ہوا ہے کہ یہ سارے کے سارے جھوم کر آ گئے ہو' آج تمہارے اندر اتنا بڑا انقلاب کیسے واقع ہو گیا؟ انہوں نے کہا کہ ہم ایمان لاتے ہیں۔ آپ ﷺ نے پوچھا کہ کیا ہوا' یہ انقلاب کیسے واقع ہوا۔ کہنے لگے کہ آپ ﷺ کی صداقت کی اس سے بڑی دلیل کیا ہو گی کہ آپ ﷺ کے بیٹے کی وفات ہوئی' آپ ﷺ کے غم میں آسمان کے سورج نے بھی سیاہ لباس پہن لیا ہے' ہم ایمان لاتے ہیں کہ تم خدا کے سچے رسول ہو۔

آپؐ کے کردار کی عظمت اور سورج گہن کا واقعہ

عزیزانِ من! آپ دیکھتے ہیں اُس قوم کی کیفیت اور اس کے بعد دیکھتے ہیں اس شخص ﷺ کی بلندیٔ کردار۔ میں کہتا ہوں کہ کوئی فریب کار نہ بھی ہو تو Opportunist (موقعہ پرست‘ ابن الوقت) ہی سہی‘ وہ بھی اپنے دل کو فریب دینے کے لیے اتنی سی بات کہے گا کہ بھئی! میں نے تو ان سے یہ کچھ نہیں کہا‘ یہ خود اس پہ آئے ہیں‘ میں چپ ہی کر رہوں تو اتنے لوگ جو ایمان لے آئے ہیں‘ بہرحال یہ تو بہت بڑا کام ہے‘ اس کے لیے اگر میں خاموش بھی رہوں تو یہ کوئی ایسا گناہ کا کام نہیں ہوگا۔ یہاں تو ضرورت کے لیے جھوٹ بولنا واجب قرار دیا جا رہا ہے‘ اتنی سی بات تو میں کہتا ہوں کہ عام انسان بھی اپنے آپ کو سمجھا ہی لے گا کہ کوئی جرم کی بات نہیں ہے‘ دوسرا بھی کہہ دے گا کہ مان لو کونسی بات ہے‘ تم نے تو خود نہیں کہا اور دین کا اتنا بڑا فائدہ ہو رہا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ بات تو بڑی خوشی کی تھی کہ تم ایمان لے آئے لیکن اگر تم اس بات کے اوپر یہ کہتے ہو کہ یہ ایک معجزہ سرزد ہوا ہے‘ اجرامِ فلکی نے میرے غم میں‘ شرکت میں‘ سیاہ لباس پہن لیا ہے‘ تو سن رکھو کہ چاند اور سورج کو گرہن خدا کے قانون کی رو سے لگتا ہے‘ اسے کسی کی موت اور حیات سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ تمہاری غلط نگہی ہے کہ میرے غم میں شرکت کے لیے آسمان میں سورج کو گرہن لگا ہے‘ یہ خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق لگا ہے‘ تمہاری اگر یہ بات ہے جس کی وجہ سے تم ایمان لاتے ہو تو اس جہالت اور توہم پرستی کے ایمان سے تمہارا انکار ہزار درجہ بہتر ہے۔ یہ ہے وہ الابشرا‘ عزیزانِ من! یہاں عام انسان تو ایک طرف رہے‘ جو بڑے بڑے انسان ہیں‘ ان کے پاؤں میں بھی لغزش آ جاتی ہے: کہیں فریب کاری کے لیے‘ کہیں بازآفرینی کے لیے‘ کہاں خود فریبی کے لیے انسان اس سے فائدہ اٹھا جاتا ہے۔ یہ ہے بلندیٔ کردار۔ غور فرمایا آپ نے‘ کیا ہیں وہ امتیازی چیزیں جو اسلام کو واقعی خدا کا سچا دین ثابت کر رہی ہیں!

اپنی اپنی مرادیں پوری کرانے کی غرض سے بڑے بڑے آستانوں پر انسان کی حاضری

ساری دنیا بڑے بڑے حضرت صاحب کے پاس جاتی ہے۔ یہ کاہے کے لیے جاتی ہے؟ مرادیں مانگنے کے لیے۔ ذہنوں میں یہ ہے کہ یہ صاحبِ اختیار ہیں۔ عام تو یہی ہے کہ یہ حضرت صاحب ہی مرادیں دیدیتے ہیں‘ ذرا سا تکلف برتتے ہیں تو کہتے ہیں کہ نہیں صاحب! یہ ہماری عرضی خدا سے منظور کرا لیتے ہیں‘ یعنی یہ خدا کے برگزیدہ ہیں‘ مقرب ہیں‘ براہِ راست ہم خدا سے کہیں‘ تو وہ سنتا ہی نہیں‘ سنے بھی تو پتہ نہیں مانتا ہی نہیں ہے‘ ان کے Through (توسط سے) ہم Application (درخواست) بھیجتے ہیں‘ یہ وہاں سے منظور کرا لاتے ہیں۔ گویا یہ چیز ہے کہ یہ جتنی دنیا ان لوگوں کے پاس جاتی ہے‘ یہی عقیدہ ہے کہ یہ نفع پہنچاتے ہیں‘ فائدہ

پہنچاتے ہیں' مرادیں بر لاتے ہیں۔ یہ جوانہوں نے ٹاؤٹ رکھے ہوئے ہوتے ہیں' پوچھو نہیں کہ پھر یہ کیا کچھ کرتے ہیں۔ تو یہ چیز ہے' جس کی وجہ سے ساری دنیا' جتنے بھی حضرت صاحب میلے کچیلے گندگی میں پڑے ہوئے' کبھی منہ ہاتھ بھی نہیں دھویا' بال بکھرے ہوئے' دھوپ میں بیٹھے ہیں' دنیا ان کے گرد بیٹھی ہوئی ہے۔ ان کے گرد ہی نہیں' مر جاتے ہیں تو ان کی قبر کے گرد' ان کی ہڈیوں کے گرد' بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں' مرادیں مانگتے ہیں' کہتے ہیں کہ یہ نفع پہنچا سکتا ہے' نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اب یہ جو عام طور پر حضرت صاحب کے متعلق یہ عقیدہ ہے' تو رسولوں کے متعلق کیوں یہ عقیدہ نہیں ہوگا۔

نفع اور نقصان کے سلسلہ میں قرآن حکیم کے الفاظ میں نبی اکرم ﷺ کا اعلانِ عام

غور کیجیے کیا اعلان ہو رہا ہے؟ کہا کہ ذہن سے اس بات کو نکال دیجیے کہ میں تمہیں کوئی نفع یا نقصان پہنچا سکتا ہوں۔ **قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِىْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ** (7:188) بتا دو کہ تم تو ایک طرف رہے' میں تو اپنی ذات کے لیے بھی قانونِ خداوندی کے خلاف کسی نفع اور نقصان کا اختیار نہیں رکھتا' میں تو اپنی ذات کے لیے نہیں رکھتا' تمہیں میں کس طرح نفع اور نقصان پہنچا سکتا ہوں۔ **وَ لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ** (7:188) ۔ یہ کہتے ہیں کہ حضرت صاحب علمِ غیب جانتے ہیں' پیشین گوئیاں کرتے ہیں بتا دیتے ہیں کہ جاؤ لڑکا ہو جائے گا یا جاؤ مر جائے گا۔ کہا کہ میں اگر غیب کی بات' کل کی بات جانتا' یہ سٹے کا نمبر لینے کے لیے بھاگے پھرتے ہیں' کہ قبل از وقت معلوم ہو جائے تو اس کے بعد ہوتا ہے کہ اتنا کچھ آ جائے گا' کہا کہ میں اگر غیب کا علم جانتا' تو اتنی دولت اکٹھی کر لیتا جو تم خیال بھی نہیں کر سکتے' غیب کا علم خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ **وَ مَا مَسَّنِىَ السُّوْٓءُ** (7:188) اور اس کے بعد مجھے کوئی تکلیف ہی نہ ہوتی لیکن تم میرے ہاں روز دیکھتے ہو' بیمار بھی ہوتا ہوں' بچے فوت بھی ہوتے ہیں' تکالیف بھی ہوتی ہیں۔ او! مجھے تمہارے لیے کوئی اختیار ہونا تو ایک طرف رہا' مجھے تو اپنی ذات کے لیے بھی کوئی اختیار نہیں ہے' اگر مجھے نفع نقصان کا اختیار ہوتا تو مجھے کوئی تکلیف ہی نہ پہنچ سکتی' میں کسی نفع نقصان پہنچانے کے قابل نہیں ہوں۔ سوچ رہے ہیں آپ کہ یہ کس اسٹیج سے باتیں ہو رہی ہیں یعنی وہ جو مذہب کی دنیا کے جتنے ستون تھے' جن کے اوپر وہ چھت کھڑی تھی' ایک ایک کو گرایا جا رہا ہے۔

گناہگاروں کے لیے شفاعت کے عقیدے کی حقیقت

اور آگے چلیے۔ حضرت صاحب کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ تو خدا کے مقرب ہیں' یہ تو گناہگاروں کو بخشوا لیں گے' ان کو اتنے اختیارات حاصل ہیں' خدا ان کی مانے گا۔ یہ شفاعت کا عقیدہ' گناہگار کو بخشوانے کا عقیدہ تو ایسے ہے جیسے ہمارا جزوِ ایمان ہے' اس

نے اتنی اہمیت حاصل کر رکھی ہے۔ دوسروں کا تو ایک طرف رہا غور فرمایئے' کیا کہا جا رہا ہے؟ (6:15) میں کہا ہے کہ تم خدا کی معصیت کا ارتکاب کرو' اور میں تمہیں ان سے چھڑا لوں یہ ناممکن ہے' یہ باتیں نبی کی زبان سے خدا کہلواتا ہے کہ اعلان کر دو کیونکہ تمہارے ہی متعلق لوگوں کا یہ عقیدہ ہے' تمہاری زبان سے یہ اعلان ہونے چاہئیں' میں نے کہہ بھی دیا تو انہوں نے کہا کہ خدا نے کہہ دیا ہے' رسول نے تو نہیں کہا۔ خدا رسول کی زبان سے کہلواتا ہے کہ قُلْ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ (6:15) تمہیں بخشوانا تو ایک طرف رہا' میں بھی اگر خدا کے کسی قانون کی معصیت کرتا ہوں' خلاف ورزی کرتا ہوں' سرکشی برتتا ہوں' میں بھی اس کے عذاب سے ڈرتا ہوں' میں تو اپنے آپ کو بخشوا بھی نہیں سکتا۔ پھر سمجھ رکھیے! اتنے بڑے کردار کا اور کیریکٹر کا انسان ہے! معصیت کہتے ہیں' خدا کے کسی حکم یا قانون کی دانستہ سرکشی برت کر خلاف ورزی کرنا' بھول چوک اور چیز ہے اُسے معصیت نہیں کہتے' وہ سہو ہوتا ہے' نسیان ہوتا ہے' نادانستہ لغزش ہوتی ہے' توبہ کے اشک اور ندامت کے قطرات اس کو دھو دیتے ہیں' وہ بھی خود ہی دھونے پڑتے ہیں' خدا کی طرف سے ازخود اس کی معافی نہیں مل سکتی لیکن اُسے بہرحال معصیت نہیں کہتے۔

زندگی کے معاملات میں رسولوں کا کیریکٹر

رسولوں کا کیریکٹر اتنا اونچا ہوتا ہے کہ وہ احکام وقوانینِ خداوندی کی دانستہ سرکشی نہیں برتتے' عام معاملات کے اندر غلطی ہوجانا' سہواً کچھ ہوجانا' اجتہادی تدبیر میں کوئی سقم رہ جانا' بشر ہونے کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ اور قرآن نے اسی لیے اس کی مثالیں (نقل) Quote کر دیں کہ ذہن میں رہے کہ رسول سے عام زندگی میں معصیت نہیں ہوتی' جس طرح سے عام انسانوں کو کہیں تدبیری غلطیاں لگ جاتی ہیں' کہیں سہو ہوجاتا ہے' کہیں بھول چوک ہوجاتی ہے' اس قسم کی چیزیں رسول سے بھی ہوجاتی ہیں کیونکہ تمہارے جیسا بشر ہے۔ کہا کہ قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰی نَفْسِیْ وَ اِنِ اهْتَدَیْتُ فَبِمَا یُوْحِیْٓ اِلَیَّ رَبِّیْ (34:50) اے رسول! ان سے کہہ دو کہ اگر کہیں کوئی تدبیری غلطی ہوجاتی ہے تو اس کا ذمہ دار میں ہوں' میری اپنی غلطی ہوتی ہے' وحی کی نہیں ہوتی۔ وَ اِنِ اهْتَدَیْتُ فَبِمَا یُوْحِیْٓ اِلَیَّ رَبِّیْ (34:50) اور جب تم دیکھو کہ میں بالکل صحیح راستے پہ چل رہا ہوں تو وہ وحی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ صحیح راہ پہ چلنے کا کریڈٹ بھی آپ ﷺ نہیں لیتے۔ میں صرف اس کا اتباع کرتا ہوں' صحیح راستے پہ چلنے کے متعلق سمجھو کہ وہ راستہ وحی نے متعین کیا ہے' میں بھی اس پہ چلتا ہوں' تمہیں بھی اسی پہ چلنے کے لیے کہتا ہوں اور اگر کہیں تم دیکھتے ہو کہ مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہو تو یہ نہ سمجھو کہ وہ وحی کے اندر غلطی تھی' جس کی وجہ سے میں غلط چلا' وہ غلطی میری اپنی وجہ سے تھی۔

نبی اکرم ﷺ کی بلند ترین شخصیت قرآن حکیم کی روشنی میں

عزیزانِ من! یونہی سن کر نہ آگے بڑھ جائیے' پڑھ کر محض ثواب نہ حاصل کر لیجیے۔ یہ بہت بڑی گہری بات ہے۔ رسول ﷺ کا اس مقام کے اوپر یہ کہنا' اقرار کرنا کہ مجھ سے بھی غلطی ہوسکتی ہے' مجھ سے سہو ونسیان ہوسکتا ہے' میں چونکہ رسول ہوں' احتمال ہوسکتا تھا کہ تم میری ہر بات کے متعلق یہ سمجھو کہ یہ تو خدا ہی کی طرف سے ہے' اس کا وحی کے اوپر حرف آ جاتا۔ بات کو نکھار کر بیان کر دیا کہ وحی کے اتباع میں کہیں غلطی سہو وغیرہ کی بات نہیں ہوتی' وہ تو صحیح راستہ ہے۔ اگر کہیں تم دیکھو کہ مجھ سے کوئی لغزش یا کوئی غلطی یا سہو ہوگیا ہے' تو یہ نہ سمجھو کہ رسول کی حیثیت سے ایسا ہوگیا ہے' وحی نے مجھے ایسا بتا دیا' تب ہوگیا ہے' یہ سمجھو کہ وہ میری اپنی ذات کی غلطی ہوگی' میں ذمہ دار ہوں۔ اپنی دو حیثیتوں میں یہ فرق کرنے کے لیے' عزیزانِ من! بڑی بلندیٔ کردار کی ضرورت ہے ورنہ یہاں بھی کون دیکھتا تھا کہ کس کی وجہ سے ہوا ہے۔ یہاں بھی اگر یہ ہوا کہ یہ سب خدا ہی کراتا ہے تو بری الذمہ ہوجاتے۔ اپنے اوپر یہ چیز لے لینا کہ اس کی ذمہ داری مجھ پہ عائد ہوتی ہے' میں اس کا ذمہ دار ہوں' خدا نہیں ورنہ اگر رسول کی حیثیت سے یہ چیز کہتے کہ صاحب! سب وحی کے ذریعے ہوتا ہے تو کون اس کو پہچان سکتا تھا' کون کہہ سکتا تھا کہ ایسا نہیں ہے لیکن یہ بلندیٔ کردار ہے۔

غزوہ تبوک کے موقعہ پر منافقین کا کردار اور نبی اکرم ﷺ کی طرف وحی کا نزول

عزیزانِ من! یہ پھر اتنی سی بات ہی نہیں ہے کہ کہہ دیا اور کوئی ثبوت نہیں ہے۔ قرآنِ مجید کے اندر اللہ تعالیٰ نے دو تین واقعات یہ بتانے کے لیے محفوظ کر کے رکھ دیئے کہ رسول سے بھی کوئی اجتہادی غلطی یا تدبیری سہو ہوسکتا ہے مثلاً غزوۂ تبوک ❶ نبی اکرم ﷺ کی زندگی کا آخری غزوہ ہے۔ اس میں کوئی مقام آیا ہے جہاں کچھ لوگ تھے جنہوں نے جنگ سے الگ ہٹ کر واپس چلے جانے کی درخواست کی تھی بلکہ راستے سے وہ واپس جانے کے لیے کہہ رہے تھے۔ یہ منافقین کا ٹولہ تھا۔ نظر آتا تھا کہ اس کی وجہ سے اوروں پر اثر پڑے گا۔ آپ ﷺ نے دو ایک دفعہ انکار کیا' اُنہوں نے بہت زیادہ اصرار کیا' تو اس کے بعد آپ ﷺ نے انہیں اجازت دیدی کہ اچھا تم چلے جاؤ۔ آپ ﷺ فوج کے کمانڈر انچیف تھے' یہ آپ ﷺ کے حقِ اختیار میں تھا لیکن اصولی طور پر یا اس کے جو مضرت رساں اثرات تھے' وہ ایسے تھے کہ قانونِ خداوندی کی رو سے' مشیت کی رو سے' ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آپ دیکھیں گے کہ اس میں کوئی لغزش نہیں ہے' کوئی کیریکٹر کی پستی نہیں ہے' بہر حال فیصلے کا جسے آپ Error of Judgment کہتے ہیں زیادہ سے زیادہ یہ ہے' خدا اس پہ بھی نگاہ رکھ رہا ہے۔ کہا کہ **عَفَا اللّٰہُ عَنۡکَ لِمَ اَذِنۡتَ لَھُمۡ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکَ الَّذِیۡنَ صَدَقُوۡا وَ**

---

❶ غزوۂ تبوک رجب 9ھ مطابق نومبر 630ء

تَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ (9:43) اے رسول! تم نے ان کو اجازت دینے کی بہت جلدی کی خدا تمہیں معاف کرے تم نے جلدی کی ایسا کرنے میں، تمہیں رکنا چاہیے ایسے میں تاوقتیکہ پتہ چل جاتا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں کہ ہمارے گھر اکیلے ہیں، پیچھے کوئی نہیں ہے اس کی تصدیق ہوجاتی، معلوم ہوجاتا اور تم دیکھتے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے لیکن تم نے ایسا نہیں کیا ہے اور پہلے ہی تم نے اجازت دیدی، تمہیں اجازت نہیں دینی چاہیے تھی۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ وہ جو کہا تھا کہ اگر میں کبھی کوئی غلطی کرتا ہوں، تدبیری غلطی کرتا ہوں، مجھ سے سہو ہوجاتا ہے تو اس کا ذمہ دار میں ہوں، خدا نے ان کے اوپر گرفت کی، ذمہ داری قرار دیدی ہے کہ یہ وحی کی طرف سے نہیں ہے یعنی قرآنِ کریم نے جہاں حضورﷺ کے اسوہ کو بہترین ماڈل قرار دیا ہے، ان باتوں کی خود وضاحت کرتا ہے، انسان ہے انسان سے اس کی تدبیری غلطیاں سہواً ہوتی رہتی ہیں، یہ قابلِ گرفت بات نہیں ہے، اصل چیز تو یہ ہے کہ وہ وحی کا اتباع کس حد تک کرتا ہے۔

نبی اکرمؐ کی زندگی کی ایک دوسری مثال

دوسری مثال سورۃ تحریم میں ہے۔ بات کچھ نہیں ہے کسی بنا پہ کوئی چیز جس کی قرآن نے تفصیل نہیں دی، کوئی کھانے پینے کی چیز تھی، اس کے متعلق آپﷺ نے یہ کہہ دیا کہ بھئی! میں نہیں کھاؤں گا۔ کوئی بات ہی نہیں، ہم بیسیوں چیزیں ایسی ہیں جو نہیں کھاتے، گھر والوں سے کہہ رکھا ہوتا ہے کہ بھئی! یہ مجھے معاف رکھیے، یہ نہ میرے لیے پکایا کرو، میں یہ چیز نہیں کھاتا! کوئی بینگن نہیں کھاتا، کوئی کریلے نہیں کھاتا تو کوئی بات ہی نہیں، ساری چیزیں حلال ہیں۔ حرام چیز کا کھانا تو معصیت ہے۔ جن چیزوں کو خدا نے حلال قرار دیا ہے تو ضروری نہیں ہے کہ اس میں ہر چیز آپ کھاتے چلے جائیں، سینکڑوں چیزیں ایسی ہیں کہ ان کو کھانے کا اتفاق ہی نہیں ہوتا، ان میں سے بیسیوں ایسی ہیں جو ہمارے لیے خوشگوار نہیں ہوتیں، ہمارا بھی جی نہیں چاہتا۔ قرآن نے اسی لیے تو حلال کے ساتھ طیّب کی شرط لگا رکھی ہے، اضافہ کردیا ہے کہ بے شک حلال چیزوں میں سے وہ جو تمہارے لیے خوشگوار ہوں، اچھی لگیں، وہ کھایا کرو۔ کوئی چیز تھی جو آپﷺ نے چھوڑ دی لیکن کسی عام آدمی کا یہ چھوڑ دینا اور رسول کا اس طرح سے بغیر کسی قسم کی دلیل دیئے ہوئے یا Explanation (وضاحت) دیئے ہوئے چھوڑ دینا، مضر اثرات کا موجب ہوسکتا تھا۔ اس سے پہلے واقعہ یہ ہوچکا تھا۔ یہودیوں کے ہاں اونٹ حلال تھا جیسا ہمارے ہاں ہے، حضرتِ یعقوبؑ کو یہ مضر پڑتا ہوگا، اُنہوں نے اس کا گوشت کھانا چھوڑ دیا، یہودیوں نے بعد میں سمجھا کہ وہ خدا کا رسول تھا، اُس نے گوشت کھانا چھوڑ دیا ہے، غالباً اونٹ حرام قرار دیا گیا ہوگا، یہودیوں نے اپنی شریعت میں اونٹ کو حرام قرار دیدیا۔ رسول اللہﷺ نے کیا تو ایسا ہی تھا۔ کہا یہ کہ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ (66:1)

اے رسول! تمہیں یہ نہیں چاہیے تھا کہ اپنے اوپر ایسی پابندی عائد کر لیتے کہ میں کبھی نہیں کھاؤں گا' تمہیں پتہ ہے کہ پہلے ایسا ہو چکا ہوا ہے:

جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے

بخاری اور مسلم کی احادیث نماز کے دوران آپؐ کے بھول جانے کی بات

عام انسان چھوڑ دے تو کوئی بات نہیں' تمہارے لیے یہ چھوڑنا تو دوسروں کے لیے سنت بن جائے گا' وہ سمجھ لیں گے کہ غالباً یہ چیز حرام تھی' حضورﷺ نے بتایا نہیں' اللہ تعالیٰ کے حکم سے چھوڑا ہوگا' ایسا نہ کیا کرو۔ یہ کیا چیز تھی؟ بھول چوک کی جو بات ہے تو دو چیزیں قرآنِ کریم میں آئی ہیں لیکن یہ حضرات تو اپنے ہاں احادیث کو زیادہ مستند مانتے ہیں۔ آپ عجیب چیز دیکھیں گے۔ بخاری شریف اور مسلم میں ہے کہ آنﷺ ظہر یا عصر کی نماز پڑھا رہے تھے تو آپﷺ نے دو رکعتیں پڑھ کر سلام پھیر دیا' پیچھے جتنے نمازی صحابہ کبارؓ تھے' سب نے سلام پھیر دیا' اس کے بعد اُنہوںؓ نے آپﷺ سے پوچھا کہ کیا خدا کا حکم آ گیا ہے کہ چار کی جگہ دو رکعتیں رہ گئی ہیں تو آپﷺ نے کہا: کیا کہا تم نے میں نے دو رکعتیں ہی پڑھی ہیں؟ اُنہوںؓ نے کہا کہ جی ہاں آپﷺ نے تو دو رکعتیں پڑھی ہیں۔ کہنےﷺ لگے کہ مجھ سے بھول ہوگئی' مجھے یاد نہیں رہا' میں نے دو ہی پڑھ دیں' دو اور پڑھیے اور میرے ساتھ سجدہ سہو کیجیے۔

دین اور مذہب کی امتیازی خصوصیت

یہ جو واقعات ہیں' اس لیے قرآن نے اپنے ہاں محفوظ رکھے ہیں اور وہ جو کتبِ روایات میں آتے ہیں' میں مانتا ہوں کہ یہ صحیح ہو سکتے ہیں کہ قرآن نے ایسا کہا ہے۔ یہ اسی لیے ہیں کہ یہ ذہنوں سے نکال دیا جائے کہ رسول فوق البشر ہوتا ہے' بشریت کے جہاں اس قسم کے سہو اور نسیان کی یا اس قسم کی اجتہادی تدبیری غلطیاں یا بھول جانا بشریت کے تقاضے ہیں' یہ تقاضے رسول کے بھی ساتھ تھے' کوئی گناہ کی یا جرم کی بات نہیں تھی۔ مذہب کے بانی یا دین کے پہنچانے والے رسول' کو مذاہب نے عینِ خدا بنا دیا تھا' کوئی مذہب تصور بھی نہیں کر سکتا کہ ان کے کسی بانی کو کہا جائے کہ وہ انسان تھے چہ جائیکہ ان کے متعلق کہا جائے کہ ان سے لغزش بھی ہو سکتی تھی' بھول بھی سکتے تھے' سہو بھی ہو سکتا تھا' دنیا کے اندر کوئی ماننے کو تیار نہیں۔ یہ ہے امتیازی خصوصیت جس دین کو اس طرح سے پیش کیا گیا۔

آپؐ اپنی تعظیم کے لیے اٹھ کھڑے ہونے والوں کو روک دیا کرتے تھے

دین کے علیٰ وجہ البصیرت پیش کرنے والے نے' اپنے آپ کو ایک انسان کی حیثیت سے پیش کیا' اپنے آپ کو انسانیت سے ذرا

اونچا نہیں جانے دیا' یہاں تک احتیاط برتی کہ صحابہؓ بیٹھے ہوتے آپ ﷺ تشریف لاتے۔ ہمارے ہاں عام انداز ہے' وہ جو میں منع کیا کرتا ہوں' کہ تعظیم کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ آپ ﷺ فوراً روک دیتے تھے کہ پھر کوئی یہ کچھ نہ کرے۔ اُنہوں ﷺ نے کہا کہ ٹھیک ہے آج اس میں کوئی مضائقہ نظر نہیں آتا لیکن اتنی سی جو بات ہے' اسی سے تو شہنشاہیت کی بنیاد رکھی جایا کرتی ہے' اس لیے کہا کرتے تھے کہ انسان اور انسان میں کیوں فرق کرتے ہو۔

آپ ﷺ کا حضرت فاطمہؓ کے لیے اٹھ کھڑے ہونا محبت کا اظہار تھا

ایک دفعہ کسی نے کہا کہ حضور ﷺ' حضرت فاطمہؓ ابھی بچی تھیں' وہ آتی ہیں تو اس پہ بھی آپ ﷺ اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کہا کہ وہ بات عظمت کی نہیں' بیٹی کی محبت کی بات ہے۔ بیٹی کی محبت کے لیے باپ کھڑا ہو سکتا ہے۔ ایک انسان کی حیثیت سے اگر وہ آتا ہے تو وہ اپنے رفقا سے بھی کہتا ہے کہ ایسا کچھ نہ کرنا۔ بات تو ذرا سی ہے' کل کو یہ ذرا سا جو ایک پَر ہے' اس کی پھر ڈاریں بن جاتی ہیں' بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ کوئی بات ایسی نہیں جو آپ ﷺ نے اپنی طرف منسوب ہونے دی ہو کہ جو ذرا فوق البشر ہو۔ آپ ﷺ نے دونوں حیثیتوں کو کس طرح سے الگ کر دیا۔ یہ بڑی چیز ہے۔

محمدؐ بن عبداللہ کی آنکھ کے آنسو اور محمد رسول اللہ ﷺ کے عدل کا حکم

اور وہ واقعہ تو پھر آپ کو یاد ہوگا' میں اکثر دہرایا کرتا ہوں۔ دو حیثیتیں جو ہیں: ایک طرف سے باپ کی حیثیت' ایک طرف عادل کی حیثیت۔ یہ بڑی چیز ہے صاحب! یہودیوں کی اپنی شریعت کے مطابق آپ ﷺ نے قتل کے جرم میں اس کو سزائے موت دی تھی اور گردن کاٹنے کے لیے وہ جلاد کھڑا تھا' اس کی بچی چلاتی ہوئی آپ ﷺ کے ہاں آئی' لپٹ گئی اور بہت روئی۔ اس نے کہا کہ مجھے یتیم ہونے سے بچا لیجیے' میرے باپ کو قتل نہ کیجیے۔ جرم ثابت تھا' عدل کا تقاضا یہ تھا۔ بچی کی آہ و فغاں سن کر آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ صحابہؓ نے یہ سمجھا کہ اب آپ ﷺ اسے کہیں گے کہ جانے دو۔ دیکھ رہے تھے' جلاد آپ ﷺ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آپ ﷺ نے حکم دیا کہ گردن کاٹ دو۔ ٹھیک ہے حکم دیدیا۔ صحابہؓ نے پوچھا کہ یہ کیا بات تھی کہ آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو بھی رواں تھے' اس کے باوجود آپ ﷺ نے قتل کا حکم دیدیا۔ عزیزانِ من! یہ فقرہ' میں سمجھتا ہوں کہ ہر ایوانِ عدل کے آگے رکھا ہونا چاہیے' آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''محمد ابنِ عبداللہ کی آنکھ رو رہی تھی' محمد رسول اللہ ﷺ خدا کے عدل کا حکم دے رہا تھا''۔ محمد بن عبداللہ اور محمد رسول اللہ ﷺ میں بڑا فرق ہے۔ جذبات کو غالب نہ آنے دینا عدل کے تقاضے کو پورا کرنا' بڑی چیز ہے۔ یہ دو حیثیتیں ہیں۔ یہی باتیں ہیں جس کے لیے قرآن نے چھوٹی چھوٹی لغزشوں کو بھی محفوظ کر دیا ہے۔ حضور ﷺ نے احتیاط برتی کہ

اس سے آگے نہ بڑھنا' میری طرف ایسی باتیں منسوب نہ کر دینا جس سے میں فوق البشر ہو جاؤں۔

قرآنِ حکیم کے بیان کردہ اسوۂ حسنہ کے برعکس ہمارے ہاں کے مذہبی لٹریچر کی نوعیت

قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا یہ اسوۂ حسنہ ہے اور اس کے بعد پوچھو نہیں کہ ہم نے کیا کیا' بڑے فخر سے بتایا کہ

وہی جو مستویٔ عرش تھا خدا ہو کر
اتر پڑا وہ مدینے میں مصطفٰی ہو کر

سبحان اللہ کیا بات ہے!!!

اگرچہ ظاہر میں وہ عرب [1] ہے
مگر حقیقت میں عین رب ہے

اور یہ بات شاعری کی ہی نہیں' آپ کے ہاں کی تمام کتابیں اس سے بھری پڑی ہیں' سارا مواد فوق البشر حیثیت سے بھرا پڑا ہے۔ آپ کے ہاں مناظرے ہوتے ہیں' جھگڑے چل رہے ہیں کہ آپ ﷺ نور تھے یا بشر تھے۔ یہ وہی ہے جو باقی اہلِ مذاہب نے اپنے ہاں کیا تھا۔ مذہب کے بانی کو وہ انسان سمجھ کر تصور نہیں کر رہے تھے۔ قرآن لاکھ کہے' رسول اس پہ لاکھ اعتراض کرے' مگر ہم نے وہیں لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ قرآن یہ دو الگ الگ حیثیتیں بتا رہا ہے۔ کہا ہے کہ **قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ** (18:110)۔ لیکن آپ کو پتہ ہے کہ کیا تفسیریں پیش کی جا رہی ہیں۔ ایک دفعہ کہہ دیا گیا کہ نبی اکرم ﷺ نے جو کچھ بحیثیت رسول فرمایا ہے' وہ احکامِ خداوندی ہیں' وہ شریعت ہیں' جو کچھ آپ ﷺ نے اپنے بشر ہونے کی حیثیت سے کیا' وہ چیز دین کا اتباع ہے کہ حضور ﷺ نے دین پہ ایسے عمل کیا ہے' کیونکہ دو حیثیتیں الگ الگ ہیں۔ جواب دیا گیا جس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو منصبِ رسالت سے سرفراز کیا' اُس وقت سے لے کر حیاتِ جسمانی کے آخری سانس تک' آپ ﷺ ہر آن اور ہر حال میں' خدا کے رسول تھے' آپ ﷺ کا ہر فعل اور ہر قول رسولِ خدا کی حیثیت سے تھا' اسی حیثیت میں آپ ﷺ مبلغ اور معلم بھی تھے' مربی اور مزکی بھی تھے' قاضی اور حاکم بھی تھے' امام اور امیر بھی تھے حتیٰ کہ آپ ﷺ کی نجی اور شہری زندگی کے سارے حالات بھی اسی حیثیت کے تحت آ گئے تھے۔ قرآن بتا رہا ہے کہ وہ بشری حیثیت سے یہ سارا کچھ کرتے تھے مگر وہ کہتے ہیں کہ نجی اور پرائیویٹ لائف جو تھی وہ بھی رسول ہی کی حیثیت سے تھی۔ یہ مرحوم ابوالاعلیٰ مودودی صاحب (1979-1903) ہیں جنہوں نے یہ کہا ہے۔

---

[1] ملاحظہ کیجیے: عرب = ع رب' اس سے عین رب بنایا۔

نبی اکرمؐ کی عظمتِ کردار کی ایک مثال

میں کیا عرض کروں ایک طرف یہ بات بھی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ وہ تو رسول کی حیثیت سے ساری زندگی آپ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے جو اتنے کارہائے نمایاں کیے' اتنی سیرت کی بلندی' کردار کی پاکیزگی ہے کہ آپ ﷺ نے کبھی کوئی چیز بحیثیت بشر کی ہی نہیں تو پھر اگر رسول کی حیثیت کے معنی یہ تھے کہ خدا ہی سب کچھ آپ ﷺ سے کہلاتا اور کراتا تھا تو آپ ﷺ کو تو کوئی کریڈٹ نہیں جاتا۔ اس میں جس طرح وحی کے الفاظ رسول اللہ ﷺ پہنچاتے تھے' اس کا کریڈٹ رسول اللہ ﷺ کو نہیں جاتا کہ وحی ان کی اپنی نہیں ہے۔ اگرچہ ایک مستشرق نے اس چیز کو کہا تھا کہ میرے نزدیک یہ شخص' محمد رسول اللہ ﷺ کی عظمت کردار ہے' میں اس سے سمجھتا ہوں کہ قرآن جیسی کتاب' جس کی نظیر دنیا میں نہیں ملتی' دنیا کا کوئی ذریعہ نہیں تھا جس سے یہ معلوم کرسکتے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی اپنی تصنیف نہیں ہے' خدا کی تصنیف ہے' اس قسم کی کتاب کا کریڈٹ اس شخص نے خود نہیں لیا بلکہ کہا ہے کہ اس میں میرا ایک لفظ بھی نہیں ہے' یہ سب خدا کا ہے' یہ شخص بڑا بلند ہے۔ کہا یہ جارہا ہے کہ وہ تو ہر حال میں رسول تھے' تو پھر جو کچھ بھی آپ اچھے کام کہہ رہے ہیں تو ان کا اپنا کیا!! وہ تو رسول تھے۔ کہا گیا کہ جی! اس میں تو کبھی کبھی لغزشوں کا بھی ذکر آجاتا ہے' یہ قرآن نے خود بتایا ہے۔

مودودیؒ کی تضاد بیانی پر ایک نظر اور اس سے ہونے والا نقصان

فرمایا کہ ان سے کسی لغزش کا صدور اس بنا پر نہیں ہوا کہ اللہ تعالیٰ نعوذ باللہ کسی وقت ان سے غافل ہو گیا تھا' اُنہوں نے کہا تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں یہ سب کچھ کرتے تھے تو کہا کہ صاحب! یہ کبھی کبھی بھول چوک جو ہوگئی تو پھر کہا کہ یہ اس لیے نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ نعوذ باللہ کسی وقت ان سے غافل ہو گیا تھا' ایسی بات نہیں تھی کہ جی! ایسی نہیں تھی تو پھر کیا تھا؟ کہا کہ یہ اس بنا پر ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے وہ لغزش ان سے صادر ہو جانے دی۔ ارے کیوں صادر ہونے دی؟ تاکہ دنیا پر یہ بات بھی واضح ہو جائے کہ وہ بندے اور بشر ہی ہیں خدائی صفات کے حامل نہیں ہیں (معاذ اللہ)۔ یہ وہی مرحوم مودودی صاحب (1979-1903) فرما رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ کسی کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد کچھ نہیں کہنا چاہیے' میں ان کی وفات کے بعد یہ کچھ نہیں کہہ رہا' میں ان کی زندگی میں بیسیوں مرتبہ یہ کہتا چلا آرہا ہوں کہ جس انداز سے آپ اسلام کو پیش کر رہے ہیں' تاریخ میں مجھے کہیں نہیں ملتا کہ کسی ایک فرد نے اتنا نقصان پہنچایا ہو' جتنا آپ نے پہنچایا ہے۔ رسول کی جو حیثیت ہے' پہلے وہ یہ حیثیت کہ صاحب! وہ زندگی کے ہر شعبے میں' نجی زندگی کے شعبے میں' بھی آپ ﷺ رسول ہی تھے' یہ کیفیت تھی' اب اس سے یہ اعتراض آئے کہ پھر یہ لغزشیں یہ سہو یہ نسیان جن کے متعلق قرآن بھی کہہ رہا ہے' حدیثیں بھی کہہ رہی ہیں یہ کیوں تھیں؟ کہا کہ یہ کچھ اللہ کبھی کرا دیا کرتا تھا۔ کیوں؟ تاکہ لوگوں پہ ظاہر ہو جائے

کہ آپ ﷺ بشر تھے۔

قرآن نے تو بیسیوں مرتبہ یہ چیز کہی' رسول سے کہلوایا کہ اَنَـا بَشَـرٌ مِّثْلُکُمْ (18:110)۔آپؐ بازاروں میں چلتے پھرتے تھے۔قرآن کہتا ہے کہ بیوی بچے بھی تھے' کھاتے پیتے بھی تھے۔تو یہ دلائل اس کے لیے کافی نہیں تھے کہ آپ ﷺ بشر تھے' بشر ہونے کے لیے یہ ضروری تھا کہ کبھی کبھی وہ گناہ بھی ان سے سرزد ہوجایا کرے (معاذ اللہ) عزیزانِ من! کہ وہ بھی حضور ﷺ کی اپنی وجہ سے نہیں ہوا' خدا نے صادر ہوجانے دیا یعنی جب صادر نہیں ہوا' اس قسم کا گناہ تو اس لیے کہ خدا نے روکے رکھا تھا' نگرانی تھی' وہ نہ ہونے کا کریڈٹ بھی (معاذ اللہ) رسول اللہ ﷺ کو کوئی نہیں جارہا' وہ تو خدا نے یہ کچھ کیا تھا' روکے رکھا اور جو کبھی ہوگیا تو وہ دانستہ خدا نے کرادیا۔اب کتنی مشکل ہے بیچارے رسول کی کہ کراتو رہا ہے اس سے خدا' اب یہ لوگوں سے کیسے کہے کہ میں اس کا کچھ جرم دار نہیں' مجھ سے کرایا گیا ہے ''مینوں تے پتہ وی نہیں لگا[1]'' (معاذ اللہ معاذ اللہ)۔

ہم نے کیا کیا؟ عزیزانِ من! قرآن نے یہ چیز رسول کی پیش کی کہ اَنَـا بَشَـرٌ مِّثْلُکُمْ (18:110) یہ اس لیے کہا کہ جو کچھ تم کہتے ہو کہ رسول اللہ ﷺ کا یہ اسوہ حسنہ تھا' یہ بلندیٔ کردار تھی' جو آپ ﷺ کرسکتے تھے تم بھی کرسکتے ہو۔کہا کہ قُـلْ اِنْ ضَـلَـلْـتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰى نَفْسِىْ (34:50) بتادو کہ حق و باطل کے اس معرکہ میں اگر مجھے کسی مقام پہ نقصان اٹھانا پڑا ہے تو وہ میری (یا میرے ساتھیوں کی) تدبیری غلطی کی وجہ سے ہوتا ہے۔یہ نہیں ہوتا کہ اس وقت باطل حق پر غالب آجاتا ہے۔

قرآنِ حکیم کی تعلیم کے مطابق رسولؐ سے لغزش تو ہوسکتی ہے' معصیت نہیں ہوتی

میں نے کہا تھا' عزیزانِ من! کہ یہاں آخر میں تین چیزیں آئی ہیں' بڑی بلند ہیں' بنیادی ستون ہیں۔دین کی بنیاد ہے کہ تَتَفَـكَّرُوْا (34:46) عقل و فکر کی بنیاد کے اوپر مانا کرو جو مانا کرو مَـا سَـاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْـرٍ (34:47) میں تم سے اس کے معاوضے میں کچھ نہیں لیتا۔اس کو پروفیشن نہیں بنالینا۔اس کے معاوضے میں کوئی چیز نہ میں لیتا ہوں' نہ تم لینا اور اگلی چیز یہ ہے کہ کوئی شخص کتنا ہی خدا کا مقرب اور خدا پرست حتیٰ کہ رسول بھی کیوں نہ ہوجائے' بشر رہتا ہے' بشری کمزوریاں رہتی ہیں' اس سے لغزش ہوسکتی ہے' سہو ہوسکتا ہے۔معصیت نہیں ہوتی لیکن تدبیری غلطیاں ہوسکتی ہیں' یہ بشریت کے تقاضے ہیں۔مجھ سے اگر اس قسم کی چیز ہوسکتی ہے' تو میں ذمہ دار ہوں' وحی نہیں' وَ اِنِ اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوْحِىْٓ اِلَىَّ رَبِّىْ (34:50) صحیح چلتا ہوں تو وحی کے بتائے ہوئے راستے کے اوپر چلتا ہوں۔اِنَّهٗ سَمِيْعٌ قَرِيْبٌ (34:50) وہ سنتا بھی ہے' بہت قریب ہے' وہ ہر بات کو دیکھتا ہے جو میں کررہا ہوں۔

---

[1] مجھے تو اس کا علم بھی نہیں ہوا۔

عزیزانِ من! آج کی اہم چیز تو یہ تھی جو میں نے عرض کی ہے۔ کہا ہے کہ **وَ لَوْ تَرٰٓی اِذْ فَزِعُوْا فَلَا فَوْتَ وَ اُخِذُوْا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ** (34:51) اس وقت تو ان کی یہ کیفیت ہے' کہ پھنے خاں بنے ہوئے ہیں' ان کی جو اپنی غلط روش ہے اس کے نتیجے میں جب تباہی آئے گی' اس وقت یہ تمہارے قریب ہی ہے' ابھی یہیں باتیں ہو رہی ہیں' دور کی بات نہیں ہے' وہی قوم جو تمہاری مخاطب تھی' وہی قوم وہاں پر موجود ہے' انہی پہ گرفت ہونے والی ہے' اس وقت یہ ہزار مضطرب و بیقرار ہوں' وہ گرفت ان سے ٹلے گی نہیں۔ ابھی فتح مکہ سے آپ دیکھیے گا کہ ان کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ اُس وقت پھر ان کی کوئی ندامت اور کسی قسم کی کوئی توبہ کام نہیں آئے گی۔

فرعون کی توبہ قبول نہ ہونے کی وجہ

جب اعمال کے نتائج محسوس طور پر سامنے آجاتے ہیں' پھر وہاں سے مفر نہیں ہو سکتا' بھاگ نہیں سکتا۔ کہا کہ **وَّ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖ** (34:52) اُس وقت کہیں گے کہ ہم ایمان لائے۔ وہی فرعون ڈوبنے لگا تھا تو اس وقت اس نے کہا تھا کہ میں ایمان لاتا ہوں۔ قرآن کی بڑی عظیم چیز ہے' عزیزانِ من! حالانکہ اُس نے کہا تھا کہ میں ایمان لاتا ہوں موسیٰؑ اور ہارونؑ پہ' ہم وہاں ہوتے' کوئی اور بھی ہوتا تو اٹھا کر گلے لگا لیتا ''آخر تے کلمہ نصیب ہو گیا اے نا''، یعنی ہم جیسے لوگوں کا ری ایکشن (ردِ عمل) یہ ہوتا۔ وہ تو اپنے آپ کو خدا سمجھتا تھا۔ کہا کہ میں ایمان لایا۔ کہا کہ کیریکٹر دکھاتا تو اس وقت بھی ثابت قدم رہتا' کہا کہ موت کے ڈر سے ایمان لا رہے ہو' تم سے تو ایسی توقع نہیں' کفر پہ بھی پورا نہ اترا۔ قرآن کہتا ہے۔ عزیزانِ من! بات زبان سے تو چار الفاظ کہنے کی نہیں' بات تو پختگی کردار کی ہے۔ پچھلے دنوں میں نے دوستوں سے یہ بات کہی تھی۔ میں نے کہا تھا کہ آپ کو معلوم ہے' اگر معلوم نہیں ہے تو سنو! ہمارے ہاں پنجاب میں فوک لوگ' لوک گیت وغیرہ گانے والے' یہ بڑے بڑے دُلا بھٹی' یہ ہیرو ہیں' ہمارے ہاں کے' قوم کے' خاص طور پہ دیہات میں رہنے والے ہیں۔ یہ لکھے پڑھے لوگ نہیں ہیں لیکن ان کے تحت الشعور میں ایک بڑی چیز ہے' جس کا مظاہرہ یہ ہے کہ ان کی واریں بنی ہوئی ہیں یعنی جیسے جنگیں لڑی ہیں' وہ بنی ہوئی ہیں۔ یہ گائے جا رہے ہیں' صدیاں گزر گئیں' گاؤں گاؤں بچہ بچہ گاتا ہے۔ یہ کون لوگ تھے؟ ڈاکو تھے' پھانسی پہ بھی چڑھے' مقابلے میں مارے بھی گئے۔

چور اور ڈاکو کے کیریکٹر میں ایک واضح فرق ہوتا ہے

ڈاکو تھے۔ ڈاکو کیا کرتا ہے؟ دوسرے کا مال چھینتا ہے۔ چور کیا کرتا ہے؟ دوسرے کا مال چھینتا ہے۔ یہ چیزیں تو ان دونوں میں مشترک ہو گئیں: ڈاکو بھی چھینتا ہے' چور بھی دوسرے کا مال چھینتا ہے۔ چور خود بھی چھپ کر کرتا ہے' چوری کہتے ہی اس لیے ہیں۔ اس کے بعد اس کا اعتراف بھی نہیں کرتا' چھپا رہتا ہے کہ کسی کو معلوم نہ ہو جائے' کبھی اعتراف نہیں کرتا' کہیں بات باہر نہیں نکالتا۔ ڈاکو

دندناتے ہوئے کرتا ہے' دن دیہاڑے کرتا ہے' ان کے گھروں کے سامنے کھڑے ہو کر کرتا ہے' کرتا چلا جاتا ہے' کبھی نہیں مکرتا' اس سے دندناتا ہوا کہتا ہے' پھانسی پہ چڑھ جاتا ہے' اس سے مکرتا نہیں ہے۔ عوام کے تحت الشعور میں بھی یہ صورت ہے کہ کردار کی یہ بلندی کہ خواہ وہ دوسرے کا مال ہی کیوں نہیں چھینتا' دندناتا ہوا چھینتا ہے'' گج وجا کے لیند اہیگا اے ❶'' مکرتا نہیں ہے' اس سے چھپتا نہیں ہے' آنکھ نیچی نہیں کرتا۔ کسی چور کے گیت نہیں گائے جاتے۔ ڈاکا بری چیز ہے' اس میں شبہ نہیں ہے عوام اس کو معاف کر دیتے ہیں لیکن یہ چیز کہ'' اوہنے گج وجا کے تے کیتا اے جو کچھ کیتا اے ❷'' اس کی ان کے دل میں قدر ہے۔ کسی چور کی مدح میں کسی نے کبھی ایک مصرع بھی نہیں لکھا' دہائی لکھی ہے' ہمیشہ لعنت ہی اس پہ بھیجی۔ جیسا میں نے کہا ہے کہ نتیجے کے اعتبار سے ری ایکشن تو دونوں کا ایک ہی تھا: دوسرے کا مال چھیننا لیکن وہ جو اس کا کیریکٹر ہے' وہ ہے ایک چیز۔ تو اتنی بڑی چیز جو تخریبی ہے' اس میں اگر کوئی شخص دیانت (Honesty) سے' گج وجا کے' دندناتا ہوا' کہتا ہے تو یہ کیریکٹر ہے۔

فرعون کی نفرت اس کی موت کا سبب بن گئی

اس کے مقابلے میں فرعون اگر موت کو دیکھ کر ایمان لاتا ہے تو خدا کہتا ہے'' اوئے فٹے منہ تیرا ❸''۔ کہا کہ **وَ اَنّٰی لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ** (34:52) انہوں اپنے آپ سے بُعد پیدا کیا' نفرت پیدا کر لی ہے اس لیے اس طرف نہیں آتے' Faith (عقیدے) کے لحاظ سے تو تمہارے قریب ہی ہیں لیکن بُعد کے لحاظ سے انہوں نے اتنی نفرت پیدا کر دی ہے کہ وہ تمہارے قریب نہیں آتے۔ **وَّ قَدْ كَفَرُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ وَ يَقْذِفُوْنَ بِالْغَيْبِ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ** (34:53) انہوں نے نفرت کی وجہ سے اپنے آپ کو اتنا دور کر دیا ہے کہ اتنے قریب ہونے کے باوجود' اتنے دور ہو چکے ہوئے ہیں' دل میں سے نفرت نکال دیں تو تمہارے بہت قریب آ جائیں۔ تو بات ان کی سمجھ میں آ جائے گی' پھر اسے قبول بھی کر لیں گے۔ اس وقت وہ انکار اور مخالفت کی راہ میں بغیر دیکھے بھالے اندھیرے میں تیر چلا رہے ہیں اور اس طرح صحیح راستے سے دور ہٹتے چلے گئے ہیں۔

تعصب اور نفرت حقیقت کو تسلیم کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے

یہ جو تعصب' عصبیت اور نفرت ہے' یہ ان کے راستے میں کھڑی ہوگئی ہے۔ **وَ حِيْلَ بَيْنَهُمْ وَ بَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ كَمَا فُعِلَ بِاَشْيَاعِهِمْ مِّنْ قَبْلُ** (34:54) جو نفرت اور تعصب سے وہ یہ کچھ کر رہے ہیں تو یہ چیز ان کے مقاصد کے حصول کے راستے میں

---

❶ علی الاعلان لیتا ہے۔

❷ یہ جو کیا ہے تو علی الاعلان کیا ہے۔

❸ تُف' لعنت تجھ پر

رکاوٹ بن جائے گی۔ کیا بات کہی ہے قرآن نے! اگر یہ کھلے دل سے علیٰ وجہ البصیرت کہتے کہ نہیں، ہم اس کو نہیں مان سکتے، ہماری سمجھ میں بات نہیں آئی، ہم اسے صحیح نہیں سمجھتے۔ کہا کہ تعصب اور نفرت کی بنا پر ہم یہ سننے کو تیار نہیں ہیں پھر یہ قریب نہیں آسکتے، ان کے درمیان اوران کے اس مقصد کے درمیان، جس کے لیے یہ کچھ کر رہے ہیں، یہی بات بُعد اور رکاوٹ بن جائے گی۔ کہا کہ پہلی قوموں کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا اوران کے ساتھ بھی یہی ہو رہا ہے تو ہمارے ساتھ بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔

شک اور ریب میں ایک بنیادی فرق ہے

عزیزانِ من! کہا کہ اِنَّهُمْ كَانُوْا فِیْ شَكٍّ مُّرِیْبٍ (34:54)۔ قرآن کی ابتدا ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ (2:2) سے ہے۔ ترجمہ کر دیا جاتا ہے کہ یہ وہ کتاب ہے جس میں شک کی کوئی بات نہیں ہے۔ اب آپ دیکھ رہے ہیں کہ شک اور ریب تو دونوں عربی کے لفظ ہیں۔ میں نے کہا ہے کہ ان الفاظ کے مرادف عربی میں ہی نہیں، ترجمہ ہم ریب کا بھی شک ہی کر دیتے ہیں۔ یہاں وہ شک مریب کہتا ہے۔ شک وہ ہوتا ہے کہ کسی چیز کے متعلق یقین نہ ہو لیکن اس کا تعلق تمہارے جذبات سے نہ ہو مثلاً یہ چیز ہے کہ صاحب! وہ گاڑی گھنٹا بھر لیٹ آئی۔ اس نے کہا کہ مجھے تو ایسا معلوم تھا کہ وقت پہ آگئی۔ آپ کو شک ہے کہ واقعی وقت پہ آئی یا لیٹ آئی، آپ کے جذبات سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، معلومات سے تعلق ہے۔ اسے وہ عربی زبان میں شک کہتے ہیں لیکن یہ بات کہ ایک خبر آئی تھی کہ تمہارا جو بھائی ہے وہ ایکسیڈنٹ میں مارا گیا ہے۔ کسی نے کہا کہ وہ نہیں تھا، کسی نے کہا کہ وہ تھا۔ اسی طرح سے آپ کو اب بھی یقین نہیں لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ اس سے آپ کے قلب کی کیا کیفیت ہے۔ جس بات سے شک سے قلب میں اضطراب پیدا ہو، اس کے لیے ریب کا لفظ آتا ہے۔ کہا ہے کہ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ (2:2) یہ وہ کتاب ہے جو تمہارے دل کے اضطرابات کو دور کر دے گی، وہ یقین ہے کہ جس سے صحیح اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ کہا کہ اِنَّهُمْ كَانُوْا فِیْ شَكٍّ مُّرِیْبٍ (34:54) ذہنی طور پر شک میں تھے اس کے بعد قلبی طور پر انہوں نے نفرت اور تعصب کے جذبات پال لیے تو وہ ریب بن گئے۔ جب شک ریب بن جاتا ہے تو پھر پہلے دل سے ان جذبات کو الگ کرنا پڑتا ہے، خالی الذہن ہو کر آنا پڑتا ہے، پھر انسان ایمان لاسکتا ہے ورنہ نہیں لاسکتا۔ اسی لیے ہم لوگ اتنا کچھ قرآن کے متعلق سنتے ہیں پھر بھی اس طرف کیوں نہیں آتے اس لیے کہ یہ ہمارا سننا اور سمجھنا ذہنی طور پہ ہوتا ہے، ہمارے دل کے اندر جو چیزیں ہیں، وہ نہیں نکلتیں۔ جب تک وہ نہ نکلیں اس وقت تک تو ایمان نہیں لاتا۔

سورۃ سبا ختم ہو گئی، عزیزانِ من! آئندہ جمعہ کو ہم سورۃ فاطر لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

سُـــوُرَةُ الفاطر

پہلا باب: **سورۃ فاطر** (آیات 1 تا 5)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج مئی 1980ء کی 2 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ فاطر سے ہو رہا ہے۔ یہ 35ویں سورۃ ہے۔ اسے سورۃ فاطر بھی کہتے ہیں اور سورۃ ملائکہ بھی کہتے ہیں۔

حمد اور حامدون کا قرآنی مفہوم

اس سورۃ کی ابتدا ہوتی ہے: **اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ** (35:1)۔ حمد کے معنی میں آپ کو بتا چکا ہوں' بار بار یہ بات آ گئی ہے: کسی خالق کا ایسا تخلیقی شاہکار' جو افادیت اور حسن' دونوں میں انتہائے کمال تک پہنچ چکا ہو' افادیت کو ذہن میں رکھیے' صرف Aesthetic Sense (جمالیاتی حس) نہیں' Utilitarian Sense (افادیتی حس) بھی اس کے اندر آتے ہیں۔ وہ تخلیقی شاہکار مفید بھی ہو اور صاحبِ جمال بھی ہو' اور وہ اس انتہا تک پہنچا ہوا ہو کہ اسے دیکھنے سے بے ساختہ زبان پر جو کلماتِ تحسین (Appreciation) آ جائیں، اسے حمد کہتے ہیں۔ وہ محسوس شاہکار ہو گا' جبھی وہ سامنے آئے گا اور وہ اس قدر جاذب' پر کشش' اس

قدر افادیت اور جمالیت سے معمور ہوگا کہ وہ آنکھ جو اسے بھانپ سکے گی' بے ساختہ اس کی زبان پر کلماتِ تحسین آ جائیں گے۔ انہیں حمد کہا جاتا ہے۔ اب آپ غور کیجیے کہ حمد کے لیے یہ دیکھنے والی آنکھیں کونسی ہونگی۔ کائنات کی ہر شے آپ کو دعوتِ نظارہ دیتی ہے اور پھر جب آپ نے اس کے افادی پہلو بھی دیکھنے ہوں' ٹھیک ہے گلاب کا جو پھول ہے' اگر آپ ذوقِ لطیف سے نوازے گئے ہیں' تو اسے دیکھنے سے آپ کے اندر تحسین کا ایک پہلو ابھرے گا لیکن اس میں تو افادیت بھی ساتھ ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ نوعِ انسانی کے لیے کتنا مفید ہے۔ کائنات کی ہر شے پر جب ان دو پہلوؤں سے تحقیق کی جائے گی' اور وہ شاہکار ہونا چاہیے ماسٹر پیس ہونا' اس کے بعد جو بے ساختہ زبان پہ آپ کے کلماتِ تحسین' جسے آپ Appreciation کہتے ہیں' آئیں گے تو اسے حمد کہتے ہیں۔ یہ کلماتِ تحسین جو یونہی آج کل ہمارے ہاں شاعری میں آ گئے ہیں' نہیں ہیں۔ کلماتِ تحسین و آفرین کی یہ جو چیز ہے جب زبان پہ یہ کلماتِ تحسین آئیں تو انہیں حمد کہا جاتا ہے۔ تعریف تو ہمارے ہاں اس کا صحیح ترجمہ نہیں ہے اور اس کا یہ ترجمہ ایک لفظ میں آپ کریں گے بھی کیا' جسے ہم انگریزی میں Praise کہتے ہیں' وہ تو عربی زبان میں مدح ہے۔ کیا بات ہے اس زبان کی! وہ ایسے مقام کے لیے حمد بولتے ہی نہیں ہیں' وہ مدح بولتے ہیں۔

بہر حال یہاں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ آیا ہے' اب سوچ لیجیے کہ یہ جو آگے بات کہی گئی ہے اس کے متعلق حمدیت کی جو شے ہے' وہ کونسے لوگ ہیں' جن کی زبان پہ یہ آئے گی۔ یہ وہ ہوں گے جو ریسرچ کریں گے' تحقیقات کریں گے' اس کے بعد انکشافات کریں گے کہ فطرت کی' خارجی کائنات کے اندر یہ جتنی چیزیں موجود ہیں' ان کا تحسینی (Appreciative) پہلو (Aesthetic) (جمالیاتی) پہلو' کونسا ہے اور ان کا افادیت (Utilitarian) کا پہلو کونسا ہے۔ ان تحقیقات کے بعد جو لوگ اس مقام پہ پہنچیں گے کہ اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی' وہ ہیں جن کو قرآن حامدون کہتا ہے۔ اس نے مومن کی ایک صفت حامدون بھی کہی ہے۔ اب الحمد للہ کہہ دینے سے تو یہ بات نہیں بنتی' حامدون اس نے کہا ہے۔ الحمد للہ پہ میں زیادہ وقت نہیں لیتا کیونکہ الحمد سے تو قرآنِ کریم کا آغاز ہوتا ہے۔ یہاں الحمد للہ خدا کی کونسی صفت ہے' جس کے لیے کہا ہے کہ حمدیت بے ساختہ زبان پہ آئے گی؟

لفظ Creation کے مقابلے میں امر اور تخلیق کا تصور

کہا ہے کہ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (35:1)۔ آپ کو معلوم ہے' یہ بات بھی پہلے آ چکی ہوئی ہے۔ ہمارے ہاں انگریزی زبان میں' اس کے لیے Creation کا لفظ ہے۔ شاید آپ کو معلوم ہوگا ایک بہت بڑا سائنٹسٹ مفکر [1] ہے اس نے لکھا ہے کہ ہمارے ہاں Creation کے لیے انگریزی میں ایک ہی الفاظ Creation ہے لیکن عربی زبان ہم سے کہیں آگے ہے۔ اندازہ

---

[1] وہ ہے پرنگل پیٹیسن۔ Pringle- Pattison, Andrew Seth (1856-1931)

لگائیے کہ دورِ جاہلیت میں ان کی زبان میں دو الفاظ تھے۔ وہ امر اور تخلیق ہیں۔ اُس نے یہ کہا تھا کہ اس کے لیے انگریزی زبان میں دوسرا لفظ نہیں ہے جو ہم بتائیں کہ اس کے معنی کیا ہیں' لغات ان کا جواب دے جاتا ہے' اس کے لیے دوسرا لفظ ہی ہمارے ہاں نہیں تو ہم کیا بتائیں کہ اس کے معنی کیا ہیں۔ اُس نے پھر کہا یہ ہے کہ کسی شے کی تخلیق کے لیے خالق کے ذہن میں پہلے ایک نقشہ آتا ہے' Plan آتا ہے' تصور آتا ہے' Imagination ہوتی ہے۔ یہ ہمارے الفاظ ہیں خدا کے لیے تو یہ الفاظ بھی استعمال نہیں کیے جاسکتے کہ اس کے ذہن میں یہ آتا ہے۔ بہرحال اس کا وہ مرحلہ جس کے اندر ابھی وہ شے ارادے کے گوشے میں ہی ہوتی ہے' اسے امر کہا جاتا ہے۔ اگر اس کا کچھ ترجمہ ہوسکتا ہے تو وہ Directive ہوتا ہے Direction ہوتا ہے' سمت مقرر کرنا' کسی چیز کا Directive پہلو ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس شے کے بننے کے لیے پہلے عالمِ امر ہوتا ہے' اس میں اس کا سارا نقشہ مرتب ہوتا ہے' Plan مرتب ہوتا ہے' اس کی Direction مرتب ہوتی ہے کہ کس طرف جانا ہے اس کی منزل مرتب ہوتی ہے اور پھر اسے وہ اس حالت میں لاتا ہے جسے تم محسوس کرسکتے ہو۔ یہ جو عالمِ محسوس میں جو کوئی شے آتی ہے تو اسے تخلیق کہتے ہیں۔ اور تخلیق درحقیقت ''خ ل ق'' ہے' اسی سے وہ اخلاق اور خلق ہے' اور یہ چیزیں تو آپ کے ذہن میں ہیں' یہ اسی مادے ''خ ل ق'' سے ہیں۔ تخلیق کے معنی ہوتے ہیں ''وہ جو چیزیں موجود ہیں' ان کو مختلف Proportion (تناسب) سے' مختلف نسبتوں سے' ملا کر مختلف چیزیں پیدا کرتے چلے جانا''۔ یہ اس کا عملِ تخلیق ہے۔ تخلیق کیا ہے؟ مختلف چیزیں جو موجود ہیں' ان کا مختلف Proportion (تناسب) سے' مختلف تراکیب سے' اس طرح امتزاج کرتے جانا کہ اب یہ چیز بن گئی' اسی سے یہ چیز بن گئی' اسی سے یہ چیز بن گئی۔ کسی پینٹر یا مصور سے پوچھیے کہ یہ جو سات رنگ ہیں' ان سے وہ کیا کیا بناتا ہے' یہ تخلیق ہے لیکن اس کے لیے پہلی چیز یہ ہے کہ وہ چیزیں موجود ہونی چاہئیں۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ چیزیں موجود کس طرح سے ہوسکتی ہیں؟

فطر اور بدع کا مفہوم اور اس کا استعمال

اب پھر عربی زبان پہ آیئے۔ یہاں بھی وہ تخلیق نہیں کہتا۔ اس زبان کے اندر اس کے لیے ایک نہیں' بلکہ دو الفاظ ہیں: ایک ہے فطر' دوسرا ہے بدع' قرآنِ کریم میں بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ہے اور خالقِ ارض وسما یہ الگ چیز ہے۔ فاطر اور بدیع کہتے ہیں کہ پہلے سے جو چیز موجود نہ ہو' اس کو موجود کردینا۔ جو موجود چیزیں ہیں' ان میں تبدیلیاں پیدا کرکے نئی نئی چیزیں بناتے چلے جانا' یہ تخلیق ہے۔ تخلیق کی چیزیں سائنس کے دائرے میں آجاتی ہیں۔ یہ چیزیں کیسے بنتی ہیں؟ وہ اس کا Analysis (تجزیہ) کرسکتے ہیں۔ نئی چیزیں بنانی ہوتی ہیں' وہ ان کا Synthesis (امتزاج) کردیتا ہے۔ سائنس یہاں تک تو آتی

ہے۔ جب وہ پیچھے جاتی ہے کہ یہ شے جس کو ہم نے لے کر اس طرح سے بنالیا مثلاً ہائیڈروجن اور آکسیجن کے دو ذرے لیے' ان کے یونٹ لیے' ان کا آپس میں امتزاج کیا' پانی کا قطرہ بن گیا۔ یہ تو ہوئی تخلیق لیکن یہ آکسیجن اور ہائیڈروجن کہاں سے آ گئی؟ یہ جو Elements (عناصر) ہیں' یہ کسی شے سے مرکب ہو کر نہیں بنے' وہ موجود ہیں' اس لیے کہ وہ شے ہے۔ اگر یہ نہ ہوں اور انہیں بنا دیا جائے تو اسے کہتے ہیں Nothingness (عدم) سے Being (وجود) میں لے آنا یعنی عدم سے وجود میں لے آنا' کچھ نہیں (Nothingness) ہے اور اسے موجود (Being) کر دینا۔

انسانی عقل خاص حد سے آگے جا ہی نہیں سکتی

یہ وہ مقام ہے جہاں پہنچنے کے بعد وہ سلیوان (Prof. Sullivan) بھی کہتا ہے کہ جہاں بڑے سے بڑا سائنسدان نیوٹن اور ایک دہقانی دونوں ایک مقام پہ کھڑے ہیں' وہ بھی نہیں بتا سکتا اور یہ بھی نہیں بتا سکتا۔ اس لیے کہ Nothingness (عدم) سے کسی چیز کا وجود (Being) میں آ جانا' سائنس یا علمِ انسانی کی حد میں آ ہی نہیں سکتا۔ اب یہ کیفیت ہے زبانِ عربی کی اور یہ ہے قرآن۔ کہا کہ **فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ** (35:1)۔ قرآن ہمیشہ **السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ** خارجی کائنات کو کہتا ہے' میں اس کا ترجمہ پستیاں اور بلندیاں کیا کرتا ہوں' یہ خارجی کائنات جسے آپ محسوس کائنات کہتے ہیں' وہ اس کا فاطر ہے' وہ اسے Nothingness (عدم) سے وجود (Being) میں لایا ہے۔ کوئی ذہنِ انسانی اسے سمجھنا تو ایک طرف' اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ کوئی شے Nothingness (عدم) سے وجود (Being) میں بھی آ سکتی ہے لیکن ہے موجود۔ یہ تحقیق کرتے ہوئے' جب پیچھے جاتے ہیں اور وہاں پہنچ کر کھڑے ہو جاتے ہیں کہ اس سے آگے ہم جا نہیں سکتے کہ یہ کس طرح سے موجود (Being) ہو گئی۔ کہا ہے کہ **فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ** (35:1)۔ اب کہیے کہ الحمد کہنے والا کوئی نیوٹن ہوگا۔ عمر بھر کی تحقیقات کے بعد جتنی تخلیقی چیزیں تھیں' ان کے متعلق تو وہ ان کا Analysis (تجزیہ) کرتا چلا گیا اور آخر میں جا کر ان چیزوں کے اوپر پہنچ گیا' جن کے Synthesis (امتزاج) سے یہ چیزیں وجود میں آئیں اور وہاں پہنچنے کے بعد وہ کھڑا ہو جاتا ہے کہ وہ ذات جو اس چیز کو وجود (Being) میں لے آیا' وہاں وہ کہتا ہے کہ اس ذات کا تصور ہمارے حیطۂ علم میں نہیں آ سکتا۔ وہ ہے **فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ**۔

کائنات کو عدم سے وجود میں لانے کے بعد بغیر کسی وقفہ کے نت نئے اضافے

اس کے بعد آگے ہے کہ **جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِیْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ** (35:1)۔ یہ دیکھیے خلق کا لفظ یہاں آ گیا' پہلا فاطر ہے اور یہاں خلق کا لفظ ہے' درمیان کی بات میں بعد میں کروں گا۔ قرآن کریم نے کہا

ہے کہ یَزِیۡدُ فِی الۡخَلۡقِ مَا یَشَآءُ (35:1)۔ وہ اس طرح سے ان چیزوں کو وجود میں تو لے آیا' اب اس کے بعد ان میں سے جو نئی نئی چیزیں بنتی چلی جا رہی ہیں' وہ کہتا ہے کہ یہ کائنات ایک دفعہ عدم سے وجود میں لانے کے بعد' پھر وہ بیکار نہیں بیٹھ گیا کہ چلو' یہ کام تو میں نے کر دیا' اب باقی جتنا ہے یہ انسان کرتے جائیں۔ ذہنِ انسانی نے تو یہی سمجھا تھا۔ محرف تورات کے جو بنانے والے تھے' ان کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی۔ انہوں نے تو کہا تھا کہ چھ دن میں خدا نے اس کائنات کو بنایا یعنی پہلے تو کائنات کو بنایا اور وہ بھی دنوں میں' کائنات ہی نہیں تھی تو دن کہاں سے آ گئے۔ ایک یہ بھی مبینہ الہامی کتابیں ہیں' شروع ہی یہاں سے ہوتا ہے کہ چھ دن میں اس نے اس کائنات کو بنایا اور اس کے بعد خدا تھک گیا تو ساتویں دن اس نے چھٹی کی۔ یہ جو Holiday ہے یعنی مقدس دن' یہ خدا کے سونے کا دن ہے۔ تھک گیا اور خدا سو گیا۔ جسے سبت کہتے ہیں۔ سبت کے معنی ہی یہ ہیں ''جب کاروبار بند کر دیا جائے اور اس دن ناغہ کر دیا جائے''۔ خدا سو گیا تو ساتواں دن سبقت کا دن ہے۔ یہ جو یہودیوں کے ہاں Saturday کا دن ہے' عیسائیوں کو چونکہ یہودیوں سے بڑی دشمنی تھی تو ان کی صورت یہ تھی کہ جو شے ان کے ہاں کی ہے' ان سے علی الرغم انہوں نے اپنے ہاں کوئی چیز کر لی مثلاً وہ اگر خنزیر کو حرام سمجھتے ہیں تو یہ کہیں کہ ہم کھائیں گے صاحب! انہوں نے کہا کہ ان کے ہاں Saturday ہے' تو یہ بات لمبی چلی جائے گی' دورِ جاہلیت میں یہ لوگ انہی چیزوں کی' چاند کی' اور سورج کی' اور دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنے ہاں وہ جو سبت تھا' وہ Saturday کے بجائے Sunday رکھ لیا۔

قرآنِ حکیم کے احکام کے برعکس ہمارے ہاں جمعہ کے روز چھٹی کا تصور

ہم نے بھی جمعہ کے متعلق کچھ اسی قسم کا تصور ذہن میں رکھ لیا۔ خدا نے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ سونے کا دن ہے' وہ چھٹی کا دن ہے۔ خدا نے تو اتنا ہی کہا تھا کہ اِذَا نُوۡدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنۡ یَّوۡمِ الۡجُمُعَۃِ فَاسۡعَوۡا اِلٰی ذِکۡرِ اللّٰہِ وَ ذَرُوا الۡبَیۡعَ (62:9) جب آواز دی جائے اجتماع کے لیے جسے آپ نمازِ جمعہ کہتے ہیں' اس وقت سارا کاروبار چھوڑ کر اس طرف آ جاؤ' تو گویا اس نے جمعہ سے پہلے کاروبار کا ذکر کیا ہے۔ قرآن میں ہے کہ کاروبار چھوڑ کر آ ؤ اور جب نماز ختم ہو جائے تو پھر کاروبار میں جا لگو لیکن ہمارے ہاں تو وہی جو کچھ باقی مذاہب میں ہوتا ہے' اسی کو ہم لے لیتے ہیں۔ ایک جمعہ بنایا چھٹی کی۔ اب اس کے بعد بحثیں چل رہی ہیں کہ اتوار کی چھٹی نہیں' جمعہ کی چھٹی ہو' مذہب کا تقاضا جمعہ کی چھٹی ہے حالانکہ سارے دن خدا کے دن ہیں۔

کائنات کے متعلق ہندوؤں کا تصورِ حیات

بات یوں نکلی تھی' میں کہہ رہا تھا کہ یہودیوں نے تورات میں اس سے ابتدا کی کہ چھ دن میں کائنات بنائی' ساتویں دن سونے کی

بات تھی۔ ہندوؤں کے ویدوں نے اور پرانوں میں تو پوچھو ہی نہیں اس سے بھی پیچھے گئے ہوئے ہیں ان کے ہاں تو کہا ہوا ہے کہ یہ سارا کچھ جو ہے وہ جو ایشور ہے وہ سویا ہوا ہے اور یہ خواب دیکھ رہا ہے جو کچھ یہ بنا ہوا ہے یعنی یہ اس کا خواب ہے جب وہ جاگ اٹھے جب آنکھ کھل گئی "نہ زیاں تھا نہ سود" تھا تو پھر یہ کچھ بھی نہیں رہے گا۔ "اللہ کرے او ہدی اکھ نہ ای کھلے۔ ملاحظہ فرماؤ۔ ککھ وی نہ رہیگا ❶"۔ یہ اندازہ لگایئے کہ خدا کے پیغمبروں نے تو دین دیا تھا پھر ذہنِ انسانی ان کو اپنی اپنی سطح کے اوپر کس طرح لے آیا ہم بھی لے آئے ہوئے ہیں۔ اب یہ جو درمیان کی چیز ہے کہ یَزِيدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ (35:1) سو نہیں گیا بیکار نہیں ہو گیا تھک نہیں گیا (معاذ اللہ)۔ اس کے متعلق تو یہ ہے کہ لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ (2:255)۔ نیند تو ایک طرف اس کو تو اونگھ بھی نہیں آتی وہ تو اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ (2:255) ہے اور یہاں ہے کہ يَزِيدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ (35:1) اپنے قانونِ مشیت کے مطابق اب یہ جو تخلیقی کائنات ہو گئی اس کے اندر وہ اضافے کرتا رہتا ہے۔ کیا خوبصورت انداز میں باتیں کر گیا ہے!

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

(غالب)

کائناتی کنٹرول کے سلسلہ میں خدا تعالیٰ کے قائم کردہ نظم و ضبط کی شکل و صورت

قرآن حکیم نے بتایا ہے کہ يَزِيدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ (35:1)۔ آج کے سائنسدان عزیزانِ من! اس مقام پہ پہنچ کر Universe (کائنات) کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ The Expanding Universe ❷ (پھیلتی ہوئی کائنات) ہے۔ یعنی يَزِيدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ. یہ Universe (کائنات) پھیل رہی ہے۔ اب یہ کچھ ہو کیسے رہا ہے؟ یہ ہے سمجھنے کی بات۔ قرآنِ کریم میں اس کے لیے ایک لفظ ملائکہ ہے۔ ہمارے ہاں تو اس کا ترجمہ فرشتہ ہے۔ یہ تو فارسی زبان کا لفظ ہے وہ جو فرستادہ ہے اس کو ذرا سا موڑا اور فرشتہ بنایا۔ یہ ایرانی لفظ ہے ہمارے ہاں بھی فرشتہ ہی کہتے ہیں۔ انسانی ذہن اور اسی قبیل کی یہ جتنی چیزیں ہیں ان کو Abstract (بسیط) کہتے ہیں۔ انگریزی میں یہ وہ چیزیں ہیں جو محسوسات کے دائرے میں نہ آئیں۔ یہ محسوسات وہ ہیں جو آپ کے Physical Senses (طبعی حواس) میں آ جائیں۔ یہ ہیں جن کو آپ حواسِ خمسہ کہتے ہیں۔ یہ چھونا، دیکھنا، سننا، سونگھنا، چکھنا حواسِ خمسہ ہیں۔ جو چیز

---

❶ خدا کرے اس کی آنکھ نہ کھلے۔ ملاحظہ فرماؤ (کہ اگر کھل گئی تو) کچھ بھی نہیں رہے گا۔

❷ یہ ایڈنگٹن، سر آرتھر ایس کی کتاب کا بھی نام ہے: (The Expanding Universe (1933))

ان کے دائرے میں آ جائے وہ تو محسوس کہلاتی ہے' وہ Perception ہوتی ہے اور جو ان کے دائرے میں نہ آئے تو اس کے متعلق ذہن میں ایک تصور' Imagination' ایک خیال' ایک نظریہ' سا ہی آ سکتا ہے۔ اسے Abstract (بسیط) کہتے ہیں مثلاً توانائی بلکہ یوں کہیے کہ Electricity (بجلی) پہ جو Electrified Objects (برق بردار اجسام) ہوتے ہیں' جن کے اندر بجلی ہوتی ہے' یوں کرو اور یوں ہوتا ہے' وہ تو ہمیں پتہ ہوتا ہے مگر یہ خود بجلی (Electricity) کیا ہے' اس کا کچھ پتہ نہیں ہے۔ یہ ایک انرجی ہے۔ دو چیزوں کی Friction (رگڑ) سے اس میں کیا چیز پیدا ہو جاتی ہے' کوئی آج تک نہیں بتا سکا۔ یہ ایک قوت ہے جو Abstract (غیر محسوس) ہے۔ قوت مختلف چیزوں کے اندر اپنا مظاہرہ کرتی ہے۔ پنکھا چل رہا ہے' وہ کہتے ہیں کہ بجلی چل رہی ہے' بند ہو گیا تو کہتے ہیں کہ بجلی فیل ہو گئی۔ پنکھا نہ ہو ہمیں معلوم ہی نہیں ہو سکتا کہ یہاں بجلی ہے' آپ کے ہاں ریڈیو نہ ہو' آپ کے ذہن میں نہیں آ سکتا کہ سات ہزار میل سمندر پار سے بولنے والے کی آواز' میرے کمرے کے اندر گونج رہی ہے۔ میں یہ ذرا نیچے کی سطح پر مثالیں دے رہا ہوں۔

وہ Abstract (غیر محسوس) چیزیں جو محسوسات کا پیکر اختیار کرنے سے ناآشنا ہیں

جو اس قسم کی Abstract (غیر محسوس) چیزیں ہیں' وہ محسوسات کے دائرے میں نہیں آتی ہیں' وہ اپنا کوئی محسوس پیکر اختیار کرتی ہیں تو پھر ہمارے سامنے آتی ہیں' ورنہ نہیں آتیں۔ مثلاً: خیال' اجی صاحب! دور کیوں جایئے یہ آپ کی جان' کیا کبھی دیکھی ہے' جیسے ہائے! یہ خبر سن کر میری تو جان نکل گئی۔ پوچھو کہ کیسے پتہ چلا ہے؟ یا مثلاً' جان میں جان آ گئی' یہ ''جان'' ایک لفظ ہے' کچھ معلوم نہیں یہ ہوتا کیا ہے اور پھر جب آپ کہتے ہیں 'میری جان' ' ایک تو وہ جان کا ہی پتہ نہیں ہے' میری کس کی' میں کون؟ میرا ہاتھ' میری آنکھ' میرا پاؤں' میں نے کہا' میں نے سنا۔ صاحب! یہ ذرا بتا دیجیے کہ یہ میں کون ہے؟ سارے جسم کو تو آپ نے کہا: میرا ہاتھ' میرا پاؤں' میری آنکھ' تو ''میں'' نہیں ہے۔ میں نے کہا' آواز تو آئی' آپ کی زبان سے یہ بات نکل گئی مگر یہ میں کون ہے؟ آپ جانتے ہی نہیں ہیں' کوئی بھی نہیں جانتا۔ ساری عمر کہتے چلے جاتے ہیں اور زندگی کا سارا دارومدار ہی اس میں ہے مثلاً میں نے اس سے روپیہ لینا ہے' میں نے اس سے یہ کیا تھا' میں نے وعدہ کیا تھا حتیٰ کہ یہ بہت مقدس رشتہ جو میاں بیوی کا ہے' وہ بھی یہ ہے کہ میں نے اس سے نکاح کیا تھا۔ یہ میں کون تھا۔ غور کیجیے یہ تصوراتی دنیا ہے۔ ہم روز بولتے ہیں' اس کے باوجود کچھ مانتے ہیں کہ ہے مگر یہ ہے کیا؟ یہ بڑا اہم سوال ہے۔

غیر محسوس چیز کو محسوس شکل میں دیکھنے کی تڑپ

ملائکہ اور خود ذاتِ باری تعالیٰ' محسوس شکل میں تو سامنے نہیں آتے تصور میں ہی آتے ہیں۔ تصور تو ہر ایک کا الگ الگ ہوتا ہے۔ ذہنِ انسانی جب ابھی عہدِ طفولیت میں تھا' وہ ہر چیز جو تصور میں آتی تھی' اس کو محسوس شکل کے اندر چاہتا تھا۔ یہ دیوی دیوتا' جو بتوں کی شکل

کے اندر آپ کو نظر آتے ہیں، ہندوؤں کے مندروں میں یہ انسان کی وہی جوخواہش ہے کہ وہ جو تصوراتی چیز ہے، وہ محسوس شکل میں سامنے آئے، یہ اس کی وجہ سے یہ کچھ بنائے ہیں۔ اور دنیا کی ہر قوم نے اس دور میں جس دور میں، وہ گزر رہی تھی، طفولیت کے زمانے میں، ہر قوم نے محسوس پیکر کے اندر، اپنے دیوی دیوتاؤں کو بلکہ خدا کو بھی بنایا ہے، انسانوں کو بھی خدا بنایا، جنہیں آپ اوتار کہتے ہیں۔ مسیح کو انہوں نے خدا بھی کہا اور خدا کا بیٹا بھی کہا تو یہ وہی انسان کی وہ جو تڑپ سی ہے کہ جو محسوس شکل میں سامنے نہیں آتا، کسی طرح محسوس شکل میں آ جائے، یہ وہ تڑپ ہے۔ یہ وہ ہے جسے اقبالؒ (1938-1877ء) نے اس انداز میں ظاہر کیا ہے کہ

کبھی اے حقیقتِ منتظر! نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

تو لباسِ مجاز میں دیکھ کر ہی تو سجدہ کرے گا۔

محسوسات کی دنیا میں حضرت انسان کا مقام تو کہیں زیادہ بلند ہے

محسوسات کا خوگر انسان لباسِ مجاز میں دیکھ کر ہی سجدہ کرتا ہے اور قرآن انسان کو اس سے اونچا لے جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ قانون کو سمجھ، نظریئے کو سمجھ، یہ جتنی چیزیں غیر محسوسات ہیں، ان کے پیچھے محسوسات کے کل کو سمجھ اور پھر اگر تو نے سجدہ کرنا ہے تو اس کو سجدہ کر جس نے غیر محسوسات کو بھی بنایا اور محسوسات کو بھی بنایا اور خود ان سے بھی بلند ہو گیا۔ **فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ** (35:1)۔ محسوسات کو دیکھ کر سجدہ کرنا تو ذہن کی پستی کی علامت ہے۔ جسے آپ Appreciation (تحسین) کہتے ہیں، Aesthetic Sense (جمالیاتی حس) کہتے ہیں، محسوس شکل میں جسے آپ بتا نہیں سکتے مثلاً مجھے وہ بہت اچھا لگتا ہے، پھول کی وہ رنگینیاں، ان پتیوں کی وہ نزاکتیں، کیوں آپ کے ذہن میں بشاشت پیدا کرتی ہیں؟ آپ اسے Explain (واضح) ہی نہیں کر سکتے۔ موسیقی کا صحیح سُر جو ہے آپ کے اندر ایک کیفیت پیدا کر دیتا ہے، آپ اسے Explain (واضح) ہی نہیں کر سکتے، محسوس ہوتا ہے۔ یہ جو سطح ہے، قرآنِ کریم انسان کو اس سطح کے اوپر لے جاتا ہے لیکن جب اس نے وہ بات کرنی ہے تو محسوسات کی سطح پہ کرنی ہے۔ مثلاً خدا نے یہ کہا کہ جہاں تم ہو، خدا تمہارے ساتھ ہوتا ہے، خدا کو پکارو وہ سنتا ہے لیکن اس کے باوجود خدا کے متعلق وہ یہ بھی کہتا ہے کہ وہ تمہارے تصورات سے بھی بلند ہے۔

قرآنِ حکیم کے ارشاد کے برعکس انسانی ذہن فرشتوں کو بھی محسوس شکل میں دیکھنے کا عادی ہے

ملائکہ کی بات ہے کہ **جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا** (35:1)۔ محسوسات کے خوگر انسان نے ان کو بھی محسوس شکلوں میں دیکھا۔ قریباً قریباً دنیا کے ہر مذہب والی قوم کے اندر فرشتوں کا تصور ہے۔ ان کو وہ دیوی دیوتا کہتے ہیں، ایران والے ان کو فرشتہ کہتے ہیں، انگریزی

زبان والے ان کو Angel بھی کہتے ہیں، ہمارے ہاں بھی ان کو فرشتہ ہی کہتے ہیں، عربی میں ان کو ملائکہ کہتے ہیں لیکن محسوس شکل میں دیکھتے ہیں۔ جو عربِ جاہلیت تھے، وہ بھی فرشتوں کو محسوس شکل میں دیکھنے کے عادی تھے، دیوی دیوتاؤں کی شکل میں ان کو رکھا ہوا تھا، ان کی بھی پرستش کرتے تھے۔ قرآنِ کریم نے ان کے متعلق پہلی چیز جو کہی ہے وہ یہ ہے کہ لم تروھا (9:26) تم انہیں دیکھ نہیں سکتے تو گویا ان کا وجود بتایا کہ وہ محسوسات کے اندر نہیں آتے۔ وجود ہے، وجود تو ایٹم کا بھی موجود تھا جب سے کائنات بنی ہے، مگر ہماری محسوسات کی دنیا میں نہیں آرہا تھا، اب بھی اس کی توانائی کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ **لم تروھا** (9:26) نے مسئلہ حل کر دیا، عزیزانِ من! ملائکہ کا ذکر وہ کرتا چلا جاتا ہے، ان کے Functions (افعال) بتاتا ہے، خصوصیات بتاتا ہے، صفات بتاتا ہے اور لم تروھا کہتا ہے کہ تم ان کو دیکھ نہیں سکتے۔

سائنس کی اس قدر ترقی کے باوجود انسان Cause & Effect (علت ومعلول) سے آگے نہیں پہنچا

وہ جو جاہلیت کی سطح کا ذہن تھا کہ لباسِ مجاز میں دیکھنا چاہتا تھا، قرآن اسے وہاں سے اونچا لے گیا، کہ ان کے فنکشن تو مانو، تم ان کو دیکھ نہیں سکتے، اس لیے کہ ذہنِ انسانی جتنا اونچا ہوتا چلا جائے گا، وہ محسوسات سے بلند غیر محسوسات کی طرف چلتا چلا جائے گا۔ فکرِ انسانی، تصورِ انسانی، نظریۂ انسانی، یہ ساری غیر محسوس چیزیں ہیں اور دانشور یا بلند فکر کا انسان تو آپ اسے کہتے ہیں، جو اس قسم کی چیزوں میں ہو، ورنہ محسوسات کی فکر میں الجھا ہوا تو یونہی گدھا چلانے والا اور ہل چلانے والا بھی ہوتا ہے۔ سائنس کی دنیا بھی اس قدر ریسرچ کے باوجود معلوم کیا کرسکی؟ کچھ نہیں۔ اس کے نزدیک تو "Cause & Effect" بہت بڑی چیز ہے یعنی جو کچھ ہوتا ہے، وہ کس وجہ (Cause) سے Effect ہوتا ہے، وہ Cause ہوتا ہے اور جو ہوتا ہے، وہ Effect ہے۔ پتیلی میں پانی ڈال لیجئے آگ پہ رکھیے ایک خاص ٹمپریچر پہ جا کر وہ کھولنے لگتا ہے تو حرارت اس کا Cause ہے اور Effect پانی کا کھولنا ہے، اس کے بعد اس کا بھاپ بن جانا ہے۔ یہ چیز سائنس نے محسوسات کی دنیا کے اندر، کائنات کے اندر، بیشتر چیزوں کے متعلق معلوم کر لیا ہے کہ اس Effect کا Cause کیا ہے اور یہ بہت بڑی چیز ہے۔ اس سے انسان کے بڑے مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ مثلاً چیچک کیوں ہوتی ہے؟ کیونکہ اس قسم کے Germs (جراثیم) پیدا ہو جاتے ہیں، Germs (جراثیم) کو تلف کر دیجیے اس کو آرام ہو جاتا ہے۔ Cause & Effect (علت ومعلول) سے علمِ انسانی وسیع سے وسیع تر ہوتا ہے۔ جسے ہم Materialist (مادہ پرست، مادیین) کہتے ہیں، وہ صرف اتنا ہی مانتا ہے کہ یہ مادی چیزیں ہیں، جو ہو رہا ہے، وہ یہیں ہے، وہ اپنی ریسرچ کو حدِ کمال سمجھ رہا ہے کہ ہم نے Effect کا Cause معلوم کر لیا ہے۔ آپ حیران ہوں گے کہ انہی کے ہاں یہ مسئلہ بھی ہے کہ صاحب! یہ بات تو ہم نے معلوم کر لی کہ اتنی ڈگری پہ پہنچ کر پانی کھولنے لگ جاتا ہے، بھاپ بن جاتا ہے، بار بار ہم نے تجربہ کیا، ہر بار یہی معلوم ہوا، قانون اس کو کہتے ہیں۔ وہ جو ایک Definition (تعریف) میں دیا کرتا ہوں، وہ تو اب بڑی جامع

Definition (تعریف) ہے' انہی لوگوں کی دی ہوئی ہے' وہ If-Then-Always ہے۔ If (اگر) پانی کو آگ پہ رکھو Then (تب) وہ بھاپ بن جائے گا' Always (ہمیشہ) ایسا ہوگا۔ جب یہ Alwyas (ہمیشہ) ہو جاتا ہے تو اس کو Law یا قانون کہتے ہیں۔ جسے Laws of Nature (قوانینِ فطرت) کہتے ہیں' وہ انہوں نے اپنے ہاں مشاہدے سے دیکھا کہ ایسا کیا جائے' ایسا ہوتا ہے' ایسا کیا جائے ایسا ہوتا ہے' ہمیشہ ایسا ہوتا ہے۔ گیہوں کا دانہ تخم جو ہے' اس کو بو دیجیے' اس کے بعد یہ زمین اچھی ہونی چاہیے' پانی ہونا چاہیے' ہوا ہونی چاہیے' سورج ہونا چاہیے' تو اس میں سے پھر بالیں پڑتی ہیں اور گیہوں پیدا ہوتا ہے۔ تجربے نے اس چیز کو بتا دیا کہ جس کو انہوں نے کہا کہ یہ Law of Nature (قانونِ فطرت) ہے کہ ایک بیج سے یہ کچھ پیدا ہوتا ہے۔ یہ قانون ہے۔ میں نے کہا ہے کہ پانی اس ٹمپریچر کے اوپر جا کر بھاپ بن جاتا ہے۔ یہ اس کا قانون ہے۔

جو قوت پانی کو بھاپ اور برف بنا دیتی ہے قرآن حکیم نے اسے ملائکہ کہا ہے

وہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صاحب! پانی اتنی حرارت کے بعد بھاپ کیوں بن جاتا ہے۔ کوئی صاحبِ تحقیق یہ نہیں بتا سکتا۔ بن جاتا ہے یہ بات تو ان کے مشاہدے میں آ گئی۔ یہ حرارت اسے بھاپ میں کیوں تبدیل کر دیتی ہے؟ یہ نہیں بتا سکتے۔ وہ بھاپ ہی کیوں بنتا ہے برف کیوں نہیں بنتا؟ وہ اگر چار ڈگری نیچے چلا جائے تو وہ برف بن جاتا ہے' وہ ٹھوس ہوتا ہے۔ اپنی حالت پہ پانی ہو تو نشیب کی طرف بہتا ہے' آپ پی بھی لیتے ہیں۔ وہ بھاپ بنتا ہے تو وہ پانی نہ پینے کے کام آتا ہے' برف بنتا ہے تو وہ تو پوچھو نہیں' وہ ڈلا سر پھوڑنے کے کام تو آ جائے گا۔ یہ کیوں ہوتا ہے کہ اس حرارت سے وہ بھاپ بنتا ہے' اس انجماد پہ وہ برف بن جاتا ہے' ٹھوس بن جاتا ہے؟ یہ قانون تو تم نے دیکھ لیا کہ اتنی ڈگری پہ پانی پہنچے تو یہ ہو جاتا ہے۔ یہ قانونِ فطرت تو ٹھیک ہے مگر یہ کیوں ایسا ہوتا ہے' کوئی سائنس یہ نہیں بتا سکتی۔ ابھی تک اس کیوں کا ہمیں پتہ نہیں چلا۔ یہ جو اس طرح سے ہوتا ہے کہ حرارت پانی کو یوں اس طرح تبدیل کر دے قرآن کہتا ہے کہ تم تو یہ کہتے ہو کہ At Random (اتفاقیہ) ہو جاتا ہے' ہمیں پتہ تو نہیں۔ کہ جی بس ہو جاتا ہے' آگ یہ کر دیتی ہے۔ وہ کہتا ہے' آگ یہ نہیں کر دیتی' اس کو یہ کرنے کے لیے ہمارے ہاں کی اور قوتیں کارفرما ہوتی ہیں۔ انہیں وہ ملائکہ کہتا ہے جنہیں تم دیکھ نہیں سکتے۔

عربی زبان میں ملائکہ کا یہ لفظ کس طرح تشکیل پایا

عزیزانِ من! دو باتیں میرے ذہن میں آئیں' یہ پوچھیے نہیں کہ جب یہ اپنے ذہن میں آتا ہے تو آدمی وجد میں آ جاتا ہے۔ یہ ملائکہ کا لفظ بنا کس طرح تھا؟ عربی زبان میں جو Roots (مادے) ہوتے ہیں' جن کے معنی لیے جاتے ہیں' ان کے اندر بعض ایسے الفاظ آتے ہیں جن کے ایک سے زیادہ Roots (مادے) ہوتے ہیں۔ ملائکہ کے دو Roots (مادے) ہیں' ایک تو ''ا ل ک'' ہے اور ایک ''م

ل ک‘‘ ہے یعنی ملک۔ ملک تو ہوتا ہے قوت اور الک (ال ک) ہوتا ہے پیغام پہنچانا Communicate کرنا۔ یہ دونوں چیزیں ہوتی ہیں، جس کو آپ ملک یا ملائکہ کہتے ہیں۔ یہ Communicate کرنے کا مسئلہ بڑا اہم مسئلہ ہے۔ عام الفاظ میں تو یہ کہیے کہ آپ نے ایک بیج مثلاً آم کی گٹھلی کا بودیا۔ اب وہ آم کی گٹھلی میں سے پہلے ایک شگوفہ نکلتا ہے' پودا بنتا ہے۔ اس کے ساتھ آپ نے جامن کا بھی بودیا' اس میں سے بھی اسی قسم کا ایک شگوفہ نکل رہا ہے' نکلنے کے بعد اس کے پتے کچھ مختلف ہوتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ جو چیز اس بیج پر تھی اس کے لیے کسی سے کہا کہ ایسے پتے بنانا' ایسی شاخیں بنانا' اس کے اندر اس قسم کا پھل لگانا، جامن میں اس قسم کا لگانا' اس میں ایسی خوشبو پیدا کرنا اس میں ایسا ذائقہ پیدا کرنا اس میں ایسی خاصیت پیدا کرنا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ جو پیغام ہے' ہماری قوتیں ان کو یہ پیغام پہنچاتی چلی جاتی ہیں کہ تم نے ایسا کرنا اور ایسا کرنا۔ ملائکہ کی یہ صفت ہے۔ کہا کہ **لم تروھا** (9:26)۔ ہمارے عالمِ محسوسات کی گرفت میں یہ بات نہیں آسکے گی۔ لیکن یہ At Random (اتفاقاً) نہیں ہوتا۔ کہتا ہے کہ اگر وہ ہنگامی طور پہ ہوتا تو کبھی جامن کی گٹھلی میں سے کیکر پیدا ہوجاتا' کبھی تم نے آم بویا ہے' تو انگور ہی لگنے شروع ہوجاتے۔ کہتا ہے کہ یہ اتفاقیہ نہیں ہوتا۔ یہ ہمارے Messages (پیغامات) ہوتے ہیں، جو وہ ان تک پہنچائے چلے جاتے ہیں۔

اہلِ یورپ کے مفکرین کے نزدیک ایک اہم سوال

Message (پیغام) کے مسئلے کے بغیر قرآن کی بات سمجھ میں ہی نہیں آتی۔ آج کل ایک بڑا اہم سوال مفکرینِ یورپ کے زیرِ بحث ہے۔ وہ یہ ہے کہ ایک تو جسمِ انسانی ہے۔ دوسرا اس کے اندر ایک اور چیز ہے' جسے وہ Mind کہہ دیتے ہیں' Self کہہ دیتے ہیں' آپ اسے خودی کہیے' نفسِ انسانی کہیے' کچھ بھی کہیے' وہ اس Body (جسم) سے الگ کوئی شے ہے اور اس جسم کا حکمران وہی ہے۔ مثلاً فیصلہ کرتا ہے کہ اس کو ذرا Touch کرکے دیکھ لو۔ میں کیا فیصلہ کرتا ہوں؟ میرا ہاتھ تو یہ فیصلہ ہی نہیں کرتا' جسم کا کوئی حصہ فیصلہ نہیں کرتا' یہ کچھ اور ہے جو فیصلہ کرتا ہے۔ وہ فیصلہ کرنے کے بعد بڑی تیزی سے اندر سے کام کرتا ہے' اس کا اندر پتہ نہیں ہے۔ یہ Botany (نباتیات) جاننے والے جانتے ہیں کہ اندر کتنے Changes (تغیرات) ہوتے ہیں' جو ہاتھ وہاں تک پہنچ کے یوں کرتا ہے' کبھی یوں کرتا ہے' کبھی پانی کا گلاس اٹھا کر پیتا ہے' کبھی اس کو اٹھاتا ہے۔ وہ اندر سے اتنی تیزی سے کوئی فیصلہ کرتا ہے' جس کی رفتار کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا کہ جو میرے مائنڈ (Mind) کا فیصلہ ہے' یہ کیا چیز ہے جو Communicate (ابلاغ) کرتی ہے کہ ہاتھ کو کہو کہ یہ کرو۔ یہ جو Communicate (ابلاغ) کرنے والی چیز ہے' اس کے متعلق ابھی تک مفکر کچھ نہیں سمجھ سکے' سائنس تو ادھر ختم ہی ہوگئی تھی کہ وہ Physical (طبعی) تھا ہی نہیں۔

کائنات کے ذرّے ذرّے کے علاوہ انسانی پیکر کو حکم دینے والے اس فنکشن (عمل) کو قرآن نے ملائکہ کہا ہے

فزیکل سائنس تو یہ نہیں بتا سکی کہ یہ جو میں نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ پانی کا گلاس اٹھانا ہے یا اس کے طمانچہ مارنا ہے' تو یہ تو Physical Body (طبعی جسم) کی بات ہی نہیں۔ اس نے کسی کا حکم ماننا ہے۔ وہ حکم دینے والا کون ہے؟ وہ بھی کہتے ہیں کہ چلو پوچھتے ہیں لیکن وہ حکم اس کو کون پہنچاتا ہے' اس کو کیسے پہنچتا ہے کہ میں نے گلاس اٹھانا ہے' میں نے مکا مارنا ہے' یہ چیز ہاتھوں کو کون بتلاتا ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ Communicate (ابلاغ) کرنے والی اندر ایک قوت ہے' جسے ہم نہیں سمجھ سکے۔ قرآن کہتا ہے کہ انہی کو ہم ملائکہ کہتے ہیں جنہیں **لَمْ تَرَوْهَا** (9:26) تم دیکھ نہیں سکے۔ اس محسوس کائنات کے اندر اس کی جو کارفرمائی ہے وہ ساری ان قوتوں کے ذریعے ہے جو خدا نے پیدا کر رکھی ہیں' جو ہمارے محسوسات کے دائرے میں نہیں آتیں۔ یہ ہیں جنہیں وہ ملائکہ کہہ کر پکارتا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ ملائکہ کے لفظ کے بنیادی معنی کے اندر ہی یہ Communication یعنی پیغام رسانی محفوظ ہے' قرآن حکیم نے اس کے ساتھ **اَلْمَلٰٓئِكَةَ رُسُلًا** خاص طور پہ کہہ دیا کہ یہ ان کی خصوصیت ہے۔ یہاں جواب بیان کر رہے ہیں۔

ہمارے ہاں فرشتوں کے لیے محسوس تصور کی بنیاد

اب یہ جو تیزی سے پہچانے والی چیز تھی اس کے سمجھانے کے لیے کہا کہ **اُولِیْٓ اَجْنِحَةٍ** (35:1)۔ یہاں **اَجْنِحَةٍ** آیا ہے' اس کا واحد **اَلْجَنَاحُ** ہے' جہاں سے ہم نے فرشتوں کا سارا محسوس تصور لیا۔ جنحہ ''کسی شے کے دونوں سائیڈز' جانبین' ادھر کا ادھر کا کو کہتے ہیں''۔ اسی لیے انسان کے جو دونوں بازو ہیں' ان کو بھی **جَنَاحُ** کہتے ہیں' پرندوں کے دونوں پروں کو بھی کہتے ہیں' ہر وہ چیز جس کے سہارے سے' جس کے ذریعے سے' آدمی یہ کچھ کرتا ہے بشرطیکہ وہ دونوں جانب ہوں' ان کو یہ **جَنَاحُ** کہتے ہیں' خود حفاظت کو بھی یہی چیز کہتے ہیں۔ **انا فی جناحه** کے معنی ہیں ''میں اس کے سائے اور حفاظت میں ہوں یعنی اس نے میرے سر پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا' دستِ شفقت پھیر دیا۔

لفظ اَجْنِحَةَ کا قرآنی مفہوم

نبی اکرم ﷺ کے متعلق ہے کہ **وَ اخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ** (15:88)۔ **اَجْنِحَةٍ** کے معنی یہاں ''پر'' نہیں ہوگا کہ اپنے پَر ان کے اوپر رکھنا۔ یہ اپنے رفقا کے سر پہ دستِ شفقت رکھنا ہے اور **اَجْنِحَةٍ** کے لفظ سے تو ہمیں خود معلوم ہو گیا کہ ان کو اپنی حفاظت میں رکھنا۔ ایک تو الفاظ کے محسوس معنی ہوتے ہیں یا Literal Meaning ہوتا ہے' اس کے ساتھ ہی اس کے مجازی معنی بھی تو ہوتے ہیں'

خود جو ہمارے ہاں لفظِ ہاتھ ہے' آپ دیکھتے ہیں کہ اس کے کتنے مجازی معنی ہیں مثلاً ذرا میرے ہاتھ میں تو آئے' یہ میرے بائیں ہاتھ کا کام ہے' تو یہ فزیکل (جسمانی) پنجے والے ہاتھ کے معنی نہیں ہوتے' مجازی معنی ہوتے ہیں۔ جَناح کے معنی ہوتا ہے''حفاظت والی چیز' وہ شے جو کسی کو اپنی حفاظت میں لے لیتی ہے' قوت جو حفاظت کے لیے استعمال ہوتی ہے۔'' تخریبی قوت کو نہیں کہتے۔ جَناح کی جمع اَجْنِحة ہے۔ ان کے ہاں کی حفاظت میں لینے کی بہت چیزیں ہیں۔ اس کے بعد اس نے یہ کہا کہ یہ نہیں کہ ہر ایک کے اندر وہ ایک ہی خصوصیت ہوتی ہے۔ اس کی دو دو تین تین چار چار مختلف چیزیں ہوتی ہیں۔ یہ جو ایک چیز کے مختلف خواص ہوتے ہیں وہ پیمانوں کے متعلق ہوتے ہیں۔ ذرہ کے برابر ڈاکٹر جو اس سنکھیا کو Prescribe کر دیتا ہے تو وہ مقدار توانائی اور زندگی دیتی ہے' وہی سنکھیا اگر اس سے زیادہ ہو جاتا ہے تو موت کا باعث بن جاتا ہے۔ پانی ممدِ حیات ہے۔ انسان اسی میں تو ڈوب کر مرتا ہے یعنی وہی مہلک ہو جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس میں فرق کیا ہے؟ یہ پیمانے کا فرق ہے' مقدار کا فرق ہے' Dose (دوا کی خوراک) کا فرق ہے۔

خدائے حکیم نے ہر شے کے لیے پیمانے مقرر کر رکھے ہیں

قرآنِ مجید نے بتایا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ (35:1) ہم نے ہر شے کے پیمانے مقرر کر رکھے تھے۔ اب اس پیمانے کے مطابق یہ جو چیز ہوتی ہے یہ تم ریسرچ کر سکتے ہو کہ یہ مقدار کتنی ہوتی ہے مثلاً یہ کہ سنکھیا اتنا کھانے سے مہلک ہوتا ہے' اتنا کھانے سے توانائی دیتا ہے' اتنا پانی پینے سے زندگی بنتی ہے۔ یہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کیوں تم نہیں جانتے؟ ہم اس کائنات کو عدم سے وجود میں لائے' یہ تم جان نہیں سکتے کہ کوئی شے عدم سے وجود میں کیسے آ سکتی ہے۔ کائنات آئی تو اس کے لیے قرآن نے بتایا کہ ہر شے کے پیمانے مقرر کر دیئے۔ یہ جو میں نے کہا کہ آگ میں یہ کیا چیز ہے کہ وہ اس درجے کے اوپر پانی کو بھاپ بنا دیتی ہے۔ قرآن نے بتایا کہ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ (35:1) اس نے پیمانہ بنا دیا ہے' آگ ایسا کرتی ہے' خدا کا پیمانہ ایسا ہے۔ وہ کیوں نوے درجے پہ نہیں کرتی' کیوں ایک سو دس درجے کے اوپر نہیں کرتی؟ وہ کہتا ہے کہ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ (35:1) یہ ہمارا مقرر کردہ پیمانہ ہے کہ وہ 100 ڈگری کے اوپر جا کر ایسا کرے گی۔ کائنات کو ہم وجود میں لائے' پھر اس کارگہ کائنات کی ہر شے کے لیے ہم نے پیمانے مقرر کیے' تم ریسرچ کے ذریعے سے دیکھ سکتے ہو کہ ہمارے جو پیمانے ہیں وہ غیر متبدل ہیں' ہمیشہ ایسا ہوتا ہے۔ یہ ایسا کیوں ہوتا ہے' یہ تم نہیں جان سکتے۔

عالمِ امر سے عالمِ خلق کی طرف مختلف منازل کے لیے اَن گنت قوتوں کا نزول

ملائکہ کے متعلق اُس نے قرآن کی اس آیت میں کہا ہے کہ فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا (79:5)۔ یہ وہی عالمِ امر ہے جو میں نے ابھی کہا تھا۔ خلق سے پہلے کا جو اس کا نظام ہے' جہاں یہ ساری چیزوں کی ڈائریکشن (Directions) مقرر ہوتی ہیں اور یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ کہا

جاتا ہے کہ مُدَبِّرٰتِ اَمۡرًا ملائکہ ہیں۔ خدا کا جو امر ہوتا ہے، جو مُدَبِّرٰتِ اَمۡرًا ہیں، وہ ہیں جنہیں ہم ملائکہ کہہ کر پکارتے ہیں۔ کائنات کے اندر آپ دیکھیے کڑی سے کڑی ملتی ہے۔ قرآن سمجھنے کا طریقہ یہ ہے۔ پوری کائنات بنائی، کہا کہ تخلیق تو ہم نے کردی، پھر یَتَنَزَّلُ الۡاَمۡرُ بَیۡنَهُنَّ (65:12) ارض و سماوات کے اندر ہم اپنا امر بھیجتے چلے جاتے ہیں، نازل کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ وہ ہے جو ان کے لیے Direction مقرر کی تھی، پیمانے مقرر کیے تھے، قاعدے مقرر کیے تھے۔ بنانے کے بعد ہم بیکار نہیں بیٹھ گئے۔ ان چیزوں کو بھیجتے چلے جاتے ہیں۔ یہ تو امر آ گیا، Directive آ گیا کہ اس سمت کو جا کر اس شے نے فلاں مقام تک پہنچنا ہے، اس کو اس طرح سے کوئی پہنچانے والا بھی تو ہونا چاہیے۔ یہ ہیں مُدَبِّرٰتِ اَمۡرًا (79:5)۔

ملائکہ کو دیکھا نہیں جا سکتا اور یہ کائنات ہر آن ارتقائی منازل کی طرف گامزن ہے

یہاں دیکھیے، کہا ہے کہ یَتَنَزَّلُ الۡاَمۡرُ بَیۡنَهُنَّ (65:12) کائنات کے اندر ہم اپنا امر نازل کرتے چلے جاتے ہیں، بھیجتے چلے جاتے ہیں۔ اس امر کو جو ہماری Follow-up کرنے والی قوتیں ہیں، ملائکہ کہا جاتا ہے اور ان کی خصوصیت یہ ہے کہ یَفۡعَلُوۡنَ مَا یُؤۡمَرُوۡنَ (16:50) وہ جو امر ان کو دیا جاتا ہے کہ اس کو یہ کر دینا، اس کے لیے یہ یَفۡعَلُوۡنَ مَا یُؤۡمَرُوۡنَ ہیں۔ اپنی مرضی سے وہ کچھ نہیں کرتے، وہ ہمارے امر کے مطابق کرتے چلے جاتے ہیں۔ کائنات تخلیق کی تو پہلے ہی دن سے اس کو بالکل Complete (مکمل) کر کے نہیں بنا دیا، اس میں اضافے ہوتے چلے جاتے ہیں، کارگہ کائنات متحرک ہے، Progressive ہے، ارتقا ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ سارا کچھ کرنے کے بعد ہم اپنا جو امر ہے، وہ بھیجتے ہیں کہ کس شے کو کیا بننا ہے، اس بیج کو آم کا درخت بننا ہے، اس کے اندر آم لگنا ہے، یہ ڈائریکشن ہم نے ہر شے کے اندر دیدی ہے۔ ان Directrions کو Follow-up کرنے والی ہماری جو قوتیں ہیں، ان کو ملائکہ کہا جاتا ہے، کوئی ایک ہی خاصیت کی مالک ہوتی ہے کوئی متعدد خاصیتوں کی مالک ہوتی ہے۔ یَزِیۡدُ فِی الۡخَلۡقِ مَا یَشَآءُ. (35:1) اس طریق سے وہ اپنی تخلیقی چیزوں کے اندر اضافے کرتا چلا جاتا ہے۔

فطرت کے قوانین کا علم تو حاصل کیا جا سکتا ہے لیکن انہیں تبدیل نہیں جا سکتا

کہا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ (35:1) یہ ان پیمانوں، قوانین کے مطابق ہوتا ہے، جو ہم نے مقرر کیے ہیں۔ یہ اس کے مقرر کردہ پیمانے ہیں۔ وَ لَنۡ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحۡوِیۡلًا (35:43) ان میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی، کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ یہ جتنے بھی فطرت کے قوانین کارفرما ہیں انہیں معلوم تو کیا جا سکتا ہے، انہیں تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ غالباً شین (Sheen) کے ہی یہ الفاظ ہیں۔ اس کا ایک فقرہ ہے۔

"We only read the book of nature we don't write it."

کیا بات ہے ان لوگوں کی! ''ہم کتابِ فطرت کو پڑھتے ہیں اسے لکھتے نہیں ہیں''، لکھی ہوئی وہ کسی اور کی ہوتی ہے۔

قرآنِ حکیم نے اپنے ہاں آدم کے قصے کو تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے

آدم کو' آدمی کو بھیجا۔ میں کئی دفعہ یہ بتا چکا ہوں کہ یہ تمثیلی بات قرآن نے بیان کی ہے' یہ کسی خاص بابا آدم کا ذکر نہیں ہے' آدمی کا ہی ذکر ہے۔ یہ جیسے آپ The لگا کر آدمی کہتے ہیں یعنی The man تو عرب اس کو ہی آدم کہتے ہیں۔ یہ آدمی کا تمثیلی ذکر ہے کہ یہاں وہ آیا' کائنات میں پیدا ہوا' اب یہ فطرت کی جتنی چیزیں پھیلی ہوئی ہیں' ان سے ہی اس نے کام لینا تھا۔ ان کو جب Discover (بے نقاب) کرے گا' کسی Effect (معلول) کے Cause (سبب) کو کہ اس طرح سے یہ ہوتا ہے' تو پھر یہ ایسا کر سکے گا۔ پانی آگ پہ رکھنے سے' سوڈگری سنٹی گریڈ پہ پہنچنے کے بعد' کھولتا ہے تو اگر اس نے چائے بنانی ہے' اس پہ رکھے گا تو وہ کھولے گا۔ یہ اس نے معلوم کر لیا کہ سوڈگری سنٹی گریڈ کے اوپر جا کر اس نے کھولنا ہے۔ یہ رکھ کر وہ ادھر اُدھر ہو جائے گا' اتنے منٹ کے بعد اُدھر جائے گا اور اس کے بعد وہ دیکھے گا کہ وہ کھولتا ہے' اس سے وہ کام لے رہا ہے۔ جی نہیں صاحب! کام لینے کی بات اور آئی۔ اس پتیلی میں سے تو پانی کھول کر صرف بھاپ بنتا ہے' اڑ جاتا ہے' آپ نے تو چائے کے لیے صرف گرم پانی لینا ہے۔ یہ پانی جس کی کیفیت یہ ہے کہ ویسے تو چھوڑ دیا جائے تو وہ نشیب کی طرف جاتا ہے' ذرا مٹی کا بندیوں آگے لگا دیا جائے تو وہیں رک کر کھڑا ہو جاتا ہے لیکن یہی پانی جب بھاپ بنتا ہے تو ایک اسٹیم انجن ساٹھ ساٹھ ستر ستر ڈبے مال گاڑیوں کے کئی میل کی رفتار سے کھینچے لیے چلا جاتا ہے۔ اس کی قوت ملاحظہ فرماؤ کہ یہ گاڑیوں کو کس طرح کھینچتا ہے۔

آدم نے ان مہیب قوتوں کو تسخیر کر لیا اور یہ ملائکہ سجدہ ریز ہو گئے

سائنس نے یہ قانون بتایا اور پھر انسان نے اس بھاپ کو قابو کیا۔ بھاپ میں تو یہ قوت تھی کہ وہ یہ کچھ کرے۔ آدم کے بیٹے نے کہا کہ ہم جس طرح چاہتے ہیں' اس طرح سے یہ بھاپ کام کرے گی۔ اس نے وہی انجن بنایا' جو کچھ بھی ہے۔ ابنِ آدم اس کے پیچھے کھڑا کیا' اس نے بٹن دبایا' اور وہی فطرت کی جو اتنی بڑی مہیب قوت تھی ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی کہ کیا کروں؟ کہا کہ انجن کو چلاؤ' اس نے چلا دیا' کہا کہ اسے اور تیز کرو' اس نے کہا کہ اچھی بات جناب! اس نے کہا کہ کھڑے ہو جاؤ' کہا کہ بہت اچھا حضور! ملائکہ نے آدم کے سامنے سجدہ کر لیا۔ اب کسی کے سامنے جتنے زیادہ یہ ملائکہ سجدہ ریز ہوں گے' اتنا ہی وہ مقامِ آدمیت کے اوپر چلا جائے گا۔

مومن سے پہلے مقامِ آدم کا حصول لازم ہے

یہ مقامِ آدم ہے۔ مومن کی بات ابھی نہیں آئی' مومن تو بہت آگے ہوتا ہے لیکن مومن آدم سے بنتا ہے' مومن کے لیے پہلے آدم کا مقام نہایت ضروری ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ یہ فطرت کی قوتیں اس کے سامنے سجدہ ریز ہوں تا کہ یہ مقامِ آدمی تک تو پہنچے۔ اور جب ان قوتوں نے سجدہ کرنا شروع کیا تو اب اس کے بعد یہ فیصلہ کرے کہ آیا یہی جو بھاپ ہے' یہ جتنے لوگ بیٹھے ہیں' اس کو اگر ان پر چلا دیا جائے تو یہ سب کو تلف کر دے گی' ہلاک کر دے گی۔ سب کے لیے یہ مہلک بن جائے گی۔ اس نے سجدہ کیا ہوا ہے' جیسا اس نے حکم دینا ہے اس طرف اس نے چل پڑنا ہے' اس نے یوں چلایا وہ یوں چل پڑی' تخریب ہوئی' اُس نے اسے انجن میں چلایا ہے' وہ یوں چل پڑے گی' اس میں تعمیر ہوگی۔

کائناتی قوتوں کا صحیح استعمال ہی مقام مومن ہے ورنہ یہی کچھ شیطنت

فطرت کی قوتوں کو اپنے قابو میں لا کر انہیں تعمیرِ انسانیت کے لیے صرف کیا جائے تو یہ مقامِ مومن ہے اور اگر تخریب کے لیے صرف کیا جائے تو یہ شیطنت ہے۔ قوت بڑی شے ہے۔ یہی قوت صرف نام ہے کہ اسے کس طرح سے استعمال کیا جائے۔ مومن کی صفت یہ ہے کہ **مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ** (13:17). یاد رکھو! بقا صرف اسی عمل کو ہے جو نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے کیا جائے گا۔ آدمی ہونے کے لیے ضروری ہے کہ فطرت کی قوتیں اس کے سامنے سجدہ ریز ہوں۔ اب اس کے بعد استعمال کی بات آ گئی۔ مومن وہ ہے جو خدا کی اقدار کے مطابق ان قوتوں کو صرف کرے۔ اور اگر قوتیں ہی اس کے قابو میں نہیں ہیں تو یہ صرف کیا کرے گا۔ اعمال تو ان قوتوں کو صرف کرنے کا نام ہے' اس طرح کرنے سے اس کے اعمال حسنہ ہونگے' کائنات کے حسن کو بڑھانے والے ہونگے۔ اگر وہ قوتیں ہی اس کے پاس نہیں ہیں' تو یہ صرف کیا کرے گا۔ اگر مقامِ آدم ہی نصیب نہیں ہے' مقامِ مومن کیا آئے گا۔ کیا بات ہے اس کے ایک فقرے کی!

بآدمے نرسیدی' خدا چہ می جوئی

(اقبالؒ: جاوید نامہ)

''او پہلاں بندے دا پتر دا بنڑ فیر رب والی گل کریں'' [1] آدم کے مقام کو تو پہنچا نہیں' خدا کو کیا پائے گا۔ خدا کے لیے تو آدم کا مقام ہے۔ ملائکہ تو آدم کے سامنے سجدہ ریز ہوں گے۔ سارے حیوانات ملائکہ کے تابع چلتے ہیں۔ ملائکہ میں سے ایک نے بکری سے کہہ دیا کہ تم

---

[1] پہلے انسان تو بنو' پھر پروردگار والی بات کرو۔

نے صرف سبزی کھانی ہے' گوشت نہیں کھانا۔ اب وہ اسے کھانے کے لیے مجبور ہے' پانی سے اس نے کہہ دیا کہ نشیب کی طرف بہنا ہے' کہا کہ بہت اچھا حضور! وہ بہہ رہا ہے۔ اسے کہا گیا ہے کہ اس نے نشیب کی طرف بہنا ہے۔ اب اگر اس پانی سے یہ کہا جائے کہ تمہاری ایسی کی تیسی' تمہیں میرے سامنے سجدہ کیا ہے' تم اپنی مرضی کے مطابق نہیں چل سکتے تو یہ غلط ہے۔ آدمی نے سینٹری فیوگل پمپ لگا دیا' چار چار دس دس منزلوں کے اوپر پانی کو چڑھا دیا۔ آدمی یہ کچھ کر رہا' اب اوپر جا کر اس کی ترائی کروتا کہ عمارت پختہ ہو جائے۔ یہ مومن کا عمل ہے۔ اوپر جاؤ تا کہ چھت گر جائے۔ یہ شیطان کا عمل ہے۔ یہ ہے جو کہا ہے کہ **اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ** (35:1)۔

حضور ﷺ کی طرف منسوب کردہ روایات کا اثر

میں نے عرض کیا ہے کہ وہ جو ہمارے ہاں ملائکہ کا تصور ہے کہ وہ پروں والے ہوتے ہیں اور پھر جو ہماری روایتیں ہیں' وہ اس قسم کی توہم پرستیوں کو پختہ کر دیتی ہیں۔ ان روایات سے یہ بات مشکل ہو جاتی ہے۔ اگر عام حالات میں بات کی جائے تو سمجھ میں بھی آ جاتی ہے اور دوسرا مان بھی لیتا ہے لیکن جب اس کی تائید میں کوئی روایت بیان کر دی جاتی ہے' حالانکہ وہ نبی اکرم ﷺ کا یقینی طور پہ فرمودہ نہیں ہوتا' وہ منسوب الی الرسول ہوتا ہے کہ یہ بات کوئی دو سو سال بعد حضور ﷺ کی طرف منسوب کی گئی تو اب وہاں سے یہ چیزیں آتی ہیں جو پہلے زمانے کے انسانوں کے تصورات کی جو محسوس شکلیں تھیں' جس طرح تورات میں یہ کچھ دیا گیا تھا' ہمارے ہاں بھی ان روایتوں میں انہی کے تتبع میں اسی قسم کی شکل دی گئی ہے مثلاً جبریل کے متعلق ہمارے ہاں روایت یہ ہے کہ حضور ﷺ نے معراج کی شب دیکھا کہ جبریل کے چھ سو پر تھے اور دو پروں کے درمیان مشرق اور مغرب کا فاصلہ تھا۔ استعارے کے طور پہ آپ لے لیجیے' بات کچھ اور تھی لیکن وہ جو ہمارے ہاں پروں والے' پھڑ پھڑانے والے فرشتے کا تصور ہے' اس کو تقویت مل گئی۔ اب اگر اس سے الگ آپ مفہوم بیان کرتے ہیں تو وہ یہ نہیں کہتا کہ تمہارا مفہوم غلط ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ اس لیے غلط ہے کہ یہ اس روایت کے خلاف جاتا ہے۔ یہاں آپ بندھ جاتے ہیں' آپ کے ہاں اس سے آگے کوئی انکشاف' کوئی ریسرچ' کوئی ترقی ہو نہیں سکتی' کہا تھا کہ **اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ** (35:1) اور پھر **لَّمْ تَرَوْهَا** (9:26) والی بات ہے۔ وہ تو آپ نے دیکھ ہی لی ہے۔

کہا ہے کہ یہ سارا سلسلۂ کائنات' جس کی اتنی لمبی چوڑی ہم نے بات کی' یہ سب کچھ ہم نے کا ہے کے لیے کیا؟ ہندو کے لیے تو آسان تھا۔ اس نے کہا کہ ایشور نے اپنی لیلا رچائی ہوئی ہے۔ لیلا تھیئٹر کے کھیل کو کہتے ہیں اور اس میں یہ مختلف ایکٹرز ہیں' جو یہ کچھ کر رہے ہیں۔ آپ کو پتہ ہے کہ نٹوں کا تماشہ کہا کرتے تھے۔ یہ نٹ انہی ہندوؤں کا لفظ ہے۔ یہ جو تھیٹر کا کھیل ہوتا ہے' اسے وہ نٹ کہتے ہیں اور ان کے ہاں ایشور کا نام آپ کو پتہ ہے' نٹ راجن ہے یعنی نٹوں کا راجہ' بہت بڑا Player (اداکار' کھلاڑی)۔ آج ہم ان پہ یوں تنقید

نہیں کر سکتے۔تنقید تو یہ ہے کہ جب انسان اس دور کے اندر تھا تو اس سے زیادہ آگے سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔تنقید یہ ہے کہ آج ذہنِ انسانی اتنی اوپر تک پہنچ چکا ہے، وہ آج بھی اسے مانتے چلے جاتے ہیں، اسی طرح سے یہ ہے وہ تنقید کی بات لیکن ہم ان پہ کیا تنقید کریں، ہم خود اسی میں گرفتار ہیں۔

مذہب اور دین میں ایک بنیادی فرق ہے

جب بھی آپ دین کو مذہب بنائیں گے، وہیں کھڑے ہو جائیں گے، آپ آگے بڑھ ہی نہیں سکتے۔ وہ تو دین تھا، جس نے قرآن کے اندر کہا تھا کہ **اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ** (4:82) عقل فکر شعور علم بصیرت تفکر: قرآن کی ایک ایک آیت کے متعلق وہ یہ چیز کہتا ہے۔ یہ تو دین میں ہے۔ زمانہ آگے بڑھتا چلا جائے، علمِ انسانی ترقی کرتا چلا جائے، اونچا ہوتا چلا جائے، قرآن کے معانی قرآن کا مفہوم، اس کے حقائق، اس کے رموز ساتھ کے ساتھ کھلتے چلے جائیں گے۔ کہا ہے کہ **سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْۤ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ** (41:53) ہم خارجی کائنات اور انسانی دنیا کے اندر اپنی علامتیں دکھاتے چلے جائیں گے اور ہر وہ شے جو Discover (بے نقاب) ہو گی، وہ قرآن کے کسی نہ کسی دعوے کی دلیل بن جائے گی، ثبوت بن جائے گی۔ وہ تو ہر دور میں آپ دیکھیں گے کہ کس کس چیز کے اوپر پڑا ہوا جو پردہ ہے، اٹھانا ہے۔

کائنات کی تخلیق کا اصل مقصد: انسانی جسم کی ربوبیت اور انسانی ذات کی نشوونما ہے

آپ تو چیزوں کو صرف Discover (بے نقاب) کرتے ہیں۔ ہم تو وہیں کھڑے ہیں۔ کہا کہ یہ سارا کچھ جو ہم نے کیا، کائنات کو اس طرح بنایا، یہ کاہے کے لیے بنایا؟ انسان کی پرورش اور اس کی ذات کی نشوونما کے لیے یہ کچھ بنایا۔ کہا کہ **مَا یَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا وَ مَا یُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ** (35:2) کائنات بنائی، زندگی پیدا کی، اس کے اندر جاندار مخلوق ہوئی۔ اب جہاں زندگی پیدا ہو گی، تو زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے، اس کو نشوونما دینے کے لیے، سامانِ رزق کی ضرورت ہو گی: زندگی کے لیے بھی، اس کی نشوونما کے لیے بھی۔ کہا ہے کہ صرف انسان کو ہی نہیں پیدا کیا بلکہ ہر جاندار کو پیدا کیا۔ رحمِ مادر کے اندر تو اس نے وہ انتظام کیا کہ وہ بچہ Sealed (سربمہر) رحم کے اندر، تین تین تہیں ہوتی ہیں، اس کے اندر بھی وہ سانس لیتا ہے، دل دھڑکتا ہے خون گردش کرتا ہے۔ یہ کیسے کرتا ہے؟ یہ ملائکہ کرتے ہیں لیکن پیدا ہونے کے بعد جو اس کا پچھلا سلسلہ ہوتا ہے، وہ منقطع ہو جاتا ہے۔ پیدا ہونے کے بعد، پہلی چیز سانس لینے کے لیے، اس کو ہوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ بچہ رحمِ مادر سے باہر آتا ہے، وہاں ہوا موجود نہ ہو تو کوئی زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔ پہلے سے ہوا موجود کی، پھر انسان کے اس بچے کو باہر لائے۔ پھر اگر وہاں یہ چیز ہوتی کہ صاحب! وہ

ہوا جو ہے' وہ جیسے وہاں دودھ ملتا ہے' دوائی کی شیشی چالیس روپے کی ملتی ہے' جس کے پاس پیسے ہیں' اس کا بچہ بچ جاتا ہے' جس کے پاس نہیں ہیں' وہ مر جاتا ہے۔ اگر اس نے یہی انتظام یہاں کیا ہوا ہوتا کہ اتنے پیسے دو گے تو دو سانس ملیں گے۔ پھر اس کے لیے کوئی مکینکل طریقہ نہیں ہے کہ صاحب! یہ مشین لگاؤ اور یہاں یہ کچھ کرو اور وہ کچھ کرو۔ جہاں زندگی موجود ہے' وہاں زندگی کو قائم رکھنے والی شے ہوا موجود ہے' مفت دی جا رہی ہے' نرم و نازک طریقے سے دی جا رہی ہے' کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی' کوئی طریقہ نہیں کرنا پڑتا۔

رحمت' رحم' رحمِ مادر' عزیز و حکیم کی ان اصطلاحات کا قرآنی مفہوم اور خصوصیات

عربی زبان میں جو سامانِ رزق اس طرح سے دیا جائے' مفت دیا جائے' لطیف پیرائے میں دیا جائے' ضرورت کے مطابق دیا جائے' اُسے رحمت کہتے ہیں اور رحم کا لفظ اسی سے آیا ہے۔ جس طرح رحمِ مادر میں بچے کو سامانِ نشو و نما ملتا ہے' عزیزانِ من! خدا کا ارشاد ہے کہ اگر وہی نظام جو ہم نے وہاں کر رکھا ہے' تم اپنی دنیا کے اندر بھی اس قسم کا نظام کرو تو ہر فرد کو اس طرح سے سامانِ نشو و نما ملے جیسے ہم بچے کو رحمِ مادر میں دیتے ہیں۔ رحم اور رحمت تو ایک ہی چیز ہے۔ کہا کہ سوچو تو سہی! اس انتظام کو یہ جو سب کچھ دیا ہوا ہے اس کو کوئی نہیں روکتا۔ یہ یَفْتَحِ ہے۔ ہم نے اس کے دروازے کھولے ہوئے ہیں۔ جب تک یہاں زندگی باقی رہی یہ ہمارے دروازے کھلے رہیں گے لیکن یاد رکھو! جس چیز کا دروازہ ہم بند کر دیں گے' تم میں سے کوئی اُسے کھول نہیں سکے گا۔ کہا ہے کہ یہ دروازے کا کھلنا اور بند ہونا' کیا یونہی ہماری مرضی کے اوپر ہے کہ اچھا ہے' اس قوم کے اوپر بند کر دو' اس کے اوپر کھول دو؟ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (35:2)۔ عزیز کے معنی ہیں جس کا کنٹرول ہو' حکیم کے معنی ہیں وہ کنٹرول حکمت پر مبنی ہو Rationally Control ہو' استبداد نہ ہو' حکمِ حاکم مرگِ مفاجات نہ ہو۔ عزیز تو یہاں سب ہوتے ہیں' حکیم نہیں ہوتے اور اگر صرف حکیم ہی ہو' اس کے ساتھ غلبہ نہ ہو تو

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

قرآنی نظامِ ربوبیت اور انسانوں کے ہاتھوں رزق کی تقسیم کا باہمی فرق

عصا حکمت کے ساتھ ہو اور حکیم تو قرآن ہے۔ کہا ہے کہ یٰسٓ ○ وَ الْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ (36:1) انسانوں کی دنیا کے اندر' خدا کا حکیم ہونا تو اس کا کارفرما ہونا ہوگا' تو قرآن کی رو سے جو رزق تقسیم کیا جائے گا' وہ ہوگا حکیم کا دیا ہوا رزق' جو اس کے خلاف دیا جائے گا' وہ دھاندلی ہوگی مگر یہ ہیں جو خدا کے متعلق کہتے ہیں ''جنوں مرضی دیاں گے' جنوں مرضی نئیں دیاں گے''[1]۔ وہ تو شکر ہے کہ رحمِ مادر کے اندر بہرحال ابھی تک انہوں نے دست درازی ایسی نہیں کہ وہاں اس بچے کے اوپر یہ سانس اور یہ خون اور یہ پانی اور یہ دودھ اس طرح سے

---

[1] جسے چاہیں گے دیں گے' جسے نہیں چاہیں گے نہیں دیں گے۔

حرام نہیں کیا جاتا' جیسا یہاں ہوتا ہے لیکن جونہی وہ اس دنیا میں آتا ہے تو پھر وہاں تو آپ سوچیے نہیں حکیم کہاں رہتا ہے' عزیز ہو جاتا ہے اور اس کے بعد کہا کہ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ (35:3)۔ اب دیکھیے! الناس کے لیے ہے صرف مومنین کے لیے نہیں ہے۔ کہا ہے کہ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ (35:3) تم سوچو تو سہی' یہ سارا کچھ انعامات خداوندی ہیں۔ تم نے کہیں سے نہیں لیے' وراثت میں بھی کہیں سے نہیں ملے۔ یہ انعامات خداوندی ہیں۔ کہا کہ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ (35:3) پہلی چیز یہ ہے کہ ایمانداری سے بتاؤ کہ اس کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ بھی اس طرح سے تخلیق کرے' کوئی اور خالق ہے' کوئی فاطر کوئی بدیع السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ذہن میں آتا ہے؟ ہمارے آپ کے نہیں وہ جو بڑے بڑے سائنٹسٹ ہیں' ان کے ذہن میں بھی نہیں آتا۔ وہ کہتے ہیں کہ نہیں' کوئی نہیں ہے۔ کہتا ہے کہ جب خالق کوئی نہیں ہے اور خالق نے اپنی بنیادی صفت یہ بتائی کہ وہ رازق ہے' رازق بھی وہ رحمت کے طریقے کے اوپر' رزق کا دینے والا ہے۔ خالق ہے' اس نے رزق اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ کہا کہ پھر' آ گئی وہ بات جس کے لیے یہ سارا کچھ دہرایا تھا کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (35:3) تمہاری دنیا کے اندر اقتدار اور حکومت اور قدرت اور اختیار بھی اسی کا ہونا چاہیے جس کا دیا ہوا کھاتے ہو' او! جس کی دی ہوئی ہوا میں سانس لے کر جیتے ہو' صاحب اقتدار بھی تو وہی ہوگا۔ کھائے گا تو اُس کا اور صاحب اقتدار کوئی اور ہو؟ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (35:3) وہ نظام اسی صورت میں قائم رہ سکتا ہے رحمِ مادر کے اندر جو بچہ ہے لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اس پہ کسی اور کا اقتدار نہیں ہوتا سوائے خدا کے۔ تمہارے معاشرے کے اندر بھی قانونِ رحمت خدا کا ہونا چاہیے' اس کے سوا کسی کا اقتدار یہاں نہیں قائم ہونا چاہیے۔ نہ تمہاری پیدا کی ہوئی مخلوق' نہ تمہارا یہ پیدا کیا ہوا رزق اور دونوں چیزوں کے اوپر قبضہ تمہارا ہے' جان جس کی جی چاہے لے لو' رزق جس کا جی چاہے بند کر دو' ہمارے ہاں تو ایسا نہیں ہوتا: لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (35:3) بس یہ بات تھی جس کے لیے ساری تمہید کہی لیکن یہ لا الہ الا چند الفاظ کا مجموعہ تو ہے نہیں' یہ لفظوں کی تو بات نہیں ہے:

تُو عرب ہو یا عجم ہو' ترا لَآ اِلٰـــــــــــــهَ اِلَّا

لغتِ غریب' جب تک ترا دل نہ دے گواہی

دل سے تسلیم کر کہ اس کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں ہے' پھر کسی انسان کے سامنے تمہارا سر نہیں جھکے گا: لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یہ دو الفاظ ہیں' مگر کتنے حسین ہیں! کہا کہ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ (35:3)۔ یہ دو چیزیں پہلے جو ہم نے کہی ہیں' مانتے جا رہے ہو' خالق کوئی اور نہیں' کسی نے کچھ نہیں بنایا' بنیادی طور پر یہ اس کا پیدا کیا ہوا ہے' یہ سب کچھ ٹھیک ہے' پھر اس کے بعد تم اس کو چھوڑ کر دوسرے انسانوں کو صاحبِ اقتدار بنا رہے ہو' تو کونسی ایسی بات ہے جو دھوکا لگ رہا ہے' تم اس طرف چلے جا رہے ہو' ذرا مجھے سمجھاؤ تو سہی کہ کس بات سے تمہیں دھوکا لگ رہا ہے' پھر الٹے کیوں پھر جاتے ہو؟ جسے تم صاحبِ اقتدار مانتے ہو' وہ بھی تو سانس لینے کے لیے ہمارا ہی محتاج ہے' تمہاری طرح محتاج ہے' اسی

طرح سے روٹی کھا کر جیتا ہے' اسی طرح سے سو کر اٹھتا ہے جیسے تم ہو' تو وہ اسی کا محتاج ہے' جیسے تم محتاج ہو' تو پھر اس کو اپنا اس طرح سے الہ تصور کر لینا فَاَنّٰی تُؤْفَکُوْنَ (35:3) الٹے کیوں پھر جاتے ہو؟

انسانوں کے پاس ان کے خود ساختہ معاشی نظام کی کوئی دلیل نہیں ہوتی

سب کچھ سمجھانے کے بعد کہا کہ یہ لوگ اس کے باوجود تمہاری بات نہیں مانتے۔ کہا کہ وَ اِنْ یُّکَذِّبُوْکَ فَقَدْ کُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِکَ (35:4)۔ ہم نے ہر بات عقل و فکر کی بنا پہ' دلائل و براہین کی رو سے' کی ہے۔ دین میں تو زبردستی نہیں ہے۔ کہا کہ ان کو سمجھایا' اس کے خلاف ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے' اس نے خود چیلنج کیا ہوا ہے کہ لَا بُرْھَانَ لَہٗ (23:117). ان کے پاس اس کے خلاف کوئی دلیل نہیں ہوگی۔ اس کے باوجود جب تم یہ کہو گے کہ صاحبِ اختیار کوئی نہیں ہے تو یہاں پہنچ کر یہ جو صاحبِ اختیار ہیں' وہ اربابِ حکومت ہوں یا اعیانِ مذہب ہوں' پیشوائیت ہو' دونوں خدا بنے ہوئے ہوتے ہیں' دونوں اس مقام پہ تمہارے متعلق یہ کہہ دیں گے کہ نہیں' تم یہ بات غلط کہہ رہے ہو' وہ تو باقی سب کچھ ٹھیک کہتے ہو لیکن یہ تم غلط کہتے ہو۔ کہا کہ اس سے انسان کے دل پہ اثر ہوتا ہے' افسردہ خاطر ہوتا ہے کہ میں اس طرح سے عقل و فکر کی بنا پہ دلائل دے کر ایک ایک اعتراض کا جواب دیتا ہوں' پہروں ان کے ساتھ باتیں کرتا ہوں' منواتا ہوں' مانتے ہیں' اس کے باوجود کہتے ہیں کہ نہیں صاحب۔ دوسرے مقام پہ ہے۔ پہلی بات تو یہاں یہی کہی کہ یہ کچھ تمہارے ہی ساتھ نہیں ہو رہا' ہر نبی ہر رسول نے آ کر پیغام ہی یہ دیا تھا کہ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ (35:3) حکومت صرف خدا کی ہے' اس کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں ہے۔ ہر نبی نے یہ کہا اور قرآن کہتا ہے کہ جن سے یہ کہا تھا' ان کے ہاں کے یہ جو مترفین کا طبقہ تھا' دوسروں کی کمائی پر پلنے والا طبقہ' انہوں نے ہمیشہ اس چیز کی مخالفت کی' باقی چیزیں مانتے چلے گئے۔

مترفین طبقہ کی ذہنیت حق بات کو ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتی

قرآن میں یہ ہے کہ ان سے پوچھو: زمین کس نے پیدا کی؟ کہیں گے خدا نے' پوچھو: آسمان کس نے پیدا کیا؟ خدا نے' چاند سورج کس نے پیدا کیا؟ خدا نے۔ کہا کہ یہاں تک تو یہ چلتے آئیں گے۔ جب اس کے بعد ان سے کہو گے کہ پھر حاکم کون ہو سکتا ہے تو کہیں گے نہیں نہیں یہ بات نہیں ہے۔ کہنے لگا کہ یہ وہاں تک ہی خدا کو ماننے کے لیے تیار ہیں یہاں وہ دخل نہ دے آسمان پہ بیٹھا ہوا ہے ٹھیک ہے "Sovereignty of God in Universe" ہے۔ وہاں اس مقام میں ہے' ادھر نہیں ہے۔ اِدھر تو وہ تمہاری مملکت ہے' یہ ہماری مملکت ہے۔ یہ شرک نہیں تو اور کیا ہے۔ کہا کہ یہ بات ہر رسول کے ساتھ ہوتی ہے۔ یہاں قرآنِ کریم نے ایک بڑا لطیف فرق کیا ہے۔ میں نے جیسا عرض کیا ہے کہ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ ان کی اس قسم کی باتوں کو ہم جانتے ہیں اور پھر جو آدمی لایعنی سی باتیں کرے'

یعنی ان میں کوئی دلیل و برہان کی بات نہیں ہے' تو عقل وفکر سے بات کرنے والا آدمی تنگ پڑ جاتا ہے' اس کے اوپر اس کا اثر ہوتا ہے' پھر یہ بھی اثر ہوتا ہے کہ میں ان کی زندگی کے لیے' ان کی خوشحالی کے لیے' کتنی کوشش کرتا ہوں' جان مارتا ہوں اور ان کا ری ایکشن' ان کا Attitude (روّیہ) یہ ہے' وہ اس سے بھی افسردہ ہو جاتا ہے۔ اور پھر جب یہ بات ہو کہ یہ سمجھا جائے کہ یہ مجھے جھوٹا کہتا ہے' تو پھر تو اس کا اور بھی بہت ہی بڑا اثر ہوتا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی حسّاس خیالی کی کیفیت

آپ غور کیجیے کہ ایک رسول کی' خدا کا پیغام پہنچانے والے کی' پوزیشن کس قدر نازک ہے' وہ یہ کچھ کرتا چلا جاتا ہے۔ خدا کو کہنا پڑا اور یہاں بڑی خوبصورت بات کہی کہ **قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِىْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَ لٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ** (6:33)۔ آپ کو معلوم ہے' میں پہلے بھی کئی دفعہ کہہ چکا ہوں کہ جب نبی اکرم ﷺ نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے تو مخالفین نے یہ کہا تھا کہ تمہارے پاس اس کا ثبوت کیا ہے کہ تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو۔ آپ کو معلوم ہے' یاد ہے' اگر نہیں تو آپ کو یاد ہونا چاہیے' عزیزانِ من! برسوں سے یہ بات ہو رہی ہے۔ آپ کو معلوم ہے' حضور ﷺ نے کیا کہا تھا کہ بھائی! مجھ سے پوچھتے ہو کہ تم کیسے کہتے ہو کہ تم سچے ہو' سنو! **فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ** (10:16) میں کوئی باہر سے' تمہارے اندر نیا نہیں آیا' جو تمہیں میرے ماضی کا پتہ نہ ہو' میں نے چالیس سال تمہارے اندر گزارے ہیں' نبی کی حیثیت سے نہیں' تمہارے جیسے انسان کی حیثیت سے' تم ایمان سے کہو کہ اس قسم کے انسان کی زندگی سچے کی زندگی ہوتی ہے یا جھوٹے کی زندگی ہے۔ میرے Past (ماضی) سے اس کا فیصلہ کر دو کہ میں جو دعویٰ کرتا ہوں سچا ہے یا غلط ہے؟

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

انسان کے کیریکٹر کا معیار اس کے Past (ماضی) کے ترازو میں تولا جاتا ہے

عزیزانِ من! اس معیار کو یاد رکھیے جو بھی کسی بات کا دعویٰ لے کر آپ کے سامنے آئے' اس کا Past (ماضی) دیکھیے کہ کس قسم کا ہے۔ اس وقت تو جناب! وہ آپ کو جبریل سے بھی زیادہ مقدس بن کر دکھائی دے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ معجزہ بتایا' ان کے سامنے یہ دعویٰ کیا اور تاریخ بتا رہی ہے کہ کسی نے انگلی تک حضور ﷺ کے خلاف نہیں اٹھائی۔ یہ ہوتا ہے سچا۔ خدا یہ بات رسول اللہ ﷺ سے کہتا ہے کہ تم ان کی اس بات کے اوپر افسردہ خاطر ہوتے ہو کہ یہ کہتے ہیں کہ نہیں' یہ غلط ہے تم جھوٹ کہتے ہو' کہا کہ یہ تمہیں جھوٹا نہیں کہتے' تم نے جو ان کے سامنے چھاتی پہ ہاتھ رکھ کر دعویٰ کیا تھا' ایک بھی ایسا نہیں نکلا تھا جس نے کہا تھا کہ تو جھوٹا ہے۔ تم افسردہ خاطر نہ ہو' یہ تمہیں

جھوٹا نہیں کہتے' کہتے یہ ہیں کہ یہ جو خدا کہتا ہے کہ میرے قانون کی رو سے تم تباہ ہو جاؤ گے' یہ کہتے ہیں کہ یہ جھوٹ ہے۔ کہنے لگے میرے ساتھ معاملہ ہے' نبھنے دو' تم خوامخواہ کے لیے افسردہ خاطر کیوں ہوتے ہو۔ کیا بات ہے! کیریکٹر کی صداقت کا یہ ثبوت ہے۔

انسان کے ہر عمل کا تعلق خدا کے قانون کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے

یہ کتنی عجیب چیز ہے کہ تم درمیان میں آ ؤ ہی نہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ تمہاری جو یہ روش ہے' اس کا نتیجہ تباہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جھوٹ ہے' نہیں ہوگا۔ ہم کہتے ہیں کہ سنکھیا اتنا کھا لو گے تو مر جاؤ گے۔ یہ کہتا ہے کہ نہیں۔ کہتا ہے کہ بیچ میں سے نکل جاؤ' تم نے ان سے یہی کہا کہ اتنا سنکھیا کھاؤ گے تو مر جاؤ گے۔ یہ خدا کا قانون ہے تم درمیان میں سے ہٹ جاؤ' کھا لینے دو۔ اور اس کے ساتھ کہا کہ **وَ اِلَی اللّٰہِ تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ** (35:4) انجام تو اس کے قانون کے مطابق ہونا ہے' ابھی پتہ چل جائے گا۔ یہ جو تکذیبِ رسل ہے' یہ بڑی عجیب چیز ہے کہ نبی کو وہ جھوٹا نہیں کہتے تھے۔ اگر وہ معاشرہ ایسا ہوا اور اس میں یہ دعویدار ایسا ہو کہ ہر شخص کہے کہ تُو تو ساری عمر جھوٹ بولتا رہا' آج بھی جھوٹ بولتا ہے' اس کی بات کوئی نہ مانے۔ نبی کی نبوت کے دعوے سے پہلے کی جو زندگی ہوتی ہے' وہ اس کی صداقت کا ثبوت اور شہادت ہوتی ہے' کوئی اس کو نہیں کہہ سکتا کہ تم تو ساری عمر جھوٹ بولتے رہے ہو۔ ساری عمر کیا اس نے تو کبھی ایک بھی جھوٹ بولا ہو تو وہ بھی اس کے پیچھے آ جائے گا۔ قرآن کہتا ہے کہ افسردہ خاطر ہونے کی بات اس وقت تھی کہ یہ تجھے جھوٹا کہتے' تُو تو ہمارا ایک قانون ان تک پہنچا رہا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ نہیں' یہ بات غلط ہے تو یہ تمہیں تو جھوٹا نہیں کہہ رہے۔ کہہ یہ رہے ہیں کہ یہ خدا کا قانون جو تم ہم تک پہنچا رہے ہو' غلط ہے' ایسا نہیں ہوگا۔ کہا کہ تم بیچ میں سے نکل جاؤ: **وَ اِلَی اللّٰہِ تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ** (35:4)۔ یہ کچھ کہنے کے بعد کہا کہ **یٰۤاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰہِ حَقٌّ** (35:5) یہ جو تم سے کہہ رہا ہے' یہ رسول خدا کے قوانین بیان کر رہا ہے' اس طرح سے تم کٹ حجتیوں سے کہتے چلے جا رہے ہو۔ یاد رکھو! خدا کا قانون حق ہوتا ہے۔

خدا کے ہر قانون کا نتیجہ محسوس شکل میں سامنے آ کر ہی رہتا ہے؟

آپ کو یاد ہے کہ حق کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ یہ وہ دعویٰ ہے' جو محسوس شکل میں نتیجہ پیدا کر کے سامنے لے آئے۔ حق اسے کہتے جس کو حقیقت کہتے ہیں۔ یہ تو حقیقت ہے۔ حقیقت اس چیز کو کہتے ہیں' جو دعوے کی دلیل محسوس شکل میں سامنے آ جائے۔ حق' قانون کا سچا ہونا ہے لیکن وہ حق اس وقت بنتا ہے جب اس قانون کا نتیجہ محسوس شکل میں سامنے آ جائے۔ جو اس کے مطابق چلے اس کا خوشگوار نتیجہ سامنے آ جائے' جو خلاف ورزی کرے اس کا تخریبی نتیجہ سامنے آ جائے' اس وقت وہ حق بن جاتا ہے۔ کہا کہ **اِنَّ وَعۡدَ اللّٰہِ حَقٌّ** (35:5) ہم جو کچھ تم سے کہہ رہے ہیں' جو قانون تمہیں دے رہے ہیں' قرآن نے اس کو وعدہ کہا ہے' یہ حق ہے' یہ اپنے محسوس نتائج سے بتا

دے گا کہ جو ہم نے کہا تھا وہ ٹھیک ہے، وہ حقیقت پر مبنی تھا۔ دیکھا ہمارے ہاں بھی یہ لفظ حقیقت آ گیا۔

کلمہ کی دوٹوک عملی تشریح نظریۂ زندگی کے سچ ہونے کا عملی ثبوت ہوتی ہے

میں اس سپاہی مردِ مجاہد کا قول دہرا دوں، حضرتِ عمرؓ کے زمانے (634-44/45ء) میں مومن سپاہی سے کسی پادری نے پوچھا تھا کہ یہ جو کلمہ تم بتاتے ہو، کلمہ کے معنی ہوتا ہے نظریۂ زندگی، ہر نظریۂ زندگی جو ہے اس کی ایک حقیقت ہوتی ہے، تمہارا یہ جو نظریۂ زندگی ہے، تم جو یہ کہہ رہے ہو کہ خدا کے قوانین کے مطابق کرنے سے وَ یَسۡتَخۡلِفَنَّهُمۡ فِی الۡاَرۡضِ وغیرہ، یہ جو نظریۂ زندگی ہے، تمہارے اس دعویٰ کی حقیقت کیا ہے؟ وہ سپاہی ہے، وہ کہتا ہے کہ یہ جو چالیس ہزار شہر اور قلعے ہم نے فتح کیے ہیں، یہ اس کی حقیقت نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ آپ نے سمجھ لیا کہ حق اور حقیقت کیا ہوتی ہے۔ اس کے بعد سوچیے کہ جو کہتے ہیں، ہم حق پر ہیں، کیا ثبوت ہے، کیا دلیل ہے کہ تم حق پر ہو وہ باطل پر ہیں۔ الفاظ ہی ہیں اور کیا ہے؟ یہ فریبِ نفس ہے یہ اپنے آپ کو فریب دے رہے ہیں۔ دعوے کا ثبوت تعمیری شکل میں، محسوس شکل میں، سامنے لائیے تب سمجھا جائے گا کہ تم حق پر ہو۔ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَا وَ لَا يَغُرَّنَّكُمۡ بِاللّٰهِ الۡغَرُوۡرُ (35:5) یہ پیش پا افتادہ دنیاوی مفاد جو ہماری دنیا کے آپ کے سامنے ہوتے ہیں، یہ واقعی محسوس شکل میں تمہارے سامنے آ جاتے ہیں۔ ہمارا قانون ہے کہ اگر ان کو تم اقدارِ خداوندی کے خلاف استعمال کرو گے تو تباہی ہو جائے گی، یہ ہمارا دعویٰ ہے۔ یہ جو ان چیزوں کی جاذبیت اور کشش ہے، یہ تمہیں فریب میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اور اس کے بعد یہ ہے کہ اس فریب میں مبتلا نہ ہو جاؤ اور اگلی چیز یہ ہے کہ فریب میں مبتلا کرنے والا تمہیں مبتلا نہ کر دے۔ اب یہیں یہ بتا دیا کہ فریب میں مبتلا کرتا کون ہے۔ اگلی آیت میں اس کا جواب دیدیا کہ فریب میں مبتلا تمہیں کرتا کون ہے؟ کہا کہ اس سے بچو۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ فاطر کی آیت 5 تک آ گئے، چھٹی آیت سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ

❀......❀......❀

دوسرا باب: **سورۃ فاطر** (آیات 6 تا 9)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عزیزانِ من! آج مئی 1980ء کی 9 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ فاطر کی آیت 6 سے ہو رہا ہے: (35:6)۔

شیطان کا قرآنی تصور

سابقہ درس میں ملائکہ کے متعلق قرآنی تصور پیش کیا گیا تھا اور میں نے آخری الفاظ میں عرض کیا تھا کہ آئندہ درس میں اس کے برعکس ایک حقیقت سامنے آئے گی یعنی شیطان کا قرآنی تصور۔ پچھلی آیت یہ تھی کہ **فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَ لَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ** (35:5) دنیاوی زندگی کی جاذبیتیں اور کششیں ہیں۔ ان کے متعلق قرآنِ کریم نے یہ بہ نص صریح کہا ہے کہ انہیں تم حرام قرار نہیں دے سکتے بلکہ ان کے متعلق بطور چیلنج کہا گیا ہے کہ ان سے پوچھو کہ وہ کون ہے جو تمہاری زندگی کی کشش اور زینت کو حرام قرار دے جسے ہم نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کیا ہے۔ اس نے کشش و جاذبیت کو ممنوع قرار نہیں دیا لیکن ان سے دھوکا کھا جانا اور بات ہے۔ یہاں یہ سمجھ لینا کہ مقصودِ زندگی یہی کششیں اور جاذبیتیں ہیں، اسی دنیا کی زندگی ہی زندگی ہے اور اس کے بعد کوئی اور زندگی نہیں ہے، مقصود یہی ہے کہ دنیا کی جتنی متاع ہیں، جتنی نعمتیں ہیں، ان کو جس جس طریق سے جی چاہے حاصل کر لیا جائے، اس میں کامیاب ہو گیا تو سمجھ لیا کہ کامرانی کی زندگی ہے، اسی میں ناکامی ناکامی ہے، اسی میں کامیابی کامیابی ہے۔ کہا کہ یہ گوشہ ہے، یہ جو چیزیں پیش کی ہیں، یہ تمام استعمال کی چیزیں ہیں، یہ **متاعًا حیٰوۃ الدنیا** ہے، مقصود بالذات، منتہا اور آخری منزل نہیں ہے۔

شیطان کی ماہیت اور اس کے عمل کی نوعیت

یہاں (35:5) میں کہا ہے کہ یہ طبعی زندگی کے پیش پا افتادہ مفادات تمہیں دھوکا نہ دیں۔ اور آگے کہا ہے کہ **وَ لَا یَغُرَّنَّکُمْ بِاللّٰہِ الْغَرُوْرُ** (35:5) اور تمہیں کوئی دھوکا دینے والا' اس دنیاوی زندگی کی جاذبیتوں اور کششوں کی آڑ میں اور خدا کے نام کی آڑ میں دھوکا نہ دے جائے۔ اس کے بعد دھوکا دینے والے کے متعلق کہا کہ **اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَکُمْ عَدُوٌّ** (35:6) یہ شیطان ہے اور وہ تمہارا دشمن ہے۔ اس کے اندر ایک نکتہ سامنے آتا ہے۔ قرآن کا ایک ایک لفظ کتنے عظیم نکات رکھتا ہے! بات صاف تھی کہ **وَ لَا یَغُرَّنَّکُمْ بِاللّٰہِ الْغَرُوْرُ** (35:5) تمہیں دھوکا دینے والا' خدا کے نام کی آڑ میں دھوکا نہ دے جائے' اس کے بعد کسی اور تشریح و توضیح کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ یہ جو درمیان میں ایک حصہ لے آیا ہے کہ خدا کے نام پر تمہیں دھوکا دینے والے دھوکا نہ دے جائیں' انہی کو شیطان کہا جاتا ہے۔ کہا ہے کہ **اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَکُمْ عَدُوٌّ** (35:6) شیطان تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ **فَاتَّخِذُوْہُ عَدُوًّا** (35:6) اسے دشمن ہی سمجھو' اپنا دوست نہ سمجھو۔

پچھلی دفعہ میں نے عرض کیا تھا کہ جب ذہنِ انسانی ابھی اپنے بچپن کے زمانے میں تھا' عہدِ طفولیت میں تھا' غاروں کا زمانہ تھا اور ابتدائی دور تھا' اس میں انسان کی کیفیت یہ تھی کہ وہ جو غیر مرئی قوتیں تھیں' جو توانائیاں اور صلاحیتیں تھیں اور کئی چیزیں تھیں' جنہیں آپ Abstract (غیر محسوس) کہتے ہیں یعنی وہ نظر آنے والی محسوس ہونے والی' چیزیں نہ ہوں' وہ ان کا تصور ذہن میں نہیں کر سکتا تھا۔ اور اگرچہ ہم کہیں گے کہ آج انسان بہت آگے چلا گیا ہے' ان کا وہ Abstract (غیر محسوس) تصور یعنی ان کو وہ محسوس شکل کے اندر نہ رکھے' ویسے ان کا تصور کرے' آج بھی بڑا مشکل ہے۔ وہ اب بھی اس قسم کی حقیقتوں کو' محسوس پیکروں کے اندر ہی اپنے ذہن میں لاتا ہے' اسی لیے میں اکثر یہ کہا کرتا ہوں' اگرچہ یہ ہے' بڑا مشکل کہ بچوں کو ابھی بچپن کی زندگی میں خدا کا تصور نہ دیا کرو' وہ بچے تو ایک طرف رہے ہم جو بڑے ہیں' وہ بھی اس کا کچھ Abstract (بسیط) تصور' محسوس شکل میں تصور نہیں کر سکتے' وہ بچے کیا کریں گے۔ وہ خدا کا کسی نہ کسی قسم کا محسوس پیکر اپنے ذہن میں رکھ لیتے ہیں' اس کے علاوہ اور چارہ ہی نہیں ہے:

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

بچے کی تعلیم تو اخلاقیات سے شروع کرنی چاہیے

عزیزانِ من! جب وہ بچے اس قسم کا کوئی محسوس تصور ذہن میں رکھ لیتے ہیں تو اس تصور کو مستقبل کی زندگی میں نکالنا بڑا ہی مشکل ہو جاتا ہے بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے لیکن کریں کیا خدا کا نام ہی تو گھروں میں لیا جاتا ہے اور اسے تو سمجھا جاتا ہے کہ صاحب! بچے کی مذہبی

تعلیم بڑی ضروری ہے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ یہ تعلیم اخلاقیات سے شروع کیا کیجیے۔ بچے کے لیے خدا کے متعلق بات بڑی مشکل ہوجاتی ہے تو اسی طرح سے میں نے عرض کیا تھا کہ ملائکہ کے متعلق بھی، وہ جب تک انہیں دیوی دیوتاؤں کی شکل کے اندر یہ نہیں لائے، محسوس شکل میں نہیں لائے، تصور ہی نہیں کرسکے کہ یہ عالمِ امر کی پیغام رسانیاں، عالمِ امر کی قوتیں اور توانائیاں، تدبیرِ امور کرنے والے خدا کے پروگرام کی توانائیاں کیا ہوسکتی ہیں، ہم سمجھ ہی نہیں سکتے۔ ہمیں لامحالہ ان کا کوئی محسوس پیکر ذہن میں لانا پڑتا ہے اور اسی سے یہ بت پرستی کی ابتدا ہوتی ہے۔ قرآن انسان کو بڑا اونچا لے جانا چاہتا ہے، اس نے یہی نہیں کہ بت پرستی کو چھڑایا کہ اس سے کوئی بہت بڑا بت سا اونچا تھا وہ اس کو حسد آتا تھا کہ یہ میرے مقابل میں ایک پتھر کی مورتی کو پوج رہے ہیں۔ قرآنِ کریم کو کہتا ہے پوجتے رہیں، **فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ**(3:97) جب کوئی انسان دنیا میں نہیں تھا تو اس وقت بھی یہ خدا تھا۔

عزیزانِ من! بات ساری انسان کی ہے۔ وہ انسان کے ذہن کو اس پست سطح سے بہت اونچا لے جانا چاہتا ہے۔ ان حقائق کو سمجھنے کے لیے انسان کے ذہن کو تیار کرتا ہے مگر عقائد کے محسوس پیکروں کے اندر نہیں، یہ تو ایک نچلی سطح کا انسان بھی یہ کچھ کرے گا۔ ملائکہ کے متعلق میں نے یہی عرض کیا تھا کہ قرآن انسانی ذہن کو بہت اونچا لے گیا اور میں نے گزارش کیا تھا کہ اب آہستہ آہستہ سائیکولوجی ان چیزوں کی طرف خود پہنچ رہی ہے۔ آپ حیران ہونگے کہ آج کل جو سب سے بڑی چیز، جس کی تحقیق ہو رہی ہے، جس کے متعلق میں نے پچھلی دفعہ بھی اشارتاً کہا تھا کہ وہ یہ ہے کہ انسان کے دل میں ایک خیال پیدا ہوتا ہے۔ اب اس کے لیے بھی ہم نے دل کا لفظ رکھا ہوا ہے۔ یہ دل وہ نہیں ہے جو دھڑکتا ہے لیکن یہ ہے کیا چیز؟ میں آپ تو ایک طرف رہے، اس کے متعلق تو یہ بڑے سے بڑے فلاسفرز بھی طے نہیں کرسکے کہ اندر وہ ہے کیا چیز۔ انہوں نے ایک لفظ Mind کہا ہے۔ وہ Mind کے متعلق بھی کہہ ہی نہیں سکتے تھے کہ وہ کیا ہے؟ لیکن یہ تو ضروری ہے کہ میں اس کو پکڑنے کا ارادہ کرتا ہوں، میرا ہاتھ اس کو پکڑ لیتا ہے، اس ہاتھ کو کوئی کہتا ہے کہ اس کو پکڑ لے، ہم کچھ کہتے تو ہیں نہیں، اگر کچھ کہتے تو کسی باہر کے انسان کو کہتے۔ اپنے ہاتھ کو، اپنے اعضاء کو، تو ہم کہتے نہیں ہیں۔ بغیر کہنے کے یہ وہاں اسے پکڑنے کے لیے کیوں چلا گیا۔ یہ ایک مسئلہ ہو رہا ہے کہ Communicate (ابلاغ) کرنے والی چیز، کیا ہے جو دل کے ارادے کو ہاتھ تک پہنچاتی ہے کہ یہ کرو۔ قرآن میں جو ملائکہ ہے اس کا مادہ ''ا ل ک'' ہے، اس کے معنی پیغام رساں ہیں۔ آجکل اتفاق سے بڑی عمدہ کتاب میرے سامنے آگئی، اس کا نام Mind & Body ہے۔ کیا خوب ہیں یہ لوگ! بہت کوشش کرتے ہیں اس لیے کہ یہ مقلد نہیں ہیں۔ ملائکہ کی بات تو یوں ہوئی۔

ہمارے ہاں شیطان اور ملائکہ کا مروّجہ تصور اور ہزار برس سے ذہنی انتشار کی نوعیت

اب آگے شیطان آیا۔ ملائکہ کا تو پھر بھی جمع کا صیغہ تھا' یہ بہت سے تھے۔ شیطان تو واحد کا صیغہ ہے' ایک ہی ہے' تو اسے انہوں نے یہ بنایا۔ اب سوچیے کہ تصور یہ ہے کہ دنیا میں جہاں کہیں بھی کوئی انسان ہے اس کے پاس شیطان ہوتا ہے اور اس کو ورغلاتا ہے۔ دنیا کے ہر حصے' ہر گوشے کے اندر جہاں انسان ہے' اس کے ساتھ وہی ایک شیطان ہے۔ میں تو کبھی کبھی حیران رہ جاتا ہوں کہ ہمارے یہ عقل وفکر کے سوتچ آف کیے تو ہم اس قسم کی بنیادی غلطیوں نہیں گمراہیوں کے اندر پڑے ہوئے ہیں' ہزار برس سے کسی نے سوچا نہیں کہ ہم یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ عزیزانِ من! قرآن نے کہا ہے کہ دنیا میں بیک وقت ہر جگہ موجود ہونا' صرف خدا کی صفت ہے: **وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ** (57:4) یعنی تم جہاں بھی ہو خدا تمہارے ساتھ ہے۔ یہ صفتِ خداوندی ہے اور ہم اس شیطان کی خاصیت یہ بتاتے ہیں کہ جہاں بھی کوئی انسان ہے وہ اس کے ساتھ ہے (معاذ اللہ)۔ کوئی نہیں سوچتا کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں' اس کا نتیجہ کیا ہے؟ اس کا ان چیزوں کو سوچنے سے پتہ چلتا ہے۔

یہ عقیدہ چلا آ رہا ہے کہ ہر شخص کے ساتھ شیطان ہے' ہر جگہ ایک ہی شیطان ہے۔ یہ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ یہ خاص طور پہ خدا نے اپنی صفت بتائی تھی اور یہاں ہم شیطان کو یہ قوت ہی نہیں' پتہ نہیں میں اس کو کیا عرض کروں کہ اسے کیا قوتوں کا مالک بنا رہے ہیں (معاذ اللہ معاذ اللہ)۔ یہ ہر جگہ موجود ہونا خالص خداوندی صفت ہے اور ہم ہیں کہ کہتے ہیں کہ جہاں کوئی انسان ہے وہاں شیطان موجود ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ **وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ** (57:4) یہ خدا کے لیے تھا اور یہ اسے شیطان کے لیے کہتے ہیں اور نہیں سوچتے کہ کیا کہہ رہے ہیں۔

خدا کے حضور آدم کی لغزش اور معصیت اور پھر شیطان کی نافرمانی اور اپنی روش سے انکار

نظری چیز قرآن نے یہ بتائی کہ جسے یہ ابلیس اور شیطان کہتے ہیں' وہ راندۂ درگاہ ہو گیا' قیامت تک کے لیے دھتکارا ہوا ہے اور پھر وہ رجیم اور مردود ہوا اور پتہ نہیں کہ کیا کیا الفاظ اس کے لیے پکارے جاتے ہیں۔ گناہ کیا تھا؟ اس کا جرم کیا تھا؟ جرم یہ تھا اور میں اسے پھر دہرا دوں' جو میں نے کئی بار پیش کیا ہے۔ وہ بڑی بنیادی چیزیں ہیں کہ آدم سے ایک لغزش ہوئی' معصیت ہوئی' خدا کے حکم کی نافرمانی ہوئی' ابلیس سے بھی ہوئی۔ آدم سے پوچھا کہ تم نے یہ کیوں کیا؟ کہا کہ **رَبَّنَا ظَلَمْنَآ أَنفُسَنَا** (7:23) مجھ سے بھول ہو گئی' مجھ سے غلطی ہو گئی' میں نادم ہوں' مجھ سے یہ ہو گیا۔ مجھ پہ کچھ کرم کر۔ اُس نے کہا کہ تُو نے اپنی غلطی کو تسلیم کیا' تم میں احساسِ ندامت پیدا ہوا' اس سے اصلاح کا امکان ہے۔ اس لیے جاؤ اب تم آئندہ اِس روش پہ نہ چلنا' اس پہ چلنا' اصلاح ہو جائے گی۔ اصلاح کا امکان ہو گیا۔ ابلیس

سے پوچھا کہ تُو نے یہ کیوں کیا؟ اس نے کہا کہ میں کہاں کرنے والا تھا' تیرے حکم کے بغیر تو پتہ بھی نہیں ہلتا' یہ تو تُو نے کرایا ہے' میں اس کا ذمہ دار نہیں۔ کہا کہ تُو اپنی ذمہ داری قبول نہیں کرتا' قیامت تک تیری اصلاح نہیں ہو سکتی۔

ہم اپنی غلط روش کی ذمہ داری بھی شیطان پر ڈال دیتے ہیں

عزیزانِ من! یہی جرم ہے اور ہم یہی کیا کرتے ہیں جو ابلیس نے کیا تھا اور راندۂ درگاہ ہوا تھا۔ لغزش اسی سے ہوا اور یہ حضرت انسان کہے کہ صاحب! لاحول ولاقوۃ یہ جو شیطان مردود ہے' یہ انسان سے یہ کچھ کرا دیتا ہے۔ کہتا ہے کہ ''شیطان نے مجھے ورغلا دیا' صاحب! یہ بعینہٖ وہ بات ہے کہ مجھ سے جو لغزش ہوئی ہے میں اس کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ اُس نے خدا کو کہہ دیا تھا کہ تُو ذمہ دار ہے' ہم اسے کہہ دیتے ہیں کہ تُو ذمہ دار ہے۔ ذمہ داری کو قبول نہ کرنے سے ہی تو شیطان مردود ہوا تھا۔ ہم تو ہر آن' ہر سانس میں یہ کہتے ہیں کہ میں ذمہ دار نہیں ہوں' شیطان ذمہ دار ہے۔ بات تو ہم وہی کر رہے ہیں جس سے وہ مردود ہوا۔ کارِ بد تو خود کریں لعنت کریں شیطان پر۔ ہر شخص یہ کہتا ہے کہ شیطان نے ورغلا دیا صاحب! کیا کریں!!! یہ دوسری چیز ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ شیطان ہے کیا؟

اڑھائی ہزار سال سے خیر و شر کی گتھی کا حل قرآن حکیم کی روشنی میں

اسی سے ایک بڑا اہم مسئلہ پیدا ہوتا ہے' جسے خیر و شر کا مسئلہ کہتے ہیں۔ اڑھائی ہزار سال سے انسانی ذہن اس گتھی کو سلجھانے میں لگا ہوا ہے اور یہ پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ Good & Evil (خیر و شر) کا سوال یہ تھا کہ اگر خدا خیرِ محض ہے تو اس نے شر کیوں پیدا کیا اور اگر شر خود پیدا ہو گیا ہے تو پھر خدا کا اس کے اوپر کوئی اقتدار نہیں ہے' وہ بے بس ہے۔ اگر اس کی مرضی کے ساتھ پیدا ہوا ہے تو وہ خالقِ شر بھی ہے تو جو شر کو پیدا کرنے والا ہو' وہ خیر کا خالق کیسے ہوا!!! اور اگر یہ اس کی مرضی کی خلاف ہو رہا ہے تو پھر وہ قادرِ مطلق نہیں ہے۔ یہ فلسفیوں کے ہاں بڑا اہم معمہ ہے۔ قرآن تو اسے یوں بات حل کر دیتا ہے۔ عزیزانِ من! اس Good & Evil' (خیر و شر) کے Issue (مسئلے) پر اس کی Creation (تخلیق) کے مسئلے اڑھائی ہزار سال سے' بڑے بڑے فلسفیوں کی کتب سے لائبریریوں کے بڑے بڑے کمرے بھرے ہوئے ہیں اور وہ یہاں آ کر رک جاتے ہیں کہ یا وہ خیرِ مطلق نہیں یا وہ قادرِ مطلق نہیں۔ جب آپ بھی شیطان کو باہر کی ایک ہستی قرار دیں گے تو وہ تو شر ہو جائے گی۔ اب اس کے سمجھانے کے لیے تو لفظ ہستی یا ایک شخص' کچھ ایسا ہی کہنا پڑتا ہے لیکن بہرحال اس قسم کی کوئی شخصیت جو باہر ہے' اسے قرار دیں گے تو وہ تو شر یہ کچھ ہو جائے گی اور وہ سارا شر کرتا پھرتا ہے' خدا دیکھ بھی رہا ہے اور جو آپ مانتے ہیں کہ اس نے ہر ایک کو پیدا کیا ہے تو پھر شیطان کو اسی نے پیدا کیا ہوا ہے اور انسان کے ساتھ ہی اسے بھی چھوڑ دیا ہے۔ اس کی مرضی سے شیطان پیدا ہوا ہے۔ یہ تمام مفکرین اور فلسفی یہیں آ کر رک گئے' کہ آپ ہی خالقِ شر ہے یعنی شر پیدا

کرنے والا ہے۔اب اس کے بعد اتنی تاکید کی ہے کہ شر سے احتیاط برتو' اس کے پاس نہ جاؤ' یہ ہو جائے گا' وہ ہو جائے گا۔خود ہی اسے پیدا کیا ہے اور انسان کو کہہ رہا ہے کہ اس کے قریب نہ جانا۔اب سوال یہ ہے کہ حضور! نے اسے پیدا ہی کیوں کیا تھا۔یہ ہیں' وہ سوالات جن پر فلسفیوں کا ذہن جا رہا ہے۔دراصل یہ سوال ہی نہیں ہے' یہ کوئی اور ہے ہی نہیں' یہ انسان خود ہی ہے۔

خدا تعالیٰ نے کائناتی قوتوں کے بالمقابل صرف انسان کو اختیار و ارادہ کی نعمت سے نوازا ہے

اب یہ رہا کہ یہ جو پیدا کرنے والی بات ہے' وہ کیا ہے؟ کائناتی قوتیں جنہیں ہم نے ملائکہ کہا تھا' ان کے متعلق قرآن کریم بتاتا ہے کہ وَ هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ(16:49) وَ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (16:50) جو کائناتی قوتیں ہیں' جن کو ملائکہ بھی کہا ہے ان کو اس کا اختیار نہیں دیا گیا کہ ہم ان سے جو کہیں وہ اس کی خلاف ورزی کرتے چلے جائیں۔ان میں اس کا امکان ہی نہیں ہے' کائنات کی کسی قوت میں' کسی شے میں اس کا امکان ہی نہیں کہ وہ اس قانون کی یا اس حکمِ خداوندی کی خلاف ورزی کر دے جس کے لیے اس کو پیدا کیا گیا ہے ۔یعنی کائنات کی کوئی شے صاحبِ اختیار نہیں ہے۔صرف انسان ہی صاحبِ اختیار اور صاحبِ ارادہ ہے۔میں نے کہا تھا کہ صاحبِ اختیار کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس کے سامنے Two Opportunities (دو امکانات) موجود ہوں' دو راستے ہوں: وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ (90:10) دو راستے اس کے سامنے ہوں' غلط بھی ہو اور صحیح بھی ہو اور اسے بتا دیا جائے کہ یہ غلط ہے وہ صحیح ہے۔اس کے بعد کہا کہ ہم اب اس میں دخل نہیں دیتے کہ وہ کل کو کہے کہ صاحب! میں ذمہ دار نہیں تھا' اس راستے پہ چلنے کے لیے تو نے مجھے چلا دیا۔کہا کہ میں کچھ نہیں کرتا۔سنو! اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ (41:40) میری مشیّت میرے میدان میں ہے' یہاں تمہاری مشیّت کام کرے گی' جونسا راستہ جی چاہے اختیار کرو' غلط راستہ اختیار کرو گے تو یہ تمہارے لیے شر کا راستہ ہوگا' صحیح راستہ اختیار کرو گے تو وہ خیر کا راستہ ہوگا۔

شر تو انسان کی غلط روش کو اختیار کرنے کا نام ہے

یہ خیر اور شر کے مسائل راستے ہیں۔یہ ہمارا Create (پیدا) کیا ہوا شر نہیں ہے' اگر تم اسے اختیار نہیں کرو گے تو شر ختم ہو جائے گا۔اگر تم اسے اختیار کر لو گے تو تم نے شر کو خود قبول کیا ہے۔انسان کا جو خود اپنا ارادہ اور اختیار ہے' جب وہ قانون' احکام اور اقدارِ خداوندی کے مطابق چلتا ہے تو یوں کہیے کہ ملائکہ کی صفت بھی ہے' خدا کا قرب بھی ہے' انسانی حدِ بشریت کے اندر خدائی صفات کو پیشِ نظر رکھنے کی ایک تمنا ہے اور اگر وہ اپنے اختیار و ارادے سے اس کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اس کا نتیجہ تباہی ہے۔شر تو شر ہی ہے۔یہ تو انسان کے اپنے اختیار اور ارادے کے استعمال کا نام ہے' جونسا راستہ یہ اختیار کرے۔

غصہ کی حالت میں انسان کا دو ڈگری ٹمپریچر (F) بڑھ جاتا ہے

جو شر ہے، یہ شر رہے، ایک چنگاری ہے اور جو شیطان ہے یہ ''ش ط ن'' سے ہے۔ یہ بھڑک اٹھنے والا شعلہ ہے۔ انسان کو جذبات دیئے گئے، ان جذبات کی کیفیت یہ ہے کہ ہم میں سے جس وقت کسی کو غصہ آتا ہے تو وہ غضب کی حالت میں آجاتا ہے۔ عربی زبان میں غضب کے معنی میں شعلہ اور حرارت اور سرکشی ہوتی ہے۔ جب غصہ آتا ہے تو اور چیزوں کو تو چھوڑ دیجئے، انسان کا دو ڈگری (F) ٹمپریچر بڑھ جاتا ہے۔ یہ شعلہ اس قسم کا ہوتا ہے اور دل و دماغ کو اس وقت یہ جس طرح سے ماؤف کر دیتا ہے، جلا دیتا ہے، وہ تو ہم سب کے دیکھنے کی بات ہے۔ غصے میں کیا ہو رہا ہوتا ہے؟ یہ کہ وہ جو اس کے لیے کوئی اصول یا قدر مقرر کر دی تھی، وہ اس کو چھوڑ کر سرکش ہو جاتا ہے۔ ایک جذبے کو اسے تعمیری کام کے لیے استعمال کرنا چاہیے تھا، مگر یہ اس کے خلاف اس کو استعمال کر رہا ہے، اپنے اس جذبے کو سرکشی کرنے میں برت رہا ہے، اس میں تندی ہے، تیزی ہے، شعلہ صفتی ہے، مشتعل مزاجی ہے۔

انسان کے اپنے سرکش جذبات ہی شیطان ہیں

یہ جو انسان کے اندر اشتعال آجاتا ہے، اسے اس، جذبے کو ایک حد تک رکھنا چاہیے۔ جب یہ اس سے آگے بڑھ جاتا ہے تو یہ شطن (ش ط ن) ہے، جس کے عربی زبان میں معنی شعلوں کا مشتعل ہو جانا ہیں۔ یہ انسان کے اپنے ہی جذبے کی بات ہے۔ انسان کے، ہر فرد کے، اپنے جذبے کا اس طرح سے حدود فراموش ہو جانا، سرکش ہو جانا، قانون و اقدارِ خداوندی کے خلاف چل پڑنا، یہ انسان یعنی ہر فرد کی اپنی چیز ہے، ہر فرد اس میں خود اپنا شیطان آپ ہوتا ہے۔ یہ کوئی ایک شیطان نہیں ہے جو ساری دنیا میں ہر انسان کے ساتھ ہوتا ہے، یہ ہر فرد کے اندر ہوتا ہے اور اس کے اختیار میں ہوتا ہے کہ جی چاہے تو اس کو جھکائے رکھے کہ یہ اٹھنے نہ پائے اور جب ذرا سا بھی اس کو بیباک کیا تو پھر یہ شعلہ ہے، بھڑک اٹھتا ہے۔ انسان کے اندر یہی سرکش جذبات شیطان ہیں۔

Aggression (جارحیّت) کے ختم ہونے پر انسان کی نفسیاتی کیفیت مایوسی کی شکل اختیار کر لیتی ہے

اب اس کے بعد قرآنِ کریم کی ایک خصوصیت اور آتی ہے۔ مذہبی کتابوں میں بھی میں نے دیکھا ہے اور دوسری زبانوں میں بھی دیکھا ہے کہ شیطان کا تصور ہر جگہ ہے، اس کا لفظ ایک ہی ہے اور وہ وہی ہے جس کے معنی شیطان سمجھ لیجیے۔ جس کو شیطان کہیں گے، قرآنِ کریم میں اس کے لیے دو الفاظ آئے ہیں: شیطان بھی ہے اور ابلیس بھی ہے۔ یہ دو الگ الگ نہیں ہیں، یہ ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ ایک کے دو نام الگ الگ کیوں ہیں؟ ان کے ہاں اس دور کی سائیکولوجی کی ایک تھیوری ہے۔ اُسے "The Theory of Aggression & Frustration" (جارحیّت اور مایوسیّت کا نظریہ) کہتے ہیں۔ یہ عجیب چیزیں آ رہی ہیں، اللہ

تعالیٰ اپنی کتاب کے ان دعاوی کو ثابت کرنے کے لیے عجیب نشانیاں دکھا رہا ہے اور یہاں ہم ہیں کہ گویا

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

اور وہاں بیٹھے ہوئے وہ ملحد و بے دین ہیں جو قرآن سے واقف بھی نہیں ہیں' وہ ریسرچ کر رہے ہیں۔ اُنہوں نے یہ کہا ہے کہ جب بھی انسان کا غصہ جسے Aggression (جارحیت) کہتے ہیں' جسے استبداد' بالا دستی یعنی قوت کا حدود فراموش ہو جانا کہتے ہیں' جسے حد سے آگے بڑھ جانا کہتے ہیں' جسے دریا کا ساحل کو توڑ کر سیلاب بن جانا کہتے ہیں (وہ اسے Aggression کہتے ہیں)' ان ساحلوں کو توڑ دیتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ انسان کے اندر یہ چیز سائیکولوجیکل (نفسیاتی) ہے۔ جب ہر Aggression (جارحیّت) ختم ہوتی ہے تو اس کا نتیجہ Frustration (مایوسیّت) ہوتا ہے۔ عربی زبان میں شیطان کے معنی ''بھڑک اٹھنے والا'' قرآن میں ابلیس کے معنی ''مایوس ہوجانے والا'' ہیں۔ ہر Aggression (جارحیّت) کے بعد اس کا انجام Frustration (مایوسیّت) ہوتا ہے' غصے میں ابھرنے والا جذبہ' جسے اشتعال کہیے' شیطان ہے۔ جب یہ ابھرنے والا غصہ یعنی اشتعال فرو ہوجاتا ہے تو آپ دیکھتے ہیں کہ آپ اپنے کیے پر خود نادم ہوتے ہیں کہ میں کیا کر بیٹھا' پاگل ہو گیا تھا۔ غصے میں آدمی پاگل ہوجاتا ہے۔ دوسرے بھی اس کو کہتے ہیں' سمجھاتے ہیں اور میاں بیوی میں جو قصہ ہوتا ہے' اس کو تو پوچھیے ہی نہیں۔ جب کوئی کمزور شیطان کے سامنے ہو تو وہ تو پوچھو ہی نہیں کہ وہ کتنا بالا دست بن جاتا ہے! وہاں اس کی شیطنت ہوتی ہے' محسوس کر رہا ہوتا ہے کہ میں نے غصے میں یہ کچھ کہا مگر اس کا اعتراف نہیں کرتا کیونکہ بیوی کے میاں صاحب کا سامنے اعتراف کرنا اس کے لیے بڑی خجالت کا باعث ہو جاتا ہے۔

اشتعال کے ختم ہونے کے بعد انسان کے ٹمپریچر میں کمی اور جسمانی حالت میں کمزوری کی وجہ سے نفسیاتی کیفیت ندامت میں بدل جاتی ہے

یہ جو اشتعال کا درجہ ہے' جب وہ پیچھے لوٹتا ہے تو وہ اپنی سطح کے اوپر جا کر نہیں ٹھہرتا' اس سے نیچے چلا جاتا ہے' اس کا جسمانی درجہ حرارت F98 ڈگری سے کم ہو کر 96 ڈگری F پہ چلا جاتا ہے۔ یہ جو ٹمپریچر کا نیچے چلے جانا ہے' یہ اس کی ندامت ہے' اس کی مایوسی ہے' اس کی Frustration ہے۔ اس کے لیے عربی زبان میں لفظ ابلیس ہے۔ ابلیس کے معنی ہی ''مایوسی'' کے ہیں۔ وہ جو بھی اس کو شیطان کہہ رہا ہے تو وہ اس کی کیفیت ہے جب اس کا غصہ حدود فراموش ہو کر مشتعل ہو جاتا ہے اور جب اس کے بعد یہ ٹھنڈا ہوا ہوتا ہے تو وہ اسی کو ابلیس کہتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ خود ہی اس میں کس قدر مایوسی طاری ہوتی ہے۔ تو ہر شیطان کا' وہ جو سکے کا دوسرا رخ ہوتا ہے' وہ مایوسی ہوتا ہے' اس لیے یہ دو الفاظ آئے اور یہ قرآن کی انفرادیت ہے' عزیزانِ من! کہ کسی ایک کے لیے جو دو الفاظ ہیں' یہ قرآن کے ہی اندر

ہیں‘ دنیا میں کہیں اور نہیں ملتے۔ یہاں آج کے جو سائیکولوجسٹ ہیں‘ وہ اس کو یوں لا رہے ہیں۔ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ شیطان باہر کی کوئی ہستی نہیں ہے‘ یہ انسان کے اپنے ہی اندر کے غلط فیصلے کا نام ہے‘ جب یہ خدا کے اقدار یا اس کی مقرر کی ہوئی حدود سے سرکش ہو جاتا ہے تو خود اس کا شیطان اس وقت کام کر رہا ہوتا ہے اور جب یہ ان حدود کے سامنے جھکا ہوا ہوتا ہے تو یہ مومن ہے۔

انسان کا اپنا نفس ہی انسان میں وسوسہ پیدا کرتا ہے

اب دیکھیے کہ یہ جو چیز کہی ہے تو قرآن کس انداز میں اس بات کو بیان کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ شیطان خود تمہارے ہی اپنے جذبات کا نام ہے‘ یہ کوئی باہر کی چیز نہیں ہے۔ میں تفصیل میں جاؤنگا تو اس کے لیے بڑا وقت درکار ہوگا لیکن تفصیل کی بجائے میں مختصراً ایک اصولی چیز جو قرآن نے بیان کی ہے‘ اسے سامنے لاتا ہوں۔ اس سے یہ پوری وضاحت سامنے آ جاتی ہے۔ میں صرف اسی کو پیش کرونگا۔ (7:20) میں قصۂ آدم تمثیلی انداز میں آیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ **فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ** (7:20) شیطان نے ان کو ورغلایا‘ ان کے اندر وسوسہ پیدا کیا‘ غلط راستے کی طرف چلنے کے لیے اشارہ دیا۔ یہاں یہ شیطان کہا ہے کہ شیطان نے انہیں یہ کیا تو یہ سمجھ لیجیے کہ اسی سے ساری عمارت اس بنیاد پہ اٹھ جاتی ہے کہ شیطان نے ان کے دل کے اندر وسوسہ پیدا کیا (7:20) اور **وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ** (50:16) ہم نے انسان کو پیدا کیا **وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ** (50:16) اور اس کا اپنا نفس جو اس میں وسوسے بھی ڈالتا ہے‘ ہم اسے بھی جانتے ہیں۔ یعنی ایک جگہ کہا ہے کہ وسوسہ شیطان نے کیا اور یہاں کہا ہے کہ انسان کا اپنا نفس خود اس میں وسوسہ پیدا کرتا ہے تو بات تو صاف ہوگئی۔ میں کہتا ہوں کہ اب کسی اور دلیل اور سند و حجت کی ضرورت نہیں۔ قرآن کی یہ دونوں آیات موجود ہیں‘ وسوسے کا لفظ موجود ہے‘ وہاں شیطان بطور فاعل موجود ہے کہ وہ یہ کرتا ہے اُسی طرح سے یہاں انہی معنوں میں موجود ہے کہ **تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ** (50:16) (اس کے دل کی گہرائیوں میں کیا کیا خیالات اور وساوس گزرتے ہیں)۔ عزیزانِ من! کہا ہے کہ ہمیں کیسے معلوم ہوگیا کہ یہ باہر والا نہیں ہے‘ یہ کچھ اس کے اندر والا ہی کر رہا ہے؟ کہنے لگے کہ **وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ**. (50:16) ہم تو اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں‘ ہم تو اندر کی وہ بات جھانک کر دیکھ لیتے ہیں۔ اس سے بڑی سند و دلیل اور کونسی ہوسکتی ہے کہ یہ جو **نَفْسُهٗ** ہے‘ یہ انسان کا اپنا ہی نفس ہے۔ اس کو غلط راہ روی (روش) کے اوپر اکساتا ہے‘ اس میں وسوسہ پیدا کرتا ہے‘ ایک ڈائریکشن دیتا ہے‘ اشارہ کرتا ہے۔ اصل میں انکا جو لفظِ وسوسہ ہے یہ عجیب لفظ ہے۔ یہ شکاری دبے پاؤں آتے ہیں۔ یہاں تو آپ لوگوں نے کبھی دیکھا نہیں‘ ہم گاؤں میں دیکھتے تھے۔ وہ ’چی چُوک چی چُوک چی چُوک‘ ذرا سی ایک چیز ہوتی تھی‘ وہ ایسی آواز نکالتے تھے کہ جو پرندے ہوتے ہیں وہ ان آوازوں کے اوپر ان کی طرف آتے ہیں‘ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ بھی ہم میں سے کوئی پرندہ

ہے جس کی یہ آواز ہے۔ تو یہ جو اس قسم کی آواز نکالنی ہوتی ہے تا کہ وہ جو پرندے ہیں' اس آواز کے اوپر آ جائیں' یہ وسوسے کی بنیاد ہوتی ہے' یہ اس قسم کی دبے پاؤں آ کر ذرا سی چی چوک' چی چوک کی آواز مارنا' حرکت کرنا کہ وہ اس طرف چلا آئے' وسوسہ کہلاتا ہے۔ کیا بات ہے انسانی نفس کی بھی جو یہ کام کرتا ہے!

انسان کا ہر عمل انسانی نفس کا ہی رہین منت ہوتا ہے

اب رہا وہ مسئلہ کہ جسے انسان کہتے ہیں کہ میں نے یہ کہا' میں نے یہ کیا' اس میں یہ ''میں'' کون ہے؟ پھر وہی بات آ جاتی ہے کہ ''میں'' وہاں بیٹھا تھا' میرے دل میں خیال آیا کہ اگر یہ ذرا سامنے سے اٹھ کر چلا جائے تو ''میں'' اس کی گھڑی جیب میں ڈال لوں' وہ چلا گیا اور میرے ہاتھ میں گھڑی آ گئی' یہ ''میں'' کون ہے' جس نے یہ خیال کیا کہ ''میں'' یہ کر لوں۔ اس مسئلے کو چھوڑ دیجیے' قرآن اس کو نفس سے ہی تعبیر کرتا ہے۔ ابھی انسانی علم بہت پیچھے ہے کہ متعین کر سکے کہ یہ نفس کیا چیز ہے لیکن بہرحال اس میں کسی افلاطون کے دماغ کی ضرورت نہیں' ہم میں سے ہر شخص یہ جانتا ہے' یہ ہر روز کہتا ہے کہ ''میں'' نے یہ کہا' میں نے یہ کیا' میرا ارادہ ہوا اور پھر اس کے بعد ارادے کو بروئے کار لانے کے لیے اٹھا بھی' چلا بھی' چوری بھی کی' چانٹا بھی مارا' قتل بھی کیا۔ یہ تو سارا کچھ میرے ہاتھوں نے' میرے پاؤں نے' کیا۔ یہ اندر سے کوئی اور کر رہا ہے' یہ اندر سے کوئی اور ہے جو یہ کرانے والا ہوتا ہے۔ یہ ہوتا ہے بے اختیار انسان' وہ ''میں'' یہ فیصلہ کرتا ہے کہ مجھے یہ کرنا چاہیے' یہ نہیں کرنا چاہیے۔ جب بھی وہ احکام و اقدارِ خداوندی کے خلاف فیصلہ کر کے اپنی قوتوں کو استعمال کرتا ہے' تو انسان کا جو نفس ہے' وہ شیطان بن جاتا ہے اور اس کے بعد جب اس کے عواقب اور مآل سامنے آتے ہیں' نقصان رساں بات سامنے آتی ہے' تو پھر وہ مایوس ہو جاتا ہے' فیصلہ کرنے کے اس شعبے کی سطح نیچے آ جاتی ہے' یہ انسان کا ابلیس ہوتا ہے۔ مومن وہ ہے' جس کے جذبات اس سطح کے اوپر رہیں' جس پر رکھنے کے لیے خدا نے اُسے حکم دیا ہے' آگے بڑھیں تو خدا کے کسی فیصلے' پروگرام یا حکم کے بروئے کار لانے کے لیے آگے بڑھیں' پیچھے ہٹیں تو اسی صورت میں پیچھے ہٹیں۔ اس کا قیام بھی خدا کی رضا جوئی کے لیے ہو' اس کا سجدہ بھی اس کے احکام کی تعمیل کے اندر ہو' پھر تو یہ انسان عبدِ مومن ہے اور جب یہ اپنے کسی مفاد' غرض یا آرزو یا تمنا کے لیے اس کو استعمال کرے اور احکام و اقدارِ خداوندی کی حد سے بڑھ جائے تو شیطان ہے' اس کا جو نتیجہ' جو مآل ہے' وہ مایوسی ہے' ندامت ہے۔ یہ انسان کی ابلیسیّت ہے۔

ہمارے ہاں زندگی کو ختم کرنے کے لیے سورۃ یٰسٓ کا استعمال کیا جاتا ہے

ایک اور مثال لیجیے۔ آپ کو معلوم ہے کہ سورۃ یٰسٓ تو ہمارے ہاں جو مرنے لگتا ہے' اس وقت پڑھاتے ہیں۔ جان نہیں نکلتی تو سورۃ یٰسٓ پڑھتے ہیں۔ جب مایوس ہو جاتے ہیں تو اس مریض کو چارپائی سے نیچے اتار دیتے ہیں۔ اب جو نیچے لٹایا تو اس نے سمجھ لیا کہ اب

میری موت آ رہی ہے ''نہیں وی آنی ہوندی تے اس دھکے اچ ای مرجاندا اے[1]۔'' اس میں جو سائیکولوجیکل (نفسیاتی) Will Power (قوتِ ارادی) کام کر رہی ہوتی ہے' وہ بھی ختم کر دیتے ہیں۔ اقبالؒ (1938-1877ء) کہتا ہے کہ قرآن سے تمہارا تو اتنا ہی کام رہ گیا کہ ''از یٰسین او آساں بمیری''[2] یہ جو زندگی بخش خدا کی کتاب تھی' اس کا مصرف اتنا ہی رہ گیا ہے کہ زندگی کی جو تھوڑی بہت رمق رہتی ہے' قرآن کی آیت سنا کر وہ بھی ختم کر دو۔ تو سورۃ یٰسٓ یہ ہوتی ہے' آپ کو پتہ ہے کہ مغلیہ خاندان میں قلعہ معلیٰ کی جو بیگمات تھیں' وہ جب قرآنِ کریم پڑھتی تھیں' یا کسی کو قرآن کریم کے پڑھنے کا کہنا ہوتا تھا تو وہ یٰسین نہیں کہتی تھیں۔ یہ تو ان کے ہاں بدشگونی ہوتی ہے۔ جی یٰسین کا لفظ ہی کہنا ان کے ہاں بدشگونی تھی۔ وہ اس کا نام ننانی سورۃ لیتی تھیں ''یعنی کہ ایہد اناں نئیں لینا چاہیدا''[3]۔ یہ ننانی سورۃ سے مجھے یاد آیا ان کے ہاں یہ تھی[4]۔

لفظ اعبدوا کا قرآنی مفہوم

قرآن نے بتایا ہے کہ اَلَمۡ اَعۡهَدۡ اِلَيۡكُمۡ يٰبَنِىۡۤ اٰدَمَ اَنۡ لَّا تَعۡبُدُوا الشَّيۡطٰنَ‌ۚ اِنَّهٗ لَـكُمۡ عَدُوٌّ مُّبِيۡنٌۙ وَّاَنِ اعۡبُدُوۡنِىۡ‌ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسۡتَقِيۡمٌ (36:60-61)۔ میں نے تمہیں یہ حکم دیا۔ کہا ہے کہ اب اس آیت میں جو اعبدوا لفظ آیا ہے اس کے معنی آپ یہاں پرستش یا عبادت کرتے ہیں لیکن یہ تو معنی جچیں گے نہیں کہ تم شیطان کی' عبادت نہ کرنا۔ شیطان کی عبادت تو کوئی بھی نہیں کرتا۔ آپ کو معلوم ہے کہ عربی زبان میں اعبدوا کے معنی ہیں ''اس کو حاکم تصور کرنا' اس کی محکومیت اختیار کرنا' اس کے کہنے پہ چلنا''۔ اس آیت میں کہا ہے کہ ہم نے تم سے یہ کہا تھا کہ شیطان کی محکومیت اختیار نہ کرنا۔ یہاں تو شیطان کی بات کہی اور ذرا آگے (45:23) ہے۔ اسے ذہن میں رکھیے کہ یہاں کہا ہے کہ شیطان کو اپنا خدا نہ بنا دینا اور یہاں کہا ہے کہ اَفَرَءَيۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰٮهُ (45:23) تم نے اس کو بھی دیکھا کہ جس نے اپنے جذبات کو ہی اپنا خدا بنا لیا۔ بات صاف ہوگئی کہ یہ انسان کے اپنے ہی جذبات ہیں۔ جب وہ ان کو اپنا الٰہ بنا لیتا ہے' اپنا خدا بنا لیتا ہے تو ان کی محکومیت اختیار کرتا ہے۔ کرتا وہی ہے جو جذباتی طور پہ اس کے جذبات اس سے کہتے ہیں۔ وہاں اس کو شیطان کہہ کر پکارا ہے اور یہاں ھوٰہ کہہ کر پکارا ہے گویا یہ انسانی نفس ہے' جو پہلے ہم نے کہا تھا۔

---

1. نہیں بھی آنی ہوتی تو اس دھچکے سے ہی مرجاتا ہے۔
2. با آیاتش ترا کارے جز ایں نیست ...... کہ از یٰسین او آسان بمیری
   یعنی تجھے اس (قرآن) کی آیتوں سے سوا اس کے اور کوئی سروکار نہیں کہ تُو اس کی سورۃ یٰسین اس لیے پڑھے کہ آخری وقت تیری جان آسانی سے نکل جائے (تو قرآن کو موت وارد کرنے کے لیے پڑھتا ہے زندگی حاصل کرنے کے لیے نہیں)۔ حوالہ ارمغانِ حجاز ص 56۔
3. یعنی کہ اس کا نام نہیں لینا چاہیے۔
4. اس سورۃ کی مکمل تشریح و توضیح کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ یٰسٓ ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2009ء۔

انسان کا اپنے سرکش جذبات سے مغلوب ہونے کا نتیجہ

قرآن نے خود بتا دیا کہ جب انسان جذبات کو خدا بنالیتا ہے تو پھر اس کا نتیجہ اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً (45:23) جب یہ اپنے جذبات سے مغلوب ہوجاتا ہے یا یوں کہیے کہ اس کا شیطان اس پہ غالب آجاتا ہے تو پھر وہ علم وعقل کے باوجود اندھا ہوجاتا ہے، بہرا ہوجاتا ہے، گونگا ہوجاتا ہے، تباہ ہوجاتا ہے۔ یہ ہے شیطان کا غالب آجانا۔

شیطان کی ماہیت کے متعلق علامہ اقبالؒ کی گوہر افشانی

پہلی چیز جو میں نے ابھی عرض کی ہے، جس کا سمجھنا بڑا ہی ضروری تھا کہ وہ شیطان کوئی باہر کی ہستی نہیں ہے، یہ انسان کے اپنے ہی اندر کے جذبات ہیں، ان جذبات کو اگر خدا کی مقرر کی ہوئی حدود سے آگے بڑھنے دیا جائے، انہیں بیباک کر دیا جائے، سرکش کر دیا جائے تو وہ شیطنت ہے۔ یہی انسان کا اپنا شیطان ہے جو اس کے اندر ہے، کہیں باہر نہیں ہے۔ آپ کو یاد ہے اقبالؒ (1877-1938ء) بڑے حسین انداز میں بات کہتا ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ دیکھنے کے قابل ہوتا ہے عزیزانِ من! کہا کہ

جہاں تا از عدم بیروں کشیدند

یہ جو خدا کی پہلی، جسے میں نے فطرۃ الامور کہا تھا، ہے، اس نے کہا ہے کہ یہ اس جہان کو Nothingness (عدم) سے Beingness (وجود) میں لانا بیروں کشیدند ہے تاکہ وہ اس جہان کو، اس کائنات کو عدم سے باہر لائے۔

ضمیرش سرد و بے ہنگامہ دیدند

اس کائنات میں دیکھا کہ یہ بالکل ٹھنڈی تھی، کوئی ہنگامہ نہیں تھا، کسی قسم کی کوئی تپش نہیں تھی، کوئی حرارت نہیں تھی، اس کے اندر کچھ نہیں تھا تو وہ ابلیس سے، شیطان سے، مخاطب کر کے یہ کہتے ہیں کہ

بغیر از جانِ ما سوزے کجا بود

تم بتاؤ کہ کیا ہماری جان کے سوا اس کائنات کے اندر کہیں تپش و حرارت تھی؟ کہیں بھی نہیں تھی اس لیے

ترا از آتشِ ما آفریدند

(اقبالؒ: ارمغانِ حجاز، ص 177)

ارے آگ تو تھی ہی میرے اندر، کائنات میں کہیں اور تھی ہی نہیں، تو تیرے متعلق جو کہا جاتا ہے کہ تو آگ سے پیدا کیا، تو یہ آگ

خدا نے لی کہاں سے تھی کہ جس سے تجھے پیدا کیا؟ کائنات میں تو ہمارے سینے کے سوا آگ کہیں تھی ہی نہیں' تو ہمارے ہی سینے کے جو شعلے ہیں' تیری تخلیق ان سے ہوئی ہے۔ کیا خوبصورت انداز ہے بات کہنے کا!

جب قوموں کی قومیں اپنے سرکش جذبات کو اپنا خدا بنالیں تو پھر دوزخ کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی

اب یہ ہے کہ گویا ایک فرد شیطان ہے اور اگر اس قسم کے بہت سے افراد اکٹھے ہو جائیں تو پھر کیا ہو؟ اس کو جنود کہتے ہیں' اس کو لشکر کہتے ہیں' قوموں کی قومیں حزب الشیطٰن ہیں یعنی شیطان کی پارٹی یا گروہ ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ایک تو ہمارے ہاں لوگ اس کو بڑا شیطان کہتے ہیں اور جب قوموں کی قومیں شیطان بن جائیں' اتنے شیطان اکٹھے ہو جائیں ''کلہا ای مان نئیں ہوندا تے ایہدا پوچھو کی'' [1]۔ **اِسۡتَحۡوَذَ عَلَيۡهِمُ الشَّيۡطٰنُ** (58:19) ان کے اوپر ان کا شیطان بری طرح مسلط ہو جاتا ہے۔ کرتا کیا ہے وہ؟ آپ دیکھتے ہیں کہ غصے میں آدمی سب کچھ بھول جاتا ہے' اس کو بالکل ہوش نہیں ہوتا' پاگل ہو گیا ہوتا ہے۔ غصہ عارضی جنون ہوتا ہے' عزیزانِ من! اگر وہ ذرا بڑھ کر مستقل ہو جائے تو اسی کو پاگل پن کہتے ہیں۔ وہ بھی جنون ہوتا ہے' آدمی بھول جاتا ہے۔ کہا کہ وہ کرتا اتنا ہی ہے کہ **فَاَنۡسٰهُمۡ ذِكۡرَ اللّٰهِ** (58:19) خدا کے جو قوانین ہیں' وہ ان کو بھلا دیتا ہے۔ یہ کون ہیں؟ **اُولٰٓـئِكَ حِزۡبُ الشَّيۡطٰنِ** (58:19) وہ اکیلا ہی نہیں یہ کچھ کرتا' قومیں یہ کچھ کرتی ہیں' دوسری قوموں پر غالب آ جاتی ہیں اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ خدا کے قوانین کو پسِ پشت ڈال دیں۔ یہ ہیں جنہیں حزب الشیطٰن کہتے ہیں۔ وہ کس طرح سے غالب آتی ہیں؟ یہ غالب قومیں دوسری مغلوب قوموں کے اوپر کیا کیا طریقے اختیار کرتی ہیں؟

قرآنِ حکیم کے ارشاد کے مطابق شیطان کے منشور کی مختلف شقیں: پہلی چیز پروپیگنڈا اور فوجوں سے چڑھائی

یہ ہے وہ مقام جہاں قرآنِ حکیم تمثیلی انداز میں آدم اور شیطان کا بارگاہِ خداوندی میں پہلا تقابل سامنے لاتا ہے۔ شیطان نے یہ بات کہی تھی کہ ٹھیک ہے اس وقت تو آپ نے آدم کو اتنی بڑی فوقیت دی ہے' اس کی وجہ سے ہمیں راندۂ درگاہ بنا رہے ہو۔ اب دیکھ! کہ ہم کرتے کیا ہیں! **وَ اسۡتَفۡزِزۡ مَنِ اسۡتَطَعۡتَ مِنۡهُمۡ بِصَوۡتِكَ** (17:64) پہلی چیز یہ ہے کہ آواز کے ذریعے یعنی پروپیگنڈے کے ذریعے' ٹی وی کے ذریعے' ریڈیو کے ذریعے' دیکھنا کس طرح میں اس کو ورغلاتا ہوں۔ میں کرتا کیا ہوں؟ سنو! **فَاَنۡسٰهُمۡ ذِكۡرَ اللّٰهِ** (58:19) ایک ہی بات مجھے کرنی ہے کہ تیرے قوانین سے مجھے اس کو غافل کرنا ہے۔ میں نے اس کے ذرائع کیا اختیار کرنے ہیں؟ پہلی چیز تو یہ ہے کہ ان کے ملکوں میں پروپیگنڈہ کیا جائے گا' فضا ہموار کرنے کے بعد ضرورت پڑے گی تو پھر **وَ اَجۡلِبۡ عَلَيۡهِمۡ**

---

[1] اس کا پوچھنا ہی کیا' وہ تو اکیلا ہی کسی کے قابو نہیں آتا۔

بِخَيۡلِكَ وَ رَجِلِكَ (17:64) ذرا فوجیں لے کر چڑھائی بھی کرونگا' مفتوح ہو جائیں گی تو پھر کیا کرونگا؟

شیطان کی زیرِ نگرانی دوسرا حربہ: قوموں کی Economy (اقتصادیات) پر کنٹرول اور اس کا نتیجہ

کہا کہ ہر وقت تو پوری فوجوں کے ذریعے سے تسلط نہیں جمائے رکھنا پڑتا' مفتوح قوم یا مفتوح علاقے کے اوپر اپنی حکومت کو سوار رکھنے کے لیے اور حربے بھی استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ میں کیا کرونگا؟ کہا کہ وَ شَارِكۡهُمۡ فِى الۡاَمۡوَالِ (17:64) ان کی Economy (اقتصادیات) اس قسم کی بناؤنگا میں کہ اس میں میرا دستِ غالب 51% ہو' یہ شارِک ہے یعنی میں اس میں ان کو شریک کرونگا لیکن دستِ غالب میرا ہی رہے گا Economy (اقتصادیات) کے ذریعے سے ان کو تباہ کرونگا۔ دیکھ لیجیے عزیزانِ من! احزاب ہیں' یہ شیطان کے جنود ہیں' یہ قومیں ہیں۔ کہا کہ میں یہ کچھ کرونگا۔ ٹھیک ہے یہ تو جو موجودہ جنریشن ہے' ان کے متعلق اطمینان کر لیا کہ ایسے کرونگا' ایسے معاشی اور اقتصادی شکنجے میں ان کو جکڑ ونگا کہ یہ ہل ہی نہ سکیں' اس سے اپنے پاؤں پہ کبھی کھڑے ہی نہ ہو سکیں۔ میں یہ کچھ کرونگا۔

شیطانی منشور کی تیسری شق: آنے والی نسل کو تعلیم کے ذریعے اپنا محکوم بنالوں گا

یہ تو موجود نسل کو کرونگا اور پھر وَ الۡاَوۡلَادِ (17:64) ان کی آنے والی نسل کو ایسی تعلیم دوں گا کہ وہ پیدائشی میرے محکوم پیدا ہوں۔ ان کے لیے میں یہ کرونگا۔ کس طرح سے یہ میرے جھانسے میں رہیں گے؟ اس کے لیے کہا کہ وَ عِدۡهُمۡ (17:64) ان کو ایسے سبز باغ دکھاؤنگا کہ یہ ان بھول بھلیوں کے اندر سب کچھ بھول جائیں گے۔ ہم ان سے ایسے وعدے کریں گے وَ مَا يَعِدُهُمُ الشَّيۡطٰنُ اِلَّا غُرُوۡرًا (17:64)۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ الگ بات ہے کہ ان کے یہ سارے دعوے اور وعدے اور یہ سبز باغ' سب کے سب دھوکا ہی نظر آئیں لیکن دھوکا دینے میں یہ اپنی ہر ممکن کوشش کر جائیں گے۔ یہ اقوام ہیں' عزیزانِ من! جن کو قرآن نے حزب الشیطٰن کہا ہے۔ آپ دیکھیے کہ اب نظر آیا کہ یہ شیطان کی کتنی بڑی قوت ہے لیکن میں نے جیسا عرض کیا ہے کہ وہ شیطان کی باہر کی بات نہیں ہے۔ فرد جب یہ کچھ کرتا ہے تو اس کے جذبات اس کے اوپر غالب آ جاتے ہیں' جو جنود الشیطٰن ہیں' جو ابلیس کے جنود ہیں' یا جو قومیں اس قسم کی ہیں وہ اٹھتی ہیں تو وہ محکوم قوموں کو اس طرح سے دباتی ہیں۔ یہ شیطان نہیں' قرآن شیطان کے لشکر کہتا ہے' وہ اس طرح سے رہتے ہیں۔ یہ کپکپا دینے والی بات ہے۔

شیطان کی ان تمام چالوں سے محفوظ رہنے کا طریق اور علاج

آدم کے سامنے یہ سارا کچھ ہو رہا تھا اور وہ سن رہا تھا۔ نہتا بے سروسامان تو واقعی کانپ اٹھا ہوگا کہ اچھی معافی ملی' ہمیں اپنے ہاں سے

چھوڑ کر آزاد کیا اور اس کے بس میں ڈال دیا۔ کہا کہ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ(17:65)۔ عبدیت کی بات تھی کہ محکومیت اس کی نہ اختیار کرو ان کی محکومیت اختیار کرنے والوں کے اوپر وہ واقعی غالب ہوگا لیکن جو میری محکومیت اختیار کریں گے ان کے اوپر اس کا کوئی بس نہیں چل سکے گا۔ اب اس فقرے نے بڑے مسئلے حل کر دیئے ہیں۔

موجودہ دور کی سوشیالوجی کے ماحصل پر عیسائیت کے اثرات

آج کل بہت بڑے مسائل سوشیالوجی (عمرانیات) کے بھی پیدا ہو رہے ہیں' Ethics (اخلاقیات) کے بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ انسان کے اندر ایک شے ہے' یہ اس شے سے دور ہو ہی نہیں سکتا' اور یہ کہ شیطان اس کے اوپر غالب آتا ہے۔ کہیں تو اس شے کو Instinct (جبلت) کہتے ہیں' وہ اس کو الگ نہیں کر سکتا۔ کہیں اسے Inheritance (وراثت) میں ملنے والی شے کہتے ہیں یعنی جو چیزیں اس کو وراثت میں مل رہی ہیں' وہ اس کو الگ نہیں کر سکتے جو چیزیں ماحول سے اور بچپن سے اس کے اندر آتی ہیں' ان کو الگ نہیں کر سکتے۔ یعنی یہ ساری شر کی قوتیں اس کے اوپر غالب آتی ہیں۔ چنانچہ ماہرین عمرانیات و اخلاقیات اس نتیجے پہ پہنچے ہیں کہ یہ انسان کے بس کی بات ہی نہیں ہے کہ وہ شر کے اوپر غالب آجائے' انسان جاتا ہی تخریب کی طرف ہے۔ یہ ہے آج کی تحقیق کا ماحصل۔ اب بات میں سے بات نکل آئی' میں عرض کر دوں۔ یہ کچھ تحقیق کرنے والے تو بظاہر ایسے اسکالر ہیں جو عیسائی نہیں ہیں بلکہ وہ خدا کو بھی نہیں مانتے' ملحد اور بے دین ہیں ان کا اپنا اپنا الگ Department (شعبہ) ہے' جس میں وہ تحقیق کرتے ہیں۔ تحقیق کرنے کے بعد کس نتیجے پہ پہنچتے ہیں؟ یہ بڑا اہم سوال ہے۔ آپ دیکھیے کہ جن کو ہم یہ ریسرچ اسکالر کہتے ہیں' محقق کہتے ہیں' ہمارے ذہن میں تو یہ ہوتا ہے کہ یہ خالی الذہن ہو کر تحقیق کر کے کسی نتیجے پہ پہنچتے ہیں۔ Unconsciously یعنی غیر شعور طور پہ آپ دیکھیے گا کہ یہ عیسائی کے عیسائی ہی رہتے ہیں۔ یہ عیسائیت کی تھیوری (نظریہ) ہے کہ ہر انسانی بچہ اپنے ماں باپ کے گناہوں کا بوجھ لے کر پیدا ہوتا ہے اور وہ ساری عمر اس کو الگ نہیں کر سکتا۔ یہ بظاہر اپنی ریسرچ سے یہ چیز کہتے ہیں اور اسی نتیجے کے اوپر پہنچاتے ہیں' جہاں انہیں عیسائیت کے اس عقیدے نے پہنچا رکھا تھا۔ آپ نے دیکھا کہ یہ کتنی گہرائیوں میں بات جاتی ہے۔ عیسائیت کو' ہم میں سے' ہمارے دانشوروں میں سے' تعلیم یافتہ نوجوانوں میں سے' ہر ایک Condemn (موردالزام) کرتا ہے کہ صاحب! یہ کیا بات ہوئی کہ ہر انسانی بچہ اپنے اولیں ماں باپ کا گناہ اپنے ساتھ لاتا ہے' ساری عمر اس کو دھو ہی نہیں سکتا۔ اس کے خلاف تو اعتراض کرتے ہیں اور یہ ان کے جتنے ریسرچ اسکالر ہیں' ان نتائج کو اتھارٹی کے طور پہ پیش کرتے ہیں کہ واقعی انسان کے اندر یہ کوئی تخریبی بات ہے' شاید یہ اس سے تو الگ نہیں ہو سکتا۔ بقول ان کی سوشیالوجی (عمرانیات) یہ کہتی ہے' انتھروپولوجی (بشریات) یہ کہتی ہے' ڈارون (82-1809ء) نے یہ چیز کہہ دی' آج کی سائیکولوجی

(نفسیات) یہ کہتی ہے حالانکہ یہ عیسائیت کا جو گہرائی میں گیا ہوا عقیدہ ہے' وہ دلوں کے اندر پیوست ہے' جس سے یہ ماہرین یہ کچھ کہتے ہیں۔ قرآن وہیں دھڑلے سے ان سے یہ چیز کہتا ہے کہ نہیں' یہ بالکل غلط ہے: **اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ**(17:65)۔ کیا مقام ہے آدم کا! کہ جو میرے محکوم ہو جائیں گے' ان پر شیطان کا کوئی بس نہیں چلے گا۔

قرآنی اقدار کی حامل شخصیت پر انسان کے سرکش جذبات (شیطان) اثر انداز نہیں ہو سکتے

لہٰذا یہ بات ہی نہیں ہے کہ انسان کے اندر شر ہے اور وہ شر دور نہیں کر سکتا' یہ اندر شر کی بات نہیں ہے۔ جب یہ خود اپنے اختیار و ارادے سے غلط راستہ اختیار کرتا ہے' اس سے تخریب ہوتی ہے' جب یہ میرا محکوم ہوتا ہے تو جیسے شیطان سے ابلیس سے کہا جاتا ہے' کہ بڑے دعوے سے اس نے کہا تھا کہ میں یہ کچھ کرونگا' کہا کہ جو تیرے جی میں آئے کر کے دیکھنا **اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ** (17:65) ان کے اوپر تیرا کوئی بس نہیں چلے گا۔ یہ ساری جتنی تھیوریز (نظریات) اور ریسرچز (تحقیقات) ہیں' قرآن نے ایک فقرے کے اندر ان پر خطِ تنسیخ کھینچ کر رکھ دیا کہ یہ غلط ہے۔ انسان کے تو اختیار میں ہے کہ وہ قوانینِ اقدارِ خداوندی کی پیروی کرے اور جب وہ ان کی پیروی کرے گا تو اس کے اوپر شیطان کا کوئی بس نہیں چل سکتا۔ اقبالؒ (1938-1877ء) پھر آ گیا' کہتا ہے کہ یہ انسان کے اپنے ہی اندر کے جذبات ہیں' جو اس طرح سے ابھر کر مشتعل ہوتے ہیں۔

نفس کشی کا عقیدہ بھی عیسائیت کا دیا ہوا ''تحفہ'' ہے

ایک تو وہ نفس کشی کا طریقہ بتایا۔ ہمارے ہاں بھی یہ وہی نفس کشی' عیسائیت کے تصوف سے آیا ہوا ہے کہ ان جذبات کو مار ہی دو۔ یہ کس قدر غلط تصور ہے! پہلی چیز تو یہ ہے کہ وہ جذبات تو انسان کی بڑی متاع ہیں' یہ نہ ہوں تو کوئی کام ہی نہیں کر سکتا یعنی آپ کے دل میں کوئی آرزو ہی پیدا نہ ہو' آپ اٹھنے کا ارادہ ہی نہ کریں تو آپ قیامت تک نہیں اٹھ سکتے۔ یہ تو انسان کا اپنا جذبہ ہے جو سب کچھ کرا رہا ہے۔ انسان کی سب سے بڑی قوت تو یہی جذبات ہیں۔ خدا نے یہ پیدا کیے اور یہ کہتے ہیں کہ صاحب! جو مقربینِ خداوندی ہیں' ان کی علامت یہ ہے کہ وہ خدا کے ان پیدا کردہ جذبات کو مار دیتے ہیں۔ یہ جذبات مر سکتے ہی نہیں ہیں' وہ[1] کہتا ہے کہ

پری رو تاب مستوری ندارد

یہ جذبات جو ہیں' اگر تم ان کو پردے کے پیچھے رکھتے ہو' بند کر کے رکھتے ہو' تو یہ اس کو برداشت نہیں کر سکتے۔

چوں در بندی سر از روزن برآرد

---

[1] یہ اشارہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1938-1877ء) کی طرف ہے۔

تم دروازہ بند کردو گے‘ وہ روشندانوں سے جھانکنے لگ جائیں گے۔

ابلیس کے سلسلہ میں نبی اکرم ﷺ کی ایک حدیث چمکتی ہوئی: میں نے اپنے ابلیس کو مسلمان کرلیا ہے

بڑی عجیب چیز ہے جو یہ شاعر کہہ گیا ہے۔ آج کی سائیکولوجی یہ کہتی ہے کہ اگر ان جذبات کو آپ فطری طریق کے اوپر باہر نکلنے کی اجازت نہیں دیں گے تو یہ جسے Perversion (بدنہادی) کہتے ہیں‘ پھر یہ غیر فطری طریقے اختیار کرلیں گے۔ قرآن نے ان کے مارنے کا حکم نہیں دیا‘ ان کو تعمیر میں استعمال کرنے کا حکم دیا ہے‘ ان کو احکامِ اقدارِ خداوندی کے تابع رکھنے کا حکم دیا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو میں کئی بار پیش کرچکا ہوں‘ آج چونکہ وقت آ گیا ہے‘ تو میں پھر نبی اکرم ﷺ کی وہ چمکتی ہوئی حدیث پیش کرونگا اور اس کو اقبالؒ (1877-1938ء) نے اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ حدیث جو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب ہے‘ یہ ہے کہ حضور ﷺ نے ایک دن فرمایا کہ ہر شخص کا اپنا اپنا ابلیس ہوتا ہے‘ شیطان ہوتا ہے تو صحابہؓ نے کہا کہ حضور ﷺ آپ ﷺ کا بھی ابلیس ہے؟ کہنے لگے کہ ہاں‘ میرا بھی ابلیس ہے۔ یہ بڑی تعجب کی بات تھی کہ پیغمبر کہے کہ میرا بھی ابلیس ہے۔ کہنے لگے پھر؟ کہنے لگے کہ میں نے اپنے ابلیس کو مسلمان کرلیا ہے۔ مسئلہ حل ہوگیا۔ ابلیس کو مار نہیں سکتے‘ آپ اس کو مسلمان کرلیتے ہیں اور جب آپ کے جو جذبات ہیں‘ وہ مسلمان ہو جائیں‘ تو پھر دنیا میں اتنی بڑی قوت کسی اور کی نہیں ہوسکتی۔ بڑے حسین انداز میں پھر اقبالؒ کہہ گیا ہے۔

کشتن ابلیس کارے مشکل است

جذبات کو مارا نہیں جا سکتا‘ کیوں؟

زانکہ او گم اندر اعماقِ دل است

وہ تو تمہارے دل کی گہرائیوں کے اندر بیٹھا ہوا ہے‘ کیا وہاں اس کو مارو گے؟ بتاؤ تو یہ کس طرح سے ناممکن ہے۔

خوشتر آں باشد مسلمانش کنی

لہٰذا بہترین بات یہ ہے کہ اس کو مسلمان کردے۔

مومن کی پہچان یہ ہے کہ وہ شیطان کی ہر سازش کو قرآنِ حکیم کی تلوار سے ذبح کرتا ہے

عزیزانِ من! اقبالؒ تو بات کو یہیں نہیں چھوڑتا۔ اس نے تو شیطان کو مسلمان کرنے کا طریق بھی بتایا ہے اور وہ یہ ہے کہ

کشتۂ شمشیر قرانش کنی

اس کو قرآن کی شمشیر سے ذبح کرڈال۔ قرآن کی شمشیر سے جب اس کو ذبح کیا جاتا ہے‘ یعنی اس کو مسلمان کیا جاتا ہے تو پھر مومن

کی کیفیت ہوتی ہے۔ قرآن کریم میں کہا تھا کہ مومن کے اوپر تیرا غلبہ نہیں ہوسکتا۔ یہ کرتا یہ ہے کہ خدا کے احکام وقوانین کو اس کی نگاہوں سے اوجھل کر دیتا ہے' بھلا دیتا ہے۔ مومن تو وہ ہے جس کے اوپر یہ غلبہ نہیں پاسکتا۔ قرآن بتاتا ہے کہ **اِنَّ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا** (7:201) قوانینِ خداوندی کی رو سے بات کرنے والوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ **اِذَا مَسَّهُمۡ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيۡطٰنِ** (7:201) شیطان کا غلبہ تو ایک طرف' کہیں گھومتے گھماتے بھی وہ ان کے سامنے سے گزرتا ہے تو ان کو احساس ہو جاتا ہے کہ یہ تو یہ کرے گا' قانونِ خداوندی کو ہماری نگاہوں سے اوجھل کرے گا۔ جب یہ گھومتے گھماتے ایسے ہی سامنے سے بھی گزر جاتا ہے تو یہ کیا کرتے ہیں؟ یہ کہ **تَذَكَّرُوۡا** (7:201) وہ فوراً خدا کے قانون کو اپنے سامنے لے آتے ہیں۔ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ کیا بات ہے قرآن کی! کہا کہ **فَاِذَا هُمۡ مُّبۡصِرُوۡنَ** (7:201) دیکھیے! سارے پردے اٹھ گئے' ان کی آنکھوں کے سامنے حقیقت آ گئی۔ اس نے دھوکا دینا تھا' یہ قرآنِ کریم کی بصیرت سے اس دھوکے سے محفوظ رہے۔ کہا کہ **تذکروا** (7:201) اس کے فریب میں نہ آنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہر وقت قوانینِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھو کہ اس حالت میں مجھے کیا حکم دیا گیا ہے' اس حالت میں مجھے کیا کرنا ہے۔ کہیں گھومتے گھماتے' انسان ہے' کوئی اس طرح سے خیال تک بھی راہگذر میں سے گزرتا ہوا بھی نظر آئے تو وہ فوراً قانونِ خداوندی کو سامنے لے آتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ اس سے یوں ہوتا ہے جیسے تاریکی میں یکایک روشنی ان کے سامنے آ گئی اور انہیں صاف نظر آنے لگ گیا کہ ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیے۔

انسان خود اپنے ہی سرکش جذبات کی بنا پر اپنا شیطان آپ ہے

عزیزانِ من! آج کے درس کے اعتبار سے شیطان کا یہ تصور ہے' جو قرآن نے دیا ہے۔ یہ کہیں باہر کی بات نہیں ہے۔ یہ ہمارے ہی اندر کے جذبات ہیں۔ ہم ہی اپنے شیطان ہیں۔ ہم ہی اپنے ابلیس ہیں۔ ہم ہی اس پہ غالب آ سکتے ہیں اور وہ یہ کہ اقدارِ خداوندی کو نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دیا جائے تو یہ کچھ نہیں کرسکتا۔ اسی لیے کہا کہ **لَكُمۡ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوۡهُ عَدُوًّا** (35:6) اس کو دور رکھو۔ عدوا کے معنی یہ ہوتے ہیں۔ **اِنَّمَا يَدۡعُوۡا حِزۡبَهٗ لِيَكُوۡنُوۡا مِنۡ اَصۡحٰبِ السَّعِيۡرِ** (35:6) وہ جو دور رہنے والے ہیں' ان پہ اس کا کوئی بس نہیں چلتا' وہ جو اس کی پارٹی میں شریک ہو جاتے ہیں تو ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ یہ انہیں جہنم تک پہنچا کر رہتا ہے' کہتا ہے اس کو یہ جہنم میں لے جاتا ہے' اس کی پارٹی کا جو ممبر ہی نہیں بنتا' دور دور اس سے رہتا ہے' اس پہ اس کا کوئی بس نہیں چلتا۔ کہا کہ **اَلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لَهُمۡ عَذَابٌ شَدِيۡدٌ** (35:7) اور بڑا ہی سخت تباہ کن عذاب ایسے لوگوں پہ آتا ہے۔ اس کے برعکس **وَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمۡ مَّغۡفِرَةٌ وَّ اَجۡرٌ كَبِيۡرٌ** (35:7) اور جو ایمان لاتے ہیں اور اس کے بعد صلاحیت بخش کام کرتے ہیں' ان

کے لیے تو ان کا صلہ ان کا معاوضہ بہت ہی بڑا ہے' یہ مغفرۃ ہے یعنی ان کو شیطان کے ان تمام حربوں سے حفاظت مل جاتی ہے۔ یہ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ہے۔ بہت بڑی کبریائیاں ان کے حصے میں آتی ہیں' یہ قوت ہے' اس لیے اسے یہاں اجر کبیر کہا ہے۔

برائی کے سرزد ہونے کی شکل میں ندامت کے احساس کی اہمیت

کہا کہ ذرا دیکھیے۔ اب قرآن دونوں قسم کے انسان سامنے لے آیا۔ کہتا ہے کہ وہ کرتا یہ ہے کہ اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا (35:8) جب انسان اس کی نگاہوں سے چیزوں کو دیکھتا ہے' وہ اپنے آپ کو دیکھتا ہے' تو اسے اپنی برائیاں بھی بھلائیاں بن کر نظر آنے لگ جاتی ہیں۔ یہ بہت بڑا فریب ہے کہ اپنی خرابیاں بھی خوشنما بن کر نظر آتی ہیں' برائی برائی نظر نہیں آتی۔ ایک تو یہ ہے کہ انسان سے کچھ برائی سرزد ہوئی ہے' اس کے بعد اس کو احساس ہوا کہ یہ برائی تھی' میں نے برا کام کیا' مجھے افسوس ہے اس سے ندامت ہے' تو اصلاح ہو جائے گی۔ اور دوسری چیز یہ ہے کہ برائی برائی نظر نہ آئے بلکہ وہ خوشنما بن کر نظر آئے کہ میں نے بڑا اچھا کام کیا ہے صاحب! میں بڑا صحیح کام کر رہا ہوں۔ کہا کہ جس کی یہ کیفیت ہو تو فَرَاٰهُ حَسَنًا (35:8) پہلے یہ خود اپنے Mind (قلب) سے پیدا کرے کہ برائی برائی نظر نہ آئے بلکہ کہے کہ بہت اچھا کام کیا ہے تو آہستہ آہستہ ہوتا یہ ہے کہ وہ سچ مچ ہی ان کو خوشنما بن کر نظر آنے لگ جاتی ہیں' یہ اس فریب میں مستقل طور پہ مبتلا ہو جاتا ہے کہ میں بہت بڑے کام کرتا ہوں' دین کا کام کرتا ہوں' اسلام کا کام کرتا ہوں' بڑا نیک کام کر رہا ہوں۔ اس کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے۔

عزیزانِ من! آگے کہا ہے کہ فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ (35:8)۔ میں پھر بتاؤں کہ آپ کو قرآن شریف میں اس کا جو ترجمہ ملے گا اور جو میں بتاؤں گا تو ان دونوں کے اندر دیکھیے گا کہ کونسی بات فٹ بیٹھتی ہے؟ یہ کہ جو اپنی برائیوں کو بھلائیاں سمجھے' جس کے بداعمال اس کو خوشنما بن کر نظر آئیں اور کیفیت یہ ہو کہ ہر برائی کی چیز کو وہ مستقل یہی سمجھے کہ بھلائی کر رہا ہوں' میں اچھا ہی کام کر رہا ہوں' اس فریب میں مبتلا رہے اور اس کے آگے یہ ہو کہ اصل میں تو اللہ جس کو گمراہ کرے' بس وہ اس کو گمراہ کر دیتا ہے اور جس کو وہ ہدایت دے' اس کو ہدایت مل جاتی ہے۔ پہلی صفت جو وہ کہہ رہے ہیں تو وہ تو سارا کچھ وہ ہے جو خدا نے دیا ہے۔ یہ ہے' وہ مقام جہاں قرآن نے وَ لَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ (35:5) کہا ہے کہ کہیں مفاد پرست گروہ خدا کے قانون کے بارے میں اپنی چالبازیوں سے تمہیں چوکا نہ دے۔ یہ خدا کے نام پہ دھوکا دیتے ہیں۔ یہ ہیں' جو ہم ان چیزوں کے ترجمے کرتے ہیں۔ جب خدا ہی یہ کراتا ہے تو معاملہ ختم ہو گیا۔ وہ تو شیطان نے ٹھیک کہا تھا کہ میں نے کہاں معصیت کی' یہ تو آپ کراتے ہیں۔ یہ جو ہمارے ہاں کے ترجمے ہیں' وہ یہاں پہنچا دیتے ہیں اور پھر ہم یہ نہیں دیکھتے کہ شیطان کوئی باہر کی چیز تو ہے نہیں' تو پھر گمراہی کس کے حصے میں آتی ہے' اور وہ کون ہوتا

ہے؟اس آیت میں خدا یہ کہتا ہے کہ جو گمراہ ہو جانا چاہتا ہے' وہ گمراہ ہو جاتا ہے' جو صحیح راستے پہ چلنا چاہتا ہے' صحیح راستے پہ جاتا ہے۔ مـن یشآء کے معنی ہیں' جو چاہتا ہے' یہ چاہنا اس کا ہے۔قرآن نے کہا ہے کہ اِعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ (41:40) اپنی دنیا میں تم جو چاہو گے' وہ تم کر سکو گے' صحیح راستہ اختیار کرنا چاہو صحیح راستے پہ آ جاؤ۔

بار بار کسی انسان کی بدعملی پر نبی اکرم ﷺ کے قلبِ حساس کی کیفیت

آگے عزیزانِ من! عجیب چیز آئی ہے۔مـن یشـاء کا وہ غلط ترجمہ ہے۔اس ترجمے کے اعتبار سے تو اگلی بات بھی سمجھ نہیں آتی۔ بات کیا ہے؟ سنیے! نبی کا مقام مصلح کا مقام ہے' میں مثال دیا کرتا ہوں کہ جو طبیب مشفق ہے' محبت والا ہے' غمخوار' ہمدرد ہے' وہ دوا بھی دیتا ہے' وہ مریض کو ہدایات بھی دیتا ہے' بڑی تاکید کرتا ہے۔ مریض ان کی خلاف ورزی کرتا ہے تو مرض بڑھتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس سے غصہ بھی آتا ہے لیکن وہ جانتا ہے کہ اگر مجھے غصہ آ گیا اور میں اس سے ناراض ہو کر بگڑ گیا' تو یہ تو مر جائے گا۔اُسے اس کا افسوس ہوتا ہے کہ یہ اچھا بھلا سمجھدار ہے' بات بھی میں نے سمجھنے کی کی تھی' اسی کے فائدے کی بات بھی کی' وہ پھر سے آتا ہے' وہ پھر یہی کچھ کرتا ہے اور زیادہ تاسف کرتا ہے۔ آپ یہ اندازہ لگائیے کہ ایک نبی کا' ایک مصلح کا' مقام کیا ہے جو قرآن نے بتایا ہے؟ نبی اکرم ﷺ کے متعلق کہا کہ پوری قوم تباہی کی طرف جا رہی ہے' انہوں نے ان کو صحیح راستے پہ لانے کے لیے' تباہی سے بچانے کے لیے' اپنی ساری عمر گھلا دی' گالیاں کھاتے رہے' اینٹیں کھاتے رہے پتھر کھاتے رہے' اتنی لڑائیاں لڑیں' اُنہوں نے آن آن کر حملے کیے۔ساری عمر اس میں گزار دی' آخر میں' دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت' یہ ہونا چاہیے تھا کہ تیری یہ صورت ہے تو جا جہنم میں' مجھے کیا۔یعنی یہ اپنے لیے کچھ نہیں کر رہا۔ وہ کہہ رہا ہے کہ میں تم سے اس کا کوئی بدلہ نہیں مانگ رہا' تم سے کوئی اجر نہیں مانگ رہا' تمہاری خاطر یہ کر رہا ہوں۔لیکن طبیب ہے ذرا مشفق' تو خدا کو یہ چیز کہنا پڑی کہ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ (35:8) تُو اپنی جان کیوں گنوا رہا ہے' کیوں ان کے غم میں گھل رہا ہے۔اب جو پہلی بات تھی وہ سمجھ میں آ گئی۔اگر اس آیت کا ترجمہ یہ ہوتا کہ یہ تو خدا ہے' جو گمراہ کرتا ہے' خدا ہے' جو ہدایت دیتا ہے' تو نبی کو اپنی جان گھلانے کا کیا فائدہ تھا' نبی تو جانتا تھا کہ خدا ہی کرا رہا ہے تو وہ تو ان کو مجرم ہی نہیں سمجھتا تھا تو ان کی خاطر وہ اپنی جان پہ یہ کیوں بات لے رہا تھا۔ دیکھا آپ نے کہ یہاں بالکل ربط ہی نہیں رہا۔ کہا یہ ہے کہ یہ جو چیز ہے' یہ ان کو سب کچھ سمجھا دیا ہے' سمجھ میں بات آ گئی ہے' یہ ایسے بے بہرہ نہیں ہیں' جاہل نہیں ہیں' سب کچھ تو نے سمجھ لیا ہے' ساری عمر سمجھا بھی دیا' اب اگر اپنے اختیار و ارادے سے یہ خودکشی کرنا چاہتے ہیں تو تُو ان کی حالت پر کیوں اتنا غم کھا رہا ہے' جو اپنے اختیار سے خودکشی کرنا چاہتا ہے' اس کے اوپر کوئی غم کی بات نہیں اور کوئی غم نہیں۔

حسرٰت لفظ کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! قرآن یہاں حسرٰت کا لفظ لایا ہے۔ کہا ہے کہ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ(35:8)۔ یہاں حسرت بھی نہیں ہے بلکہ اس کی جمع ہے۔ حسرت کیا ہوتی ہے؟ ایک بات ذہن میں آ گئی اسے شعر سمجھا سکتا ہے۔ پہلے میں یہ عرض کروں کہ یہ مادے (Root) کے لحاظ سے ہوتا کیا ہے؟ یہ ہوتا ہے: کسی چیز کا انتظار کرتے کرتے تھک جانا' اس تھکنے سے جو تکان پیدا ہوتی ہے' جو افسردگی پیدا ہوتی ہے' اسے حسرت کہتے ہیں۔ یہ شدتِ انتظار ایک لمبا عرصہ ہوتا ہے' اس سے انسان تو تھک جاتا ہے۔ پھر انسان اس تکان سے جو افسردگی پیدا ہوتی ہے' اسے حسرت کہتے ہیں۔ عزیزانِ من! کتنا لمبا عرصہ تھا جو حضورﷺ نے انتظار کیا۔ اس انتظار میں کہ یہ اب بھی بچ جائیں' اب بھی یہ بچ جائیں' تھکتے گئے' آخر میں جا کر ان کی اس تباہی سے تھکتے گئے' کہ یہ نہیں بچ سکتے' ایک افسردگی سی پیدا ہو گئی۔ یہ ہے وہ کیفیت جس کو حسرت کہتے ہیں۔ میں نے اوپر کہا تھا کہ ذہن میں ایک بات آئی' اسے سمجھا دوں:

جو بے بس ہو کے رہ جاتی ہیں للچائی ہوئی نظریں
انہیں حسرت بنا کے ہم نے اپنے دل میں رکھا ہے

کس بات پہ رسول اللہﷺ کی للچائی ہوئی نظریں تھیں؟ کہ یہ کسی طرح سے بچ جائیں' آخر وہ نظریں بے بس ہو جاتی ہیں' اس سے بچ نہیں سکتیں۔ اُس پہ بھی یہ بات نہیں ہے کہ ان کی ذات بھلا دے یا کہہ دے کہ جاؤ! تمہارا بیڑہ غرق ہو۔ انسان کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے۔ یونہی بات آ جاتی ہے' بہر حال کبھی کبھی کچھ شعر بھی ایسا ہوتا ہے جو بات سمجھا جاتا ہے۔ غالب نے (1797-1869) نے یہ فرق کیا ہے کہ جو کچھ سابقہ تمنائیں' آرزوئیں تھیں' ان میں ناکامی تھی' وہ حسرت تھی' آنے والی زندگی کے متعلق کچھ تمنائیں تھی' ان کا بھی پتہ ہے کہ اسی طرح سے انہوں نے بھی ایک دن حسرت بن جانا ہے۔ کس خوبصورت انداز میں کہتا ہے کہ میری زندگی پوچھتے ہو' سنو!

آئندہ و گذشتہ تمنا و حسرت است

گزشتہ کی ساری زندگی حسرت تھی آئندہ کی ساری زندگی ایک تمنا تھی۔

آئندہ و گذشتہ تمنا و حسرت است
یک ''کاشکے'' بود کہ بہ صدجا نوشتہ ایم

اے کاش! میں یہ ہو جاتا' اے کاش! میں یہ ہو جاتا۔ تو ساری عمر ہر جگہ اے کاش لکھتا رہا ہوں۔ یہ ہے وہ عذابِ جہنم جس کے اندر سے نکلنے کے لیے قرآن کہتا ہے۔ تم ہزار بار ارادے بھی کرو تو نہیں نکل سکو گے لیکن یہاں اس حسرت کا ذکر ہے جو رسول کے قلبِ مطہر

میں ان کی تباہیوں پر پیدا ہوئی تھی' کہا ہے کہ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ (35:8)۔ یہاں یہ کہا تھا اور وہاں (35:5) میں وہ بات آ گئی' وہ کہا تھا کہ وَ لَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ (35:5) یہ تمہیں خدا کے نام کی آڑ میں دھوکا دیتے ہیں۔ اس کے نام کی آڑ میں کیسے دھوکا دیا جا سکتا ہے؟ سمجھ لیجیے کہ یہ کیسے ہوتا ہوگا' کہا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ (35:8) جو کچھ ہم نے ان سے کہا تھا کہ جو نظامِ خداوندی' اقدارِ خداوندی وغیرہ ہے' یہ اُسے مصنوعی طور پہ کچھ بنا دیتے ہیں' حقیقت میں وہ ایسا نہیں ہوتا' ان کی شکلیں وہ ایسی قائم کرتے ہیں' کہ وہ تصنع ہوتا ہے' مصنوعی ہوتا ہے۔ مصنوعی تو ہم سمجھتے ہیں' جو لفظ ہوتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ ان چیزوں کو مصنوعی طور پہ وہ کچھ بنا دیتے ہیں' یوں دھوکا دیتے ہیں' سب سے بڑا دھوکا یہ ہے۔

جھوٹ بالآخر بے نقاب ہو کر ہی رہتا ہے

عزیزانِ من! جھوٹ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا اگر وہ جھوٹ بن کر سامنے آئے۔ ایک شخص امیدیں دلا کر' قسمیں کھا کر' اپنا اعتبار جما کر' آپ سے وعدے کرتا چلا جائے' جاتے وقت یہ کہے کہ بھئی! سب کچھ ٹھیک ہے جو کچھ ہم نے کیا ہے لیکن میں نے جو کچھ تم سے کہا تھا جھوٹ کہا تھا تو کیا وہ اس کے دھوکے میں آ جائے گا؟ نہیں' قطعاً نہیں' جھوٹ بے نقاب ہو کر کامیاب ہو نہیں سکتا' اسے سچ کے لباس میں سامنے آنا ہوتا ہے۔ یہ دین جب مذہب میں بدلتا ہے تو یہ نہیں ہوتا کہ یہ خدا رسول نماز روزہ حج زکوٰۃ شعائر وغیرہ جو ہیں ان تمام کو اٹھا کر پھینک دو کہ بس کچھ نہیں ہے' وہ تو ملحد اور بے دین ہوتا ہے' انکار کرتا ہے' کافر ہے' اس کے دھوکے میں کوئی نہیں آتا' دھوکے میں اس کے آتا ہے کہ یہ ان چیزوں کا جو مقصد تھا وہ نگاہوں سے اوجھل کر دو' ان کی روح ان کے اندر سے نکال دو' خالی ان کے ڈھانچے کھڑے کر دو' ان سب چیزوں کو مصنوعی بنا دو' مصنوعی بنا کر خدا کے نام پہ دھوکا دے سکتا ہے۔ کیا بات کہہ گیا ہے قرآن! اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ (35:8). کہا ہے کہ آؤ تمہیں بتاؤں کہ یہاں بھی انتہائی مایوسی کی کوئی بات نہیں' اگر ان کے اندر زندہ رہنے کا ذرا سا امکان ہو' تھوڑی سی بھی رمق ہو پھر بھی زندگی مل سکتی ہے:

اگر یک قطرہ خوں داری' اگر مشتِ پرے داری
بیا من با تو آموزم طریقِ شاہبازی را

کچھ زیادہ ساز و سامان کی ضرورت نہیں' خدا کی راہ میں ایک قطرہ خون دینے سے' تھوڑے سے بال و پر سے' میں تمہیں شہباز بنا سکتا ہوں اتنا سا سامان لے کر تو آ جاؤ لیکن اگر وہ ایک قطرہ بھی اندر نہ رہے تو پھر موت ابدی موت ہوتی ہے۔

انسانی زندگی کی ادنیٰ سی صلاحیت بھی جہانِ تازہ کی نوید کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے

قرآن کہتا ہے کہ اگر زندہ رہنے کی تھوڑی سی صلاحیت بھی باقی ہو تو ہمارے ہاں سے بڑا سامان فراواں ملتا ہے' وہ یہ ہے کہ وَاللّٰهُ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ (35:9) تو ہم سمندر کے بخارات سے بادل اٹھاتے ہیں۔ ہم کیا کرتے ہیں؟ دیکھیے یہ تشبیہیں کیسی خوبصورت ہیں! وہ تو سمندر کے اوپر ہی بارش نہیں برساتیں اور اگر وہیں پر ہی ٹھنڈی ہو کر برس گئیں تو وہ سمندر کا پانی سمندر میں برس گیا تو اس سے کیا ہوا۔ کہتے ہیں کہ نہیں! پھر ہم ہوائیں بھیجتے ہیں' جو ان بادلوں کو وہاں سے دوسرے مقامات کی طرف ان زمینوں کی طرف' ان بستیوں کی طرف لیے جاتی ہیں جو اِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ (35:9) ہیں۔ مردہ لفظ کا ہمارے ہاں ترجمہ یہ ہے۔ عربی زبان میں یہ آخری لفظ ہوتا ہے جہاں وہ مردہ (Physically Dead) بھی کہتے ہیں لیکن اس سے پہلے ان کے ہاں وہ چیزیں ہیں کہ حرارت تو ہو لیکن وہ بڑی خاموش سی ہو' جسے آپ سوئی ہوئی حرارت کہتے ہیں' یا Delude (پُرفریب) کی ہوئی جو کوئی چیز ہوتی ہے' مثلاً ان کے ہاں شراب میں زیادہ پانی ملا دیا جائے تو اس شراب کو مردہ کہتے تھے' اس میں ابھی وہ کچھ تھوڑا سا نشہ باقی ہوتا ہے۔

وحی کے سمندر سے اٹھنے والے ابرِ رحمت کا ہر ایک قطرہ' ہر مردہ قوم کے لیے زندگی کا پیغام لیے ہوئے ہوتا ہے

پھر اسے ایسی زمین کی طرف لے جاتے ہیں کہ فَاَحْيَيْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (35:9) یہ وہ موت کی حالت میں نہیں ہے' یعنی وہ ایسی نہیں ہے جس میں زندہ ہونے کا امکان ہی نہ رہا ہو۔ جب بارش برستی ہے تو یہ جو زمینیں بارانی' ہیں' جن زمینوں میں کھیتی اگانے کی کچھ بھی صلاحیت ہوتی ہے' ان میں کھیتی کی نمود ہو جاتی ہے۔ ریگستان کے اندر بھی جب بادل برستا ہے' تو اس میں سے بھی کچھ اُگ آتا ہے' صحیح معنی میں وہ مردہ نہیں ہوگئی ہوتی کہ جس میں زندہ ہونے کا امکان ہی باقی نہ رہا ہو۔ یہ جو قرآن نے مثال دی ہے کہ زمینِ مردہ' دوبارہ زندہ ہو جاتی ہے تو دوبارہ زندہ وہ زمین ہوتی ہے جس میں زندگی کی کچھ بھی جو نمود اور رمق ہے' وہ ابھی باقی ہو' جس قوم کے اندر زندہ رہنے کی کچھ بھی آرزو یا تمنا یا صلاحیت یا قوت موجود ہو' وہ اگر خدا کے اس پیغام سے' جسے اس نے بارانِ رحمت کہہ کر پکارا ہے' وحی کی روشنی میں وہ اپنے نظام کو درست کر لے تو یہ وہ بنجر زمین ہے جس میں سے لہلہاتی ہوئی کھیتیاں اگ پڑیں گی۔

زندگی کی نشوونما کے لیے آرزو ایک قیمتی سرمایہ حیات ہے

کہا ہے کہ كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ (35:9) تم پوچھتے ہو کہ یہ حیاتِ تازہ عطا کیسے ہو جاتی ہے؟ کہتا ہے کہ اس طرح سے ہو جاتی ہے کہ وہ جو زندگی لے کر اٹھتا ہے وہ وہی اٹھتا ہے جس میں اٹھنے کی صلاحیت باقی ہوتی ہے' جو فی الواقعہ مر چکا ہوتا ہے' جسے ہم Physical

Death (طبعی موت) کہتے ہیں یا وہ زمین جس میں یہ صلاحیت ہوتی نہیں ہے' اس پہ بارش کچھ نہیں کرتی۔ زندگی کا نشوونما کے لیے' آرزو کا ہونا ایک بنیادی شرط ہے اور اگر کوئی قوم اس مرحلے تک جا پہنچے کہ اس میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہی باقی نہ رہی ہو' تو اس کی بنیادی وجہ ہی یہ ہوتی ہے کہ وہ قوم آرزو کے لازوال جذبے سے محروم ہو چکی ہے۔ سوال یہی ہے کہ اگر قوم اس مرحلے میں جا پہنچی ہے جہاں اس میں ابھی زندہ رہنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں ہے تو وہ زندہ نہیں رہ سکتی اور صلاحیت کا رہنے یا نہ رہنے کا جو ثبوت ہوتا ہے وہ آرزو ہوتی ہے۔

ما بہ تخلیق مقاصد زندہ ایم
از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

تمہارے دل کے اندر اگر زندہ رہنے کی آرزو ہے تو امکان ہے کہ تم زندہ ہو جاؤ گے اور جس میں زندہ رہنے کی آرزو ہی نہ رہے تو وہ زندہ نہیں ہو سکتا۔ خزاں کے زمانے کی جو خشک لکڑی ہے' وہ امیدِ بہار رکھ سکتی ہے لیکن وہ لکڑی جو پانی میں چلی جائے' وہ گل جاتی ہے' سڑ جاتی ہے' وہ کبھی زندہ نہیں ہوتی۔ یہ تصورات جو ہم پہ آ کر چمٹ گئے ہیں' یہ وہ ہماری سڑی ہوئی' گلی ہوئی لکڑیاں ہیں' جو پانی میں پڑی ہوئی ہیں ورنہ خشک لکڑی اگر درخت کے ساتھ رہے تو اسے امیدِ بہار ہوتی ہے۔

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ
ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے
مِلّت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

ذرا سی زندہ رہنے کی صلاحیت رکھ اور پیوستہ رہ شجر سے۔ یہ جو قرآن کا شجرِ طیب ہے' اس سے پیوستگی رہتی ہے تو امیدِ بہار رکھ۔ **مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا** (35:10)۔ کیا اگلا فقرہ ہے! کیا بات ہے! ابھی جو گمراہ ہیں' وہ بہت خستہ ہیں' بہت کمزور ہیں' بہت ناتواں ہیں۔ کیا کہہ رہے ہو؟ غلبہ چاہتے ہو' عزت چاہتے ہو' تکریم چاہتے ہو' قوت چاہتے ہو' تو سنو! **فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا** (35:10) کوئی بات نہیں' پوری کی پوری قوتیں' توانائیاں خدا کے قوانین کے ساتھ رکھو۔

عزیزانِ من! درس کا وقت پورا ہو چکا ہے اور بات آگے بہت اہم آتی ہے تو پھر یہ اس قسم کی قوم جو فی الواقع مر تو نہ چکی ہو' مردنی چھا چکی ہو' آرزو کی تابندگی ابھی اس میں بے تاب ہو' تو اس میں پھر سے حیاتِ نو پیدا کیسے ہوا کرتی ہے؟ اُسے پھر سے قوت' غلبہ' عزت' تکریم کیسے مل سکتی ہے؟ پہلے تو یہ اصول کہا ہے کہ اگر وہ تمہاری زمین ایسی ہے' جس میں اُگنے کی صلاحیت ہے تو پھر آؤ' سنو! **مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا** (35:10) ہمارے ساتھ آؤ:

بیا من با تو آموزم طریقِ شاہبازی را

لیکن وہ کیسے حاصل ہوگی؟ وہ اسی آیت کا اگلا ٹکڑا ہے اور وہ پروگرام ذرا لمبا بھی ہے' غور سے سمجھنے کا بھی ہے' اس لیے اُسے ہم آئندہ درس پہ اٹھا رکھتے ہیں۔

سورۃ فاطر کی آیت 9 تک ہم آ گئے' 10 ویں آیت سے ہم آئندہ آئیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

❀......❀......❀

تیسرا باب: **سورۃ فاطر** (آیت10)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من ! آج مئی 1980ء کی 16 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ فاطر کی آیت 10 سے ہو رہا ہے:

(35:10)۔

قرآنِ حکیم کی ساری تعلیم کا ملخص انسان کو اس کے مقام سے آگاہ کرنا ہے

جیسے آپ احباب کو علم ہے، میں نہایت انکساری سے متعدد بار عرض کر چکا ہوں کہ میری قریباً ساری کی ساری عمر قرآنِ کریم پر ہی غور و فکر میں گزری اور اگر مجھ سے یہ پوچھا جائے کہ اس کے بعد تم نے قرآن کی تعلیم کا ملخص کیا پایا، اس کا نقطۂ ماسکہ، اس کا مرکز، اس کا موضوع، اس کا عمود کیا ہے، یعنی یہ کیا چاہتا ہے، اس نے کیا کیا ہے، اس کی تعلیم کیا ہے، تو وہ ایک فقرے میں یہ ہے کہ اس نے انسان کو اس کے مقام سے آشنا کرایا ہے۔ ہمارے ذہنوں میں تو یہ ہے کہ خدا نے اس میں کچھ اپنے متعلق کہا ہوا ہے کہ وہ یہ کچھ کر رہا ہے، یہ اس کی کتاب ہے، اس نے اپنے متعلق یہ کچھ کہا ہے۔ یہ کتاب تو اس کی ہے مگر وہ جو اس [1] نے کہا ہے کہ

محمدؐ بھی ترا، جبریل بھی، قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا؟

(بالِ جبریل)

یہ انسان کا ترجمان ہے، اس نے انسان کو اس کے صحیح مقام سے آشنا کرایا ہے اور یہ چیز مذاہب کی دنیا تو ایک طرف رہی، دنیائے فکر و دانش میں

---

[1] یہ اشارہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) کی طرف ہے۔

کہیں نہیں ملے گی جو اس نے انسان کا مقام بتایا ہے۔ اس کو احسن تقویم میں پیدا کیا ہے۔ اپنی مخلوق سے بیشتر میں اس کو اشرف کہا ہے۔ وہ اشرف المخلوقات ہمارے ہاں یونہی ایک لفظ مشہور ہو گیا ہے' یہ پوری مخلوقات میں نہیں۔ قرآن نے کہا ہے کہ جو بیشتر مخلوق ہے اس میں اس کو اشرف پیدا کیا ہے۔ اور پھر اس کو واجب التکریم بتایا ہے' مسجودِ ملائک بتایا ہے۔ یہ ساری چیزیں بتائی ہیں۔

خدا اور بندے کا باہمی تعلق شرفِ انسانیت کی رفاقت کی شکل میں ہے

ایک چیز ان سب سے بلند' برتر اور اعلیٰ ہے جو اس نے بتائی ہے اور وہ آج کی جو آیت ہمارے سامنے ہے اس میں آئی ہے۔ آپ کو معلوم ہے' پچھلے درس کے آخر میں' میں نے یہ کہہ کر اسے چھوڑ دیا تھا کہ بات ذرا لمبی سی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس اعتبار سے جو سب سے بلند ترین مقام ہے وہ اس آیت کے دو فقروں میں آ گیا ہے۔ وہ مقام یہ ہے کہ خدا نے اسے اپنا رفیق قرار دیا ہے' خدا اور بندے کے درمیان رفاقت کا تعلق ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جیسا کہ حضورِ نبی اکرم ﷺ نے ایک چمکتی ہوئی حدیث میں فرمایا بلکہ حضور ﷺ کی حیاتِ ارضی کا جو آخری سانس ہے وہ اس آیت میں آتا ہے کہ آخری بات جو حضور ﷺ نے کہی تھی وہ یہ تھی کہ **بل الرفیق الاعلیٰ** میں جا رہا ہوں رفیقِ اعلیٰ کی طرف۔ خدا کو رفیق کہا ہے اور اس میں حسنِ امتیاز یہ ہے کہ وہ رفیقِ اعلیٰ ہے' ہم اس کے مقابلے میں رفیقِ ادنیٰ ہیں لیکن جو تعلق ہے وہ رفاقت کا ہے۔ یہ بہت بڑا تعلق ہے صاحب!

یہ آیت ہمارے سامنے آتی ہے' کہا ہے کہ **مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيعًا** (35:10)۔ سابقہ آیت کے تسلسل میں بات بیان ہو رہی تھی کہ تم غلبہ تسلط قوت اقتدار عزت تکریم چاہتے ہو تو یہ قوانینِ خداوندی سے وابستگی سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ تصنع کی جھوٹی ناپائیدار' اپنے آپ کو فریب دینے والی' دوسروں کو مکر سکھانے والی تکریم اور عزت اور اقتدار تو تم دوسرے طریقوں سے بھی حاصل کر سکتے ہیں لیکن وہ جس میں شرفِ انسانیت پنہاں ہے' وہ قوت' وہ تکریم' اصول و اقدارِ خداوندی کے ساتھ وابستگی سے حاصل ہو گی۔ کیسے حاصل ہو گی؟ اقدار و اصولِ خداوندی کے ساتھ وابستگی سے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ قرآنِ کریم بار بار یہی بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ بڑی چھوٹی سی آیت ہے۔

کلمات اللہ کی خصوصیت' وسعت اور جامعیت

عزیزانِ من! ایک ایک لفظ ایسا ہے کہ اس کے اوپر کھڑے رہیے' مہینوں تک کھڑے رہیے' سوچتے رہیے' وہ عجیب و غریب حقائق کی نقاب کشائی کرتا چلا جاتا ہے۔ کہا کہ اس کا طریق یہ ہے کہ **اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ** (35:10)۔ میں پھر کہوں گا کہ ایک ایک لفظ پہ کھڑے رہیے اور پھر عربی زبان کے اعجاز اور قرآنِ کریم کے انتخابِ الفاظ کی داد دیتے چلے جائیے'

عزیزانِ من! اس سے پتہ چلتا ہے کہ عربی زبان میں اتنے الفاظ جو ایک ہی مقصد کے لیے تھے' وہ مرادفات نہیں تھے۔ مرادف اس کو کہتے ہیں جس کے معنی میں کوئی فرق ہی نہ ہو۔ یہ تو زبان کا نقص ہوتا ہے کہ ایک معنی کے لیے دو الفاظ ہوں۔ کیوں دو الفاظ ہوں؟ ان کے ہاں تو ایک چیز کے لیے ہزار ہزار الفاظ ہوتے ہیں مثلاً اونٹ کے لیے ایک ہزار الفاظ ہیں' شمشیر کے لیے آٹھ سو الفاظ ہیں تو یہ معنی کیا ہوئے۔ ہر لفظ میں دوسرے لفظ کے ساتھ معنی کا ایک Shade (عکس) سا ہوتا ہے' جسے وہ ایک تھوڑا سا Shade (عکس) کہتے ہیں بس اتنا سا ان کے اندر معنی میں فرق ہوتا ہے۔ یہ تھی وہ زبان جس میں قرآنِ کریم کا نزول ہوا۔ کہا کہ **اِلَيۡهِ يَصۡعَدُ الۡكَلِمُ الطَّيِّبُ** (35:10)۔ **طیب** کا لفظ آیا ہے' شجرِ طیب وہ ہوتا ہے جس میں خوشگوار پھل آنے کے امکان ہوں اور شجرِ خبیث وہ ہوتا ہے جس میں پھل نہ آئے۔ اس میں دوسرا لفظ **کلم** آیا ہے۔ یہ کلمات اللہ نظریاتِ زندگی' تصوراتِ حیات' اقدارِ خداوندی' اس کے دیئے ہوئے اصول ہیں' ان سب کے لیے ایک لفظ کلمہ ہے اور بڑا ہی جامع لفظ ہے۔ یہی تو وہ لفظ ہے جس سے اس نے کلام اللہ کہا ہے' قرآن کلمت اللہ ہے۔ یہ جو ہر قسم کا کلمہ ہے' فقرہ یعنی Sentence ہے' اس کے لیے بھی یہ لفظ آئے گا۔ یہ جو خدا کے کلمات یا نظریاتِ زندگی ہیں' چونکہ آج کل ہمارے ہاں نظریات' آئیڈیالوجی کے الفاظ عام ہیں' اس لیے انہی معنی میں ہم نظریاتِ حیات یا اقدارِ خداوندی لے لیتے ہیں۔ ان کی تعریف یہ ہے کہ وہ طیّب ہیں' وہ نہایت خوشگوار پھل دیتے ہیں۔ کہا کہ یہ جو چیز ہے' وہ ان کے اندر موجود ہے' یہ تمہاری پیدا کردہ نہیں ہے' ان میں یہ چیز موجود ہے' یہ اس کی Potentiality (صلاحیت) ہے' یہ کچھ بن جانے کا امکان ان کے اندر ہے۔

انسانی ذات کی نشوونما کا انحصار صالح بیج کی مانند اعمالِ صالحہ کا رہین منت ہے

اب سوال یہ ہے کہ وہ یہ کچھ بنتا کیسے ہے؟ کہا کہ **وَ الۡعَمَلُ الصَّالِحُ يَرۡفَعُهٗ** (35:10) تمہارے جو اعمالِ صالحہ ہیں وہ انہیں یہ کچھ بناتے ہیں۔ کیا بات ہے! اگر آپ اہمیت کے اعتبار سے دیکھیے تو بیج کو ہی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ اگر وہ صالح یا طیّب نہیں ہے تو کسان جو جی میں آئے کرتا پھرے' اس کی ساری محنت رائیگاں چلی جاتی ہے۔ یہ جو Partner (شریکِ کار) ہے' اس کاروبار میں رفیق ہے' اس رفیق نے جو اپنا Share (حصہ) اس میں دیا ہے' بنیادی طور پہ اس کی اہمیت یہ ہے کہ اگر وہ طیب نہ ہو تو یہ محنت کرنے والا جتنا جی چاہے محنت کرے' وہ محنت رائیگاں جائے گی اور اگر وہ بیج طیّب ہے اور کسان اس میں محنت نہیں کرتا تو اس کا وہ بیج بھی رائیگاں چلا جاتا ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ رفاقت کی اہمیت کیا ہے۔ کہا ہے کہ **اِلَيۡهِ يَصۡعَدُ الۡكَلِمُ الطَّيِّبُ** (35:10)۔ پہلے آپ یہ دو الفاظ دیکھیے: **يَصۡعَدُ** اور **يَرۡفَعُهٗ**۔ کہا ہے کہ **وَ الۡعَمَلُ الصَّالِحُ يَرۡفَعُهٗ** (35:10)۔ ان دونوں الفاظ کے معنی بلند کے ہیں بلکہ ایک تیسرا لفظ بھی ابھی آنے والا ہے۔ وہ ہے **يَعۡرُجُ** (32:5)۔ میں نے کہا ہے اور صرف میں نے ہی نہیں کہا بلکہ خود اہلِ عرب کہتے ہیں' دنیا کے بڑے

بڑے اسکالرز کہتے ہیں کہ قرآنِ کریم کا ترجمہ تو کسی زبان میں ہو ہی نہیں سکتا۔ اب ہم ان الفاظ کا ترجمہ ''بلندی کی طرف لے جانے والا' یا بلند ہونے والا'' ہی کہیں گے۔ ہمارے ہاں دوسرا لفظ ہی نہیں ہے۔ قرآن ان دونوں الفاظ کو الگ الگ استعمال کر رہا ہے۔ الگ الفاظ میں تو معنی کی دنیا پوشیدہ ہے۔ کہا ہے کہ اِلَيۡهِ يَصۡعَدُ الۡكَلِمُ الطَّيِّبُ (35:10)۔ اَلۡكَلِمُ الطَّيِّبُ کے اندر یہ امکان موجود ہے۔ میں ''الیہ'' کا مفہوم ابھی بتا تا ہوں۔ کلمہ طیّب خدا کا عطا کردہ صحیح نظریۂ زندگی جس کے اندر خوشگوار نتائج پیدا کرنے کے امکانات ہیں' وہ اس کی طرف **الیہ یصعد** ہے یعنی اس کی طرف بلند ہوتا چلا جاتا ہے' چڑھتا چلا جاتا ہے۔

لفظ صعود اور یرفع کا مفہوم' ایک فرق کے ساتھ

کہا کہ وَ الۡعَمَلُ الصَّالِحُ يَرۡفَعُهٗ (35:10) انسانوں کے اعمالِ صالحہ يَرۡفَعُهٗ ہیں۔ یہ دوسرا لفظ يَرۡفَعُهٗ آ گیا۔ اس کے معنی بھی تو بلندی کے ہیں' بلند ہونے کے ہیں۔ يَصۡعَدُ ہے جیسے کوئی پہاڑ کی گھاٹی پہ بامشقت' آہستہ آہستہ چڑھتا چلا جاتا ہے۔ کوئی اس کو چڑھا نہیں رہا ہوتا' وہ (زورِ دروں سے) چڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس میں کچھ مشقت کا پہلو بھی ہوتا ہے۔ رفتار کم ہوتی ہے۔ پہاڑ کی گھاٹی پہ چڑھنا تو آپ جانتے ہیں۔ تو یہ ہے جہاں یہ **صعد** کا لفظ **صعود** کا لفظ' آئے گا: نہایت سست روی سے' آہستہ آہستہ' محنت کے ساتھ' بلندی کی طرف چلتے جانا۔ کہا کہ اس کے اندر یہ امکان ہوتا ہے' وہ جو ہم نے تمہیں آئیڈیالوجی یا نظریاتِ زندگی دیئے ہیں' ان کے اندر یہ چیز ہے۔ میں ابھی عرض کرونگا کہ یہ جو اس طرح سے **صعود** ہے' وہ کیسے ہوتا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ ان میں یہ چیز ہے کہ وہ بڑی سست رفتاری کے ساتھ' بڑی محنت کے ساتھ' اوپر چڑھتے ہیں لیکن اگر انسانوں کے اعمالِ صالحہ اس کے ساتھ ہوں تو یہ **یرفعه** ہوتا ہے یعنی یہ ان کو جلدی سے بلند کر دیتے ہیں۔ دیکھا دو الفاظ کا مفہوم اور عمل۔ اب عام طور پہ' جس طرح یہ معمار اینٹوں کا ایک ایک ردا اوپر رکھ کر دیوار کو بلند کرتا ہے' اور وہ دیوار اوپر کو اٹھتی چلی جاتی ہے وہ دیوار معمار کے اس پروگرام یا اس کوشش سے اٹھتی ہے' وہ از خود نہیں اٹھتی۔ یوں جو اٹھتی ہے تو وہ نظر آجاتی ہے کہ ''اج کنے ردے لائے ہیگے ای توں''[1]۔ آپ ایک نگاہ میں دیکھ لیتے ہیں کہ کل کے مقابلے میں یہ کتنی اوپر اٹھتی ہے۔ یہ اٹھنا يَرۡفَعُهٗ ہے۔ یہ اس کو بلند کیے چلا جاتا ہے۔

الیہ يَصۡعَدُ کی پیدا کردہ پیچیدگیاں

میں پہلے اِلَيۡهِ يَصۡعَدُ لیتا ہوں۔ اس کا ترجمہ ہے: خدا کی طرف بلند ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ جو ''خدا کی طرف ہے'' اس کے غلط تصور نے نہ صرف یہ کہ پیچیدگیاں پیدا کی ہیں' بلکہ گمراہیاں پیدا کی ہیں۔ عام طور پر وہ جو اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَيۡهِ رَاجِعُوۡنَ ہے اس کا ترجمہ کیا جاتا

---

[1] آج تم نے کتنے ردّے لگائے ہیں۔

ہے کہ ''ہم خدا کے ہیں اور ہم خدا کی طرف جائیں گے' رجوع کریں گے'' بلکہ کہا جاتا ہے کہ ''پھر سے جائیں گے' بارِ دیگر اسی کی طرف جائیں گے''۔ اور جب اس کی طرف کہا جاتا ہے تو محسوسات کا خوگر انسان لفظ طرف سے کسی مقام کا تصور ذہن میں لے آئے گا' اب جب آپ طرف کہیں گے تو ''اس طرف'' جانے کے لیے کوئی نہ کوئی تو مقام ذہن میں آئے گا۔ یہ جو Space یا مقام ہے' آپ کا ذہن اس سے باہر جا نہیں سکتا خواہ وہ عرشِ معلّٰی ہی کیوں نہ ہو' مقام ضرور آپ کے ذہن میں آئے گا۔

عزیزانِ من! اسی جہت سے تو ہمارے ہاں تجسم اور تنزیہ کی بنیاد پر دو فرقے پیدا ہو گئے: تجسیمیہ اور تنزیا۔ ایک نے یعنی تدسیمیہ نے تو یہ کہا کہ خدا اسی طرح سے ایک محسوس پیکر رکھتا ہے۔ قرآنِ کریم میں خدا کے ہاتھ' خدا کی آنکھیں' یعنی یہ جو چیزیں ہیں' یہ الفاظ آئے ہیں' جیسے کہتے ہیں کہ اس نے اپنے دستِ قدرت سے یہ بنایا' تو قرآن میں بھی ہے کہ خدا نے اپنے ہاتھ سے یہ بنایا' وہ ہماری آنکھوں کے سامنے یہ کر رہا تھا۔ اب' عزیزانِ من! سیدھی سی بات ہے کہ اگر زبان کے مجازی معنی سامنے ہوتے تو معلوم ہوتا کہ دست کے معنی ''اقتدار'' ہوتا ہے' ہماری آنکھوں کے سامنے یہ کر رہے کے معنی ''نگرانی'' ہوتا ہے لیکن ایک فرقہ آپ کے ہاں پیدا ہوا۔ انہوں نے ان کے حقیقی لغوی (Literal Meaning) لیے کہ خدا کے ہاتھ ہیں' ہماری طرح سے خدا سچ مچ کا ایک مجسمہ ہے' جیسے خدا سنتا ہے تو کان ہونے چاہئیں' خدا دیکھتا ہے آنکھیں ہونی چاہئیں تو اس کی آنکھیں بنائیں' اس کے کان بنائے پھر اس کے بعد اس کو ایک عرش پہ بٹھایا اور عرش آسمانوں کے اوپر پہنچایا۔ اس فرقے کے مقابل میں دوسرا فرقہ تنزیہہ پیدا ہوا' انہوں نے کہا کہ نہیں بابا! ان کے یہ سارے مجازی معنی لینے چاہئیں' یہ سچ مچ کے ہاتھ اور کان اور زبان اور آنکھیں نہیں ہیں۔

میرا کہنے کا مطلب یہ تھا کہ یہ جو اس قسم کے الفاظ اِلَیۡہِ یَصۡعَدُ ہیں یعنی اس کی طرف جاتے ہیں تو ''طرف'' سے ذہن میں ضرور ایک مقام آتا ہے۔ خدا زمان اور مکان (Time & Space) کی جو حدود ہیں ان سے ماورا ہے' منزا ہے' وہ زمان یعنی ٹائم (وقت) کے اندر بھی نہیں آ سکتا' وہ ہے جسے ہم ابدی' ازلی کہتے ہیں' نہ ہی وہ Space یا کسی جگہ کے اندر' کسی احاطے کے اندر آ سکتا ہے۔ یہ جو اِلَیۡہِ لفظ ہے' اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ خدا کسی مقام پہ ہوتا ہے جہاں انسان اس کی طرف جاتا ہے' اس کے معنی ہوتے ہیں کہ اس نے جو مقصد یا منزل متعین کر رکھی ہے' اس کی طرف جانا۔ مثلاً حضرتِ ابراہیمؑ نے اپنے ماحول کے اندر دیکھا کہ اس میں نظامِ خداوندی کے قائم کرنے کے امکانات نہیں ہیں' ان کی مخالفت شدت اختیار کر گئی ہے اور ہر رسول کے ساتھ یہ ہوا ہے' تو انہیں وہاں سے ہجرت کرنا پڑی' دوسرے مقام کی طرف جانا پڑا۔ آپ کو معلوم ہے کہ حضرتِ ابراہیمؑ نے جاتے وقت کیا کہا تھا کہ اِنِّیۡ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیۡ (37:99) میں اپنے خدا کی طرف جا رہا ہوں۔ اب ظاہر ہے کہ خدا فلسطین کی کسی سرزمین میں تو نہیں بیٹھا تھا۔ دوسرے مقام پہ ہے کہ اِنِّیۡ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیۡ (39:26) میں اپنے خدا کی طرف ہجرت کر کے جا رہا ہوں۔

خدا کی طرف جانے کا قرآنی مفہوم اور ہماری سوچ

میں کہنے یہ لگا تھا کہ جہاں یہ اِلَیْـہِ، اِلَیْنَا، اِلٰی رَبِّیْ، اِلَی اللّٰهِ کے الفاظ آتے ہیں تو ان کے معنی کوئی مقام نہیں ہوتا' ان کے معنی وہ مقصد' وہ منزل ہوتی ہے' جو خدا نے مقرر کی ہوتی ہے۔ اور اس کے لیے تو پھر وہ الفاظ لیجیے جہاں اِنَّـا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ آیا ہے۔ یہ عظیم چیز ہے۔ کہا ہے کہ وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَ الْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ (2:155) حق اور باطل کے تصادمات میں وہ مقامات آئیں گے جہاں تمہارا مقابلہ بڑی سختیوں سے ہوگا' بڑی مصیبتیں آئیں گی' جانیں جائیں گی' مال جائے گا' کھیتیاں برباد ہونگی' یہ سب کچھ ہوگا لیکن اس کے باوجود خدا کے مومنین' جو اس حق کا علم بلند کرنے کے لیے نکلے ہیں' یہ مصیبتیں' یہ مشقتیں' یہ چیزیں' ان کے قدموں کے اندر رکاوٹ پیدا نہیں کر سکیں گی۔ ہر نئی مصیبت' ہر نئے تصادم' کے بعد ان کی زبان کے اوپر یہ آئے گا کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ ان رکاوٹوں سے ہم رک جائیں گے' باز آ جائیں گے' یا اپنا رخ بدل دیں گے؟ نہیں قطعاً نہیں وہاں کہا ہے کہ اِنَّـا لِلّٰـهِ وَ اِنَّآ اِلَیْـهِ رٰجِعُوْنَ (2:156) کر لو جو کچھ کرنا ہے' ہم نے اپنے آپ کو خدا کے اس پروگرام کے لیے وقف کر دیا ہے' ہمارا ہر قدم اس منزل کی طرف اٹھے گا جو منزل اس نے مقرر کی ہے۔ یہ ہے اِنَّـا لِلّٰـهِ وَ اِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ۔ کتنا عظیم تھا' عزیزانِ من! یہ Declaration' یہ اعلان' یہ اعتراف! ہمارے ہاں جونہی کسی نے کہا کہ اِنَّـا لِلّٰـهِ وَ اِنَّآ اِلَیْـهِ رٰجِعُوْنَ (2:156)' تے اوہنوں پوچھیا ئی کیہڑا مر گیا اے ❶'۔ اس کا مصرف ہی اور کوئی نہیں رہا تھا۔ یہ عظیم چیز ہے کہ آئیں جتنی مشکلات آتی ہیں' جتنے تصادمات آتے ہیں' راستے کے اندر جتنی تکلیفیں آتی ہیں جتنی مشقتیں آتی ہیں' تم کھڑے ہو جاتے ہو مگر ہمارا راستہ کوئی نہیں روک سکتا: اِنَّـا لِلّٰـهِ او! ہمارا قدم اسی طرف جانے کے لیے اٹھ رہا ہے۔

میں کہہ یہ رہا تھا کہ اِلَیْـهِ یا اِلَیْـنَا کے قرآن میں یہ معنی ہیں۔ حضرتِ ابراہیمؑ نے جب کہا تھا کہ اِنِّـیْ ذَاهِـبٌ اِلٰـی رَبِّـیْ (37:99) میں جا رہا ہوں اپنے اللہ کی طرف' تو وہ یہ نہیں تھا جیسا میں نے کہا ہے کہ وہ کہیں فلسطین یا یروشلم یا ان میدانوں میں بستا تھا اور وہ کہتا تھا کہ میں اس کی طرف جا رہا ہوں۔

معراج شریف کے سلسلہ میں خدا تعالیٰ کے پاس جانے کا غیر قرآنی تصور

ضمناً بات آ گئی ہے تو بہر حال سن لیجیے۔ یہ جو ہمارے ہاں معراج شریف کا تصور ہے' میں اس پر لمبی چوڑی بات نہیں کرتا' ایک ہی فقرے میں بات کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ یہاں سے آسمانوں کے اوپر تشریف لے گئے' اس کے بعد پھر عرشِ معلیٰ پہ گئے' وہاں

---

❶ تو انہوں نے پوچھا کہ کون مر گیا ہے۔

خدا سے ملاقات کی' وہ جسمانی طور پر یہاں سے کسی مقام پہ گئے وہاں خدا سے ملاقات کی۔ اس پہ اعتراض ہی یہ وارد ہوتا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کسی مقام میں ہے' خواہ وہ آسمانوں کے اوپر ہی کوئی مقام کیوں نہیں ہے' جسمانی طور پہ وہاں جا کر اس کو ملنا ہوتا ہے۔ خدا نے جو اپنا تصور دیا ہے' یہ بات اس کے خلاف ہے اور باقی چیزوں کو تو چھوڑ دیجیے۔ انسان یہاں سے اپنے جسدِ عنصری یعنی اپنے جسم کے ساتھ' کسی خاص مقام میں جا کر خدا سے ملے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کسی خاص مقام میں ہے' خواہ آپ اس کا نام عرشِ معلٰی ہی کیوں نہ رکھ لیں وہ کسی مقام میں ہی ہوا لیکن وہ کہتا ہے کہ **هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ** (57:4) جہاں کہیں بھی تم ہو' وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ ہے اس کی لامکانیت (Spacelessness) کہ وہ کسی خاص مقام میں نہیں ہے۔

قرآنی قوانین کے ساتھ اگر انسان کا ہاتھ مل جائے تو پھر صدیوں کا سفر دنوں اور سالوں میں طے ہو جاتا ہے

عزیزانِ من! **اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ** (35:10) سے بات چلی تھی۔ جن نظریاتِ حیات میں نہایت خوشگوار پھل پیدا کرنے کی صلاحیت ہے وہ خدا نے دیئے ہیں اور میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ وہ بلند ہوتے چلے جاتے ہیں۔ الیه کے معنی خدا کی طرف نہیں ہیں۔ اس کے معنی اس Destination کی طرف' اس منزل کی طرف کے ہیں جو ان کے لیے خدا نے مقرر کی ہے۔ اب میں بتاؤں گا کہ یہاں جو **اِلَيْهِ يَصْعَدُ** کہا ہے وہ کیا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ وہ بلند ہوتے جاتے ہیں لیکن اس کے ساتھ **وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ** (35:10) کی بات ہے کہ جب انسان کے اعمالِ صالحہ اس کے ساتھ مل جاتے ہیں تو پھر ان کو وہ بڑی تیزی سے اوپر اٹھا دیتے ہیں یعنی وہ بہت جلد اس منزل تک پہنچ جاتے ہیں جو ان کے لیے خدا نے مقرر کی ہے۔ آپ پھر آ جایئے کسان کی مثال کی طرف۔ قرآنِ کریم نے اکثر و بیشتر ایمان اور اعمالِ صالحہ کی مثال زراعت کی دی ہے' کھیتی کی دی ہے۔ ایک ہل چلانے والا کسان بھی اس بات کو سمجھ سکتا ہے' نیوٹن (1642-1727) بھی اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ سب سے پہلے صحیح فارمولا ہونا چاہیے۔ اس فارمولے کو جب عمل میں لائیں گے تو وہ صحیح نتیجہ پیدا کرے گا۔ نیوٹن (1642-1727) تو یوں سمجھے گا۔ کسان یہ سمجھے گا کہ صاحب! بیج اچھا ہونا چاہیے' بیج اچھا ہوگا تو پھر زراعت کے قاعدے اور قانون کے مطابق اس پہ محنت کی جائے گی' عملِ صالح کے معنی یہی ہوتے ہیں' تو پھر وہ بیج اپنے نتائج پیدا کرے گا۔ بیج میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ یہ کچھ بن جائے بشرطیکہ کسان کی محنت صحیح قاعدے کے مطابق ہو۔ ہر طرح کے عمل کے متعلق قرآن نے نہیں کہا کہ وہ جو کچھ اس کے ساتھ کرتا رہے گا' ایک ایک سٹے میں سے جسے کہتے ہیں سات سات سو دانے نکل آئیں گے۔ ہر قسم کا عمل نہیں ہے۔ سارے قرآن میں عملِ صالح ہی وہ کام ہے جو ان کی صلاحیتوں کو جو ان کے اندر مضمر ہیں' بار زر کر دے۔ یہ ہے عملِ صالح۔

خدااور بندے کی رفاقت کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ انسانی زندگی خدا کے قانون کے مطابق ہو

یہ جسے آپ نیک کام یا برا کام کہتے ہیں' اس کی Definition (حدودِکار) یہ ہے۔ نیک تو لفظ ہی فارسی زبان کا ہے۔ یہ صالح کیا ہے؟ کچھ بننے کی جو صلاحیتیں اس کے اندر مضمر ہیں تو جو کام اسے وہ کچھ بنا دے' اسے وہ عملِ صالح کہتا ہے۔ وہی نیک کام ہے۔ کہا کہ جب انسان کا ساتھ مل جائے تو پھر یہ یَـرْفَعُهٗ ہوتا ہے یعنی پھر دیکھو کہ کتنی تیزی سے وہ اوپر جاتا ہے۔ میں دونوں کا جو فرق ہے اسے آخر میں جا کر عرض کرونگا۔ ایک ہے اس کا از خود اوپر کو اٹھنا اور دوسرا ہے جب انسان کے اعمالِ صالحہ اس کے ساتھ مل جائیں تو پھر وہ کیا بن جاتا ہے۔ یہی ہے جو خدا کی اور بندے کی رفاقت ہے۔ آیئے پہلے ذرا اس خارجی کائنات کو دیکھیں' انسان کی دنیا کے اندر تو اور بات ہے۔

خارجی کائنات کے اندر آپ دیکھیں گے کہ بہت کچھ خدا نے پیدا کیا ہے: پہاڑ ہیں' دریا ہیں' ستارے ہیں' چاند ہیں۔ یہ سب کچھ ہے لیکن ان کے ساتھ جب انسان کا ہاتھ لگ جاتا ہے تو وہ پتھر کی چٹان کو تاج محل بنا دیتا ہے' چٹان ورنہ چٹان ہی ہوتی ہے۔ خدا کی بنائی ہوئی سنگ مرمر بھی کیوں نہ ہو' قیامت تک پڑی رہے گی تو وہی پتھر کی چٹان ہوگی' پہاڑ پہاڑ رہے گا۔ گلاب کا پھول معلوم نہیں کہ شروع میں کیسے یہ وجود میں آ گیا۔ آج گلاب کے پھول میں' کم از کم چھ سو اقسام کے گلاب کے پھول ہیں۔ دو تین سال ہوئے ولایت کی ایک کیٹگری (قسم) آئی تھی' آج اتنے بنا دیئے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی سینکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں اور انسان بنائے چلا جا رہا ہے۔ پتھروں کو تراش تراش کر' اس میں پوشیدہ خدا بنا کر وہ سامنے لے آتا ہے' پہاڑوں کو کیا کچھ بنا رہا ہے' دریاؤں سے کیا کیا کام لے رہا ہے۔ کائنات کے حسن میں یہ جتنا نکھار پیدا ہوا ہے یہ انسان نے کیا ہے۔ اس نے تو صرف میٹریل (مواد) دیا تھا۔ اس کو عجیب عجیب سانچوں میں ڈھال کر آپ دیکھیے کہ یہ کیا کچھ بناتا چلا جاتا ہے۔ یہ تو میدان ہی اقبالؒ (1938-1877) کا تھا' اس نے بڑے حسین انداز میں بات کی ہے۔ یہ مکالمہ ہے خدا اور بندے کا۔ خدا کی طرف سے اگر تعمیر کا پہلو ہے تو تخریب کے پہلو کی چیز بھی اس کے اندر ہے' یہ بندہ اگر اتنی بڑی حسین عمارت بنا سکتا ہے تو ایک بم سے یہ تاج محل کو اڑا بھی تو سکتا ہے۔ یہ بھی تو چیز ہے۔ اس مکالمے میں خدا' اس کے اس قسم کے کاموں کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ تُو کس قسم کی تخریبی چیزیں پیدا کرتا ہے۔

خدا تعالیٰ انسان سے اس کی خامیوں کو بطورِ جرم بیان کرتا ہے

اقبالؒ (1938-1877) کہتا ہے کہ

جہاں را ز یک آب و گِل آفریدم

میں نے اس ساری دنیا کو ایک ہی آب و گل سے بنایا' سارے انسانوں کو ایک ہی مٹی سے پیدا کیا

تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی

تُو نے انسانوں کی اس طرح تقسیم کر دی کہ یہ افغانی' یہ تورانی' یہ ایرانی' یہ ہندی' یہ مصری۔ تُو نے اس کو کیا کر دیا ہے؟ اسے رنگ و نسل کا امتیاز دے دیا۔

من از خاک پولادِ ناب آفریدم

میں نے مٹی سے لوہا پیدا کیا' فولاد پیدا کیا

تو شمشیر و تیر و تفنگ آفریدی

تُو نے اس سے تلواریں بنائیں' نیزے بنائے' یہ کچھ کر دیا

تبر آفریدی نہالِ چمن را

میں نے درخت پیدا کیے' چمن پیدا کیے' تُو نے اسے کاٹنے کے لیے کلہاڑا پیدا کر دیا

قفس ساختی طائرِ نغمہ زن را ❶

چہکنے والے پرندے کے لیے تُو نے اس سے قفس اور پنجرے بنا دیئے۔ کیا کیا تُو نے!!

انسان نے خدا تعالیٰ کے حضور اپنی خوبیوں کو بیان کرتے ہوئے سن لیا۔ اس نے کن اکھیوں سے دیکھا زیرِ لب تبسم تھا۔ کہا کہ جرأتِ عرض معاف ہو یا شہنشاہیت کی زبان میں جان کی امان پاؤں' جسے کہتے ہیں' تو میں بھی کچھ عرض کر سکتا ہوں۔ کہا کہ کہو' کیا کہنا چاہتے ہو۔ کہنے لگے کہ یہ کہنا چاہتا ہوں

تو شب آفریدی چراغ آفریدم

رات اور رات کی تاریکیاں تیری پیدا کی ہوئی تھیں میں نے بجلی کے قمقمے بنا لیے۔

سفال آفریدی ایاغ آفریدم

تُو نے مٹی کا ڈھیر ہی پیدا کیا تھا' میں نے اس کے اندر سے کیسا خوبصورت پیالہ بنا دیا

بیابان و کہسار و راغ آفریدی

---

❶ ڈاکٹر محمد اقبالؒ: محاورہ مابین خدا و انسان: خدا (پیامِ مشرق)

تم یہی کہہ رہے ہو کہ تُو نے صحرا' میدان' پہاڑ' یہ کچھ پیدا کیے۔

خیابان و گلزار و باغ آفریدم

میں نے کیاری' گلزار اور باغ پیدا کیے' یہ کچھ میں نے بنایا۔

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم

اس نے کہا تھا کہ میں نے پتھر بنایا۔ ہاں ٹھیک ہے تُو نے پتھر بنایا تو میں نے اس پتھر سے آئینہ بنا لیا۔

من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم ❶

تُو نے زہر بنائی' میں نے اس کو ممدِ حیات بنا کر رکھ دیا۔ فرمایئے' حضور! کیا ارشاد ہے۔

انسان خدا کے حضور میں

یہ ہے انسان کا مقام۔ اور یہ تو پھر بھی اُس نے فارسی میں کہا ہے' دوسرے وقت میں' دوسری جگہ اور ذرا تھوڑا سا شوخ انداز ہے۔ بحضورِ ربُ العزت عرض کر رہا ہے کہ

قصور وار' غرٓیب الدیار ہوں لیکن

یہاں اقبالؒ (1938-1877) کے ایک ایک لفظ میں وہ چیز ہے جسے تلمیحات کہتے ہیں۔ تلمیح کے معنی ہوتا ہے کہ اشارے سے' قرآن کی کسی آیت' کسی بڑے واقعہ' کسی حادثہ' کی طرف شعر میں یا نثر میں یا لفظ میں اشارہ کر دینا' بات کھل کر نہ کہنا۔ یہ بڑا خوبصورت انداز ہوتا ہے۔ یہاں 'قصور وار' کہا ہے۔ آدم کے متعلق تو یہ ہے ہی کہ اس نے غلطی کی' قصور کیا۔ یہاں قصور وار بھی اپنے آپ کو کہہ رہا ہے۔ کہتا ہے کہ 'غریب الدیار ہوں' نکالا ہوا ہوں۔ ان دونوں چیزوں کو سامنے رکھیے' انسان کی کچھ قیمت ہی نظر نہیں آتی قصور وار بھی ہو' غریب الدیار بھی ہو' وطن سے نکال دیا ہوا اشتہاری مجرم ہے۔ کہا کہ جی! یہ ٹھیک ہے' حیثیت تو میری یہی ہے لیکن حضور ذرا غور فرمایئے کہ

ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد

یہ کسان جانتا ہے کہ خرابہ کسے کہتے ہیں۔ کہا ہے کہ

قصور وار' غریب الدّیار ہُوں لیکن
ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد

---

❶ ڈاکٹر محمد اقبال: محاورہ مابین خدا و انسان: انسان (پیام مشرق)۔

مری جفا طلبی کو دعائیں دیتا ہے
وہ دشتِ سادہ، وہ تیرا جہانِ بے بنیاد

اب آیا خارجی کائنات سے باہر اپنی دنیا کی طرف۔

مقامِ شوق ترے قُدسیوں کے بس کا نہیں
اُنھی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد ❶

اے حضور! قصور وار، غریب الدیار ہوں لیکن ذرا اس طرف بھی تو توجہ فرما دیجیے کہ میں کیا ہوں۔ دیکھتے ہیں کہ خدا اور انسان کا کیا تعلق ہے! کیا رفاقت ہے! اقبالؒ نے تو وہ جو میلادِ آدم ہے، اس میں انسان کے متعلق یہ چیز کہی تھی۔ جو بڑی خصوصیت خدا کے بعد اس کائنات میں انسان کو حاصل ہے، وہ اس کا اختیار و ارادہ ہے۔ وہ اپنے ہاں یہ کہتا ہے کہ ہم جو چاہتے ہیں اپنی مشیت کے مطابق کرتے ہیں۔ انسان کے متعلق ہے کہ **اِعۡمَلُوۡا مَا شِئۡتُمۡ** (41:40) اپنی دنیا میں تم اپنی مشیت کے مطابق کام کرو۔ اتنا بڑا مقام ہے یہ اختیار و ارادے کا! اسی کے متعلق یہ کہا کہ اس کو وہاں سے دنیا میں بھیجا گیا۔ یہ تمثیلی انداز ہے، ڈرامائی انداز ہے، بڑا خوبصورت ہے۔ پیامِ مشرق میں وہ باب انسان کا، آدم کا، جنت سے دنیا کی طرف ❷ آنا ہے۔ ایک دوسرے مقام پہ اس کے متعلق کہا ہے کہ

گفت یزداں کہ چنیں است و دگر ہیچ مگو
گفت آدم کہ چنیں است و چناں می بالست

سنو! دنیا میں جا تو رہے ہو مگر جیسا میں نے بنایا ہے وہ ویسے کا ویسا رہے گا۔ اس بات کو یاد رکھو! جا تو رہے ہو، وہاں بگاڑنا نہیں۔ بالکل نہیں! یہ ایسا ہے، ایسا ہو کر رہے گا جیسا میں چاہونگا، اس نے یہ کر کے دکھا دیا۔

انسان کے لیے اختیار و ارادے کی نعمت کا استعمال ہر دو شکلوں میں

اب یہی دو چیزیں اس کے اندر آئیں کہ اگر یہ اپنے اختیار و ارادے کو تخریب کی طرف استعمال کرتا ہے تو وہ جو خدا نے پہلے کہا تھا کہ میں نے تو صرف لوہا ہی بنایا تھا اور تُو نے شمشیر و تفنگ و تیر بنا کر کشت و خون بھی شروع کر دیا۔ اُسی لوہے کے شمشیر بنا کر اگر ظالم کا گلا کاٹتا ہے تو پھر کیا یہ خدا کا رفیق بن جاتا ہے؟ ایسا رفیق جس کے متعلق ہم روز کہتے ہیں کہ صاحب! یہ ظالم ظلم کیے چلے جاتے ہیں تو خدا کیوں ان

---

❶ اقبالؒ: بالِ جبریل، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، 1996، ص۔34۔

❷ اس باب کا نام ہے: تسخیر فطرت (4)، آدم از بہشت بیروں آمدہ می گوید (آدم بہشت سے باہر آتا ہوا کہتا ہے)، 1948، ص ص 99 تا 100۔

کا گلا نہیں کاٹ دیتا۔ وہ کہتا ہے کہ یہاں یہ ظلم کرنے والے کو بھی اختیار دیا ہے کہ اپنی قوت اور اقتدار کو جس طرح جی چاہے استعمال کرے اور دوسری طرف ہم نے صاحبِ شمشیر کو بھی یہ اختیار دیا تھا کہ شمشیر مظلوم کے سینے میں نہ گھونپو' ظالم کا گلا کاٹو۔ جب یہ ظالم کا گلا کاٹتا ہے تو خدا کا رفیق بنتا ہے کیونکہ اس نے کہا تھا کہ **اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ** (6:21) یاد رکھو! ظالم کی کھیتی پنپ نہیں سکتی۔ وہ اس کی کھیتی کو خود نہیں اجاڑنے آتا' مظلوم کی مدد ان انسانوں سے کرتا ہے جو اس کے رفیق بنتے ہیں۔ میں نے کہا ہے کہ اس موضوع کے اوپر تو پوچھو نہیں کتنا کچھ کہا جا سکتا ہے۔ میرا تو عمر بھر کا یہ موضوع رہا ہے' عزیزانِ من! اگرچہ اس کی رفاقت تو حصے میں نہ آئی لیکن اس کے جو رفقا بنے تھے ان کی حسین زندگیاں تو سامنے آ گئیں۔

خدا تعالیٰ کے ساتھ رفاقت کے معاملے کی نوعیت

سنیے! کس طرح یہ اس کا رفیق بنتا ہے' اس کا پروگرام اس کے ہاتھوں کس طرح بروئے کار آتا ہے؟ یہ بڑا ہی اہم نکتہ ہے۔ روز ہمیں شکایت ہوتی ہے کہ صاحب! ظلم بڑھتا جا رہا ہے' استبداد بڑھتا جا رہا ہے' سلب و نہب بڑھتا جا رہا ہے' کوئی ان کو لگام دینے والا نہیں ہے' خدا بیٹھا ہوا کیا کر رہا ہے؟ روز یہ اعتراض ہوتا ہے۔ خدا نے خود کرنا ہوتا تو تمہیں صاحب اختیار بنا کر بھیجتا ہی نہیں۔ ابھی وہ آیت آتی ہے جس میں کہتا ہے کہ کتنا حصہ ہم کرتے ہیں اور کتنا تمہارے لیے چھوڑ دیا کرتے ہیں۔

میں یہ چیز عرض کر رہا ہوں کہ ظالم ظلم کیسے چلا جا رہا ہے۔ یہ سورۃ نسآء کی آیت 75 ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ جماعتِ مومنین مکے سے ہجرت کر کے مدینے چلے گئے' وہاں جا کر اپنی مملکت بھی قائم کی۔ اگرچہ ابتدا میں چھوٹے سے پیمانے پہ تھی' اقتدار کی قوت بھی حاصل تھی۔ کچھ مسلمان ساتھی مکے میں پیچھے بھی رہ گئے تھے۔ اب سوچ لیجیے کہ مکے کے مسلمان جو پیچھے رہ گئے ہیں' ان کے ساتھ مکے میں بسنے والے دشمن کیا نہ کرتے ہونگے۔ یہ تو جہالت کا وہ زمانہ تھا۔ یہ تھوڑی سی جماعت تھی۔ وہ قریش اتنے بڑے تھے' آج آپ دیکھیے جو ہم انڈیا کے اندر پیچھے چھوڑ آئے تھے' جو وہاں رہ گئے تھے' وہاں ان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ وہ جو مکے میں رہ گئے تھے' ان پہ بڑے مظالم ہو رہے تھے' ان کے مظالم سے وہ خدا کو پکارتے تھے کہ ہمارے لیے کچھ کر' ان ظالموں کی بستی سے ہمیں نجات دلا۔ وہ یوں خدا کو پکار رہے تھے۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے مظلوم کی آہ و پکار کے جواب کا طریق

سنیے الفاظ' عزیزانِ من! خدا کی طرف سے مدینے کے مومنین سے کہا جاتا ہے' مسلمانوں سے کہا جاتا ہے کہ **وَ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ** (4:75) تمہیں کیا ہو گیا ہے' ان کی مدد کے لیے اٹھتے کیوں نہیں ہو۔ وہ خدا سے براہِ راست کہہ رہے ہیں۔ ابھی وہ الفاظ آتے ہیں۔ خدا قادرِ مطلق ہے تو اس کے لیے کیا مشکل ہے کہ بستی کی بستی کو غرق کر دے مگر وہ نہیں کرتا۔ مدینے والوں کو کہتا ہے کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ ان مظلوموں کی مدد کے لیے اٹھتے نہیں ہو۔ کہا کہ **وَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ**

اَلَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْیَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَاوَ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْکَ وَلِیًّا اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْکَ نَصِیْرًا (4:75)او سنتے نہیں ہو‘ وہ کس طرح سے پکار پکار کر ہم سے کہہ رہے ہیں! وہ کہہ رہے ہیں کہ یا اللہ! ہماری کوئی مدد کر‘ اس ظالموں کی بستی سے نکال‘ کوئی ہمارا حامی و مددگار بنا‘ ہمارا کوئی غمگسار بنا‘ یا اللہ! کچھ کر ہمارے لیے۔ خدا مدینے کی مملکتِ اسلامیہ یا اس جماعت سے کہتا ہے کہ او! سنتے نہیں ہو‘ وہ ہمیں کس طرح سے پکار رہے ہیں‘ تم بیٹھے ہوئے ہو۔ کیا بات ہے! انسان کا مقام یہ ہے‘ عزیزانِ من! یہ عظیم آیت ہے‘ الفاظ غور طلب ہیں کہ سنتے نہیں ہو‘ وہ ہمیں کس طرح سے پکار رہے ہیں‘ ہم سے کہہ رہے ہیں کہ یہ کرا ور تم اپنے کان لپیٹ کر بیٹھے ہوئے ہو‘ تم سنتے ہی نہیں ہو۔ ہمارے جیسے ہوتے تو وہ کہتے کہ سرکار! کہہ تو وہ آپ سے رہے ہیں ”تے اے بلا تسی ساڈے گلے پان ڈئے ہیگے او‘ ایہہ کی گل ہوئی اوہ تہانوں کہندے پئے ہیگے نیں‘ تسی ساڈے ول ڈالدے پئے او[1] “ کیا بات ہے؟ کیا آپ بے بس ہو گئے؟ (معاذ اللہ) آپ قادرِ مطلق ہیں تو کیجیے‘ کرنا نہیں چاہتے تو پھر ہم سے کیوں کہتے ہیں؟ کہا کہ سنتے نہیں ہو‘ وہ ہمیں کس طرح سے‘ کس غمگساری سے‘ پکار رہے ہیں‘ او تمہیں کیا ہو گیا ہے‘ جو اٹھتے نہیں ہو۔

حضرت عمرؓ کے نزدیک خلافت کے فریضہ کی عملی شکل

دیکھ رہے ہیں رفاقت! دیکھتے ہیں انسان کا مقام! کس حسین انداز میں حضرتِ عمرؓ (581-644/45ء) نے کہا تھا! وہ لوگ قرآن کو سمجھتے تھے‘ یہ سمجھے تھے مقام! یہ بات جو کہی ہے‘ بڑی گہری ہے۔ اپنے دورِ خلافت (634-644/45ء) میں آپؓ نے ان لوگوں سے ایک دفعہ کہا تھا کہ آپ کو پتہ ہے کہ میرے سپرد خدا کی طرف سے کیا کام ہوا ہے‘ کہا کہ میرے ذمے یہ فریضہ عائد ہوا ہے کہ جو دعائیں تم خدا کو کرتے ہو‘ میں انہیں خدا تک نہ پہنچنے دوں‘ راستے میں روک لوں۔ اس تک پہنچیں تو اس نے بھی تو مجھے ہی کہنا ہے‘ تو میں یہ لمبا چکر کیوں کرنے دوں۔ بڑا عجیب فقرہ ہے۔ ایک تو اس میں انسان کا اور خدا کا جو تعلق ہے وہ بتایا‘ دوسرے یہ بتایا کہ اگر تمہاری کوئی ضرورت رکی رہے گی‘ تبھی تو تم خدا سے دعا کرو گے۔ جن کی کوئی ضرورت رکتی نہیں ہے‘ وہ تو خدا سے دعا نہیں کرتا۔ میں روک کر تمہاری ضرورت پوری کر دیتا ہوں‘ تمہیں خود ہی دعا کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اور آگے یہ ہے کہ اگر واقعی خدا تک تم دعا پہنچاتے ہو‘ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تم میری شکایت کرتے ہو کیونکہ اگر میں تمہاری ضرورتیں پوری کروں جو خدا نے میرے ذمے لگائی ہیں‘ تو پھر تو دعا کرنے کی ضرورت نہ آئے‘ تمہاری دعا کے معنی ہیں کہ تم میری شکایت کرتے ہو‘ تو کیا میں اپنی شکایت وہاں تک پہنچنے دیتا ہوں؟ میں پہلے تمہارا کام کر دیتا ہوں: ”لے جا درخواست اپنی‘ ایہدے تے ہو گیا فیصلہ[2] “۔ انسان کا فریضہ یہ ہے کہ کسی مظلوم کی دعا کو خدا تک نہ پہنچنے دے‘ خود ہی یہاں اس کے

---

[1] آپ یہ مصیبت ہمارے گلے ڈال رہے ہو۔ یہ کیا بات ہوئی! وہ تمہیں کہہ رہے ہیں‘ تم ہمارے گلے ڈال رہے ہو۔

[2] اپنی درخواست واپس لے جاؤ‘ اس پر فیصلہ ہو چکا۔

لیے فیصلہ کر لے۔

خدا کے پروگرام کی تکمیل کی خاطر جنگ بدر میں تیروں کے استعمال کی نوعیت

آپ دیکھتے ہیں کہ انسان کی تخلیق کا مقصد کیا ہے؟ اُس کے پروگرام' اِس کے ہاتھوں سے ہوتے ہیں' ہاتھوں سے تو اس کے ہوتے ہیں کیونکہ یہاں معاملہ من تُو شدم تو من شدی والا ہوتا ہے' جب یہ مظلوم کی مدد کے لیے اٹھتے ہیں' ظالم کے سینے میں خنجر گھونپتے ہیں' اس کا گلا کاٹتے ہیں' جنگ کرتے ہیں' اس سے تیر چلاتے ہیں۔ یہ وہی ہے جو اس نے کہا تھا کہ تم نے تیر بنائے' شمشیریں بنائیں' بدر کا میدان ہے' اتنا بڑا وہ معرکہ ہے' وہاں یہ کچھ ہو رہا ہے' دشمنوں کے سر کٹ رہے ہیں' تیر چلائے جا رہے ہیں۔ کیا آپ کو پتہ ہے کہ وہاں کیا کہا جا رہا ہے؟ دیکھیے (8:17)۔ کہنے لگے کہ وہاں اس میدانِ جنگ کے اندر' ٹھیک ہے' تمہاری تلواریں ان کے گلے کاٹ رہی تھیں' تمہارے تیر چل رہے تھے لیکن اصل بات یہ ہے کہ **فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ** (8:17) تم انہیں قتل نہیں کر رہے تھے' ہم کر رہے تھے' **وَ مَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى** (8:17) تم تیر نہیں چلا رہے تھے' ہم تیر چلا رہے تھے:

من تُو شدم تُو من شدی ' من تن شدم تُو جاں شدی
تاکس نہ گوید بعد ازاں ' من دیگرم تُو دیگری

ان کی تلواریں سامنے نظر آ رہی ہیں کہ گلا کاٹ رہی ہیں' وہ کہتے ہیں کہ نہیں' تم نہیں یہ کاٹتے' ہم کاٹ رہے ہیں' ٹھیک ہے تیر تمہاری کمانوں سے نکل رہے ہیں' لیکن ہم نکال رہے ہیں۔ رفاقت کی یہ کیفیت ہے!

قرآنِ حکیم نے اسوۂ حسنہ کے سلسلہ میں کنکریوں کی بات نہیں کی بلکہ تیروں کی' کی ہے

عملِ صالح جو اس جماعتِ مومنین کا ہے' اس کو وہ خود اپنے کام کہہ کر پکار رہا ہے۔ ہمارے ہاں یہ کہا جاتا ہے کہ حضور ﷺ نے کنکریوں کی مٹھی لی اور اس کو زور سے مار دیا تھا اور اس کے بعد وہ سارے جتنے دشمن تھے' ان کی آنکھوں میں جا کر وہ کنکریاں لگیں اور وہ سارے اندھے ہو گئے اور میدان سے بھاگ گئے۔ کنکریاں مار کر اگر اس طرح سے فتح حاصل کرنی تھی' عزیزانِ من! تو اس جماعت کو اس کا کریڈٹ کیا جاتا ہے اور یہ چیز ہمارے لیے اسوۂ حسنہ کیسے بنتی ہے' ہماری کنکریاں تو اس طرح سے اندھا نہیں کرتیں۔ یہ بات ہی اور ہے۔ اس کے تو معنی ہی تیر اندازی تھے: تم تیر نہیں چلا رہے' بیشک دیکھنے والوں کی نگاہوں کے اندر وہ تیر تمہاری کمانوں سے نکل رہے تھے۔ غالب (1797-1869) بھی کچھ کم نہیں کہتا تھا' وہ تو آپ کو معلوم ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ کئی دفعہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ نعت کی دنیا میں شاید ہی اس قسم کا کوئی اور شعر ہو۔ مقام جو ہے' وہ آدم کا نہیں' حضور ﷺ کا مقام ہے:

تیرِ قضا ہر آئینہ در ترکش حق است

یہ ٹھیک ہے کہ قضا اور تکلیف کے جو تیر ہیں' اس میں شبہ نہیں کہ وہ خدا کے ترکش کے اندر ہوتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے' ہم جانتے ہیں کہ قضا کے تیر خدا ہی کے ترکش میں ہوتے ہیں

اما کشادِ آں ز کمانِ محمدؐ است

لیکن وہ محمدﷺ کی کمان کے ذریعے نکلتے ہیں تو پھر نشانے پہ جا کر لگتے ہیں ورنہ وہ ترکش کے اندر دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔

حضورؐ کی زندگی کے آخری الفاظ خدا تعالیٰ کے ساتھ رفاقت کی عملی تفسیر ہیں

یہ ہے مقامِ محمدﷺ' عزیزانِ من! خدا کے جو تیرِ قضا ہیں' کمانِ محمدیﷺ سے نکلتے ہیں تو نشانے پہ جا کر لگتے ہیں ورنہ اس کے ترکش میں پڑے کے پڑے رہ جاتے ہیں۔ یہ ہے رفاقت اور اسی لیے جیسا میں نے پہلے عرض کیا تھا' آخری الفاظ حضورﷺ کی زبان پر یہ تھے: **بل الرفیق الاعلیٰ** جا رہا ہوں میں اپنے رفیقِ اعلیٰ کی طرف۔ یہاں تک کہ اور آگے بڑھ۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ حدیبیہ کے اندر جسے بیعت رضوان کہا جاتا ہے جو خدا نے قرآن کے اندر کہا تھا کہ بڑا سخت مقام آیا تھا' مکے سے باہر جب مکے والوں نے روک دیا تھا تو وہاں نبی اکرمﷺ نے صحابہؓ سے یہ کہا تھا۔

عزیزانِ من! کیا آپ کو معلوم ہے کہ مسلمان ہونے کے لیے کیا کرنا پڑتا ہے؟ میں وہ کہا کرتا ہوں کہ ہم تو مسلمان ہوئے ہی نہیں' ہمیں پتہ ہی نہیں ہے کہ مسلمان ہونے کے لیے کیا کرنا پڑتا ہے۔ جو کوئی غیر مسلم بھی مسلمان ہوتا ہے جسے ہم کہتے ہیں کہ وہ حلقۂ اسلام میں داخل ہو گیا' اسے کلمہ پڑھنا ہوتا ہے۔ کوئی لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ سے زیادہ بڑی بات کہے گا تو وہ چھ کلمے یا وہ **امنتو ا باللہ و ملئکہ** پڑھ لیا تو وہ مسلمان ہو گیا۔ مسلمان ہونا تو یہ نہیں ہوتا۔ یہ تو ایک اقرار نامہ یا معاہدہ یا عہد نامہ ہے جو خدا اور بندے کے درمیان ہوتا ہے۔ یہ وہ عہد نامہ ہے جیسے آج کی اصطلاح میں بڑے اسٹیمپ پیپر کے اوپر دونوں کے دستخط ہوتے ہیں۔ یہ معاہدہ ہے۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ **اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ** (9:111) یہ کہتے ہیں کہ صاحب! ہم نے اپنی جان اور مال آپ کے ہاتھ بیچ دیا۔ اُس نے کہا کہ ہم نے تمہیں اس کے بدلے میں جنت دیدی۔ اُس نے بھی لکھ دیا' یا دونوں کے دستخط ہو گئے' یہ مسلمان ہو گیا۔ کیا ہم میں سے کوئی اس طرح مسلمان ہوا ہے؟ پھر یہ جان اور مال بیچ دیا ہوتا جو اس کے پاس ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ اس وقت تک کے لیے ہے جب تک ہم آواز نہ دیں۔ رکھو بھی' ذرا حفاظت بھی کرو' اب یہ ہمارا ہو گیا ہے' ہم نے تمہاری حفاظت میں رکھا ہوا ہے' جب ضرورت پڑے گی تو آواز دے لیں گے۔

حدیبیہ کے مقام کے اوپر ضرورت پڑ گئی۔ مشہور یہ ہو گیا کہ حضرت عثمان غنیؓ (656-573ء) مکے گئے تھے' اور اہل مکہ نے ان کو شہید کر دیا ہے اور وہ جنگ کے لیے اُمڈ آ رہے ہیں۔ یہ صرف حج کے ارادے سے گئے تھے وہاں یہ مسئلہ پیش آ گیا کہ وہ تو حملہ کرنے کے لیے آ گئے ہیں تو یہ بڑا ہی جاں گسل مرحلہ تھا۔ اُس مقام پہ نبی اکرمﷺ نے مومن اور خدا میں وہی جو معاہدہ ہوا ہوتا ہے اس کی تجدید کی۔ کہا تھا کہ آؤ! وہ وقت آ گیا ہے۔ وہ جسے تجدیدِ بیعت کہتے ہیں وہ اُس شجرِ رضوان کے نیچے کی۔ یہ بیعت تو اب ''حضرت صاحب'' کی بیعت ہوتی ہے جس میں کچھ نذرانہ دینا ہوتا ہے' باقیوں کے لیے شیرینی لے جانی پڑتی ہے اور وہ بیعت ہو جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ میں فلاں کی بیعت ہوں۔ یہ بیعت تو بیع ہی ہے۔ یہ تو اپنے آپ کو بیچ دینا ہے۔ وہاں یہ بات تھی۔ اُس مقام کے اوپر نبی اکرمﷺ سے کہا کہ آیئے! تجدیدِ بیعت کے لیے' وہ جو تم نے کہا ہوا ہے۔ طریقہ ان کے ہاں یہ تھا' اب بھی یہ چیز ہے کہ ہاتھ لا استاذ اب بھی جہاں سودا پختہ کیا جاتا ہے' وہاں ہاتھ پہ ہاتھ رکھتے ہیں۔ اس چیز کا ایک محسوس طریقہ ہوتا ہے۔ تو نیچے وہ ان کا ہاتھ ہوتا تھا' اوپر یہ نبی اکرمﷺ کا ہاتھ ہوتا تھا اور بیعت لیتے تھے۔ کہا کہ **اِنَّ الَّذِیۡنَ یُبَایِعُوۡنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوۡنَ اللّٰہَ** (48:10) اے رسول! یہ جو آ کر تیرے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر بیعت کرتے ہیں' یہ تیرے ساتھ معاملہ نہیں کر رہے' یہ ہمارے ساتھ معاملہ کر رہے ہیں' ہماری بیعت کر رہے ہیں۔ تو اب یہ معاملہ ہوا کہ نہیں صاحب! ہاتھ تو نیچے ان کا ہے' اوپر رسول کا ہے۔ کہنے لگے کہ ٹھیک ہے ہم جانتے ہیں کہ **یَدُ اللّٰہِ فَوۡقَ اَیۡدِیۡہِمۡ** (48:10) ان کے ہاتھ کے اوپر جو ہاتھ ہے' بظاہر تمہارا ہی ہاتھ نظر آتا ہے' لیکن تم تو ہمارے نمائندے ہو' یہ خدا کا ہاتھ ہے' تمہارا ہاتھ نہیں ہے۔ آپ دیکھتے ہیں رفاقت کے تعلقات کہاں تک جاتے ہیں!

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا کارساز

بندۂ مومن کا ہاتھ جب خدا کا ہاتھ بنتا ہے تو وہ حدودِ بشریت کے اندر رہتے ہوئے خدائی صفات کا حامل ہو جاتا ہے۔

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تُو زباں تُو ہے
یَدُ اللّٰہِ فَوۡقَ اَیۡدِیۡہِمۡ (48:10)۔ وہ بات یہ کہہ رہا تھا۔

قرآنی نظام کے سلسلہ میں نوجوان نسل کی مایوسی کی وجہ اور اس کا علاج

عزیزانِ من! زیرِ درس آیت یہ تھی کہ **اِلَیۡہِ یَصۡعَدُ الۡکَلِمُ الطَّیِّبُ وَ الۡعَمَلُ الصَّالِحُ یَرۡفَعُہٗ** (35:10) خدا کے نظریاتِ حیات' اقدارِ زندگی جو اس نے دی ہیں' ان میں اس کے امکانات ہیں کہ وہ بڑھ پھول کر نہایت خوشگوار پھل دے۔ غالباً سورۃ ابراہیم میں ہے کہ یہ ہر موسم میں پھل دیتے چلے جائیں گے' زمانے کی بھی قید نہیں ہے کہ صدرِ اول کے زمانے میں تو قرآن نے یہ پھل دیئے تھے' اب

اس کے بعد نہیں دے سکتا۔ ہر دور میں' ہر زمانے میں' جب بھی اس بیج کو کوئی بوئے گا' عملِ صالح اس کی آبیاری کرے گا' تو یہ اسی قسم کے پھل دے گا جس قسم کے پھل اس نے ایک دفعہ دیئے تھے۔ شرطیں دونوں ہیں کہ وہ بیج بھی صالح ہو اور عملِ صالح اس کے ساتھ ہو۔ بیج تو اس نے محفوظ کر لیے۔ وہ قرآن کے اندر موجود ہیں لیکن اگر وہ بیج کسان کی بوری میں بند پڑے رہیں تو پھر پھل نہیں دے سکتے۔ پھر وہ یہ گمراہی پیدا کرتے ہیں جو ہمارے ہاں کی اسلامائزیشن (اسلامیانے) کی اسکیمیں ❶ پیدا کر رہی ہے' ہمارا نوجوان طبقہ دیکھ رہا ہے کہ اس کے بعد کوئی نتیجہ تو نکل نہیں رہا' معاشرہ اور زیادہ خراب ہوتا جاتا ہے' میں ساری دنیا میں کہہ رہا ہوں کہ یہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس سے بدقسمتی سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ صاحب! اسلام میں اب یہ صلاحیت ہی نہیں رہی کہ وہ ہمارے زمانے کے تقاضوں کو' یہاں کے مسائل کو حل کر سکے۔ یعنی ان کے نزدیک وہ بیج جو ہے وہ اس زمانے میں تو صالح بیج تھا' اس میں وہ پودا اگ گیا' اب یہ جو بیج ہے' ایہنوں سُسری کھا گئی ہیگی اے ❷' اب یہ اس قابل نہیں رہا۔ دیکھ لیجیے نہیں اگ رہا' نہیں پھل دے رہا۔ یہ میں نے کئی دفعہ کہا ہے کہ اس کا نقصان یہ پہنچا ہے کہ اس سے پہلے تو پھر بھی بھرم بنا ہوا تھا' یوں کہیے ہماری جو نوجوان نسل ہے' وہ اس نتیجے پہ پہنچ رہی ہے کہ اب اسلام کے بیج میں یہ صلاحیت نہیں رہی کہ وہ اس طرح سے شجرِ طیب بنے اور پھل بھی دے' یہ دے چکا۔

عزیزانِ من! اس کے ساتھ دوسری کیا چیز تھی؟ کہا کہ **وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ** (35:10)۔ کسان کا وہ جو پورا پروگرام ہے وہ ساتھ ہونا چاہیے' جب یہ پھل دیتا ہے۔ اگر یہ نہیں اگ رہا تو ٹھیک ہے ہمارے ایمان کا تقاضا ہے کہ یہ بیج کا نقص نہیں ہے' ہم اس پہ محنت نہیں کر رہے جیسے کہ کسان کو کرنی چاہیے۔ کیا اگر یہ پھر بھی اس طرح سے رہے تو بس پھر خدا کی کھیتی ختم ہوگئی تو گویا ہم نے خدا کو بے بس کر دیا کہ تیرے پروگرام وہیں دھرے کے دھرے رہ جائیں گے اگر ہم تمہارا ساتھ نہ دیں گے۔ اُس نے کہا ہے کہ **اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ** (35.10) یہ تو اس کا ایک مثبت اعلان ہے کہ جو کلمہ طیّب ہیں وہ اس کی طرف چڑھ رہے ہیں خواہ اسی طرح سے کیوں نہ ہو جس طرح پہاڑ کی چٹان پہ کوئی چڑھتا ہے' بلندیوں کے اوپر مشقت سے سہی' سست رفتاری سے سہی' وہ چڑھ رہے ہیں۔ یہ ہے اصل چیز جو اس میں آئی کہ ان کے اندر یہ صلاحیت موجود ہے' آج بھی موجود ہے اور وہ یہ کچھ کر رہے ہیں لیکن فرق کیا ہے؟ یہ ہے عزیزانِ من! دیکھنے کی بات۔

یہ کائنات ہر آن ارتقائی منازل طے کرتی' خوبصورت سے خوبصورت تر ہوتی' جا رہی ہے

وہ اس سلسلۂ کائنات کے متعلق بتاتا ہے' پہلے تو وہی ہے کہ وہ Nothingness (عدم) سے وجود میں آیا۔ وہ وجود میں آیا ہے'

---

❶ یہ صدر جنرل ضیاء الحق کے دورِ صدارت کی طرف اشارہ ہے جب اسلامیانے کا عمل شروع کیا گیا تھا۔

❷ یہ بیج کرم خوردہ ہے۔

سائنٹسٹ (سائنسدان) بتا رہے ہیں کہ وہ ہیولیٰ کس قسم کا تھا۔کبھی وہ آیات آئیں گی تو میں بتاؤنگا کہ قرآن کس طرح سے ان چیزوں کی تشریح کرتا ہے کہ گیسز کا Nabula (ہیولیٰ) اس قسم کا تھا' پھر اس میں سے آہستہ آہستہ یہ جو اس کا پروگرام تھا' وہ ارتقائی منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ارتقا کے لفظ کے اندر اوپر چڑھنا ہے۔سائنس کی تحقیقات یہ کہہ رہی ہیں کہ اولیں مرحلے سے لے کر آج تک زندگی نے اپنے ارتقائی منازل طے کیے ہیں' ہرئی منزل پچھلی منزل سے اونچی بھی ہے' زیادہ حسین بھی ہے' زیادہ مفید بھی ہے یعنی یہ ترقی کرتی چلی جارہی ہے' اوپر آرہی ہے' پیچھے کی طرف نہیں جارہی' اوپر اٹھتی ہوئی چلی جارہی ہے لیکن اس میں وقت کتنا لگتا ہے' اس میں ہمارے جو اعدادوشمار ہیں' وہ تو بے بس ہی ہو جاتے ہیں' کروڑوں اربوں سال لگتے ہیں بس ہم تو یہیں تک ہیں۔ وہ تو اس سے بھی زیادہ ان کو حسیں اور خوب تر بنائے جارہا ہے۔اس سے کہا ہے کہ اس میں اتنا اتنا وقت لگتا ہے۔آج یہ تحقیق ہو چکی ہے کہ خدا کی کائنات کی تخلیق کی ابتدائی اسکیم اس درجے میں تھی' وہاں سے یہ جو آگے آرہی ہے' تو اوپر چڑھتی چلی جارہی ہے' بلند ہوتی چلی جارہی ہے' ارتقائی منازل طے کررہی ہے' لمبے لمبے عرصے میں ہی سہی۔کہا ہے کہ **يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ** (32:5)۔عالمِ امر آپ کو معلوم ہے کہ جہاں یہ Plan ہوتا ہے' خدا کا نقشہ بنتا ہے' ارادہ ہوتا ہے' وہ کہتا ہے کہ وہ اپنے اس ارادے کو جب Practical Shape (عملی شکل) دینا چاہتا ہے یعنی خدا اس کو عملی شکل میں ڈھالنا چاہتا ہے تو وہ اپنی یہ اسکیم ارض سے شروع کرتا ہے۔ارض کے معنی ہوتا ہے پست تریں مقام۔اس اسکیم کا جو سب سے نچلا مقام ہے وہ اسے وہاں سے شروع کرتا ہے۔یہاں (32:5) میں ''یدبر'' آیا ہے' میں نے آپ کو تدبیر کا کہا تھا اور تدبر کے معنی ہیں کسی اسکیم کو Follow-up (پیروی) کرنا۔وہ اپنی ہر اسکیم کا Follow-up (پیروی) کرتا ہے۔اب سوال یہ ہے کہ پھر ہوتا کیا ہے؟

کائناتی ارتقا کے سلسلہ میں قدرت کا ایک دن ایک ایک ہزار اور پچاس پچاس ہزار سال کے برابر ہوتا ہے

اب آپ یہاں دیکھیے کہ انسان کا ہاتھ نہیں لگ رہا' یہ وہی اس کا امر آرہا ہے' زمین پہ آرہا ہے۔کہا ہے کہ **ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِىْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ** (32.5) پھر وہ اسکیم الیہ ہو رہی ہے یعنی اپنی مقرر منزل کی طرف اس طرح اٹھتی چلی جارہی ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ ایک دن میں اس نے یہ فاصلہ طے کیا مگر یہاں کہا ہے کہ تمہارے اعدادوشمار سے یوں سمجھو جیسے ہزار سال میں کیا' دوسری جگہ ہے کہ یوں سمجھو جیسے پچاس ہزار سال میں کیا' وہ بلندیوں کی طرف جارہی ہے لیکن تمہارے حساب وشمار سے اتنا اتنا لمبا وقت لگ جاتا ہے' یہ طویل المعیاد ہے' اتنا لمبا وقفہ اس کے درمیان میں آتا ہے لیکن یہ چڑھ اور بڑھ رہی ہے۔اور تیسرا لفظ **يَصْعَدُ** اس میں آ گیا' پھر بلندی کے لیے کہا ہے کہ **اِلَيْهِ يَصْعَدُ** (35:10) تو یہ ایک لفظ تھا پہاڑ کی گھاٹی کے اوپر مشقت کے ساتھ رفتہ رفتہ چڑھتے چلے جانا یعنی **وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ** (35:10) دوسرا لفظ آ گیا کسی کو بلند کرتے چلے جانا۔یہاں وہ ارتقائی منازل ہیں جو یہ چیزیں

بتدریج طے کرتی ہوئی چلی جارہی ہیں۔سائنٹسٹ (سائنسدان) ان ارتقائی منازل کے لیے By Stages کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔

یعرج الیہ کے قرآنی مفہوم کے علاوہ، سیڑھی کے ڈنڈوں کے لیے دو مختلف الفاظ

اس یَعۡـرُجُ کے معنی ہوتے ہیں ''سیڑھیوں کے ذریعے سے' ایک ایک ڈنڈے پہ قدم رکھ کر اوپر جانا''۔عزیزانِ من! یہ زبان ہے یا قرآن ہے۔ان کے اندر یہ تین الفاظ ہیں جن میں بلندی کا وہ بنیادی مفہوم ہے بلندی کے متعلق تینوں جگہ یہ دیا ہے۔میں کہہ رہا ہوں وہ جو بڑی سے بڑی ریسرچ ہے وہ یہ الفاظ استعمال کرے گا۔وہ پرنگل پیٹیسن (1856-1931) کہتا ہے کہ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہماری زبان میں دوسرے لفظ ہی نہیں ہیں' ان کے ترجمے کہاں سے لائیں۔یہاں (32.5) میں یَعۡرُجُ اِلَیۡهِ آیا ہے۔یہ جو ارتقائی منازل (By Evolution) سے یہ اسکیم اوپر جارہی ہے' اس کی مثال یہ ہے جیسے کوئی سیڑھیوں کے ذریعے سے اوپر چڑھے۔یہ جو عـرج ہے' یہ تیسرا لفظ بلندی کی طرف چڑھنے کا آیا ہے لیکن سیڑھیوں کی طرف اوپر چڑھنا ہے۔یہیں سے لفظ معراج ہے' معراج کہتے ہی سیڑھی کو ہیں۔ہمارا امر اپنی منزل کی طرف جو ہم نے اس کے لیے مقرر کی ہوئی ہے' سیڑھیوں کے ذریعے اوپر چڑھتا ہوا چلا جاتا ہے۔پھر درمیان میں بات آ گئی یہ عجیب قوم تھی۔ہمارے ہاں تو سیڑھی جاتی ہے' سیڑھی کے ڈنڈے ہوتے ہیں۔ان کے ہاں یہی ڈنڈے جب کوئی اوپر چڑھتا ہے' تو اس کو وہ درجات کہتے ہیں' یہ وہی مدارج ہیں جس کو درجہ کہتے ہیں۔درجات انہی ڈنڈوں کو کہتے ہیں۔جب یہ نیچے اتر رہا ہوتا ہے تو انہی ڈنڈوں کو درکات کہتے ہیں کیونکہ درجہ تو اس وقت کہنا چاہیے جب یہ اوپر جائے' اب وہ نیچے آرہا ہے تو اس کے لیے دوسرا لفظ درکات ہے۔

کائناتی قوانین کے ساتھ انسانی ہاتھ کے استعمال کی بنا پر حیرت انگیز نتائج برآمد ہونے کی شکل

کہا ہے کہ ثُمَّ يَعۡرُجُ اِلَيۡهِ فِىۡ يَوۡمٍ كَانَ مِقۡدَارُهٗۤ اَلۡفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوۡنَ (32:5) اگر تمہارے اعمالِ صالحہ یعنی انسانوں کے اعمالِ صالحہ' ہمارا ساتھ نہیں بھی دیتے' اور ہمیں وہ جلدی سے اوپر نہیں چڑھاتے' تو فرق اتنا ہی پڑتا ہے کہ تمہارا ہاتھ ساتھ لگ جاتا ہے تو وہ پچاس پچاس ہزار سال یا ہزار ہزار سال کی منزل' تمہارے اعداد و شمار کے لحاظ سے گھنٹوں اور دنوں میں طے ہو جاتی ہے۔اور اگر تم ساتھ نہیں دیتے تو یہ نہیں ہے کہ ہم بے بس ہو کر رہ جاتے ہیں۔پھر وہ جو ہمارا نظریہ زندگی ہے' جس میں اوپر چڑھنے کے امکان ہیں وہ پھر اپنی رفتار سے اوپر چڑھتا چلا جاتا ہے' اس نے اپنی منزل تک پہنچنا ہے' وہ تمہارا احتاج نہیں ہے' تم اس کے محتاج ہو۔اس سے پھل لینا چاہتے ہو تو اٹھو کوشش کرو۔یورپ کے وہ نرسری والے ہیں' وہ چوبیس گھنٹے میں جو پھول آپ کہو' وہ اسے پیدا ہی نہیں کر دیتے بلکہ ان کا انتظام یہ ہے کہ دنیا میں جہاں کہو وہاں پہنچا بھی دیتے ہیں۔یہ جتنی بڑی بڑی پارٹیز اور Weddings (شادیاں) ہوتی ہیں' ان میں یہ ہوتا ہے۔

یہ عجیب چیز ہے۔ان کے ہاں کا لٹریچر آیا ہے۔وہاں انہوں نے ایک قسم کی نرسری بنائی ہوئی ہیں' وہاں وہ اپنی آب وہوا اس طرح سے رکھتے ہیں' شیشے کے کچھ کیبن رکھے ہیں' ان کے اندر ہر قسم کا چوبیس گھنٹے میں تازہ پھول اگا دیتے ہیں اور پھر ان کے ہاں ہوائی جہازوں کا چارٹر سسٹم ہے' وہ دنیا میں بھیج دیتے ہیں۔وہی پھول جو چھ مہینے میں اگنا تھا' وہ چوبیس گھنٹے میں اگا دیتے ہیں۔وہ خدا کی جو اسکیم ہے' اس میں تو وہ ہزار ہزار پچاس پچاس ہزار سال کا دن لگتا ہے' تم اگر ساتھ دیدیتے ہو تو پھر چوبیس گھنٹے میں پھول اگ سکتا ہے۔یہ جو چیز ہے' یہ ہے فرق۔اور وہ اس کے لمبے لمبے دن اس لیے ہیں' عزیزانِ من! کہ اس نے مرنا نہیں ہے ''چھیتی تے اوہنوں پیندی اے جنوں مرنا ہوندا اے۔ جنے مرنا نئیں پنجاہ ہزار سال دا اک دن ہو گیا' تاں کی ہے' لکھاں کروڑاں دا اک دن ہو گیا تاں کی ہیگا اے' اوہدی عمر گھٹنی اے کوئی ایہدے نال ❶''۔کہتا ہے تم تو ایسے نہیں ہو۔

قانونِ خداوندی کے ساتھ نبی اکرمؐ کے ہاتھ کی رفاقت کا نتیجہ: صدیوں کا سفر دنوں میں

عزیزانِ من! اگلی ہی آیت ہے جو عمر کے متعلق آئی ہے۔کیا بتاؤں' کہاں کہاں آیتیں ہیں اور کیا کیا ربط ہے! عمر کی آیت آگے آرہی ہے کہ بھائی جان! یہ بات یہ ہے' اتنی سست رفتاری اختیار نہ کرو کہ کوئی بات نہیں' ہو جائے گا' ہم تو یہ Afford (مہیا و برداشت) کر سکتے ہیں لیکن تم نہیں کر سکتے:

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

وہ کہتا ہے کہ وہ اپنی رفتار سے چلا جا رہا ہے۔اس کے لیے آپ کو' عزیزانِ من! اس چودہ سو سال کی تاریخِ عالم پر نگاہ رکھنی پڑے گی کہ جب اسلام کا ظہور ہوا ہے' نبی اکرم ﷺ کا ظہور ہوا ہے' یہ جو **الکلم الطیب** اس کے ساتھ تھے جب **محمد** رسول اللہ ﷺ والذین معہٗ کے دست و بازو نے اس کو اٹھایا ہے تو چند دنوں کے اندر اندر دنیا میں انقلاب آ گیا۔یہ کیا ہوا تھا؟ وہی جو خدا کی اسکیم تھی جس کا ایک ایک دن ہزار ہزار سال کا تھا' ان کے دست و بازو سے **یرفعہ** ہوا' انہوں نے جب اس کو سنبھالا دیا' اوپر کرنا شروع کیا' تو ان کے حساب وشمار کے دنوں سے وہ بروئے کار آ گیا۔یہ اتنا سا جو اس قسم کا انقلاب آتا ہے کیا بات ہے اس کی ہے! وہ شاعر تو غزل کا ہی ہے مگر کہہ کیا خوب گیا ہے کہ

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور
نکلے جو میکدہ سے تو دنیا بدل گئی

---

❶ عجلت تو اسے ہوتی ہے جسے مر جانا ہوتا ہے۔جس نے مرنا ہی نہیں ہے اس کے لیے پچاس ہزار سال کا دن ہوا تو کیا' لاکھوں' کروڑوں سال کا ہوا تو کیا۔ اس سے اس کی عمر گھٹتی نہیں ہے۔

آج بھی کلمہ طیّبہ کے نتائج پر دنیا بھر کے انسان محوِ حیرت ہیں

انسان اس کے کلماتِ طیّبہ کو جب اپنے ہاتھوں سے ارتقا کی طرف لے جاتا ہے تو پھر اس کے بعد جب یہ باہر نکلتا ہے تو دنیا بدل جاتی ہے' عزیزانِ من! دنیا بھر کے جو مورخ ہیں' وہ انگشت بدنداں ہیں کہ یہ انقلابِ عظیم اتنے تھوڑے سے عرصے کے اندر آ کیسے گیا؟ آ ایسے گیا کہ وہ کلمہ ٔ طیّب تھے اور اس کو بر فعہ عملِ صالح نے کیا تھا۔ اس کے بعد عملِ صالح الگ ہو گیا تو وہ نہیں بیکار بیٹھ گیا تھا' اس کا سورج اسی طرح سے چڑھتا ہے' خواہ کوئی انسان یہاں نہ رہے وہ اسی طرح سے چل رہا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں عالمگیر انسانیت کے جتنے نظریات تھے' ذرا ان پہ نگاہ ڈالیے۔ ملوکیت خواہ اسے Autocracy کہیے' شخصی حکومت کہیے' یہ ساری دنیا کا مسلمہ چلن تھا۔ پتہ نہیں لاکھوں سالوں سے یہ مسلسل چلا آ رہا تھا۔ کسی کے ذہن میں بھی نہیں آیا تھا کہ اس کے سوا کوئی دوسرا اور بھی اندازِ حکومت ہو سکتا ہے۔ انہوں نے آ کر پہلے تو یہ نظریۂ زندگی جو کلمہ ٔ طیّب تھا اس کا اعلان کیا۔ کہا کہ **مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ** (3:79) کسی انسان کو حق حاصل نہیں ہے کہ دوسرے انسان کے اوپر حکومت کرے۔ یہ اعلانِ عظیم ہے۔ کہا کہ یہ کلمہ طیّب ہے۔ وہاں انسانی دست و بازو نے اس کو اوپر اٹھایا' چند دنوں کے اندر آپ نے دیکھا کہ مٹھی بھر عربوں نے قیصر و کسریٰ تک کی شہنشاہیت ختم کر کے رکھ دی اور اپنے ہاں وہ نظام قائم کیا جس کے اندر کسی انسان کو حق حاصل نہ رہا کہ دوسرے انسان کے اوپر حکومت حاصل کرے۔

قرآنِ حکیم کے اس پیش کردہ کلمہ طیّبہ کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ

اس کے بعد یہ جو عملِ صالح کر کے الگ ہو گیا تو خود آپ کے ہاں ہی ملوکیت آ گئی۔ سب سے پہلے آپ ہوں' کوئی بھی ہو' جو بھی اس کا ساتھ چھوڑ دے گا' اس کلمہ طیّب کو چھوڑ دے گا' اس کی حالت یہ ہو جائے گی۔ آپ غور کیجیے کہ تیرہ سو سال کے اندر آپ نے تو پھر وہ اس کے کلمہ طیّب کا سہارا نہیں لیا لیکن وہ کلمہ ٔ طیّب جو ہے اپنے زور دروں سے بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ آج ساری دنیا اس نتیجے پہ پہنچی ہے کہ ملوکیت Autocracy ڈکٹیٹرشپ آمریت بدترین اندازِ حکومت ہیں۔ ابھی وہ وہیں پہنچی ہے کہ مشاورت ہونی چاہیے۔ کس نے ان کو یہ پہنچایا ہے؟

وحی کے مقابلے میں انسانی عقل کا طریق تجرباتی ہوتا ہے

میں اسے زمانے کے تقاضے کہا کرتا ہوں۔ ہمارے لیے اس سے زیادہ اور کوئی مناسب الفاظ نہیں ہیں جو ہم کہیں۔ وحی تو آپ کو وہ اقدار دیتی ہے جن میں انسانی فکر کا دخل نہیں ہوتا' اگر ہم اس کی طرف جاتے تو ہمارے لیے وہ اقدار موجود ہیں۔ عقل کا ایک تجرباتی طریقہ

Trial & Error (سعی وخطا) ہوتا ہے یعنی وہ اپنے لیے ایک طریقہ تجویز کرتی ہے، چلتی ہے، تجربہ کرتی ہے، اس کے اوپر عمل کرتی ہے، ہڈیاں تڑواتی ہے، خون کے دریا بہاتی ہے، اس کے بعد وہ اس نتیجے پہ پہنچتی ہے کہ یہ غلط تھا، تو پھر اپنے لیے کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرتی ہے۔ اس میں پتہ نہیں کہ کتنی صدیاں لگ جاتی ہیں۔ پھر تجربہ کرتی ہے، غلط ہوتا ہے، اسی طرح سے پھر اور تجربہ لیتی ہے۔ یہ ہے عقلِ انسانی کا طریقِ کار۔ اس کے سوا عقلِ انسانی کچھ نہیں کر سکتی۔

ملوکیت کو حرام کہنے والے، آج خود ہی ملوکیت کے محافظ بنے ہوئے ہیں

ایک یہ چیز ہے کہ پہلے ہی دن اس کو کہہ دیا جائے کہ جو ملوکیت ہے، وہ بدترین نظام ہے اور جو مشاورت کا انتظام ہے بشرطیکہ وہ اقدارِ خداوندی کی حدود کے اندر رہتے ہوئے کیا جائے، بہترین نظام ہے۔ یہ تو وحی دیتی تھی۔ انسانوں نے وحی کے اس دیئے گئے نظام کو چھوڑا تو اُدھر ملوکیت کے نظام کی طرف چلے گئے۔ دنیا میں آج آپ دیکھیے، ملوکیت کہیں بھی نہیں ہے، اگر ہے تو اسی قوم میں ہے جس نے دنیا کو کہا تھا کہ ملوکیت حرام ہے۔ ظہورِ اسلام کے وقت دنیا کا نقشہ یہ تھا کہ رنگ نسل زبان خون وطن کی بنا پر انسانوں کی تقسیم ہوئی تھی۔ وہی جو خدا نے کہا تھا کہ میں نے تو ایک آدم بنایا تھا، تم نے اسے کس طرح سے تقسیم کر دیا۔ ساری دنیا میں یہ تقسیم ہوئی ہے۔ ساغر کے ایک دور نے آ کر یہ بتا دیا کہ یہ تقسیم باطل ہے، انسان صرف انسان کی حیثیت سے واجب التکریم ہے، وہ روم کا مزدور صہیب ہو یا حبش کا غلام ہو یا وہ مکے کا عمر ابنِ خطاب ہی کیوں نہ ہو، قریش کیوں نہ ہو، بلال کیوں نہ ہوں، تمام انسان ہونے کی حیثیت سے یکساں واجب التکریم ہیں۔

عقل کے بالمقابل ہزار سال پیشتر قندیلِ آسمانی کی راہنمائی کا پیدا کردہ نتیجہ

عزیزانِ من! اس کے بعد ہم نے اس شجرِ طیّب کو چھوڑ دیا، رنگ نسل زبان وطن اور ان کی زبانوں کے اوپر مسلمان تقسیم ہوئے۔ ساری دنیا بھی اسی پہ تقسیم ہو چکی تھی۔ ساری دنیا اپنے عقل کے تجرباتی طریق سے اس نتیجے پہ پہنچی کہ یہ قومیت اور نیشنل ازم بدترین چیز ہے۔ آپ آج یورپ کے لوگوں کی چیخ و پکار کو سنیے کہ وہ کیا کہتے ہیں؟ کہتے ہیں کہ یہ ساری جتنی بھی دنیا میں جنگیں ہو رہی ہیں، وہ صرف، یہ جو حدود کے اندر ہم نے انسانوں کو مقید کر رکھا ہے، یہ اس کی وجہ سے ہیں، دنیا کے اندر عالمگیر انسانیت کی تحریکیں چل رہی ہیں۔ کس نے ان کو یہ بتایا ہے؟ وہ خدا کا امر جو پچاس پچاس ہزار سال یا ہزار سال کے ایک ایک دن میں آگے بڑھ رہا تھا، ہماری آپ کی کاریگری نہیں ہے، وہ اس کے اندر آ رہا ہے۔ وہ دنیا تو چیخ رہی ہے اور ہم ان گرہوں کو اور مضبوط کیے چلے جا رہے ہیں۔ آپ کے ہاں کوئی بھی عالمگیر اجتماع ہو، آپ جن کو کہتے ہیں، مسلمانوں کا یہ امتیاز وہاں ہر جگہ موجود ہوتا ہے، یہ اس قوم کا جھنڈا ہے، یہ اس قوم کا نمائندہ ہے۔ یہ چیزیں کیسے آ گئی ہیں؟ اس زمانے میں نظامِ سرمایہ داری ساری دنیا کا نظام تھا۔ تصور میں بھی نہیں آتا تھا کہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا نظام بھی ہو سکتا ہے۔

اُنہوں نے ایک ساغر کے دور میں قُلِ الْعَفْوَ کی یہ چیز بتادی: کسی کو حق حاصل نہیں ہے کہ اپنی ضرورت سے زیادہ کچھ چیز بھی اپنے پاس رکھے' یہ اس کا حق ہے جس کو اس کی ضرورت ہے' ایک نظام دیا ہے۔ چند دنوں کے بعد ہم نے اس صالح بیج کو چھوڑ دیا اور بدترین قسم کی نظامِ سرمایہ داری اپنے ہاں رائج کر لی اور کرتے چلے آرہے ہیں۔ آج دنیا اس نتیجے پہ پہنچ رہی ہے۔ مارکس (83-1818) نے یہ کہاں سے لیا تھا کہ ''ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق کام کرے اور اس کی ضرورت کے مطابق اس کو دیا جائے''۔ قرآن کا یہ فیصلہ اور رسول اللہ ﷺ کا یہ عمل ہے۔ کس نے اس (کارل مارکس) کو اس نتیجے پہ پہنچایا ہے؟ زمانے کے تقاضے نے۔ اب یہ تمام وہاں Welfare State (بہبودی ریاست) تک نہیں پہنچ رہے ہیں ابھی ساری دنیا پہنچ رہی ہے۔ ظہورِ اسلام کے زمانے میں مذہبی پیشوائیت یعنی مذہب پیشوائیت کے بغیر تصور میں بھی نہیں آتا تھا' یہاں ساغر کے ایک دور نے یہ آکر بتایا کہ خدا اور بندے کے درمیان کوئی حائل نہیں ہوسکتا' خدا نے اپنے قوانین نافذ کیے ہیں' سارے انسانوں پہ براہِ راست ان کا اطلاق ہوگا' کوئی مذہبی پیشوائیت نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے یہ کرکے دکھادیا' آپ ﷺ کے صدرِ اول' کے زمانے میں مذہبی پیشوائیت کا یہ نام ہی نہیں تھا۔ کیا کبھی آپ نے مولانا عمر فاروق اور مولوی ابوبکر صدیق کا نام سنا ہے؟ یا یہ کہ جنگِ بدر کا معاملہ پیش آیا تو علمائے کرام نے بیٹھ کر فتویٰ دیا کہ اس میں جانا چاہیے یا نہیں جانا چاہیے۔ کلمۂ طیب کا یہ بیج پھر آپ نے چھوڑ دیا۔

عیسائیت میں مذہبی پیشوائیت کے ساتھ ہونے والا سلوک

آپ کے ہاں جو سب سے سخت قسم کی پیشوائیت ہے' دنیا اس سے الگ ہوتی چلی جارہی ہے۔ یورپ میں عیسائیت وہ ہے جس کا مدار ہی چرچ کے اوپر تھا' انہوں نے اس کی Reformation (اصلاح) میں ان کو چار دیواری کے اندر محبوس کردیا کہ صاحب! ٹھیک ہے' ابھی ہماری جان نہیں چھوٹ سکتی تو نہ سہی' پنجرے میں رہو' ہم تمہیں یہاں دانہ پانی دیتے جائیں گے'' ساڈے معاملیاں اچ دخل نہ دیو بھائی صاحب[1]!'' ہمیں انسان کی حیثیت سے جینے دو مگر یہاں آپ کے ہاں آپ کا کوئی فیصلہ انسان یا قرآن کی حیثیت سے نہیں ہوتا۔

آج غیر شعوری طور پر انسانی زندگی کا ہر اٹھنے والا قدم نظامِ خداوندی کی طرف ہی گامزن ہے

کہا ہے کہ اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ (35:10) جتنے بھی اجتماعی زندگی کے نظام ہیں' آپ ان پہ عالمگیر انسانیت کی تاریخ کی روشنی میں نگاہ ڈالیے' دیکھیے کہ ظہورِ اسلام کے وقت میں اجتماعیت کے نظام کیا کیا تھے' انسانوں کے اس دور میں ہم نے اس کو چھوڑا اور کس

---

[1] بھائی جان! ہمارے معاملات میں مداخلت نہ کرو۔

طرح سے وہ غیر محسوس رفتار، جس کو قرآن کہہ رہا ہے کہ درجہ بہ درجہ ایک ایک ڈنڈا کر کے اوپر کو اٹھ رہا ہے، کس طرف جا رہا ہے۔ یہ ہے **اِلَیۡہِ یَصۡعَدُ** (35:10) اس ہزار سال میں انسانیت کا کوئی قدم، عزیزانِ من! ایسا نہیں اٹھا جو انسان کو اس منزل کے خلاف لے جا رہا ہو۔ ان کو اس کا احساس ہو یا نہ ہو۔ کیا ضروری ہے کہ احساس ہو؟ کتنی بار ہم دن میں سورج کو کہتے ہیں! تیرا شکریہ، تُو نے روشنی دی، ضرورت نہیں ہے۔ روشنی سے مستفید تو ہو رہے ہیں۔ جہاں جہاں یہ چیز آپ دنیا کے اندر دیکھ رہے ہیں ہو رہی ہے:

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو

دنیا میں جہاں کہیں بھی کوئی رنگ و بو دیکھ رہا ہے

آنکہ از خاکش بروید آرزو

یا اس کا اعتراف کرلے کہ یہ سب کچھ ہم نے جو لیا ہے نورِ مصطفیٰؐ سے لیا ہے

یا ہنوز اندر تلاش مصطفیٰؐ است

یا اس کی تلاش میں ہے۔ اس میں سب سے زیادہ محروم، سب سے زیادہ بدقسمت، کونسی قوم ہے؟ وہ جو مصطفیٰؐ کے نام کے ساتھ اپنے آپ کو منسوب کر رہی ہے۔ نہ ہمارے کسی خواب کے اندر آرزو بیدار ہو رہی ہے، نہ کہیں ہمیں نظام مصطفیٰؐ سے روشنی ملی ہے، نہ ہم تلاشِ مصطفیٰؐ کے اندر ہیں، عزیزانِ من! لیکن اس میں نہ مصطفیٰؐ کا کچھ بگڑتا ہے، نہ خدا کا کچھ جاتا ہے۔ سورج نکلنے کے بعد جو آنکھیں بند کرتا ہے، اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے، جو آنکھیں کھولتا ہے روشنی سے مستفید ہوتا ہے، نام لے یا نہ لے، وہ تو غنی وحمید ہے، وہ تنگ نظر نہیں ہے کہ تُو نے نام میرا نہیں لیا، میں تمہیں نہیں دیتا۔ دنیا کدھر جا رہی ہے، عزیزانِ من!

یا ز نورِ مصطفیٰؐ اور بہا ست

یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰؐ است

کہا ہے کہ **اِلَیۡہِ یَصۡعَدُ الۡکَلِمُ الطَّیِّبُ** (35:10)۔ اس کے لیے دیر کیوں ہو رہی ہے؟ اس لیے کہ **وَ الۡعَمَلُ الصَّالِحُ یَرۡفَعُہٗ** (35:10) انسانوں کے اعمالِ صالحہ اگر اس کو تھوڑا سا بھی سہارا دیدیں، تو پھر یہ تمہارے حساب وشمار سے پھل دینے لگ جائے گا۔ یہ ہے فرق۔ وہاں یہ چیز نہیں ہے۔ وہ اپنے فطری تقاضوں کی رو سے جو اس نے کہا تھا کہ **ثُمَّ یَعۡرُجُ اِلَیۡہِ فِیۡ یَوۡمٍ** (32:5) وہ خدا کے ایام خدا کے دنوں، کی رفتار سے چل رہا ہے، اُسی طرف جا رہا ہے۔ **ھُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ بِالۡھُدٰی وَ دِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡھِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ** (9:33) ہم نے رسول اللہ ﷺ کی وساطت سے یہ نظامِ کائنات بھیجا ہے اور اس کی Destination (منزل) یہ ہے کہ دنیا کے جتنے اور نظام ہیں یہ اِن سب پہ غالب آ جائے گا۔

آج دنیا بھر کے مسلمانوں کی حالتِ زار کا تجزیہ

آج ہم مسلمانوں کی کیفیت یہ ہے کہ ہم سب سے پست ہیں۔ یہ کلمہ طیّب کیسے غالب آ رہا ہے؟ یہ وہی جو خدا کی رفتار ہے' یہ اس اصول کے ماتحت غالب آ رہا ہے۔ دنیا کے سارے نظام اس طرف چلے آ رہے تھے یا مٹ چکے ہیں یا مٹنے کی طرف جا رہے ہیں اور ان کی جگہ وہ نظام لے رہا ہے جو خدا نے قرآن میں رسول اللہ ﷺ کی وساطت سے دیا تھا۔ اِلَیۡہِ یَصۡعَدُ الۡکَلِمُ الطَّیِّبُ وَ الۡعَمَلُ الصَّالِحُ یَرۡفَعُہٗ (35:10) یہ ہوگا۔ اگلا حصہ بھی پڑھ ہی دوں۔ کہا کہ وَ الَّذِیۡنَ یَمۡکُرُوۡنَ السَّیِّاٰتِ لَہُمۡ عَذَابٌ شَدِیۡدٌ ؕ وَ مَکۡرُ اُولٰٓئِکَ ہُوَ یَبُوۡرُ (35:10) اور جو پھر اس معاملے میں فریب دیتے ہیں' ان کے لیے عذاب شدید ہے۔ یہ انکار کرنے والوں کی بات نہیں ہے' کھلے بندوں انکار کرنے والا تو پتہ ہے کہ دوسری سمت جا رہا ہے' بات ہے ان کی جو فریب دیتے ہیں' یہ نام یہی رکھتے ہیں۔ قرآن نے جو پچھلی آیت میں یَصۡنَعُوۡنَ کہا تھا کہ کچھ شکل و شباہت بھی اسی قسم کی رکھتے ہیں' رسمی طور پہ Formalism کے طور کے اوپر' وہ اسے اس طرح سے استعمال کرتے ہیں' یہ دھوکا ہے لوگوں کو۔ یہ وہی شجرِ طیّب ہے' کلمۂ طیّب ہے' جو خدا نے دیا تھا' جس کو ہم بو رہے ہیں۔ کہا کہ فریب دے رہے ہیں تو ہمارا کیا بگاڑ رہے ہیں۔ ہمارے بگاڑنے کا سوال ہی نہیں ہے۔

عزیزانِ من! ان کے لیے کہا کہ لَہُمۡ عَذَابٌ شَدِیۡدٌ (35:10) وہ بڑی سخت سزا میں رہیں گے' بڑے جہنم کے اندر زندگی بسر کریں گے۔ مزید کہا کہ نَارُ اللّٰہِ الۡمُوۡقَدَۃُ الَّتِیۡ تَطَّلِعُ عَلَی الۡاَفۡئِدَۃِ (104:6:7) اس آگ میں رہیں گے کہ جو دلوں کو لپیٹ لیا کرتی ہے۔ عزیزانِ من! ذرا سوچیے کہ کسی مسلمان کا آج کوئی قلب بھی' کوئی دل بھی' آپ کو ملتا ہے جو آگ کے اضطراب کے اندر عذاب میں موجود نہ ہو؟ جہاں دو مسلمان ملتے ہیں' ہمیشہ ان کی پہلی بات مرثیہ ہوتی ہے' جو وہ اپنا کرتی ہے کہ کیا ہو گیا ہے ہمیں اور اب تو ہو گیا نہیں' اب تو ہوتا ہے کہ کیا ہوگا' یہ کیفیت ہو گئی ہے۔ کیا صورت ہو گئی؟ کہا کہ عَذَابٌ شَدِیۡدٌ (35:10)۔ اور پھر کیا یہ جو فریب انگیزیاں ہیں' یہ اسی طرح سے رہیں گی۔ کہا کہ مَکۡرُ اُولٰٓئِکَ ہُوَ یَبُوۡرُ (35:10) حق کے خلاف اس قسم کی ابلہ فریبیاں' مکاریاں' کبھی کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ اس دوران میں عذاب میں رہیں گے' آخر الامر ناکامی اور تباہی ہو گی۔

عزیزانِ من! ایک ہی آیت ہم نے لی ہے لیکن یہ جو قرآن کا انداز ہے اگر میں اس کو سمجھانے میں کچھ بھی کامیاب ہو گیا ہوں تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ جو ہمارا وقت ہے یہ بر آیا۔ سورۃ فاطر کی 11 ویں آیت آگے لیں گے' اس میں اس کی عملی مثال دی ہے کہ وہ پروگرام جو خدا کے امر کے تابع چلتا ہے' وہ کہاں تک پہنچتا ہے اور آگے پھر جہاں انسان کے دست و بازو آتے ہیں' وہ اگر ساتھ دیتے ہیں تو وہ کامیاب ہوتا ہے' ساتھ نہیں دیتے تو یوں ناکام رہتا ہے' Otherwise (ورنہ) وہ اپنے طریق کے اوپر چلتا ہے۔ اسے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ

چوتھا باب: **سورۃ فاطر** (آیات 11 تا 23)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج مئی 1980ء کی 23 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ فاطر کی آیت 11 سے ہو رہا ہے: (35:11)۔

کائناتی حقیقتوں کے اصول و اقدار کی نوعیت اور انسانی اعمال کی نتیجہ خیزی

آپ کو یاد ہو گا کہ سابقہ درس میں ایک بڑی عظیم حقیقت ہمارے سامنے آئی تھی اور وہ یہ تھی کہ خدا نے کائنات کے متعلق اصول' اقدار' قوانین اور پروگرام تجویز کیا ہے۔ اگر وہ از خود خدا ہی کے پروگرام کے مطابق چلتا رہے تو اس میں ایک ایک دن خدا کا پچاس پچاس ہزار سال کا ہوتا ہے' اگر اس کے ساتھ انسان کے دست و بازو' انسان کی رفاقت' شاملِ حال ہو جائے تو پھر وہی مرحلہ ہائے دور دراز انسانی حساب و شمار سے طے ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ بڑی عظیم حقیقت ہے جو اس نے کہی ہے۔ اگلی آیت میں اس کی ایک شہادت پیش کی

ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ ٹھیک ہے' اس اعتبار سے ہم خوش قسمت ہیں کہ کچھ ایسے دور میں آئے ہیں کہ علمِ انسانی نے اتنی ترقی کی ہے' یہ اتنا اونچا چلا گیا ہے کہ قرآنِ کریم کے اس قسم کے حقائق ہم نسبتاً آسانی سے سمجھ سکتے ہیں' اس سے پہلے دور کے لوگوں کو یہ Advantage (فائدہ) حاصل نہیں تھا، علمِ انسانی اُس دور میں اس سطح پہ نہیں پہنچا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اگر علمِ انسانی وہاں نہیں تھا' اُنہوں نے سمجھا ہے تو ان کی غلطی نہیں ہے، غلطی ہماری ہے جو یہ کہہ دیتے ہیں کہ جو کچھ اُنہوں نے سمجھا ہے وہ حرفِ آخر ہے' اس میں ترمیم نہیں ہوسکتی' اس میں اصلاح نہیں ہوسکتی' عصرِ حاضر میں اگر مزید انکشافات ہمارے سامنے آئے ہیں تو ان کی روشنی میں ان میں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ یعنی انسانوں نے اس سے پہلے جو کچھ تحقیق کیا یا انکشافات کیے' ان میں تو تبدیلی ہوسکتی ہے' بعد میں آنے والے انکشافات سے' سائنٹفک پروگریس اسی طرح سے ہوتی ہے لیکن اسی چیز کو جو اس دور کے کسی محقق نے' کسی سائنسدان نے' کہی تھی' جن کو حکیم کہتے ہیں اس چیز کو اگر ہمارے ہاں کے کسی مذہبی پیشوائیت میں سے کسی نے اپنے ہاں کہہ دیا تو اس سائنسدان کی جو بات تھی اس میں تو ترمیم' تغیر و تبدل ہوسکتا ہے لیکن وہی بات جو اس نے اپنے ہاں لکھ دی وہ مذہب بن گیا' اب اس میں تغیر و تبدل نہیں ہوسکتا اور یہی وہ جمود ہے جو قوموں کو لے ڈوبتا ہے۔ قرآن کے اعجاز پہ غور کیجیے' اتنی بسیط حقیقت (Abstract Truth) وہ بیان کر رہا ہے کہ خدا کے پروگرام کے مطابق جو بھی ایک مرحلہ چلتا ہے وہ بہت دور و دراز ہوتا ہے' لمبی مدت ہوتی ہے' جب انسان کے ہاتھ اس میں آجاتے ہیں' اس کا جو عملِ صالح ہوتا ہے تو اس کو بڑی تیزی سے بلند کر دیتا ہے۔

کائنات کے اندر باہمی ربط کی طرح قرآنِ حکیم کا ایک ایک لفظ مربوط ہے

اگلی آیت میں اس کی شہادت آئی ہے اور یہ شہادت میں نے کہا ہے کہ ہم اس لیے خوش قسمت ہیں کہ ہمارے دور میں اس باب میں ایسے انکشاف ہوئے ہیں کہ ہم اسے آسانی سے سمجھتے ہیں ورنہ بات تو یہ تھی۔ کہا ہے کہ **وَ اللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ** (35:11)۔ نظر بظاہر نہ کوئی اس آیت کا سابقہ آیت سے ربط نظر آتا ہے' نہ ہی یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ جو حقیقت اس میں بیان کی گئی ہے اس حقیقت کے ساتھ اس کا تعلق کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں کے وہ طبقے جو اسلاف کے کسی قول کو حرفِ آخر سمجھتے ہیں ان کی سمجھ میں یہ بات بھی نہیں آتی کہ ان آیتوں میں ربط کیا ہے' چنانچہ قرآن کے متعلق یہ عام بات ہے کہ صاحب! اس میں ربط والی بات تلاش نہیں کرنا چاہیے' یہ تو ایسے ہی ہے جیسے چلتے چلتے کچھ باتیں کرتا چلا جائے' کبھی درخت کے متعلق بات کر دی' کبھی دریا کے متعلق کر دی' اس میں ربط کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ کائنات کے ربط کی تو بات وہ ہے جو اقبالؒ (1877-1938) نے کہی ہے:

لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

انسانی زندگی کی ابتدا پانی سے ہوئی طینِ لازب سے ہوئی

قرآن کی ربط کی کیفیت یہ ہے کہ الحمد سے والناس تک ایک مربوط سلسلہ چلا جاتا ہے۔ کہا ہے کہ وَ اللّٰہُ خَلَقَکُمۡ مِّنۡ تُرَابٍ (35:11)۔ اس کا عام ترجمہ یہ کیا جائے گا کہ اللہ نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا' ثُمَّ مِنۡ نُّطۡفَۃٍ (35:11)۔ پھر نطفہ تک آ گیا۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اُسی حقیقت کو سامنے رکھیے کہ خدا کے امر کے مطابق جو اس کا پروگرام چلتا ہے' بڑا سست رفتار ہوتا ہے' ابھی تمہارا ہاتھ اس میں نہیں لگتا۔ تخلیقِ انسانی یا جتنے جاندار ہیں ان کی تخلیق کے متعلق میں اپنی کتابوں کے اندر لکھ چکا ہوں اور متعدد درسوں میں بتا چکا ہوں کہ جسے آپ Evolution کی تھیوری یا نظریۂ ارتقا کہتے ہیں اس کے مطابق زندگی کی ابتدا ایک نفسِ واحدۃ سے' Universal Cell سے ہوتی ہے یہ ایک ایسا سیل ہے جو Naked Eye سے یعنی برہنہ آنکھ سے دیکھا بھی نہیں جاتا' اسے مائیکروسکوپ (خوردبین) کے نیچے دیکھا جاتا ہے اور یہ وہ سیل ہے جس کے اندر ابھی نر اور مادہ کی تمیز نہیں ہوتی۔ یہ ایک ہوتا ہے' واحد ہوتا ہے۔ وہ سیل کس طرح بنتا ہے؟ قرآن نے کہا ہے کہ وَ جَعَلۡنَا مِنَ الۡمَآءِ کُلَّ شَیۡءٍ حَیٍّ (21:30) ہر شے میں زندگی کی ابتدا پانی سے ہوتی ہے لیکن جو ابتدا پانی سے ہوتی ہے' اس کے لیے پروسیس یہ ہے کہ وہ پانی مٹی کے ساتھ ملے تو پھر اس میں سے جرثومہ بنتا ہے۔ تحقیق یہ ہے کہ جو ہڑ یا دریا کے کنارے کے اوپر جو کائی وغیرہ جمتی ہے' جو مٹی اور پانی ملتا ہے تو اس میں سے خمیر اٹھتا ہے' اس خمیر کے اندر سے یہ پہلا جرثومہ پیدا ہوتا ہے۔ قرآن نے اسے طینِ لازب کہا ہے کہ زندگی کے جرثومے کی ابتدا چپ چپی مٹی سے ہوتی ہے۔ کہیے اس سے پہلے کون اس بات کو سمجھ سکتا تھا۔ کہیں اس نے اسے خالی تراب ہی کہا ہے' اس کے پھر مآء ساتھ لایا ہے۔ اب اگر یہ جو چیز ہے کہ خدا نے انسان کی تخلیق مٹی سے کی تو وہ تصور وہی ہو سکتا تھا' وہ آدم کا پتلا ایک مٹی سے بنایا گیا اور کوئی بات ان کے سمجھ میں آ نہیں سکتی تھی اور یہ بھی اس لیے آئی کہ تورات میں ایسا لکھا ہوا تھا۔ وہاں سے یہ چیز آئی' یہودی عیسائی اس چیز کو عام کرتے تھے۔ اُنہوں نے بھی سن پایا' علمی تحقیق تو ہوئی نہیں تھی اس لیے اُنہوں نے بھی یہی کہا کہ وہ مٹی کا ایک تھوبہ سا ہے جیسے کمہار اُسے چاک پہ رکھتا ہے اور پھر اس کو گردش دیتا ہے اور اس میں سے ایک پیالہ اور صراحی اور پرات اور یہ اور وہ چیزیں بناتا ہے جیسے قرآن وَ اللّٰہُ یُصَوِّرُکُمۡ (3:6) کہتا ہے کہ انہیں الگ الگ Forms (پیکر) دیتا چلا جاتا ہے۔ اُنہوں نے یہی سمجھا کہ تراب یا طین کے معنی یہی' گوندھی ہوئی مٹی' ہیں اس کو رکھا اللہ میاں نے چاک پہ اور اس کو بنایا اور اس کے بعد وہ آدم کا ایک پتلا بنایا۔ اس سے زیادہ کیا سمجھ سکتا تھا۔

بچپن کی بات یاد آ گئی۔ ساڈے باتاں پاندے ہوندے سن سون لگیاں:

''بات پاواں' بتونی پاواں' سن پایا حکیماں!

لکڑیاں دا پانی کڈاں' تے چک بناواں

دس کی ہو یا بجھو'۔

اس قسم کی وہ بات ای سی ساڈے جیہڑی پینڈی ❶ سی۔ وہ ایک مٹی کا تھوبہ لیا اور اس کو چاک پہ رکھا اور یوں کچھ خدا نے کیا اور اس میں سے آدم کا پتلا بن گیا۔ اس آدم کے پتلے سے پھر آگے مشکل پڑتی تھی کہ وہ زوج بنانی تھی وہ زوج اس کی پسلی سے بنائی۔

انسانی پیدائش کا موجودہ سلسلہ اپنے اندر اربوں سال کی مسافت لیے ہوئے ہے

میں نے کہا ہے کہ ہم جب ان حضرات کے متعلق یہ کہتے ہیں تو اس میں ان کی کوئی تنقید نہیں ہوتی' اس دور کا علم ہی ایسا تھا' ہم اس دور میں ہوتے تو ہم بھی کچھ اسی قسم کی باتیں کرتے۔ اعتراض کی بات یہ ہے کہ اس قول کو حرفِ آخر سمجھ لیا گیا ہے اور پھر قرآن کی طرف ہم پلٹے نہیں کہ اس نے یہ جو چیز ابتدا کی ہے' وہ کیا ہے۔ اب معلوم ہوا ہے کہ وہ جو اولین نفسِ واحدۃ بنا' وہ پہلا واحد جرثومہ Life Cell بنا' جس میں ابھی یہ Male (نر) اور Female (مادہ) کی Distinction (تقسیم) نہیں تھی اس لیے وہ واحد تھا۔ یہ جو واحد سیل ہے' آج اس کا تجزیہ کرتے ہیں' اس کو لیبارٹری میں دیکھتے ہیں کہ وہ کیا کرتا ہے۔ بہرحال یہ تو دوسری بات تھی۔ وہاں سے' اس لائف سیل سے' تـــــــــراب سے' پانی اور مٹی کے امتزاج سے' یہ سلسلہ چلا اور جب یہ کسی شکل میں آیا ہے اور وہ مرحلہ آیا ہے کہ جس میں پھر آگے جسے Procreation (ولادت) کہتے ہیں' جنسی اختلاط سے آگے پیدا ہونا کہتے ہیں' خواہ وہ حیوانات میں ہو' خواہ وہ انسانوں کے اندر ہو' شروع ہوا۔ جنسی اختلاط سے پیدا ہونے تک یہ جو مراحل تھے' وہ ابتدائی جرثومے سے لے کر اب تک لاکھوں کروڑوں' پتہ نہیں اب تو اربوں سال ہیں جو اس کے اندر لگے ہیں۔ یہ کاروانِ حیات جن منزلوں سے گزرا ہے' اسے ایک ایک منزل میں لاکھوں برس صرف ہوئے ہیں' پھر اس میں ایک ذرا سا تغیر ہوا ہے اور اس کا اگلا مرحلہ شروع ہوا ہے' ایک ایک دن خدا کا پچاس پچاس ہزار سال کا ہے۔ قرآن اُس طینِ لازب سے شروع کر کے تمہاری تخلیق کہتا ہے۔

عزیزانِ من! قرآن مجید کہتا ہے کہ تمہاری تخلیق اس طینِ لازب سے شروع کی۔ یہ لاکھوں کروڑوں برس کے مراحل تھے۔ یہ اس لیے تھے کہ اس کے ساتھ ابھی انسان کا ہاتھ نہیں لگا تھا' خدائی پروگرام کے مطابق یہ سلسلہ چل رہا تھا۔ انسان کا ہاتھ ابھی اس میں نہیں لگا تھا

---

❶ ہمارے ہاں سوتے وقت پہیلیاں ڈالا کرتے تھے:

پہیلی ڈالوں' معمہ ڈالوں' اے بھائی حکیم! اسے سنو! کہ میں لکڑیوں سے پانی نکالوں' اسے چاک پہ رکھوں۔ اب بتاؤ کہ یہ کیا ہوا' اسے بوجھو۔ اس قسم کی وہ پہیلی نما بات تھی جو ہمارے ہاں پوچھی جاتی تھی۔

اس لیے اس کی جو رفتار تھی اس میں تیزی نہیں پیدا ہوئی تھی۔ یہ مرحلہ انسان کے ہاتھ سے تھا ہی دور'اس کی دسترس سے باہر تھا۔ بہرحال انسان کا ہاتھ نہیں لگا تو یہ مراحل کروڑوں برس میں طے ہوئے۔ اس اتنے لمبے عرصے کی وہی بات اس نے پہلے کہی۔ اور اس کے بعد پھر کہتا ہے کہ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا (35:11) اس کے بعد پھر جب تمہاری دنیا آئی تو اس میں پھر آگے نر اور مادہ' مؤنث اور مذکر' مرد اور عورت کے جنسی اختلاط سے تخلیق ہوئی۔

اب آ گیا انسان کا مرحلہ۔ اگر اس میں اس کی رفاقت نہ ہو یعنی جنسی اختلاط نہ ہو تو خدا کا یہ پروگرام دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے۔ وہ جواز خود وہاں سے اتنے مراحل طے کرتا ہوا چلا تھا' اس شکل میں آ پہنچا تھا' یہاں آنے کے بعد اس نے اپنا وہ جو پروگرام تھا اس کو چھوڑ دیا۔ انسان کی زندگی میں آ کر' حیوان کی زندگی میں آ کر' یہاں آ کر' اب انسان پہ آ گیا کہ وہ اس پروگرام کو آگے بڑھائے۔ اگر یہ جنسی اختلاط نہ ہو تو تخلیق ختم ہو جاتی ہے۔ یوں نظر آتا ہے جیسے اُس نے اس پروگرام کو یہیں تک از خود پہنچانا تھا اور اس کے بعد اس کے سپرد کرنا تھا کہ لو بھئی! اب تم آگے چلاؤ۔ اب اس نے اسے آگے چلایا ہے۔

رحمِ مادر میں جرثومے کے ارتقا کی اربوں سالوں کی منازل' مہینوں میں' دنوں میں

ان سائنس کے انکشافات پہ آپ حیران ہونگے کہ رحمِ مادر کے اندر وہ جو جرثومۂ حیات ہوتا ہے' وہ وہی ہوتا ہے جو اولیں جرثومۂ حیات تھا اور یوں مراحل طے کیے تھے' یعنی اس جرثومے کے ایک پیکر یا شکل اختیار کرنے کے لیے کروڑوں سال لگے تھے اب چھ مہینے کے عرصے میں وہ سارے مراحل طے ہو جاتے ہیں۔ یہ جو رحمِ مادر کے اندر جرثومہ ہے' یہ Evolution یعنی ارتقا میں جتنی Stages (مراحل) سے گزرا ہے' یہ جس جس شکل میں جو کچھ بنا ہے آپ حیران ہونگے کہ یہ اسی طرح سے اس کے اندر چھ مہینے کے عرصے میں اس شکل میں بنتا ہے۔ یہ جرثومہ ان تمام مراحل سے گزرتا ہے جو اس سے پیشتر یہ از خود گزر رہا تھا' اس جرثومے کے اندر جتنی Development (نشوونما) ہوتی ہے' اب تو وہ ان کے متعلق بڑی آسان ہے جب تصویریں لیتے ہیں اور جب Evolution (ارتقا) کی تھیوری کے اندر دیکھتے ہیں کہ وہی جو پچھلی تخلیق کے مراحل میں سے زندگی گزری ہے وہ الگ بات ہے کہ وہ پچاس پچاس سو سو فٹ کے ہوں اور یہ ملی میٹر کی لمبائی چوڑائی ہو لیکن ہوتا یہ وہی ہے جو وہاں ہوتا ہے' سارے مراحل جو اس نے اربوں سال میں یا شاید کروڑوں سال میں یا لاکھوں سال میں طے کیے تھے رحمِ مادر کے اندر انسان کے یہ اعمالِ صالحہ اس کو بلندیوں تک لے جاتے ہیں اور یہ تو چھ مہینے میں طے کر دیتا ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ وہ جو کہا تھا کہ ہمارا امر جب ہمارے ہی پروگرام کے مطابق چلتا ہے تو کروڑوں سال میں وہ بات طے ہوتی

ہے' جب انسان کا ہاتھ اس میں لگتا ہے تو وہ کروڑوں سال برسوں مہینوں یا دنوں میں طے ہو جاتے ہیں۔ اس کی یہ مثال تھی کہ تراب سے شروع کر کے جنسی اختلاط تک پہنچایا ہے۔ اندازہ لگائیے' عزیزانِ من! اس کی داد تو یورپ کا کوئی Inventor (موجد) ہی دے سکتا ہے۔ یہاں داد کا لفظ بھی غلط ہے' خدا کو کیا داد دی جائے گی!! یوں کہنا چاہیے کہ اس کو Appreciate (پسند) تو کوئی سائنٹسٹ ہی کر سکتا ہے' Embryologist (ماہر جینیات) ہی کر سکتا ہے کہ قرآن کیا کہہ گیا ہے لیکن اس بات کی کس قدر ایک زندہ شہادت ہے کہ جب ہمارے پروگرام کے مطابق وہ سلسلۂ تخلیق چلا تو کروڑوں برس لگے' جب تمہاری رفاقت اس کے ساتھ آئی ہے تو وہی جو کروڑوں برس تھے وہ چند مہینوں میں' چند دنوں میں طے ہو گئے لیکن جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ یہاں پہنچنے کے بعد یہ جو اختلاط کے رو سے سلسلہ تخلیق' کا بچے کا آگے چلتا ہے اگر انسان اس کے اندر اپنے عملِ صالح سے یہ عمل نہ کرے' خدا پھر از خود نہیں کرتا۔ اپنی اسکیم کو یہاں تک پہنچا کر' میں Inverted Commas میں جیسے کہتے ہیں کہونگا' کہ 'ریٹائر ہو گیا'۔ اس نے کہا کہ **اِعۡمَلُوۡا مَا شِئۡتُمۡ** (41:40) وہاں تک ہماری مشیت چلتی تھی' اب تمہاری مشیت ہے' تمہارا جی چاہتا ہے' ٹھیک ہے' اب آگے چلو۔ یہ کہ یہ چیز اب انسان کی رفاقت سے ہوگی اس کے لیے یہ اتنی اہم مثال دی ہے۔

پہلے بھی بات آ چکی ہے اور بڑی اہم چیز ہے کہ بات تو عیسائیوں کے عقیدہ کی ہو رہی تھی۔ اُنہوں نے کہا کہ حضرت عیسیٰؑ ابن اللہ ہیں یعنی خدا کے بیٹے ہیں' خدا کی طرف سے جواب یہ دیا جا رہا ہے کہ یہ خدا کا بیٹا کیسے ہو سکتا ہے۔ پہلے ہے کہ **بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ** (2:117) یہ ٹھیک ہے کہ پوری کی پوری کائنات کو ہم عدم سے وجود میں لے آئے ہیں لیکن انسانی بچے کی تخلیق کے لیے ہم نے جو یہ بات انسانوں کے سپرد کر دی ہے اور جو انسان کا پروگرام ہے' اس میں ہمارا قانون یہ ہے کہ یہ مرد اور عورت کے اختلاط سے بات آگے چلے گی۔ یہ قانون ہم نے بنایا تو اس میں یہ کہا ہے۔ جب یہ کہا کہ یہ خدا کا بیٹا ہے تو کہا کہ خدا کے ہاں بیٹا کیسے پیدا ہو سکتا ہے جب اس کے ہاں بیوی ہی نہیں ہے۔ یعنی اب یہ چیز میاں بیوی' مرد اور عورت پہ منحصر ہوگی' خدا بھی از خود یہ نہیں کرتا کہ اس اختلاط کے بغیر کوئی وجود میں لے آئے۔ یہ ہے انسان کی رفاقت۔ مثال وہ دی ہے جس کو دو اور دو چار کی طرح سائنس کی لیبارٹری کے اندر دیکھا جا سکتا ہے۔ عظیم حقیقت ہے جس کا ثبوت سائنٹفک شہادت کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔ کہا کہ **ثُمَّ مِنۡ نُّطۡفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمۡ اَزۡوَاجًا** (35:11) وہ پھر جو دونوں جوڑے بنے ہیں اور اس کے بعد کہا کہ **وَ مَا تَحۡمِلُ مِنۡ اُنۡثٰی وَ لَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلۡمِهٖ** (35:11) پھر اس کے بعد رحمِ مادر میں وہ جنین کن کن مرحلوں سے گزرتا ہے' اس کے اندر کیا کیا تبدیلیاں ہوتی ہیں' پھر اس کے بعد کس طرح سے وضع حمل ہوتا ہے' تولید ہوتی ہے' وہ کہتا ہے کہ یہ سب کچھ ہمارے علم میں ہوتا ہے۔ یعنی اب صرف اتنا ہی کہا ہے کہ ہمارے علم میں ہوتا ہے' ہم جانتے ہیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ پھر اس کے بعد وہ بھی ہمارے ہی منشا کے مطابق ہوتا ہے' صرف علم ہے۔ اور عجیب بات ہے جہاں جہاں بھی قرآن

میں رحمِ مادر کے اندر جنین کی صورت آئی ہے ہر جگہ علم کا ہی لفظ آیا ہے کہ ہمارے علم میں ہوتا ہے۔

رحمِ مادر کے سلسلہ میں ایک غلط سوچ کا ازالہ

وہ جو ہمارے ہاں عام طور پہ جہالت میں ہی سہی' مشہور ہے کہ چار چیزیں ایسی ہیں جن کے متعلق انسان کچھ نہیں جان سکتا اور وہ یہ ہیں کہ (۱) انسان نہیں جان سکتا کہ کل کیا کرے گا' (۲) وہ نہیں جان سکتا کہ کس سرزمین پہ اس کی موت آئے گی' (۳) کب اس کی موت آئے گی اور (۴) میں یہ بھی ہے کہ وہ نہیں جان سکتا کہ رحمِ مادر میں کیا ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ وہ دو چیزیں تو ہیں ان کے متعلق تو انسان کچھ نہیں کہہ سکتا کہ Future (مستقبل) میں کیا چیز ہوگی۔ وہ فیوچر (مستقبل) نہیں جان سکتا۔ یہ جو رحمِ مادر کی بات ہے یہ خدا نے کہیں نہیں کہی کہ انسان نہیں جان سکتا۔ اُس نے یہی کہا ہے کہ صرف خدا کو اس کا علم ہوتا ہے اور جو کچھ کائنات میں ہو رہا ہے اس کا علم تو خدا کو ہوتا ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انسان کو اس کا علم نہیں ہوتا' اس نے تو خود انسان کی **وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ** (2:31) سے بات شروع کی ہے' اس نے علم تو خود دیا ہے' **عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ** (96:4) اس نے خود کہا ہے' ہم نے تعلیم دی ہے اس نے کہا ہے کہ **علمه البيان** (55:4) بولنا بھی سکھایا ہے' لکھنا بھی سکھایا ہے' تعلیم دی ہے' علم دیا ہے۔ یہ بات نہیں کہ جس چیز کا علم خدا کو ہے انسان کو اس کا علم نہیں ہے' جس چیز کی نفی خدا نے کی ہے کہ انسان کو اس کا علم نہیں ہو سکتا بس وہی حد ہے جس میں انسان کو اس کا علم نہیں ہو سکتا' باقی ساری کائنات کے متعلق خدا نے اس کو خود علم دیا ہے۔ یہ علم ہو کیوں نہیں سکتا؟ بات ضمناً آ گئی تھی۔ کہا کہ **اِلَّا بِعِلۡمِهٖ** (35:11) اسے اس کا علم ہوتا ہے۔ بات یہ کہی کہ ہمارا علم تو ہوتا ہے' عمل ہمارا نہیں ہوتا' اس میں عمل اب انسان کا ہی ہوا۔ اب انسان کی دنیا کے اندر یہ بات ہوگئی کہ یہاں وہی نتائج مرتب کرنے کے لیے جو خدا اپنی کائنات میں یوں کر رہا ہے' اب انسانوں کی رفاقت کے لیے اس کے عملِ صالح کی ضرورت پڑ گئی ہے' یہ اگر اس زندگی میں اس کا رفیق نہیں بنتا' تو پھر وہ نتائج مرتب نہیں ہو سکتے۔ اس کے نتائج مرتب ہونگے مگر ہونگے اس پروسیس سے' اسی طریق سے جس کا ایک ایک دن پچاس پچاس ہزار سال کا ہے۔

چودہ سو سال کے عرصہ میں انسان کا اپنی منزل کی طرف چند قدم سفر

یہی چیز ہمارے ہاں کی معاشرتی زندگی کے اندر بھی ہے۔ یہ انسان جتنی چیزیں اس کے قانون کے خلاف کر رہا ہے ان کا نتیجہ بھی بھگت رہا ہے۔ اس کے کائناتی قانون کی رو سے یہ کشاں کشاں اس منزل کی طرف جا رہا ہے جو اس نے اس کے لیے منتخب کی تھی۔ لیکن وہی اس کی رفتار ہے بڑی سست۔ چودہ سو سال کے عرصے میں یہ انسان اس کی طرف یونہی چند قدم چل سکا ہے۔ وہ جو چودہ سو سال پہلے جب انسان کی رفاقت اس کے ساتھ آئی تھی تو چند دنوں کے اندر اس نے وہ سارے مراحل طے کر کے تمام نتائج برآمد کر دیئے تھے۔ وہ جو

میں نے کہا تھا کہ اب چوبیس گھنٹے کے اندر وہ گلاب کا پھول پیدا کر لیتے ہیں' اُنہوں نے تو چوبیس گھنٹے سے بھی کم عرصے میں پھول پیدا کر دیئے تھے' صحنِ کائنات پھولوں سے بھر گیا تھا جب محمد رسول اللہ ﷺ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ کا ہاتھ لگا ہے۔ کہا ہے کہ بِعِلْمِهٖ (35:11) یہ اس کے علم میں ہوتا ہے۔

کیا عمر کا تعین کہیں پہلے سے ہوا ہے؟

عزیزانِ من! اب آگے آخر میں انسان کی زندگی کا جو اگلا مرحلہ ہے وہ موت کا مرحلہ ہے' اس کے ساتھ ہی کہا ہے کہ **وَ مَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّ لَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖۤ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ** (35:11)۔ اب یہ وہ آیت ہے کہ پھر جس کے غلط مفہوم نے ہمارے لیے مصیبتیں' الجھنیں اور کشمکش پیدا کر دی ہے۔ 'موت کا ایک دن مقرر ہے' ضرب المثل ہے۔ ہمارے ہاں ہر ایک کی زبان پہ یہ بات ہے کہ وہ تو لکھی ہوئی ہے صاحب! ٹل ہی نہیں سکتی' اپنے وقت پہ آ کر رہے گی۔ موت ہی نہیں عمر کہیے کہ ہر ایک کی عمر لکھی ہوئی ہے' اتنے سال کی عمر میں اس نے مر جانا ہے اور اس میں ذرا سی بھی دیر سویر نہیں ہو سکتی' متعین ہے' مقرر ہے' پہلے سے لکھی ہوئی ہے' تقدیر میں ہے' قسمت میں ہے' خدا نے فیصلہ کیا ہوا ہے' اور عمر کا ہی نہیں' موت ہی کا نہیں' یہاں تو یہ چیز ہے کہ خدا کے حکم کے بغیر پتہ بھی نہیں ہلتا تو انسان کا ہر کام' اس کے جملہ امراض لکھے ہوئے ہیں' خوشحالی غریبی امیری ہر چیز کے فیصلے پہلے سے ہوئے ہوتے ہیں۔ علاوہ اس کے' عزیزانِ من! یہ تصور قرآن کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے۔ اس کی بنیادی تعلیم ہی یہ ہے کہ اس کائنات میں بلا حدود و قیود اختیارات خدا کو حاصل ہیں' وہ قادرِ مطلق ہے' اس کا عطا کردہ اختیار انسان کو حدودِ بشریت کے اندر حاصل ہے' انسان صاحب اختیار ہے۔ جونہی آپ اس کی ہر بات کو پہلے سے مقدر' لکھا ہوا کہیں' اسے قسمت کہہ دیں تو اس کا اختیار تو ختم ہو گیا' اس کے اختیار میں ہی کچھ نہیں۔ یہی چیز ہے کہ اگر اس کی عمر پہلے سے لکھی ہوئی ہے' سوال ہی نہیں ہے کہ اس میں ذرا سی بڑھ جائے یا ذرا سی کم ہو جائے' دو سانس بھی زیادہ آ سکیں یا دو سانس کم رہ جائیں۔ علاوہ اس کے جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ یہ تصور قرآنِ کریم کی بنیادی حقیقت کے خلاف ہے۔ اس تصور کے ماتحت آپ دیکھیے کہ انسان کس طرح منافقت کے اوپر اتر آتا ہے۔ مریض ہے' بیمار ہے' ایک طرف ایمان یہ ہے کہ خدا کے حکم سے یہ مرض آیا' اتنے دن یہ رہے گا' یہ خدا نے پہلے سے مقرر کیا ہوا ہے' آرام ہو گا یا نہیں ہو گا پہلے سے طے شدہ ہے' فلاں دن اس نے مر جانا ہے' پہلے سے لکھا ہوا ہے' صبح کے وقت ایک سو ایک ڈگری (F) ہونا ہے' دو پہر کو ایک سو تین ہونا۔ یہ ہے لکھا ہوا ہے' اور خدا کا لکھا مٹایا ہی نہیں جا سکتا۔ یہ ہوا ایمان۔ اور صبح اٹھ کر جو بھاگ دوڑ شروع ہوتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب! آپ فرمائیے کہ بخار ایک سو چار ڈگری (F) ہو رہا ہے کیا کیا جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ برف کی پٹیاں رکھی جائیں' پیراسٹامول دی جائے۔ وہ کہتے ہیں ڈاکٹر صاحب! اس سے آرام نہیں ہوا' اس کے بعد کیا کیا جائے۔ وہ

بھاگتے دوڑتے ہیں کہ وہ بخار ایک سو چار ڈگری (F) سے ایک سو ایک پہ آ جائے۔ ایمان یہ ہے کہ ایک سو چار خدا کے حکم سے آیا ہے' جو اٹل ہے' اس کا حکم اٹل ہے اور یہ اس کے خلاف چیلنج دے کر بھاگ دوڑ کر رہا ہے' دیکھتا ہوں کہ کیسے اٹل ہے' نیچے لاتا ہوں کہ نہیں۔ کہ جی یہ تو نیچے آ گیا۔ کیسے ہوا؟ کہ جی' یہ بھی خدا کے حکم سے ہوا۔ اس کے حکم سے نیچے ہونا تھا تو یہ ڈاکٹر صاحب بیچ میں کاہے کے لیے تھے' آپ کیوں اس طرح تگنی کا ناچ ناچ رہے تھے جو یہ ہونا ہی تھا۔ آپ نے دیکھا ہے کہ کبھی کسی نے اس پہ سوچا نہیں کہ یہ کیا کیفیت ہے۔ نہ تو وہ ایمان ہے' اگر وہ ایمان ہے کہ یہ سب کچھ اس کے حکم سے پہلے سے لکھا ہوا ہو رہا ہے' تو خاموشی سے بیٹھنا چاہیے اور اگر یہ نہیں ہے' آپ کی کوششوں سے کچھ ہونا ہے تو پھر وہ کہنا چھوڑ دیجیے کہ یہ پہلے سے لکھا ہوا ہے' اس کے مطابق ہو گا۔

عزیزانِ من! یہ مسلمان دونوں چیزیں کر رہا ہے' اس پہ بھی ایمان ہے جب وہ ہو چکتا ہے تو پھر کہتا ہے کہ او جی اصل میں یہ تھا کہ '' ودھی دا کوئی غم نئیں' تے گھٹی دا کوئی دم نئیں' سدھی جی گل اے' اللہ نے لکھیا ای ایویں ہیگا سی' ساہ ای ایہنے سن جی اوہدے ❶ '' اس کے بعد وہ جب ہو چکتا ہے تو یہی کہتا ہے مگر اس دوران میں یہ ساری سعی و کاوش جو جتنی ہو رہی ہے' یہ تو پھر اس لکھے ہوئے کے خلاف ایک چیلنج ہے کہ دیکھتا ہوں یہ کیسے ان مٹ ہے۔ اسے مٹانے کے لیے یہ تگ و تاز ہو رہی ہوتی ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی کہا جا رہا ہے۔ آپ نے غور کیا ہے کہ قرآن میں جو اس نے کہا تھا کہ قرآن کے اندر غور و فکر کرو۔ اس کو چھوڑ دینے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ یہ کہ نہ تو وہ ایمان باقی رہا اور اگر وہ ایمان ساتھ ہے تو کچھ نہ کچھ تو اس میں بات ہے۔ پھر تو مرنے کی صورت میں یہ یقین ہو جائے گا کہ دوائی نے جو اثر نہیں کیا ہے تو خدا کی مرضی اس میں نہیں ہے۔ اب وہ اس تیقن کے ساتھ علاج کے پیچھے نہیں چلے گا کہ صحیح علاج سے ہی اس بخار کو آرام ہو سکتا ہے۔ یہ بات وہاں تک چلتی ہے۔ نسخہ لکھتے وقت بھی پہلے تو ہمارے زمانے کے وہ طبیب ہی کرتے تھے' اب ماڈرن ہو گئے ہیں' وہ ہمارے ہاں سارا اسلامائزیشن ہو رہا ہے' ڈاکٹر نے بھی نسخے کے اوپر '' ھوالشافی '' لکھنا شروع کر دیا ہے کہ شفا تو اس نے دینی ہے' '' اسی صرف فیس ای لینی ہیگی اے ❷ ''۔

خدا تعالیٰ نے ہر چیز کے لیے قانون بنا رکھے ہیں

یہ کیا ہے؟ یہ کیوں فریبِ نفس میں مبتلا ہے؟ دھڑلے سے' پورے یقین کے مطابق کہو کہ شفا اس کے بتائے ہوئے قوانین کے مطابق ہو گی اور وہ قانون ڈاکٹر جانتا ہے' سمجھتا نہیں ہے تو اس ڈاکٹر کے علم میں کمی ہے۔ ہمارا یہ کام اس کے قانون کے مطابق ہونا ہے۔

---

❶ زندگی کے بڑھنے یا گھٹنے پر کوئی اختیار نہیں ہے۔ سیدھی سی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہی ایسے تھا' اس کے سانس ہی اتنے تھے۔

❷ ہمیں تو صرف اپنی فیس ہی وصول کرنی ہے۔

یہ معلوم کریں کہ اس معاملے میں اس کا قانون کیا ہے پھر وہ کبھی اس قانون کے خلاف نہیں کرے گا۔ اس کا یقین ہے، ہمیں کتنا بڑا یقین ہے یہ! یہاں آدمی ایک یقین کے اوپر آ گیا، یہاں منافقت نہیں رہی لیکن دونوں چیزیں ساتھ چلتی ہیں، اس لیے کہ یہ جو ہے کہ صاحب! خدا کے حکم سے سب کچھ ہوتا ہے، اس سے انسان دیندار یا اللہ والا بن جاتا ہے۔ یہ منافقت ہے اور وہ جو ساتھ ساری تدبیر کر رہا ہوتا ہے، کہتا ہے کہ جی! ہوتا تو خدا کے حکم سے ہی ہے لیکن تدبیر کرنا فرض بھی تو ہے یعنی اسی خدا نے یہ بھی کہہ دیا کہ ''اسی تے ایوں کیتا ہویا ہیگا ای تے توں ایہہ کردار ہیں، نسدار ہیں ❶''۔ ایک سوچ کے سوئچ آف کر دینے سے بات کہاں پہنچ جاتی ہے: نہ اس یقین پہ رہی کہ وہی سب کچھ کرتا ہے تو چلو، آرام سے بیٹھ جاؤ، نہ اس یقین کے اوپر رہی کہ یہ ہمارے ہی اختیار، ہمارے ہی ہاتھوں اس کے قانون کی رو سے ہمارا نقصان ہوتا ہے۔ قانون یہ ہے کہ اتنا سنکھیا پھانک لو، موت ہو جائے گی۔ یہ ہے خدا کا اس کو حکم۔ کیوں کہو؟ قانون کہو اور یہ ہے میرے اختیار کی بات کہ اتنا سنکھیا پھانکوں یا نہ پھانکوں، پھانک لونگا تو پھر اس کا وہ جو قانون ہے اس کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔

عمر کے کم ہونے یا زیادہ ہونے کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کا بیان کردہ اصول

اس آیت میں انسان کی عمر کے متعلق بات چلی، اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ کسی کی عمر نہ بڑھ سکتی ہے، نہ گھٹ سکتی ہے مگر فی کتاب، اللہ کی کتاب میں یہ لکھا ہوا ہے۔ پہلے تو ذرا کھڑے ہو کر اس ترجمے کو سوچیے کہ بات کیا بنی کہ کسی کی عمر نہ بڑھ سکتی ہے نہ گھٹ سکتی ہے مگر جو خدا کی کتاب میں لکھ دی ہے یا ترجمہ یہ ہے کہ جو کچھ کسی کی عمر میں بڑھتا ہے یا اس کی عمر سے گھٹتا ہے: **مَا يُعَمَّرُ مِنۡ مُّعَمَّرٍ وَّ لَا يُنۡقَصُ مِنۡ عُمُرِهٖۤ** (35:11) یعنی اس کی عمر میں سے اگر کچھ کم ہوتا ہے یا اس سے زیادہ ہوتا ہے تو **فِىۡ كِتٰبٍ** (35:11) یہ خدا کی کتاب میں لکھا ہوا ہے۔ کیا لکھا ہوا ہے؟ ایک تو آپ کہتے ہیں کہ اس کی عمر لکھی ہوئی ہے۔ اگر وہ پچاس برس لکھی ہوئی ہے تو یہ تو خدا کا لکھا ہوا اٹل ہے، اب کہتا ہے کہ اس میں سے اگر کچھ بڑھتا ہے یعنی پچاس کی بجائے پچپن عمر ہو جاتی ہے تو **فِىۡ كِتٰبٍ** ہے، یہ بھی لکھا ہوا ہے، اگر پینتالیس رہ جاتی ہے تو **فِىۡ كِتٰبٍ** ہے، یہ بھی لکھا ہوا ہے۔ ''چنگی کتاب اے او ❷؟'' یعنی پہلے عمر بھی لکھی ہوئی ہے **مِنۡ عُمُرِهٖۤ** پھر آگے ہے **وَمَا يُعَمَّرُ مِنۡ مُّعَمَّرٍ** کہ اس عمر سے جس کی عمر کچھ زیادہ ہوتی ہے **وَّ لَا يُنۡقَصُ مِنۡ عُمُرِهٖۤ** اس کی عمر میں سے کچھ کمی اگر ہوتی ہے **اِلَّا فِىۡ كِتٰبٍ** وہ بھی کتاب میں ہے۔ پوچھیں کہ کیا ہوا؟ آپ نے کہا تھا پچاس سال کی عمر ہے، یہ پچپن کیوں ہو گئی؟ کہنے لگا ''اگلا ورق تے ویکھو اوتھے ہے نا 55 لکھی ہوئی''۔ پینتالیس کیوں رہ گئی؟ کہنے لگے کہ ایک ورق پیچھے الٹو، اس میں ہم نے پینتالیس لکھا ہوا ہے۔ یہ کچھ سوچ نہ ہونے سے ہوا ہے، اسی لیے قرآن غور و فکر پہ بار بار تاکید کرتا ہے۔

---

❶ ہم نے تو یوں کیا ہوا ہے، تم یہ کچھ کرتے رہو، بھاگتے رہو۔

❷ یہ کیسی کتاب ہے؟

غلط تراجم کے پیدا کردہ نتائج کی متضاد کیفیت

آپ غور کیجئے' عزیزانِ من! جو کچھ میں کہہ رہا ہوں۔ کیا اس کے لیے کسی افلاطون کے دماغ کی ضرورت ہے؟ یہ پیش پا' افتادہ سی' سیدھی سی باتیں ہیں کہ من عمرہ کہہ کر وہ کہتا ہے کہ اس عمر سے جو گھٹتی ہے یا جو بڑھتی ہے اس کی کتاب ہے' تو اس کے معنی ہیں کہ کتاب کے اندر کوئی Fix (متعین) عمر ہے۔ اب کتاب کے متعلق یہ لکھا۔ اُنہوں نے کتاب کا ترجمہ قسمت کا نوشتہ کہا تو یہ ہوا اس کا ترجمہ۔ کتاب کا ترجمہ اگر ان کے ہاں ضابطۂ قانون ہو جاتا تو بات طے ہو جاتی۔ ہوا کیا؟ ایک تو وہ لکھی ہوئی عمر کہیں نہیں ہے' عزیزانِ من! لکھی ہوئی عمر اگر کسی جگہ ہو تو انسان خودکشی کر ہی نہ سکے۔ جس وقت جی چاہے مر سکتا ہے اور اگر یہ چیز ہو کہ وہ جو لکھی ہوئی عمر ہے' اس کے مطابق یہ مرا ہے اور خدا کے حکم کے ساتھ سب کچھ ہوتا ہے' تو قتل کے متعلق پھر یہ ہوا کہ جس نے قتل کیا ہے وہ خدا کے حکم سے کیا ہے' جو مقتول ہے' جسے قتل کیا گیا ہے' اس کی عمر ہی اتنی تھی۔ اور خدا قاتل کو پھانسی پہ بھی چڑھاتا ہے وہ اگر اس کی عدالت کے اندر آ کر ہزار بار کہے کہ سرکار میں کون ہوں یہ کرنے والا' یہ تو آپ نے مجھے حکم دیا ہے اور میں نے یہ خنجر چلا دیا ہے' میرا تو اتنا ہی کام ہے' تو وہ اسے ابلیس کا جواب قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ جو کہنے والا ہے ہمیشہ کے لیے راندۂ درگاہ ہوگا۔ پھر اگر وہ کہے کہ صاحب! اس کی تو عمر ہی اتنی لکھی ہوئی تھی تو میں نے تو اس کی عمر کم نہیں کیا ہے' یہ اس سے زیادہ جی نہیں سکتا تھا' آپ کی اس کتاب کے اندر جو لکھا ہوا تھا' اس نے تو سانس ہی اتنے لینے تھے' اسے وہ نہیں مانتا۔ کہتا ہے کہ یہ مجرم ہے' اس نے اُس کو مار دیا ہے' وہ اپنے وقت کے اوپر موت کے ہاتھوں نہیں مرا' اس نے اس کو مار دیا ہے۔ کہا ہے کہ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا ۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ (5:32) یعنی جس نے کسی ایک جان کو بھی جرم کے علاوہ قتل کر دیا یوں سمجھو کہ اس نے پوری نوعِ انسانی کو قتل کر دیا۔ تو قتل کرنے والا مجرم ہے۔ جسے قتل کیا جاتا ہے' یہ بات نہیں کہ اس کی عمر یہی تھی جو ختم ہوگئی ہے' اس نے تو ابھی جینا تھا۔ تو پھر یہ کیا ہے جو کہا گیا ہے۔ وہ سانس کی بات یاد آ گئی کہ سانس لکھے ہوئے ہوتے ہیں جیسے یہ ہے کہ اناج لکھا ہوا ہوتا ہے' سانس لکھے ہوئے ہوتے ہیں کہ کتنے لینے ہیں۔ یہ حضرت میاں میرؒ (957-1045ھ) ہمارے لاہور میں ہی جن کا مقبرہ ہے' ان کے احوال میں ہم کو یہ کچھ سناتے تھے۔

قوموں کی طبیعی عمر کا دار و مدار ہمیشہ طبعی اصولوں پر ہوتا ہے

یوگا جو ہندوؤں کا ہے اس کے اندر ایک مشق ہوتی ہے جسے حبسِ دم کہتے ہیں یعنی سانس روک لینا۔ وہ اس قسم کی مشقیں ہیں جس کا جی چاہے کر لے۔ وہ سانس روک لیتے ہیں' وہ اس میں اتنے دور تک پہنچتے ہیں کہ آپ نے سنا ہوگا' کبھی آپ نے اخبار میں پڑھا ہوگا کہ ان کے جوگی جو ہیں وہ زندہ قبر کے اندر مقفل منوں مٹی کے اندر چلے جاتے ہیں' جہاں ہوا کا ذرا سا بھی دخل نہیں ہوتا' چالیس چالیس دن زندہ رہتے ہیں۔ تو یہی مشقیں ہمارے ہاں کے تصوف میں بھی آئی ہوئی ہیں۔ وہ حضرتِ میاں میرؒ (957-1045ھ) حبسِ دم کرتے

تھے۔ وہ کہتے تھے کہ سارے دن میں وہ تین یا چار سانس لیتے ہیں۔ ان سے پوچھا گیا کہ حضرت! آپ یہ کیوں کرتے ہیں؟ یہ ان کا لکھا ہوا ہے' میں نہیں کہہ رہا کہ اُنہوں نے کہا ہے یا نہیں کہا۔ کہتے ہیں کہ اُنہوں نے کہا تھا۔ ہاں تو کہنے لگے کہ اللہ میاں نے ہر انسان کے سانس گن کر دیئے ہوئے ہیں کہ اپنی عمر میں اتنے سانس اس نے لینے ہیں تو ہم ان سانسوں کو چوبیس گھنٹے میں یوں کرتے ہیں کہ مثلاً اگر ہم نے دن بھر دو سو سانس لینا تھے تو ہم چار ہی لیتے ہیں تو ہماری عمر تو پانچ سو سال تک بڑھ گئی اپنی عمر کو بڑھانے کے لیۓ اللہ میاں کے ساتھ ہمارا یہ کچھ چلتا ہے۔ سانس گنے ہوئے ہیں' اس میں تو وہ تبدیلی نہیں کرے گا' تو وہ جو دو سال کے اندر سانس ہم نے دس ہزار لینا تھے ہم وہ دس سال کے اندر لیتے ہیں' گنتی تمہاری بھی پوری ہوگئی عمر ہم نے اپنی بڑھالی۔

عزیزانِ من! کیا کرتا ہے یہ مسلمان۔ فریبِ نفس ہے' عدمِ تفکر ہے' قرآن سے دوری کا نتیجہ ہے' یہ ساری روایتیں ہیں کہ عمر لکھی ہوئی ہے' سانس گنے ہوئے ہیں' دانہ پانی گنا ہوا ہے''اینا ای سی' ایہدا دانہ پانی مک گیا[1] '' یہ چیزیں ہمارے ہاں ضرب المثل ہیں' زبانوں پہ آجاتی ہے''لکھیا ای ایناں ہیگا سی[2] ''۔ اس کے لیے اجل ایک لفظ آگیا۔ یہ موت کے معنی میں آتا ہے۔ یہ عجیب چیز ہے۔ آج اس دور میں' ہمارے ہاں' یہ پتہ چلتا ہے کہ ایک Average (اوسط) عمر' سائنس اور Medicine (ادویات) کی رو سے قوموں کے لیے طے ہوتی ہے۔ یہ جو ایک Average (اوسط) عمر ہے اسے عمر طبعی کہتے ہیں' یہ ہر فرد کی الگ عمر نہیں بلکہ عام طور پہ اور پھر وہ صحت کے متعلق جو قوانین ہیں' ان کو عام کرنے سے' قوموں کو ان کے مطابق چلانے سے' صحت برقرار کرنے سے' ان کی تندرستی توانائی برقرار رکھنے سے' جو Average (اوسط) عمر ہے' جو قوموں کی اوسط عمر ہے وہ بڑھتی ہے اور اگر انسان اس کے خلاف چلا جائے' یہ جو Health کے' صحت کے' غذا کے' قواعد اور قوانین ہیں ان کے خلاف چلا جائے تو وہ جو عمر طبعی ہے وہ کم ہو جاتی ہے' چھوٹی چھوٹی سی عمر میں' ہمارے جیسے یہ جو ملک ہیں' ان کے اندر تو بچوں کی موت کی شرح آپ دیکھیے۔ ان کی یہ کیفیت ہے کہ ہمارے ہاں کے لاکھوں کی تعداد کے اندر یہ پھول بن کھلے مرجھا جاتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ جو قانون ہے اس کی خلاف ورزی ہوتی ہے' رحمِ مادر کے اندر صحت کا خیال نہیں' بچے کی غذا کا خیال نہیں' اس کی صحت کا خیال نہیں۔ بیسیوں عوامل ایسے ہیں' عزیزانِ من! کہ خیال کر کے بھی کیا کرے گا۔ ہزار کوشش کر کے دیکھ لیا' آپ کو ایک روٹی تو خالص آٹے کی مل نہیں سکتی۔ پھر اس قوم کی Average (اوسط) عمر کیا ہوگی۔ وہ جو قوموں کی طبعی عمر جس کو Average Age (اوسط عمر) کہتے ہیں وہ اتنی آگے چلی گئی ہے اور ہمارے ہاں یہ ہیں کہ اس کو Neglect (فراموش) کر رہے ہیں۔

---

[1] یہی کچھ تھا' اس کا آب و دانہ ختم ہوا۔

[2] اتنا ہی لکھا تھا۔

قرآنِ حکیم نے انسان کی عمر متعین نہیں کی

کہا کہ وہ جوانسانوں کی Average (اوسط) عمر تم شمار کرتے ہو وہ اس عمر سے بڑھ بھی سکتی ہے، قوموں کی عمر اس سے گھٹ بھی جاتی ہے۔ یہ اِلَّا فِیۡ کِتٰبٍ (35:11) ہے۔ اس کے لیے بھی ہمارے ہاں قانون مقرر ہے۔ کہتے ہیں کہ اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیۡرٌ (35:11) یہ کچھ بات ہمارے لیے مشکل نہیں تھی، مشکل تو جب ہوتی کہ جب ہم ایک عمر لکھ دیتے اور پھر کہتے کہ یہ اٹل ہے، اس میں تبدیلی نہیں ہوسکتی، پھر ہمارے لیے مشکل تھی کہ ہم کہتے کہ اس میں تبدیلی نہیں ہوسکتی اور تم اس میں تبدیلی کر دیتے ''تے اسیں پھنس جاندے مصیبت اچ❶''۔ کیا بات کہی ہے!! اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیۡرٌ (35:11) جو بات ہمارے قانون کے مطابق ہوتی ہے، اس میں ہمیں کوئی مشکل ہی پیش نہیں آتی۔ اب یہاں اِلَّا فِیۡ کِتٰبٍ ہے ہمارے ہاں اجل ایک لفظ ہے یہ بڑی ڈروانی چیز ہے۔ اس کے معنی موت کے کیے ہوتے ہیں۔ اجل کے معنی عربی زبان میں موت کے نہیں ہیں، قرآنِ کریم میں بھی، جن معنوں میں یہ لفظ آیا ہے، وہ اور پنجنل (اصلی) معنوں میں آیا ہے۔ اجل کے معنی ہوتے ہیں: ''دو ہاتھوں کے درمیان میں جو وقفہ ہوتا ہے''، اس کو اجل کہتے ہیں، وہ دو پوائنٹس کے درمیان کا جو وقفہ ہو وہ جو پیدائش اور موت کے درمیان کا وقفہ ہے، اسے آپ عمر کہتے ہیں، اُسے ہی اجل کہا جاتا ہے، وہ ''وقفے'' کا نام ہے موت کا نام نہیں ہے، موت تو جب آجاتی ہے تو اس کا سوال ہی نہیں ہے کہ پھر وہ ٹل جائے۔ جب وہ موت آ ہی گئی یعنی مر ہی گیا تو پھر وہ ٹل کیسے جائے گی۔ وہ جو موت کو ٹالنا ہے، وہ موت نہیں ہوتی جو ٹلتی ہے۔ موت تو ٹل ہی نہیں سکتی، مر گیا وہ تو گیا، وہ ابھی مرا نہیں ہوتا جس کو ہم کہتے ہیں کہ اس کی عمر اور بڑھا دی جائے، تو وہ جو درمیان کا وقفہ ہے یہ اس کا سوال ہے، موت کا سوال نہیں ہے۔ موت تو اس حادثے کا نام ہے جب انسان میں یہ زندگی نہیں رہتی۔ قرآن نے اسی لیے اسے کتاب کے ساتھ کہا۔ کیا باتیں ہیں، قرآن کی عزیزانِ من!! کہا کہ وَ مَا کَانَ لِنَفۡسٍ اَنۡ تَمُوۡتَ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰہِ کِتٰبًا مُّؤَجَّلًا (3:145)۔

اجل، موت اور زندگی کے درمیانی وقفے کا نام ہے: اجل کا قرآنی مفہوم

میں پچاس اور دس کہہ کر مثال دے رہا ہوں مبادا ڈاکٹر صاحب❷ کہیں کہ ہمارے معاملے میں دخل دیدیا۔ یعنی یہ ہے وہ چیز، جو اس نے تقدیر کہا ہے، پیمانہ کہا ہے، Measure (پیمانہ) کہا ہے۔ یہ Measures (پیمانے) ہیں جو ہم نے مقرر کیے ہوئے ہیں اور یہ تمہارے اختیار میں ہے کہ جونسا Measure (پیمانہ) تم چاہو، اٹھا کر اسے اختیار کرلو۔ اذن کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ یہ اس کے مطابق

---

❶ تو ہم مصیبت میں پھنس جاتے۔

❷ یہ ڈاکٹر سید عبدالودود مرحوم (1908-2001ء) کی طرف اشارہ ہے۔

ہوتا ہے۔ اُس کے بعد کہا ہے کہ کِتٰبًا مُّؤَجَّلًا (3:145)۔ اب انہوں نے اجل کے معنی موت لیے' کتاب کے معنی قسمت کا لکھا ہوا لیا' ترجمہ ہو گیا کہ ''خدا کے حکم کے سوا کوئی مر نہیں سکتا اور اس کی اجل تو اس نے لکھی ہوئی ہے۔'' اجل کے معنی موت لیا اور موت لکھی ہوئی ہے' چلو جی! معاملہ ختم ہوا۔ کہا کہ موت تو اس کے قانون کے مطابق ہوتی ہے۔ یہ جو پیدا ہونے اور آخری سانس لینے کے درمیان کا وقفہ ہے' مدت ہے' اس کی معیاد ہے' یہ ساری قانون کے مطابق تم خود اس کو متعین کرتے ہو۔ جیسا میں نے کہا ہے زندگی کو بڑھانے کا عمل تو بڑا غیر محسوس ہوتا ہے اچھی غذا' عمدہ صحت کے اصول' ورزش' یہ سب چیزیں جتنی بھی ایسی ہوتی ہیں' ان کو ساتھ رکھیے تو جسے طبعی عمر کہتے ہیں وہ بڑھ جاتی ہے اور جب جی چاہے پانی میں چھلانگ لگا دیجیے' اُسی وقت موت ہو جاتی ہے۔ مُؤَجَّلًا دراصل اجل سے ہے اور اجل اس درمیان کے وقفے کا نام ہے' وہ اس کی رو سے قانون متعین کرتا ہے تو ٹھیک ہے صحت مند لوگوں کی عمریں دیکھی ہیں کتنی کتنی ہیں! جس کی عمر بڑھتی ہے تو اس کے لیے پھر تحقیق کرنے کے لیے پہنچتے ہیں کہ تمہاری لمبی عمر کا راز کیا ہے۔ وہ یہ سن کر نہیں آتے کہ صاحب! خدا نے کتاب میں یہ لکھا تھا کہ میں اس وقت تک زندہ رہونگا۔ وہ محقق اُس سے پوچھتے ہیں' پھر دنیا کو بتاتے ہیں کہ لمبی عمر کا راز یہ ہے۔ یہ ہے کِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ۔ یہ ایک دوسری جگہ اور بھی واضح ہے کہ عمل اور اس کے نتیجے کے برآمد ہونے کا درمیانی وقفہ' بیج بونے اور کھیتی پکنے کا درمیانی وقفہ' یہ ساری اجل کہلاتی ہیں اور اس کے لیے اُس نے یہ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ کہا ہے۔

خدا تعالیٰ نے ہر چیز کی اجل کے لیے قانون مقرر کر رکھا ہے

کہا ہے کہ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ (13:38) عمل اور اس کے نتیجے کے مرتب ہونے کے درمیان کا جو وقفہ ہے' اس کے لیے قانون مقرر ہے۔ یہ ہے چیز۔ گیہوں بویئے' تو وہ جو اس کے ہاں قانون تھا کہ اسے چھ مہینے لگ جاتے تھے' اُس سے پہلے یہ مکئی کی ایک فصل لے لیتے تھے' اس لیے کہ جو درمیان کی اجل ہے' وہ ایک قانون ہے۔ اسی طرح سے قوموں کے متعلق بھی قرآن نے کہا ہے کہ وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ (7:34) قوم اس طرح سے جیسے فرد مرتا ہے' مردہ نہیں ہو جاتی۔ قرآن نے کہا ہے کہ ایک قوم میں جب زندہ رہنے کی صلاحیت نہیں رہتی تو وہ مردہ ہو جاتی ہے۔ زندہ رہنے سے مراد یہ سانس لینے کے معنی نہیں ہیں' اس کے معنی یہ ہیں کہ اُس میں قوت نہیں رہتی' اس کے نظام میں استحکام نہیں رہتا' وہ قوم نامساعد حالات کا مقابلہ نہیں کر سکتی' اس کے اوپر آہستہ آہستہ زوال آ جاتا ہے' اس کا انحطاط ہو جاتا ہے۔ سانس لینے والے افراد تو وہ ہوتے ہیں مگر قوم کے اعتبار سے' وہ مردہ قوم ہوتی ہے۔ یہ ہے قوم کی اجل: لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ (7:34)۔ ان کا عروج کا زمانہ کتنا رہے گا یہ قانون کے مطابق طے ہوتا ہے۔ تمہارا جی چاہے اس کو گھٹا دو' تمہارا جی چاہے اس کو بڑھا لو' جتنی زیادہ اس قانون کی مطابقت کرتے جاؤ گے یہ بڑھتا جائے گا' اُس کی خلاف ورزی کرنی شروع کر دو گے یہ گھٹ جائے گا۔

کیا موت کا کوئی دن متعین ہے؟

میں کہہ یہ رہا تھا کہ یہ جو ہمارے ذہنوں کے اندر' لاشعوری طور پہ ہی سہی' بیٹھا ہوا ہے کہ موت کا ایک دن معین ہے' یہ اپنے وقت پہ آ کر رہتی ہے' ٹل نہیں سکتی' نہ گھٹ سکتی ہے' نہ بڑھ سکتی ہے' اس کے لیے کوئی چارہ ہی نہیں یہ بالکل غلط اور باطل تصور ہے' قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے۔ اس کے لیے اُس نے طبعی قوانین مقرر کیے ہوئے ہیں۔ ان کے مطابق چلنے سے فرد بھی' اجتماعی طور پہ اقوام بھی' زندہ رہتی ہیں' عروج پہ پہنچتی ہیں' استحکام ہوتا ہے۔ انسان کی زندگی میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس کی خلاف ورزی کرنے سے انحطاط ہو جاتا ہے' زوال ہو جاتا ہے۔ کہا ہے کہ یہ جو کائنات کے اندر ہمارے قوانین چلتے ہیں' ان کو دیکھیے' وہ کس طرح سے خود بخود عمل کرتے ہیں کیونکہ انہیں اختیار اور ارادہ نہیں دیا' تم ہو کہ حق اور باطل کے اندر' ان دونوں کے اندر' تم اختلاط کر دیتے ہو' دونوں کے اندر ملاوٹ کر دیتے ہو۔ سب سے زیادہ نقصان اُسی وقت پہنچتا ہے جب ان دونوں میں ملاوٹ پیدا کر لی جائے۔

کائناتی نظام میں کسی قسم کی کوئی ملاوٹ محسوس نہیں ہوتی

جیسا قرآن کہتا ہے کہ خالص کفر بھی ایک شے ہے' ٹھیک ہے خالص اسلام بھی ایک چیز ہے' درمیان میں یہ جو منافقت آ جاتی ہے یہ تباہ کن چیز ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہماری کائنات کا سلسلہ نظم و نسق اس حسن و خوبی سے اس لیے چلتے رہتے ہیں۔ کہا کہ ذرا زمین کے اندر دیکھو تو سہی **وَ مَا یَسۡتَوِی الۡبَحۡرٰنِ ھٰذَا عَذۡبٌ فُرَاتٌ سَآئِغٌ شَرَابُہٗ وَ ھٰذَا مِلۡحٌ اُجَاجٌ** (35:12) اس سے پہلے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ ایک نہایت نمکین کڑوے پانی کا بہنے والا دریا ہے اور ایک بالکل میٹھا بہنے والا دریا ہے۔ یہ دونوں اپنی اپنی جگہ پہ بہتے چلے جاتے ہیں' وہ ایک دوسرے کے اندر ملتے نہیں ہیں' ان میں امتزاج نہیں ہوتا۔ اب یہ بات سمجھ میں آ رہی ہے کہ زمین کے نیچے پانی کی لہریں جاری ہوتی ہیں۔ یہ جو آپ کنویں کھودتے ہیں تو پانی کی ایک لہر کو آپ اوپر لے آتے ہیں' چشمے بھی اسی طرح سے نکلتے ہیں' یہ لہریں بالکل دریاؤں کی طرح نیچے بہہ رہی ہوتی ہے اور اس میں صورت یہ ہے کہ آپ یہاں سے کنواں کھودیئے کڑوا پانی نکلتا ہے' ذرا ہٹ کر دوسری جگہ سے کنواں کھودیئے نہایت عمدہ میٹھا پانی نکلتا ہے۔ زمینوں کے متعلق یہ طے ہے کہ یہاں سے نہ کھودیئے گا' یہاں پانی کھاری ہوتا ہے' کڑوا ہوتا ہے' وہاں کا کنواں دیکھیے بڑا ہی شیریں اور بڑا میٹھا پانی ہوتا ہے۔ کہتا ہے کہ ذرا دیکھیے تو سہی' نیچے اتر کر دیکھیے' کس طرح سے یہ دونوں دریا بہہ رہے ہوتے ہیں لیکن ان میں یہ کبھی نہیں ہوتا کہ ایک اپنی حدود سے تجاوز کر کے دوسرے سے جا ملے' اُس کے حقوق کی پامالی کر کے' اپنی حد سے تجاوز کر جائے! وہ کبھی تجاوز نہیں کرتا' میٹھے والا میٹھا رہتا ہے' کڑوے والا کڑوا رہتا ہے۔ یہ ہمارا قانون ہے۔ اس کے مطابق تم بھی چلو گے تو یہ جسے تم زندگی اور موت کہتے ہو' اس میں حدِ فاصل قائم ہو جائے گی' یاد رکھو! یہ دونوں کبھی نہیں ملتے۔

وَ مِنۡ کُلٍّ تَاۡکُلُوۡنَ لَحۡمًا طَرِیًّا وَّ تَسۡتَخۡرِجُوۡنَ حِلۡیَۃً تَلۡبَسُوۡنَہَا (35:12)اوران میں سے پھرتم دیکھو کہ اس قسم کی مچھلیوں کی زندگی، تمہارے لیے تازہ گوشت ہے، جس میں بہترین پروٹین ہوتی ہے،اس کے اندر جسم کی نشوونما کے لیے اتنا تازہ گوشت ہوتا ہے اوراس کے بعد کہا کہ پھر وہ موتی بھی نکلتے ہیں،جن سے تم ہار بناتے ہو،زیورات بناتے ہو،سامانِ زیبائش وآرائش بھی اس سے نکلتا ہے۔ اس لیے اُس نے دوسری جگہ کہا ہے کہ کون ہے جو ہمارے سامانِ زیب وآرائش کو حرام قرار دینے والا ہے؟ ہم نے یہ کچھ بنایا ہے۔اُسی میں سے کہتا ہے کہ دیکھ لو یہ لَحۡمًا طَرِیًّا جیتی جاگتی مچھلی ہے۔اُسی میں سے وہ سیپ ہے،سیپ کے اندر سے موتی نکلتا ہے،اپنی اپنی جگہ یہ دونوں پرورش پا رہے ہیں۔آگے کہا کہ وَتَرَی الۡفُلۡکَ فِیۡہِ مَوَاخِرَ لِتَبۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِہٖ وَ لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ (35:12)اور پھر تم سمندر کی طوفان آمیز، تلاطم خیز موجوں کو دیکھو، پہاڑ کی طرح اُٹھتی ہیں اوران کے اندر ایک چھوٹی سی کشتی کو دیکھو، سینۂ بحر کو چیرتی ہوئی بط کی طرح کیسے تیرتی ہوئی چلی جاتی ہے!وہ کہتا ہے کہ بڑے بڑے جہازوں کو دیکھیے،ان کی کیفیت یہ ہے کہ لوہے کی ایک سوئی آپ پانی کے اندر ڈالیے تو وہ نیچے بیٹھتی چلی جاتی ہے،تیر ہی نہیں سکتی،لاکھوں ہزاروں ٹن کا لوہے کا جہاز،اتنا ہی اس کے اندر لدا ہوا وزن،یہ تیرتا ہوا چلا جاتا ہے۔یہ کیسے تیر رہا ہے؟ایک قانون ہے کہ اتنے وزن کا جو پانی (Displaced Water) الگ کرتے ہیں اُس میں وہ چیز تیرتی ہے۔ اسی لیے ان جہازوں کے اوپر ایک لائن لگی ہوئی ہوتی ہے کہ اس کے اندر اتنا وزن لادیئے کہ پانی اس لائن سے نیچے رہے اور اگر اس میں زیادہ لد گیا تو جو روز ہماری کشتیاں ڈوبتی ہیں،وہ قانون کی خلاف ورزی ہوتی ہے،وہ جہاز ڈوب جائے گا۔کہا کہ وہ سوئی قانون کے مطابق ڈوبتی ہے تم تیراتے ہو،جہاز تیرتا ہے،یہ ہمارے قانون کے مطابق تیرتا ہے اگر وہ اس قانون کے مطابق نہیں ہے تو ڈوبتا ہے،جب تم اس کی خلاف ورزی کرتے ہو تو ڈوب جاتے ہو۔

قدرت کے تخلیقی قوانین میں اورانسانی سوچ کے عملی نتائج میں بنیادی فرق ہوتا ہے

آپ دیکھتے ہو کہ قرآن عمر،عمر کی مدت اوراس کے لیے قانون کی کیا کیا مثالیں دیتا چلا جاتا ہے۔کہتا ہے کہ یہ سب کچھ ہمارے قانون کے مطابق چلنے سے ہوتا ہے۔کہا ہے کہ یُوۡلِجُ الَّیۡلَ فِی النَّہَارِ وَ یُوۡلِجُ النَّہَارَ فِی الَّیۡلِ وَ سَخَّرَ الشَّمۡسَ وَ الۡقَمَرَ کُلٌّ یَّجۡرِیۡ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی (35:13)اور پھر دیکھو اتنے اتنے عظیم کرّے ہیں،سورج ہے۔دن اور رات کو دیکھیے کس طرح سے متعین اوقات کے مطابق سورج چڑھتا ہے،غروب ہوتا ہے،موسموں کی تبدیلی ہوتی ہے،ہر ایک کی وہ اپنی اپنی اَجَلٍ مُّسَمًّی ہے۔اس نے کہا ہے کہ ان کے لیے یہ مقصد ہم نے مقرر کیے ہوئے ہیں،یہ اس کے مطابق چلتے ہیں،ان میں کسی قسم کا کوئی نقص واقع نہیں ہوتا،کوئی فساد واقع نہیں ہوتا،یہ اس کے مطابق چلتے چلے جاتے ہیں۔جب تم التباسِ حق وباطل کرو گے،اس کا نتیجہ یہ ہوگا جو تمہارے ہاں ہو رہا ہے۔

یہ تو ہمارے ہاں جو صحت کے قانون ہیں ان کو دیکھیے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ یہ اور یہ دو چیزیں ملا کر نہ کھائیے۔ یہاں تک وہ کیفیت ہے کہ التباسِ حق و باطل ہو جاتا ہے' ان میں یہ کچھ نہیں ہوتا ہے۔ کہا کہ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ (35:13) خارجی کائنات میں' اُس نے تمہارے لیۓ یہ سامانِ نشوونما جمع کر رکھا ہے' اس کو تمہاری پرورش کا ذریعہ بنایا ہے۔ یہاں رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ (35:13) کہا ہے یعنی یہ کہ اس کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں رکھا ہے' تمہارے ہاتھ میں رکھتے تو جس طرح سے ایک فرد اپنے آپ خودکشی کرتا ہے' غلط معاشرہ قوم کی قوم کو تباہ کر دیتا ہے' تمہارے ہاتھ میں اگر کہیں یہ ہوجاتا کہ زمینِ صالح بھی ہو' بیج بھی اچھا ہو' سب کچھ اس کے اندر تم اپنی محنت سے کرو اور اگر کسی کے ہاتھ میں یہ ہوتا کہ وہ گیہوں کے بجائے جو اُگیں تو تم مصیبت میں آجاتے۔ وہ کنٹرول ہم نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ اس لیے رکھا ہے کہ یہ اقتدار کی بات نہیں ہے۔ یہ اقتدار رَبُّكُمْ کے اس مقصد کے لیے ہے' وہ اقتدار ہم تمہیں فاقے مارنے کے لیے استعمال نہیں کرتے۔ ایک اقتدار ہی وہ ہوتا ہے کہ وہ جتنے بھی مقہور ہوتے ہیں' ان کے خون کی رنگینی سے اپنے محلات کی تعمیر کرتا ہے' اپنی نشوونما کرنے کے لیے ان کا خون چوستا ہے۔ ایک یہ بھی ملک ہوتا ہے' اختیار ہوتا ہے۔

حدودِ بشریت کے اندر خدا تعالیٰ کی صفتِ ربوبیت سے انسانوں کی نشوونما کے فریضہ کی اہمیت

ایک اقتدار اور بھی ہوتا ہے۔ وہ ہے رَبُّكُمْ یعنی دوسروں کی نشوونما کے لیے خود بھوکا رہتا ہے اور فاقے اختیار کرتا ہے لیکن ان کی نشوونما کرتا ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ یہی چیز تھی جو خدا نے کہا ہے کہ یاد رکھو! ہم تمہارے رزق کے محتاج نہیں ہیں' ہم کھاتے بھی نہیں ہیں' پیتے بھی نہیں ہیں' ہم تمہاری نشوونما کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ چھوٹے پیمانے پہ اس نے بات ہی یہ کہی ہے کہ ایک صاحبِ اختیار وہ ہے جو دوسروں کی نشوونما کے لیے اٹھتا ہے' وہ سب سے پہلے اپنے آپ پہ یہ کنٹرول کرتا ہے کہ مجھے سب سے بعد میں ملے' سب سے پہلے یہ کھائے۔ یہ ہے رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ (35:13)۔

تیری اور میری کی تفریق میں انسان کی عزتِ نفس اور عقل و فکر کی لاانتہا پستی

عزیزانِ من! قرآن کے ایک ایک لفظ پہ غور کیا کیجیے۔ تاریخِ انسانیت نے یہی بتایا ہے کہ جس کے ہاتھ میں بھی اقتدار آیا ہے اس نے دوسروں کو بھوکا مار دیا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ ایک لَهُ الْمُلْكُ (35:13) ہمارا اقتدار ہے اور رَبُّكُمْ ہے یعنی یہ تمہاری ربوبیت کے لیے ہے۔ خدا کا قانون ساری کائنات میں چل رہا ہے۔ بیج اگنے اور فصل تیار ہونے تک تو ہمارا قانون چل رہا ہوتا ہے۔ وہاں' گندم از گندم بروید۔ جو ز جو' ہے تمہیں ایک ایک دانے کے سات سات سو دانے دیدیتے ہیں' بوریاں بھر جاتی ہیں' کوٹھیاں بھر جاتی ہیں۔ جب یہ بات آئی تو پھر وہی بات ہے کہ یہاں تک پہنچنے کے بعد ہم دست کش ہو جاتے ہیں' اب تمہاری دنیا شروع ہو جاتی ہے اور سارا فساد یہیں ہوتا

ہے پھر جس کے قابو میں جتنا رزق آ جاتا ہے بس وہ سامان کو لوٹ کر اپنے لیے رکھتا ہے' باقیوں کو بھوکا مار دیتا ہے۔ یہ ہے تمہارا نظام' وہ ہے ہمارا نظام۔ اُس نظام میں تو وہ کفر اور اسلام میں بھی تمیز نہیں کرتا۔ محمد دین کے کھیت سے بھی اُسی طرح سے گیہوں اگتا ہے جیسا کہ چرن سنگھ کے کھیت سے اگتا ہے۔ اس کھیت میں سے اگنے کے بعد جب فصلیں آتی ہیں تو پھر وہاں فرق پڑ جاتا ہے۔ وہ جو صاحب اقتدار ہوتا ہے' وہ اس کو ذاتی ملکیت بنا لیتا ہے اور وہ جو خدا کی طرف سے عائد کردہ ربوبیت کا ذمہ دار ہوتا ہے' وہ اس کو امانت سمجھتا ہے' دوسروں کو پہلے دیتا ہے اور اپنے حصہ میں کچھ آ جائے تو لیتا ہے ورنہ فاقے سے سو جاتا ہے۔ کہا کہ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ (35:13) یہ ہے ہمارے ہاں کا اقتدار۔ وَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ (35:13) خدا کے علاوہ اگر تم کسی سے کہو تو یاد رکھو! کوئی ذرا بھر اس چیز کے اوپر' ہمارے کائنات کے قانون کو بدلنے کے لیے اختیار نہیں رکھتا۔ وہ جو ہمارا ملک ہے' ہمارے ہاں کی مملکت ہے' اس کے اندر کسی کا کوئی اقتدار نہیں ہے۔ اس لیے تم جو اس کے قانون کو چھوڑ کر انسانوں کی طرف رجوع ہوتے ہو' ان کے دروازوں کے اوپر جا کر جھولیاں پھیلاتے ہو' اس سے تذلیلِ شرفِ انسانیت بھی ہوتی ہے' بھوک سے بھی مرتے ہو۔ اس لیے وجہ یہ ہے کہ تم نے خدا کا وہ قانون جو خارجی کائنات میں رائج تھا' تم نے اپنی دنیا میں اُس سے سرکشی برت لی۔ اگر وہاں وہ چرن سنگھ اور محمد دین میں تمیز نہیں کرتا' تم پھر اپنے ہاں رزق کی تقسیم میں یہ کس طرح سے تفریق کرتے ہو کہ یہ میرا ہے' اسے اتنا ملے' یہ دوسرا ہے' اسے نہ ملے۔

جو قوم اپنی زندگی مُردوں کے سپرد کر دے تو پھر وہ خود بھی مُردہ ہو جاتی ہے

کہا یہ کہ تمہاری جہالت کی یہ کیفیت ہے کہ تم زندہ انسانوں کے سامنے ہی جھولیاں پھیلا کر نہیں مانگتے' تم مردہ انسانوں کے ہاں جا کر بھی مانگتے ہو۔ زندہ انسان مردہ انسان سے اپنے لیے کچھ مانگ رہا ہے۔ کہا کہ اس سے زیادہ تذلیلِ انسانیت ہو نہیں سکتی کہ زندہ انسان مردہ انسان سے مانگ رہا ہے۔ 'مردہ بدست زندہ' ہم روز کہتے ہیں۔ وہ حضرت صاحب بھی فوت ہو جاتے ہیں تو وہ ہمارے ہاتھ میں ہوتے ہیں' جی چاہے تو ان کے اوپر ابلتا ہوا پانی ڈال کر غسل دیں' جی چاہے تو برف پہ لٹا دیں' وہ کچھ کر ہی نہیں سکتے'' اولت وی مار کے ساہنوں پچھاں نہیں کر سکدے ہیگے ❶'' ان کی یہ کیفیت ہے۔ انہیں کس قبر میں ڈالتے ہیں' کس قسم کا کپڑا ان کے اوپر ڈالتے ہیں' انہیں اس پر کچھ بھی اختیار نہیں ہوتا۔ جونہی ہم نے ان کو دس ہزار من مٹی کے نیچے دبایا' ان کو سارے اختیارات حاصل ہو جاتے ہیں اور ہم بے اختیار ان حضرت صاحب کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ وہی ہیں جو ابھی ابھی تمہارے ہاتھ میں تھے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سیلاب سے ان کی قبر کی مٹی اُدھر ہوتی ہے تو پھر اسے کھود کر ان حضرت صاحب کی ہڈیاں اٹھا اٹھا کر' جہاں جی چاہے دبا دیتے ہیں' دبانے

---

❶ وہ ٹانگ مار کر بھی ہمیں پیچھے نہیں ہٹا سکتے۔

کے بعد پھر وہ حضرت صاحب ہو جاتے ہیں۔ یاللعجب!! گویا اتنی تذلیلِ انسانیت' سوچ تو سہی کہ تُو کیا کر رہا ہے' یہ ہے تمہاری کیفیت۔

قرآن کہتا ہے کہ اِنۡ تَدۡعُوۡهُمۡ لَا يَسۡمَعُوۡا دُعَآءَكُمۡ (35:14) تم ان سے یہ چیزیں مانگ رہے ہو' ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ تمہاری بات سن ہی نہیں سکتے۔ وَ لَوۡ سَمِعُوۡا مَا اسۡتَجَابُوۡا لَكُمۡ (35:14) بفرضِ محال اگر وہ سن بھی لیں تو جواب ہی نہیں دے سکتے۔ ان کی کیفیت اس قدر ہے۔ اور ان مردوں کی کیفیت ہی یہ نہیں ہے جو ہم مٹی کے نیچے دبا دیتے ہیں' ذرا انہیں بھی دیکھیے جنہیں ہم دنیا کے اندر اتنے اختیارات' اقتدارات اور قوتوں کا مالک سمجھتے ہیں۔ ذرا ان سے منصب چھین لیجیے' وہ جیتے ہوئے بھی مردوں سے زیادہ بے بس ہو جاتے ہیں' جا کر ہوٹلوں میں بہرہ گیری کرتے ہیں۔ ان کا قوت اور اقتدار کسی کا دیا ہوا نہیں ہے' کسی سے چھینا ہوا نہیں ہے' ان سے کیوں مانگتے ہو؟ وَ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يَكۡفُرُوۡنَ بِشِرۡكِكُمۡ (35:14) اور جب ان سے یہ پوچھا جائے گا کہ کیا تم نے ان کو یہ سبق پڑھایا تھا کہ خدا کے قوانین کے مطابق نہ چلو' مردوں سے مانگا کرو۔ وہ وہاں کہیں گے کہ صاحب! ہم نے تو ان سے یہ نہیں کہا تھا۔ بہرحال' بہت سعادت مند ہونگے وہ بزرگ' جو کم از کم وہاں یہ کہہ دینگے کہ ہم نے نہیں کہا تھا۔ یہاں کی زندگی میں تو ہم نے کوئی ایسے دیکھے نہیں جو کسی سے یہ نہ کہیں کہ ہماری خانقاہ پہ نہ آیا کرو' ہمارے مرشد کی قبر پہ نہ جایا کرو' سب دیکھتے ہیں سب کرا رہے ہوتے ہیں' کوئی منع نہیں کرتا۔ بہرحال وہ خدا کے بندے جو واقعی یہ چیز نہیں کہتے ہیں' کہا کہ وہ وہاں ان سے انکار کر دیں گے کہ ہم نے ایسا نہیں کہا تھا۔

حضرت صاحب کی کرامت

عزیزانِ من! رسول سے کہا جاتا ہے کہ وَ لَا يُنَبِّئُكَ مِثۡلُ خَبِيۡرٍ (35:14) یہ باتیں کہ یہ مردے سن نہیں سکتے' جواب نہیں دے سکتے' یہ تمہیں خدا کے سوا کوئی بتا ہی نہیں سکتا تھا۔ ان کی عقیدت مندی تو روز بتائے گی کہ نہیں صاحب! حضرت صاحب سے بات کی' اُنہوں نے آواز دی' ہم نے خود سنی ہے' یوں نہیں آئے تو رات کو خواب میں ہی آ گئے تھے اور پھر ان کی جو کرامات ہیں تو صاحب پوچھیے نہیں کہ یہ یہاں بیٹھے ہوئے تھے' تھوڑے وقت کے اندر تھوڑے سے غائب ہو گئے' پھر واپس آئے تو کپڑے جھاڑ رہے تھے' ایسے ایسے پوچھا کہ کیا ہوا؟ حضرت صاحب کہنے لگے کہ نہیں نہیں' کچھ نہیں۔ اُدھر کہیں پانچ سات دنوں کے بعد کوئی ان کے مریدوں کا قافلہ آیا ہے' انہوں نے کہا کہ صاحب! فلاں دن حضرت صاحب کچھ غائب ہو گئے تھے' کپڑے جھاڑ رہے تھے' کہنے لگے: اچھا! فلاں جگہ قافلہ چلا آ رہا تھا'' تے اودے اچ ساڈا گڈا پھنس گیا[1]'' یہ جو گڈا ہمارا تھا' یہ کہیں دلدل میں پھنس گیا' ہم نے بہت زور لگایا' یہ نکلا نہیں تو ہم میں سے ایک

---

[1] کہ وہاں اچانک ہمارا گڈا (بیل گاڑی) پھنس گیا۔

نے کہا کہ حضرت صاحب کو بلایئے تو ہم نے کہا کہ یا حضرت المدد المدد! ہم نے مدد کے لیے پکارا' وہاں حضرت صاحب آئے ''گڈے نوں موہڈا دتا ایناں نیں' تے گڈا باہر لنگ گیا۔ او جیہڑا کپڑا اجھاڑ دے سن او مٹی لگی ہوئی ہیگی اے گڈے دی [1] ''۔ چوں نہ دیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند [2]' افسانے بناتے ہیں پھر اس طرح سے ساری قوم ان افسانوں کے اندر دوبی ہوئی ہوتی ہے اور جتنا قوم کو ان افسانوں میں پختہ کر دیا جائے اتنا ہی ان کا کاروبار زیادہ چمکتا ہے صاحب! ان کے آستانوں پہ جا کر دیکھیے' ان کی قبروں کے اوپر سونے اور چاندی کے دروازے لگتے ہیں اور غریب کو جھونپڑی نہیں ملتی جس میں اپنے بچے کو سلا سکے۔ یہ تقسیم کا نقص ہے' اس کے دیئے ہوئے کا نقص نہیں ہے۔ جب انسان اقتدار سنبھال لیتا ہے' خواہ وہ عقیدت مندوں کا ہو یا محکومیت کا ہو' وہاں تقسیم کی یہ کیفیت ہوتی ہے۔ **یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰہِ وَاللّٰہُ ھُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ** (35:15) اے نوعِ انسانی! تم اپنی نشوونما کے لیے' ہر ضرورت کے لیے' فقرآء ہو' فقیر ہو۔ **فُقَرَآءُ** کے لفظ پر غور کیجیے' عزیزانِ من! یہ لفظ دوبارہ آیا ہے۔ دنیا میں ایک دوسرے کے تعاون کی ضرورت ہے۔ احتیاج تو ہر ایک کو ہے' ٹھیک ہے ترکھان ہے' بیمار ہوتا ہے اس کو احتیاج ڈاکٹر کی مدد کی ہے لیکن اس ڈاکٹر کو اپنی دکان کا کواڑ بنانا ہوتا ہے تو اس کو اس ترکھان کی احتیاج ہوتی ہے۔ یہ تعاون کہلاتا ہے لیکن اگر تعاون نہیں ہے بلکہ وہ اپنی احتیاج کے لیے کسی دوسرے انسان کے سامنے جھولی پھیلاتا ہے اور وہ دوسرا انسان سمجھتا ہے کہ مجھے اس کی کیا پرواہ ہے۔ یہ ہے حقیقت میں وہ جو ملک اختیار اس کو حاصل ہے' وہ اس کا ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے۔

لفظ فقرآء کا قرآنی مفہوم اور نظامِ ربوبیت کی خصوصیت

کہا کہ یہ جو کیفیت ہے کہ جو خدا نے تمہیں نشوونما کے لیے دیا ہے تو **اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰہِ** (35:15) تمہاری یہ محتاجی کسی انسان کے سامنے نہیں ہے' ہمارے سامنے ہے اور ہم دیتے ہیں تو پھر کسی کو ذلیل نہیں کرتے۔ **فُقَرَاء** فقیر کی جمع۔ ہمارے ہاں تو پھر یہ فقیر بس فقر و فاقہ ہی ہے' یہ سب کچھ ہے۔ یہاں عربوں کے ہاں نشوونما کے لیے عام پانی کی تو کمی ہوتی تھی' یہ جو ہم درخت یا پیڑ اُگاتے ہیں تو ان کے نیچے تھوڑا سا ہی سہی' ایک گول سا گڑھا کھود دیتے ہیں' اس میں پانی بھر جاتا ہے تو وہ زیادہ وقت کے لیے رہتا ہے' اور زیادہ وقت کے لیے نیچے چلا جاتا ہے ورنہ پانی تو آتا ہے اور بہہ کر آگے چلا جاتا ہے' تو جن درختوں کو سیرابی کی ضرورت ہوتی ہے ان کے ارد گرد اتنا سا کھالا سا بنا دیتے ہیں' گڑھا سا بنا دیتے ہیں' اس کو فقر کہتے ہیں کہ بہتے ہوئے پانی کے لیے تو وہ تھوڑا سا حاصل ہوتا ہے اور اس میں پوری

---

[1] انہوں نے گڈے کو کندھا دیا' تو گڈا باہر نکل آیا۔ وہ جو کپڑا اجھاڑ رہے تھے وہ اسی گڈے کو کندھا دینے کی وجہ سے مٹی لگی ہوئی تھی۔

[2] یہ ذہنِ انسانی کی افسانہ تراشی ہے۔

نشو ونما نہیں ہوتی' اتنا سا اس درخت کے لیے کہ جو زیادہ وقت کے لیے بھی اس کی نشو ونما کرے' باقی جگہ اگر نہ بھی بارش ہو یا پانی نہ ہوتو اس کے کھالے میں وہ پانی رہے۔ کہا کہ ہم دیتے ہیں تو اس طرح دیتے ہیں کہ بہتی ہوئی ندیاں بھی دیتے ہیں اور اس کے بعد تمہارے کھالے جو ہیں ان میں بھی پانی بھر دیتے ہیں لیکن اس کے لیے **اِلَی اللّٰہِ** ہے' یعنی نظام خداوندی ہے۔ کہا ہے کہ اس کے تابع یہ کرو' تم اپنے لیے بند باندھ کر پانی نہ روک لو' اتنے سے پانی کے لیے کھالے کی قسم کی جو چیز ہو' وہ بناؤ: **اَلْفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰہِ** (35:15) اور اس کے بدلے میں' معاوضے میں **وَاللّٰہُ ھُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ** (35:15) ہمیں کوئی احتیاج نہیں ہے۔ یعنی یہاں تعاون کی بات نہیں ہے کہ ہم تمہارے لیے یہ کچھ کرتے ہیں' تم ہمارے لیے یہ کچھ کرو۔ وہ تعاون تو اسی قسم کا ہوتا ہے کہ "میں تیرے دانے دیاں' توں میرا منڈا اکھڈا❶"۔ یہ "تعاون" ہوتا ہے "توں میرا کچھ کم کر' میں تیرا کم کرنی آں"۔ یہاں تو "تعاون" اس طرح سے ہوتا ہے کہ "اوایناں دے دانے دیندے ترے جاندے نیں' ایہ اوہناں دے منڈے کھڈاندے ترے جاندے نیں❷"۔ کیا ہو رہا ہے؟ جی' تعاون ہو رہا ہے۔ تعاون دینے والا تو کہتا ہے کہ **ھُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ** (35:15) اس کو استغنیٰ ہے' وہ تمہارا محتاج نہیں ہے' اور اس کو اس کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ دیا ہے تو تم اس کی تعریف کرو۔ اس کی ذات ایسی ہے کہ وہ حمد وستائش کا پیکر ہے محتاج نہیں' تمہاری ستائش کا بھی محتاج نہیں' وہ **غَنِیٌّ الْحَمِیْدُ** ہے۔

عزیزانِ من! انسانیت' یہ نوعِ انسانی ہزاروں' لاکھوں' کروڑوں سال سے چلی آ رہی ہے اور تسلسل کے ساتھ چلی آتی ہے۔ اس خارجی کائنات میں اس کے خلاف اتنے عناصر کام کر رہے ہیں۔ آپ کسی ڈاکٹر سے پوچھیے۔ وہ آپ کو پانی کا گلاس پینے نہ دے۔ اگر وہ مائیکروسکوپ یوں لگا دے تو آپ کو گلاس کیڑوں کا بھرا ہوا نظر آئے' اب ایک سانس میں جتنے ہلاکت انگیز جرثومے اندر لے جاتے ہیں اس کے باوجود نوعِ انسانی کی کیفیت یہ ہے کہ وہ کارواں در کارواں اس طرح چلے آ رہی ہے۔ کہا کہ یہ ہماری ربوبیت ہے کہ اس کے باوجود تم اس طرح چلے آ رہے ہو' یہ نہ سمجھ لو کہ تم بڑے پھنے خاں بنے ہوئے ہو' اپنے زورِ بازو کے اوپر یہ کر رہے ہو' یہ ہمارا انتظام تھا ورنہ **اِنْ یَّشَاْ یُذْهِبْکُمْ وَ یَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِیْدٍ** (35:16) ہمارے اقتدار کی تو کیفیت یہ ہے کہ اگر ہماری مشیت میں ہو تو ایک فرد نہیں' ایک قوم نہیں' پوری نوعِ انسانی کی بجائے' اس کی جگہ ایک دوسری مخلوق لے آئیں۔

---

❶ میں تمہیں دانے دیتی ہوں تم میرے بیٹے کا دل بہلاؤ' اسے کھیل کراؤ۔

❷ وہ انہیں دانے دیئے چلے جاتے ہیں' اور یہ ان کے بچے بہلاتے' کھلاتے چلے جاتے ہیں۔

نوعِ انسانی کی جگہ ایک دوسری مخلوق بھی لائی جا سکتی ہے

جیسا کہ قرآن نے کہا ہے کہ ہم تمہیں اس سے پہلے جو مخلوق تھی' اس کی جگہ لے کر آئے تھے۔ یہ تھی وہ مخلوق جن کو جن کہا جاتا ہے جو اب تمہاری نگاہوں سے اوجھل ہو چکے ہیں۔ وہ اس سے پہلے مخلوق تھی۔ پوچھیے Anthropologists (ماہرینِ علم البشریات) سے' وہ بتاتے ہیں کہ اس سے پہلے' یعنی انسانوں سے پہلے کس قسم کی مخلوق تھی۔ وہ تو درمیان میں جو Links (کڑیاں) چمپینز اور انسان میں ہیں ان کی تلاش میں لگے ہوئے ہیں۔ بہرحال پہلے ایک مخلوق تھی۔ قرآن کہتا ہے کہ اس کی جگہ تمہیں لائے ہیں تو ہمارے لیے یہ بھی مشکل نہیں ہے کہ پوری کی پوری نوعِ انسانی کو یہاں سے ملیا میٹ کر دیں اور تمہاری جگہ کوئی دوسری قوم لے آئیں' ہم تو یہ تک کرتے ہیں لیکن یہ کر سکنے کے باوجود ہم تمہاری ربوبیت کرتے چلے جا رہے ہیں' تم سرکشی اختیار کرتے ہو' گالیاں تک بھی دیتے ہو۔ کوئی بات نہیں مانتے' ہمیں ذرا غصہ نہیں آتا' یہ خدا کی عطا کردہ ماں کی محبت ہے کہ وہ بچے کو کوستی بھی چلی جاتی ہے' بعض اوقات تھپڑ بھی لگاتی چلی جاتی ہے اور پھر دودھ کا سرچشمہ بھی اس کے منہ میں دیتی چلی جاتی ہے۔ ''پیناں اے کہ نئیں پیناں [1]'' اس کی ڈانٹ بھی اس قسم کی ہے۔ کہا ہے کہ وَ مَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیۡزٍ (35:17) پھر یہ بات ہے کہ ہمارے لیے یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے' ہم بڑی آسانی سے یہ کچھ کر سکتے ہیں۔

قرآنی نظام کی بنیاد یہ ہے کہ اس میں کوئی اپنا بوجھ دوسرے پر نہیں لاد سکے گا

یہ یاد رکھو کہ دوسرے کو دینے کا جو ہمارا قانون ہے جسے آپ اقتدار کہتے ہیں' وہ یہ ہے کہ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰی (35:18) کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا' اپنا اپنا بوجھ اٹھانا پڑے گا۔ اور یہاں جو انسانوں کا سارا نظامِ باطل ہے' وہ یہ ہے کہ خود یہ کوئی بوجھ نہ اٹھائیں' سارا بوجھ دوسرے کے اوپر لاد دیں۔ وہ چیخ رہا ہے' وہ چلا رہا ہے مگر وہ ہیں کہ دوسرے پہ لادتے چلے جا رہے ہیں۔ جب پوچھا جائے کہ یہ تو چیخ رہا ہے' چلا رہا ہے کہ بابا! خدا کے لیے بس کرو' مرا بوجھ کچھ کم کرو' میرے ذمے جو کچھ لگا رہے ہو' میں تو اتنا بوجھ نہیں سہار سکتا۔ کہنے لگے ''او کچھ نئیں ایناں دی گل نئیں سنی دی۔ اونٹ اڑیندا ای لدیندا ہوندا اے [2]'' اونٹ کی کیفیت یہ ہے کہ لادتے جاؤ' اس نے دہائی مچائی ہوتی ہے۔ کبھی اونٹ کو دیکھیے۔ جب اس پہ بوجھ لادتے ہیں تو ''دہائی پائی ہوندی اے اوس نے [3]'' لیکن وہ اونٹ والا اس کی دہائی کو کچھ نہیں سنتا۔ آہستہ آہستہ یہ لادنے والے بھی سمجھ جاتے ہیں کہ ''ایناں دی تے عادت جئی ہیگی اے۔ ایناں دی نئیں سنی دی [4]''۔ کہا ہے کہ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰی (35:18) ہمارے قانونِ مکافات میں یہ صورت

---

1. اسے پیتے ہو یا نہیں (تو دوں تھپڑ!)۔
2. ارے بھئی! کچھ نہیں۔ ان کی بات نہیں سنتے۔ اونٹ کے دہائی مچاتے ہوئے ہی اس پہ بوجھ لادا جاتا ہے۔
3. اس نے دہائی مچائی ہوئی ہوتی ہے۔
4. ان کی تو عادت ہی یہی ہوتی ہے۔ ان کی نہیں سنتے۔

ہے کہ کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

انسان کا ہر عمل صرف اس کی اپنی ذات پر ہی اثر انداز ہوگا

یادرکھو کہ وَ اِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَّ لَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى (35:18) ہمارے ہاں، ہمارے قانونِ مکافاتِ عمل میں، خود بوجھ اٹھانے والا کتنا ہی چاہے کہ کوئی دوسرا اس کا بوجھ، اس کی جو ذمہ داریاں اس پہ عائد کی گئی ہیں، وہ اس کے ذمے لگا دے، خود نہ کرے، وہ یہ نہیں کر سکے گا، ہمارے نظام کے اندر بالکل نہیں کر سکے گا، خواہ کتنا ہی قریبی کیوں نہ ہو، وہ بھی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکے۔ جو اپنی صحت خراب کرتا ہے، اسی کی صحت خراب ہوتی ہے، دوسرا اس کے لیے ہمدردی کے الفاظ تو کہہ سکتا ہے، کوئی دوائی وغیرہ کر سکتا ہے مگر جو درد اس کو ہو رہا ہوتا ہے، وہ درد نہیں بانٹ سکتا۔ اور جو صبح کی سیر کرتا ہے، ورزش کرتا ہے، احتیاط کرتا ہے، اس کی جو صحت بنتی ہے، کتنا ہی پیارا بھائی اور بیٹا کیوں نہ ہو، وہ اپنی اس صحت کو اس کی طرف منتقل نہیں کر سکتا۔ اسی کو تو Individuality (انفرادیت) کہتے ہیں۔ ہر فرد کے ہر عمل کا اثر اس کی اپنی ذات پہ ہوتا ہے، کسی دوسرے پہ نہیں ہوتا۔

عالمِ غیب کی حقیقت اور اس کا مفہوم

کہتا ہے کہ اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ (35:18) یہ جو بات ہے، یہ فوراً ہی پتہ نہیں چل جاتی کہ صحت خراب ہو رہی ہے یا بن رہی ہے۔ غیب کے معنی یہی نہیں ہوتے کہ وہ عالمِ غیب کی بات ہے، آپ کو نظر نہیں آتی ہے۔ ہر وہ چیز، ہر وہ نظام، ہر وہ پروگرام، جس کا ابھی فوراً نتیجہ سامنے نہیں آتا، وہ غیب کا نتیجہ کہلاتا ہے۔ کہتا ہے کہ اس نظام کے اندر اگر کوئی مریض اپنی صحت درست کرنا چاہے تو یہ چیز بڑی آہستہ آہستہ ہوتی ہے، کھیتی کرنا چاہو تو آج بیج بوتے ہو، چھ مہینے کے بعد فصل آتی ہے۔ اب وہ جو کہا گیا تھا عالمِ غیب میں ہے کہ اس میں سے سات سات سو بالیں نکلیں گے، چھ مہینے کے بعد وہ عالمِ شہادت ہو جاتا ہے یعنی وہ چیز سامنے آ جاتی ہے۔ میں اَقَامُوا الصَّلٰوةَ کو یہاں چھوڑ رہا ہوں کہ صلوٰۃ کے متعلق متعدد بار اس درس میں آ چکا ہے، آتا بھی جائے گا۔ آگے کہا کہ وَ مَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ (35:18) جو اپنی ذات کی نشوونما چاہتا ہے، وہ جو کچھ کرے گا اس کی اپنی ذات کی نشوونما ہوگی۔ یہ جو بوجھ تم کہتے ہو کہ دوسرا اٹھالے گا، نہیں اٹھا سکے گا۔ اتنی پوری فوج تیار کر دو، جو صبح پی ٹی کرنے والی، اچھا کھانے والی، بالکل تنومند توانا ہو اور اگر یہ چاہو کہ وہ اپنی صحت کو تمہاری طرف منتقل کر دے، خواہ تم کمانڈر انچیف بھی کیوں نہ ہو، وہ نہیں ہو سکے گا۔ یہاں کہا ہے کہ وَ مَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ (35:18) جو بھی اپنی نشوونما کرتا ہے، وہ اپنی ہی ذات کے لیے کرتا ہے۔ یادرکھو! تم اس کی چیزیں چھین سکتے ہو لیکن اس کی نشوونما یافتہ ذات لے نہیں سکتے۔ یہ بڑا فرق ہے۔

اپنی ''میں'' کو دوسروں کے حوالے کرنے والا شخص حیوان کی سطح پر آ پہنچتا ہے

عزیزانِ من! بات کہیں دور چلی جائے گی۔ میری چیز اور میرا جو کچھ ہے اُسے تو کوئی دوسرا شخص چھین سکتا ہے ''میں'' کو نہیں چھین سکتا اور جس دن آپ نے ''میں'' کو دوسرے کو دیدیا' اس دن آپ انسان نہیں رہے' حیوان کے درجے پہ پہنچ گئے:

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات

تُو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

اس سے یہ دونوں چیزیں ختم ہو جاتی ہیں۔ یہ ''میں'' منتقل نہیں کی جا سکتی۔ وہ کہہ رہا ہے کہ ٹھیک ہے کہ تم ان کا جو کچھ چھین رہے ہو اس سے تمہارا جسم شاید موٹا ہو جائے گا لیکن یہ نفس ہے' انسانی ذات ہے' جو میں ہے' تشخص ہے' انسانیت ہے' وہ انسانیت کا حسن ہے' نشو و نما ہے' وہ اگر تم اپنی یہ نشو و نما کرتے ہیں تو اس میں سے تم چھین نہیں سکتے' وہ تو تمہیں خود ہی کرنا پڑے گی۔

زندگی سانس لینے کا نام نہیں بلکہ تکریمِ آدمیت کا نام ہے

یاد رکھو! **وَ اِلَی اللّٰهِ الۡمَصِیۡرُ** (35:18) آخری پناہ گاہ' جہاں جا کر فیصلہ ہونا ہے' وہ تو صرف خدا ہی کا مقرر کردہ معیار ہے' تمہارے معیار نہیں ہیں جو تم مقرر کرتے ہو' اور یہ جو دونوں ہیں ایک کی ذات کی نشو و نما ہو رہی ہے' جو دوسرا ہے وہ دوسروں کی طبعی چیزیں چھینتا چلا جا رہا ہے۔ اس طرح سے اپنے جسم کو موٹا کرتا چلا جا رہا ہے۔ کہتا ہے کہ **وَ مَا یَسۡتَوِی الۡاَعۡمٰی وَ الۡبَصِیۡرُ** (35:19) دنیا کے اندر اس قسم کے دو گروہ ہیں اور یہ دو کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ قرآنِ کریم اضداد سے' Opposite (متضاد) چیزوں کو سامنے لا کر' مفہوم کو واضح کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ کیا تم نے دیکھا ہے اندھا اور آنکھوں والا کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ **وَلَا الظُّلُمٰتُ وَ لَا النُّوۡرُ** (35:20) روشنی اور تاریکی کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ **وَ لَا الظِّلُّ وَ لَا الۡحَرُوۡرُ** (35:21) دھوپ اور چھاؤں کبھی برابر نہیں ہو سکتے اور اسی طرح سے **وَ مَا یَسۡتَوِی الۡاَحۡیَآءُ وَ لَا الۡاَمۡوَاتُ** (35:22) زندہ اور مردہ انسان کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ یہ چلنے پھرنے والا زندہ' اور وہ قبر کے نیچے مردہ نہیں ہے۔ زندگی سانس لینے کا نام نہیں ہے:

ترا دیں نفس شماری' مرا دیں نفس گدازی

(اقبالؒ: ضربِ کلیم)

زندگی سانس لینے کا نام نہیں ہے' عزیزانِ من! زندگی شرف و تکریمِ انسانیت کی نشو و نما کا نام ہے۔ یہ نہیں ہے کہ تُو مردہ ہے' وہ زندہ نہیں ہے۔ کہتا ہے کہ بات یہ ہے کہ **اِنَّ اللّٰهَ یُسۡمِعُ مَنۡ یَّشَآءُ** (35:22) تم کہتے چلے جاتے ہو' سنتا کوئی نہیں ہے۔ سنے گا وہ جو

سننا چاہے گا۔ خواہ تمہاری محفل میں بھی کیوں نہ بیٹھا ہوا ہو، سننا نہیں چاہتا، اس کا خیال ہی کہیں اور ہے۔ سنے گا وہ جو سننا چاہے گا۔ وَ مَآ اَنۡتَ بِمُسۡمِعٍ مَّنۡ فِی الۡقُبُوۡرِ (35:22) اور جو قبروں کے اندر ہوں، ان کو تُو کیا سنائے گا۔ یہ نہیں ہے کہ قبرستان کے اندر جا کر وعظ مت کرو، یہ مردے نہیں سنتے، یہ چلتے پھرتے سارے مردے یہ سب قبرستان ہے۔ عزیزانِ من! یہ بستے ہوئے انسانوں کی زندگی نہیں ہے۔ بستے ہوئے انسان تو وہی ہونگے جن میں شرف وتکریمِ انسانیت موجود ہوگی، جن کی انسانیت زندہ ہوگی۔ یہ تو حیوانی زندگی ہے، ہماری طبعی زندگی ہے، بھیڑیا بھی جیتا ہے، بکری بھی جیتی ہے، ہم بھی سانس لیتے ہیں تو اس لیے کہا کہ ان کی یہ کیفیت ہے کہ ان کی انسانیت زندہ نہیں ہے، وہ اس بات کو کیا سنیں گے۔ ان کو کہا کہ یہ قبروں کے اندر ہیں۔ اِنۡ اَنۡتَ اِلَّا نَذِیۡرٌ (35:23) تمہارا کام یہ نہیں ہے کہ مُردوں کو سنا سکو، سنے گا وہ جو سننا چاہے گا۔ تمہارا کام یہ ہے کہ یہ بات کہتے چلے جاؤ، ان کو بتاتے چلے جاؤ کہ اس سے تمہاری تباہی آئے گی، اس سے تمہاری ہلاکت ہوگی۔ ڈاکٹر دوائی لکھ کر اس کو ڈائریکشن دیدیتا ہے، نسخہ اس کے حوالے کر دیتا ہے پھر اس کے بعد مریض کی مشیت شروع ہوتی ہے، جی چاہے پئے، جی چاہے نہ پئے، جی چاہے اس کی ہدایت پہ عمل کرے جی چاہے نہ کرے۔ تیرا کام یہ ہے کہ تُو بتادے کہ ہلاکت اس میں ہے، زندگی اس میں ہے۔

عزیزانِ من! آگے کہا ہے کہ اِنَّـآ اَرۡسَلۡنٰکَ بِالۡحَقِّ بَشِیۡرًا وَّ نَذِیۡرًا یہ سورۃ فاطر کی 24 ویں آیت ہے۔ اسے ہم آئندہ لیں گے۔ آج کا درس سورۃ فاطر کی آیت 23 پر ختم ہوتا ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ

❀......❀......❀

پانچواں باب: **سورۃ فاطر** (آیات 24 تا 35)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج مئی 1980ء کی 30 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ فاطر کی آیت کی 24 سے ہو رہا ہے:

(35:24)۔

نبوت کا فریضہ کاروانِ انسانیت کو خطراتِ منزل سے آگاہ کرنا ہوتا تھا

سابقہ آیات میں یہ کہا گیا تھا کہ تُو کسی کو زبردستی بات سنا نہیں سکتا' بات اُسی کے سننے میں آسکتی ہے جو سننا چاہے' جو سننا ہی نہ چاہے اس تک بات پہنچائی تو جاسکتی ہے لیکن تیرا فریضہ نہیں ہے کہ تُو اس کو سنا بھی دے' ہدایت پہ لے بھی آئے۔ اِنْ اَنْتَ اِلَّا نَذِيْرٌ (35:23) تُو تو سفرِ زندگی میں کاروانِ انسانیت کو راستے کے خطرات سے آگاہ کرنے والا ہے۔ اب اس کے بعد اس کا سننا' نہ سننا' اس کے مطابق عمل کرنا' نہ کرنا' یہ اس کا کام ہے' تمہاری ذمہ داری نہیں ہے۔ اِنَّـآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا (35:24) اے رسول! تُو بشیر اور نذیر ہے' ان ہدایات کے مطابق چلو گے' اس کا نتیجہ خوشگوار ہوگا' ان کی خلاف ورزی کرو گے تباہ ہو جاؤ گے' تمہارا کام تو یہ بتا دینا ہے' ان لوگوں کو زبردستی اس راستے پہ چلا دینا نہیں ہے۔ اور یہ چیز بھی کوئی نئی نہیں ہے کہ تُو دنیا میں پہلی بار آیا ہے' انسانوں نے اس سے پہلے کسی ایسے نذیر اور بشیر کو دیکھا نہیں۔ وَ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (35:24) کوئی بھی قوم ایسی نہیں گزری جس میں ہم نے رسول کو نہ بھیجا ہو اور اس نے انہیں خطرات سے آگاہ نہ کیا ہو۔ یہ موضوع اور ہے' کسی دوسرے وقت میں' اس کی تفصیل بیان کرونگا یہ نہایت ضروری ہے۔

مواخذہ کے لیے دو شرائط کا پورا ہونا ضروری ہے

جب کسی سے باز پرس کی جائے کہ تم نے ایسا کیوں نہیں کیا' تمہیں اس کی سزا ملے گی' تو یہ لازمی ہے کہ پہلے اس کو بتا دیا جائے کہ اگر تم ایسا کرو گے تو یہ جرم ہوگا اور اس کی سزا ہوگی اور اگر اُسے یہ نہ بتایا جائے تو پھر اس سے مواخذہ نہیں کیا جاسکتا۔ دو چیزیں ضروری ہیں: ایک تو اس میں یہ سمجھنے کی صلاحیت ہو کہ یہ کیا کہہ رہا ہے اور دوسرے یہ کہ اس تک وہ بات پہنچا دی گئی ہو کہ اس کے خلاف کرو گے تو یہ ہوگا۔ یہ دو شرطیں پوری ہوتی ہیں تو پھر مواخذہ ہوتا ہے' پھر اس کے بعد نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ اسی لیے ہر رسول کو نذیر اور بشیر کہہ کر پکارا گیا۔ کہا کہ ہر قوم کے اندر' ہر امت کے اندر' رسول آتے رہے' نبی آتے رہے لیکن کہا کہ وَ اِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَ بِالزُّبُرِ وَ بِالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِo ثُمَّ اَخَذْتُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ (35:25-26) اس کے بعد یہ ہے کہ تُو ان کو ان سے آگاہ کرتا ہے اور یہ تیری تکذیب کرتے ہیں۔ کہا ہے کہ کوئی قوم ایسی نہیں گزری جس میں ہم نے اپنے رسول کو نہ بھیجا ہو اور یہ بھی حقیقت ہے کہ کوئی قوم ایسی نہیں گزری جنھوں نے ان رسولوں کو جھٹلایا نہ ہو اس لیے اگر یہ قوم تجھے بھی جھٹلا رہی ہے تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے' نہ تُو نیا رسول ہے' نہ ان کی طرف سے یہ ردِ عمل کوئی انوکھا ہے۔ مفاد پرست گروہ ہمیشہ یہی کرتا چلا آرہا ہے۔ شاید آپ کو یاد نہ رہا ہو' نہ رہا ہو تو میں پھر یاد دہانی کرادوں' پہلے یہ آچکا ہے' یہاں کہا گیا تھا کہ وان

یکذبوک کے تو معنی یہ ہیں کہ یہ تیری تکذیب کرتے ہیں۔

کسی چیز کو جھوٹا کہنے کی نسبت اس کی تکذیب کرنا زیادہ نقصان دہ ہے

وہاں کہا تھا کہ یہ تجھے جھوٹا نہیں کہتے' تیرے سچا ہونے کے تیرے دعویٰ نبوت سے پہلے کے قائل چلے آرہے ہیں' سارا عرب تمہیں امین اور صدیق کہہ رہا تھا' آج بھی تمہاری امانتوں کے متعلق' تمہاری صداقت کے متعلق انہیں کوئی شبہ نہیں۔ یہ تجھے جھوٹا نہیں کہتے' یہ میرے دین کی' میرے قوانین کی تکذیب کرتے ہیں۔ تکذیب کرتے ہیں' کے کیا معنی ہیں؟ کسی سے کہا جائے کہ دیکھو بھئی! شوگر کے مریض ہو' میٹھا نہ کھاؤ' شوگر بڑھ جائے گی اور اس کے بعد موت ہو جائے گی' وہ کہے کہ جاؤ جاؤ' دیکھا ہوا ہے' کچھ نہیں ہوتا' میں نے بیسیوں مریضوں کو دیکھا ہے' میں نے کئی دفعہ یہ کھا کر دیکھا ہے' کچھ نہیں ہوتا۔ یہ جو چیز ہے کہ کسی کے متعلق یہ چیز کہنی کہ نہیں' اس سے کچھ نہیں ہوگا' وہ کہتا ہے کہ اس کا Definite (یقینی) نتیجہ یہ نکلے گا۔ وہ کہتا ہے کہ نہیں' کچھ نہیں ہوگا۔ یہ ہے تکذیب۔ اس کے اس دعوے کو جھوٹا کہنا کہ یہ غلط ہے' ایسا نہیں ہوگا' ایسا نہیں ہوگا' یہ تھی تکذیب۔ جسے دین کہا جاتا تھا' وہ اس کہنے والے رسول کو جھوٹا نہیں کہتے تھے' کہتے یہ تھے کہ تم جو کہتے ہو کہ خدا کے قانون کی خلاف ورزی سے تم پہ تباہی آجائے گی' یہ غلط ہے' ایسا نہیں ہوگا' ہم پہ تباہی نہیں آئے گی' ہم نے انتظامات کر رکھے ہیں۔ یہ ہے جسے تکذیب کہتے ہیں۔

صدیوں سے ہمارے ہاں قرآن حکیم کے استعمال کا مقصد

ہماری کیفیت تو یہ ہے کہ قرآنِ کریم ہمارے ہاں صرف تلاوت کے لیے رہ گیا ہے یا ایصالِ ثواب کے لیے: ''قُلاں واسطے تے' چہلماں واسطے تے' جمعراتاں واسطے ❶''۔ قرآن میں جو کچھ آیا ہے' وہ تو اور قوموں کے لیے تھا' وہ یہودیوں کے لیے' کچھ عیسائیوں کے لیے' کچھ کفار کے لیے' کچھ قریشِ مکہ کے لیے' یہ سارا کچھ جو اس میں احکام دیئے ہیں' ہدایات دی ہیں' تنبیہ کی ہے' یہ سارا تو ان کے لیے تھا اور ہمارے لیے ایک ایک حرف سے تیس تیس نیکیاں حاصل کرنے کے لیے تھا۔ تفسیروں میں لکھا ہے کہ یہ ال م پڑھیے تو کہا ہر ایک حرف پر دس نیکیاں ملیں گی اس طرح ال م پر اس حساب کی رو سے تیس نیکیاں ملیں گی۔ ہمارے لیے تو یہ صرف اس مقصد کے لیے رہ گیا ہوا ہے۔ کبھی کھڑے ہو کر سوچا نہیں کہ ہمارے لیے بھی کچھ ہے اور اگر یہ سوچا جائے پھر یا تو یہ کیفیت ہو کہ اس کے ایک لفظ کی خلاف ورزی نہ کرنے کی جرأت نہ کی جائے اور یا پھر یہ ہے کہ وہ اسے پڑھنا بھی چھوڑ دے۔ اگر یہ کھڑے ہو کر سوچیں تو کہیں کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔ ایسا نہ کرنا تو تکذیبِ دین ہے' بقول ان کے بے شمار مقامات پہ یہ آیتیں آئی ہیں کہ یہ اممِ سابقہ کے لیے تھیں' پہلی قوموں کے لیے

---

❶ رسمِ قل کے لیے' چہلموں کے لیے' جمعراتوں کے ختموں کے لیے۔

تھیں، قریش کے لیے تھیں، حضورﷺ کے زمانے کے مخاطبین کے لیے تھیں اور اس کے بعد کہا کہ یہ قصہ ہی ختم ہو گیا اور اب قرآن ہمارے لیے تلاوت کورہ گیا، یہ باتیں اُنہی کے لیے رہ گئیں، تکذیبِ دین تو وہ کیا کرتے تھے۔

تکذیب کے کیا معنی ہیں؟ یہ کہ رسول کی رسالت پہ ایمان، قرآن کے منجانب اللہ ہونے پر ایمان۔ ایمان کے معنی میں یہ دعویٰ نہیں کہ ہم مانتے ہیں کہ یہ ہے۔ اور اس میں اگر یہ کہا جائے کہ ظالم کی کھیتی پنپ نہیں سکتی، وہ تباہ ہو کر رہتی ہے اور ایسا کرنے والی وہ قوم تباہ ہو جاتی ہے، بقول ان کے یہ جو بات تھی، اصل میں یہ قریش کے لیے کہی گئی تھی، ہمارے لیے نہیں کہی تھی۔ اس کے بعد زبان سے نہ بھی کہا جائے کہ ظلم کا انجام تباہی ہوتا ہے مگر عملاً ظلم کی روش اختیار کیے چلے جائیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم دین کی تکذیب کر رہے ہیں۔

تکذیب دین کی حقیقت کا نتیجہ

الدین کہہ رہا ہے کہ **اِنَّهٗ لَا یُفۡلِحُ الظّٰلِمُوۡنَ** (6:21) یہ ایک واضح حقیقت ہے، یاد رکھو کہ ظلم کبھی بھی پنپ نہیں سکتا، آخر الامر کامیاب نہیں ہوتا، کچھ وقت کے لیے وہ اپنے دعوے اور اپنا تحکم جتا تا ہے لیکن آخر الامر اس کے لیے تباہی ہے مگر یہ کہتے ہیں کہ ہم ظلم پہ ظلم کیے چلے جاتے ہیں، تباہ نہیں ہوتے تو یہ کیا بات ہوئی۔ اصل میں یہ یونہی بات ہے جو اس نے کہہ دیا کچھ ہوتا ہوا تا نہیں ہمیں اس کا پتہ ہے۔ اسے کہتے ہیں تکذیبِ دین یعنی اُسے ماننا کہ ہاں صاحب! یہ خدا کا کلام ہے اس سے انکار نہیں ہے، اسے زبان سے کفر نہیں کہا لیکن عملاً یہ ثابت کرنا کہ جو کچھ یہ کہہ رہا ہے، یہ ٹھیک نہیں، صحیح نہیں، یہ غلط ہے۔ یہ ہے تکذیبِ دین۔ اگر ہم کبھی کھڑے ہو کر سوچیں تو سمجھ میں آئے کہ قرآنِ کریم نے جہاں جہاں تکذیب کے لیے کہا ہے، تو کیا وہ آیات ہم پہ ہی منطبق نہیں ہوتیں؟ مگر ہم سوچتے نہیں ہیں۔

تکذیب دین کرنے والے کون کون لوگ ہیں؟ یہ جاننے کے لیے سورۃ الماعون قابل غور ہے

عزیزانِ من! بہت سے مقامات چھوڑ دیجیے ایک پوری سورۃ 107 نمبر ہے جسے الماعون کہا جاتا ہے، کہا ہے کہ **اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ یُکَذِّبُ بِالدِّیۡنِ** (107:1) بات تو سیدھی سی ہے اگر یہ کفار کے متعلق ہوتی کہ جو مانتے ہی نہیں تھے تو یہ نہ کہا جاتا کہ تُو نے اس شخص کی یا ان لوگوں کی حالت پہ غور کیا ہے، جو الدین کی تکذیب کرتے ہیں۔ وہ تو الدین سے انکار کرتے تھے، ان کے متعلق تو نہیں کہا جائے گا کہ کیا تم نے ان کو دیکھا جو الدین سے انکار کرتے ہیں۔ یہاں کفر برتتے نہیں کہا بلکہ یہ کہا کہ الدین کی تکذیب کرتے ہیں تو اس کے کیا معنی ہوئے؟ یہ کہ الدین کو لفظاً تو مانتے ہیں، عملاً اس کی تکذیب کرتے ہیں، جھٹلاتے ہیں کہ یہ جو کہتا ہے کہ ایسا کرنے سے یہ ہوگا، یہ ایسی بات نہیں ہے۔ غور کیجیے، عزیزانِ من! کہ کیا ہم ہی مخاطب نہیں ہیں کہ اس قرآن کو مانتے ہیں کہ یہ خدا کی کتاب ہے، الدین خدا کا دیا ہوا دین ہے، ہم الحمدللہ اس پہ قائم ہیں اور اس کی تکذیب کرتے ہیں کہ اس نے جو کہا ہے کہ اس سے تباہی آئے گی، اور ہم وہی کچھ کیے چلے جا رہے

ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم عملاً اس کی تکذیب کرتے ہیں کہ نہیں' تم جھوٹ کہتے ہو۔ **اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ** (107:1) ۔عربی زبان والے جانتے ہیں کہ ارءیت وہاں بولا جاتا ہے جہاں محسوس طور پہ ایک چیز سامنے نظر آ جائے' وہ نظری' اعتقادی' تصوراتی' ذہنی' نہ ہو کہ ہم ذہن میں یہ تصور کر لیں کہ نہیں' ہم پنپ رہے ہیں' ہم خوشحال ہو رہے ہیں۔

دین کی تکذیب کرنے والوں کی پہچان

کہا ہے کہ **اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ** (107:1) اور پھر قرآن یہ دعویٰ کرنے کے بعد یونہی نہیں چھوڑ دیتا' بتا دیتا ہے کہ یہ کون لوگ ہیں جو اس قرآن کو خدا کی کتاب بھی مانتے ہیں اور دین کی تکذیب بھی کیے جا رہے ہیں۔ یہ وہ ہیں جو **فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ** (107:2) ان کو دھکے دیتے ہیں جو معاشرے میں تنہا رہ جاتے ہیں۔ دین کی تکذیب کرنے والے یہ لوگ ہیں۔ دیکھتے یہ ہیں کہ کس کی پارٹی بڑی ہے' کس کا جتھہ زیادہ ہے' Majority (اکثریت) کن لوگوں کی ہے۔ یتیم کے معنی' ہم لوگوں نے یہ کر لیے' کہ جس کے ماں باپ مر گئے ہوں ہم نے اسے صرف یتیم کہہ دیا اور ان کو بھی جس طرح دھکے دیئے جاتے ہیں' ہمارے سامنے ہے لیکن عربی زبان میں یتیم کے معنی صرف وہی نہیں ہیں جن کے ماں باپ مر جائیں بلکہ ہر وہ جو تنہا رہ جائے یتیم ہے۔ وہ تو میں کئی دفعہ بتا چکا ہوں کہ ہم تو اس معاشرے کے اندر سارے کے سارے یتیم ہیں' ہر شخص کی مصیبت تنہا اس کی مصیبت ہے' کوئی اگر ذرا کچھ اس کی مدد بھی کرتا ہے تو اس کے اوپر اتنا بڑا احسان رکھ دیتا ہے کہ اس سے وہ مصیبت جھیل لینا اس کے لیے زیادہ آسان تھا' بہ نسبت اس احسان کے جو اس نے کیا ہے۔ یہ میرے ہی ذہن کی تفہیم نہیں ہے' جو میں نے کہا ہے کہ پورے معاشرہ کے اندر رہتے ہوئے ہم میں سے ہر ایک یتیم ہے' قرآن نے کہا ہے کہ **یَّتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ** (90:15) معاشرے میں دوسروں کے قریب ہوتے ہوئے تنہا ہیں۔ کیا بات ہے قرآن کی!

امریکا کی حالتِ زار پر لکھی جانے والی کتاب: The Lonely Crowd تنہا ہجوم

عزیزانِ من! یہ جو **یَّتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ** اصطلاح ہے یہ کہیں اور نہیں ملے گی۔ شاید آپ کو یاد ہو گا' میں نے بتایا تھا کہ یہ چیز امریکا کے دو مصنف تھے جنہوں نے وہاں کے معاشرے کے متعلق ایک کتاب لکھی تھی' ہم اپنے ذہن میں کہتے ہیں کہ وہ جو معاشرہ ہے اس میں تو آپس میں بڑا Cooperation (تعاون) ہوتا ہے' ہمدردیاں ہوتی ہیں۔ انہوں نے وہ کتاب اس معاشرے کے متعلق لکھی ہے۔ کتاب میں کیا تھا؟ اس کو چھوڑ دیجیے' اس کا ٹائٹل بتا رہا ہے کہ کیا تھا' وہ کتاب میں اپنے معاشرے کے متعلق کیا کہتے ہیں؟ یہ کہ "The Lonely Crowd" ہے۔ یہ **یَّتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ** کا ترجمہ ہے "The Lonely Crowd" وہ ہجوم جس میں ہر فرد اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ وہاں تو پھر بھی ہمیں نظر آتا ہے کہ کچھ لوگ کسی دوسرے کی مدد کرتے ہیں' خواہ کسی جہت سے سہی' میں سمجھتا ہوں کہ جیسے ہم

یتیم ہیں' اس کی تو شاید ہی کہیں اور مثال ملے: يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ (90:15) اتنی بستی' دنیا کے اندر اتنے بڑے ہجوم کے اندر' اتنی بڑی آبادی کے اندر' ہر فرد اپنے آپ کو تنہا محسوس کر رہا ہے۔ تکذیبِ دین کا جرم ملاحظہ فرمائیے۔

آج ہمارے معاشرے کا ہر فرد اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے

عزیزانِ من! یہ جرأت عرض معاف فرمائیے۔ دین کو یہ بھی زبان سے مانتے ہیں کہ یہ خدا کی کتاب ہے' یہ خدا کا ارشاد ہے' یہ اس کا دیا ہوا دین ہے۔ زبان سے یہ کہے جاتے ہیں کہ ہم کافر نہیں ہیں مگر عملاً مکذب ہیں' تکذیب کرتے ہیں کہ نہیں' ظلم کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ فَذٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ (107:2-3) جس کا چلتا ہوا کاروبار رک کر رہ جائے' جس کی گاڑی کہیں رک جائے' بیچارے کی حرکت اس کے اندر نہ رہے' چلنے کی ہمت اس کے اندر نہ رہے' اس کی روٹی کے لیے نہ خود انتظام کرتے ہیں' نہ دوسروں سے کہتے ہیں کہ اس کا انتظام کرنا چاہیے۔ یہ ہے تکذیبِ دین۔ کہا کہ یہ اپنے آپ کو کس طرح فریب دے لیتے ہیں کہ نہیں' صاحب! یہ ہمارے لیے نہیں ہے' ہم تو دین کی تکذیب نہیں کرتے۔

کہا کہ نمازیں پڑھتے رہتے ہیں۔ عزیزانِ من! قرآن ہے' تکذیبِ دین کرنے والوں کے متعلق تو یہ کہا ہی تھا' اب مزید کہا کہ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ ۝ الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ (107:4-5) تباہی ہے ان نمازیوں کے لیے' جو نماز کا مقصد' غرض اور غایت کو پسِ پشت ڈالے ہوئے ہیں' اس پہ ان کی نگاہ ہی نہیں کہ اس کا مقصد کیا تھا۔

ہم نے صلوٰۃ کے حقیقی مفہوم کو نظروں سے اوجھل کر رکھا ہے

صلوٰۃ کس چیز کو سمجھے ہوئے ہیں؟ کہا کہ الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ (107:6) اٹھنا' بیٹھنا' ہاتھ باندھنا' نیت کرنا' یوں نظر آتی ہیں۔ کہتا ہے کہ بس اس کا نام اُنہوں نے صلوٰۃ رکھ چھوڑا ہے اور جس مقصد کے لیے ہم نے یہ صلوٰۃ فرض قرار دی تھی' اس کو اُنہوں نے بھلا چھوڑا ہے' ان نمازیوں کے لیے تباہی ہے: لِّلْمُصَلِّينَ (107:4)۔ تکذیبِ دین کون کرتا ہے؟ یہ ہے عنوان۔ صلوٰۃ کی اُنہوں نے ایک غایت بتائی اور کچھ نہیں تو یہ تنھی عن الفحشآء والمنکر سہی کہ نماز تو ہر قسم کی جو برائیاں اور بے حیائیاں ہیں' ان کو دور کر دیتی ہے۔ کہا کہ ان کو دیکھیے' یہ کیا مصلین ہیں' کاہے پہ مطمئن ہیں؟ وہ جو Formal (رسمی سی) حرکتیں ہوتی ہیں ان کے اندر' محض دیکھنے کی جو ایک چیز ہے' اس کی ادائیگی کے بعد سمجھ لیتے ہیں کہ ہم نے فریضۂ خداوندی پورا کر دیا لیکن نہ یتیموں کی پرورش کی' نہ مسکین کی مدد کی' نماز میں اپنے آپ کو فریب دے لینا کہ اس کا نام صلوٰۃ ہے' وہ ہم نے پورا کر دیا۔

مرئی طور پر حرکات وسکنات کو ہی صلوٰۃ سمجھ لیا گیا

کہیں مسجد میں جا کر ان لوگوں کے ہاں دیکھیے۔ کہتے ہیں کہ تیری نماز نہیں ہوئی بھئی! آپ کو کیسے پتہ چل گیا کہ نہیں ہوئی' کیا آپ کے پاس وہاں سے یہ چٹ (پرچی) آ گئی ہے کہ اِس کی ہو گئی ہے' اس کی نہیں ہوئی؟ کیسے نہیں ہوئی؟ کہ جی' تمہارے پاؤں کے درمیان اتنا فاصلہ نہیں تھا' اتنا فاصلہ ہو جائے تو نماز ہو گئی' اتنا نہیں ہے تو نماز نہیں ہوئی۔ **یُـرَآءُ وْنَ** (107:6) جو چیزیں مرئی طور پہ ہیں' سامنے یہ حرکتیں ہیں' کہ ہاتھ یہاں سینے کے اوپر باندھو تو وہ حنفیوں کے نزدیک نہیں ہوئی' نیچے ہاتھ باندھو تو اہلِ حدیث کے نزدیک نہیں ہوئی' یہ یہاں باندھو تو اہلِ حدیث کے نزدیک ہو گئی وہ یہ دیکھ رہے ہیں۔ اندازہ لگائیے کہ نماز ہو گئی یا نہیں ہوئی کا معیار یہ حرکتیں رہ گئی ہیں اسی لیے کہا کہ **هُـمْ يُرَآءُ وْنَ** (107:6) جو چیزیں یوں سامنے نظر آتی ہیں اُنہوں نے صرف وہ معیار قائم رکھا ہے۔ عزیزانِ من! یہ قرآن ہے' یہ تو کہیں جانے ہی نہیں دیتا' بھاگنے ہی نہیں دیتا۔ فوراً مقصد و مدعا پہ لے آتا ہے۔

قرآنِ حکیم کو صرف ناظرہ پڑھنے تک کیوں محدود کر دیا گیا؟

اب آپ کو معلوم ہوا کہ یہ قرآنِ ناظرہ پہ کیوں زور دیا جاتا ہے کہ بغیر معنی کے پڑھتے رہو' یہ جو آپ کے قاری ہیں یہ ساری عمر قرأت کرتے ہیں' تلاوتِ قرآنِ کریم اتنی شدت سے ہوتی ہے کیوں؟ تاکہ یہ قوم کہیں قرآن کے معنی کی طرف نہ آئے جس کو الم (ا ل م) کہنے سے تیس نیکیاں مل جائیں' اس کو اس بات کی کیا پڑی ہوئی ہے کہ اس کے بعد بیٹھا ہوا یہ بھی سوچے کہ الم (ا ل م) کے معنی کیا ہیں۔ کہا کہ **هُـمْ يُـرَآءُ وْنَ** (107:61) یہ اتنے پہ مطمئن ہو جاتے ہیں کہ یہ جو حرکات نظر آتی ہیں وہ صحیح ہونی چاہئیں تو نماز ہو گئی' اور عملاً کیفیت یہ ہے کہ **وَيَـمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ** (107:7) وہ رزق' کہ جسے بہتے پانی کی طرح رواں دواں رہنا چاہیے تھا' کہ جس کو ضرورت ہے اس ندی میں سے لے لے' وہ اس کے آگے بند لگا لیتے ہیں' اسے اپنے لیے محفوظ کر لیتے ہیں: **اَرَءَ يْتَ الَّذِىْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ** (107:1) دین کی تکذیب کرنے والے یہ ہیں۔ میں کہتا ہوں اس سے بڑا کوئی اور جرم نہیں ہو سکتا' (معاذ اللہ) خدا کو جھٹلانا کہ نہیں' تم غلط کہتے ہو کہ اس کا نتیجہ تباہی ہو گا' نہیں ہو گا' دیکھو تمہیں ہم بتا دیں گے۔ تکذیبِ دین' عزیزانِ من! اتنی بڑی چیز ہے۔ میں تو صرف ایک سورۃ آپ کے سامنے لایا ہوں' اگر میں اس موضوع پہ یہ چیزیں لاؤں' اگر آپ کو تحقیق یا سمجھنے کی جستجو ہو تو میری جو' تبویب القرآن' ہے اس میں دیکھیے گا سارے قرآن کے مقامات کے حوالے ایک عنوان کے تابع رکھے ہیں۔ سوال تھا کہ تکذیبِ دین کون کرتا ہے؟ یہاں آپ نے دیکھ لیا کہ کون کرتا ہے۔

اجڑی بستیاں اور کھنڈرات تکذیب دین کرنے والوں کا منہ بولتی شہادت ہیں

اب یہ چیز ہمارے سامنے آئی کہ وَ اِنْ یُّکَذِّبُوْکَ فَقَدْ کَذَّبَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (35:25) اگر یہ تمہیں جھٹلاتے ہیں تو اس سے پیشتر یہ لوگ ایسا کرتے رہے تھے' پھر اس کا نتیجہ بھی اُنہوں نے دیکھ لیا تھا' جب ہم نے اس کی گرفت کی ہے۔ اُنہوں نے دیکھ لیا' تم نے بھی دیکھ لیا' تاریخ کے اوراق سے پوچھو' اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات سے جا کر پوچھو' وہ بتائیں گے کہ پھر خدا کی گرفت کیسی ہوا کرتی ہے۔ یہ جو کہتے تھے کہ کچھ نہیں ہوتا' ہمیں دیکھو کیا ہوا۔ سنو! ان کے ساتھ تکذیبِ دین کا یہ نتیجہ ہوتا ہے' عزیزانِ من! ان کے پاس رسول آئے تھے: بیّنٰت' زبر' کتٰب' ہے اور قرآنِ کریم میں یہ مقام آئے گا' جہاں بتاؤں گا کہ پہلے تو بیّنٰت ہوتی ہیں' اس کے سامنے وہ دلائل کے ذریعے سے پیش کرتا ہے جو زبر ہے' عام طور پہ اس کو زبور کی جمع کہا جاتا ہے۔ زبور کے متعلق ہمارے ہاں یہ ہے کہ حضرتِ داؤدؑ پر جو کتاب نازل ہوئی تھی' اس کا نام زبور تھا۔ یہ ایسا نظر نہیں آتا۔ زبر جمع زبور جو ہے' اس کے متعلق عربوں کی زبان میں کہتے ہیں کہ یہ کوئی جلی کتاب بھی ہے' لکھی ہوئی جو ہو' اُسے زبور کہتے ہیں' زبر اس کی جمع ہے' کتابیں اس کے معنی ہوتے ہیں۔ تو انبیائے کرام کی طرف سے دلائل آتے تھے' زبور کے معنی کر دیئے کتٰب المنیر۔ کتاب قوانین کو کہتے ہیں۔ یہ پہلی چیز جو قرآن نے دی ہے' وہ دلائل ہوتے ہیں' وہ پیش کرتا ہے' جب کوئی دلائل سے مطمئن ہو کر اس جماعت میں داخل ہوتا ہے تو پھر قوانین کا نفاذ ہوتا ہے۔ بہرحال اُس نے کہا کہ پہلے انبیائے کرام بھی آئے' رسول آئے' اُنہوں نے یہ کچھ کہا لیکن اُنہوں نے تکذیب کی۔

قرآنِ حکیم اپنے قوانین کی صداقت کے لیے خارجی کائنات کو بطور شہادت پیش کرتا ہے

اب آگے دیکھیے کہ وہ کس طرح سے یہ کہتا ہے کہ ہمارے قوانین' جو ہم نے بنا دیئے ہیں' ان کے مطابق نتیجہ برآمد ہو کر رہتا ہے۔ اب یہ جو چیز تھی' یہ ذہنی نہیں کہی' تصوراتی نہیں کہی۔ جو Physical World (خارجی کائنات) ہے' جو محسوس کائنات ہے' وہ اس کے اندر لاتا ہے' وہاں سے دلائل دیتا ہے' وہاں سے شہادتیں پیش کرتا ہے اور شہادتیں اپنے قانون کی محکمیت کی پیش کرتا ہے۔ کہا کہ ذرا دیکھو! خارجی کائنات کے اندر کہیں بھی ہمارے دین کی تکذیب ہو رہی ہے؟ سمندر کے پانی کے متعلق جو دین ہے کہ سورج کی کرنیں اُس پہ پڑیں گی تو اس حرارت سے وہ پانی بھاپ بن کر اوپر اٹھ جائے گا' کبھی تم نے دیکھا ہے کہ سمندر نے اس کی تکذیب کی ہو کہ سورج کی حرارت اس پہ پڑے اور وہ پانی بھاپ نہ بنے؟ کیا ایسا ہوا ہے؟ اور پھر وہ بھاپ دوسری ہوا سے ہلکی نہ ہو' کیا کبھی اُس بھاپ نے تکذیب کی ہے؟ پھر وہ اوپر چلا جائے اور اس کے بعد جہاں بھی ایسا فضائی کرہ آئے جس میں ٹھنڈک ہو تو وہ بھاپ پھر پانی بن جائے اور وہ پانی ہوا سے بھاری ہو اور پھر وہ نیچے اتر آئے' کیا اس نے اسے جھٹلایا ہے؟ کہا کہ آپ دیکھتے ہیں کہ اس پروسیس (عمل) میں کسی نے بھی

تکذیب کی ہے کہ نہیں، تم غلط کہتے ہو کہ بھاپ پانی بن جائے گی تو نیچے اترے گی، ایسے نہیں ہوسکتا۔ دیکھتے ہیں پھر تکذیب کیا ہوتی ہے؟ کہا کہ یہ ایسا نہیں ہوتا۔

کہتا ہے کہ **اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا**(35:27) دیکھتے ہو دین کی صداقت کیسے ہوتی ہے: پانی بارش سے برستا ہے، پہلے تو زمین کی صلاحیت ہوتی ہے، ہر زمین پہ یکساں بارش ہوتی ہے، کوئی زمین ایسی بنجر ہوتی ہے کہ اس میں سے کچھ بھی نہیں اگتا، پانی میں اگانے کی صلاحیت تھی لیکن اس کے لیے ایک تعاون کی ضرورت تھی کہ نیچے زمین بھی صالح ہو، جس میں اگنے کی صلاحیت تھی۔ تو خدا کی یہ وحی، اس کے یہ قوانینِ ابرِ رحمت تو پوری انسانیت کے اوپر برستا ہے اب نیچے زمین کا فرق آ گیا، ہمارے جیسی زمینِ شور کے اوپر یہ برستا ہے تو اول تو کہیں اگتا ہی کچھ نہیں ہے ''اگر یہ اگداوی اے تے او برسات دے جیہڑے اوپڈرے ہیگے نیں کھمبیاں اگدیاں ہیگیاں[1]'' اور زمینِ صالح پہ وہ کہتا ہے کہ **ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا** (35:27) پھر یہ دیکھو تو سہی، وہی پانی، وہی زمین ہے، ذرا سا اس بیج کا فرق ہوتا ہے۔ کس قدر مختلف قسم کے پھل، زراعتیں یہ ساری چیزیں اس میں سے اگتی چلی جاتی ہیں۔ یہ حصہ جو تھا یہ تو Agriculture (زراعت) کے متعلق کہہ دیجیے، بائیالوجی کے متعلق کہہ دیجیے، میں اس لیے یہ کہہ رہا ہوں کہ ابھی بات آئی ہے کہ میں نے یہ کیوں کہا ہے کہ یہ Agriculture (زراعت) ہے، یہ بائیالوجی ہے؟ اس لیے کہ وہ تو ذکر ہی ان چیزوں کا کرتا ہے۔

کھیتی کی مثال کے بعد پہاڑوں کی مثال، چٹانوں کی مثال

عزیزانِ من! اگلا ٹکڑا یہ ہے کہ **وَ مِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّ حُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَ غَرَابِيْبُ سُوْدٌ**(35:27) ان کو چھوڑ دیجیے یہ تو روز بارش برستی ہے، اس کے اندر سے اگتا ہوا نظر آ جاتا ہے۔ پہاڑوں کی طرف جاؤ، ان کی چٹانوں کو دیکھو۔ عزیزانِ من! ہم کیا دیکھیں گے!!! یہاں بھی جو اس سائنس کے طالبعلم یا اس سائنس کو جاننے والے ہیں، ان سے پوچھو وہ پہاڑوں کی چٹانوں میں جا کر کیا کیا پڑھتے ہیں، ہمیں تو یونہی ایک چٹان سی نظر آتی ہے، اس میں مختلف طبقات ہوتے ہیں، ان طبقات سے ان کی عمر کا پتہ چلتا ہے، ان کی خاصیتوں کا پتہ چلتا ہے، یہ ایک بہت بڑا علم ہے کانوں (Mines) ہی کا نہیں بلکہ جو باہر کھڑی ہوئی چٹانیں ہوتی ہیں، ان کے متعلق بڑی تحقیق ہوتی ہیں۔ قرآنِ کریم چودہ سو سال پہلے، جب کسی کے ذہن میں بھی نہیں ہوسکتا کہ پہاڑوں کی یہ چٹانیں بھی اس قابل ہیں کہ وہاں دیکھا جائے کہ الدین کس طرح سے کارفرما ہوتا ہے، کہتا ہے کہ ان کو دیکھو، تم تو یونہی دیکھتے ہو کہ کچھ ان میں سے سفید ہیں،

---

[1] اگر یہ اُگتا بھی ہے تو برسات کی یہ جو کھمبیاں پیدا ہوئی ہیں وہ ہیں جو یہ اکھاڑ دیتے ہیں

کچھ سرخ ہیں، کچھ کالے بھجنگ ہیں، تم تو اتنا ہی دیکھتے ہو۔ آگے ایک لفظ آتا ہے، وہ آئے گا تو میں عرض کرونگا کہ کیا کہا ہے۔ تم تو اتنا ہی دیکھتے ہو، ان سے پوچھو جو اس کی تحقیق کرتے ہیں کہ یہ جو اس میں سے مختلف رنگ نظر آتے ہیں، ان کے معنی کیا ہیں، اُنہوں نے کس کس قسم کے قوانین کی اطاعت کی اور اس کے اندر سے یہ تغیر پیدا ہوا۔

کائنات کے اندر شعبۂ بیالوجی (Biology) کی مثالیں

اسی طرح سے کہا کہ **وَ مِنَ النَّاسِ وَ الدَّوَآبِّ وَ الْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ** (35:28) انسانوں کی دنیا کے اندر جاؤ، حیوانات کی دنیا کے اندر جاؤ، اور جاندار چیزیں ہیں کہ جو رینگنے والے بھی ہیں۔ **دو آب** میں ہر قسم کی جاندار چیز آجاتی ہے، یہ ساری چیزیں، جتنی بھی ہیں ان کے اندر جاؤ۔ بیالوجی (Biology) کی طرف آ گئیں جاندار چیزیں، **انعام** کی طرف آ گئیں، حیوانات کے متعلق الناس کے متعلق، اور جس قسم کی جاندار چیزیں ہیں۔ عزیزانِ من! علوم کا کونسا حصہ ہے جو بنیادی طور پہ چھوڑ دیا ہو۔ اس کے اندر قرآن نے بارش کے متعلق، زمین کے، متعلق، زراعت کے متعلق، پہاڑوں کے متعلق، چٹانوں کے متعلق، انسانوں کے متعلق، **انعام** کے متعلق، دیگر جاندار اشیاء کے متعلق، تمام چیزوں کے متعلق کہا ہے، کچھ نہیں چھوڑا۔

قرآنِ حکیم نے کائنات کا علم حاصل کرنے والوں کو علما کہا ہے

پتہ ہے آگے کیا کہا ہے؟ ہمارے ہاں علمائے کرام کا لفظ تو ایسا عام ہو گیا ہوا ہے۔ کسی بات کے متعلق ان سے پوچھیے، کہتے ہیں کہ اب علما کا یہ فیصلہ ہے، اب اس کے بعد کسی اور کا کوئی فیصلہ قابلِ قبول نہیں۔ علما عالم کی جمع ہے۔ سوال یہ ہے کہ قرآن میں بھی کہیں یہ علما آیا ہے اور اُس نے کن کو علما کہا ہے؟ علما تو وہ ہونگے جنہیں وہ علما کہے۔ قرآن میں دو ہی مقامات کے اوپر علما کا لفظ آتا ہے۔ ایک تو علمائے بنی اسرائیل ہیں، ان کو تو چھوڑ دیجیے، وہ ان کے تھے، یہاں (35:28) میں علما کا لفظ آیا ہے۔ سنیئے، دیکھ رہے ہیں کیا کیا گنائے جا رہا ہے! پھر دہرا دوں فضا کے متعلق علم، بارش کے متعلق علم، زراعت کے متعلق علم، چٹانوں کے متعلق علم، انسانوں کے، **دو آب** کے، **انعام** کے، ان تمام علوم کے بعد کہا ہے کہ **اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا** (35:28) عوام تو ان کو دیکھ کر آگے گزر جاتے ہیں، علما کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ان کے اوپر غور کرتے ہیں تو خدا کی عظمت سے تھر تھرا اٹھتے ہیں۔ کون ان پہ غور کرتے ہیں؟ ان علوم کے متعلق کہا گیا کہ وہ کیا چیز ہے جس سے وہ کانپ اٹھتے ہیں دیکھتے ہیں کہ کیا کہا گیا ہے!

اجرامِ فلکی کے نظم وضبط کا حیران کن سسٹم اور اس پر کنٹرول کی کیفیت

کہا کہ **اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ** (35:28) وہ یہ دیکھتے ہیں کہ اس کا غلبہ اتنا ہے کہ کوئی اس کے قانون سے سرتابی نہیں کرسکتا۔ کس

قدر محیر العقول یہ کائنات ہے۔ اجرامِ فلکی میں سے ایک ایک کو دیکھو۔ اگر ان میں ذرا سی بھی رفتار کا' ایک سیکنڈ کے کروڑویں حصے کا بھی' فرق آ جائے' سارے کرّے ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو جائیں' زمین پاش پاش ہو جائے۔ کہتا ہے کہ وہ یہاں اتنا صاحبِ غلبہ ہے کہ اُس نے ان کو قانون کی زنجیروں میں جکڑ کر رکھا ہے وہ غَفُوْرٌ ہے اس کے ساتھ حفاظت کا سامان بھی اُس نے کر رکھا ہے کہ محفوظ بھی رہیں۔ کہا کہ یہ جو ساری چیزیں ہیں' ان پہ غور اور تحقیق کے بعد جو علما ہیں' وہ کہتے ہیں کہ کیا بات ہے! وہ خدا کی عظمت سے کانپ اٹھتے ہیں۔ علما کا لفظ یہاں آیا ہے۔ عالم کی جمع علما بھی آتی ہے' عالمون' عالمین بھی آتی ہے۔ یہ دیکھیے اس نے دوسری جگہ عالمین کہا ہے۔ (30:22) سے بات شروع کرتے ہیں۔ پہلی چیز یہ ہے کہ میں اشارہ کرتے ہوئے چلا جاؤں گا کیونکہ مجھے عالمین پہ پہنچنا ہے۔

نسلِ انسانی کے سلسلہ میں ازدواجی تعلقات' رنگوں کا' زبانوں کا' اختلاف اور ارض وسما کی تخلیق

بات یہاں سے شروع کی کہ وَ مِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ (30:20) یہ جو تخلیقِ انسانی ہے' کہا کہ یہ بھی خدا کی حقیقت کو سمجھنے کی ایک نشانی ہے۔ وَ مِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا (30:21) پھر اس کے بعد یہ جو سلسلہ ازواج کا بنایا ہے' ہم نے مؤنث مذکر بنائے' ان کے اختلاط سے نسل آگے بڑھتی ہے بیالوجی (Biology) اسے کہتے ہیں۔ یہ بھی خدا کی آیات میں سے ہیں۔ وَ مِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَ اَلْوَانِكُمْ (30:22) اور پھر یہ بھی کہ تخلیقِ ارض وسما' انسانوں کی دنیا میں زبانوں کا اور رنگوں کا اختلاف ہے۔ سورۃ فاطر کے وہ علوم جو میں نے گنائے تھے' ان کو پہلے سامنے رکھیے' ان کی لسٹ میں تخلیقِ انسانی کا بھی اضافہ کر لیجیے اس کے بعد یہ جنسیات ہے' اس کے بعد تخلیقِ ارض وسما ہے' اس کے بعد اختلافِ السنہ و الوان ہے یعنی ہم لوگ تو چونکہ کبھی اس طرف آتے ہی نہیں ہیں' اس سے تو ہم حرفوں کو یہی لیتے کہ کتنی نیکیوں کا ثواب ملا۔ ان سے پوچھو یہ اختلافِ السنہ کے اوپر جو یورپ کے محققین نے تحقیق کی ہے کہ زبانوں کا جو اختلاف ہے' وہ کتنی بڑی سائنس ہے اور کس طرح سے اختلاف ہوتا ہے۔ الوان میں یہ مختلف Races (نسلیں) جتنی بھی ہیں جو مختلف رنگ ہیں ان کے پیچھے کیا کیا قوانین کارفرما ہیں' ان لوگوں نے اس کے اوپر جو تحقیق کی ہے' عزیزانِ من! پوچھو نہیں! ان چیزوں کے اوپر تو Encyclopedia لکھ دیا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ہماری حقیقت تک پہنچنے کی ان کے اندر بھی نشانیاں ہیں۔ اور آگے کہا ہے کہ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ (30:22) ان میں تو عالم' وہی عالم کی جمع عالمین' یعنی علما ہیں ان کے لیے غور وفکر کی نشانیاں ہیں۔ اُنہیں لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ کہا جو غور وفکر سے کام لیتی ہے لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ کہا جو قوم عقل اور علم سے کام لیتی ہے لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ کہا جو سماعت اور بصارت سے کام لیتی ہے۔ یہ ہیں عالمین' یہ ہیں جن کو ہماری ان نشانیوں میں حقیقت نظر آتی ہے۔

ہمارے ہاں تو سائنٹسٹ کو علما کی لسٹ میں شامل ہی نہیں کیا جاتا

عزیزانِ من! آپ غور کیجیے کہ جو علما اور عالم ہیں' قرآن نے کس کو پکارا ہے؟ آج کی زبان میں اگر اس کا ترجمہ سائنٹسٹ نہیں ہے تو اور اس کا کیا ترجمہ ہوسکتا ہے لیکن ہمارے علما تو علمائے کرام ہیں' Scientists (سائنس دان) تو علمائے کرام نہیں ہوتے۔ پہلے ان کے ہاں کے علما کی بات سن لیجیے' کوئی مسئلہ' کوئی معاملہ' پیش ہو' بجائے اس کے کہ وہ یہ کہیں کہ کسی صاحبِ علم سے پوچھیں' کسی سائنسدان سے پوچھیں' اس فن کا جو عالم ہے اس سے پوچھیں' وہ سب سے پہلے اسے اپنے ہاں اپنے حجروں میں لے جاتے ہیں کہ شریعتِ حقہ کا اس کے متعلق کیا فیصلہ ہے' آیا یہ حرام ہے یا حلال؟ اور پھر اس کے متعلق فتویٰ صادر کردیتے ہیں۔ آج ایک بہت بڑی نعمت ہے کہ مرنے والے آنکھوں کا عطیہ دیتے ہیں کہ اس کی وہ آنکھ جس میں بینائی ہوتی ہے' کسی دوسرے نابینا کے لگادی جائے۔ اس پر بھی فتویٰ ہے کہ آیا یہ حلال ہے یا حرام؟

ہمارے علما کے نزدیک تو آنکھ کا عطیہ دینا بھی حرام ہے

عزیزانِ من! اس عطیے سے ہوتا یہ ہے کہ وہ فوراً ہی' ایک طریقے سے اندھے کی آنکھ میں جہاں بینائی ختم ہوجاتی ہے' وہ اسے وہاں لگا دیتے ہیں' وہ دیکھنے لگ جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس سے بڑی خدا کی رحمت اور کیا ہوگی' اور اس کا کچھ نہ جائے جو مر رہا ہے' اس نے مرنے کے بعد آنکھ کیا کرنی ہے' جہاں باقی جسم کے حصوں کو کیڑوں نے کھا جانا ہے' وہاں وہ آنکھ بھی ختم ہوجانی ہے' اس کا کچھ نہیں جاتا مگر یہاں ایک اندھے کو بینائی مل جاتی ہے عزیزانِ من! مجھ سے نہ پوچھو' قرآن سے پوچھو' وہ کہتا ہے کہ دیکھنے والا اور اندھا کبھی برابر نہیں ہوسکتے' وہ بینائی اس کو مل جاتی ہے۔ دنیا میں اس علم کی دھوم مچ گئی ہے۔ سب سے بڑا کافر مُلک جو سیلون ہے' اُنہوں نے اپنے ہاں آئی بینک "Eye Bank" بنا رکھا ہے سب سے زیادہ ان کے ہاں وہ لوگ اپنی Eyes (آنکھیں) Donate (عطیہ) کرتے ہیں' وہ دنیا کے مختلف علاقوں میں جہاں یہ بینک نہیں ہے وہاں جاتی ہیں۔ وہ ان کو سپلائی کرتے ہیں' وہ وہاں سے آنکھ بھیجتے ہیں جہاں یہ شریعت زیادہ زوردار ہے' یہاں وہ آنکھ بجائے اس کے کہ ڈاکٹر کے کلینک میں پہنچے' فتویٰ گاہ میں پہنچ جاتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ یہ آنکھ لگانا شریعت کی رو سے حرام ہے' اس سے ایک نابینا دیکھ کیوں لے۔ شریعت کے مطابق تو یہ ہے کہ ہر دیکھنے والے کو اندھا کردیا جائے' انہوں نے ہم سب کو اندھا کیا ہوا ہے۔ اگر اندھا دیکھنے لگ جائے' تو واقعی ان کی شریعت کی رو سے تو یہ ناجائز ہے' اس پہ فتوے لگے ہوئے ہیں۔

مودودی مرحوم کے نزدیک آنکھ ہی نہیں بلکہ جسم کا ہر حصہ بطورِ عطیہ دینا حرام ہے

یہ پرانے زمانے کے جو آپ کہیں گے دقیانوسی قسم کے کوئی علما ہونگے جنہوں نے یہ فتوے دیئے ہونگے۔ نہیں صاحب! یہ آپ کے

ہاں کے Latest, Modern مرحوم (ابوالاعلیٰ) مودودی صاحب (1979-1903) کا فتویٰ موجود ہے' وہ آنکھ ہی کو نہیں' وہ تو جامع جسم کے متعلق بھی یہ حرام کہتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک کا دل' دوسرے میں داخل کر دینا' ایک کا جگر دوسرے میں لگا دینا' اب یہ سب چیزیں آ رہی ہیں' یہ سب حرام ہے' یہ سب ناجائز ہے۔

مفتی محمد شفیع مرحوم کا فتویٰ: لاؤڈ اسپیکر کا استعمال حرام ہے

بات تو یہاں علما کی ہو رہی ہے کہ وہ معاملہ پہلے ان کے ہاں جاتا ہے۔ مثلاً جب یہ لاؤڈ اسپیکر نیا نیا ایجاد ہوا تو یہ ان کی فتویٰ گاہ میں پہنچا۔ یہ تقسیمِ ہند سے پہلی کی بات ہے' 1941ء کی بات ہے' مفتی محمد شفیع مرحوم (1976-1897)' دو چار سال ہوئے ان کا انتقال کراچی میں ہوا ہے' دیو بند میں مفتی اعظم تھے' ان کے ہاں یہ بات پہنچی کہ لاؤڈ اسپیکر کا استعمال شرعاً جائز ہے یا ناجائز؟ لاؤڈ اسپیکر اب مفتی صاحب (مرحوم) کے سامنے آیا' تو بات ان کی سمجھ میں نہ آئی کہ یہ ہے کیا۔ کہنے لگے کہ نہیں! میں تو جب تک تحقیق نہ کرلوں گا اس وقت تک اس کے متعلق فتویٰ نہیں دے سکتا' بڑی ہی ذمہ داری کا کام ہے صاحب! لاکھوں کروڑوں انسانوں کے ایمان کے متعلق معاملہ ہو رہا ہے' مجھ پر تو بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اب اُنہوں نے تحقیق شروع کی۔ اُنہوں نے ایک رسالہ لکھا' اس رسالے کا نام ہے ''البدایہ الفیدہ حکم الثنایہ الجدید''۔ جی! لاؤڈ اسپیکر کے متعلق فیصلہ ہو رہا ہے۔ اسے جتنے بڑے لاؤڈ اسپیکر میں جی چاہے' پڑھ کر دیکھیے' حرام ہے جو آپ کے سمجھ میں آ جائے۔ یہ ہے اس رسالے کا نام۔ اُس میں اُنہوں نے یہ لکھا ہے کہ بات میری سمجھ میں آ نہیں سکتی تھی' میں نے اس کی تحقیق کی۔ اس تحقیق کے لیے کہتے ہیں کہ میں نے الیگزنڈر ہائی اسکول بھوپال کے سائنس ماسٹر مسٹر برج نندن لال صاحب کے پاس بات بھیجی۔ شریعت کا فیصلہ ہو رہا ہے اور سائنٹسٹ کتنا بڑا ہے: الیگزنڈر ہائی اسکول بھوپال کا سائنس ماسٹر ہے۔ اس کے پاس بھیجا۔ اُنہوں نے اس کا جواب بھیجا۔ جواب سے پہلے یہ سن لیجیے کہ اس قسم کے جو محقق تھے وہ گاؤں میں ہوتے ہیں ان کو لال بجھکڑ کہتے ہیں۔ ہر بات جو گاؤں میں نئی ہوتی ہے' وہ ان کے پاس پوچھنے کے لیے چلے جاتے ہیں کہ حضرت! یہ کیا بات ہے۔

اب سنیے ایک حکایت کہ ایک دن گاؤں میں کہیں ہاتھی آ گیا وہ علاقہ تھا جہاں ہاتھی ہوتے نہیں تھے' ان کی سمجھ میں بات نہ آئی' بھاگے لال بجھکڑ کے پاس کہ یہ کیا ہے؟ بات سن کر وہ رونے لگ گیا' یہ بھی انہیں دیکھ کر رونے لگ گئے۔ یہ پوچھا کہ صاحب! آپ رو کیوں رہے تھے۔ کہنے لگا کہ اس لیے رو رہا تھا کہ اب تو جو آپ کو اس قسم کی مشکل درپیش ہوتی ہے' آپ بھاگے بھاگے میرے پاس آ جاتے ہیں کہ بتا دیجیے' میں بتا دیتا ہوں' میرا خیال ہوا کہ بھئی! زندگی ہے انسان ہی تو بالآخر ہے' میں جو کل کو مر جاؤں گا تو پھر تم یہ پوچھنے کے لیے کس کے پاس جایا کرو گے' تمہارے اس غم سے میرے آنسو نکل جاتے ہیں۔ اُنہوں نے بھی آنسو پونچھے انہوں نے بھی۔ کہا کہ حضرت صاحب! پھر بتا دیجیے کہ یہ کیا ہے۔ کہنے لگے ''او تے مینوں وی پتہ نئیں ہیگا''' یعنی اس کا تو مجھے بھی علم نہیں ہے۔

ہاں تو' عزیزانِ من! انہوں نے برج نندن لال صاحب کو جو بھیجا' اُنہوں نے جواب لکھ کر بھیجا کہ ''برقی قوت کی وجہ سے میں تو کم ازکم یہ ماننے میں تامل کرتا ہوں کہ اصلی آواز ہے اور اس کا انکار بھی مجھ سے ممکن نہیں کہ ثبوت مشکل ہے''۔ اُدھر سے یہ آیا جواب اور اس تحقیقِ انیق کے بعد مفتی صاحب نے فتویٰ دیدیا کہ عبادات کے لیے لاؤڈ اسپیکر کا استعمال شریعت کی رو سے حرام ہے' کروڑوں انسانوں کے ایمان کا اس کے ساتھ تعلق ہے' اگر وہ اس کے بعد اس کو وہاں استعمال کرتے ہیں تو یہ شریعتِ حقہ سے سرکشی ہے۔ اندازہ لگایئے! رکتے ہیں تو اتنی بڑی جو مفید چیز ہے' اُسے اپنے اوپر حرام قرار دیتے ہیں۔ تو اتنی جو ذمہ داری تھی' تحقیق کے بعد ہی اس کے متعلق فیصلہ دینا تھا اُنہوں نے یہ فیصلہ دیدیا۔ یہ 41-1940ء کی بات ہے کیونکہ 1941ء کے ''طلوعِ اسلام'' میں یہ سارا درج ہوا تھا۔ وہ لاؤڈ اسپیکر جناب احرام ہوگیا۔ اب ہر مسجد میں ایک ایک لاؤڈ اسپیکر نہیں بلکہ گلی کی اتنی سی مسجد میں بھی چار چار لاؤڈ اسپیکر لگے ہوئے ہیں۔ یہ نمازوں میں' عیدوں میں' عید کے خطبوں کے اندر' جمعہ کے خطبہ کے اندر' نماز کے اندر' امام صاحب کے سامنے پڑا ہوتا ہے۔ اُنہی مفتی صاحب کے بھی سامنے یہی کچھ ہوتا تھا' وہ کراچی تشریف لے آئے تھے' اب تو وہ مرحوم ہو چکے ہیں' یہ فتویٰ بھی موجود ہے اور یہ سب کچھ موجود ہے حتیٰ کہ اب اگر کبھی حکومت اپنی کسی مصلحت کی بنا پہ اس پہ پابندی لگا دیتی ہے تو اُس پابندی کے خلاف Protest (احتجاج) ہوتا ہے۔ کسی نے مجھے بتایا تھا کہ کسی امام صاحب کی طرف سے کوئی مقدمہ چل رہا ہے کہ حکومت نے یہ جو پابندی لگائی کہ اذان اور خطبے کے سوا لاؤڈ اسپیکر کے استعمال پہ پابندی ہے' تو اُنہوں نے اس کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا کہ یہ تبلیغِ دین کے خلاف ہے' ہم اسے نہیں مانتے۔ وہ جو یہاں تک حرام تھا مفتی صاحب کے فتوے کی رو سے' وہ فتویٰ موجود ہے' اب اس کی کیفیت یہ ہے کہ اگر حکومت کسی مصلحت کی بنا پہ کبھی کہتی ہے کہ اس کا یوں استعمال حرام ہے تو اس کے خلاف وہ Protest (احتجاج) کرتے ہیں کہ حرام نہیں ہے' کہو کہ حلال ہے۔ ہم جانتے ہیں' ہم کرتے ہیں ''تسی مامے لگدے ہیگے او[1]'' اسی کے متعلق کہہ رہے ہیں کہ تمہیں اس سے کیا۔

کوئی محمل نشیں کیوں شاد یا ناشاد ہوتا ہے
غبارِ قیس خود اٹھتا ہے خود برباد ہوتا ہے

دارالعلوموں' مکتبوں اور مدرسوں کے تعلیم یافتہ طالب علموں کی حالت زار

یہ علما حضرات آپ کو پتہ ہے کہ علما کیسے بنتے ہیں۔ یہ آج کی بات نہیں ہے' یہاں کے ایک حافظ نذر احمد صاحب ہیں' اُنہوں نے 1972ء اسلامی دارالعلوموں' مکتبوں اور مدرسوں کا کچھ جائزہ لیا تھا۔ اُنہوں نے اس جائزے پر بڑی موٹی ایک کتاب شائع کی تھی اُنہوں

---

[1] تمہارا اس سے کیا واسطہ۔

نے بڑی محنت سے جائزہ لیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ یہ دار العلوم' مکتب اور مدرسے تعداد میں 135 سے 900 ہو گئے اور اس زمانے میں ان میں پینتالیس ہزار طلبا تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اور ان میں سے ہر سال جتنے پاس ہو کر نکلتے ہیں' وہ تو آپ کو معلوم ہے کہ معاش کے اعتبار سے ان کے پاس ایک وقت کی روٹی کمانے کا بھی ڈھنگ نہیں ہوتا' کوئی ہنر ہی نہیں ہوتا۔ مسجد کی امامت اور خطابت ہی تو ہوتی ہے' مسجدوں میں پہلے ہی امام اور خطیب موجود ہوتے ہیں' تو اب یہ کیا کریں؟ اس کے لیے پھر ایک نئی مسجد بنانی ہوگی۔ اگر وہ اسی قسم کی یا اسی عقیدے کی مسجد ہے جس میں وہ پہلے امام صاحب موجود ہیں تو محلے کے نمازی کہیں گے کہ اس مسجد میں ہم پہلے سے جاتے ہیں' جگہ بھی موجود ہے' وہاں ہم جا کر پڑھتے ہیں' الگ کی کیا ضرورت ہے۔ وہ پہلے فیصلہ کرے گا کہ نہیں! یہ جو تمہیں نماز پڑھاتا ہے یہ نماز نہیں ہوتی' تمہاری سب نمازیں اکارت چلی گئیں' میں اس لیے بنا رہا ہوں کہ تمہاری نمازیں شریعت کے مطابق ہوں' ایلوپیتھک نال تہانوں آرام نئیں' تہانوں اونڑا ہومیو پیتھک کرو[1]' وہ اپنی ایک مسجد کھڑی کر دیتا ہے۔ وہ جو ہر سال ان اداروں سے فارغ التحصیل ہو کر نکلتے چلے آتے ہیں' غور کرنے کی چیز ہے۔ یہ تھے اس جائزے کے نتائج۔

1972ء میں نو سو دار العلوموں کے پینتالیس ہزار طالب علموں کے لیے 80 لاکھ روپے کا بجٹ

عزیزانِ من! ان کے خلاف کوئی بات نہیں ہے یہ قوم کا مسئلہ ہے۔ اس زمانے میں اُنہوں نے یہ لکھا تھا کہ وہ جو اس زمانے کے صرف نو سو تھے' ان کا بجٹ اسی لاکھ روپے بنتا ہے۔ اب آج دیکھ لیجیے کہ اس کی کیا صورت ہوتی ہے۔ نو سال کا کورس ہوتا ہے' اس میں ان کے نصاف کو دیکھ لیجیے' ان اداروں میں پڑھایا کیا جاتا ہے؟ صرف' نحو' عروض' منطق' فلسفہ علمِ کلام' ہیئت' مناظرہ' اصولِ فقہ' فرائض اور آخری سال میں قرآنِ کریم' اس کی بھی ایک بیضاوی کی تفسیر ہے اس میں وہ سورۃ البقرۃ پڑھاتے ہیں۔ اور اس کے بعد ان کو اس چیز کی سند مل جاتی ہے کہ اس امت پر یہ علمائے کرام جس چیز کو چاہیں حرام قرار دیدیں' جسے چاہیں حلال قرار دیدیں۔ قرآن یہاں انہیں کہتا ہے کہ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ (35:28) ان علوم کے جاننے والوں کو قرآن عالم کہہ رہا ہے' عزیزانِ من! میں تو نہیں کہہ رہا۔ یہ لوگ خدا کے عزیز ہونے کی' اس کے غفور ہونے کی علیٰ وجہ البصیرت شہادت دیتے ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ وہ پیرس کا ڈاکٹر مورس بوکائے (1911-1989) ہے' اس کی کتاب[2] ذرا پڑھ کر دیکھیے کہ وہ شخص کیا کر گیا ہے۔ اور یہ حضرات ہیں کہ یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ یہ دیکھنے والی جو ایک آنکھ ہے' اسے کسی دوسرے اندھے کی آنکھ میں لگا دینا بھی ناجائز ہے۔

---

[1] ڈاکٹری علاج (ایلوپیتھک) سے آپ کو شفا نہیں ملتی' ہومیو پیتھ طریقہ سے علاج کراؤ۔

[2] اسکی محوالہ کتاب یہ ہے:

Bucaille, Maurice (1998). The Bible, The Qur'an And Science. Lahore:Islamic Book Service.

لفظ تلاوت کا مفہوم پڑھنا نہیں بلکہ پیروی کرنا ہے

کہا کہ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَتۡلُوۡنَ کِتٰبَ اللّٰہِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اَنۡفَقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ سِرًّا وَّ عَلَانِیَۃً یَّرۡجُوۡنَ تِجَارَۃً لَّنۡ تَبُوۡرَ (35:29) یہاں یَتۡلُوۡنَ کِتٰبَ اللّٰہِ آیا ہے۔ ہمارے ہاں تلاوت کے معنی پڑھ لینا لیے جاتے ہیں۔ عربی زبان میں تلاوت کے معنی ہوتے ہیں ''کسی کی پیروی کرنا' کسی کے پیچھے چلنا''۔ تلاوتِ قرآنِ کریم کے معنی ہیں ''قرآنِ کریم کی پیروی کرنا' اس کا اتباع کرنا' پڑھنا تاکہ اس کو سمجھا جائے' سمجھنا تاکہ اس کا اتباع کیا جائے' یہ ہے ضروری چیز''۔ یہ جو لوگ ہیں ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ صلوٰۃ کا نظام قائم کرتے ہیں' جو کچھ انہیں خدا نے دیا ہے اسے کھلا رکھتے ہیں یہ انفاق فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہ بڑا جامع لفظ ہے۔

رزق کا قرآنی مفہوم بڑا پُر معنی ہے

عرب رزق صرف کھانے پینے کی چیزوں کو نہیں کہتے' عربی زبان میں انسان کی یہ جو Physical Wants ہوتی ہیں یعنی جسم کی پرورش' نشوونما اور انسانی صلاحیتوں کی نشوونما' یہ سب اس میں آتی ہیں۔ یہ بڑا لطیف ہے۔ میں نے کہا تھا کہ عربی زبان تو عجیب چیز ہے۔ رزق کے معنی ہیں کہ جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کی نشوونما کا ایسا سامان ملنا' اُس میں شرط یہ ہے کہ یہ بروقت دیا جائے۔ کہا کہ اس کام کے لیے جو کچھ ان کے پاس ہوتا ہے اسے وہ کھلا رکھتے ہیں' سِرًّا وَّ عَلَانِیَۃً (35:29) دکھاوے کے لیے نہیں' ضرورت کے ماتحت وہ سب کچھ دیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ نظر تو آتا ہے کہ یہ دیئے چلے جا رہے ہیں۔

نظامِ سرمایہ داری میں Wages (اجرتوں) کا سسٹم بدترین سسٹم ہے

یہ ایسی تجارت کرتے ہیں جس میں ان کو کبھی گھاٹا نہیں پڑتا' ورنہ نظر تو یہ آتا ہے کہ ہم تو دیئے ہی چلے جا رہے ہیں' ملتا تو کچھ نہیں۔ کہا کہ نہیں' اس تجارت میں ان کو کبھی نقصان نہیں ہوتا' کبھی گھاٹا نہیں پڑتا۔ کہتا ہے سنو کہ لِیُوَفِّیَہُمۡ اُجُوۡرَہُمۡ (35:30) یہ تجارت کیسی ہے؟ ایک تو یہ چیز ہے کہ ان کی محنت کا یہ صلہ یا معاوضہ ہے' وہ پورا پورا مل جاتا ہے' کارخانے کا مالک اس میں سے کچھ کاٹ ہی نہیں سکتا۔ میں نے کہا تھا کہ Wages (اجرتوں) کا یہ سسٹم' بدترین سرمایہ داری کا سسٹم ہے' یہ سپلائی اینڈ ڈیمانڈ (طلب اور رسد) پر ہے' مزدور زیادہ ہیں سامان کم ہے' وہ مزدور جس بھاؤ پہ بھی آپ دیکھیں گے' وہ بیچارہ مزدوری کرنے آ جائے گا وہ تو بھوکا ہے' اجرت یہ مقرر کریں گے جو اوپر کے Employ (ملازم) کرنے والے ہیں۔ روز کی کیا دیہاڑی ہے' وہ نہیں طے کرتے جو مارکیٹ میں آ کے مزدور بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں یہ Wages (اجرتیں) ہوتی ہیں' محنت کا معاوضہ یا صلہ نہیں ہوتا' یہ Wages (اجرتیں) مقرر کی ہوئی ہوتی ہیں جن میں مزدور کا کوئی عمل دخل ہی نہیں ہوتا۔

قرآنِ حکیم اپنے ہاں انسان کو معاوضہ کی بجائے ماحصل کے نظام سے متعارف کراتا ہے

قرآن نے کہا ہے کہ لِيُوَفِّيَهُمْ (35:30) محنت کا ماحصل پورے کا پورا' اس محنت کرنے والے کا ہوتا ہے۔ ایک تو محنت کا ماحصل ہو گیا' کہا کہ وَ يَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ (35:30) اگر اس میں اس کی ضروریات پوری نہ ہوتی ہوں' تو پھر اور بھی زیادہ دیدیا جاتا ہے۔

عدل کے ساتھ احسان کا بھی حکم ہے

مقصد تو ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کا ہے' اس کے ذمے کچھ کام لگائے' اس نے اپنی پوری محنت سے وہ کام سرانجام دیا' اس سے کچھ پیدا ہوا' ٹھیک ہے ضرورت سے جو زیادہ ہے یہ خود ہی دیدیگا کہ اس کو دیدیجیے جس کی ضرورت پوری نہیں ہوتی اگر اس سے کم ہے تو وہ ہم اس کو دیدیں گے۔ قرآنِ کریم نے' عزیزانِ من! عدل اور احسان کا حکم دیا ہے۔ یہ فرض قرار دیا ہے۔ کہا ہے کہ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ (16:90) عدل تو یہی ہے کہ جو محنت کی ہے' اس محنت کا جو ماحصل سے ملا ہے' یہ تو عدل ہے لیکن اگر اس سے ضرورت پوری نہیں ہوتی تو احسان کے معنی ہیں ''اس کی جو کمی ہے وہ پوری کردی جائے''۔ کہا کہ وَ يَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ (35:30) حفاظت کرتا ہے کہ کسی کی محنت کو کوئی غصب کر کے نہ لے جائے۔ شکور کے معنی ہیں ''بھرپور نتائج پیدا کرنے والا' ایسے بھرپور جس طرح یہ اس بکری کو کہتے تھے کہ چلتے ہوئے اس کے تھنوں سے دودھ خود ٹپکتا چلا جائے یعنی وہ بکری دودھ سے اتنی لبریز ہو' وہ کہتا ہے کہ وہ ہے شکور۔

قرآنِ حکیم کا معاشی نظام پوری انسانیت کی ربوبیت کا ضامن ہے

کہا ہے کہ وَ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ اِنَّ اللّٰهَ بِعِبَادِهٖ لَخَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ (35:31) ہم جانتے ہیں کہ انسانوں کو کس چیز کی ضرورت ہے۔ ہم اس اعتبار سے ان کے احوال اور کیفیات کو دیکھتے ہیں اور تجھے یہ ڈائریکشن یا ہدایات دیتے چلے جاتے ہیں ہم نے یہ کچھ وحی کے ذریعے دیا۔ وحی کے سوا کوئی بھی نظام ایسا نہیں' عزیزانِ من! جو پوری عالمگیر انسانیت کی ربوبیت کا ضامن بن سکے۔ ہر نظام انسان اور انسان میں فرق کرے گا' قوم اور قوم میں فرق کرے گا' پارٹی اور پارٹی میں فرق کرے گا' فرد اور فرد میں فرق کرے گا لیکن یہ جو رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ہے وہ تو وحی کے ذریعے نظام دیتا ہے' اس میں تو کفر اور ایمان کا بھی امتیاز نہیں ہے۔

ان دونوں میں کیوں فرق نہیں ہے؟ اس لیے کہ کھڑک سنگھ بھی اگر اپنی زمین کو زراعت کے قانون کے مطابق کاشت کے قابل بنا کر اس کی حفاظت کرتا ہے' اس کی زمین بھی اتنی فصل دیتی ہے جتنی عبداللہ کی زمین فصل دیتی ہے' یہ ربوبیتِ عالمینی ہے۔ کفر اور ایمان کا

فرق تو اس رزق کی تقسیم میں جا کر پڑتا ہے کہ وہ کس مقصد کے لیے اس کو صرف کرتا ہے۔ وحی کے ذریعے سے ہم نے یہ ہدایات دیں۔ وحی وہ ہے جو ہم کہتے ہیں کہ ان دعاوی کو سچا کر دکھانے والی ہے۔ اس سے پہلے بھی ہم نے یہی چیزیں وحی کے ذریعے انبیائے کرام کو دی تھیں ' ان کی قوموں نے ان کو سچا کر کے نہیں دکھایا' یہی ہم تمہیں دے رہے ہیں کہ ان دعاوی کو سچا کر کے دکھا۔ **مُصَدِّقًا** کے معنی ہوتا ہے ''سچا کر کے دکھانا'' ورنہ یہ بڑا اعتراض پڑتا ہے۔ ہمارے ہاں پہلے یہ اعتراض اٹھاتے ہیں' پھر جواب نہیں بن پڑتا' یہ کہتے ہیں کہ قرآن سابقہ کتابوں کی تصدیق کرتا ہے۔ قرآن خود سابقہ کتابوں کو محرف کہتا ہے کہ وہ تو تحریف شدہ کتابیں ہیں' ان میں کوئی کتاب بھی اپنی اصلی شکل میں نہیں ہے۔ ایک طرف وہ ان کتابوں کے متعلق یہ کہتا ہے' دوسری طرف ان کی تصدیق بھی کرتا ہے۔ عزیزانِ من! مصدق کے معنی ہوتا ہے ''سچ کر کے دکھانے والا''۔ ان محرف کتابوں میں بھی یہ وعدے کیے گئے تھے' پھر ان کی امتوں نے سچ کر کے نہ دکھایا' ہم نے اس لیے دیا ہے کہ سچ کر کے دکھاؤ۔ کہا کہ **اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ** (35:31) رسول اللہ ﷺ کی طرف یہ وحی کی۔ کیا اب رسول اللہ ﷺ کے بعد اس وحی کی نشر و اشاعت کا یہ قصہ ختم ہو گیا؟ کہا کہ نہیں!

دینِ خداوندی شخصیات سے وابستہ نہیں ہوتا

عزیزانِ من! دیکھیے' اس میں ہماری ذمہ داری کیا آتی ہے؟ رسول کے بعد قرآنِ کریم نے یہ کہا کہ **ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْکِتٰبَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْھُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِہٖ وَ مِنْھُمْ مُّقْتَصِدٌ ج وَ مِنْھُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَیْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰہِ ذٰلِکَ ھُوَ الْفَضْلُ الْکَبِیْرُ** (35:32) یہ نہ سمجھ لینا **وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِہِ الرُّسُلُ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓی اَعْقَابِکُمْ** (3:144) رسول بھی بالآخر ایک بشر ہے' ہر انسان کی طرح ایک دن اس نے بھی مرنا ہے۔ اگر کل کو یہ مر جائے یا قتل کر دیا جائے تو تم یہ سمجھو گے کہ دین تو اس کی شخصیت کے ساتھ وابستہ تھا' وہ نہیں رہا تو دین ختم ہو گیا۔ تو کیا تم یہ سمجھ لو گے؟ اس کے بعد تو کوئی دوسرا نبی بھی نہیں آنا اور تم یہ سمجھ لو کہ دین اس کے بعد ختم ہو گیا' یعنی بس پھر تئیس سال کے بعد یہ قصہ ختم ہوا' قیامت تک نہ کوئی رسول آنا ہے' نہ دین کا قیام ہونا ہے تو بس یہ معاملہ ختم ہو گیا۔ کہا کہ نہیں' قطعاً نہیں۔ دین کے نظام کو رسول کی ذات کے ساتھ تعلق نہیں تھا' اُس نے بھی قائم کیا' چلایا' اس کے بعد اس کی جو امت ہے' اس کے جو متبعین ہیں' وہ اسے چلائیں گے۔ قرآن نے کہا کہ اے رسول! تیری طرف تو ہم نے وحی کی ہے' وحی تو رسول کی طرف ہوئی ہے' وحی بعد میں نہیں ہوگی' اس کتاب کا وارث ہم نے اس امت کو بنا دیا۔ یہ ان کے لیے بہت بڑا لفظ لے آیا ہے۔ کہا کہ **اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا** (35:32) اپنے بندوں میں سے جنہیں ہم نے منتخب کر لیا۔ نبی اکرم ﷺ کو ہم مصطفیٰ کہتے ہیں' وہ یہیں سے لفظ ہے یعنی برگزیدہ' انتخاب کیا ہوا' کسی مقصد کے لیے چن لیا ہوا وہ تو ذاتِ اشرف تھی' یہاں پوری امت کے متعلق کہا کہ

جنہیں وارثِ کتاب بنایا گیا ہے۔

اقوامِ عالم کی حد تک وارثِ کتاب امت کا فریضہ اور پھر اس کی ادائیگی کا ماحصل

عزیزانِ من! اس امت کو کتاب کا وارث بنایا ہے' اس مقصد کے لیے منتخب کیا گیا ہے کہ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (2:143) ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی امت بنایا ہے تا کہ تم اقوامِ عالم کے اعمال پہ نگرانی کرو کہ کون جادۂ حق و عدالت سے ادھر اُدھر بھٹک رہا ہے۔ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا (35:32)۔ لیکن وہیں یہ بتا دیا کہ پھر اس امت کی پوزیشن کیا ہو جائے گی۔ ان میں کچھ تو سَابِقٌ بِالْخَيْرٰتِ (35:32) ہیں یعنی اور آگے بڑھ جانے والے ہیں' سب سے آگے آگے جانے والے ہیں' Pioneer ہیں' صفِ اول میں سے ہیں اُس کے بعد مُّقْتَصِدٌ (35:32) ہیں یعنی کچھ بین بین چلنے والے ہیں۔ یہ صورت بعد میں درمیان میں پیدا ہونے والی ہے اور اس کے بعد فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ہیں یعنی پھر اس کے بعد وہ جو اپنے آپ پر ظلم کرنے والے ہیں' بظاہر سمجھنے والے ہیں کہ دوسروں پر ظلم کیا جا رہا ہے ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ (35:32) اپنے آپ پہ ظلم کرنے والے ہیں۔ قرآن نے تو ہمارے متعلق پہلے ہی یہ بات کہہ دی تھی کہ ہم کس کیٹگری (شق) میں آ رہے ہیں: ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ (35:32)۔ اور وہ ہیں: سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ (35:32) وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ (56:10) السّٰبِقُوْنَ (9:100)۔ قرآن کہتا ہے کہ Pioneers یعنی آگے بڑھنے والے' وہ صدرِ اول کے مومن جماعتِ صحابہؓ محمد رسول اللہ ﷺ والذین معہٗ والے تھے۔ ان کے متعلق کہا ہے کہ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ (35:32) یہ وہ لوگ ہیں جن کے اوپر خدا کی طرف سے وہ فضل ہوا جو بھی کہا تھا کہ ہم محنت سے بھی زیادہ دیتے ہیں۔

اعمالِ صالحہ کے عوض خدا تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ نعمتوں کا تمثیلی ذکر

دوسری جگہ جنت کے متعلق کہا کہ وہاں ہر چیز تمہاری خواہشات اور آرزوؤں کے مطابق ہوگی اور اس کے بعد کہا ہے کہ وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ (50:35) ہم اُس سے بھی زیادہ دیں گے۔ بات یہ پیدا ہوئی کہ اگر کسی کی آرزو کے مطابق سب کچھ مل جائے تو اس کے بعد اور زیادہ کیا ہوتا ہے؟ کہا کہ ہمارا منتہٰی تو یہ ہے کہ ہماری آرزو پوری ہو جائے' اس کے بعد تو باقی کچھ نہیں بچتا' تو یہ وہاں تھا کہ پھر اور زیادہ کیا ہے۔ کہا کہ تمہارا محدود دماغ ہے' تمہارا محدود دل ہے' تمہارے محدود تقاضے ہیں' تمہاری محدود آرزوئیں ہیں' تم تو اتنا مانگ سکتے ہو' تمہارا پیالہ ہی چھوٹا ہے' ہماری بخشش کے پیالے بڑے زیادہ ہیں' تمہاری آرزو سے بھی زیادہ' کیونکہ تمہاری آرزو بڑی محدود ہے۔ ہم بچے کی آرزو جانتے ہیں' وہ تو اتنے سے کھلونے سے بہل جاتا ہے۔ ہم اس کے لیے جوتا بھی اور بوٹ بھی اور کپڑا بھی اور پھر نشو و نما کی اور چیزیں

لاتے ہیں اس کی آرزو تو کھلونے سے پوری ہو جاتی ہے۔ کہا کہ تم اور تمہاری آرزوئیں تو بڑی محدود ہیں' ہمیں پتہ ہے کہ تمہیں اور کس کس چیز کی ضرورت ہے' ہم وہ بھی دیتے ہیں۔ اور جہاں آرزوئیں ہی کچلی جائیں' یا تو پیدا ہی نہ ہوں اور اگر پیدا ہوں تو ناپختہ رہ جائیں اور اس کے بعد ختم ہو جائیں' تو یہ کس قسم کی ربوبیت ہے؟

عزیزانِ من! کہا کہ **جَنّٰتُ عَدْنٍ یَّدْخُلُوْنَهَا یُحَلَّوْنَ فِیْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّ لُؤْلُؤًا وَ لِبَاسُهُمْ فِیْهَا حَرِیْرٌ** (35:33)۔ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم میں اگر آخرت کی جنت ہے' تو اس کا سارا بیان تمثیلی ہے Symbolical (علاماتی) ہے' استعارات کے ذریعے سے سمجھایا گیا ہے کیونکہ اس دنیا کی زندگی کے متعلق ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر کچھ نہیں سمجھ سکتے' وہ سارا کچھ فزیکل نہیں ہے' ہماری طرح مثال کے ذریعے ہی سمجھایا جا سکتا ہے لیکن وہ جنت تو اس زندگی میں' اس دنیا کے اندر' بھی شروع ہو جاتی ہے۔ یہ جو قرآن نے اپنا نظام بتایا ہے' وہ نظام جنت کا نظام ہے' اس نظام کے اندر جس زمانے میں نزولِ قرآن ہوا ہے' عربوں کے سامنے ایران کی سلطنت' ان کی تہذیب تھی جیسے آج کل ہم تہذیبِ فرنگ کو اپنا معیار بنائے ہوئے ہوتے ہیں' وہاں کی ہر شے ہمارے نزدیک کچھ معیار یا منتہٰی یا معراج ہوتی ہے' وہ عربوں کے نزدیک ایران کی تھی اور وہ تہذیب بھی ہزاروں سالوں کی تہذیب تھی' ان کے ہاں عجیب و غریب چیزیں آ گئی ہوئی تھیں' ان کے ذہنوں میں وہ نقشہ تھا۔

عربوں کے ہاں شفاف پانی کی قدر و منزلت

ہم دیکھتے یہ ہیں کہ ایک تو صحرا میں زندگی بسر کرنے والے یہ عرب ہیں۔ ان کے ہاں پہلی چیز تو یہ پانی' صاف شفاف پانی' ٹھنڈا میٹھا پانی تھا۔ ہم آپ اس پانی کی قدر کیا جانیں چودہ سو سال پہلے کا عرب نہیں' آپ نے بھی شاید خبر پڑھی ہوگی' ابھی ابھی دو ایک ہفتے گزرے ہیں' سعودی عربیہ اور یہ جتنے بھی عرب کے ممالک ہیں' جن میں زمین پگھلا ہوا سونا اگل رہی ہے' سونے کے دریا بہہ رہے ہیں' وہ ساری دنیا کو خرید سکتے ہیں۔ کیا آپ کو پتہ ہے کہ وہاں ضرورت کیا ہے؟ وہ یورپ سے پینے کا پانی امپورٹ کرتے ہیں' ان کے ہاں اتنا پینے کا پانی نہیں ہے' جتنی آبادی بڑھ گئی ہے' ان کو وہاں سے پانی منگوانا پڑتا ہے۔ ہمیں تو پوچھیے نہیں کہ ہم کس قدر مستغنی واقع ہوئے ہیں ہم نے انہیں آفر کر دی ہے کہ صاحب! وہاں سے جو منگاتے ہو' اور چار پیسے سانوں دیا کرو' آ سارا ہڑ دا پانی اسی بخش دیا کراں گے تہانوں۔ سانوں سمجھ ای نئیں اوندی پئی ایس پانی نوں کریے کی' آ موج ہو گئی ساڈی تے ❶ '' انہوں نے آفر کر دیا کہ صاحب! ہم سے

---

❶ وہ چار پیسے ہمیں دے دیا کرو' ہم سیلاب کا یہ سارا پانی آپ کو دے دیا کریں گے۔ ہماری تو سمجھ میں ہی یہ بات نہیں آتی کہ ہم اس پانی کا کیا کریں۔ یہ (آپ کو دینے سے تو) ہماری موج ہو جائے گی۔

منگائیے۔ پتہ نہیں کہ انہوں نے اس آفر کا کیا جواب دیا ہے۔ انہیں تو پتہ ہے کہ یہاں سے جو چیز بھی منگائی ہے' بس کھولنے کے بعد وہ نہیں نکلی' جو انہوں نے Sample (نمونہ) بھیجا تھا۔ اگر پانی بھی تم نے ہمیں ایسا بھیج دیا کہ بعد میں ہمیں کہنا پڑے کہ 'ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں' تو اس باب میں میرا خیال ہے کہ وہ کچھ محتاط سے ہونگے کیونکہ پانی کا تعلق تو زندگی سے ہوتا ہے۔

میں کہہ یہ رہا تھا کہ عربوں کے نزدیک پانی آج بھی اتنا ہی قیمتی ہے۔ اب بات سمجھ میں آئی کہ جنت کے متعلق یہ کیوں کہا ہے کہ وہاں گھنے درخت ہیں۔ اتنا سیاہی مائل سبزہ ہے' ان کے نیچے سے' یہ جن کو ہم آڈاں یا نالیاں کہتے ہیں' بہتی ہیں۔ عرب ان نالیوں کو نہر کہا کرتا تھا ''چھپڑنوں سمندر کہندا ❶ ہونداسی'' وہ سچے ہیں' سچے تھے بلکہ آج بھی وہاں یہی کچھ ہے۔ قرآن نے ان کے سامنے جنت کا جو نقشہ کھینچا وہ یہ ہے کہ سایہ دار درختوں کے نیچے' بہتا ہوا صاف شفاف پانی ہے' درختوں میں ان پھلوں کے خوشے لٹکے ہوئے ہیں جنہیں تم دور سے ہی دیکھتے ہو۔ ایران کی سرزمین میں وہ اگتے ہیں۔ بہترین قسم کے پھل کے خوشے لٹکتے ہوئے ہیں کہ منہ میں پانی بھر آئے' یہ ایسے خوشے ہیں کہ وہ خود بخود تمہاری جھولیوں میں آ پڑیں۔ اندازہ لگایئے' ریت پہ سونے والے آج بھی ایک دوست نے جب میں نے کہا کہ وہاں بڑی گرمی ہوتی ہے' کہا کہ ہاں' ہوتی ہے' ہمارے لیے تو انتظام ہے' ہر چیز ائرکنڈیشن ہے۔ اس نے بتایا کہ ہم نے ان بدوؤں کو دیکھا ہے' وہ مئی جون کے مہینے کے اندر 128 ڈگری C ٹمپریچر میں' وہیں کھجور کے سائے تلے' صحرا میں اپنا کمبل اوڑھے ہوئے سو رہا تھا۔ اس زمانے میں اُن کے سامنے ایران کے ریشمی لباس' موتیوں کے مالائیں' سونے کے کنگن' صوفے قالین' یہ سب کچھ تھے۔ قرآنِ کریم نے جنت میں یہ سب کچھ بتایا ہے۔ کہا کہ یہ ان کی آرزو کی انتہا ہو سکتی تھی۔ ہم نے کہا کہ وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ (50:35) بھی ہے یعنی یہ سب کچھ بھی اور اس سے کچھ زیادہ بھی ہم تمہیں دیں گے۔

وحی کی روشنی میں قائم ہونے والے نظام اور انسانی عقل کے بل بوتے پر اختیار کردہ نظام میں فرق

یہ ساری چیزیں جنتی بھی ہیں بس ایک فرق کے ساتھ انہیں بتائیں اور یہ بڑا عظیم فرق ہے۔ وہ ایران میں ہوں یا روما میں تھیں یا مغرب میں ہوں یا آج بھی ہمارے معاشرے کے بعض گھرانوں میں ہوں' یہ ساری چیزیں ایک خاص طبقے کے لیے مخصوص تھیں یا ہیں' اسی معاشرے کے اندر دوسرا طبقہ نانِ جویں تک سے محتاج ہوتا ہے مگر جنت میں یہ چیزیں ہر ایک کے لیے ہوتی ہیں۔ یہ ہے فرق۔

جنتی معاشرے میں نہ خوف ہوگا نہ حزن

جنت میں یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ اس طبقے کو تو یہ سب کچھ ملے گا' اتنا بھی نہیں کہ سیکنڈ کوالٹی کے یہ لوگ' جو درمیانے درجے کے سفید

---

❶ تالاب کو سمندر کہا کرتا تھا۔

پوش ہیں ''اپناں نوں لٹھا ای دتا جائے ❶ ''۔ فرد اور فرد کے اندر کہیں کوئی فرق نہیں ہے۔ جس معاشرے میں جو کچھ بھی ملے خواہ وہ نانِ جویں سے شروع ہو' خواہ وہ حریر و اطلس پہ منتہا ہو' ہر فرد کو اگر وہی ملتا ہے' عزیزانِ من! تو وہ جنت ہے۔ جنت کا کوئی گوشہ جہنم نہیں ہے جیسے جہنم کا کوئی گوشہ بھی جنت نہیں بن سکتا۔ یہ جو حریر و اطلس پہننے والے اور قالین بچھانے والے آپ کے ہاں ہیں' کہا ہے کہ **نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ o الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْئِدَةِ** (104:6;7) جہنم کی آگ ان کے دلوں کو بھی لپیٹے ہوئے ہے' جنت میں وہ بھی نہیں ہیں۔ بس تو یہ فرق ہے۔ قرآنِ کریم نے جو کہا ہے کہ وہاں طبقات نہیں ہونگے' یہ نہیں ہوگا کہ کچھ فرد محروم ہونگے اور باقیوں کو یہ ملے گا۔ حضرت عمرؓ کا (46/45-581ء) کا وہ قول آپ کو یاد ہی ہے جب مصر کے گورنر نے ان سے کہا تھا کہ آپؓ جو کی روٹی کیوں کھا رہے ہیں' گیہوں کی روٹی کیوں نہیں کھاتے' اب تو مملکت میں گیہوں خاصا ہے اب تو میں مصر سے خاصا گندم بھیج رہا ہوں اُنہوںؓ نے کہا تھا کہ کیا آپ مجھے یہ ضمانت دے سکتے ہیں کہ یہاں میری مملکت میں ہر فرد کو گیہوں کی روٹی ملتی ہے؟ یہ روٹی بڑی چیز تھی۔ عیش کے معنی ہی گیہوں کی روٹی ہے۔ کہنے لگے کہ اس کی آپ گارنٹی دیتے ہیں کہ مملکت کے ہر فرد کو گیہوں کی روٹی مل جاتی ہے۔ وہ کہنے لگے کہ اس کی تو میں ضمانت نہیں دیتا' میں یہاں اتنا زیادہ گیہوں مصر سے بھیج رہا ہوں۔ کہنے لگے کہ مجھے آج اس کا اطمینان ہے کہ مملکت کا ہر فرد آج جو کی روٹی کھا سکتا تھا' جس دن مجھے یہ اطمینان ہوگیا کہ سارے فرد گیہوں کی روٹی کھاتے ہیں' اس کے بعد میں آخری بندہ ہونگا جو گیہوں کی روٹی کھاؤنگا۔

یہ ہے جنت' خواہ وہ جو کی روٹی کیوں نہ ملے' عمر کو بھی ملے اور وہ بھیڑ چرانے والے بدو کو بھی ملے۔ اس کے بعد یہ ساری جنتی بھی یہاں یہ چیزیں ہیں تو آپ کے ہاں یہ سونے اور چاندی اور موتی اور یہ ریشم وغیرہ' آپ کو پتہ ہے کہ علمائے کرام کی شریعت کے فتوے کی رو سے یہ حرام ہیں' یہاں یہ کچھ مردوں کے لیے پہننا حرام ہے' ان سب کے لیے اب عورتوں کی بھی باری آگئی ہے یعنی یہ مردوں کے لیے حرام ہے۔ تو گویا جس جنت میں یہ سب چیزیں ہونگی تو یہ وہاں ان سب کے لیے (معاذ اللہ) حرام تھیں۔ قرآن نے تو یہاں تفریق نہیں کی کہ وہاں یہ حوروں کے لیے ہونگی' آپ لوگوں کے لیے کچھ نہیں ہوگا۔ یہ بات غلط ہے۔ خدا کی جو نعمتیں ہیں' خدا کے بتائے ہوئے طریقے سے حاصل کی گئی ہوں' خدا کے بتائے ہوئے طریقے سے استعمال کی گئی ہوں' قرآن کہتا ہے کہ کوئی زینت کی چیز حرام نہیں قرار دے سکتا' یہ کس دھڑلے سے کہا کہ ان سے پوچھو کہ کون ہے جس کو یہ جرأت ہو کہ ہماری حلال قرار دی ہوئی چیز کو حرام قرار دے۔ یہ کہتے ہیں کہ ہاں ہیں' کرلو کیا کرتے ہو۔ اور یہ چیزیں تو طبعی لباس کی اور موتیوں کی اور سونے کی اور چاندی کی تھیں' بات تو جنت کی آگے آتی

---

❶ انہیں صرف لٹھا ہی دیا جائے گا۔

ہے۔کہا کہ وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ (35:34) وہ ذات کہ جس کی کیفیت یہ تھی: اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ (35:34) جس میں ہم پھر حزن دور کردیں گے۔خوف اور حزن دو الفاظ ہیں' عربی زبان میں خوف تو محسوس خطرے کو کہتے ہیں۔پہلی چیز تو قرآن نے کہا ہے کہ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ (2:38) مومن کا معاشرہ یہ ہے کہ ان کو کسی قسم کا کوئی بیرونی خطرہ نہیں ہوتا لیکن بیرونی خطرے سے محفوظ ہوجانے کے بعد انسان کا قلب تو مطمئن نہیں ہوتا۔حزن کہتے ہیں ''اس قسم کی دل گرفتگی' افسردگی' دل کی بے چینی کہ جس کا بظاہر کوئی سبب معلوم نہ ہو' لیکن دل ہے کہ گھٹا جارہا ہے'':

وہ خود تسکینِ خاطر کر رہے ہیں
مگر دل ہے کہ ڈوبا جا رہا ہے

کیوں ڈوبا جارہا ہے' یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں ہے' میں تو بس اتنا ہی جانتا ہوں کہ

ہے کوئی بات آج ہونے کو
جی بہت چاہتا ہے رونے کو

یہ جو بلاسبب رونے کو جی چاہتا ہے' جس کا سبب معلوم نہیں ہوتا' اور سبب آپ کو پتہ کیا ہوتا ہے معاشرے کے اندر بے چینی اضطراب اور بے اطمینانی اتنی پھیلی ہوئی ہوتی ہے کہ Unconsciously (غیر شعوری طور پر) ہمارے دلوں کے اندر وہ چیز جاگزیں ہوگئی ہوتی ہے' شعوری طور پر کوئی خطرے کی بات نہ بھی ہو تو Unconsciously (غیر شعوری طور پر)' اندر سے' ہمارا دل گھٹا ہوا ہوتا ہے' کسی موہوم خطرے کے لیے کہ پتہ نہیں کیا ہوجائے۔یہ جو غم ہے' وہ شعر تو غزل کا ہی ہے لیکن بڑا ہی دلگداز ہے' اس کی پوری پوری عکاسی کرتا ہے کہ

کہاں تک میری غمخواری' کہاں تک میری ہمدردی
ہزاروں غم ہیں انجانے' ستارو تم تو سو جاؤ!

اس مقام پہ الحمد کہا ہے۔یہاں کہا ہے کہ خطرات' یہ بھوک اور یہ چیز تو آپ نے مٹا ہی دی تھی' آپ کا شکریہ لیکن حمد یت کی سزاوار یہ ہے کہ ہمارے دلوں کے اندر جو انجانے غم ہوتے تھے' تم نے ان کو بھی دور کردیا۔یہ جنت ہے' عزیزانِ من! ۔کہا کہ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُ نِ o الَّذِیْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ لَا يَمَسُّنَا فِیْهَا نَصَبٌ وَّ لَا يَمَسُّنَا فِیْهَا لُغُوْبٌ (35:34-35) یہ حزن دور کرنے والا' حفاظت کا سامان بہم پہنچانے والا رب غفور ہے' اور شکور ہے کہ بھرپور نتائج دینے والا ہے کسی کی محنت غصب نہیں ہوتی' سلب

نہیں ہوتی' یہ وہ ذات ہے کہ جس نے ہمیں **دَارَ الْمُقَامَةِ** یعنی ٹھہرنے کے لیے ایسا مقام دیا جو محفوظ بھی ہے' شکور بھی ہے۔ خدا کے فضل سے کوئی ایسا مقام مل جانا بڑی ہی نعمت ہے۔

ایک قطرہ خون بہائے بغیر مملکت پاکستان کا حصول' خدا تعالیٰ کا بہت بڑا فضل تھا

عزیزانِ من! جہاں انسانوں کو یا اس امت کو یا قوم کو حفاظت نصیب ہو جائے' اللہ نے اس کو بھی اپنا فضل قرار دیا ہے۔ یہ ہم پہ بہت بڑا فضل تھا جو پاکستان کا خطۂ زمین ہمیں مل گیا۔ پوچھو آج ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں پہ کیا بیت رہی ہے۔ اس کے بعد اس خطۂ زمین کو ہم جنت بنالیں یا جہنم بنالیں' یہ تو ہمارے ہاتھوں کی بات ہے' وہ بنی بنائی ہوئی جنت بنا بنایا ہوا جہنم نہیں دیتا' وہ **دَارَ الْمُقَامَةِ** (35:35) تو دیدیتا ہے۔ وہ **دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ** (35:35) ہماری کسی کاریگری کا نتیجہ نہیں' ایک مردِ [1] مومن تھا جس نے اس کا تصور دیا' خدا کے قانون کے راستے میں ایک دوسرا مردِ مومن [2] تھا جس نے اس تصور کو عملاً خطۂ زمین حاصل کر کے ہمیں دیدیا۔ یہ سارا **مِنْ فَضْلِهٖ** (35:35) ہوا ہے' ایک قطرۂ خون بہائے بغیر اتنی بڑی مملکت مل گئی' تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی' عزیزانِ من! اس مقصد کے لیے ایک فرد ایک دن کے لیے جیل نہیں گیا تھا۔ یہ جو ہمارے ہاں پنجاب میں اس زمانے میں ہوا تھا تو وہ تو یہاں کا Local Politcs (مقامی سیاست) کا قصہ تھا' ورنہ اس تحریکِ پاکستان کے لیے قائداعظم [2] کی طرف سے جو اسکیم تھی' ایک فرد بھی جیل نہیں گیا' اس کے بغیر اتنی بڑی مملکت مل گئی۔ قرآن نے **مِنْ فَضْلِهٖ** ' **دَارَ الْمُقَامَةِ** کہا ہے لیکن اسے **دَارَ الْمُقَامَةِ** کہو جو جنت بنایا جاتا ہے' اس جنت کے اندر آگے پھر اس جنت کی دو خصوصیات بتائیں۔ **لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ وَّ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا لُغُوْبٌ** (35:35)۔ کیا بات ہے عربی زبان کی! **نَصَبٌ** کہتے ہیں "جگر پاش مشقتوں کے بعد کچھ حاصل ہونا" محنت تو اور چیز ہے' مشقت اور چیز ہے' جس سے کلیجہ شق ہو جاتا ہے۔ کہا کہ اس میں سے سامانِ رزق حاصل کرنے کے لیے جگر پاش مشقتیں نہیں کرنی پڑیں گی۔

نہ جسمانی مشقت اور نہ نفسیاتی تکان

عزیزانِ من! پورا پاکستان یا پورا مغربی پاکستان تو چھوڑ دیجیے' یہ خطہ جس کے اندر ہم بستے ہیں' جسے پنجاب کہتے ہیں' کسی دن

---

1. یہ اشارہ مفکرِ قرآن ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) کی طرف ہے۔
2. یہ اشارہ قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ (1876-1948) کی طرف ہے۔

بیٹھ کر سوچے گا کہ اس خطے کے اندر سے کیا کیا کچھ نہیں میسر آتا۔ یہ **نَصَبٌ** نہیں ہے یعنی اس کے لیے محنت کرنا پڑتی ہے اور اگلی بات تو فزیکل Labour ہے' جسمانی مشقت ہے' کہا ہے کہ **وَّ لَا یَمَسُّنَا فِیۡهَا لُغُوۡبٌ** (35:35) **لُغُوۡبٌ** کہتے ہیں ''ذہنی نفسیاتی تکان کو'' کیا بات ہے قرآن کی! نہ اتنی فزیکل مشقت جو جگر پاش ہو' نہ نفسیاتی جس کو سائیکولوجیکل تکان کہتے ہیں جس کو افسردگی کہتے ہیں' نہ وہ اس **دَارَ الۡمُقَامَةِ** کے اندر ہے۔ کہا ہے کہ یہ چیز ہے جو تُو نے ہم کو دیدیا ہے' یہ وہاں اس جنت کے اندر میسر آتی ہے جو خدا کے دین کی تکذیب نہیں کرتے' جو اس پہ ایمان رکھتے ہیں کہ جو کچھ اس نے کہا ہے یہ برحق ہے' اس کا یہ نتیجہ نکل کر رہے گا۔ یہ ہے جو اس کا نتیجہ بتایا۔

وقت ہو گیا ہے عزیزانِ من! سورۃ فاطر کی آیت 35 تک ہم آ گئے' 36ویں آیت سے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ

❀......❀......❀

چھٹا باب: سورة فاطر (آیات 36 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج جون 1980ء کی 6 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ فاطر کی آیت 36 سے ہو رہا ہے: (35:36)۔

جہنم کی کیفیت: نہ زندگی، نہ موت

سابقہ آیات میں یہ کہا گیا تھا کہ جن لوگوں کی حسنِ عمل کی بنا پر جنت کی سی زندگی ہوگی، انہیں کیا کچھ میسر آئے گا اور اس کے برعکس جن کی زندگی جہنم کی ہوگی، اب ان کا ذکر چار آیتوں میں آ رہا ہے۔ کہا کہ **وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ** (35:36) ان کے لیے جہنم کی آگ ہے۔ جہنم کی کیفیت یہ ہے کہ **لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا** (35:36) وہاں کسی کی زندگی کا خاتمہ بھی نہیں ہوگا اور موت بھی نہیں آئے گی۔ **وَ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا** (35:36) اور اس عذاب میں، اس سزا میں، تخفیف بھی نہیں ہوگی۔ **كَذٰلِكَ نَجْزِيْ كُلَّ كَفُوْرٍ** (35:36) یہ کسی پہ ظلم نہیں ہو رہا بلکہ ان کے اپنے ہی غلط اعمال کا فطری نتیجہ ہے جو انہیں بھگتنا پڑے گا۔ قرآنِ کریم نے جہاں یہ کچھ کہا ہے اسے ذہن میں رکھیے گا۔

ہر عمل کا ایک اپنا فطری نتیجہ ہوتا ہے، خدا کسی کو سزا نہیں دیتا

ہمارے ہاں سزا کا تصور ہے، یہ سزا نہیں ہوتی بلکہ یہ غلط کام کا فطری نتیجہ ہوتا ہے مثلاً سنکھیا کھا لینے سے، جب موت واقع ہوتی ہے تو یہ سزا نہیں کہلا سکتی، جب آپ آگ میں انگلی ڈالتے ہیں اور وہ جل جاتی ہے تو تکلیف کے اعتبار سے تو ایسی سزا شاید ہی کہیں اور ملے لیکن اسے سزا نہیں کہا جا سکتا، یہ آپ کے اپنے اس عمل کا Natural Consequence (فطری نتیجہ) ہے۔ اس لیے قرآنِ کریم میں جہاں یہ کچھ آئے گا، اُسے یہ نہ سمجھیے گا کہ یہ کسی کی طرف سے ایسے شخص کو سزا ملی ہے بلکہ یہ جزا کا ہی لفظ ہے، سزا کا تو لفظ ہی قرآن میں نہیں آیا، اسی لیے یہ لفظ ہی جزا کا ہے، اس کے معنی ہی کسی کام کا فطری نتیجہ ہیں۔ تو یہ غلط کام کا فطری نتیجہ ہوتا ہے جو انسان تکلیف اٹھاتا ہے، نقصان اٹھاتا ہے۔ چونکہ یہ خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے اس لیے بعض وقت یہ کہا جاتا ہے کہ یہ تمہارے اپنے ان اعمال کا نتیجہ ہے، بعض وقت یہ کہا جاتا ہے کہ خدا کی طرف سے تمہیں یہ نتیجہ بھگتنا پڑا۔ خدا کی طرف کے معنی ہوتے ہیں کہ یہ چیز اس کے قانون میں تھی، اس کا قانون تھا کہ سنکھیا کھانے سے ہلاکت ہوگی، آگ میں انگلی ڈالنے سے وہ جل جائے گی۔ اسے ہمیشہ ذہن میں رکھیے کہ اس کا یہ مقصد و مطلب ہوتا ہے، جہاں ہم سزا کا لفظ کہہ دیتے ہیں۔ اس میں ایک لفظ آیا ہے، اس کی طرف میں بعد میں آؤنگا۔ پہلی چیز تو اس میں یہ ہے کہ جہنم میں موت نہیں آئے گی۔

اُخروی زندگی کا عذاب ہو یا وہاں کی خوشگواریوں کا تذکرہ ٗ ان کی نوعیت کا ہمیں شعور نہیں ہوسکتا

میں نے آپ کو عرض کیا تھا کہ جب بھی قرآن کریم میں جہنم کا عذاب یا جنت کی خوشگواریاں آئیں ٗ یا آخرت میں یہ چیزیں جس طرح آئیں گی ٗ ان پر ہمارا ایمان ہے ٗ لیکن ہم سمجھ نہیں سکتے کہ فی الواقعہ وہ کس نوعیت کی ہونگی ٗ ان کی کیفیت کیا ہوگی ٗ ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر ٗ آخرت کی زندگی کے متعلق ٗ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ وہ تو صرف مثالوں کے ذریعے سے بیان کیا ہے لیکن یہ جنت اور جہنم اسی دنیا سے شروع ہو جاتا ہے۔ اس دنیا کے اندر جو عذاب کی ٗ تفکرات کی ٗ پریشانیوں کی ٗ جھلنے کی ٗ اضطرابی کیفیت کی ٗ زکِ نفس کی ٗ زندگی ہے یہ ساری وہ چیزیں ہیں جنہیں آپ جہنم کی زندگی کہیں گے۔

جہنمی معاشرے کی حالت

یہ جو یہاں کا جہنم ہے ٗ اس کے متعلق میں نے اس سے پہلے بھی کئی دفعہ ٗ جب جہنم کی بات آئی ہے ٗ تو وہ آیات آپ کے سامنے پیش کی ہیں ٗ انہیں دہرا دیتا ہوں کہ اگر آپ نے حوالے نہ لکھے ہوں تو پھر تجدیدِ یادداشت بھی ہو جائے گی ٗ شاید آپ حوالے بھی لکھ لیں گے۔ قرآن نے عجیب قسم کی Description (وضاحت) دی ہے کہ معاشرہ جب اُس مقام پہ پہنچ جاتا ہے جہاں جسے No Return (واپس نہ پلٹنا) کہتے ہیں کہ پھر واپسی نہیں ہوسکتی ٗ ایک حد تک تو وہ مقام ہوتا ہے کہ جہاں اصلاح ہوسکتی ہے ٗ Return (مراجعت) ہوسکتی ہے ٗ مرض میں ایک مقام ایسا بھی آجاتا ہے جہاں پھر شفا کی امید باقی نہیں رہتی ٗ اس کے بعد اگلا قدم موت ہوتا ہے۔ تو یہ جو طبعی زندگی میں No Return (واپس نہ پلٹنا) کی بات ہے تو اس میں آخر میں موت واقع ہو جاتی ہے لیکن یہ جسے قرآن نے عذاب کی زندگی کہا ہے ٗ غلط معاشرے میں تو اس کے اندر قرآن نے یہ کیفیت کہی ہے کہ اس میں زندگی اتنی تلخ ہو جاتی ہے ٗ انسان چاہتا ہے کہ اس زندگی سے تو موت بھلی ہے ٗ کئی دفعہ ذہن میں یہ باتیں آجاتی ہیں جب اس قسم کی تکالیف اور مصائب غلط معاشرے میں ناقابلِ برداشت ہو جاتے ہیں تو انسان تھک کر یہ کہہ دیتا ہے کہ صاحب! اس جینے سے تو مرنا بھلا ہے ٗ موت اچھی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس قسم کے غلط معاشرے کے اندر موت بھی نہیں آتی۔ کئی ایک مقامات میں اس کا نقشہ بڑا ہی عبرت ناک انداز میں قرآن نے کھینچا ہے ٗ وہی میں نے کہا ہے کہ یہ آیات پہلے بھی آچکی ہیں لیکن حوالے کے لیے میں ان کو دہرا دیتا ہوں۔ کہا کہ **اِنَّـهٗ مَـنۡ يَّـاۡتِ رَبَّهٗ مُجۡرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ** (20:74)۔ جہنم کی زندگی کے متعلق کہا ہے کہ جو شخص وہاں مجرم بن کر جائے گا اس کے لیے جہنم کا وہ الم انگیز عذاب ہوگا جس سے وہ **لَا يَـمُـوۡتُ فِيۡهَا وَ لَا يَحۡيٰى** (20:74)۔ عجیب انداز ہے قرآن کے بیان کرنے کا کہ اس میں انسان نہ تو زندہ ہی ہوگا ٗ نہ مردہ ہی ہوگا۔

صرف سانس لینے کا نام زندگی نہیں ہوتا

سوچیے کہ یہ کیا زندگی ہے: نہ زندگی ہے نہ وہ موت ہے۔ زندگی اس لیے نہیں کہ زندگی تو انسانیت کی سطح کی زندگی ہے ورنہ سانس لینا تو زندگی نہیں ہے اور عذاب کے تسلسل کی کیفیت یہ ہے کہ اس میں موت بھی نہیں۔ سوچیے عزیزانِ من! کہ یہ اس قسم کا عذاب ہے جس میں لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَ لَا یَحْیٰی (20:74) نہ زندگی نہ موت۔ ایک اور جگہ بھی (87:13) میں بھی یہی الفاظ آئے ہیں کہ انسان اس میں نہ زندہ ہوگا نہ اس میں موت آئے گی اور ایک مقام پہ تو اور بھی زیادہ عبرت آموز انداز میں بات کہی گئی ہے کہ وَ یَاْتِیْهِ الْمَوْتُ مِنْ کُلِّ مَکَانٍ وَّ مَا هُوَ بِمَیِّتٍ (14:17) کیفیت یہ ہوگی کہ چاروں طرف سے موت آتی دکھائی دے گی لیکن وہ مرے گا نہیں۔ ایک دفعہ انسان کے اوپر جو موت آجاتی ہے وہ کوئی ایسا عذاب نہیں ہوتا معاملہ ختم ہو جاتا ہے لیکن جہاں جہنم کے معاشرے کی یہ کیفیت ہو کہ چاروں طرف سے موت آتی دکھائی دے لیکن مرے بھی نہیں:

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستم گر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

(غالب)

یہ بڑی اندوہناک کیفیت ہے۔ قرآن کا یہ کیا انداز ہے! ہر طرف سے موت آتی دکھائی دے اور وہ مرے بھی نہیں پھر یہ کہ

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

(غالب)

اب اس زندگی کو کیا کہا جائے۔ مسلسل موت کی زندگی بھی اس کو نہیں کہا جا سکتا۔ کیا بات ہے قرآن کی! کہ اس کے لیے کوئی نام ہی نہیں رکھا جا سکتا کہ اس زندگی کو کیا کہا جائے: نہ زندہ ہے نہ مردہ ہے موت چاروں طرف سے آتی ہے لیکن موت آتی بھی نہیں ہے۔ یہ ہے غلط معاشرے کی زندگی جسے قرآن جہنم کہہ کر پکارتا ہے اور پھر اسے تو غلط معاشرے میں ہر شخص محسوس کرتا ہے اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے ہر روز اس پہ بیتتی ہے یہ ساری کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں۔ وہاں یہ کیسے ہوگی یہ تو وہاں کی بات ہے لیکن قیامتِ موجود بھی تو یہاں ہے اس قیامتِ موجود میں تو یہ نقشہ ہے کہ چاروں طرف سے موت آتی دکھائی دیتی ہے لیکن موت آتی نہیں ہے۔ یہ وہ مقامات ہیں جہاں واقعی عزیزانِ من! یہ کہتا ہے کہ واقعی یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہو سکتا۔

ذاتِ خداوندی انسانی جذبات کو کس قدر بلیغ انداز میں بیان کرتی ہے

پھر وہ علیم ہے جاننے والا ہے جو کہتا ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ اس پہ یہ بیتی ہے اور وہ اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے (معاذ اللہ) خدا پہ خود تو یہ بیتی نہیں ہے لیکن علم کی یہ کیفیت ہے کہ

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

(غالب)

وہ ہمارے دلوں کے اندر کی بات کہہ رہا ہے جو خود محسوس ہی نہیں کرتا۔ معاف رکھیے گا' میں یہی کہونگا کیونکہ جذبات تو اس کے ہیں نہیں' خدا نہ کرے یہ بات تو ہے نہیں کہ خدا (معاذ اللہ معاذ اللہ) اس جہنم کے عذاب میں تھا' اُس نے خود بھگتا' اس کو احساس ہوا' اب اس کو Description (وضاحت) کی Power (قوت) ایسی عمدہ ہے جیسی ایک شاعر شاعری کرتا ہے لیکن یہ بات تو نہیں ہے۔ اس کے علم کی یہ کیفیت ہے اس نے علیم کہا ہے' اس کے بعد اس نے خبیر کہا ہے تو علیم وخبیر کی کیفیت یہ ہے کہ انسانوں کے دل کی گہرائیوں میں ابھرنے والے جذبات' جو اس کے جذبات نہیں ہیں' جو اس کے احساسات نہیں ہیں' ان کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ ہر شخص محسوس کرتا ہے کہ واقعی یہ میرے دل کی بات کہہ گیا ہے۔

میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن کسی انسان کا کلام نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے' ہمارے ہاں انشاء پرداز بھی ایسے ہیں جو ان احساسات کو اس انداز میں لکھیں گے کہ آپ محسوس کریں کہ یہ واقعی میرے دل کی بات ہے' شاعر تو ایسے ہوتے ہی ہیں جو یہ کچھ کرتے ہیں لیکن وہ ان کے اپنے جذبات بھی ہوتے ہیں' اپنے احساسات ہوتے ہیں' اپنی بیتی ہوئی ہوتی ہے' انہیں پتہ ہے کہ کیا ہوتا ہے لیکن جس پہ خود بیتی نہیں ہے' وہ اس سے بہت بلند ہے' اس کے علم کی نوعیت ملاحظہ فرمایئے کہ وہ ان کے دل کی ترجمانی کس طرح سے کر رہا ہے' جن پر یہ بیت رہی ہے۔
یہ ہے قرآن کا اعجاز!

زندگی واپس نہیں لوٹا کرتی

کہا کہ **وَ هُمْ يَصْطَرِخُوْنَ فِيْهَا رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ** (35:37) اس معاشرے کے اندر چیخیں گے' چلائیں گے کہ اے ہمارے نشو ونما دینے والے! اے ہمارے پروردگار! ایک دفعہ اس زندگی کو لوٹا دے' ایک دفعہ پھر ہم کو موقع دے' پھر زندگی دے' پھر دنیا میں واپس بھیج دے' پھر تُو دیکھ کہ ہم کس طرح سے اچھے کام کرتے ہیں لیکن دوبارہ یہ زندگی نہیں مل سکتی'

وہاں واپسی نہیں ہے۔اس زمانے میں تو بہر حال یہی چیز تھی۔ان بدوؤں نے مانا یا سمجھا کہ واقعی زندگی' واپس نہیں آتی' یہ ہندوؤں کے ہاں کا جو تناسخ ہے' اس کو ایک فقرے میں قرآن نے کاٹ کر رکھ دیا کہ سوال ہی نہیں کہ دوبارہ اس دنیا کے اندر آئے اور پچھلے جنم میں' پچھلی جون میں' جسے وہ کہتے ہیں جو وہ غلط کام کیے تھے' ان کی تلافی اس جون میں کر دے۔اُس نے ایک فقرے میں بات ختم کر دی۔اور آج تو پھر یہ بڑے بڑے جو آپ کے ہاں کے فلاسفر ہیں' وہ جانیں گے' آئن سٹائن (1879-1955) اس کی شہادت دے گا کہ وقت واپس نہیں آسکتا' کچھ کیجیے آپ کا ماضی واپس آ ہی نہیں سکتا۔اتنی سی بات جو اس نے کہی کہ ان سے کہا جائے گا کہ نہیں' ماضی واپس نہیں آیا کرتا۔ اور اس کے بعد اتمامِ حجت کی یہ کیفیت ہے کہ تم پہ ظلم نہیں ہو رہا' اس لیے اَوَلَمۡ نُعَمِّرۡكُمۡ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيۡهِ مَنۡ تَذَكَّرَ (35:37) اتنی عمر تم کو دی تھی کہ اس میں تم ان چیزوں پہ نگاہ رکھ کر صحیح راستہ اختیار کر سکتے تھے۔وَجَآءَكُمُ النَّذِيۡرُ (35:37) اور تمہیں آگاہ کرنے والا بھی آیا تھا' جو بتاتا تھا کہ یہ غلط راستہ ہے' وہ بتا رہا تھا کہ سنکھیا مہلک ہوتا ہے' اس وقت بھی تمہارے پاس وقت تھا' مہلت بھی تمہیں ملی ہوئی تھی آگہی بھی تھی' اطلاع بھی دی گئی' خبردار بھی کیا گیا تھا۔دو ہی باتیں ہونی چاہئیں کہ خبردار کیا جائے اور اس کے بعد مہلت کا وقت بھی اتنا ہو کہ انسان تلافی کر سکے۔کہا کہ یہ تمہارے پاس دونوں چیزیں تھیں تو تم نے نہ اس کی سنی' نہ اس مہلت کے وقفے سے فائدہ اٹھایا بلکہ اپنی ضد پہ اڑے رہے' اسی ظلم وستم کی جولذت کی خون آشامی تھی' اس میں تم آگے بڑھتے چلے گئے۔فَذُوۡقُوۡا (35:37) جو کچھ تم نے کیا تھا' اب اس کا ذرا مزا چکھو۔

ظلم کرنے والوں کا کوئی دوست نہیں ہوتا

کہا کہ فَمَا لِلظّٰلِمِيۡنَ مِنۡ نَّصِيۡرٍ (35:37) ہم تو ایک طرف' ظلم کرنے والوں کا دنیا میں کوئی حامی و ناصر نہیں ہوتا۔ان کی دھاندلی کی وجہ سے' ان کے جبر واستبداد کی وجہ سے' کوئی لب کشائی نہ کرے تو اور بات ہے مستبد کا یہ ہوتا ہے کہ کوئی اس کی تعریفیں بھی کرتا چلا جائے لیکن اس کا دوست کوئی نہیں ہوتا۔ظالم کا دوست کوئی نہیں ہو سکتا۔ٹھیک بات کہہ گیا ہے کہ جو بظاہر اس کے ساتھ جتھے میں ہوتے ہیں' وہ بھی اپنے فائدے کے لیے' مفاد پرستی کی خاطر' اس کے ساتھ ہوتے ہیں' دوستی نہیں ہوتی اور مظلوم تو اس کا دوست ہی نہیں ہوتا' اس کے ساتھی بھی آپس میں دوست نہیں ہوتے۔اس لیے یہ بھی نہیں کہ اس وقت کوئی تمہارا ہاتھ بٹا دے' تمہاری یہ جو مصیبت ہے' اس کو ہی بٹا دے اور کچھ حصہ اپنے اوپر لے لے۔یہ ہو ہی نہیں سکتا۔

کسی قسم کی سزا سے پہلے حق و باطل سے آگاہی کا فریضہ ادا کرنا ضروری ہے

یہاں یہ ہے کہ وَجَآءَكُمُ النَّذِيۡرُ (35:37)۔قرآن نے مختلف مقامات پہ کہا ہے کہ تمہارے پاس آگاہ کرنے والا آیا تھا'

تمہیں پتہ تھا' اس بات کا تمہیں معلوم کرا دیا گیا تھا کہ سنکھیا مہلک ہوتا ہے۔ یہ بہت بڑی چیز ہے جو قرآن نے کہی ہے۔ گویا اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر کسی تک یہ پیغام نہیں پہنچا کہ سنکھیا مہلک ہوتا ہے اور وہ سنکھیا کھالیتا ہے تو قرآن کی رو سے جسے ہم کہیں گے کہ وہ ماخذ نہیں ہوگا یعنی سزا کا سوال چھوڑ دیجیے' ذہن میں یہ نہ رکھیے کہ اُسے سزا نہیں ملے گی وہ ماخذ نہیں ہوگا یعنی شرط یہ قرار دی ہے کہ اس تک یہ پیغام پہنچا ہوا ہو' وہاں تک یہ جو آگہی ہے' جو تنذیر ہے' یہ اس کو بتایا گیا ہو کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا' یہ شرط دی ہے۔ قرآن نے اس کے لیے دو شرطیں دی ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ ان کی ذہنی سطح ایسی ہو کہ وہ اس بات کو سمجھ جائیں اور دوسرے یہ کہ ان تک بات پہنچا دی گئی ہو۔ یہاں سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ ہم نے دنیا کے ہر ملک میں' ہر قوم میں' ہر زمانے میں' اپنے رسول بھیجے جو یہ نذیر ہونے کا فریضہ ادا کرتے تھے' تنذیر کرتے تھے' وہ یہ آگہی دیتے تھے۔ ٹھیک ہے' ماضی کی بات ہے' قرآن کا دعویٰ ہے' وہ کہتا ہے ٹھیک ہے اس نے بھیجے اور وہ اسی لیے کہ اس نے یہ شرط قرار دی تھی کہ بات پہنچا دی گئی ہو' ہر وہ قوم جس کی ہلاکت کا قرآن میں ذکر ہے اُس سے پہلے یہ ہے کہ ان کی طرف وہ آیا' وہ اطلاع دینے والا نذیر ہی کہہ کر پکارا گیا ہے' متنبہ کرنے والا آگاہ کرنے والا' ان کو بتانے والا آیا کہ اس کا نتیجہ ہلاکت ہوگا اور اُنہوں نے ضد کی' نہ مانا تو پھر وہ ہلاک ہوگئے۔ نبی اکرم ﷺ پر نبوت تو ختم ہوگئی اب تو ساری دنیا میں کوئی رسول نہیں آئے گا۔ ایک ایک قوم' ایک ایک ملک تو ایک طرف رہا حضور ﷺ کو رسول **كَآفَّةً لِّلنَّاسِ** (34:28) کہا ہے' **رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ** (21:107) کہا ہے' وہ للناس ہے' تمام نوعِ انسانی کے لیے قیامت تک کے لیے ہے۔ اور رسول خود اپنی شخصیت کے اعتبار سے تو دنیا کے اندر موجود نہیں ہیں تو پھر یہ کس طرح سے ہوگا کہ وہاں تک پیغام پہنچایا جائے۔

ختم نبوت کے بعد مامور من اللہ کا تصور خلافِ قرآن ہے

ختمِ نبوت کے بعد' چار ہی آیتیں پہلے تو بات صاف کی تھی کہ **ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا** (35:32) ختمِ نبوت کے بعد یہی فریضہ تھا' کہ ہم نے قرآن میں جو ہدایت دی ہے' اسے دوسروں تک پہنچایا جائے۔ یہ ہے فریضہ۔ یعنی صحیح راستے پر چلانا نہ تو رسول کا ذمہ تھا' نہ رسول کے بعد اس امت کا ذمہ تھا' یہ صحیح راستے کی طرف راہنمائی کر دینا ہے' یہ چوراہے کے اوپر بتا دینا ہے کہ یہ راستہ تمہاری منزل کی طرف جائے گا' یہ دوسری طرف جائے گا' یہ بتا دینا ہی صرف فریضہ ہے۔ ختمِ نبوت کے بعد رسول تو کوئی آئے گا نہیں' یہ فریضہ کون ادا کرے گا؟ یہ امت کرے گی جس کو کتاب کا وارث قرار دیا گیا ہے۔ اس امت کے متعلق یہ کہا کہ **اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ** (2:143) تم وہ بین الاقوامی امت ہو کہ تمام نوعِ انسانی کے اعمال کی نگرانی تمہارے ذمے ہے کہ دیکھتے رہو کہ کون صحیح راستے پہ جارہا ہے' کون غلط راستے پہ جارہا ہے اور پھر اسے کتاب کی وارث قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ جو کام اس سے پیشتر خدا کے

رسول کرتے تھے' اب تمہارے پاس یہ کتاب محفوظ ہے' رسول اس کتاب کے احکام ہی دوسروں تک پہنچاتا تھا' رسول تو اب نہیں آئے گا' کوئی مامور من اللہ' خدا کی طرف سے' نہیں آئے گا' ختمِ نبوت کے بعد عزیزانِ من! مامورِ من اللہ کا یہ تصور ختمِ نبوت کے خلاف ہے' اگر اسے کسی معنی میں' کسی شکل میں' کسی نام سے بھی مانا جائے' کہ کوئی مامور من اللہ آئے گا تو یہ خلافِ قرآن تصور ہے۔ محفوظ کتاب کی وارث اس امت کو قرار دیا ہے' اس کی کتاب محفوظ ہے وارث یہ ہے' امت موجود ہے' اب مامور من اللہ کے آنے کا سوال ہی نہیں ہے۔ یہ اس امت کا فریضہ تھا' اسے اس کا ذمہ دار قرار دیا تھا۔

کتاب کا وارث ہونے کی بنا پر امت کا فریضہ اور اس کی اہمیت

اب آپ خود تصور کیجیے کہ ہمارے جرم کی سنگینی کتنی بڑی ہے۔ ہماری کیفیت یہ ہے کہ قرآنِ کریم میں نبی اکرم ﷺ سے کہلوا دیا کہ جسے کہتے ہیں کہ قیامت میں ہر قوم آئے گی اور وہ عدالت کے سامنے سے گزرے گی اور ان کے جرائم گنائے جائیں گے۔ قرآن میں یہ ہے کہ جب یہ امتِ محمد یہ ﷺ یعنی ہم' امتِ محمد یہ میں صدرِ اول کے مسلمانوں کو تو ہم نہیں لے آتے' اس کے بعد گاڑی جب دوسری پٹڑی پہ جا پڑی' ایک امت کی حیثیت سے گزریں گے' قرآن عجیب ڈرامائی انداز میں بیان کر رہا ہے کہ جیسے نبی اکرم ﷺ ایک جگہ کھڑے ہوئے تعارف کراتے ہیں کہ اب وہ آگئے' اب یہ آگئے' یہ اب وہ آگئے' تو قرآن میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ پکار کر کہیں گے کہ یا اللہ! یہ وہ میری قوم آئی ہے جس نے قرآن کو چھوڑ دیا تھا۔ ہمارا تعارف ان الفاظ میں کرایا جائے گا کہ جنہوں نے اپنے آپ کو فریب دے لیا ہوا ہے کہ وہ ہماری شفاعت کریں گے' رسول اللہ ﷺ سفارش کریں گے' ہمیں بخشوا کر جنت میں لے جائیں گے۔ وہ جن کے متعلق ہم زعم کر رہے ہیں کہ وہ بخشوا کر لے جائیں گے' قرآن کہہ رہا ہے کہ وہ ہمارا تعارف خدا سے یہ کہہ کر کرائیں گے کہ اے خدا! یہ ہے وہ قوم جس نے قرآن کو مَهۡجُوۡرًا (25:30) کیا' یہ میری امت ہے: قَوۡمِیۡ (25:30) میری قوم ہے' کوئی اور قوم نہیں' میری امت' میری طرف نسبت کرنے والی' اب آپ کے سامنے وہ آ رہی ہے جس نے قرآن کو چھوڑ دیا تھا۔

اس فریضہ کی عدمِ ادائیگی کا نتیجہ

عزیزانِ من! رسول کریم ﷺ ہمارے متعلق یہ کہہ کر تعارف کرائیں گے۔ ایک تو یہ چیز ہے کہ حضور ﷺ جیسے جو شاہد ہیں (معاذ اللہ) ان کی شہادت کہیں غلط نہیں ہو سکتی ہے' نہ اس میں کوئی شبہ ہو سکتا ہے' وہ قیامت کے دن' حشر کے دن' خدا کے حضور پکار کر کہیں گے کہ یہ میری وہ قوم آ رہی ہے جس نے قرآن کو چھوڑ دیا تھا۔ یہ جو فریضہ ہم کہہ رہے ہیں ہم نے چھوڑ دیا' وہ اسے دوسروں تک کیا پہنچائے گا۔ سوچیے' عزیزانِ من! ہمارے جرم کی شدت اور سنگینی کتنی بڑی ہے! پہلا جرم یہ ہے کہ ہم نے خود اسے چھوڑا' دوسرا جرم یہ ہے کہ ہم نے اسے

دوسروں تک نہیں پہنچایا۔ اس نہ پہنچانے کی وجہ سے وہ تو ماخذ نہیں ہونگے۔ یہ دوسرا جرم ہمارے ذمے ہے کہ ہم نے نہیں پہنچایا۔ اس کا انجام آپ سوچ سکتے ہیں۔ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ سوچ کیا سکتے ہیں' اس کا انجام دیکھ رہے ہیں کہ خود چھوڑا' تو ان تمام نعما سے محروم رہ گئے جو خدا نے اس کے بدلے میں ہمیں دینی تھیں یا اس پہ عمل کرنے کا جو فطری نتیجہ تھا' وہی جنت کی زندگی جو اوپر کہا گیا ہے' وہ گئی' جہنم کی زندگی آئی' جہنم کی وہ زندگی آئی کہ چاروں طرف سے موت آتے دکھائی دیتی ہے لیکن موت آتی نہیں ہے۔ قرآن کے الفاظ میں یہ ہے کہ ہر دفعہ جب اس میں سے نکلنے کا ارادہ کریں گے تو دھکا دے کے ان کو اسی کے اندر پھر داخل کر دیا جائے گا کہ تم اس میں سے نکل نہیں سکتے' تم نہ زندوں میں ہو' نہ مردوں میں ہو۔ یہ اس دوہرے جرم کی سزا ہے کہ ہم نے قرآن کو خود چھوڑا' وہ جو ہمارے ذمے تھا اسے خود ہی چھوڑ دیا۔ ان کو کہا ہے کہ **فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ** (35:32) ہم نے اس امت کو قرآن کا وارث بنایا اور اس کی کیفیت یہ ہوئی کہ خود قرآن کو چھوڑا' جو دوسروں تک پہنچانا تھا' اس کا سوال ہی پیدا نہ ہوا اور یہ **ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ** (35:32) ہے' اپنے آپ پہ اتنا بڑا ظلم کیا **فَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ** (35:37) تو اس قسم کے ظالموں کا دوست کون ہوسکتا ہے' عزیزانِ من! کوئی دوست نہیں ہوسکتا۔ جنہیں آپ دوست سمجھتے ہیں وہ بھی آپ کے دوست نہیں ہوتے۔

قرآن کو دوسروں تک پہنچانے میں تغافل کی بنا پر خدا کی نعمتوں سے فیض یاب نہ ہونے کا جرم

قرآن چھوڑنے والوں کا دوسروں تک پہنچانے کا جو فریضہ ان پہ عائد کیا گیا تھا' انہوں نے اس میں تغافل ہی نہیں برتا بلکہ اس قوم نے اس کو قطعاً متروک کر دیا۔ ذہن میں یہ چیز آیا کرتی ہے کہ جن تک یہ بات پہنچی نہیں ہے' سزا نہ ہی سہی' بہر حال وہ ان نعما سے تو محروم رہ گئے کہ جو اس کے اتباع سے ان کو ملنی تھیں۔ کبھی ذہن میں یہ آتا ہے کہ یہ تو کچھ ان پہ زیادتی ہے۔ اس کو چھوڑ دیجئے' یہ دیکھیے کہ ذمہ داری کس کی ہے' وہ کس کیٹگری (شق) میں شامل ہونگے۔ بات بڑی فطری سی ہے۔ اگر کسی گاؤں کے اندر اسکول نہیں کھولا گیا' چھوڑ دیجیے کہ یہ کس کی وجہ سے ہوا' کون اس کا ذمہ دار ہے' وہاں کے بچے علم سے محروم رہ گئے' اس کے بعد یہاں اعلان ہوا کہ فلاں فلاں ملازمت کے اندر یہ شرط ہے' یہ علمی ڈگری ہونی چاہیے' یہ Educational Qualification (تعلیمی لیاقت) ہونی چاہیے۔ اب اس گاؤں کے لڑکے تو یہاں اس امتحان میں نہیں بیٹھ سکتے کہ ان کے پاس یہ ڈگری نہیں ہے' وہ جاہل ہیں۔ یہ تو دوسری بات ہے کہ اس کے ذمہ دار کون ہیں' کوئی بھی اس کے ذمہ دار قرار دیدیجئے' انہیں تو اس ملازمت میں نہیں لیا جا سکے گا کیونکہ اس کے لیے تو علم شرط تھی' علم سے تو وہ محروم ہیں' علم کی جتنی برکات ہونی تھیں ان سے تو وہ محروم رہ گئے۔ بات یہ رہ گئی کہ اس کے ذمہ دار کون ہیں' ذمہ دار کسے باشد' وہ تو محروم رہ گئے۔ وہ جو ذمہ دار تھے اُنہوں نے ذمہ داری پوری نہیں کی' وہ جو ان کی جہالت کی وجہ سے نقصان ہوا ہے' اس کا مواخذہ بھی ان سے کیا جائے گا'

انہیں کچھ نہیں کہا جائے گا' انہیں کوئی سزا نہیں دی جائے گی لیکن بہر حال علم سے محرومی کی وجہ سے' جہالت کی وجہ سے' جو کیفیت انسان کی ہے' وہ تو ان کی ہے۔ یہ ہیں وہ کہ جن تک یہ قرآن پہنچایا نہیں گیا' ٹھیک ہے وہ اس سے محروم رہے۔ اور پھر جو اُس نے کہا ہے کہ اس نے قرآن کو چھوڑ دیا تھا وہ کتنا بڑا جرم ہے!

قرآنِ حکیم کے دنیا بھر میں سمجھے بغیر پڑھے جانے کے چرچے کے فریب کی نوعیت اور نتیجہ

عزیزانِ من! ہم نے اپنے آپ کو یہ فریب دے رکھا ہے کہ قرآن کا اتنا چرچا ہو رہا ہے' ساری دنیا میں اتنا پڑھا جاتا ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ دنیا کی کوئی کتاب اس طرح سے نہیں پڑھی جاتی۔ لاکھوں کی تعداد میں' شاید کروڑوں کی تعداد میں حفاظ ہیں' سارے کا سارا قرآن دہراتے ہیں اور ابھی رمضان شریف کا مہینہ آنے والا ہے' اس ایک مہینے میں' ایک ایک مسجد میں' پانچ پانچ سات سات جگہ تراویح کی نمازیں ہو رہی ہوتی ہیں اور قرآن دہرایا جا رہا ہے' ایک ایک رات میں قرآن دہرایا جا رہا ہے۔ بہت بڑے معرکے کی باتیں کر رہے ہیں کہ قرآنِ کریم کے اتنے نسخے چھپوا کر ہم نے تقسیم کر دیئے اور اتنے نسخے لوگوں کے پاس ہیں' مدرسے کھول لیے ہیں' ان کے اندر ناظرہ قرآنِ کریم پڑھا رہے ہیں۔ ناظرہ نہ بھی پڑھائیں اگر کہیں کوئی ترجمے والا بھی پڑھائیں تو وہی کچھ ہے جو آپ سن رہے ہیں اور دیکھ رہے ہیں۔ کیا یہ جس کو ہم اپنے آپ کو فریب دے رہے ہیں کہ ہم قرآن کا اتنا چرچا کر رہے ہیں' اتنا ذکر کر رہے ہیں' اس قدر پہنچا رہے ہیں' یہ قرآن کو ترک کرنا ہے یا قرآن کے اوپر عمل کرنا ہے؟ صرف اپنے ہاں ہی دیکھ لیجیے۔ بہر حال اب تو گھروں کے اندر وہ روش کم ہو رہی ہے ورنہ گھروں کے اندر تو صبح اٹھ کر بچوں سے لے کر بڑوں تک' سب قرآن کھول کر بیٹھ جاتے تھے' گھروں کے اندر سب ناظرہ قرآن کی آوازیں آتی تھیں' اب بھی میں نے کہا ہے کہ ان کی کوئی کم تعداد نہیں ہے۔

عزیزانِ من! کیا قرآن کے الفاظ دہرانے کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے **تمسک بالقرآن** کر رکھا ہے؟ کیا کسی کتاب کے متعلق بھی آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کے الفاظ دہرانے سے وہ مقصد پورا ہو جاتا ہے جو اس کتاب کے لکھنے والا کا مقصد تھا؟ نہیں' قطعاً نہیں۔ جن الفاظ کے معنی آپ نہیں سمجھتے ہوں' آپ وہ الفاظ تو دہرا ہی نہیں سکتے' انہیں بڑی مشکل سے یاد کرانا پڑتا ہے۔ ان سے جو حفظ یاد کرتے ہیں' نماز کی الحمد شریف ہی پوچھیے کہ انہیں یہ کتنی مشکل سے یاد ہوتی ہے' جس کے معنی نہیں آتے۔ اور پھر الفاظ دہرانے سے آپ کو فائدہ کیا پہنچتا ہے' آپ اُسے سمجھتے ہی نہیں ہیں' آپ حکیم والا نسخہ اگر حفظ بھی یاد کر لیں گے' چاندی کے اندر لپیٹ کر گلے میں ڈال لیں گے' تو کیا وہ آپ کو بیماری سے شفا دیدے گا؟ ہزار بار نسخے کو دہرانے سے کیا آپ کو شفا ہو جائے گی؟ اس میں شفاء للناس لکھا ہے اور روزمرہ کے نسخے میں تو آپ یہ چیز کبھی نہیں کرتے' مذاق کرتے ہیں' ہنستے ہیں اگر کوئی ایسا کرے۔ اول تو یہ کوئی کرتا ہی نہیں ہے' یہ تو سوچیے کہ کبھی ایسا ہو سکتا ہے

کہ اس نسخے کو آپ پڑھتے چلے جائیں، سو دفعہ پڑھ لیں اور آپ کا بخار اتر جائے۔ بخار تو اترے گا نہیں، دماغ بھی اس کے ساتھ چکرا جائے گا۔ یہ قرآن کے ساتھ اسی انداز سے تمسخر ہے جس طرح سے ہم قرآن کو یوں پڑھتے ہیں۔ اگر آپ نے دنیا کی دوسری اقوام کو جا کر پڑھا بھی دیا تو کیا یہ قرآن کا پہنچانا ہے؟

نبی اکرمؐ کا صحابہؓ کو قرآنِ حکیم کو پڑھانے اور سمجھانے کا طریق اور ہمارا عمل

عزیزانِ من! کیا رسول یہی تنذیر کرتا تھا؟ کیا بلا معنی، بلا مطلب، بلا مفہوم خدا کی کتاب لوگوں کو یاد کرایا کرتا تھا، پڑھایا کرتا تھا، بتایا کرتا تھا؟ نہیں وہ تو آج بھی ہمیں روایات میں ملتا ہے، صحابہؓ کی روایتیں موجود ہیں کہ نبی اکرم ﷺ قرآن کو ہمیں سمجھاتے تھے، ہم اس طرح سمجھتے تھے کہ جب تک دس آیتیں پوری طرح سے سمجھ نہیں لیتے تھے، گیارھویں آیت تک ہم آگے نہیں جایا کرتے تھے۔ حضورِ نبی اکرم ﷺ سمجھانے والے تھے، صحابہؓ سمجھنے والے تھے، یہ انداز تھا۔ یہ اب بھی ہماری روایات میں ملتا ہے کہ جب تک دس آیتوں کے معنی پوری طرح سے سمجھ نہیں لیتے تھے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ ہمارے ہاں ناظرہ قرآن کے اوپر، حافظوں کے اوپر اتنا زور دیا جا رہا ہے اور اس کو سمجھا جا رہا ہے کہ ہم بہت بڑا جو مقصد ہے، اس کو پورا کر رہے ہیں، اتنا خرچ کیا جا رہا ہے اتنا وقت دیا جا رہا ہے، اتنے انسان ہیں جو اس کے اوپر زندگی وقف کر دیتے ہیں۔ یہ سال کے بعد جسے منزل سنانا کہتے ہیں، یہ آسان نہیں ہے۔ سال بھر یہ دہرایا جاتا ہے: اس کی منزل صبح کے وقت اٹھ کر دہرائی جاتی ہے۔ آپ اپنے ذہن میں رکھ لیں کہ اس سے ثواب ہوتا ہے!!!

امام غزالیؒ سے لے کر مولانا تھانویؒ تک ورد و وظائف، عملیات، تعویذ گنڈے، دم وغیرہ کا سلسلہ

میں پوچھتا ہوں کہ جسے قرآن نے اَلْکِتٰبُ کہا تھا یعنی ذٰلِکَ الْکِتٰبُ (2:2) دنیا کی کوئی دوسری کتاب ایسی ہے جسے آپ بغیر سمجھے یوں دہراتے ہوں۔ وہ حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ یہ میری وہ قوم آ رہی ہے جس نے قرآن کو چھوڑ دیا تھا۔ کیا آپ وہاں کھڑے ہو کر کہیں گے کہ نہیں صاحب! ہم تو قرآن کو اتنی دفعہ دہراتے تھے!!! اولیاء اللہ کے یہ بہت بڑے کارنامے بتائے جاتے ہیں 'نولکھ ہزار ریئے ہیں' کہ جی! اُنہوں نے نو لاکھ مرتبہ قرآنِ کریم کو دہرایا تھا' کہنے والے نے بھی یہ کہا اور سننے والے نے بھی واہ واہ سبحان اللہ کہہ دیا۔ کہا کہ کسی نے گن کر نہ دیکھا کہ اگر ایک دفعہ قرآن ختم کرنے کا کم از کم وقت بھی ہو، اور زندگی سو سال کی بھی لے آئیں تو کیا نو لاکھ مرتبہ ہو بھی سکتا ہے؟'' کہ جی ایہ کرامات والی گل ہیگی اے نا منطق نئیں [1] ہیگا''۔

---

[1] کہ جی! یہ تو کرامات والی بات ہے، منطق (Logic) نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اگر یہ بھی ہو تو بھی نولاکھ چھوڑ کر نوے لاکھ مرتبہ بھی ان الفاظ کو دہرا دیا جائے' تو کیا کتاب کا مقصد یہی ہے؟ خدا نے کیا اس لیے قرآن کو دیا تھا کہ تعویذ لکھو' اس کو ورد وظائف لکھو' جوں شروع ہوئی تعویذات عملیات۔ یہاں قرآن کی تفسیریں لکھی گئی ہیں' کتابیں لکھی ہوئی ہیں' قرآن کی آیتوں کے یہ ورد وظیفے اور عملیات ہیں۔ یہ کام امام غزالی (1111-1058ء) سے شروع ہوا ہے اور وہ تھانوی [1] مرحوم تک خوب خوب رہا۔ اب بھی ہے۔ ان کو عوامل کہتے ہیں۔ عامل اس کو کہتے ہیں جو یہ ورد وظیفے بتانے والا' تعویذ لکھنے والا ہوتا ہے یعنی قرآن کے اوپر عمل یہ ہے' اس کا نام عمل ہے' عملیات ان کتابوں کا نام ہوتا ہے جن میں تعویذ گنڈے ورد وظیفے لکھے ہوتے ہیں۔ یہ ہے قرآن کی آیتوں پر عمل بالقرآن۔ کیا وہ جو حضورﷺ فرمائیں گے کہ یہ میری وہ قوم آ رہی ہے جنہوں نے قرآن کو چھوڑ دیا تھا' تو یہ قوم یہ کہہ کر وہاں سے چھوٹ جائے گی کہ نہیں' ہم نے چھوڑا تو نہیں تھا' ہم تو اتنا حفظ کرتے تھے' اتنا سناتے تھے' اتنے تعویذ لکھتے تھے' اتنے گنڈے لکھتے تھے۔ یہ جو چیز میں نے کہی تھی کہ وَ جَآءَ كُمُ النَّذِيرُ (35:37) تم تک یہ بات پہنچائی گئی تھی' ''النذیر'' آیا تھا۔ اب ختمِ نبوتﷺ کے بعد مامور من اللہ تو نہیں آئے گا' یہیں لکھا ہوا ہے کہ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا (35:32) یہ فریضہ ان وارثِ کتاب کے سپرد کیا۔

اس وارث کتاب کے بارے میں قیامت کے روز خدا کے حضور نبی اکرمؐ کی شکایت

کتاب کو محفوظ رکھنے کا فریضہ خدا نے اپنے ذمے لیا' وارثِ کتاب اس قوم کو بتایا' جو فریضہ رسالت کا تھا اب ختمِ نبوت کے بعد وہ انہوں نے ادا کرنا تھا کہ خدا کی اس کتاب پر خود عمل کرنا تھا اور دوسروں تک یہ پہنچانا تھا۔ خود عمل نہیں کیا تو وہ حضورﷺ کا جو فرمان ہے کہ یہ وہ قوم ہے جس نے قرآن کو مَهْجُوْرًا (25:30) کیا' اس کے مجرم ہیں اور اسے دوسروں تک نہیں پہنچایا' یہ اس سے بھی زیادہ جرمِ عظیم ہے۔

قرآن حکیم جیسی لازوال نعمت کے مل جانے پر ناسپاس گزاری' ناشکری کے جرم کی سزا

قرآن نے کہا ہے کہ ہم نے اس قوم کو وارث بنایا تھا' ہم نے اس قوم کو اس مقصد کے لیے چنا تھا۔ اگرچہ اس میں ایک لفظ آیا ہے' وہ ایسا موضوع ہے کہ شاید اس کے لیے میں دو ایک درس مخصوص کرتا لیکن اب سامنے آیا ہوا ہے' اس لیے اس پہ ذرا سی بات کر دوں۔ یہاں جو کہا ہے کہ جہنم کے اندر یہ ہونگے' ایسا عذاب ہوگا جو ختم ہونا تو ایک طرف رہا' اُس میں تخفیف بھی نہیں ہوگی' چاروں طرف سے موت دکھائی دے گی' موت آئے گی نہیں' نہ زندہ ہوگا' نہ مردہ ہوگا۔ یہ کس کے متعلق کہا' ان کی یہ حالت کیوں ہوگی؟ یہاں یہ بڑی اہم چیز ہمارے

---

[1] یہ اشارہ غالباً مولانا اشرف علی تھانویؒ (1943-1863ء) کی طرف ہے۔

سامنے آئی ہے۔کہا کہ کَذٰلِکَ نَجۡزِیۡ کُلَّ کَفُوۡرٍ(35:36)۔یہاں لفظِ کفور ہے' کافر نہیں ہے' کفار نہیں' کفور ہے۔کفور ناشکرے ناشکر گزار کو کہتے ہیں' کافر نہیں' انکار کرنے والا نہیں ہے' سرکش نہیں ہے' ناسپاس گزار' ناشکرا ہے۔تو گویا یہ ناسپاس گزاری اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کی سزا یہ اس قسم کا جہنم' مستقل عذاب ہے' جس میں تخفیف تک نہیں ہے' موت بھی نہیں آتی۔وہ جرم بتایا ہے۔خدا کی نعمتیں جو اس نے کسی قوم کو فضل وکرم سے دی ہیں' وہ ان نعمتوں کی کفور ہیں۔کفر کے معنی ہوتا ہے''ان کو ڈھانپ کر رکھنا' چھپا کر رکھنا' ظاہر نہ ہونے دینا' جہاں ان کو پہنچانے کے لیے کہا تھا وہاں نہ پہنچانا' جتنا کچھ سمیٹا جا سکے سمیٹ کر' دبا کر رکھ لینا''۔اس کے مقابلے میں انفاق تھا کہ''جو کچھ آیا ہے اس میں اپنی ضرورت کے لیے لے کر باقی سارا بہتے پانی کی طرح آگے بڑھا دو کہ جس جس کو ضرورت ہے اس میں سے لیتا چلا جائے''۔ایسا نہ کرنے والوں کے لیے یہ کُلَّ کَفُوۡرٍ(35:36) آیا ہے۔

شکر کا قرآنی مفہوم یعنی خدا کی طرف سے ملنے والی نعمتوں کو دوسروں کے لیے کھلا رکھنا

یہ کفر' جس سے یہ کفور کا لفظ ہے' اس کے معنی ناشکرا ہیں یعنی یہ کہ اس کو چھپا کر رکھو' ڈھانپ کر رکھو' یہ ہے ناشکر گزاری۔شکر تو وہ تھا جو میں نے کہا تھا کہ عربوں کے ہاں اس قسم کی بکری یا اونٹنی جس کے''ہوانے'' میں ہی دودھ تھا یا کہیں اوپر تھا' وہ اس شکل کا دودھ ہو کہ اس کے تھنوں میں سے خود ٹپک رہا ہو' یہ ہے شکر' یہ ہے شکر گزاری ہے کہ جن کو یہ نعمتیں مل ہوئی ہوں وہ ان کو اس طرح سے ظاہر کریں کہ اس کے اندر سے وہ نعمتیں از خود ٹپک پڑتی ہوں۔یہ ہے شکر۔ناسپاس گزاری یہ ہے کہ جس مقصد کے لیے اُنہیں دیا تھا' اس میں صرف نہ کیا جائے' انہیں چھپا کر رکھا جائے' ڈھانپ کر رکھا جائے' اپنے لیے مخصوص کیا جائے۔وَیَمۡنَعُوۡنَ الۡمَاعُوۡنَ (107:7) جو میں نے کہا تھا کہ تکذیبِ دین کرتے ہیں' جس رزق کو بہتے پانی کی طرح رہنا چاہیے تھا' اس کے آگے بند لگا کر اپنے لیے روک لیتے ہیں' محتاجوں کو محروم کر دیتے ہیں۔یہ تکذیب دین ہے' یہ کفور ہے۔یہاں کافر نہیں ہے۔

کفار کے عمل سے زیادہ سنگین جرم کفور کا ہونا ہے

عزیزانِ من! اب سمجھ میں آیا کہ یہ جو پہلے سزا کی اتنی سنگینی اور شدت تھی کہ یا اللہ! اس سے زیادہ شدید سزا' چاروں طرف سے موت آتی ہے' آتی نہیں' نہ زندہ ہیں' نہ مردہ ہیں' ہر دفعہ کوشش کرتے ہیں کہ کہیں نکل جائیں' دھکا دے کے پھر اس میں لوٹا دیا جاتا ہے۔یہ سزا کس کی ہے؟ اس کے لیے کہا کہ نَجۡزِیۡ کُلَّ کَفُوۡرٍ(35:36) جن کو ہم نے محض اپنے فضل وکرم سے اتنی نعماء دی تھیں' اُنہوں نے پھر ان نعمتوں کے ساتھ یہ کیا کہ جس جس کے قابو میں جو آیا' دبا کر بیٹھ گیا۔قرآن کیا کہہ رہا ہے؟ میں نے کہا ہے کہ یہاں کفار نہیں کہا' کفور کہا ہے۔شکر گزاری کا میں نے کہا تھا کہ میں اس کے لیے اور درس لوں گا' یہ لفظ کہیں آئے گا تو میں اس کے اوپر آؤں گا۔

شکر کے لفظ سے انسان کے اندر اضطراب کی بجائے فراخدلی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے

ہمارے ہاں شکرگزاری تو بس یوں ہے جیسے السلام علیکم ایک Formality (رسم) کا لفظ رہ گیا ہے۔ یہ شکر یا یہ شکرگزاری بھی اسی طرح سے رہ گیا ہے۔ یہ بڑی عظیم انسانی صلاحیت اور سعادت ہے' عزیزانِ من! شکر کا جذبہ بڑی چیز ہے۔ وہ جو کچھ کسی کو دیتا ہے یا احسان کرتا ہے' اس کے متعلق تو قرآن نے کہہ دیا ہے کہ **لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا** (76:9) ہم اس کے بدلے میں تم سے کچھ نہیں چاہتے' ہم شکریہ تک کے بھی متمنی نہیں ہیں۔ ایک طرف تو وہ دوسرے کے لیے یہ کیفیت پیدا کرتا ہے کہ یہ کچھ کرنے والا اس کا بھی متمنی نہ ہو لیکن یہ جو شخص ہے' اس کے لیے قرآن نے کہا کہ تمہارے اندر جذبۂ شکرگزاری ضرور بیدار ہونا چاہیے تھا اور یہ بڑی عظیم بات ہے' عزیزانِ من! یہ جو شکرگزاری کا جذبہ ہے اس سے دوسرے کا احترام پیدا ہوتا ہے' اس سے وسعتِ نگاہ پیدا ہوتی ہے' کشادگیٔ ظرف پیدا ہوتا ہے' اس سے ایک اچھی چیز کو Recognise (تسلیم) کرنا ہوتا ہے کہ اس نے یہ ایسا کیا ہے۔ یہ انسان کی بڑی صفت ہے۔ اس قسم کے کشادہ ظرف لوگ' جن کے دلوں میں یہ جذبہ پیدا ہو جائے کہ جس نے کچھ اچھا کام اس کے لیے کیا ہے' اس کا احترام اس کے دل میں پیدا ہو جائے' یہ اس کی اپنی ذات کی نشوونما کے لیے بڑی چیز ہے' عزیزانِ من!۔ اس کے برعکس نفرت کا' حسد کا' تنگ نظری کا' شکایت کا' شکوے کا' جذبہ ہوتا ہے' ذرا اس کی حالت پہ غور کیجیے' جس جہنم میں وہ رہتا ہے' جو ہر وقت شکایت ہی کرتا رہے' جسے ہر وقت حسد ہی حسد ہو' سوچیے کہ وہ کس جہنم میں رہتا ہے۔ اس کے دل میں کشاد پیدا نہیں ہو سکتی' اس کی نگاہ میں وسعت نہیں ہو سکتی' دل میں انسانیت کے جو لطیف جذبات ہوتے ہیں وہ پیدا نہیں ہو سکتے' اس میں ایک اضطراب کی آگ ہوتی ہے۔

پاکستان جیسی عظیم مملکت کے مل جانے پر بھی ناشکرگزاری کی شکل میں تنگ نظری کی انتہا

کہا کہ **نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ o الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ** (104:6-7) وہ آگ جو دلوں کو لپیٹ لیتی ہے' یہ ناشکرگزاری کی' حسد کی' نفرت کی' بغض کی' کینہ کی' آگ ہوتی ہے۔ سب کچھ مل رہا ہے لیکن ناشکرگزاری ہے مثلاً' کیا لے لیا جی' پاکستان بنا کر وہ تو چلا گیا ہمیں یہاں مصیبت میں ڈال گیا' یعنی چلتے ہوئے کیلے کے چھلکے سے کسی کا پاؤں پھسلے اور گر جائے تو' ہت تیرے پاکستان بنانے والے کی' کیا کر گیا ہمارے لیے۔ آپ کے ہاں عام جذبات یہ پھیلے ہوئے ہیں' خاص طور پہ نئی نسل کو تو اس سازش کے ساتھ Exploit (سلب ونہب) کیا جا رہا ہے کہ بہت اچھے تھے صاحب! ہم ہندوؤں کے ساتھ' بڑے اچھے تعلقات تھے' ہم تو پشتوں سے ان کے ساتھ رہتے تھے' بڑے شریف آدمی تھے' کوئی کوئی بیچ میں بُرا بھی ہوتا ہے' کیا ہم میں بُرے نہیں ہیں۔ ہندوستان کے ساتھ رہتے تو نہ یہ بلائیں آتیں' نہ یہ جنگیں آتیں' نہ یہ خطرات آتے' نہ یہ مصیبتیں آتیں۔

قائداعظمؒ کی وہ بلند کردار شخصیت کہ جس نے اپنی خدمت کے عوض ایک پائی تک وصول نہیں کی

عزیزانِ من! اگر ہندو کے ساتھ انہیں رہنا پڑ جائے تو ہفتے بھر کے اندر چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا' انہیں پتہ نہیں کہ ہندو کیا ہے۔ یہ میں کہہ رہا ہوں جوان میں رہا ہوں۔ وہ جو شکایت اور شکوہ ہے وہ ہے یہ جس کو ناشکر گزاری کہتے ہیں' وہ اس شخص کا ❶ احسانِ عظیم تھا اُس نے قوم سے ایک پائی تک نہیں لی تھی' عزیزانِ من! ایک پائی نہیں لی تھی۔

قائداعظمؒ کی کہانی علامہ پرویزؒ کی زبانی

بات بیچ میں اپنی آ جاتی ہے۔ میں بھی تو ان کے ساتھ کام کرتا تھا' تحریکوں میں جاتا تھا۔ یونہی ایک دن ہنسی ہنسی میں کہنے لگے کہ ایک بات تمہیں بتا دوں' اس قوم کا کچھ کام کرنے کے لیے اگر تمہیں کہیں جانا ہو' اگر کسی جگہ تقریر جلسے کے لیے جانا ہو تو اور تو اور تانگے کے پیسے بھی ان سے نہ لینا' ورنہ یہ چوراہے پہ کھڑے ہو جاتے ہیں' پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہیں اور کہتے ہیں کہ صاحب! یہ شخص کھا گیا' بے ایمان ہے' غدار ہے۔ اس نے کرائے کی صرف چونی دی ہوئی ہوتی ہے اور کہتا یہ کچھ ہے۔ یہ ناشکر گزاری کا جذبہ ہے۔ اُس نے Actually (حقیقتاً) اپنی جان دیدی تھی' واقعی جان دیدی تھی' اپنے اس مرض کو سینے میں چھپا کر رکھا جو اس کو کھائے جا رہا تھا کہ کہیں دشمن کو پتہ نہ چلنے پائے ورنہ وہ ہمیں پاکستان نہیں لینے دیں گے' اپنی جان پہ کھیل کر اُس نے ایک پائی تک نہیں لی' جتنا کچھ عمر بھر میں کمایا ہوا تھا وہ سارا قوم کو وصیت کی رو سے ویسے ہی دے گیا۔ اتنا بڑا ملک' اتنی بڑی مملکت' اور اتنے بڑے اس کے خزائن' وہ سب کے سب قوم کو دے گیا۔

پاکستان کے اس خطہ میں بیک وقت جس قدر خزائن ہیں یہ دنیا بھر میں کہیں نہیں

ہم نے تو کبھی اس ملک کے خزائن کی اس قسم کی تحقیق نہیں کی' اس مقصد کے لیے کوئی کمیشن نہیں بٹھایا کہ جو کچھ اس ملک کے اندر ہے' وہ دنیا کے کسی خطۂ زمین کے اندر بیک وقت اتنا کچھ نہیں ہے۔ مفت' بلا معاوضہ' بغیر کسی محنت کے وہ ہمیں دے گیا۔ لیکن وہ جو ناشکر گزاری کا جذبہ ہے کہ بجائے اس کے کہ ہم مانیں کہ اُس نے بہت بڑا احسان کیا ہے' چلو اللہ کا ہی شکر ادا کریں کہ اُس نے فضل و کرم سے ہمیں یہ دیدیا' ہماری تو محنت ہی اس میں نہیں تھی' عزیزانِ من! یہ ناشکر گزاری' عملاً ناشکر گزاری ہے۔ وہاں تو جو کچھ کسی کے ہاتھ میں آیا' لے کر بیٹھ گیا اور یہ جو دوسری ناشکر گزاری ہے' یہ بھی اس کی وجہ سے ہے۔ یہ اگر یہاں ان نعمائے خداوندی کی تقسیم ہی عدل کے مطابق اور

---

❶ یہ اشارہ قائداعظم محمد علی جناح (1876-1948) کی طرف ہے۔

ضرورتوں کے مطابق ہوتی تو پھر جن کو جائز شکایتیں ہیں، وہ بھی نہ ہوتیں لیکن یہاں تو کیفیت یہ ہے کہ وہ جو کشادگی ظرف ہوتی ہے، وہ نہیں پیدا ہوتی۔

شکر گزاری کو اپنائے بغیر گھر کا ماحول جہنم بنا رہتا ہے

یہاں اگر میں چھوٹی سی مثال دیدوں، تو میری بہنیں اور بیٹیاں مجھے معاف رکھیں۔ گھروں کے اندر کی زندگی میں اگر ناشکر گزاری ہو تو آپ دیکھیے کہ گھر کس طرح سے جہنم بنتا ہے۔ سب کچھ ملتا ہے مگر کہتی ہیں کہ صاحب! وہ جو رشتہ دار یا پڑوسن ہے، ان کے ہاں بہت زیادہ ہے، ان کو بہت کچھ ملا ہے، مجھے اس کے مقابلے میں یہ نہیں ملا یا۔ ویسے ناشکر گزاری میں فطرتاً ہی بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ مجھے کیا ملا، اس گھر کے اندر میرے نصیبے میں تو یہ آیا، میں تو پتہ نہیں کس طرح زندگی بسر کر رہی ہوں۔ بہن! جانے دیجیے، اس کو مت کھولیے، اسپغول کچھ نہ پھول، مجھے اس نے کیا دیا تھا۔ انہیں خاوند سے شکایت ہے، بیٹوں سے شکایت ہے، عزیزوں سے شکایت ہے، اور ہر وقت شکایت ہے۔ خود جہنم میں ہیں، گھر جہنم بنا رکھا ہے، بچوں کے دلوں کے اندر باپ کے خلاف زہر پھونکی جا رہی ہے کہ معلوم نہیں کتنا کچھ ظلم ہو رہا ہے۔ ایک شکر کا جذبہ پیدا کر لیجیے، جائز شکایت بڑی صحیح ہے، جائز تکلیف کا مداوا ضرور ہونا چاہیے لیکن یہ اور بات ہے، یہ پھر شکوہ اور شکایت والی بات ہے۔ وہ ایک اور جذبہ ہوتا ہے کہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی شکایت ہے۔ یہ ہے وہ جس کو ناشکرا کہتے ہیں۔ شکر کا یہ جذبہ پیدا کرنے سے یہ طبعی چیزیں تو وہی ہوتی ہیں لیکن خود بھی ایک سکون اور اطمینان کی جنت نصیب ہو جاتی ہے، گھر کا ماحول بھی جنتی بن جاتا ہے، اسی کو آگے پھیلائیے تو معاشرہ ہوتا ہے۔ اسی معاشرے میں اگر اس پاکستان کے ملنے کے اوپر شکر گزاری کے جذبے ہوتے، تو اس کو Defend (دفاع) کرنے، اس کو محفوظ کرنے کے لیے، ہم اپنی جانیں دیدیتے کہ خدا کے فضل و کرم سے ہمیں اتنی بڑی چیز ملی ہے، اس کو کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہیے، اس کو کوئی گزند نہیں پہنچنی چاہیے، اور اس کے برعکس اگر یہ ہو کہ صاحب! وہ خوامخوہ کے لیے مصیبت ہمارے گلے میں ڈال گیا، آپ تو مر گیا اور پتہ نہیں ہمیں کیا کر گیا:

اسیرِ پنجۂ عہدِ شباب کرکے مجھے
کہاں گیا میرا بچپن خراب کرکے مجھے

قائداعظمؒ سے بدسلوکی اور اس ناقدری کا نتیجہ

اس محسن کو گالیاں دیتے ہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ سازش بھی ہے، مجھے اس کا معلوم ہے لیکن ہم سازش کا شکار ہو جاتے ہیں۔ عام طور پہ یہ چیز ہے کہ یہ زبان پہ بھی نہیں آتا کہ شکر گزاری کا جذبہ ہمارے دلوں میں کبھی موجزن نہیں ہوا کہ کتنی بڑی چیز تھی جو بلا مزدو

معاوضہ ہمیں مل گئی۔ عزیزانِ من! ان کے اعداد و شمار بتائے ہوئے بھی دیکھیے کہ اس تیس سال کے عرصے میں، کم از کم چار ہزار ایسے فسادات وہاں مسلمانوں کے خلاف ہو چکے ہیں، جہاں ہزاروں کی تعداد کے اندر قتل و غارت گری ہو چکی ہے، کسی بڑی ملازمت میں وہاں آپ کو ایک مسلمان نہیں ملے گا، تجارت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے، بستیوں کی بستیوں کو آگ لگا دی جاتی ہے، کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ یہاں آپ اندازہ لگائیے خدا کے فضل و کرم سے ہی کہہ لیجیے۔ یہ میں کوئی چھوٹی بات نہیں کہہ گیا، میں کبھی کسی اور درس میں اس کے اوپر آؤں گا جہاں خدا نے شکر گزار ہونے کی تاکید کی ہے لیکن یہاں تو یہ دیکھیے کہ یہ جہنم کا عذاب بتایا ہے۔ اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ تم ناشکرے ہو۔ ہے نا عذابِ جہنم جس میں ہم مبتلا ہیں، اس کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم ناشکرے ہیں، سب کچھ ہوتے ہوئے بھی جہنم میں ہیں۔

ناشکر گزار قوم کو ہر وقت سوائے پژمردگی کے بھیانک چہرے کے کچھ نظر نہیں آتا

میں اس لیے کہہ رہا تھا کہ یہاں قرآن ایک بڑی اہم بات کہہ گیا ہے۔ کہا ہے کہ **كَذٰلِكَ نَجْزِیْ كُلَّ كَفُوْرٍ** (35:36) یہاں کفار نہیں کہا۔ کہا کہ جو قوم ناشکری ہو جاتی ہے، وہ اس قسم کے جہنم میں مبتلا ہو جاتی ہے، اس کے عذاب میں تخفیف بھی نہیں ہوتی، انہیں موت بھی نہیں آتی، نہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں، ہر وقت موت کا بھیانک چہرہ آتا دکھائی دیتا ہے، موت آتی نہیں ہے۔ یہ کس جرم میں ہے؟ **كُلَّ كَفُوْرٍ** (35:36) جذبۂ شکر گزاری نہیں ہے۔ یہ جذبہ بڑی چیز ہے عزیزانِ من! یہ قرآن بڑی بات ہے۔ کبھی ہماری اپنے اس جرم کی طرف نگاہ ہی نہیں جاتی۔ اور یہ ہے وہ چیز۔ ٹھیک ہے جو چیزیں لوگوں کے دلوں کے اندر جائز شکایت کی ہیں، ان کا دور کرنا نہایت ضروری ہے اس کے بعد جذبۂ شکر گزاری بیدار ہوتا ہے، یہ نہایت ضروری ہے، لیکن من حیث القوم تو ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ خدا کا بہت بڑا فضل تھا اور جس کے ہاتھوں سے یہ فضل خدا نے ہم تک پہنچایا، اس کا بھی ہمیں شکر گزار ہونا چاہیے، اس کا قوم کے اوپر بہت بڑا احسان تھا، وہ اس قوم کا بڑا محسن تھا۔ اور جہنم ہمیں اس لیے ملتا ہے کہ **كَذٰلِكَ نَجْزِیْ كُلَّ كَفُوْرٍ** (35:36) ہم ناشکر گزار ہیں۔

بات میں کہہ رہا تھا کہ **جَآءَكُمُ النَّذِیْرُ** (35:37) تمہارے تک بات پہنچائی بھی گئی تھی کہ یہ جو راستہ ہے، ہلاکت کا ہے، تباہی کا ہے، اس کے باوجود دیکھتے ہوئے، بھالتے ہوئے، جانتے ہوئے، بوجھتے ہوئے، پھر تم اس طرف چلے گئے۔ تو ٹھیک ہے۔ **فَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ نَّصِیْرٍ** (35:37) ظلم کرنے والوں کا کوئی دوست نہیں ہوتا۔ جو بظاہر دوست ہوتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ یہ اسی ظلم کے اندر اور بڑھتے جائیں تا آنکہ یہ تباہی کے اس گڑھے میں جا گریں جہاں سے نکلنا ہی نصیب نہ ہو: **فَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ نَّصِیْرٍ** (35:37)۔

خدا کی ذات جذبات واحساسات کی کیفیات سے بالاتر ہے لیکن وہ ہر قسم کے انسانی جذبات سے پوری طرح باخبر ہے

میں نے عرض کیا ہے کہ یہ چیزیں خدا کہہ رہا ہے جو انسانی جذبات سے بلند ہے۔ یہ نہیں ہے کہ اُس نے اپنے آپ کو اس جہنم میں ڈال کر محسوس کیا ہو کہ یہ ان احساسات کا اظہار ہے جو اس کے ہاں سے ہو رہا ہے۔ یہ جذبات واحساسات اس کے ذاتی نہیں ہیں اِنَّ اللّٰهَ عٰلِمُ غَيْبِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (35:38) اُس کا دل تو جہنم کی اس آگ کے سوز میں نہیں گیا لیکن وہ تمہارے دلوں کی گہرائیوں میں ابھرنے والے جذبات سے واقف ہے۔ اب علم کی ایک اور Definition (تعریف) ہمارے سامنے آ گئی، علم اور معلومات میں فرق ہو گیا۔ معلومات تو صرف Information (اطلاعات) ہیں اور علم یہ ہے کہ جو دوسرے پہ گزر رہی ہے اس کا احساس آپ کے دل کے اندر پیدا ہو، پھر صحیح معنوں میں آپ اس کے غمگسار بھی ہو سکیں گے، ہمدرد بھی ہو سکیں گے، مداوا بھی صحیح کر سکیں گے۔ اور اگر آپ کو یہی علم نہیں ہے کہ اس کے دل پہ کیا بیت رہی ہے، اس کے لیے آپ کیا کریں گے۔ یہ علم کی ایک نئی Definition (تعریف) آئی۔ ٹھیک ہے اُس وقت جو اس پہ بیت رہی ہے آپ اس اندوہ میں شریک نہیں، آپ پہ وہ صدمہ نہیں ہوا، آپ کے دل میں از خود چیزیں پیدا نہیں ہوئیں لیکن علم کی یہ کیفیت ہے کہ اُس پہ جو بیت رہی ہے، اُس کی جو ٹیس ہے، وہ آپ اپنے جگر میں محسوس کریں۔ کہا کہ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (35:38) یہ بات ہے، اس لیے یہ نہ کہو کہ اللہ میاں! تمہیں کیا پتہ کہ مجھ پہ کیا بیت رہی ہے، تم کیا جان سکتے ہو۔ وہ جو مزاح نگار مرزا اسد اللہ غالب (1869-1797) نے کہا تھا، اس کا مطلب یہ تھا کہ جس کا اُسے تجربہ نہیں ہے، وہ کیا جانے۔ بیوی تو بڑی نماز ن پرہیز گار تھی، تو وہ آ کر بیٹھی کہ یہاں یہ ہو رہا ہے، وہ ہو رہا ہے، تمہارا گھر تم سے سنوارا نہیں جاتا اور یہ دیکھیے ایک سلسلۂ کائنات کس حسن وخوبی سے چل رہا ہے، کہیں بگاڑ نہیں ہے، کہیں خلا نہیں ہے، کہیں کسی قسم کا نقص نہیں ہے، کمزوری نہیں ہے۔ وہ یہ سارا کچھ سن رہے تھے، کہنے لگے کہ بڑی بی! مجھے معلوم ہے جو تم کہتی ہے، بالکل ٹھیک ہے، لفظاً لفظاً میں اتفاق کرتا ہوں کہ ایسا ہی ہے، یہ چل رہا ہے لیکن کبھی اس پہ غور کیا کہ یہ اس حسن وخوبی کے ساتھ کیوں چل رہا ہے، کہنے لگی کہ نہیں۔ کہنے لگے کہ یہ اس لیے چل رہا ہے کہ اللہ میاں نے شادی نہیں کی تھی، ہم تو جب مانتے کہ بیوی گھر پہ ہوتی اور پھر وہ اس طرح چلاتے۔

بات کسی کے احساسات کو محسوس کرنے کی ہوتی ہے

بات وہ (مرزا اسد اللہ خاں غالب) یہ کہہ گیا ہے کہ جس پہ بیتتی نہیں ہے، اُسے کیا پتہ ہے کہ کیا ہوتا ہے لیکن وہ کیا جواب دے گیا ہے! قرآن کے یہ مقامات ہیں جہاں کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تم کہو گے کہ تم پہ تو بیتی نہیں ہے، تمہیں کیا معلوم کہ ہم پہ کیا بیت

رہی ہے۔کہا کہ اِنَّ اللّٰہَ عٰلِمُ غَیْبِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (35:37)۔غَیْبِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ کا تو عٰلِمُ ہے اور جو تمہارے دل میں گزر رہی ہے وہ اس کا عَلِیْمٌ ہے بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ہے یعنی تمہارے دلوں کے اندر جو گزر رہا ہے وہ اس کا علیم ہے۔ عٰلِمُ کسی ایک وقت کے ہنگامے کے علم کو بھی کہتے ہیں' علیم ہوتا ہے جو''مسلسل طور پر کسی کے ساتھ اس قسم کا جو علم ہے کہ جو اس کے دل میں بیت رہی ہے' اس کو محسوس ہو رہا ہے' اور مسلسل ہو رہا ہے'' یہ کسی ایک واقعہ کی بات نہیں ہے کہ تمہارے اس ہنگامے کے اندر معلوم ہوا ہے کہ تم پہ کیا بیتی ہے بلکہ ساری زندگی تم پہ جو بیتتی چلی جائے گی' تمہارے دلوں کے اندر جو کیفیات ہونگی' جو جہنم کی آگ ہوگی' ہمیں اس کا علم ہوگا اور اسی علم کی بنا پہ ہم یہ بات تم سے کہہ رہے ہیں' یہ نہ کہنا کہ اللہ میاں! تمہیں کیا پتہ کہ ہم پہ کیا بیت رہی ہے۔

زمین پر انسان خدا کا خلیفہ نہیں بلکہ یہ سابقہ مخلوق کا جانشین ہے

کہا کہ اے ناشکر گزارو! سنو هُوَ الَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ (35:39) پہلی چیز تو یہ لو کہ تمہیں زمین پہ پیدا کیا' یعنی تمہیں' انسان کو اور جتنی مخلوق اس زمین کے اوپر تھی' مَـافِی السَّمٰوٰتِ بھی تھی' پیدا کیا' اُس نے تو کہا ہے کہ کائنات کی باقی مخلوق کے اوپر تمہیں صاحب اقتدار بنایا ہے' ارے اس کے لیے تم نے کچھ کیا ہی نہیں ہے۔تمہاری خلقت کے اندر ہم نے یہ چیز رکھ دی' تمہیں اس قسم کا بنایا۔وہ بات تو پہلے گزر چکی' دوبارہ کیا دہراؤں' جو ہم کہتے ہیں کہ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً (2:30)۔اس کے لیے کہتے ہیں کہ اس دنیا میں خدا نے اپنا خلیفہ انسان کو بنایا' اپنا نائب بنایا۔نائب اور خلیفہ وہ ہوتا ہے جو اس کی عدم موجودگی میں اس کے کام کرے۔ اس میں پہلی چیز''عدم موجودگی'' آ گئی۔یہ تصور ہی اُنہوں نے دیا ہے جو انسانوں کی اس دنیا کے اندر زندگی میں خدا کو مانتے نہیں ہیں۔ اُس نے ٹھیک کہا تھا کہ تم خداوند ہی کہلاؤ' خدا اور سہی۔اپنے آپ کو خداوند کہلاتے ہیں۔ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً (2:30) کا ترجمہ کیا کہ ہم نے زمین میں تمہیں اپنا خلیفہ بنایا۔اس ترجمے میں اپنے کا لفظ ہی اپنی طرف سے ہے' وہ قرآن میں ہے ہی نہیں۔

انسان کسی سابقہ مخلوق کا جانشین (Successor) ہے اور صاحب اقتدار ہے۔پہلی چیز تو یہ ہے کہ پورے انسانوں کو' کائنات کی جتنی Physical Wrold (طبعی دنیا) کی چیزیں ہیں' ان کے اوپر سخر لکم تمہیں تابع تسخیر کر دیا ہے' یہ اقتدار کی بہت بڑی چیز ہے۔اور پھر یہ جو اُس میں سے قوم تھی جس کو وراثتِ کتاب کے لیے چنا تھا' اس کے لیے یہ آئے گا۔اِسْتِخْلَاف فِی الْاَرْضِ اس کو کہتے ہیں۔کہا کہ یہ تمہارے ایمان اور عملِ صالح کا نتیجہ ہوگا' تمہیں جو اقتدار ملے گا وہ اس لیے ملے گا کہ تم خدا کی اس کتاب کو عملاً نافذ کرو۔اس کے یہ معنی ہیں' عزیزانِ من! کہا کہ انسان ہونے کی حیثیت سے' جو تمہیں ہم نے صاحبِ اقتدار بنایا ہے' ذرا اس کی شکر گزاری کی طرف آؤ' دیکھو تو سہی کہ دنیا کے اندر کتنی بڑی مہیب قوتیں اور طاقتیں ہیں اور تم ان کے اوپر بھی صاحبِ اقتدار ہو' ایٹم (Atom) کا

ذرہ ایک شہر کو تباہ کرتا ہے' اُس پہ اس کا اقتدار جو بٹن کو دباتا ہے' کتنا بڑا اقتدار ہے۔ کہا کہ یہی احسان مانو کہ یہ کچھ تمہارے لیے کیا۔ اب کہا کہ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ (35:39)۔ یہ وہی کفر کی بات ہے اور اس کے بعد جو ناشکر گزار ہوتا ہے پھر وہ سزا بھگتتا ہے۔ سوال تو یہ ہے کہ اس میں شکر گزاری کی بات ہے۔ کہا کہ وَ لَا يَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ كُفْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اِلَّا مَقْتًا (35:39)۔ یہاں دونوں چیزیں آگئی ہیں کہ اس کفر کے اندر' قوانین کی خلاف ورزی بھی کرنا اور کفور یعنی ناشکر گزاری بھی کرنا۔ تو خدا کے نزدیک جو بھی ایسا کرتا ہے' یہاں جو مقتاً لفظ آیا ہے' اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ اس سے خدا کا بغض بڑھتا (معاذ اللہ) ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔

قرآنِ حکیم کے مروجہ تراجم نے انسان کے مذموم جذبات کو خدا کی طرف منسوب کر رکھا ہے

مقتاً کا یہ ترجمہ کیا جاتا ہے یا ذرا اور Mild Form (نرم صورت) میں اس لفظِ مقتاً کا ترجمہ کرتے ہیں کہ خدا کی نفرت بڑھتی ہے' گویا وہ بغض بھی کرتا ہے' غضبِ خداوندی بھی ہوتا ہے' اُس کو غصہ بھی آتا ہے' بغض بھی ہوتا ہے' نفرت بھی ہوتی ہے (معاذ اللہ)۔ جو انسان کے مذموم جذبات ہیں' ان سب کو اس کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے۔ یہ سوال ہی نہیں ہے۔ سوال تو یہ ہے کہ یہ کچھ جو تم کر رہے ہو' یہ ہمارے قوانین سے ہم آہنگ نہیں ہے' اُس کے مطابق نہیں ہے' یہ اُس کے خلاف ہے۔ رضا مندی کے معنی ہوتے ہیں ''کسی چیز کے ساتھ ہم آہنگ ہونا' اُس کے ساتھ چلنا''۔ تو یہ جو تم ان قوانین سے خلاف ورزی برت رہے ہو' اس سے تو بُعد ہوتا چلا جا رہا ہے' تم میں اور خدا کے ان قوانین میں دوری ہوتی چلی جائے گی۔ تمہاری یہ ریل گاڑی دوسری پٹڑی پہ پڑ گئی ہے' جتنا جی چاہے تیزی سے چلاؤ' جتنا تیزی سے چلاؤ گے منزلِ مقصود سے بُعد ہوتا چلا جائے گا۔ یہ ہوتے ہیں ان الفاظ کے معنی۔ خدا بغض' نفرت' حسد اور انتقام کے جذبوں والا خدا نہیں ہوتا' وہ تو رحمٰن و رحیم ہے۔ کہا ہے کہ وَ لَا يَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ كُفْرُهُمْ اِلَّا خَسَارًا (35:39) اور اس کے بعد ان کا نقصان بڑھتا چلا جاتا ہے۔ نقصان تو ان کا بڑھتا ہے۔ یہ کہنا غلط ہے کہ خدا کے دل میں (معاذ اللہ) بغض یعنی مذموم سا ہی جذبہ ہوتا ہے۔ کسی کے متعلق تو کہو کہ اس کا سینہ سوز و بغض سے بھرا ہوا ہے لیکن ہمارے ہاں ترجمے ہی یہی ہوتے ہیں جن سے قرآن کا صحیح مفہوم سامنے نہیں آتا۔

کائنات میں انسان صاحبِ اختیار تو ہے لیکن خدا کے قوانین میں دخل انداز نہیں ہو سکتا

کہا کہ یہ تو ہے وہ خدا۔ اور اس کے بعد قُلْ اَرَءَيْتُمْ شُرَكَآءَكُمُ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (35:40) جنہیں تم خدا بنائے بیٹھے ہو' ہم نے تو تمہیں اتنا بڑا اختیار اور اقتدار دیا ہے' ذرا ان کے متعلق ہمیں بتاؤ کہ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ (35:40) اس ارض کے اندر' سماوات کے اندر' انہوں نے کیا چیز پیدا کی ہے؟ عزیزانِ من! آج تک گھاس کی ایک پتی سارے سائنسدان مل کر بھی پیدا نہیں کر سکے' مکھی کی ایک ٹانگ بھی نہیں بنا سکے۔ خدا کے دیئے ہوئے مادے (Matter) میں'

جو اُس نے میٹریل (مواد) دیا ہوا ہے اُس میں مختلف تراکیب سے جو نئی نئی چیزیں ہیں یہ تو ایجاد ہو جاتی ہیں لیکن وہ جو اوریجنل چیز اُس نے دی ہوئی ہے اُس کی تخلیق انسان سے ممکن ہی نہیں۔ وہ تو Nothingness (عدم) سے لایا ہے یعنی جب کچھ نہیں تھا تو اُس نے وہ پیدا کیے۔ اب بھی جو Elements (عناصر) گناتے ہیں' پہلے غالباً 92 بتاتے تھے' اب ان میں کچھ اضافہ ہوا ہے' وہ عناصر مختلف چیزوں کے ملانے سے ایک چیز نہیں بنی ہوئی۔ Element (عنصر) تو کہتے ہی اس کو ہیں کہ اُس کے بعد وہ مزید تقسیم نہیں ہوتا۔ اگر مزید تقسیم کر دیا جائے تو برقیوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ کہا کہ بتاؤ تو سہی کہ انہوں نے کوئی اس قسم کی چیز بنائی ہے جو یہ Nothingness (عدم) سے وجود میں لے آئے ہوں۔ زمین میں کوئی چیز بنائی' آسمانی کروں میں کچھ' اس قسم کا انہوں نے بنایا۔ **اَمْ اٰتَیْنٰهُمْ كِتٰبًا فَهُمْ عَلٰى بَیِّنَتٍ مِّنْهُ** (35:40) یا کوئی اس قسم کا ضابطۂ قوانین واخلاق ہی دیا ہو جو قرآن جیسا ہو جسے ہم کہتے ہیں کہ بے مثل ہو' بے نظیر ہے۔ یہ اس قسم کی چیز ہوتی تو تمہیں کچھ تھوڑا سا مغالطہ بھی لگ سکتا تھا' یہ چیز متشابہ (Similar) بھی ہو سکتی تھی ''بھلیکا لگ گیا اے جی''[1] کہ خدا نے بھی یہ بنایا تھا' انہوں نے بھی یہ کچھ بنا دیا' کچھ تھوڑا سا مغالطہ ہو گیا۔ کہنے لگے کہ بتاؤ تو سہی ہے' اس کا تمہارے پاس کوئی جواب ہے؟

صراطِ مستقیم سے ہٹ کر انسان کا اپنا کردار' ہمیشہ اپنی مفاد پرستی پر مبنی ہوتا ہے

کہا کہ بات ساری اتنی ہے کہ **بَلْ اِنْ یَّعِدُ الظّٰلِمُوْنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا اِلَّا غُرُوْرًا** (35:40) یہ مفاد پرست طبقہ ایک دوسرے سے یہ کہتا رہتا ہے کہ میاں! چھوڑو یہ دیانتداری' یہ ایمانداری جس طرف چلے جا رہے ہو' اس سے کچھ نہیں بنے گا' نقصان اٹھاؤ گے' چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی' "When in Rome do as Romans do" ساری دنیا کا جو چلن ہے وہی چلن ہونا چاہیے' دیکھیے وہ ذرا سے چار پیسے لے کر بیٹھا تھا' اُس نے مال بنا لیا ہے لگے ہوئے ہو' تم اپنی دیانتداری کے اندر۔ کہتا ہے کہ یہ جو لوگ ہیں' محض اس لیے کہ ان کے ان کارناموں کو کوئی برا نہ کہے' وہ دوسروں کو بھی اکساتے رہتے ہیں کہ تم بھی ایسے ہی ہو جاؤ۔ **اِلَّا غُرُوْرًا** (35:40) خود بھی دھوکے میں ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی دھوکے میں رکھتے ہیں۔

انسان کو اس قدر وسیع کائنات کی بناوٹ اور اس کے نظم ونسق پر غور وفکر کرنا ہوگا

ارشادِ خداوندی ہے کہ اس کے قانون کے مطابق جو نظم ونسق چلتا ہے' ذرا اس کو دیکھو۔ کہا کہ **اِنَّ اللّٰهَ یُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا** (35:41)۔ یہاں بیٹھے ہوئے تم دیکھتے ہو کہ سورج چڑھا' اُدھر سے آیا اُدھر چلا گیا' چاند چڑھا غروب ہو گیا' جی ستارے آئے چلے گئے' اتنا ہی تمہیں پتہ ہے' تمہیں پتہ نہیں ہے کہ یہ کتنے کتنے بڑے عظیم الجثہ کرّے ہیں' سوچو تو سہی کہ یہ اس فضا کے اندر

---

[1] کہ جی! مغالطہ لگ گیا ہے

کس سہارے کے اوپر معلق ہیں۔ ہمارا ایک قانون ہے' اس قانون کی قوت دیکھنا چاہتے ہو تو ان کو دیکھو۔ یہ کششِ ثقل (Gravitation) کا ایک قانون ہے' یہ اس کی رو سے ہے اور جو بڑے بڑے کرّے ہیں' ان کو تو جانے دیجیے۔ یہ سورج زمین سے 13 لاکھ گنا بڑا ہے' کہتا ہے کہ یہ کرّے اس فضا کے اندر جو اس طرح سے معلق چلے جا رہے ہیں' لَمْ تَـرَوْنَهَا (13:2) دوسری جگہ کہا ہے کہ کوئی ایسا ستون نہیں ہے جن کو تم دیکھ سکو مگر ستون تو ہیں۔ یہ بڑی عجیب چیز ہے تَـرَوْنَهَا کہہ کر کہا کہ تمہاری ان آنکھوں سے نہیں نظر آ سکتا' وہ ایک کشش ہے' وہ Visible (مرئی) نہیں ہوتی' ہمارا قانون ہے جس کی رو سے یہ اتنے عظیم الجثہ کرّے تیر رہے ہیں۔

یہ کائنات تو اپنے اندر کششِ ثقل کے کروڑویں حصے کی کمی بیشی کو بھی برداشت نہیں کر سکتی

کہا کہ وَ لَـئِنْ زَالَتَـآ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِهٖ (35:41) اگر ذرا کششِ ثقل کا کروڑواں حصہ بھی کم ہو جائے تو تمہارے ہاں کوئی قوت ہے جو پھر ان کو اس کے بعد سنبھال سکے۔ "Origin of Planet" ایک کتاب میرے پاس آئی تھی۔ وہ جوان علوم کے لکھنے والے ماہرین ہیں وہ ایسے لکھ رہے ہیں جیسے ڈرے ہوئے' کانپتے ہوئے' وہ لکھ رہے ہیں کہ بابا! تم لوگوں کو پتہ نہیں ہے' ہم سے پوچھو کہ ایک انچ کے کروڑویں حصے کے برابر بھی اگر کسی کی رفتار یا راستے میں فرق پڑ جائے تو اس سے جو قیامت برپا ہو گی' جس طرح سے یہ ٹکرائیں گے' کہتا ہے کہ ہم سے پوچھو ہم تو روز ان کی طرف دیکھتے ہیں۔

قدم قدم پر انسان کی بدنظمی اور غلط روش پر خدا کو بُردبار ہونا پڑتا ہے

کہا کہ اگر کسی ایک کرّے کے اندر یہ کیفیت پیدا ہو جائے تو ساری دنیا کے انسان مل کر بھی کیا تمہاری یہ کیفیت ہے کہ تم اسے سنبھال سکو گے؟ لیکن وہ ہے کہ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا (35:41) تم یہ کچھ کرتے چلے جاتے ہو' اس کے باوجود وہ کبھی تمہاری جلدی گرفت نہیں کرتا' بڑا بردبار ہے' بڑے لمبے لمبے وقفے دیتا ہے' تم کو مہلتیں دیتا ہے' کاہے کے لیے دیتا ہے؟ غَـفُـوْرًا (35:41) تاکہ تم بچے رہو' تباہ نہ ہو جاؤ' تمہاری حفاظت کی خاطر ہمیں بردبار ہونا پڑا ہے۔ کہا کہ وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَ هُمْ نَذِيْرٌ لَّيَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ فَلَمَّا جَآءَ هُمْ نَذِيْرٌ مَّا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا (35:42) یہ قسمیں کھایا کرتے تھے کہ صاحب! اگر کوئی اس قسم کا ہماری طرف آ جائے جو ہمیں صحیح راستہ بتا دے' تو ہم بے حد شکرگزار ہونگے' اس کے راستے میں فوراً سجدے کریں گے اس کو قبول کر لیں گے۔ کہتا ہے کہ جب ان کے پاس وہ آیا تو ان کی کیفیت کیا ہوئی؟ یہ کہ مَّا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا (35:42) ان کی نفرت بڑھ گئی۔

انسان کی کوئی بھی تدبیر خدا کے قانون کا مقابلہ نہیں کر سکے گی

کہا کہ اسْتِكْبَـارًا فِـى الْاَرْضِ وَمَـكْـرَ السَّيِّءِ (35:43)۔ ان کی نفرت کیوں بڑھ گئی؟ انہیں جو اپنی مملکت میں اقتدار

حاصل تھا' جووہ کہہ رہا تھا' اُس سے اقتدار چھن رہا تھا' نفرت کی یہ وجہ تھی۔ اوراس کے لیے یہی نہیں کہ چلو بائیکاٹ کر دیا ہو' دخل نہ دیا ہو' نہیں! سازشیں کرنے لگ گئے' ناہمواریاں پیدا کرنے کے لیے تدبیریں کرنے لگ گئے کہ کس طرح اس کی بات کو الٹیں' کس طرح اس کے نظام کو تباہ کریں' کس طرح اس کے راستے میں کھڑے ہوں' یہ سازشیں شروع کرنے لگ گئے۔ اور آگے ایک بات ہے' عزیزانِ من! عجیب بات ہے۔ کہا کہ وَ لَا یَحِیۡقُ الۡمَکۡرُ السَّیِّئُ اِلَّا بِاَہۡلِہٖ (35:43) یاد رکھو! غلط سازشیں اور تدبیریں کرنے والوں کی یہ تدبیریں الٹ کر انہی کے اوپر جا کر پڑا کرتی ہیں لیکن وہ جو مہلت کا وقفہ اُس نے دیدیا ہے' اُسی سے تو تباہیاں آتی ہیں۔ فَہَلۡ یَنۡظُرُوۡنَ اِلَّا سُنَّتَ الۡاَوَّلِیۡنَ (35:43) اصل میں یہ انتظار کر رہے ہیں کہ جس طرح سے پہلی قومیں تباہ ہوئی تھیں یہ اس مقام تک پہنچ جائیں اور پھر یہ بھی اُسی طرح تباہ ہو جائیں۔ کیا یہ اسی کا انتظار کر رہے ہیں کہ ان کی بھی کیفیت' ان کا بھی انجام اور مآل' وہی ہو جائے جو انہی جیسی پہلی اقوام کا ہوا تھا؟ تو ان سے کہہ دیجیے کہ فَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَبۡدِیۡلًا ۚ وَ لَنۡ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَحۡوِیۡلًا (35:43) خدا کے قوانین اوراس کی روش میں تبدیلی تو ایک طرف رہی' اُس کا رخ بھی دوسری طرف نہیں مڑا کرتا' آندھی کا نہ آنا تو ایک طرف رہا' یہ بھی نہیں ہوتا کہ وہ آندھی آئے اور کسی دوسری طرف اپنا رخ کرلے' ٹھیک یہ اپنے ہدف کے اوپر آیا کرتی ہے۔ اگر یہ سُنَّتَ الۡاَوَّلِیۡنَ دیکھنا چاہتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ یہ کوئی مذاق کی بات نہیں ہے جو یہ کچھ کر رہے ہیں۔ ہمارے قوانین کی خلاف ورزی کا مآل آتا ہے' انجام آتا ہے' تباہی آتی ہے تو پھر اس میں نہ تبدیلی ہوتی ہے نہ وہ اپنا رخ بدلتی ہے۔

دنیا کی کوئی قوم بھی سنت اللہ کو عاجز نہیں کر سکتی

کہا کہ اس کے ثبوت کے لیے ان سے کہو کہ اَوَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَیَنۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ وَ کَانُوۡۤا اَشَدَّ مِنۡہُمۡ قُوَّۃً (35:44) جاؤ چلو پھرو زمین کے اندر' ملک کے اندر' مختلف اقوامِ عالم جو تباہ ہوئی تھیں ان کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات کی اینٹوں کے اوپر' ان کی داستانیں لکھی ہوئی ہیں' پڑھو جا کر کہ سنت اللہ کس طرح تباہ کیا کرتی ہے' جاؤ دیکھو ان کو تم سے زیادہ قوت رکھتی تھیں' تم سے زیادہ دولت رکھتی تھیں' ان کے جتھے بھی تم سے زیادہ تھے' پھر دیکھو تو سہی خدا کے قوانین کی خلاف ورزی' ظلم اور ستم کا انجام کیا ہوا؟ جا کر ان کے کھنڈرات کو دیکھو۔ وَ مَا کَانَ اللّٰہُ لِیُعۡجِزَہٗ مِنۡ شَیۡءٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِی الۡاَرۡضِ (35:44) کیا سمجھتے ہو خدا کو عاجز کر سکتے ہو تم؟ اُس کے قوانین کے نتیجے کو روک سکتے ہو تم؟ وہ کمزور نہیں ہے کہ تم اس کو عاجز کر دو گے' قطعاً ایسا نہیں ہوگا' تم تو ایک طرف مِنۡ شَیۡءٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ کائنات کی کوئی شے بھی ایسی نہیں ہے جو اس کے قانون کو بےعمل بنا دے' بےنتیجہ بنا دے۔ اِنَّہٗ کَانَ عَلِیۡمًا قَدِیۡرًا (35:44) علم کی بنا پہ اُس نے اپنے قوانین مقرر کیے ہوئے ہیں' کوئی ان کو

روک نہیں سکتا۔

انسانی دنیا کے لیے اس کائنات کے اندر مہلت کا وقفہ خدا تعالیٰ کی رحمانیت کا ظہور ہے

اور آگے کہا ہے کہ وَ لَوْ یُؤَاخِذُ اللّٰہُ النَّاسَ بِمَا کَسَبُوْا مَا تَرَکَ عَلٰی ظَھْرِھَا مِنْ دَآبَّۃٍ وَّ لٰکِنْ یُّؤَخِّرُھُمْ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی (35:45) بات ساری اتنی ہے کہ اگر خدا کی سنت یہ ہوتی، روش یہ ہوتی کہ جونہی کسی نے ایک غلط کام کیا، فوراً اس کا گلا دبوچ لیا جائے تو اس زمین پر کوئی انسان زندہ باقی نہ بچتا ''گل تے بڑی ٹھیک ہے۔ باقی انسان اپنے آپ جانڑ ساڈے اچ کوئی نہ بچدا[1]''۔ کہتا یہ ہے کہ اگر یہ چیز ہوتی یعنی وہ قانونِ مہلت کے متعلق بتاتا ہے کہ یہ تمہارے اوپر اس کا احسان ہے، اس سے ناشکر گزار مت ہو، اس سے فائدہ اٹھاؤ، اگر وہ فوراً پکڑتا، فوراً گرفتار کرتا تو کوئی متنفس نہ بچتا، قرآنِ کریم میں دَآبَّۃٍ کا لفظ ہے، یہ ہر متنفس کے لیے آتا ہے، جاندار کے لیے آتا ہے لیکن چونکہ اس نے کہا ہے کہ وَ لَوْ یُؤَاخِذُ اللّٰہُ النَّاسَ بِمَا کَسَبُوْا (35:45) انسان جو کچھ کرتے ہیں، ظلم اور ستم ناشکر گزاری اگر اُس سے وہ فوراً پکڑ لیتا تو وَّ لٰکِنْ یُّؤَخِّرُھُمْ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی (35:45) اور وہ وقفے کی جو مدت ہے وہ درمیان میں نہ رکھتا، فوراً گرفت ہوتی تو اس کرۂ ارض پر، زمین کی پشت کے اوپر، کوئی انسان تمہیں نظر نہ آتا۔

مہلت کا وقفہ ختم ہونے پر خدا کا قانون نتیجہ خیز ہوئے بغیر نہیں رہتا

اسے بھی یاد رکھو کہ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُھُمْ (34:45) جب وہ مہلت کا وقفہ گزر جاتا ہے تو پھر اس میں ایک ثانیے کی بھی تاخیر نہیں ہوتی، پھر سنت اللہ اپنا کام کر جاتی ہے، پھر اس طرح تباہی آتی ہے کہ جس کے نشانات تمہیں ان کھنڈروں میں ملیں گے۔ کہا یہ کہ تـنـذیـر، ہماری طرف سے وارننگ ہے کہ اس مہلت کے وقفے کا مذاق نہ اڑاؤ، اسے Seriously (سنجیدگی سے) لو، اپنی اس غلط روش سے باز آجاؤ، واپس آجاؤ، جس غلط راستے پہ چل رہے ہو، پھر اُسی چوراہے پہ آجاؤ، تو بچ جاؤ گے لیکن یہ نہ ہوا اور مہلت کا وقفہ ختم ہو گیا تو پھر تو وہی ہوگا جو پہلی قوموں کے ساتھ ہوا تھا۔ فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِعِبَادِہٖ بَصِیْرًا (35:45) وہ اس کائنات کو بنا کر، تمہیں بنانے کے بعد، ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق، سو نہیں گیا کہ اُسے پتہ ہی نہ ہو کہ تم کیا کر رہے ہو۔ وہ تو بصیر ہے، مسلسل Watch کرنے والا، دیکھنے والا، نگہبان ہے، تمہاری ایک ایک چیز اُس کی نگاہوں کے سامنے ہے، اس کی نگاہوں کے سامنے رہنا تو ایک طرف رہا، وہ تو کہتا ہے کہ وہ تمہارا اعمالنامہ تمہارے اپنے گلے میں لٹکا ہوا ہے۔

---

[1] بات تو صحیح ہے باقی انسان ختم ہو جاتے، ہم میں سے کوئی بھی نہ زندہ بچتا۔

انسان کا نامۂ اعمال تو ہر وقت اس کے گلے میں لٹکا ہوا ہوتا ہے

یہ بھی غلط ہے کہ کندھوں کے اوپر فرشتے بیٹھے ہوئے لکھتے چلے جاتے ہیں۔ کہتا ہے کہ تم خود لکھتے چلے جاتے ہو۔ مہلت کے وقفے میں وہ لپٹا ہوا ہوتا ہے' جب وقفہ ختم ہوتا ہے تو جو لپٹا ہوا ہے' کھول دیا جاتا ہے اور تم سے کہا جاتا ہے کہ اِقْـرَاْ كِتٰبَكَ (17:14) یہ نہیں کہ کوئی اور پڑھ کر سنائے' ہمارا ریڈر پڑھے' تم کہو جی! اس نے غلط کر دیا تھا' کہا ہے کہ پڑھ! اپنے لکھے کو آپ پڑھ' اپنے اعمالنامے کو آج ہمارے سامنے پڑھ۔ اور اس کے بعد یہ کہ پھر خود ہی بتا دے کہ تمہیں سزا کیا دی جائے' یہ بھی ہم پہ نہ چھوڑ' تیری اپنی ذات آج یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ تمہارا حساب کتاب کیا ہے اور تمہیں کیا سزا ملنی چاہیے۔ کہا کہ یہ ہے جب مہلت کا وقفہ ختم ہو جاتا ہے تو لپٹا ہوا اعمالنامہ کھل کر سامنے آ جاتا ہے اور اُس وقت پھر بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس وقت کو غنیمت سمجھو' اپنی روش کو سمجھو اور بدلو۔

مردہ قوم میں زندگی بخشنے والی سورۃ' سورۃ یٰسین کا ہمارے ہاں استعمال کا طریق

عزیزانِ من! سورۃ فاطر آج ختم ہوگئی۔ آئندہ درس میں ہم سورۃ یٰس لیں گے۔ میں نے کہا تھا قلعہ معلّٰی کی جو بیگمات تھیں ان کو تو چھوڑ دیجیے' ہمارے ہاں بھی تو '' پوچھے کوئی کہ کی حال اے اوہدا؟ او جی کی حال دسیے' اوہنوں تے ہن یٰس سنان لگ پے ہیگے [1] '' اور یہ ایسا فریضہ سمجھا جاتا ہے کہ اُسے ضرور سنانا ہے اگر اپنی قوتِ ارادی سے بھی وہ چار سانس اور زیادہ لے سکتا ہے تو وہ بھی ختم کرو۔ جب اُس کو پتہ لگے کہ '' مینوں یٰس سنان ڈیے ہویے نیں تے گیا [2] '' مرنے سے پھر پہلے مریئے کا وہ تو تصور ہے: '' قبر سامان چلن دا کریئے' مرنے توں پھر پہلاں ں مریئے ''۔ اقبال (1938-1877) نے کہا ہے کہ تُو قرآن کی آیات سے اس کے سوا کچھ کام نہیں رکھتا کہ 'از یٰس او آساں بمیری' یعنی وہ نزع کے وقت کے لیے موبل آئل ہے کہ جلدی سے '' تلک کے گاں لنگھے [3] ''۔ کیا بات کہہ گیا ہے کہ وہ قرآن جو کہہ رہا تھا کہ تمہیں جو موت سے زندگی بخشنے کے لیے آیا ہے' اُس قرآن کو اب زندہ کو مارنے کے لیے استعمال میں لایا جاتا ہے۔

---

1. اگر کوئی پوچھے کہ اس کا کیا حال ہے؟ (کہتے ہیں کہ) جی! اس کا کیا حال بتائیں' اسے تو اب یٰسین سنانے لگے ہیں۔
2. مجھے سورۃ یٰسین سنانے لگے ہیں تو وہ مر گیا۔
3. پھسل کر آگے بڑھ جایئے۔

یہ سورۃ یٰسٓ آ رہی ہے، تو میں نے کہا تھا کہ قلعہ معلّٰی کی بیگمات تو ناشگونی کو برداشت ہی نہیں کر سکتی تھیں تو جب یہ ادھر اس پہ آتی تھیں تو اس کا نام سورۃ یٰسٓ نہیں تھا، یہ اس سورۃ یٰسٓ کو ننانویں سورۃ کہتے۔ یعنی ''نامی سورۃ ایہنوں کہندے سی جیہد اناں نئیں لینا چاہیدا[1]''۔

عزیزانِ من! اس سے آگے وہ سورۃ یٰسٓ ہے، جس کے اندر یہ ہے کہ ہم مرنے والوں کو زندگی عطا کرتے ہیں۔ زندگی عطا کرنے والی سورۃ اب آئندہ درس میں ہمارے سامنے آئے گی، یہ 36ویں سورۃ ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

❀......❀......❀

---

[1] ننانویں سورۃ کہتے تھے۔ اسے کہتے تھے کہ اس کا نام نہیں لینا چاہیے۔

مجھے اپنے فہمِ قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں
ہوسکتا کہ وہ سہو وخطا سے منزہ ہے۔ یہ قرآن
فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی
کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان
ہے۔لہٰذا! میری تحریر میں جو کچھ آپ کو صحیح
نظر آئے' وہ نورِ قرآنی کا تصدق ہے اور
جہاں کہیں سہو وخطا دکھائی دے' وہ میرے
ذہن کی نارسائی۔ (پرویز۔معراجِ انسانیت)